

بلوغ المرام

اُردو
مِن أدلة الأحكام

جلد اول

تألیف: ابو الفضل شاہ الدین اشدر بن حجر عسقلانی

شارح: مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

دار السلام

کتب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

اس کتاب کے جملہ حقوق ترجمہ، نقل و اشاعت محفوظ ہیں

جمادی الاول ۱۴۱۸ھ ستمبر ۱۹۹۷ء



دارالافتاء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۴۳ ریاض ۱۱۴۱۶ مملکت سعودی عرب

فون نمبر ۲۰۳۳۹۴۲ فیکس ۲۰۲۱۶۵۹

(برایچ پاکستان)

دارالافتاء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

۵۰۔ نورمال نزد ایم اے او کالج لاہور۔ فون: ۲۲۰۰۲۲۰ فیکس ۲۲۰۰۲۲۰

(سیل نمبر) رحمن مارکیٹ (غزنی سٹریٹ) اردو بازار لاہور پاکستان

بُلُوغُ الْمَلَامِ

مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ

جلد اول

تأليف
ابو الفضل شهاب الدین ابن ابي حنبلہ رحمہ اللہ
(۸۲۳-۸۵۲ھ)

شرح بلوغ المرام

مترجم
مولانا عبدالوکیل علوی

شرح
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

تصحیح و تصحیح
مولانا ارشد الحق الاثری

دارالسلام

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ریاض - لاہور

243،۹
ن - ب



لکھنؤ کتب خانہ

۹۹۔۔۔ جے ماڈل ٹاؤن - لاہور

۱۰۷۶۴۰۰۰۰۰۰۰۰

فہرست مضامین

جلد اول

۲۴۶	نفل نماز کا بیان	۲۵	طہارت کے مسائل
۲۶۸	نماز پاجامات اور امامت کے مسائل	۲۵	پانی کی اقسام
۲۹۰	مسافر اور مریض کی نماز کا بیان		(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)
۳۰۰	نماز جمعہ کا بیان	۳۹	برتنوں کا بیان
۳۱۶	نماز خوف کا بیان	۴۴	نجاست اور اسے دور کرنے کی تفصیل
۳۲۲	نماز عیدین کا بیان	۵۱	وضو کا بیان
۳۳۱	نماز کسوف کا بیان	۶۷	موٹوں پر مسح کرنے کا بیان
	(گرہن والی نماز)	۷۱	وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان
۳۳۸	نماز استسقاء کا بیان	۸۳	قضائے حاجت کے آداب کا بیان
	(بارش مانگنے کیلئے نماز)	۹۵	غسل اور جنبی کے حکم کا بیان
۳۴۸	لباس کا بیان	۱۰۵	تیمم کا بیان
۳۵۴	جنازے کے مسائل	۱۱۳	حبس (سے متعلق احکام) کا بیان
۳۸۹	زکوٰۃ کے مسائل	۱۲۳	نماز کے احکام
۴۱۱	صدقہ فطر کا بیان	۱۲۳	اوقات نماز کا بیان
۴۱۴	نفلی صدقے کا بیان	۱۳۶	اذان کا بیان
۴۲۳	اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان	۱۴۹	شرائط نماز کا بیان
۴۳۰	روزے کے مسائل	۱۶۱	نمازی کے سترے کا بیان
	نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے	۱۶۷	نماز میں خشوع و خضوع کا بیان
۴۴۶	اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان	۱۷۳	مساجد کا بیان
۴۵۳	حج کے مسائل	۱۸۱	نماز کی صفت کا بیان
۴۵۹	حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان		(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)
۴۵۹	حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان	۲۳۲	سجود سو وغیرہ کا بیان
۴۶۶	(احرام کے) میقات کا بیان		

۶۱۷	لقط (گری پڑی چیز) کا بیان
۶۲۳	فرائض (وراثت) کا بیان
۶۳۱	وصیتوں کا بیان
۶۳۵	ودیعت (امانت) کا بیان
۶۳۶	نکاح کے مسائل کا بیان
۶۵۴	کفو (مثل، ہمسری) اور اختیار کا بیان
	عورتوں (بیویوں) کے ساتھ رہن سہن و
۶۶۵	میل جول کا بیان
۶۷۴	حق مہر کا بیان
۶۸۱	ولیمہ کا بیان
۶۸۸	بیویوں میں باری کی تقسیم کا بیان
۶۹۳	خلع کا بیان
۶۹۵	طلاق کا بیان
۷۰۷	(طلاق سے) رجوع کرنے کا بیان
۷۰۸	ایلاء، ظہار اور کفارہ کا بیان
۷۱۴	لعان کا بیان
۷۱۹	عدت، سوگ اور استبراء رحم کا بیان
۷۳۰	دودھ پلانے کا بیان
۷۳۷	نفقات کا بیان
۷۴۴	پرورش و تربیت کا بیان
۷۵۰	جنایات (جرائم) کے مسائل
۷۶۴	اقسام دیت کا بیان
۷۷۳	دعویٰ خون اور قسامت
۷۷۷	باغی لوگوں سے جنگ و قتال کرنا
	مجرم (بدنی نقصان پہنچانے والے) سے
۷۸۰	لڑنے اور مرتد کو قتل کرنے کا بیان
۷۸۶	حدود کے مسائل
۷۸۶	زانی کی حد کا بیان

۴۶۹	احرام کی اقسام اور صفت کا بیان
۴۷۰	احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان
۴۷۹	حج کا طریقہ اور دخول مکہ کا بیان
	حج سے محروم رہ جانے اور روکے جانے
۵۰۲	کا بیان

جلد دوم

۵۰۶	خرید و فروخت کے مسائل
۵۰۶	بیع کی شرائط و اور بیع منوعہ کی اقسام
۵۴۱	بیع میں اختیار کا بیان
۵۴۵	سود کا بیان
	بیع عرایا، درختوں اور (ان کے) پھلوں کی
۵۵۵	بیع میں رخصت
۵۵۹	بیہنگی ادائیگی، قرض اور رہن کا بیان
	مفلس قرار دینے اور تصرف روکنے کا
۵۶۵	بیان
۵۷۴	صلح کا بیان
۵۷۷	ضمانت اور کفالت کا بیان
۵۸۰	شراکت اور وکالت کا بیان
۵۸۴	اقرار کا بیان
۵۸۴	ادھار لی ہوئی چیز کا بیان
۵۸۷	غصب کا بیان
۵۹۰	شفعہ کا بیان
۵۹۵	مضاربت کا بیان
۵۹۷	آپاشی اور زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا بیان
۶۰۲	بے آباد و بنجر زمین کو آباد کرنے کا بیان
۶۰۷	وقف کا بیان
۶۱۰	حبہ، عمری اور ربئی کا بیان

۸۸۷	مسائل	۸۰۰	تہمت زنا کی حد کا بیان
۸۹۴	شہادتوں (گواہیوں) کا بیان	۸۰۳	چوری کی حد کا بیان
۸۹۹	دعویٰ اور دلائل کا بیان		شراب پینے والے کی حد اور نشہ آور
۹۰۵	غلامی و آزادی کے مسائل	۸۱۱	چیزوں کا بیان
۹۱۰	مدبر، مکاتب اور ام ولد کا بیان	۸۱۶	تغزیر اور حملہ آور (ڈاکو) کا حکم
۹۱۶	متفرق مضامین کی احادیث	۸۲۰	مسائل جہاد
۹۱۶	ادب کا بیان	۸۳۵	جزیہ اور صلح کا بیان
۹۲۳	نیکی اور صلہ رحمی کا بیان	۸۵۰	گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان
۹۲۹	دنیا سے بے رغبتی اور پرہیز گاری کا بیان	۸۵۴	کھانے کے مسائل
	برے اخلاق و عادات سے ڈرانے اور	۸۶۰	شکار اور ذبائح کا بیان
۹۳۷	خوف دلانے کا بیان	۸۶۷	(احکام) قربانی کا بیان
	مکارم اخلاق (اچھے عمدہ اخلاق) کی	۸۷۳	عقیقہ کا بیان
۹۵۶	ترغیب کا بیان	۸۷۶	قسموں اور نذروں کے مسائل
۹۶۶	ذکر اور دعا کا بیان		قاضی (جج) وغیرہ بننے کے



فہرست ائمہ مشاہیر (حالات زندگی)

۹۸۹	سعید بن منصور	۹۸۳	محمد بن حنبل
۹۸۹	ابن السکن	۹۸۵	اسحق بن راہویہ
۹۸۹	الشافعی	۹۸۶	الاسماعیلی
۹۸۹	ابن ابی شیبہ	۹۸۳	البخاری
۹۸۹	الطبرانی	۹۸۶	البزار
۹۹۰	الطحاوی	۹۸۶	البیہقی
۹۹۰	ابن عبد البر	۹۸۵	الترمذی
۹۹۰	عبد الحق	۹۸۶	ابن الجارود
۹۹۰	عبد الرزاق	۹۸۶	ابو حاتم الرازی
۹۹۱	ابن عدی	۹۸۷	الحارث بن ابی اسامہ
۹۹۱	العقلی	۹۸۷	الحاکم
۹۹۱	علی بن المدینی	۹۸۷	ابن حبان
۹۹۱	ابو عوانہ	۹۸۷	ابن خزیمہ
۹۹۱	ابن القطان	۹۸۷	ابن ابی خیشمہ
۹۸۵	ابن ماجہ	۹۸۷	الدارقطنی
۹۹۱	مالک بن انس	۹۸۸	الدارمی
۹۸۳	مسلم بن الحجاج	۹۸۳	ابوداؤد
۹۹۲	ابن مندہ	۹۸۸	ابوداؤد الطیالسی
۹۸۵	النسائی	۹۸۸	ابن ابی الدنیا
۹۹۲	ابو نعیم الاصبہانی	۹۸۸	الذہلی
۹۹۲	ابو یعلیٰ	۹۸۸	ابوزرعۃ الرازی



فہرست اسماء الرواة

۷۷	برہ بنت صفوان	۳۳۳	ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ
۲۲۳	بشیر بن سعد	۷۱	ابی بن عمارہ
۲۲۵	ابو بکر الصدیق	۸۵۷	ابن ابی عمار
۵۶۸	ابو بکر بن عبد الرحمن	۲۶۳	ابی بن کعب
۷۶۶	ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم	۴۹۳	اسامہ بن زید
۷۱	ابو بکرہ نفع بن الحارث	۳۷۹	ابو اسحاق السبیعی
۴۱۱	بلال بن الحارث الزنی	۵۰	اسماء بنت ابی بکر
۱۳۸	بلال بن رباح الحبشی مؤذن	۱۱۵	اسماء بنت عمیس
۳۹۹	بنہر بن حکیم	۹۶۱	اسماء بنت یزید بن السکن
۳۷۱	بضاء و ابنائہا	۶۸۱	ابو اسید
۹۶۳	تیم الداری	۹۰۱	اشعث بن قیس الکندی
۶۰۰	ثابت بن النحاک	۷۳۴	اخو ابی القعیس
۶۹۵	ثابت بن قیس	۴۶۶	اقرع بن حابس
۴۳	ابو ثعلبہ الحنسی	۲۸	ابو امامہ ثمالی
۹۸	ثمامہ بن اثال	۲۳۰	ابو امامہ الحارثی
۷۰	ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ	۱۶۰	امامہ بنت زینب بنت النبی ﷺ
۷۹	جابر بن سرہ	۶۲۸	ابو امامہ بن سہل
۶۲	جابر بن عبد اللہ	۸۰۸	ابو امیہ المخزومی
۱۳۲	جعیم بن مطعم	۳۶	انس بن مالک
۱۴۰	ابو جحیفہ	۷۶۱	انس بن النضر
۶۷۲	جدامہ بنت وہب	۲۳۰	ایاس بن ثعلبہ
۸۲۲	جریر بن عبد اللہ البجلی	۹۰	ابو ایوب الانصاری
۳۸۶	جعفر بن ابی طالب	۲۰۸	البراء بن عازب
۶۶۳	جمیل بن زید	۸۱۷	ابو بردہ الانصاری بلوی
۸۷۰	جندب بن سفیان	۳۱۳	ابو بردہ بن ابی موسیٰ
۹۷۰	جویریہ بنت الحارث	۱۲۷	ابو برزہ الاسلمی
۱۷۱	ابو جہم بن حذیفہ	۶۷۸	برور بنت واشق
۱۶۲	ابو جہیم بن الحارث	۱۴۵	بریدہ بن الحصیب
۸۱۰	حارث بن حاطب	۵۶۱	بریرہ

۱۲۷	رافع بن خدیج	۸۳۹	حبیب بن مسلمہ الفہری
۷۳۷	رافع بن سنان	۱۱۷	ام حبیبہ بنت جحش
۲۲۸	ابو رافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ	۲۵۰	ام حبیبہ بنت ابی سفیان (ام المؤمنین)
۶۵۳	ربیع بن سبرہ	۵۰۵	حجاج بن عمرو بن غزیہ
۷۹۱	ربیع بنت النضر	۷۳۳	ابو حذیفہ
۲۳۷	ربیعہ بن کعب	۴۰	حذیفہ بن الیمان
۱۸۳	رفاعہ بن رافع بن مالک	۱۷۶	حسان بن ثابت
۷۰۲	ابو رکنہ بن عبد یزید	۲۱۶	حسن بن علی
۷۷۳	ابو رمثہ	۶۲۶	حسن بن یسار البصری
۷۲۷	روقیع بن ثابت	۸۷۳	حسین بن علی
۳۵۰	زبیر بن العوام	۴۳۳	حفصہ بنت عمر
۵۱۴	ابو زبیر (محمد بن مسلم بن مدرس)	۳۱۵	حکم بن حزن
۷۴۲	ابو زناد (عبد اللہ بن ذکوان)	۱۷۷	حکیم بن جریم
۷۲۰	زہری (محمد بن مسلم بن شحاب الامام)	۳۹۹	حکیم بن معاویہ
۱۴۷	زیاد بن الحارث الصداقی	۵۳	حران مولیٰ عثمان
۷۳۷	زیاد السبعمی	۴۴۲	حمزہ بن عمرو الاسلمی
۱۵۷	زید بن ارقم	۷۵۹	حمل بن ثائف الہذلی
۸۰۰	زید بن اسلم	۱۱۶	حنہ بنت جحش
۲۴۲	زید بن ثابت	۱۸۴	ابو حید الساعدی
۶۴۰	زید بن خالد الجہنی	۵۹۹	حنظلہ بن قیس
۶۶۳	زید بن کعب بن عجرہ	۵۲۳	ابو حنیفہ النعمان بن ثابت الامام
۴۲۰	زینب زوجہ ابن مسعود	۷۷۶	حویرہ بن مسعود
۶۶۱	زینب بنت النبی ﷺ	۲۵۷	خارجہ بن حذافہ
۴۷۱	سائب بن خلاد بن سويد	۸۱۹	خالد بن عرفطہ
۵۸۱	سائب المخزومی	۲۴۳	خالد بن معدان
۳۱۱	سائب بن یزید	۶۱۰	خالد بن الولید
۳۷۷	سالم بن عبد اللہ	۸۱۹	خباب بن الارت
۷۳۳	سالم بن معقل مولیٰ ابی حذیفہ	۲۳۶	خرباق بن عمرو السلمی (ذوالیدین)
۱۶۲	سبرہ بن معبد الجہنی	۴۸۵	خزیمہ بن ثابت
۷۲۰	سیبہ بنت الحارث الاسلمیہ	۴۷۱	خلاد بن السائب
۴۹۹	سراء بنت نبھان	۳۱۷	خوات بن جبیر
۹۳	سراقہ بن مالک	۹۴۴	خولہ الانصاری
۲۱۴	سعد بن طارق الاشجعی	۵۱	خولہ بنت یار
۸۸۳	سعد بن عبادہ	۹۵۰	ابو الدرداء
۱۷۸	سعد بن معاذ	۱۱۰	ابو ذر

۳۱۷	صالح بن خوات	۲۲۷	سعد بن ابی وقاص
۸۳۶	صحز بن العیلہ	۸۳۵	سعید بن جبیر
۹۴۹	ابو صرمہ	۲۷	ابو سعید الخدری
۴۷۵	صعب بن جشمہ اللیثی	۶۳	سعید بن زید
۵۸۷	صفوان بن امیہ	۷۹۶	سعید بن سعد عبادہ
۳۷۱	صفوان بن بیضاء	۲۹۹	سعید بن المسیب
۶۹	صفوان بن عسال	۷۴۲	سفیان الثوری الامام
۶۷۴	صفیہ بنت حبیب بن اخطب	۷۳۸	ابو سفیان صحز بن حرب
۶۸۵	صفیہ بنت شیبہ	۴۳۵	سلمان بن عامر الضبی
۴۵۱	صماء بنت بمر	۸۹	سلمان الفارسی
۵۹۵	صہیب بن سنان الرومی	۳۰۲	سلمہ بن اکوع
۵۰۵	ضباعہ بنت الزبیر	۷۱۲	سلمہ بن صحز البیاضی
۶۵۸	ضحاک بن فیروز الدیلمی	۶۷۵	ابو سلمہ بن عبد الرحمن
۳۸۲	ضمیرہ بن حبیب	۴۲	سلمہ بن المحبب
۲۱۴	طارق بن اشیم	۳۵۸	ابو سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسد
۸۱۶	طارق بن سوید	۴۰	ام سلمہ (ام المؤمنین)
۳۱۴	طارق بن شہاب	۹۶	ام سلیم
۷۳۹	طارق بن عبد اللہ المحاربی	۳۸۷	سلیمان بن بربدہ
۵۲۹	طاؤس	۲۰۱	سلیمان بن یار
۴۸۹	ابو الطفیل (عامر بن واثلہ)	۴۹	ابو السمح
۴۶	ابو طلحہ (زید بن صہل)	۹۹	سموہ بن جندب
۳۷۳	طلحہ بن عبد اللہ بن عوف	۴۹۰	سوہہ بنت زمعہ
۶۳	طلحہ بن مصرف عن ابیہ عن جدہ	۸۱۶	سوید بن طارق حضری
۷۶	طلق بن علی	۳۷۱	صہل بن بیضاء
۸۴۷	عائذ بن عمرو	۴۰۶	صہل بن ابی حثمہ
۴۸	عائشہ الصدیقہ (ام المؤمنین)	۳۷۲	صہل بن حنیف
۶۶۱	ابو العاص بن الربیع	۳۰۳	صہل بن سعد
۴۹۸	عاصم بن عدی	۷۳۳	صہلہ بنت صہیل
۸۴۶	عاصم بن عمر	۳۷۱	صہیل بن بیضاء
۶۶۳	عالیہ بنت ظبیان	۸۴۹	صہیل بن عمرو
۳۴۹	ابو عامر الاشعری	۴۳۹	شداد بن ادس
۱۵۲	عامر بن ربیعہ	۷۶۴	ابو شریح الخزاعی
۶۴۴	عامر بن عبد اللہ بن الزبیر	۵۶۹	شرید بن سوید
۱۹۳	عبادہ بن الصامت	۸۰۲	شریک بن سحماء
۳۴۵	عباس بن عبد المطلب	۲۵۸	شعیب (والد عمرو بن شعیب)

۴۲۴	عبد الله بن عدي بن الخيار	۵۶۱	عبد الرحمن بن ابيزى
۴۰۷	عقاب بن اسيد	۷۶۲	عبد الرحمن بن البيلماني
۸۴۶	عثمان بن ابي سليمان	۸۷۸	عبد الرحمن بن سره
۱۴۵	عثمان بن ابي العاص الشقيف	۷۷۶	عبد الرحمن بن سئل بن زيد
۵۳	عثمان بن عفان	۶۲۲	عبد الرحمن بن عثمان التيمي
۳۸۱	عثمان بن عفان	۲۳۵	عبد الرحمن بن عوف
۸۶۲	عدي بن حاتم الطائي	۵۷۰	عبد الرحمن بن كعب بن مالك الانصاري
۷۸۰	عرفه بن شريح	۳۷۲	عبد الرحمن بن ابي ليلى
۵۳۸	عروه الباري	۵۹۶	عبد الرحمن بن يعقوب الجيني
۵۹۰	عروه بن الزبير	۳۶۴	عبد الله بن ابي (ركيس السافين)
۴۹۲	عروه بن مضر الطائي	۱۹۸	عبد الله بن ابي اوفى
۵۵۲	عطاء الخراساني	۲۰۸	عبد الله بن يحيى
۵۷۲	عطيه القرظي	۲۵۸	عبد الله بن بريده
۱۱۸	ام عطيه	۸۰	عبد الله بن ابي بكر
۷۳۷	عقبه بن الحارث	۲۳۹	عبد الله بن جعفر
۱۳۱	عقبه بن عامر	۸۱۸	عبد الله بن خباب بن الارت
۵۰۵	عكرمه	۵۰۱	عبد الله بن الزبير
۵۹۶	الطاء بن عبد الرحمن الجيني	۶۹۳	عبد الله بن زمه
۶۷۸	علقمه بن قيس	۵۴	عبد الله بن زيد بن عاصم المازني
۶۰۶	علقمه بن وائل الكندي	۱۳۸	عبد الله بن زيد بن عبد ربه
۵۳	علي بن ابي طالب	۸۲۴	عبد الله بن السدي
۱۴۹	علي بن طلق	۳۱۳	عبد الله بن سلام
۱۰۸	عمار بن ياسر	۷۷۶	عبد الله بن سئل بن زيد
۸۵۷	ابن ابي عمار	۱۵۸	عبد الله بن الشيخير
۶۶	عمر بن الخطاب	۶۷۹	عبد الله بن عامر بن ربيعه
۵۶۸	عمر بن خلد	۳۲	عبد الله بن عباس
۶۸۶	عمر بن ابي سلمه	۳۶۴	عبد الله بن عبد الله بن ابي
۹۱۳	عمرو بن الحارث	۳۰	عبد الله بن عمر بن الخطاب
۸۱	عمرو بن حزم	۵۵	عبد الله بن عمرو بن العاص
۴۷	عمرو بن خارج	۹۱	عبد الله بن مسعود
۲۸۰	عمرو بن سلمه	۲۵۱	عبد الله بن مغفل
۵۶۹	عمرو بن الشريد	۳۷۹	عبد الله بن يزيد
۲۵۷	عمرو بن شعيب	۴۲۶	عبد المطلب بن ربيعه
۵۷۶	عمرو بن عوف الزني	۱۳۲	عبد مناف
۴۴	عمران بن حصين	۶۲۸	ابو عبيده بن الجراح

۷۰۰	محمود بن لیب	۶۸۱	عمرو بنت الجون
۷۷۶	محیصہ بن مسعود	۳۲۴	ابو عمیر (عبداللہ بن انس)
۱۵۵	ابو مرثد الغنوی	۳۷۴	عوف بن مالک
۸۴۹	مروان بن الحکم	۳۲۱	ابو عیاش الزرقی
۸۹۴	ابو مریم الازدی	۶۲۲	عیاض بن حمار
۹۱	ابن مسعود	۹۳	عیسیٰ بن یزاد
۲۲۳	ابو مسعود انصاری	۶۵۸	غیلان بن سلمہ الشقیفی
۴۹۶	مسور بن مخرمہ	۷۳	فاطمہ بنت ابی جیش
۶۳	مصرف (والد طلحہ)	۶۵۵	فاطمہ بنت قیس
۱۵۸	مطرف بن عبداللہ بن الشخیر	۳۶۶	فاطمہ بنت النبی ﷺ
۸۷	معاذ بن جبل	۷۲۴	فریعہ بنت مالک بن شان الخدریہ
۸۳۳	معاذ بن عمرو بن الجموح	۲۲۲	فضالہ بن عبید
۱۵۷	معاویہ بن الحکم	۴۶۳	فضل بن العباس
۳۹۹	معاویہ بن حیدہ القشیری	۶۵۸	فیروز الدلمی
۸۳	معاویہ بن ابی سفیان	۴۲۶	قبیصہ بن الحارث
۶۷۸	معقل بن شان الاشجعی	۳۵	ابو قتادہ (الحارث بن ربیع)
۳۵۷	معقل بن یسار	۹۴۷	قطبہ بن مالک
۵۳۳	معر بن عبداللہ بن نافع	۶۳۱	ابو قلابہ
۸۳۸	معض بن یزید	۵۷۶	کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف
۱۶۸	معتیق	۸۸۴	کردم
۶۱	مغیرہ بن شعبہ	۸۷۴	ام کرز الکعبہ
۷۴	مقداد بن الاسود	۴۷۷	کعب بن عجرہ
۶۲۳	مقدام بن معدیکرب	۶۳	کعب بن عمرو الیائی
۱۴۳	ابن ام کتوم	۵۷۰	کعب بن مالک الانصاری
۸۳۴	مکحول	۹۰۶	کعب بن مرہ
۱۴۵	ابو موسیٰ الاشعری	۷۸۰	کوثر بن حکیم
۳۳	میونہ بنت الحارث	۵۶	لقیط بن صبرہ
۵۵۲	نافع مویٰ ابن عمر	۱۳۵	مالک بن الحویث
۴۴۹	نیشہ الحدلی	۹۰۴	مجزز الدلمی
۳۶۹	نجاشی (ملک الحبشہ اصحمہ بن الابر)	۱۳۵	ابو مخزومہ
۳۰۹	نعمان بن بشر	۷۰۲	محمد بن اسحاق (صاحب المغازی)
۸۲۸	نعمان بن مقرن	۳۴۲	محمد الباقر
۱۹۵	نعیم بن عبداللہ البحر	۶۳۰	محمد بن الحسن الشیبانی
۹۱۱	نعیم بن عبداللہ النحام	۸۶۷	محمد بن شان
۹۱۸	نواس بن سمعان	۶۴۰	محمد بن سلمہ

۸۰۲	حلال بن امیہ الواقفی	۱۹۲	وائل بن حجر
۷۳۸	ہند بنت عقبہ زوجہ ابی سفیان	۲۸۷	والصہ بن معبد
۶۵۶	ابو ہند (یسار او سالم)	۳۹	ابو وائد السیسی
۷۳۷	ام یحییٰ بنت ابی اہاب	۲۸۹	ام ورقہ
۲۷۳	یزید بن الاسود	۸۱۲	ولید بن عقبہ
۵۹۷	لیث بن الجہنی	۸۴۲	ام حانی بنت ابی طالب
۳۸۹	یعلیٰ بن امیہ	۲۶	ابو حریرہ
۶۳۰	ابو یوسف (لیث بن القاضی)	۳۰۷	ام مشام



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عرض ناشر

دارالسلام -- الریاض، لاہور -- اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ الحمد للہ، اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں۔ جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ بھی ہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری بھی، اور طباعت و کتابت کے ظاہری حسن و جمال سے آراستہ بھی۔

اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری نشریاتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور اس کی مہربانی کا نتیجہ اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا صلہ ہے، بس پر ہم بارگاہ الہی میں سجدہ ریز اور وابستگانِ بارہ کے مشکور ہیں۔ جَزَاهُمْ اللَّهُ أَحْسَنُ الْجَزَاءِ، وَوَفَّقَنَا اللَّهُ وَإِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب ”بلوغ المرام فی اولی الاحکام“ بھی ہے، ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیسی ساز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا، اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا، یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ ہے۔

”بلوغ المرام“ پاک و ہند کے دینی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متداول۔ اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے، چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں مولانا مبارکپوری حفظہ اللہ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا، تاکہ اردو دان حلقہ بھی اس سے

استفادہ کر سکے۔

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی خدمات حاصل کیں، انہوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا، فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) نے اس پر نظر ثانی فرمائی، اس کے بعد بھی اس کی نوک پلک درست کرنے میں ادارے کے بعض اور رفقاء نے بھی حصہ لیا۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم سلمہ اللہ تعالیٰ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انہوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس طرح رفیق ادارہ جناب محمود الحسن اسد نے بھی اس کی تصحیح و نظر ثانی میں بڑی پر خلوص محنت کی ہے۔ جَزَاهُمْ اللهُ أَحْسَنُ الْجَزَاءِ

اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں، ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کر دی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظر ثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے، اس لیے ادارہ اس کو قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔

خادم، توحید و سنت

عبدالمالک مجاہد

دار السلام۔ الریاض لاہور

ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / جولائی ۱۹۹۷ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهِ لِيَكُوْنَ عَلَى الْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا وَبَعْدُ:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ”بلوغ المرام من ادلة الاحکام“ اپنے موضوع میں درج ذیل متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے، یہ کہ مؤلف نے اس میں احکام کی احادیث میں سے ایسی احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں، جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور لمبی احادیث کا شاندار انداز میں اختصار پیش کیا اور حدیث کو ائمہ حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے اور صحت و حسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اعتناء کیا ہے، جیسا کہ بہت سی علل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ واضح ہو کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد ٹکڑے اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں، جو مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل بنانے اور مغلط کو واضح، تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں، جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث و تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنایا، مشرق و مغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کا زینہ بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کر لیا اور اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح و توضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

سابق الذکر اہتمام و اعتناء کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی، جس میں قدیم و جدید انداز کی معروف و مشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقے سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہو، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں

میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا، اس عمل عظیم کو شروع کیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہوگی، جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہوگی، تاہم یہ اس وقت ہو گا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدہ کا اثبات کرنا چاہوں جو عام کتابوں میں ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اکثر یا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے غامض اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسہ کیا ہو، جب کہ وہ طبعی، تاریخی، جغرافیائی اور دیگر قسم کی تحلیل کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں، چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت دینے پر مجبور ہوا تا کہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی مجھے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰی نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّم

مفتی الرحمن مبارکپوری

شعبان ۱۳۹۴ھ



مؤلف کتاب کے مختصر حالات

ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی، المعروف ابن حجر عسقلانی، سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے قاضی القضاۃ اور حفاظ و رواۃ میں منفرد ہیں۔ دس شعبان ۷۳۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحادی اور مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب یاد کیں اور اپنے کسی ایک وصیت کرنے والے کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا، پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز، شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہوئے، چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی، ابن الملقن اور دیگر اہل علم سے فقہت حاصل کی، آپ کو جلیل القدر ائمہ و شیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا، جو کسی دوسرے کو میسر نہ آیا، جیسا کہ مقدم الذکر ائمہ و شیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا۔ اور آپ نے دونوں اصول یعنی کتب و سنت اور دیگر علوم عز بن جماعہ سے، لغت الجہد فیروز آبادی سے، عربی زبان عماری سے، ادب و عروض بدر شتگی سے اور کتابت جماعہ سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے اور قرأت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ توفی سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشر و اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ، قرأت، تدریس و تصنیف اور افتاء کی صورت میں اس پر نئے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر، حدیث، فقہ اور وعظ و نصیحت کی تدریس کی اور ازھر، جامع مسجد عمرو اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے اور اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املاء کروائی اور بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے تجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں، اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ اور امراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر ”فتح الباری شرح صحیح بخاری“ کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی

فتح الباری ہی آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ھ میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ھ میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۲۲ھ میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا، جس میں تمام عام و خاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی نصرت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب ”بلوغ المرام فی اولیہ الاحکام“ جو اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے، مگر اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں جن میں ایک یہی مولانا صفی الرحمن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی اتحاف الکرام ہے جسے اردو دان طبقہ کے لیے اردو پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔

پہلے سال آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے، پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شاہی علاقے بھی آپ کی قضاء میں شامل کر دیے گئے، جو اکیس سال سے زائد عرصہ تک آپ کے زیر قضاء رہے، شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے، حتیٰ کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا، پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے، بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انہیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا، یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے، آپ کی یہ تقرری ۱۲ محرم بروز ہفتہ ۸۲۷ھ عمل میں آئی، پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات ہی مرتبہ اس سے الگ ہوئے، پھر جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو آخری مرتبہ اس عہدہ سے دستبردار ہوئے اور اسی سال میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس کے علاوہ آپ، تواضع، بردباری، صبر و تحمل، خوش طبعی، وسعت و طرافت، قیام و صیام، احتیاط و ورع، جود و سخا، برداشت، باریک و لطیف کلام اور عمدہ اور نفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور و مختار تھے، جیسا کہ آپ ائمہ متقدمین و متاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب و احترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ بروز ہفتہ آٹھ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا ثواب اور بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تخصیص از ”التبر السبوك وغیره“



کلمہ مؤلف

آغاز اللہ رحمن اور رحیم کے نام سے

بسم الله الرحمن الرحيم

ظاہری، باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور درود و سلام اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور (مزید برآں) اس کی آل اور اس کے اصحاب پر جنہوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تہذیب اور برق رفقاری کا مظاہرہ کیا اور تابعین کرامؒ پر جو ”المعلم“ کے وارث ہوئے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ علماء ہی انبیاء کرامؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ اور اچھا ہے یہ ورثہ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ
وَالْبَاطِنَةِ قَدِيمًا وَحَدِيثًا، وَالصَّلَاةُ
وَالسَّلَامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ
وَالِهِ وَصَحْبِهِ الَّذِينَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ
دِينِهِ سِرًّا حَثِيئًا، وَعَلَى أَتْبَاعِهِمُ
الَّذِينَ وَرَثُوا الْعِلْمَ، وَالْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ
الْأَنْبِيَاءِ، أَكْرَمَ بِهِمُ وَارِثًا وَمُورِثًا.

حمد و صلوة کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب میں بڑی جانفشانی اور تہذیب سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بحیثیت ماہر اور بڑی شان والا بن جائے۔ مبتدی طالب علم اس کے ذریعہ مدد طلب کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت و ضرورت سے مستغنی نہ رہ سکے۔ (یعنی یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)

أَمَّا بَعْدُ، فَهَذَا، مُخْتَصَرٌ يَسْتَعْمَلُ
عَلَى أُصُولِ الْأَدِلَّةِ الْحَدِيثِيَّةِ
لِلْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَزْتُهُ تَحْرِيرًا
بَالِغًا، لِيَصِيرَ مَنْ يَحْفَظُهُ مِنْ بَيْنِ
أَقْرَانِهِ نَابِغًا، وَيَسْتَعِينَ بِهِ الطَّالِبُ
الْمُبْتَدِي، وَلَا يَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّائِعُ
الْمُنْتَهِي.

میں نے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے امت کی خیر

وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقَبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ
أَخْرَجَهُ مِنَ الْأَيْمَةِ، لِإِرَادَةِ نُصْحِ

الْأُمَّة، قَالَ مُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ وَالبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه، وَبِالسَّبْعَةِ: مَنْ عَدَا أَحْمَدَ، وَبِالْخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا الْبُخَارِيَّ وَمُسْلِمًا، وَقَدْ أَقُولُ: الْأَرْبَعَةُ وَأَحْمَدُ وَبِالْأَرْبَعَةِ: مَنْ عَدَا الثَّلَاثَةَ الْأُولَى، وَبِالثَّلَاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ وَالْآخِرَ، وَبِالْمُتَّفَقِ: الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لَا أَذْكَرُ مَعَهُمَا غَيْرَهُمَا، وَمَا عَدَا ذَلِكَ فَهُوَ مُبَيَّنٌ.

خواری کے لیے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جہاں میں نے ﴿اعرجہ السبعہ﴾ نقل کیا ہے اس سے میری مراد امام احمد رحمہ اللہ، بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ، ابوداؤد رحمہ اللہ، ترمذی رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ ہیں اور جہاں میں نے ﴿اعرجہ السنۃ﴾ نقل کیا ہے اس سے مراد امام احمد بن حنبل کے ماسوا باقی تمام آئمہ ہیں اور ﴿اعرجہ الخمسہ﴾ سے مراد بخاری و مسلم کے علاوہ باقی پانچ امام ہیں اور کبھی میں نے ﴿اعرجہ الاربعہ﴾ لکھا ہوں اور ﴿اربعہ﴾ سے مراد پہلے تین امام یعنی احمد، بخاری اور مسلم کے علاوہ باقی آئمہ مراد ہوتے ہیں اور ﴿اعرجہ الثلاثہ﴾ سے مراد پہلے تینوں اور آخری کے علاوہ بقیہ تین امام مراد ہیں (یعنی امام ابوداؤد، نسائی، ترمذی) اور ﴿متفق علیہ﴾ سے مراد بخاری اور مسلم ہیں اور با اوقات میں بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے آئمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ متذکرہ بالا صورتوں کے ماسوا باقی تمام صورتوں میں روایت کرنے والے آئمہ کا ذکر ہر موقع پر نمایاں طور پر ذکر کر دیتا ہوں۔

وَسَمَّيْتُهُ بُلُوغُ الْمُرَامِ مِنْ أَذَلَّةِ الْأَحْكَامِ، وَاللَّهِ أَسْأَلُ أَنْ لَا يَجْعَلَ مَا عَلِمْنَاهُ عَلَيْنَا وَبَالًا وَأَنْ يَرْزُقَنَا الْعَمَلَ بِمَا يَرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

میں نے اس مختصر کتاب کا نام ﴿بلوغ المرام من ادلة الاحکام﴾ تجویز کیا ہے۔ آخر میں رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

لغوی تشریح: ﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم﴾ سے مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن پاک کے طریقہ کی پیروی اور نبی ﷺ سے ایسے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتداء کرنے کی تعمیل کے لیے کیا ہے۔ ﴿الحمد﴾ میں حمد سے مراد ہے بہترین تعریف۔ بہترین اسلوب کے ساتھ جو انسان کے اختیار میں ہو۔ ﴿النعم﴾ ان پر دو اعراب منقول ہیں۔ کسرہ اور فتح۔ یہ جمع ہے اس کا واحد نعمۃ ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿الظاہرہ﴾ سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ ظاہری انعامات و احسانات میں انسان کی شکل و صورت کا موزوں و مناسب بنانا اور لذیذ و عمدہ طرح طرح کے کھانے جو

اس کے منہ کے ذریعہ شکم میں جاتے ہیں شامل ہیں اور ظاہری نعمت سے اسلام بھی مراد ہے۔ ﴿الباطنہ﴾ ایسے انعامات جن کا انسان اور اک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو ارض و سماء میں ہی نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ایسی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ باطنی نعمتوں میں عیوب پر پردہ پوشی بھی شامل ہے۔ قدیم و جدید سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان نے اپنی زندگی کی سہولت اور آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ عقل و خرد کو استعمال کر کے معیشت و معاشرت اور تمدن کے لیے ایجادات کی ہیں۔ دور جدید کے انکشافات نے انسانی تمدن کو ایسی نعمتوں سے روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ انسان بحر و بر تو در کنار فضا میں ہوا سے تیز رفتار ایجاد کی وجہ سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چند لمحوں میں ہزار ہا میل دور بیٹھے ہوئے انسان سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ﴿الصلوۃ﴾ کے معنی دعا و رحمت، بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں ﴿السلام﴾ آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ مصنف نے کتاب کا آغاز حمد و ثناء کے بعد قرآن مجید میں رب کائنات کے ارشاد صلوا علیہ وسلموا تسلیما کی تعمیل اور سلف کی پیروی میں صلوة و سلام سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی عزت افزائی فرمائے اور آپ ﷺ کی شان بلند کرے۔ ﴿ال﴾ آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ یعنی اس لفظ میں بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے اتباع و پیروکار بھی شامل ہیں۔ مثلاً ال ابراہیم سے جس طرح ان کی اولاد مراد ہے اسی طرح ان کے متبعین بھی مراد ہیں بعینہ جس طرح ال فرعون میں فرعون کی اولاد بھی شامل ہے اور اس کے نظریہ کے پیروکار بھی۔ ﴿صحابہ﴾ فتح یعنی زبر کے ساتھ۔ صاحب کی جمع ہے اور صحابی سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں مگر زیادہ صحیح یہی ہے۔ ﴿الحشیت﴾ تیز رفتاری، تیز گامی۔ ﴿اتباع﴾ ہمزہ کے فتح یعنی زبر اور تاء کے سکون۔ تابع کی جمع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کے حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تحصیل علم کے بعد اس کے دقیق مسائل نکالے۔ یہ بزرگ اگر جانفشانی اور سعی و جدوجہد کر کے علم حقیقی ہم تک نہ پہنچاتے تو آج انسانیت کفر و الحاد کے اندھیروں میں ٹانک ٹولیاں مارتی پھرتی۔ ﴿اکرم بہم فعل تعجب﴾ یعنی کتنے معزز و مکرم ہیں یہ لوگ۔ ﴿وادا﴾ اکرم مہم میں ضمیر مجرور کی تیز کے طور پر ہے۔ اسے منصوب لایا گیا ہے۔ یعنی تابعین صحابہ کرامؓ سے دین حقیقی کے علم کو وراثت میں پانے کی وجہ سے بہت ہی معزز و مکرم ہیں۔ ﴿امابعد﴾ حرف شرط ہے اور بعد کے ”د“ پر ضمہ ہے گویا جہی بر ضمہ ہے۔ یہاں ظرف واقع ہو رہا ہے مضاف الیہ کی نیت موجود ہے مگر اضافت بظاہر موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حمد و صلوة کے بعد۔ ﴿اصول﴾ جمع ہے اصل کی۔ جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔ ﴿الادلہ﴾ ہمزہ کے فتح ”د“ کے کسرہ اور ”ل“ کی تشدید دلیل کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے دلیل کا معنی مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ ﴿الاحکام﴾ حکم کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ ﴿حردہ﴾ تحریر سے ہے جس کے معنی تفتیح تہذیب کے ہیں۔ ﴿نابعہ﴾ عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ ﴿المبتدی﴾ فن

حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ ﴿المنہمی﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلباء سے لے کر کامل ماہرین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ ﴿عقب﴾ ”ع“ کے فتح اور ”ق“ کے کسرہ۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿من اخرجہ﴾ اس میں ”من“ موصولہ ہے اور اخرجہ کے ساتھ مل کر نیت کا مفعول ہے اس میں اخرج، تخریج اور روایت کے معنی میں استعمال ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ کتاب میں بیان کرنا اور مصنف نے مخزین کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے حسن یا ضعیف ہے۔ ﴿النصح﴾ بھلائی اور خیر خواہی۔ ﴿الامراء﴾ کا مطلب ہے میری مراد۔ یعنی اس کتاب میں جب میں بالسبعہ کہتا ہوں تو میری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اور جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد ”اخرجہ السبعہ“ کہتا ہوں تو اس کا بھی وہی مطلب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ﴿عدا﴾ غیر اور سوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو اشتاء کے لیے ہیں اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے اور کبھی میں ﴿الاربعة﴾ واحد ﴿اخرجہ الخمسة﴾ کی طرح پانچ محدث مراد ہوتے ہیں ﴿الاربعة﴾ واحد ﴿اور﴾ ﴿اخرجہ الخمسة﴾ بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔ ﴿الثلاثة الاول﴾ الاول ہمزہ کے ضمہ اور ”و“ کے فتح۔ اول کی جمع ہے اور ثلاثہ سے میری مراد پہلی تین کتابوں بخاری، مسلم اور احمد کے علاوہ ہے۔ ﴿الاخیر﴾ سے ابن ماجہ مراد ہے۔ یعنی پہلی تین اور آخری ابن ماجہ کے علاوہ باقی ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رہ جاتی ہیں بالثلاثة سے یہی تین مراد ہیں۔ ﴿معہما﴾ اس سے مراد بخاری و مسلم کے ساتھ۔ ﴿غیرہما﴾ حدیث کی نسبت بخاری و مسلم کی جانب ہے۔ حدیث کے مرتبہ صحت کے لیے کافی ہے مگر مزید برآں تائید غے لیے ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ﴿ما عدا ذلک﴾ ان سات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے ان کے اسماء گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ﴿المروم﴾ کے معنی طلب کے ہیں اور مراد سے مطلوب ہے۔ ﴿والله﴾ مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے اسال کا مفعول ہے۔ مفعول کو مقدم بیان کرنے سے مقصود کلام میں حصر کرنا ہے یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ بجز اس کے کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ ﴿ما علمناہ﴾ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر جعل فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول وبالہ ہے۔ وبال کی ”و“ پر فتح ہے اس کے معنی برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصہ اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے اور ان یرزقنا کے معنی ہیں یوفقنا یعنی ہمیں اللہ توفیق دے۔



١- كتاب الطهارة

طہارت کے مسائل

پانی کی اقسام

١ - بَابُ الْمِيَاهِ

(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ بیانی کا بیان)

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْبَحْرِ: «هُوَ الظُّهُورُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتُهُ». أَخْرَجَهُ الْأَزْمَعِيُّ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ.

خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس

روایت کو مالک، شافعی اور احمد نے بھی روایت کیا ہے)

نفعی تشریح: ﴿کتاب الطہارۃ﴾ کتاب کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب مسائل کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ اور طہارت پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

﴿باب المیاء﴾ باب ایک ہی نوع سے متعلق مسائل جس میں بیان کئے جائیں اسے باب سے تعبیر کرتے ہیں اور ﴿میاہ﴾ ماء کی جمع ہے ”مویہ“ اس کی تغیر آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر ”مویہ“ کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں وہ کنوئیں کا پانی، دریا اور سمندر کا پانی اور چشموں اور باران رحمت کے پانی کا ذکر کر سگے۔

﴿عن ابی ہریرۃ﴾ اس کا تعلق محذوف سے ہے جو روی یا مروی وغیرہ ہو سکتا ہے اور ﴿فی البحر﴾ کا مطلب ہے دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ پھر ﴿الطہور﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے ”طاء“ کے فتح سے اگر اسے ادا کیا جائے تو اس صورت میں وہ اسم مراد ہوگا جو مطہر یعنی پاک کرنے والا کے معنی میں ہوگا۔ دریا و سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ ﴿الحل﴾ ”حاء“ کے کسرہ اور ”لام“ کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے معنی ہیں حلال۔ ﴿میتہ﴾ سے وہ جانور مراد ہے جو پانی میں ہی صرف زندہ رہ سکتا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث دراصل ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں، ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے، اب اگر ہم اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے مرجائیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا ”وہ پانی پاک ہے۔“

یہ حدیث دلیل ہے، اس کی کہ سمندری پانی بغیر تفصیل کے مطلقاً پاک ہے۔ نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں خواہ وہ کتے اور خنزیر کی شکل کے ہوں۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی ﷺ نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ بغیر سائل کے دریافت کئے، اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتادی۔ اس لئے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے وہ تو اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کیس زیادہ شک و شبہ میں رہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے مگر اس کی تفصیل نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہذا آنحضرت ﷺ کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ یہ سائل کون تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبداللہ المدلجی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالعزیز رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبید العزیز رضی اللہ عنہ تھا اور عسکی سمندر و دریا میں کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی ملا۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا پاک ہونا، اس سے وضو کرنا، اس کو (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں، چاہے سمندر میں مرجائے یا نکالنے کے بعد مر جائے اور یہ کہ سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت ابوسیرۃ رضی اللہ عنہ﴾ وہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ صاحب استیعاب کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تھے۔ ۶ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اٹھتر سال کی عمر پائی اور ۵۹ھ میں اس دنیائے فانی

سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع غرقہ نامی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان سے کم و بیش ۵۳۸۴ احادیث مروی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا کہ ”پانی پاک ہے“ اسے رسول اللہ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا كُوفِيْ شَيْءٍ نَجَسُهُ شَيْءٌ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ وَصَحَّحَهُ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے أَخَذَ۔ صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخدری﴾ ”خاء“ کے ضمہ اور ”ز“ کے سکون کے ساتھ۔ ”خدرہ“ کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک معروف و مشہور قبیلہ ہے۔ ﴿طہور﴾ ”طاء“ کے فتح کے ساتھ اس کے معنی پاک کے بھی ہیں اور پاک کرنے والے کے بھی۔ ﴿لاینجسہ﴾ میں ینجسہ تنجیس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس یعنی ناپاک نہیں کرتی۔ مفہوم و معنی یہ ہے پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔

حاصل کلام: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور غواہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف عملاً رونما نہ ہو جیسا کہ آگے ابوامامہ ہابلی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بشر بضاہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ (بشر بضاہ ایک پرانا کنواں تھا جس میں حیض والے کپڑے، کتے کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں) آپ نے اس کے جواب میں فرمایا ”پانی تو پاک ہے۔“ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ الماء میں جو ”لام“ ہے یہ لام عمد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسائل کے ذہن میں جس کنوئیں کا پانی مراد تھا اور وہ بشر بضاہ کا پانی تھا، اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں پانی ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا۔ جیسا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ (اگر مذکورہ کثیر مقدار ہو تو اس میں نجاست واقع ہونے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا ورنہ ناپاک ہو جاتا ہے)۔

راوی حدیث: ﴿ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ﴾: ابو سعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ

ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھپاسی برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ھ کے آغاز میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

(۳) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَاءَ لَا يَنْجِسُهُ شَيْءٌ إِلَّا مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنُهُ». أخرجه ابنُ ماجه، وَصَحَّفَهُ أَبُو حَنِيمٍ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ: ماجه نے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اسے ضعیف قرار دیا (ہے) بیہقی میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں ”پانی پاک (اور پاک کرنے والا بھی ہے) بجز اس کے وہ ناپاک پانی میں گرنے والی چیز پانی کی بو، ذائقہ اور رنگت غالب ہو جائے۔“ (اسے ابن رنگت کو تبدیل کر دے۔“

لعوی تشریح: ﴿لَا يَنْجِسُهُ﴾ تنجیس سے ہے۔ محض نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ پانی کی مقدار کثیر ہو یعنی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اگر پانی دو بڑے مشکوں کی مقدار کے مساوی ہو اور اس میں نجاست گر کر اس کی بو، ذائقہ اور رنگت میں سے کوئی ایک وصف بھی تبدیل کر دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس میں پانی کی مقدار قلیل یا کثیر کا اعتبار نہیں ہو گا ﴿تحدث فيه﴾ معنی نجاست پانی میں واقع ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں رشدین بن سعد راوی متروک ہے اور وہ اسے موصول بیان کرتا ہے جبکہ راشد بن سعد جو ثقہ راوی ہے اسے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم معنوی اعتبار سے اس کی صحت پر اجماع ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ نجاست کے اس میں گرنے سے اس کے تین اوصاف میں سے کسی ایک کی تبدیلی کی صورت میں وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کو اگر زیادہ مقدار مثلاً دو قلعے یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ہاں اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ، بو یا مزہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿أَبُو أُمَامَةَ الْبَاهِلِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ﴾: ابو امامہ کنیت۔ امامہ حمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ باہل قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے باہلی کہلائے۔ ان کا نام صدی (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی پھر حصص کی جانب منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات ۸۱ یا ۸۶ھ میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔

(۴) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلْتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ». وَفِي لَفْظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أَخْرَجَهُ الْأَزْهَقِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ وَابْنُ جِبَانَ وَالْحَاجِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب پانی کی مقدار دو بڑے منکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔“ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ ”پانی نجس (نپاک) نہیں ہوتا۔“ (اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلنین﴾ ”قاف“ کے پیش اور ”لام“ کی تشدید۔ بڑے منکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ لیکن عرب میں حجر کے منکے مشہور و معروف تھے۔ شعراء نے اپنے اشعار میں بکثرت اس کا استعمال کیا ہے اور امثال میں بھی اسے بہت بیان کیا ہے۔ اس طرح حدیث میں بیان شدہ منکے سے مراد یہی حجر کا منکا ہے اور دوسرا کوئی مراد نہیں ہو سکتا اور ان کے منکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سامنے کی گنجائش تھی لہذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانہ کے پیمانہ کے مطابق دو سو ستائیس کلو گرام ہوتی ہے۔ ﴿یحمل الخبث﴾ الخبث میں ”خاء“ اور ”باء“ دونوں پر زبر ہے۔ معنی اس کے نجاست اور گندگی کے ہیں۔ ﴿لم یحمل الخبث﴾ کے معنی ہیں کہ پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا، قبول کرنے سے انکاری ہے اور صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے وہ نپاک ہوتا بھی نہیں۔ وفی لفظ ﴿لم ینجس﴾ میں ایک قرأت کے مطابق تو ”جیم“ پر زبر (فتح) ہے اور دوسری قرأت کے مطابق پیش (ضمہ) ہے، دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (منکوں) سے کم ہوگی تو نجاست کے اس میں محض گرنے سے ہی وہ نپاک ہو جائے گا۔ خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ اور اس کی مقدار قلتین (منکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی۔ تو محض وقوع نجاست سے وہ نپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو پاک کرے گا اور جب ان اوصاف ثلاثہ (بو، ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف اس کی وجہ سے رونما ہوگا تو وہ پانی نپاک شمار ہوگا۔ جیسا کہ ابوامامہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

جہاں تک ”بشر بضاعۃ“ والی حدیث کا تعلق ہے اس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ اس میں پانی دو قلوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث کے ایک جم غفیر امام شافعی رحمہ اللہ، ابو عبیدہ رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ، طحاوی رحمہ اللہ، ابن حبان رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ، ابن مندہ رحمہ اللہ،

حاکم رحمہ اللہ، خطابی رحمہ اللہ، بیہقی رحمہ اللہ، ابن حزم رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے قوت المختاری میں نقل کیا ہے۔ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی کثیر کے زمرہ میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احناف کا ”دو درود“ کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

معلوم ہوا کہ کھڑے پانی میں نہ تو نجاست ڈالی جائے اور نہ جنبی نہائے۔ پانی اگر دو قلوں سے کم ہو تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے، چاہے اس کا رنگ، بو اور مزہ بدلے یا نہ بدلے اور اگر دو قلوں سے زیادہ ہو تو اس وقت تک پلید نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ، بو اور مزہ نجاست پڑنے سے بدل نہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ زاہد اور وسیع علم کے مالک تھے۔ صغریٰ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوہ خندق میں شریک ہوئے۔ ۳۷ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طویٰ نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ». أخرجه مسلم. وللبخاري: «لَا يُولُوْهُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لَا يَغْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». ولمسلم: «منه» ولأبي داود «وَلَا يَغْتَسِلُ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔“ (مسلم) اور بخاری کے الفاظ ہیں کہ ”تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔“ صحیح مسلم کے الفاظ فیہ کے بجائے منہ ہیں یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل کرے اور ابو داؤد کے الفاظ ہیں ”ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ“ یعنی ”جنابت لاحق ہو جانے کی صورت میں اس میں غسل نہ کرے۔“

لعنوی تشریح: ﴿الدائم﴾ ایسا ساکن جو بہتانا ہو ﴿جنب﴾ جمیم اور نون کے ضمہ (پیش) کے ساتھ۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہو۔ ﴿ثم یغتسل فیہ﴾ اس میں ثم دوری ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور ﴿یغتسل﴾ میں پیش (رفع) بھی جائز ہے، مبتدا مخذوف ”هو“ کی خبر ہونے کے اعتبار سے اور سکون (جزم) پڑھنا بھی جائز ہے ﴿لا یغتسل﴾ کی نہی پر عطف کی وجہ سے اور زبر (نصب) پڑھنا بھی جائز ہے، (ان) پوشیدہ (مقدور) مان لینے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت میں ”فیہ“ کی جگہ ”منہ“ ہے اگر ”فیہ“ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس

پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے اور ”منہ“ ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہیں ہے۔ بہر حال مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے دونوں کی ممانعت ہے۔ ابو داؤد کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر ممانعت ہے یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ دونوں عمل ہی ممنوع ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر و تبدل کا موجب ہوگا۔ پس نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک و نجس نہیں ہوتا۔

(۶) وَعَنْ رَجُلٍ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ اِيك ايسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ كَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَغْتَسِلَ صَحْبَت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، اَوِ الرَّجُلُ مَنَعَ فَرَمَا ہے کہ ”عورت“ مرد کے بچے ہوئے غسل بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلِيَعْتَرِفَا جَمِيعًا. كے پانی سے غسل کرے یا مرد، عورت کے باقی ماندہ اَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمِيُّ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ. غسل کے پانی سے غسل کرے۔ ہاں دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں۔ (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں) “

(ابو داؤد و ترمذی۔ اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن رجل صحب﴾ صحب باب سمع يسمع سے فعل ماضی ہے اور اس مرد کی صفت میں واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں، کیونکہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ ”الصحابہ کلہم عدول“ کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اور ﴿بفضل الرجل﴾ سے مراد ہے کہ آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ ﴿وليغتربا جميعا﴾ میں ”لام“ امر کا ہے اور ﴿اغترفا﴾ کے معنی ہیں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی لینا۔ یعنی دونوں چلو سے پانی لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نہی سے مراد نہی تزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑ سکتا ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا بدل بن جاتے ہیں اس میں چونکہ کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

اگر خاوند و بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے پانی لے کر نہائیں تو جائز ہے۔ لیکن صرف خاوند یا صرف بیوی کے غسل جنابت کے بعد اس کا بچا ہوا پانی دوسرے کیلئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے،

تاکہ دونوں کے ذہن میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. وَلاَ ضَحَابُ السَّنَنِ: اغْتَسَلَ بِغَضُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ لِيَغْتَسِلَ مِنْهَا، فَقَالَتْ لَهُ: إِنِّي كُنْتُ جُنْبًا، فَقَالَ: إِنَّ الْمَاءَ لَا يَجْنُبُ. وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیا کرتے تھے۔ (مسلم) اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے ایک نے ٹب نہا برتن میں غسل کیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے کہ اس میں باقی بچے ہوئے پانی سے غسل فرمائیں تو اس نے آپ سے عرض کیا کہ میں نے اس میں حالت جنابت سے غسل کیا ہے تو آپ نے فرمایا ”پانی ٹپاک نہیں ہوتا۔“ (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿لاصحاب السنن﴾ سے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، اسی طرح داری، دارقطنی، ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ ﴿جفنة﴾ ”جیم“ کے فتح اور ”فاء“ کے سکون کے ساتھ۔ ایک بڑا سا پالہ اور عام لوگ اسے ”اجانہ“ (یعنی چڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ ﴿یغتسل منها﴾ یعنی اس کے پانی سے ﴿فقال: انی كنت جنبا﴾ سے مراد ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ ﴿لا یجنب﴾ میں جنب سمع اور کرم دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب اکرام سے ہو۔ اس کا معنی ہے کہ جنبی کے کسی پانی والے برتن سے پانی لے کر غسل کرنے کی وجہ سے وہ پانی ٹپاک نہیں ہو جاتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کو یہ شک پیدا نہ ہو کہ یہ حدیث پہلی کے مخالف ہے۔ درحقیقت امت کی سہولت اور آسانی کیلئے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے اور پہلی ترک اولیٰ پر۔

رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور آپ دونوں ایک برتن سے پانی لے کر نہاتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری سند سے واضح ہے۔ اصحاب سنن والی روایت بلحاظ سند ضعیف ہے۔ لہذا راجح یہی ہے کہ خاوند اور بیوی دونوں اکٹھے تو ایک برتن سے پانی حل کر نہا سکتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ نہانے کی صورت میں ایک کو دوسرے کا بچا ہوا پانی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما﴾ ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ

(میمونہ رضی اللہ عنہ) میمنہ بنت حارث الحللیہؓ - رسول اللہ ﷺ نے ۷ھ میں عمرہ القضاء کے موقع پر ان سے نکاح کیا۔ ۶۱ھ یا ۵۱ھ یا ۶۲ھ کو وفات پائی۔

صاف کرنا چاہئے۔“

حاصل کلام: ترفدی کی یہ عبارت کہ اخراہن او اولاہن غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے ورنہ ایسا نہیں کہ دھونے والے کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ چاہے پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرے یا آخری مرتبہ اور اولاہن کا لفظ بکثرت روایات میں آنے کی وجہ سے اور خاص طور پر بخاری و مسلم کے روایت کرنے کی وجہ سے رائج ہے۔ یعنی اس بات کو ترجیح ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنا چاہئے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کتے کا منہ، اس کا لعاب و دہن اور اس کا جوٹھا نجس و ناپاک ہے اور یہی اس کے سارے بدن کے نجس و ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور برتن کے سات مرتبہ دھونے کو واجب ٹھہراتی ہے اور مٹی کے ساتھ صاف کرنا بھی واجب ہے۔ یہی محققین کی رائے ہے اور بعض نے کہا

کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرنا مندوب ہے واجب نہیں اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست کے ازالہ کیلئے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ نجاست کے علاوہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی حکمت اور ہو۔ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلہ سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے ارد گرد بالوں کے ساتھ ان میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا وجود صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہے جیسا یورپین اقوام اور اس کے مقلدین عموماً ایسا کرتے ہیں تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورد و نوش کے وقت آسانی سے اس کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس انسان کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس سے جراثیم نکل کر معدہ کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل، دماغ اور پھیپھڑے کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے وقت درکار ہے اور انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے۔ ایسے آلات کے ذریعہ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شرعاً اسے نجس و ناپاک قرار دینا اور سات مرتبہ دھونا برتنوں کی صفائی اور نظافت کیلئے ہے تاکہ مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے اور یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔

(احکام الاحکام شرح عمدة الاحکام لابن دقیق العید، ج ۱، ص: ۲۷) خورد و نوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہ لانا چاہئے اسے گرا دینا چاہئے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ مسلم کی ایک روایت میں تو ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دار قطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہئے، حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا فتویٰ یہ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ لہذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے، وہی رائج ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتویٰ سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری، ج ۱، ص: ۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر یہاں حدیث مرفوع

اور صحیح کے مقابلہ میں ان کے مروج فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم نے اس سلسلے میں علامہ عینی رحمہ اللہ اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ کے اعتراضات بارودہ کا کافی و شافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعیۃ، ج ۱، ص: ۴۴۹-۴۵۴)

(۹) وعن أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ فِي الْهَرَّةِ: «إِنَّهَا لَبَسَتْ بَنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَافِينَ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ الْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ”وہ نجس فی الہرۃ: «إِنَّهَا لَبَسَتْ بَنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَافِينَ عَلَيْكُمْ»۔“ (اس روایت کو چاروں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فی الہرۃ﴾ اس کا مطلب ہے کہ بلی کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ہرۃ کے علاوہ اسے قط اور سنور بھی کہتے ہیں۔ ﴿الطوافین﴾ ”واو“ کی تشدید۔ واحد اس کا طواف ہے اور یہ ایسا جانور ہے جن کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے اور وہ گھر کا خادم ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہ دینے سے مقصود یہ اشارہ کرنا ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلہ میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کیلئے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور وقت کے دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے کی بدولت ہی اس کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا۔ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی تو حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تاکہ بلی آسانی سے اور سیر ہو کر پی لے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ”بلی نجس نہیں ہے۔“ اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ابوقتادہ رحمہ اللہ﴾ ابو قتادہ رحمہ اللہ ان کی کمیت ہے۔ اصل نام حارث بن ربیع ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی رحمہ اللہ ہیں۔ (فارس رسول اللہ ﷺ) کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوہ احد وغیرہ میں شریک جنگ رہے۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۰ھ بعض نے ۵۴ھ بیان کیا ہے۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔ (تمذیب الاصابہ)

(۱۰) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ، أَيْكُ بَدْوِيٍّ، يَأْتِي الْمَسْجِدَ كَوْنَهُ فِي مِثْلِ شَبَابِ كَرْنَا

فَبَالَ فِي طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ شروع کر دیا تو لوگوں نے اسے ڈانٹا۔ لیکن نبی ﷺ النَّاسُ، فَتَهَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا، جب وہ بدوی فلما قَضَى بَوْلَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرت ﷺ نے پانی کا بِذُنُوبٍ مِنْ مَّاءٍ فَأَهْرِيقْ عَلَيْهِ. مَنَعُوا ایک ڈول طلب فرمایا اور اس جگہ پر بہا دیا (جہاں اُس نے پیشاب کیا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعرابی﴾ اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی و دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذوالخویصرہ یمانی تھے اور وہ بڑے پیٹ والے آدمی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ ﴿طائفة المسجد﴾ مسجد کا کوئی کونہ یا کنارہ۔ مسجد کی کسی جانب۔ ﴿فزعجه الناس﴾ لوگوں نے اسے ڈانٹا، جھڑکا، سختی سے منع کیا۔ ﴿فنهاهم رسول الله ﷺ﴾ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا مرد کی شرم گاہ کیلئے ضرر رساں ہے اور بااوقات ایسا کرنے کی وجہ سے گردہ اور مثانہ کا خبیث مرض لاحق ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی آپؐ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ پیشاب کا منقطع کرنا بدن، لباس اور مسجد کے دوسرے حصے جہاں پیشاب نہیں کیا کے نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ادھورا پیشاب لے کر بھاگ کھڑا ہوتا تو اس کے اپنے کپڑے اور بدن کے علاوہ مسجد کے دوسرے حصوں میں پیشاب کے چھینٹوں کا گرنا ممکن تھا جس سے گندگی زیادہ پھیلتی۔ ﴿بذنوب﴾ ذال کے زبر کے ساتھ۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ ﴿فاهريق﴾ دراصل اریق تھا ”ہا“ کو حمزہ سے بدل کر اس پر مزید ایک حمزہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں انڈیل دیا گیا۔

حاصل کلام: ترمذی نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے نیز یہ بھی مسئلہ ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ زمین نرم و سبیل ہو یا سخت و صعب۔ مزید برآں اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام، نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا سختی اور درشتی نہ کرنا، حضور ﷺ کا حسن خلق اور نہایت عمدہ طریقہ سے تعلیم دینا وغیرہ باتیں نمایاں ہیں۔

راوی حدیث: ﴿حضرت انس رضی اللہ عنہ﴾: حضور ﷺ کے خادم خاص ہیں ان کی والدہ ام سلیم نے آپؐ کی خدمت کیلئے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ مدنی زندگی میں آخری سانس تک خدمت کرتے رہے۔ ابو حمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلہ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ وہ ۹۱ھ کو فوت ہوئے اور بصرہ میں ہی دفن ہوئے۔

(۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مِيتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمِيتَتَانِ فَالْجَرَادُ وَالْحُوْتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطَّحَالُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبْنُ مَاجَةَ، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ دو مری ہوئی چیزیں (جنہیں ذبح نہ کیا گیا) ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔ باقی رہے دو خون تو اس سے مراد ایک جگر اور دوسری تلی ہے۔“ (احمد اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں کمزوری ہے)

حاصل کلام: مصنف نے اس روایت کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مرجائیں خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ، وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند عبدالرحمن بن زید بن اسلم وہ اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ جیسا کہ امام ابو زرعہ اور ابوحاتم نے کہا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد یعنی عبداللہ اور عبدالرحمن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان (یعنی زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے البتہ امام احمد بن حنبل ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ گو اس حدیث کا سند موقوف ہونا صحیح ہے، مگر یہ مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا ”أُحِلَّتْ لَنَا“ کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے یا ”حرم علینا“ کہنا اسی طرح حکماً مرفوع ہے جیسے ”أمرنا“ یا ”نہینا“۔

یہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ ٹڈی ہر صورت حلال ہے۔ خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سبب سے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث بالا امام صاحب کے فتویٰ کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کی تردید کرتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو خواہ دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو۔ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مرجائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو حلال نہیں حرام ہے۔ حدیث بالا احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداؤد کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دل دونوں حلال ہیں چاہے خود مرجائیں یا کسی طریقہ سے مار دیا جائے دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں، ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مِيتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمِيتَتَانِ فَالْجَرَادُ وَالْحُوْتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطَّحَالُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبْنُ مَاجَةَ، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جب تمہارے کسی

مشروب میں کبھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہئے اس لئے کہ اس کے ایک پر میں مرض (کے جراثیم) ہوتے ہیں اور دوسرے میں شفا و علاج کے۔“ (اس کو بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔) ابوداؤد کی روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ کبھی مشروب میں اپنا وہ پر ڈبوئی ہے جس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

﴿إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابٍ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءٌ، وَفِي الْآخَرِ شِفَاءٌ﴾. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَزَادَ: «وَأِنَّهُ يَنْقِي بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

لغوی تشریح: ﴿الذباب﴾ پیش اور تخفیف کے ساتھ۔ سب کے جانی پہچانی۔ یعنی کبھی۔ ﴿شراب﴾ پینے کا ہر مشروب۔ ﴿فلیغمسه﴾ ”میم“ کے زیر کے ساتھ۔ ﴿غمس﴾ سے۔ ”غمس“ کے معنی پانی یا مائع یعنی بننے والی چیز میں غوطہ لگانا، ڈبکی مارنا۔ ﴿لینزعہ﴾ نزع سے۔ باہر نکالنا، کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں پر لام، لام امر ہے اور معنی ہوئے کہ غوطہ دینا اور نکالنا چاہئے۔ ﴿والجنح﴾ سے مراد پر، جس کے ذریعہ پرندہ پرواز کرتا ہے، اڑتا ہے۔ ﴿داء﴾ بیماری اور مرض اور ایک روایت میں ”سما“ بھی منقول ہے۔

حاصل کلام: ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ کبھی اپنا وہ پر بچا کر رکھتی ہے جس میں بیماری اور مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یعنی کبھی جب مشروب میں پر ڈالتی ہے تو اپنا بیماری والا پر اس لئے ڈالتی ہے کہ اپنا آپ بیماری سے بچالے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ ہے کہ کبھی زہر والا پر آگے کرتی ہے اور جس میں شفاء ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ غوطہ دینا اور ڈبکی دے کر نکالنے میں مقصود بیماری کو توڑنا اور زہر کو شفا کے ذریعہ زائل کرنا ہے۔

حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کبھی اگر کسی سیال چیز میں گر کر مرجائے تو وہ نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس میں بننے والا خون ہی جسم میں موجود نہ ہو۔ مثلاً شہد کی مکھی، مکڑی، بھڑ وغیرہ اور انہیں سے ملتے جلتے دیگر پرند۔ تو ان کے کسی مشروب یا بہہ نکلنے والی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس اور ناپاک نہیں ہو جاتا، کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو بہہ جانے والا خون ہے جو اس کی موت کے وقت جسم سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور مذکورہ حیوانات میں یہ سبب یعنی خون ہی موجود نہیں۔ اس لئے ان کے مائع قسم کی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفع ضرر کیلئے کبھی کا مارنا جائز ہے ورنہ بغیر کسی ضرورت معقول کے کسی کو مارنا ناروا فعل ہے۔ یہ تو معلوم حقیقت ہے کہ اکثر اوقات کبھی گرم چیز میں گر کر مر ہی جاتی ہے اور بعض اوقات ٹھنڈی چیز میں ڈبکی دینے سے بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پینے کی کسی چیز میں کبھی کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہیں ہو جاتی بلکہ اس صورت میں اسے ڈبکی دے کر باہر پھینک دینا

چاہئے۔

(۱۳) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا قُطِعَ مِنَ الْبَهِيمَةِ، وَهِيَ حَبِئَةٌ، فَهُوَ مَيْتٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور وَالتَّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿ما قطع﴾ یہاں ”ما“ موصولہ ہے اور ”قطع“ فعل بنی مفعول کے لئے ہے۔ یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا۔ ﴿البہیمۃ﴾ ہر چار پاؤں پر چلنے والا جانور مگر چیر بھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ ﴿وہی حیۃ﴾ اس میں ”واو“ حالیہ ہے یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا بلکہ زندہ ہو۔ ﴿فہو﴾ سے مراد زندہ جانور سے جو کچھ کاٹ کر الگ کر لیا گیا وہ مردہ ہے، اس کا کھانا حرام اور نجس ہو جاتا ہے۔ پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

حاصل کلام: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کانا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے۔ لہذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو واقد لیثی﴾ ابو واقد کنیت ہے اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنی عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں اس لئے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بدر کے غزوہ میں شریک تھے۔ بعد میں مکہ کی رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ھ / ۶۸ھ میں وفات پائی۔ جبکہ ان کی عمر ۵۷ برس تھی۔ فسنج میں مدفون ہوئے۔

برتنوں کا بیان

۲ - بَابُ الْآيَةِ

(۱۴) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَشْرَبُوا فِي آيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الْآخِرَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور ان کے پیالوں میں کھایا بھی نہ کرو۔ دنیا میں یہ کافروں کیلئے ہیں اور آخرت میں فقط تمہارے لئے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الانیۃ﴾ انیۃ کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ ”ابواب الطہارت“ کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنہیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاکباز

انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿صحافہا﴾ صحاف صحفہ کی جمع ہے جس کے معنی پیالہ کے ہیں۔ ﴿لہم﴾ سے مشرکین مراد ہیں۔ ﴿فی الدنیا﴾ یعنی دنیا میں یہ برتن ان کیلئے ہیں، کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کیلئے حلال ہیں بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ جس پر یہ مشرکین عملاً کاربند ہیں۔ یعنی دنیا میں یہ برتن مشرکین کے استعمال میں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا، پینا حرام ہے اور ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا عموم کے اعتبار سے حرام ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں، ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اہرات و یا قوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا اور پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہر حال بہتر اور اولیٰ ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا ان برتنوں کے پانی سے وضو و غسل کرنا سب حرام ہے۔ راوی حدیث: ﴿حضرت حذیفہؓ﴾: حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابی باپ یمانؓ کے بیٹے ہیں اور راز دان رسالت مآب ﷺ کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمانؓ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۶ یا ۳۵ھ میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(۱۵) وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ بَرْتَنٍ فِي جَنَّمَ كَيْفَ يَشْرَبُ فِي إِنَاءِ الْفِضَّةِ» (بخاری و مسلم)۔
حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اندیلتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بجرجر﴾ ”جرجرہ“ سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت گلے میں پانی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے ”جرجرہ“ کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کیلئے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نار جہنم کا ایدھن ہوں گے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلمہؓ﴾ ان کا نام ہند بنت ابی امیہ۔ ابو سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسود الخزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں۔ غزوہ احد میں ابو سلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے یہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ھ میں حضور ﷺ نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ ۵۹ھ میں یا ۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ بقیع قبرستان میں

دفن ہوئیں۔

(۱۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا دُبِغَ الْإِهَابُ فَقَدْ حُزِرَ» (مسالہ لگا کر) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو طہر۔ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الْأَرْبَعَةِ جاتا ہے۔ (مسلم) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ ”جو نسا چمڑہ بھی رنگا جائے۔“

لعنوی تشریح: ﴿دبغ﴾ دباغ سے ماخوذ ہے۔ یہاں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ چمڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدبو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ ﴿الاہاب﴾ بروزن کتب۔ مطلق چمڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ہنوز رنگ نہ گیا ہو۔ ﴿ایما اہاب دبغ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام چمڑے شامل ہیں۔ ”ایما“ عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

حاصل کلام: پس حدیث اپنے عموم پر رہتے ہوئے یہ مطلب دے رہی ہے کہ ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چمڑے اس میں شامل ہیں اور خنزیر یعنی سور کا چمڑہ بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی اس زمرے میں شامل ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چمڑا بھی اس میں شامل ہے جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چمڑہ پاک ہو جاتا ہے، وہ چمڑہ خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا ہو، جانور خواہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چمڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا، مثلاً خنزیر کا چمڑہ ہے اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چمڑہ ہے اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے، تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انہیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح رائے نہیں ہے اسی طرح احناف کا کہنے کے چمڑے کو دباغت کے بعد حلال قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ، بال، دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جاسکتی ہیں نیز ان کی تجارت بھی کی جاسکتی ہے۔

(۱۷) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ حَدَّثَنَا عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ الْمَيِّتَةِ» (مردہ جانوروں کے چمڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔) (ابن حبان طہورہا۔ صَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ۔ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿سَلَمَةُ﴾ ”سین“ ”لام“ اور ”میم“ کے زیر کے ساتھ۔ ﴿المحبس﴾ ”میم“ کی پیش، حاء کی زیر، ”باء“ کی تشدید اور زیر کے ساتھ، مگر محدثین ”با“ پر فتح کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابوسفیان ان کی کنیت ہے۔ بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ ہذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ہذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انہیں ان کے بیٹے ”نان“ کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے فرمایا۔ جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔

(۱۸) وَعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ لَوْ أَخَذْتُمْ إِيَّاهَا فَقَالُوا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ، فَقَالَ: سَأَخْرِجُهُ أَبَا بَطْرُهَا الْمَاءِ وَالْقَرْطُ. أَخْرَجَهُ أَبُو هَوَيْ. اس پر وہ بولے، (حضور ﷺ) وہ تو مری ہوئی ہے۔ آپ نے (یہ سنکر کر فرمایا پھر کیا ہوا؟) ”اس کو پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دیتی ہے۔“

(ابوداؤد - نسائی)

لغوی تشریح: ﴿القرط﴾ ”قاف“ اور ”راء“ کے زیر کے ساتھ۔ کیکر کے پتے، چھال۔ عرب میں اس کے ساتھ چمڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔ حاصل کلام: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے برتنوں سے وضو وغیرہ بھی جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ مردار چوپایوں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے لہذا ایسی کھال سے ڈول وغیرہ بنانا جائز ہے۔

(۱۹) وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الْخُسَنِيِّ حَضَرْتُ ابُو ثَعْلَبَةَ خُسَنِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِ هَيْسِ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا بِأَرْضِ قَوْمٍ أَهْلُ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي أَنْبَتِهِمْ؟ قَالَ: «لَا تَأْكُلُوا فِيهَا إِلَّا أَنْ لَا تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاغْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا». ان کے ماسوا اور برتن میسر نہ ہو سکیں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿انا﴾ مزہ کے کسرہ ”نون“ کی تشدید کے ساتھ، ضمیر متکلم کے ساتھ حرف تاکید ہے، ﴿اہل الکتاب﴾ کتاب والے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور یہ لفظ ان کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ ﴿افساکل فی انیتھم﴾ ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب پیتے ہیں۔ ابو داؤد اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت و وضاحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے پینے کے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ”پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ، پیو۔“ آپؐ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خورد و نوش سے احتراز کرنا چاہئے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آجائے۔ پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو پھر بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کیلئے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کیلئے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندگی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا، ان میں پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ناپاک اور نجس چیزیں ان میں پکاتے ہیں۔ جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود، دہریوں اور ملحدوں کے ان برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہئے جن میں ناپاک و نجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راوی حدیث: ﴿ابو ثعلبۃ الخشنی﴾ ”خاء“ کے پیش اور ”شین“ کی زیر کے ساتھ، خشین بن نمیر جس کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا، کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشنی کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۵۷ھ میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ہیں کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ﷺ وَأَصْحَابَهُ تَوَضَّؤُوا مِنْ مَرَادَةٍ مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر اس سے امْرَأَةً مُشْرِكَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ وضو کیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ظہور ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مَرَادَةٍ﴾ میم کے زبر اور زائے معجم کے ساتھ۔ مشکیزہ کے معنی میں آیا ہے۔ جس کی

حاصل کلام: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے بھی زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی جانب راہنمائی ملتی ہے اور یہ اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزہ سے آپؐ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضہ میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذباح تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز و درست ہے اور اس حدیث سے دباغت شدہ کھال کے پاک ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمران بن حصین رضی اللہ عنہ﴾ خزاعی کعبی تھے۔ ان کا شمار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ ان کی کنیت ابو نجید تھی۔ غزوہ خیبر کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۱) وعن أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ
 اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ
 انْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً
 مِنْ فِضَّةٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی
 کریم ﷺ کا ذاتی پیالہ ٹوٹ گیا تو آپ نے اس ٹوٹی
 جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿القدح﴾ ”قاف“ اور ”دال“ دونوں پر زبر۔ چھوٹا ”پیالہ“۔ ﴿الشعب﴾ ”شین“ کے زبر اور ”عین“ کے سکون کے ساتھ۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ ﴿سلسلہ﴾ دونوں جگہ سین پر زبر۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا، جوڑنا اور دونوں جگہ سین کے زیر کے ساتھ بھی ہے تو اس صورت میں لڑی، زنجیر وغیرہ کے معنی ہوں گے۔ وہ لوہے کی زنجیر دھاگے کی طرح باریک ہوگی۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کیلئے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورت اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو، غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ سونے، چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور تعلی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور تعلی خالق کائنات کو پسند نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ کو تار کے ذریعہ پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کبر و مغرور اور تعلی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

دور کرنے کا بیان

(۲۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا» بَارِءٌ فِيهِ مِنْ شَرَابٍ سَرَكٌ بَنَانٌ مِنْهُ. (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن الخمر﴾ یعنی حرمت شراب کے بعد۔ شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ﴿خل﴾ ”خاء“ کے فتح اور لام کی تشدید، شراب یا انگور وغیرہ کے شیرہ سے تیار کردہ سرکہ، یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنالینا جائز ہے یا نہیں؟ ﴿فقال: لا﴾ اس کے جواب میں فرمایا ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نئی تحریم کیلئے ہے۔

حاصل کلام: اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔ البتہ اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ شراب جب سرکہ بن جاتا ہے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں کیا رائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن شراب کا سرکہ بنانا ممنوع ہے۔

اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کے حکم آنے کے بعد انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اس نقصان سے بچنے کیلئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں آپ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ اس حدیث (اور دیگر اولہ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمٌ خَبِيرَ أَمْرَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَقَادَى: أَنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِي عَنْ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ، فَإِنَّهَا دُونُ تَمْهِيسٍ غَرِيْبَةٍ لِهَوْنِ كُفْرِهِمْ كَوَافِرٍ مِمَّنْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ. (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

مع فرماتے ہیں، کیونکہ وہ رجس (ناپاک) ہے۔ (بخاری

و مسلم

لغوی تشریح: ﴿یوم خیبر﴾ سے غزوہ خیبر کے روز مراد ہے۔ خیبر مدینہ کے شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم ۷ھ میں یہ غزوہ یہود کے ساتھ واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو یتاء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ﴿ینہیانکم﴾ میں تنبیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ ﴿الحمرة﴾ ”حاء“ اور ”میم“ کے پیش کے ساتھ۔ اس کا واحد حمار ہے۔ اردو میں جسے گدھا کہتے ہیں۔ ﴿الاهلیہ﴾ ”گھریلو (جنگلی نہیں) اہلیہ“ کی نسبت اہل کی طرف ہے یعنی وہ جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کے ہاں پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ ﴿دجس﴾ راء کے زیر سے۔ ہر وہ چیز جسے ایک انسان گندگی تصور کرتا ہے خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو۔ لہذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

حاصل کلام: گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے جازز سمجھتے ہیں۔ گدھے کا جوٹھا ائمہ اربعہ کے نزدیک پاک ہے۔ بعض فقہاء مثلاً امام حسن بصری رضی اللہ عنہ اور امام اوزاعی رضی اللہ عنہ وغیرہ اسے ناپاک کہتے ہیں۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے قابل ترجیح اور زیادہ قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ﴾: ابو طلحہ کنیت۔ نام زید بن سہل بن الاسود بن حرام انصاری، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور اس کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ احد میں حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ہاتھ شل ہو گیا۔ معرکہ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ھ یا بقول بعض ۵۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۴) وعن عمرو بنِ خَارِجَةَ حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: حَظَبْنَا اللّٰهَ ﷺ نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِمَنًى وَهُوَ عَلٰی خُطْبٍ فَرَمَا اور اس اونٹنی کا لعاب دہن میرے رَاحِلَتِيْ، وَلَعَابُهَا يَسِيْلُ عَلٰی كَتِفِيْ. کندھوں پر بہتا تھا۔ (احمد و ترمذی۔ اور ترمذی نے اس کو اُخْرَجَ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحُوْهُ۔ صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿بمنی﴾ تنوین کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ساتھ یہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے مشہور ترین شعائر میں سے قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ﴿لعابها﴾ ”لام“ کے ضمہ کے ساتھ۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی اور گرتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن خارجه بن منتفق اسدی﴾: بقول بعض اشعری اور بقول شخص انصاری اور کسی کے بقول جمحی قبیلے سے ہیں۔ ابوسفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اسدی ہونے کے بارے میں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔

(۲۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا رَوَيْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) منی کو دھویا کرتے تھے۔ پھر اسی کپڑے کو زیب تن فرما کر نماز پڑھ لیتے تھے اور میں دھونے کے نشان اور اثر کو صاف طور پر (اپنی) إِلَى أَثَرِ الْغَسَلِ فِيهِ. متفق علیہ. آنکھوں سے) دیکھتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

ولمسلم: «لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُهُ مِنْ تَوْبِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَرَا، فَصَلَّيْتُ فِيهِ. وَفِي لَفْظٍ لَهُ: «لَقَدْ كُنْتُ أَحْكُهُ بِأَبْسَاءٍ يُطْفِرِي مِنْ تَوْبِهِ».

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپؐ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: ﴿افركه﴾ اس میں ضمیر متصل ”ء“ سے مراد منی ہے۔ راء کے کبھی پیش سے اور کبھی زیر کے ساتھ۔ باب نصر ینصر اور ضرب ینضرب دونوں سے آتا ہے۔ ﴿الفرک﴾ کے معنی مل کر صاف کرنا کہ اس کا اثر زائل ہو جائے۔ ﴿احک﴾ میں بھی ضمیر متصل ہ سے مراد منی ہے۔ ”حاء“ کے پیش کے ساتھ ”حک“ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنا کے آتے ہیں۔ ﴿بابسا﴾ حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

حاصل کلام: اس بارے میں وارد تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ وہ خشک ہو یا تر، بلکہ اس کو زائل کرنے کیلئے جبکہ وہ خشک ہو اتنا کافی ہے کہ اسے صاف کر دے ہاتھ سے یا کپڑے کے ٹکڑے سے یا اذخر گھاس سے اور ان دونوں جیسی چیزوں مثلاً لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے۔ ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تعبداً منی کو دھو کر، ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے، اسے مل کر، رگڑ کر وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کا نجس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا۔ پس صحیح موقف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے لہذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعہ سے اس کو پاک کیا جائے۔

مگر علامہ شوکانی نے السبل الجرار اور الدرر البہیہ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ اس میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آبِ بنی اور لعابِ دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی امام شافعی رحمہ اللہ، داؤد ظاہری رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ ائمہ میں سے اور صحابہ میں سے حضرت علی رحمہ اللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ، حضرت ابن عمر رحمہ اللہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رحمہ اللہ کرتی ہیں اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کرتے ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خشک منی کھرج دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرج دینا ہے، اس کے بعد چونکہ کپڑا دھویا نہیں گیا اس لئے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد، ص: ۱۱۹-۱۲۰، ج ۳ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما﴾: ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی اہ میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ یا ۵۸ھ کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ کثرتِ احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی برأت آسمان سے نازل ہوئی۔ جس کا قرآن مجید کی سورہ نور میں ذکر ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے حجرہ میں مدفون ہیں۔

(۲۶) وَعَنْ أَبِي السَّمْعِ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يُغَسَّلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ، سِرَّةً مَرَّةً وَبَوْلُ الْغُلَامِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابو السمع رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”لڑکی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں گے۔“ (اسے داؤد و التیمی، و صححہ الحاکم)

لغوی تشریح: ﴿من بول الجارية﴾ اس میں ”من“ تعلیل یعنی علت و وجہ کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے، بدن وغیرہ پر لڑکی کے پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ ﴿الجارية﴾ لڑکی، بچی کے معنی۔ ﴿یرش﴾

”دش“ سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور معنی اس کے چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصہ پر پانی غالب آئے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

حاصل کلام: حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں شرعی حکم الگ الگ ہے۔ لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونے کا اور لڑکے کے پیشاب کیلئے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کے پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خواری کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خواری کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، ابن وہب رحمہ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری رحمہ اللہ اور اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دھونا قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوالسمح﴾ ”سین“ پر زبر اور ”میم“ ساکن۔ ابوالسمح اس کی کنیت ہے۔ ایاد (ممرہ کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے خادم تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گم ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲۷) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ حَضْرَتِ اسْمَاءُ بِنْتِ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا روایت کرتی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ هِیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کا خون جو کپڑے کو لگ جائے کے متعلق فرمایا۔ ”پہلے اسے کھرچ ڈالو پھر پانی الثَّوْبَ: ”تَحْتَهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالْمَاءِ، سے مل کر دھو لو پھر اس پر کھلا پانی بہاؤ پھر اس میں ثُمَّ تَنْضَحُهُ، ثُمَّ تَصَلِّي فِيهِ“۔ مَنَفَقَ نماز پڑھ لو۔“ (بخاری و مسلم) عَلَيَّہِ

لغوی تشریح: ﴿تَحْتَهُ﴾ ”تا“ کے فتح ”حاء“ کے ضمہ اور دوسرے ”تا“ کے تشدید اور ضمہ کے ساتھ باب نصرینصر سے صیغہ مؤنث ”حت“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی تلنا اور کھرچنا ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کھرچ کر دور کر دینا اور ”ہ“ کی ضمیر منصوب ”دم“ کی جانب راجع ہے۔ ﴿ثم تقرصه﴾ اس میں ”ہ“ کی ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے ”ر“ پر ضمہ ہے، باب نصرینصر سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا

حاصل کلام: خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے، تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے پھر اسے دھونے کا حکم ہے، تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھا۔ نضح کا اس مقام پر موقع کی مناسبت سے معنی غسل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ باب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔

خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جاسکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول اللہ ﷺ کی بڑی بہن۔
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۳ھ میں اپنے بیٹے عبداللہ کے قتل کئے جانے کے ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت گرا اور نہ ہی عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَتْ خَوْلَةُ: يَا
رَسُولَ اللَّهِ! فَإِنْ لَمْ يَذْهَبِ الدَّمُ؟
قَالَ: «بِكُفْيِكَ الْمَاءِ، وَلَا يَضُرُّكَ
أَثَرُهُ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

لغوی تشریح: ﴿فان لم يذهب﴾ یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے، رگڑنے اور کھرچنے کے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا اثر نہ جائے۔ ﴿يكفيك الماء﴾ یعنی پانی کے ساتھ دھونا تیرے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی تذبذب، تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی ماندہ اثرات و نشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں چونکہ ابن لہیعہ ایک ایسا راوی ہے جسے علماء فن رجال نے ضعیف قرار دیا ہے ورنہ جہاں تک حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے وہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿خولہؓ﴾ خاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابوسلمہ بن عبد الرحمن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبد البر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی۔ مگر مولف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الاصابہ)

وضو کا بیان

۴ - بَابُ الْوُضُوءِ

(۲۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي لِأَمْرَتِهِمْ بِالسَّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ». أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَلَفِظًا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اگر مجھے اپنی امت کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔“ (مالک، احمد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿باب الوضوء﴾ ”واؤ“ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو دھونا۔ مطلقاً اور شرعاً دونوں طرح دھونے کو شامل ہے۔ وضو کا عمل اس سے سب واقف ہیں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر وضو میں ”واؤ“ کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی اس برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

﴿لولا ان اشق﴾ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو کہیں تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ کر دوں۔ ﴿لامرتهم﴾ تو میں ان کو حکم دیتا۔ اس میں امرایجاب کے حکم میں۔ یعنی میں واجب قرار دیتا۔ ایسا حکم صادر ہے۔ فرمانے سے رکنارفع مشقت کی مصلحت کے پیش نظر اس کا مقتضی ہے۔ مسواک کرنا مسنون ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ مسلم اور ابوداؤد میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔ مزید یہ کہ مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ مسند امام احمد، ابن خزیمہ، حاکم اور دارقطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب

بے سواک نماز سے سترگنا زیادہ ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر پہلے سے وضو موجود ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے سواک کر لینی چاہئے تاکہ اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(۳۰) وَعَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ
 رضي الله تعالى عنه: أَنَّ عُثْمَانَ
 دَعَا بَوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَيْهِ ثَلَاثَ
 مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضَّمَصَ وَاسْتَنْشَقَ
 وَاسْتَنْشَرَهُ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ
 مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى
 الْمِرْفَقِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى
 مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ
 غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ
 ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلُ
 ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ
 ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وَضُوءِي هَذَا. مَنَعَهُ
 غَلْبُهُ.

لغوی تشریح: ﴿بوضوء﴾ ”واؤ“ کے فتح کے ساتھ۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ ﴿تمضمض﴾ المضمضہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے وہیں گردش کرائے۔ پھر باہر پھینک دے۔ ﴿استنشق﴾ استنشاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کاناک کے داخلی حصہ میں پہنچا کر بذریعہ سانس سے اوپر چڑھانا۔ ﴿استنشر﴾ ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا۔ ﴿المرفق﴾ کمرہ کے ساتھ۔ ”ر“ ساکن اور ”قا“ کی فتح کے ساتھ۔ بازو کی ہڈی یعنی کلائی کے جوڑے بازو کے اوپر والے حصے کا ہڈی کا جوڑے۔ یعنی کہنی۔ ﴿الی الکعبین﴾ ٹخنوں تک۔ پنڈل اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنہیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ ان کا تعلق وضو سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: من توضع نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لا یحدث فیہا نفسہ غفرلہ ما تقدم من ذنبہ۔ کہ ”جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا، پھر اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے اعضاء وضو میں سے ہاتھ منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا

ہے۔ دوسری روایت میں دو، دو مرتبہ اور بعض روایات میں ایک ایک مرتبہ دھونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ محدثین فقہاء نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا واجب اور تین تین مرتبہ دھونا مسنون ہے، دو دو مرتبہ بھی دھولیا جائے تو بھی کافی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ واجب تو صرف ایک مرتبہ دھونا ہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿حمران رضی اللہ عنہ﴾ "حاء" کے ضمہ اور "میم" کے سکون۔ حمران بن ابان۔ حمزہ کے فتح کے ساتھ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک غزوہ میں اسے قید کیا۔ جو مسیب بن نجہ کے حصہ میں آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسیب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ طبقہ ثانیہ سے تعلق رکھتا ہے ثقہ ہے اور ۷۵ھ میں فوت ہوا۔ بعض نے سن وفات ۷۶ھ اور ۷۷ھ بھی ذکر کی ہے۔

﴿عثمان رضی اللہ عنہ﴾ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ - تیسرے خلیفہ راشد، سابقین اولین میں سے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی دو لخت جگر رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں رہیں۔ اسی وجہ سے ذوالنورین کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے۔ جمعہ کے روز جام شہادت نوش کیا۔ یہ ۳۵ھ / ۱۸ ذی الحجہ کا واقعہ ہے۔

(۳۱) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، بَلْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي التَّائِبِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی فرض ہے۔ علماء امت کی غالب اکثریت کا یہی مسلک ہے البتہ امام شافعی رحمہ اللہ مسح میں تکرار کے قائل ہیں اور دوسرے اعضاء کی طرح تین بار مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال ابو داؤد کی ایک روایت سے ہے لیکن اکثر احادیث (جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں) کی بناء پر جمہور علماء کا مسلک ہی رائج ہے اور اقرب الی الصواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن ابی طالبؓ﴾ چوتھے خلیفہ راشد۔ حضرت حسنؓ و حسینؓ کے والد ماجد اور رسول اکرمؐ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ ماسوا جنگ تبوک کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو منصب خلافت پر فائز ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کی صبح کوفہ میں ایک شقی القلب عبدالرحمن بن ملجم نے بے دریغ تین وار کر کے شہید کر دیا۔

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بْنِ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَعْدُكَ

عَاصِمٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

مُتَعَلِّقٌ مُرَوًى هِيَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَظَرَ إِلَى سَرِّهِ فَسَمَحَ بِرَأْسِهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

عَاصِمٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الْوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي لَفْظٍ لَهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدِّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاةِ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ.

ایک روایت میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ آپ سر کے اگلے حصہ سے شروع کر کے ہاتھوں کو سر کے پچھلے حصہ یعنی گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لَعْنُو تَشْرِيحًا: اَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَادْبَرَ یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصہ سے شروع کیا اور سر کے آخری حصہ تک لے جا کر واپس اسی مقام پر لے آئے۔ اس کی وضاحت ﴿بدا بمقدم راسه﴾ کا جملہ کرتا ہے۔ ﴿قفا﴾ سر کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کے پچھلے حصہ کے ساتھ ملحق ہے۔ ﴿رجع﴾ رجوع سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

حَاصِلُ كَلَامٍ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سر کے مسح کا آغاز سر کے اگلے حصہ سے کیا جانا چاہئے۔ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ) کے علاوہ اسحق بن راہویہ کی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت جسے ترمذی نے حسن کہا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پچھلے حصہ سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حائض کی وجہ سے جرح کی ہے۔

رَاوِی حَدِیثُ: ﴿عبداللہ بن زید بن عاصم رحمہ اللہ﴾ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے۔ غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ھ میں معرکہ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ یہاں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ عبداللہ بن زید وہ ہیں جنہوں نے خواب میں اذان سنی تھی۔ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ تھے۔ گویا دادا دونوں کے الگ الگ تھے۔ ابن عبد ربہ کا ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حَضَرْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَدْنِ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْمَحُ بِرَأْسِهِ وَنَظَرَ إِلَى سَرِّهِ فَسَمَحَ بِرَأْسِهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

رضی اللہ تعالیٰ عنہما، فی صِفَةِ بَارِئِیْنِ رَوَايَتِیْنِ هُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَظَرَ إِلَى سَرِّهِ فَسَمَحَ بِرَأْسِهِ وَأَذْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

الْوُضوءِ قَالَ: ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ کیا اور اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت والی انگلیوں کو
وَأَذْخَلَ إِصْبَعِيهِ السَّبَّاحَتَيْنِ فِي کانوں میں داخل کیا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر
أُذُنَيْهِ، وَمَسَحَ بِإِبْهَامَيْهِ عَلَى ظَاهِرِ کا مسح کیا۔ (اس روایت کو ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا
أُذُنَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَّمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)
ابن خُزَيْمَةَ.

لغوی تشریح: ﴿السباحتين﴾۔ ”اصبعیه“ کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اس کا واحد السباحۃ
اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور انگشت وسطی کے مابین ہے۔ ﴿عند التسبیح﴾ چونکہ اس سے
اشارہ کیا جاتا ہے اس بنا پر اسے سباحۃ کہتے ہیں۔ سباحتین، اس کا تنہیہ ہے۔ یعنی دونوں ہاتھوں کی
انگشتہائے شہادت۔ ﴿الابهام﴾ پانچوں انگلیوں میں پہلے نمبر۔ پانچوں انگلیوں سے زیادہ فائدہ بخش اور رسغ
(کٹ) کے زیادہ قریب۔ ﴿ظاہر اذنیہ﴾ سے مراد دونوں کانوں کا بالائی حصہ۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں
پر مسح فرمایا ہے۔ ظاہر سے مراد کان کا وہ حصہ ہے جو سر کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور باطن وہ ہے جو منہ
کے قریب ہوتا ہے۔ ترمذی نے کانوں کے ظاہر اور باطن پر مسح کی حدیث بیان کر کے کہا کہ اہل علم کا
عمل اسی پر ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن عمرو بن العاص بن وائل سہمی قریشی رضی اللہ عنہما﴾
ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب کعب بن لوی پر جاتا ہے۔ اپنے والد سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے۔ اپنے
والد محترم سے صرف تیرہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے پایہ کے عالم فاضل، حدیث کے حافظ اور عابد تھے۔
بکثرت احادیث نبوی ان سے مروی ہیں۔ یہ ارشادات نبوی ﷺ کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ ۶۳ھ یا ۷۰ھ
میں وفات پائی۔ تدفین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مکہ مکرمہ میں، طائف میں اور مصر میں۔

(۳۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول
تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی نیند سے
ﷺ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ بیدار ہو تو تین مرتبہ اپنا ناک جھاڑ کر صاف کرے
فَلْيَسْتَنْشِرْ ثَلَاثًا، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيتُ اس لئے کہ شیطان ناک کے نتھنوں کی ہڈی پر رات
عَلَى خَيْشُومِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. بسر کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

(۳۵) وَعَنْهُ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلَا يَغْسِلُ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ میں مذکور ہے کہ ”تم میں سے جب کوئی نیند سے
حَتَّى يَغْسِلَهَا ثَلَاثًا، فَإِنَّهُ لَا يَذَرِي بیدار ہو تو تین مرتبہ دھونے سے پہلے اپنا ہاتھ پانی

مذکورہ بالا حدیث میں مذکورہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فلا یغمس﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ معنی ہیں کہ داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ اسے واجب قرار دیتے ہیں اور جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ کا دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

حاصل کلام : حدیث میں مذکور لفظ فی الاناء اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کیلئے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لئے ہے البتہ نہراور بڑا حوض و تالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں یہی رائے بیان کی ہے۔

(۳۶) وَعَنْ لَقِيطِ بْنِ صَبْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «أَسْبَغَ الْوُضُوءَ، وَخَلَّلَ بَيْنَ
الْأَصَابِعِ، وَبَالَغَ فِي الاسْتِنْشَاقِ إِلَّا
أَنْ تَكُونَ صَائِمًا». أَخْرَجَهُ الْأَزْهَرِيُّ،
وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ. وَلَا يَبْنِي دَاوُدُ فِي رَوَايَةٍ: «إِذَا
تَوَضَّأْتَ فَمَضِغْ».

"

لغوی تشریح: ﴿اسبغ﴾ اسباغ سے فعل امر ہے۔ اسباغ کے معنی ہیں، 'اعضاء وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔' ﴿خلل﴾ تخلیل سے فعل امر ہے۔ "خلال" یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ ﴿الان﴾ ان کو صائما ﴿روزے دار کو پانی اتنا اوپر نہ چڑھانا چاہئے، تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ ناک کے اندرون پانی مبالغہ سے چڑھانا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اعضاء وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خال کرنا، تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿لَقِيطُ بْنُ صَبْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ "لام" کے فتح اور "قاف" کے کسرہ سے۔ صبرہ "صاد"

حاصل کلام: دائرہی کا خلال نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون ہے واجب نہیں۔

(۳۸) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بَنِي لُئِيٍّ مُدًّا فَجَعَلَ يَذْلُكُ ذِرَاعَيْهِ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپ نے دھونے کیلئے بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اسی﴾ مفعول واقع ہوا ہے۔ ﴿مد﴾ میم کے ضمہ اور وال کی تشدید کے ساتھ۔ پانی کا پیمانہ جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سمائے۔ آج کل کی اصطلاح میں چھ سو گرام وزن بنتا ہے۔ ﴿یدلک﴾ ملتے ہوئے دھونا۔ ﴿ذراعہ﴾ ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو ذراع یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

حاصل کلام: دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اتنے پانی سے وضو کیا اور ایک روایت میں ایک مد سے وضو کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حجازی مد، انگریزی سیر اور کلو سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

(۳۹) وَعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپؐ جو پانی سر کے مسح کیلئے لیتے تھے، کانوں کے مسح کیلئے اس سے الگ

إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضًا. لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ اور مسلم کے ہاں اسی سند سے یہ روایت بایں الفاظ بَلْفَظٍ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلٍ منقول ہے کہ ”آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا“ یعنی نیا پانی استعمال کیا اور یہی مسلم کی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿وہو عند مسلم﴾ سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مسلم کتاب الطہارت باب وضو النبی ﷺ) ﴿من هذا الوجه﴾ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ ﴿بماء﴾ غمزہ مجرور ہے۔ تنوین کے ساتھ۔ گرائمر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور ﴿غیر فضل بدیہ﴾ اس کی صفت ہے اور ﴿الفضل﴾ کے معنی ضرورت سے زائد بچا ہوا یعنی وضو پوری طرح مکمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا، بلکہ مسح کیلئے نیا پانی لیا۔ ﴿وہو المحفوظ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مشروع ہے مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”زاد المعاد“ میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کیلئے نیا پانی لینا ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج ۱، ص ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث سے واقف نہیں جس میں یہ بیان ہو کہ آپؐ نے کانوں کیلئے نیا پانی لیا اور اس پر کلام نہ ہو۔ ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں نافع کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کیلئے نیا پانی لیتے تھے۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا چاہئے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کیلئے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی، ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے کہ فمسح براسہ واذنبہ کہ آپؐ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۴۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے

لغوی تشریح: ﴿غرا﴾ یاتون کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اعراب اس طرح ہے کہ غین پر ضمہ اور راء پر تشدید ہے اور اغر کی جمع ہے اور "اغر" اسے کہتے ہیں جس کے سفیدی ہو اور ﴿غرۃ﴾ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ ﴿محجلین﴾ تحجیل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں دک اور چمک رہے ہوں گے۔ ﴿یطیل﴾ اطالہ سے ماخوذ ہے۔ دراز کرنے، لمبا کرنے اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿غرثہ﴾ اپنی چمک، روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک یانی پہنچنا ضروری و لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچنا۔

حاصل کلام: اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اعضاء وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا مثلاً ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب نہیں سمجھتے، وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین، تین مرتبہ دھوئے اور ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے اور ہر وقت با وضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ اس آخری جملہ کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور فتح الباری میں ہے۔ اس لئے اس سے مقررہ حد سے زائد حصہ کو دھونے پر استدلال محل نظر ہے۔ (اغاثۃ اللہفان، ص: ۲۰۰، ج: ۱)

(۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ يُعِجِبُهُ التَّيْمُنُ فِي تَعْلِهِ وَتَرْجُلِهِ
وَطُهْرِهِ، وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ”رسول اللہ
ﷺ جو تاپہنے، بالوں میں کنگھی کرنے اور وضو کرنے
بلکہ ہر کام کیلئے دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔“
(بخاری و مسلم)

نغوی تشریح: ﴿یَعِجْہ التَّمِینَ﴾ یعنی آپؐ کو وایاں آگے کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ ﴿فَی تَنْعَلْہ﴾

حاصل کلام: آنحضور ﷺ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہونے، نماز سے فارغ ہونے کے وقت سلام پھیرنے، اعضاء وضو کو دھونے، کھانے پینے، مصافحہ کرنے، دودھ دوہنے، لباس پہننے، سرمہ لگانے اور مسواک کرنے کے وقت وغیرہ۔ دور جدید کا مسلمان ان گراں مایہ چیزوں کو فراموش کر بیٹھا ہے اور غیروں کی نقالی میں دائیں کی بجائے بائیں کو پسند کرنے لگا ہے۔ بڑی قابل افسوس بات ہے۔

(۴۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «إِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَاْبْدُؤُوا
بِمَا مِنْكُمْ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ
حُرَيْمَةَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم وضو کرنے لگو تو اپنے
دائیں جانب سے ابتدا کیا کرو۔“ (اسے ابو داؤد، ترمذی،
نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ
نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کو دایاں پہلو ہی پسند اور محبوب تھا۔ خو
دبھی اسی پر عمل پیرا رہے اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ دائیں جانب سے ابتدا کرنی چاہئے۔

(۴۳) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم) وَالْحُقُفَيْنِ . أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .

لغوی تشریح: ﴿بناصیہ﴾ سر کا اگلا حصہ۔ جہاں سے بال کاٹے جاتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں بال اگتے ہیں۔ یہ حصہ پیشانی سے متصل ہوتا ہے۔ ﴿العمامة﴾ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا جاتا ہے اور سر پر باندھنے کیلئے اسے کئی بل دینے پڑتے ہیں۔ ﴿الخفین﴾ خف کا تنزیہ ہے۔ پاؤں میں ٹخنوں تک جو چیز پہنی جائے اسے خف یعنی موزہ کہتے ہیں جو چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ محض پیشانی پر مسح کرنا کافی نہیں اور پگڑی پر مسح کے جہور قائل نہیں۔ مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے کہ آپؐ کبھی صرف ننگے سر پر مسح فرما لیتے اور کبھی پگڑی پر اور کبھی پگڑی اور پیشانی سمیت دونوں پر اور فقط پیشانی پر مسح کرنا آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موزہ پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ پگڑی پر مسح جائز اور درست ہے۔ ہاس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ کچھ مسح سر پر کیا جائے اور کچھ پگڑی پر۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح کیا جائے۔ ترمذی میں منقول ایک صحیح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ،

بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہئے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ”ان الصفاء والمروءۃ“ یعنی سنی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور آیت وضو میں چہروں کا دھونا پہلے مذکور ہے ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں۔ اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ ”سلم“ سے تعلق کی بنا پر انصاری سلمیٰ کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ ۷۳ھ میں ۹۳ برس کی عمر پر کفوت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(۴۵) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ نَبِيَّ كَرِيمٍ ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی ڈالتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ادار الماء﴾ پانی بہانا۔ اس حدیث کی سند میں قاسم بن محمد بن عقیل متروک راوی ہے۔

(۴۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ». (اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان کی بیان کردہ سند ضعیف ہے اور ترمذی نے یہ حدیث سعید بن زید سے روایت کی ہے اور اسی طرح اسے ابوسعید شنیہ سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے

کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں)

لغوی تشریح: ﴿لا وضوء﴾ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ کا پڑھنا وضو کیلئے رکن ہے یا شرط ہے۔ کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے۔ جیسا کہ لا (جو) نفی جنس پر دلالت کرتا ہے) کی ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے گویا کہا ہے کہ اس باب میں کوئی چیز ثابت نہیں مگر اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن الصلاح، ابن کثیر اور علامہ عراقی وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر میں علامہ البانی حفظہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے وضو کی ابتدا میں بھی ہر نوع بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عدا بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔

راوی حدیث: ﴿سعید بن زید رحمہ اللہ﴾ اس سے مراد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہے۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان خوش قسمت دس صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جنہیں لسان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ فاطمہ بنت خطابؓ تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں آنے کا یہ دونوں حضرات ذریعہ اور سبب بنے۔ معرکہ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵۵ھ میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(۴۷) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصْرَفٍ حضرت طلحہ بن مصرف رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالْإِسْتِنْشَاقِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. (اس روایت کو ابو داؤد نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یفصل﴾ یفرق کے معنی میں، جس کے معنی فرق کرنا ہے۔ یعنی آپؐ کلی کرنے کیلئے پانی الگ لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے الگ لیتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کلی کے الگ اور ناک کیلئے الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ مصنف نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس بخاری اور مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کلی بھی کر لیتے تھے، جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آ رہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحہ بن مصرف﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو عبد اللہ ہے۔ مصرف کا اعراب۔ ”میم“ کا ضمہ اور ”راء“ پر کسرہ اور تشدید۔ تابعین میں ثقہ شمار کئے گئے ہیں۔ طبقہ خامہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت ہیں۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کے والد مصرف مجہول الحال ہیں۔

﴿عن جدہ﴾ ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن محمد الیامی رضی اللہ عنہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ ”یام“ کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبد البر کے قول کے مطابق انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

نفوی تشریح: ﴿بمضمض وینشر من الکف الذی یاخذ منه الماء﴾ یعنی چلو بھر پانی لیتے۔ اس میں سے کھلی کرنے کیلئے کچھ پانی منہ میں داخل کرتے اور بقیہ پانی ناک میں چڑھاتے۔ یہ عمل آپؐ تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں ﴿ینشر﴾ سے دراصل استنشاق مراد ہے۔ یعنی پانی ناک میں ڈالنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک ہی چلو پانی منہ اور ناک دونوں کیلئے استعمال ہو سکتا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اس عمل کو حضور ﷺ تین مرتبہ کرتے تھے اور نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ آپؐ ناک بائیں ہاتھ سے جھاڑتے تھے۔ منہ اور ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے داخل کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿من کف واحد﴾ کف مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مراد ہے پانی کا ایک چلو (چلو بھری پانی) آپؐ نے کلی کرنے کیلئے تھوڑا سا پانی منہ میں ڈالا اور باقی پانی ناک جھاڑنے کیلئے ناک میں چڑھایا۔

(۵۰) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِے ہيں كہ نبی كَرِيم

عنه قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا وَفِي قَدَمِهِ مِثْلُ الظُّفْرِ لَمْ يُصْبِهِ الْمَاءُ، فَقَالَ: «ارْجِعْ فَأَحْسِنْ وَضُوءَكَ». (اے ابو داؤد والنسائی۔
 ﷺ کی نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جس کے پاؤں کی ناخن برابر جگہ پر پانی نہ پہنچا یعنی خشک رہ گئی۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ ”واپس جاؤ اور اچھی طرح عمدہ طریق سے وضو کرو۔“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے

روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کیلئے آگ ہے۔ ابو داؤد میں بھی خالد بن معدان سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ جاپہلے تازہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے، مسح ناکافی ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے ان کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

(۵۱) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
 حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ”مد“ پانی سے وضو اور ”صاع“ یعنی چار سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿الصاع﴾ چار مد کا ہوتا ہے اور مد ۳/۱ ارطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجود زمانہ کے پیانہ کے حساب سے ۲۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہر طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کیلئے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

حاصل کلام: وضو اور غسل کیلئے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جتنا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا۔ جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلم میں ایک ”فرق“ پانی سے آنحضور ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ فرق ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً ساڑھے نو سیر پانی آتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں تو یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضور ﷺ دونوں ایک فرق سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ ذکر کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔

(۵۲) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيَسْبِغُ الوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَابِينَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِينَ».

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر یوں کہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور نیز میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، مگر اس کیلئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ اب جس دروازے سے چاہے داخل جنت ہو۔“ (مسلم، ترمذی) اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”اے اللہ مجھے توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں میں سے کر دے۔“

لغوی تشریح: ﴿الافتحت﴾ یہ الاستثناء کا ہے۔ اس سے مراد کلام اول میں جو حصر ہے اس کی نفی مقصود ہے اور ﴿فتحت﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغہ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے جس طرح ماضی کے گزر جانے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لاہدی امر ہے۔ ﴿وزاد﴾ سے مراد یہ ہے کہ ترمذی نے ﴿محمد اعبده ورسوله﴾ نقل کرنے کے بعد ”اللهم اجعلنی... الخ“ کے الفاظ مزید نقل کئے ہیں اور ﴿التواب﴾ میں ”واو“ مشدود ہے جس کے معنی ہیں جو شخص کثرت سے توبہ کرنے والا ہو۔

راوی حدیث: ﴿عمر رضی اللہ عنہ﴾ سے مراد عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ رضی اللہ عنہ۔ کنیت ابو حفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے آفاق ارض کو حکم، عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے سفیر تھے۔ ۶ نبوت ذی الحجہ کو دار ارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ اور بن فاطمہ رضی اللہ عنہ کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے مگر تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق، فارس، شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لولو کے اقدام سے مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ شہادت کا واقعہ ۲۴ھ محرم کا ہے۔

۵ - باب المَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ۔ موزوں پر مسح کرنے کا بیان

(۵۳) عَنْ الْمُعْبِرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: «دَعُهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مَتَّقَ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا، آپ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپ کے موزے اتارنے کیلئے لپکا۔ آپ نے فرمایا ”چھوڑ دو میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔“ پھر آپ نے ان پر مسح فرمایا۔

لغوی تشریح: ﴿فاهویت﴾ میں نے اپنے ہاتھوں سے مدلی، سارا لیا یا پھر یہ معنی ہیں، حالت قیام سے نیچے کی طرف بیٹھے کیلئے جھکا۔ ﴿لانزع﴾ اخرج کے معنی میں ہے کہ میں نکالوں۔ ﴿خفیه﴾ آپ کے موزے پاؤں سے نکالوں۔ ﴿دعہما﴾ اترکد کے معنی میں آیا یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ ﴿طاهرتین﴾ حال واقع ہو رہا ہے معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک ہیں۔ اس لئے موزوں کو نہ نکالو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کئے ہیں اس وقت وہ پاک تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔

(۵۴) وَلِلْأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلَّا النَّسَائِيَّ: نَسَائِيَّ كَ عِلَاوَه بَاقِي سَنَن كِي چَارُون كِتَابُون مِیْن مَغِیْرَه اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ اَعْلَى الْخُفِّ وَفِي اِسْنَادِهْ ضَعْفٌ۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

نسائی کے علاوہ باقی سنن کی چاروں کتابوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہئے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح حسن روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثور بن یزید ہے جو رجاء بن حیوۃ کے واسطے سے بیان کرتا ہے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

(۵۵) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَا الدِّينَ بِالرَّأْيِ دَارُودَار رَائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی چُلی لَكَانَ اَسْفَلُ الْخُفِّ اَوَّلَى بِالْمَسْحِ۔ سطح پر مسح اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں

مِنْ أَعْلَاهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے خود رسول اللہ ﷺ کو موزے کے بالائی حصہ پر ﷺ يَمْسُحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَيْهِ. أَخْرَجَهُ مَسْحُ كَرْتے دیکھا ہے۔“ (ابوداؤد نے اس کو حسن سند کے ابو داؤد بإسناد حسن۔ ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الہی پر ہے عقل و رائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کبھی جائز نہ ہوتا، بلکہ نجلی سطح پر ہوتا، کیونکہ گندگی سے آلودہ نجلا حصہ ہوتا ہے۔ لہذا نص صحیح کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(۵۶) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفَرًا أَنْ لَا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلِيَالِيَهُنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبُولٍ وَنَوْمٍ. أَخْرَجَهُ الثَّيَابِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَابْنُ حُرَيْمَةَ وَضَحَّاهُ

ترمدی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمذی میں منقول روایت کے ہیں۔ ترمذی اور ابن خزیمہ دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: سفر یعنی مسافرین سین کے فتح اور ”فء“ کے سکون کے ساتھ۔ مسافر کی جمع ہے جسے ”رکب“ اور ”تجر“ راکب اور تاجر کی جمع ہے اور ﴿خفاف﴾ خف کی جمع ہے اور ﴿الامن جنابه﴾ اور ﴿ان لا ننزع﴾ میں جو نفی ہے اس سے اشتاء ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں۔ خواہ ابھی مدت پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تین شب و روز مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

حاصل کلام: موزوں پر مسح بلا اختلاف جائز ہے۔ موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہ کی تعداد اسی (۸۰) کے لگ بھگ ہے۔ جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن عبد البر نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تو اتار کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے ان کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے مسافر کیلئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہوگا، موزہ پہننے کے وقت سے نہیں، مثلاً ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کیلئے آغاز مدت

حاصل کلام: بیوں سے مراد ایسی پٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو زخموں کے زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا بازو یا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں انہی کو عصائب کہا جاتا ہے۔ جنگ کیلئے روانہ کرتے وقت اس قسم کا حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران زخمی حضرات اعضاء وضو دھونے کی بجائے زخم کی پٹیوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ابو داؤد میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ نے سردی کی شکایت کی تو آپؐ نے پگڑی اور تساخین پر مسح کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿ثوبان بن جحدہ بن جحدہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ ثوبان کا اعراب۔ ”حاء“ پر فتح ”واو“ ساکن۔ اور بجدہ میں ”با“ کے ضمہ جیم ساکن اور دال اول پر ضمہ اور دال ثانی ساکن اور بن جحدہ میں جیم پر فتح ”حاء“ ساکن، دال پر فتح۔ یہ سراقہ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ حمیر قبیلہ میں سے تھے۔ زندگی بھر حضور و سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجالاتے رہے۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے خرید کر آزادی سے ہمنکار کیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۵۹) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مَوْفُوفًا، وَأَنْسِ مَرْفُوعًا: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبَسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلَا يَخْلَعْهُمَا إِنْ شَاءَ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاجِمُ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ”جب تم میں سے کوئی موزے پہن کر وضو کرے تو ان پر مسح کر لینا چاہئے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے، الا یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔“ (اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿لَا يَخْلَعُهُمَا﴾ یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے انہیں نہ نکالے۔

(۶۰) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلِالْمُقِيمِ يَوْمًا وَلَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبَسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ.

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے مسافر کیلئے (مسح کی مدت) تین دن اور تین راتوں کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات۔ اس حالت میں کہ اس نے با وضو ہو کر موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کر لینا چاہئے۔ (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿ابوبکرہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام نفع (تغیر نافع کی) بن حارث ہے۔ یہ طائف کے قلعہ سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعہ باہر آئے۔ اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ کبار و فضلاء صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھے۔

(۶۱) وَعَنْ أَبِي بِنِ عِمَارَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: يَوْمًا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ثَلَاثَةً؟ قَالَ: نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ.

حضرت ابی بن عمارہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا ”ہاں کر سکتے ہو“ عرض کیا ایک دن؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں ایک دن“ عرض کیا دو دن؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں دو دن“ میں نے عرض کیا تین دن؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں تین دن اور جب تک تیری مرضی ہو“۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے

اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث جو مدت کی تعیین کرتی ہیں کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ چونکہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں مسافر کیلئے تین دن، تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو ”شرح المہذب“ میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں۔ ابن الجوزی نے تو اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن عمارہ رضی اللہ عنہ﴾ حمزہ کے ضمہ ”باء“ کے فتح اور ”یاء“ پر تشدید۔ عمارہ عین کے نیچے کسرہ اور کبھی اوپر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینہ کے انصار میں سے مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر اس کی حدیث و سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

۶ - بَابُ نَوَاقِصِ الْوُضُوءِ

(۶۲) عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ الْعِشَاءَ. حَتَّى تَخْفِقَ رُءُوسُهُمْ، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلَا يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں صحابہ کرامؓ نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی

الدَّارُ قُلْتَنِي، وَأَضَلَّهُ فِي مُنْجِلِهِ۔ اصل مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب نواقض الوضوء﴾ نواقض، ناقض کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ﴿تخفق﴾ نیند کے غلبہ کی وجہ سے جھک جاتے۔ ﴿روسہم﴾ راس کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں سر۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے جب تک انسان گہری نیند نہ سوئے اس وقت تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس سے پہلے صفوان بن عسال کی روایت گزشتہ باب میں گزر چکی ہے جس میں مطلق نیند سے وضو کے ٹوٹنے پر دلالت ہوتی ہے۔ اس روایت کی روشنی میں اس کو بھی گہری نیند پر محمول سمجھا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے نیند سے مراد معمول کی نیند لی ہے اور صحابہ کرام اس نیند سے بھی واقف تھے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس نیند سے بھی جس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی وضاحت اور بیان کی ضرورت نہیں۔ بہر صورت یہ بات معلوم ہوئی کہ نیک یا تکلیہ لگا کر سونے کی صورت میں نیند ناقض وضو ہوگی بصورت دیگر نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ نیک لگانے یا تکلیہ کا سہارا لینے کی حالت میں جسم انسانی کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیٹ سے رت کے خروج کا غالب امکان ہوتا ہے، اسی بنیاد پر احتیاط کے پیش نظر وضو نئے سرے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۶۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ ابْنَتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ هَوْنًا أَوْ عِلْلاً، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهَرُ، أَفَأَدْعُ الصَّلَاةَ؟ قَالَ: «لَا، إِنَّمَا ذَلِكَ عَرَقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلْتَ حَيْضَتِكَ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَذْبَرَتْ فَاعْسِلِي عَنكَ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت تعالیٰ عنہا قالت: جاءَتْ فَاطِمَةُ ابْنَتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ هَوْنًا أَوْ عِلْلاً، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهَرُ، أَفَأَدْعُ الصَّلَاةَ؟ قَالَ: «لَا، إِنَّمَا ذَلِكَ عَرَقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلْتَ حَيْضَتِكَ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَذْبَرَتْ فَاعْسِلِي عَنكَ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

ابی حبیش رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ استحاضہ کے خون میں مبتلا رہتی ہوں، پاک ہوتی ہی نہیں۔ کیا ایسی حالت میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا ”نہیں“ یہ تو ایک رگ ہے (جو پھٹ جاتی ہے اور خون بہتا رہتا ہے) حیض کا خون نہیں ہے۔ ہاں جب ایام حیض شروع ہوں تو نماز کو چھوڑ دو اور جب یہ ایام پورے ہو جائیں تو خون دھو کر نماز پڑھو۔“ (بخاری و مسلم)

اور بخاری میں مزید یہ الفاظ ہیں ”پھر ہر نماز کے لئے وضو کرو“ مسلم نے اشارہ کیا ہے کہ اسے انہوں نے عمداً چھوڑا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿استحاض﴾ صیغہ مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کے اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ ﴿افسار﴾ اس میں مہرہ استفہام کا ہے اور ”فہاء“ تعقیب کیلئے ہے اور ﴿ادع﴾ ودع سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ ﴿انما ذلک﴾ اس میں ”کاف“ کے نیچے کسرہ ہے۔ اس لئے کہ مخاطب عورت ہے اور معنی یہ ہیں۔ خون کا بہنا۔ ﴿عرق﴾ عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ معنی یہ ہوئے رگ سے خون بننے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عازل یا عازر ہے۔ ﴿ولیس بحیض﴾ یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ﴿فاذا اقبلت حیضتک﴾ ”حا“ پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ ﴿فدعی﴾ چھوڑ دو۔ ﴿واذا دبوت﴾ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ فاعل واقع ہو رہا ہے اور ضمیر حیض کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے جب خون بند ہو جائے۔ ﴿ثم توضی لکل صلاۃ﴾ پھر ہر نماز کیلئے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حاصل کلام: عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض کا خون، یہ خون ہر ماہ عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوسرا نفاس کا خون ہے یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن، یا اس سے کم و بیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے، یہ خون متذکرہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے یہ ایک عازل نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے، ساری عمر بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا﴾ حبشہ - حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ قبیلہ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبد العزی بن قصی۔ یہ عبد اللہ بن حبش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انہوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(۶۴) وَعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كُنْتُ کے خارج ہونے کا مریض تھا۔ میں نے مقدار رضی اللہ عنہ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمُقَدَّادَ أَنْ يَسْأَلَ سے کہا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق النَّبِيِّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: فِيهِ دریافت کریں۔ مقدار رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے الْوُضُوءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْحَارِجِ. بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہو گا یا غسل جنابت؟) آپ نے فرمایا ”ایسی حالت

نغوی تشریح: ﴿مذاء﴾ ذال پر تشدید۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی خارج ہوتی رہتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید، رقیق لیس دار پانی ہے جو بیوی سے چھیڑ چھاڑ کے وقت اور جماع کے ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿فامرت الممقداد﴾ مقداد کو مسئلہ کی بابت پوچھنے کیلئے کہا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم رضی اللہ عنہ کی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیاداری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

(۶۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا رَوَيْتُ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ بَعْضِ نِسَائِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَضَعْفَهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ابراہیم تیمی کرتے ہیں مگر ابراہیم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں سنا۔ اس لئے یہ مرسل اور کمزور ہے۔ مگر بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدہ کیلئے جانے سے پہلے میرے پاؤں کو آپ اپنے ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضاء جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ لینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں اور ائمہ میں

سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(۶۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئًا فَأَشْكَلَ عَلَيْهِ، أَخْرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لَا؟ فَلَا يَخْرُجَنَّ مِنَ الْمَسْجِدِ، حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». أخرجه مسلم.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کیلئے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے، تاوقتیکہ (یقین نہ ہو جائے) ہوا کے خارج ہونے کی آواز یا بدبو سے محسوس کرے۔“

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وجد فی بطنہ شیء﴾ اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا۔ گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ ﴿اشکل﴾ مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ ﴿اخرج﴾ ہمرہ اس میں استفہام کا ہے۔ یعنی اسے یہ شک میں مبتلا کر دے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ ﴿فلا یخرجن من المسجد﴾ محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ ﴿حتی یسمع﴾ تاآنکہ وہ ہوا کے باواز خارج ہونے کو سنے ﴿او یجد ریحاً﴾ یا پھر بے آواز ہوا کا پیٹ سے خارج ہونے والی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ اس باب میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم پر قائم رہتی ہے، تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

(۶۷) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسَسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلَاةِ أَعْلَيْهِ وَضُوءٌ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِنْكَ». أخرجه الحنساء، وصححه ابن جبان، وقال ابن المذني: هو ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن مدینی کہتے ہیں

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہئے؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں“ وہ تو تیرے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور

أَحْسَنُ مِنْ حَدِيثِ بُسْرَةَ. (برہ کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوقال﴾ اس میں فاعل وہ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس مرد کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ ﴿الرجل یمس﴾ مبتداء اور خبر ﴿بضعۃ﴾ ”باء“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور ”ضاد“ ساکن ہے معنی اس کے گوشت کا ٹکڑا۔ ﴿منکذ﴾ سے مراد ہے کہ تیرے جسم کا ٹکڑا ہے جس طرح دیگر اعضاء جسم ہیں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصہ کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

حاصل کلام: علی بن عبد اللہ جو ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ اور ابوداؤد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے بہت سے صحابہؓ اور تابعینؓ مس ذکر (یعنی شرمگاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ علی بن عبد اللہ یعنی ابن المدینی اور ابن المبارک اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دوسری طرف بہت سے صحابہؓ و تابعینؓ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں، ان کی دلیل برہ کی روایت ہے جو آئندہ آرہی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿طلق بن علی رضی اللہ عنہ﴾ ابو علی ان کی کنیت ہے۔ ”طاء“ پر فتح، ”لام“ ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی، یحییٰ، یمامی۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اسی وقت یہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبویؐ کی تعمیر میں زور و شور اور شوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

(۶۸) وَعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ بَرَّهَتْ صَفْوَانَ بِسْنِهَا كَتَبَتْ هِيَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَزَلَ فِيهَا فَسَمِعَتْهُ يَقُولُ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». وضو کرنا چاہئے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ أَخْرَجَهُ الْحَمَّصِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَّانَ، ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کی وَقَالَ الْبُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا الْبَابِ۔ رائے یہ ہے کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے)

لغوی تشریح: ﴿من مس ذكره﴾ جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا یا ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ﴿فليتوضأ﴾ اسے وضو کرنا چاہئے یعنی نئے سرے سے نماز کیلئے وضو کرنا چاہئے۔

حاصل کلام: یہ حدیث صریح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے، اس لئے کہ کلام میں ایک مقرر حکم ہے، اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ متیقن

ائمہ جن میں امام شافعی رحمہ اللہ، ابو زرعہ رحمہ اللہ، ابو حاتم رحمہ اللہ، دارقطنی رحمہ اللہ، بیہقی رحمہ اللہ اور ابن جوزی رحمہ اللہ شامل ہیں نے طلق بن علی سے مروی حدیث کو ضعیف اور بسرہ بنت صفوان سے مروی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور جہاں تک ابن مدینی کے اس قول کا تعلق ہے کہ طلق بن علی کی روایت بسرہ کی روایت سے زیادہ بہتر ہے۔ اس رائے کو ائمہ نے قبول نہیں کیا۔ تقریباً اٹھارہ صحابہ کرامؓ سے بسرہ والی حدیث کی تائید میں مروی ہے، مزید برآں یہ کہ بسرہ والی حدیث کی سند کے راوی صحیحین کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور طلق بن علی کی روایت کے سند کے راویوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو صحیحین کے راویوں جیسا ہو اور ابو ہریرہ رحمہ اللہ ان راویوں میں سے ہیں جو مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اور راوی حدیث ہیں۔ یہ طلق بن علی کی آمد کے چھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد اسلام لائے تھے اور طلق بن علی ابتدا ہی میں (جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی) مدینہ میں آئے تھے پھر اپنے وطن یمامہ کی طرف واپس چلے گئے اور حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ ۶ھ کے آخر میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بایں صورت بھی بعد میں حاضر ہونے والے صحابی کی روایت راجح ہے۔

راوی حدیث: ﴿بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا﴾ بسرہ کے باء پر ضمہ اور سین ساکن ہے۔ پورا نام بسرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد بن عبد العزی قرشیہ اسدیہ۔ سابقین صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار تک بقید حیات رہیں۔

(۶۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ يَبْهُوثُ بِرُءٍ يَابِثٍ أَوْ نَدَى يَابِثٍ أَوْ مَذْيٌ، فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَنْبِرْ عَلَى صَلَاتِهِ، وَهُوَ فِي ذَلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَفَهُ أَحْمَدُ چھوڑی تھی اسی پر بنا کر لے۔ بشرطیکہ اس دوران میں اس نے گفتگو نہ کی ہو۔“ (ابن ماجہ نے اسے

روایت کیا ہے اور احمد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿رعاف﴾ ”راء“ پر ضمہ۔ ناک کے راستہ سے جو خون نکلتا ہے اسے ”رعاف“ یعنی نکسیر کہتے ہیں۔ ﴿قلس﴾ ”قاف“ پر فتح اور ”لام“ ساکن۔ خورد و نوش کی کوئی چیز جو منہ کے راستہ سے باہر آجائے۔ ﴿لیسن﴾ اس میں لام، لام امر ہے اور بناء یہ ہے کہ آدمی نے نماز شروع کی ایک یا دو یا زیادہ رکعات پڑھ چکا تھا کہ بے وضو ہو گیا۔ اب تازہ وضو کر کے بغیر کسی قسم کی گفتگو کئے آکر نماز شروع کر دے۔ جتنی پہلے پڑھ چکا تھا انہیں شمار کرے اور باقی ماندہ رکعات پوری کر کے سلام پھیر دے۔ اس بے وضو ہونے سے پہلے کی پڑھی ہوئی رکعات بھی ضائع نہیں جائیں گی اور از سر نو پوری نماز بھی پڑھنا نہیں

پڑے گی۔ ﴿وہو فی ذلک لا یتکلم﴾ اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بناء کیلئے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بناء نہیں کر سکتا، از سر نو پوری نماز پڑھنا ہوگی۔

حاصل کلام: مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں البتہ قے آنے، پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستہ سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بناء کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بناء والی حدیث ضعیف ہے اور مرسل ہے۔ نیز احادیث صحیحہ کے معارض و مخالف بھی ہے، لہذا اس کے ذریعہ حجت قائم نہیں ہوتی۔

ائمہ و فقہاء کا بناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں بناء کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب نمازی بے وضو ہو گیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بناء کس پر ہوگی۔ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ کرامؓ میں سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، جابر بن یزید رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین میں ابن مسیب رحمہ اللہ، کھول رحمہ اللہ اور ربیعہ رحمہ اللہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔

(۷۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوْضَأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ. قَالَ: أَتَوْضَأُ مِنَ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ. أَخْرَجَهُ اور اونٹ کے گوشت سے؟ فرمایا ”اونٹ کا گوشت منہ سے کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿فاتوضاء﴾ حمزہ استفہام اس جگہ حذف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ ﴿من لُحُومِ الْغَنَمِ﴾ یعنی بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔ عام طور پر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا

ضروری نہیں کیونکہ تعدی احکام کی حکمت کا عقل میں آنا ضروری نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”اعلام الموقعین“ ج ۱: ص ۱۳ پر اس کی بڑی عمدہ اور معنوی اعتبار سے بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہراونٹ کی کوہان پر شیطان ہوتا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ جن کی پیدائش آگ سے کی گئی ہے۔ کھانے والے کی مشابہت کھانے کے ساتھ ہوگی۔ لہذا جب اونٹ کا گوشت کھائے گا (اور وہ اس کی خوراک ہوگا) تو اس میں از خود قوت شیطانی پیدا ہوگی۔ اور شیطان کی تخلیق بھی آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی کے ذریعہ بجھایا جاتا ہے۔ حدیث مذکور بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب بندہ اونٹ کا گوشت کھا کر بعد میں وضو کرے گا تو اس کے وضو میں وہ چیز شامل ہوگی جو اس شیطانی قوت کو بجھائے گی تو ایسی صورت میں یہ فساد انگیز چیز زائل ہو جائے گی۔

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ اہل سنت میں اختلاف ہے۔ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابن منذر، ابن خزیمہ وغیرہ محدثین علماء کا یہی مذہب ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو برقرار نہیں رہتا۔ بیہقی اور تمام اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کسی بھی حلال جانور کے گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک وضو برقرار رہتا ہے۔ ان کی دلیل ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان وغیرہ کی روایت ہے۔ یہ حضرات اس حدیث سے وضو سے ہاتھ منہ دھونا مراد لیتے ہیں جس طرح خور و نوش سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھویا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک وضو کا لغوی معنی مراد ہوگا، اصطلاحی معنی نہیں۔ آخری حکم یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کی ضرورت نہیں، مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”امام احمد وغیرہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے مضبوط ہے، ابوداؤد وغیرہ کی حدیث عام ہے اور مسلم کی یہ حدیث خاص اونٹ کے بارے میں ہے اس لئے خاص حکم عام حکم سے مقدم ہے۔“ نیز ایک شرعی لفظ ”وضو“ کو بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿جَابِرُ بْنُ سَمْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ جابر بن سمرہ بن جنادہ مشہور و معروف صحابیؓ ہیں۔ کوفہ میں رہے۔ غالباً ان سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ۷۳ھ میں وفات پائی۔

(۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ غَسَلَ مِيتًا فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ كَرَّ اور جس نے میت کو اٹھایا وہ وضو کرے۔»
حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ (اس حدیث کو احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔
وَالْتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ، وَقَالَ أَحْمَدُ: لَا يَصِحُّ شَيْءٌ تَرْمِذِيٌّ نے اسے حسن کہا ہے اور احمد کا قول ہے کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿قال احمد﴾ سے مراد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ ﴿لا یصح شئی فی هذا الباب﴾ اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں کو دھو لینا ہی کافی ہے۔“ (حاکم، بیہقی)

حاصل کلام: صحیح یہ ہے کہ ﴿من غسل میتا فلیغتسل﴾ میں حکم استحباب کیلئے ہے یعنی میت کو نہلانے والے کیلئے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دارقطنی اور مسند احمد میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن عمر رضی اللہ عنہما، عائشہ رضی اللہ عنہا، حسن بصری رحمہ اللہ، ابراہیم نخعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ فِي اللَّهِ ﷺ نَظَرَ فِي الْحَدِيثِ الَّذِي كَتَبَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَكَ كَرْدِي تَحِي اس مِیں تَحْرِیر تَحَا كَه ”قُرْآن پَاك كُو لِعَمْرُو بْنِ حَزْمٍ: أَنَّ لَا يَمَسُّ پَاكِزَه اِنْسَان (جس نے وضو كِیا هو) هِی هَاتَه لَكَا۔“ الْفُرْقَانَ إِلَّا طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُزْسَدًا، (امام مالِك نے اسے مرسل روایت كِیا هِے، نَسَائِی اور ابن حبان نے اس كُو موصول بیان كِیا هِے، دراصل یہ حدیث معلول هِے)

لغوی تشریح: ﴿الاطاهر﴾ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہوا یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ﴿وهو معلول﴾ مصنف نے اس روایت کو معلول غالباً اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داؤد یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد خولانی ہیں اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس لئے حدیث معلول نہ ہوئی۔ (السل)

حاصل کلام: طہارت دو قسم پر ہے ایک طہارت تو وہ ہے جس کی تعبیر حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا، ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ محض بے وضو ہونے کی صورت میں اختلاف ہے بہتر ہے کہ با وضو ہاتھ لگایا جائے۔ راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ﴾ یہ عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری

برہنہ مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔
 ﴿عمر بن حزم رحمہ اللہ﴾ عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابو ضحاک ان کی کنیت ہے۔ غزوہ
 خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لئے بھیجا کہ وہاں کے
 لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم سکھائیں۔ قرآن مجید پڑھائیں، لوگوں سے ملاقات کی وصولی کیلئے
 حسابات و نصایب ان کو تحریر کر کے سپرد کئے۔ عمر فاروق رحمہ اللہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ جو تحریر نبی
 ﷺ نے ان کو دی تھی اس میں فرائض، سنن، صدقات اور دیات کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی
 طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۵۰ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر
 نَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (ایسے مسلم نے
 ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ. رَوَاهُ روایت کیا اور بخاری نے اس کو تعلقاً نقل کیا ہے)
 مُسْنِمًا، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: مطلب اس کا یہ ہے کہ جماع، بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے باقی
 اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنابت کی حالت کے ماسوا
 قرآن پڑھا کرتے تھے، زبان پاک ہے زبانی ذکر الہی ہر وقت کیا جاسکتا ہے۔

(۷۴) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی
 اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ کریم ﷺ نے کچھنے لگوائے اور نیا وضو کئے بغیر نماز
 احْتَجَمَ وَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے کمزور
 الدارقطني، وَلَيْتَهُ. کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿احتجم﴾ کچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سینگ یا کسی دیگر آلہ کے ذریعہ جسم کے
 حصہ سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں
 کے علاوہ دوسرے کسی ذریعہ سے اخراج خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث
 سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ ﴿لینہ﴾ تسلیں سے ماخوذ ہے۔ جس کے
 معنی کمزوری و ضعف کے ہیں۔ اس کے ضعف کی وجہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا
 راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے قدرتی دونوں راستوں کے علاوہ بدن
 سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ وغیرہ صحابہ کرام اور تابعین عظام
 کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۷۵) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْعَيْنُ وَكَأُ السَّهْ، فَإِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَزَادَ: «وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ».

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”آنکھوں کا کھلا رہنا ریح خارج ہونے کا بندھن ہے جب آنکھ سونے کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ (کھل جاتا ہے) (مسند احمد، طبرانی) (طبرانی نے اتنا اضافہ بھی اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ ”جس شخص کو نیند آجائے وہ از سر نو وضو کرے۔“

وَهَذِهِ الزِّيَادَةُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ عَلِيِّ دُونَ قَوْلِهِ: «اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ» وَفِي كَلَا الْإِسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اتنا اضافہ ابوداؤد کی اس روایت میں بھی ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کیا ہے البتہ اس روایت میں استطلق الوکاء ”یعنی بندھن کھل جاتا ہے“ والی عبارت نہیں ہے۔ (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں)

وَلَأَبِي دَاوُدَ أَيْضاً عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا مَرْفُوعاً: «إِنَّمَا الْوُضُوءُ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً». وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ أَيْضاً.

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے ”وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔“ (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے)۔

لَفَوَى تَشْرِيحُ: ﴿وِكَاءُ السَّهْ﴾ الْوِكَاءُ وَآؤُ پر کسرہ اور کاف پر مد۔ اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿وَالسَّهْ﴾ سین پر فتح اور ”ہا“ مخفف۔ دیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿اسْتَطْلَقَ﴾ کھل جانا۔ ڈھیلا ہونا۔ ﴿مُضْطَجِعاً﴾ پہلو کے بل لیٹ کر۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک ”بقیہ“ نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضعف خفیف سا ہے۔ منذری، نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں موافقت و تطابق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضاء جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان

غالب ہوتا ہے، جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا ایسا نہیں۔ گہری جس صورت میں ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے اس لئے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راوی حدیث: ﴿معاویہ﴾ معاویہ سے مراد معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ ۶۰ھ ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(۷۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «يَأْتِي أَحَدَكُمْ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلَاةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَيْهِ، فَيُحَيِّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحَدٌ، وَلَمْ يُحَدِّثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذَلِكَ فَلَا يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». أَخْرَجَهُ الْبَزَّازُ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ زَيْدٍ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال جاتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا۔ لہذا تم میں سے جب کوئی ایسا محسوس کرے تو رتج کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔“ (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری میں عبد اللہ بن زید اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان جیسے ہی الفاظ مروی ہیں۔

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا: «إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحَدَنْتَ، فَلْيَقُلْ: إِنَّكَ كَذَبْتَ». أَخْرَجَهُ ابْنُ حَبَّانَ بَلْفِظَ: «فَلْيَقُلْ فِي نَفْسِهِ».

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطے سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ ”جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور ذہن میں وسوساں ڈالے کہ تو بے وضو ہو گیا تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔“ اس کو ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ ”وہ شخص اپنے دل میں کہے کہ تو جھوٹا ہے۔“

قضائے حاجت کے آداب کا بیان

۷ - بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الْحَاجَةِ

(۷۷) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. جاتے تو انگشتی (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے)

لعوی تشریح: ﴿باب آداب قضاء الحاجة﴾ قضاء حاجت۔ بول و براز سے کنایہ ہے۔ ﴿الخلاء﴾ ”خاء“ کے فتح اور آخر پر الف ممدودہ۔ خالی جگہ۔ خالی مکان۔ پھر کثرت استعمال میں یہ قضاء حاجت کی جگہ کیلئے بولا جانے لگا۔ (بیت الخلاء) کیونکہ قضاء حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے اور اس لئے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کیلئے اس میں تنہائی میسر آتی ہے۔ ﴿وضع خاتمه﴾ اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے، کیونکہ اس میں ”محمد رسول اللہ“ منقش تھا اور اس میں تنبیہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگہوں سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ ﴿وهو معلول﴾ معلول اس لئے ہے کہ یہ روایت ہمام، ابن جریج، عن الزہری کے واسطے سے روایت کرتا ہے، حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی، بلکہ اس نے تو زیاد بن سعد کے واسطے سے زہری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے اتار دیا۔

حاصل کلام: اس روایت کو ابو داؤد نے معلول قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں ”ہمام“ راوی کو وہم ہوا ہے حالانکہ ابن معین ایسے نقاد حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے نیز یہ کہ اس حدیث کو ہمام کے علاوہ اور طرق سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ متن حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء وغیرہ ناپاک اور گندی جگہوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ دانستہ داخل نہیں ہونا چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(۷۸) وَعَنْ رَضِيِّ اللَّهِ تَعَالَى عَنْهُ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبْثِ وَالْخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ. وقت یہ دعا پڑھتے تھے ”اللهم انی اعوذ بک من الخبث والخبائث“ اے اللہ! میں آپ کی پناہ پکڑتا ہوں، خبیث جنوں اور خبیث جنینوں سے۔

(اس کو ساتوں، یعنی بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی)

لعوی تشریح: ﴿إذا دخل﴾ جب بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ ﴿الخبث﴾ ”خاء“ اور

”ہاء“ دونوں پر ضمہ۔ اور ”ہا“ پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خمیٹ کی جمع ہے۔ ﴿الخبائث﴾ خبیثہ کی جمع ہے۔ اول کا معنی ’ز‘ شیطان اور ثانی کا معنی مادہ شیطان مراد ہے اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلاء قسم کی جگہیں ایک کنارے یا دور بنائے جاتے ہیں اور تذکرہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہیں بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو، تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلاء نہ ہو تو رفع حاجت کیلئے نیچے بیٹھنے کیلئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: گندے مقامات اور جگہوں پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بیرا کرتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے قضاے حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ انسان کی مقعد بھی چونکہ قضاء حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے، اس لئے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں، ان سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کی تعلیم دی۔

(۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي إِدَاوَةً مِنْ مَاءٍ، وَعَنْزَةً فَيَسْتَنْجِي بِالْمَاءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. کہ رسول اللہ ﷺ قضاہ حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو میں اور ایک میرا ہم عمر لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک چھوٹا سانیہ لے کر ہمراہ جاتے۔ اس پانی سے آپؐ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اداوہ﴾ مہرزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ﴿من ماء﴾ پانی سے بھرا ہوا۔ ﴿وعنزة﴾ منصوب۔ اداوہ پر عطف کی وجہ سے۔ عین اور نون دونوں پر فتح۔ ایسا لبا عصا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا پھر چھوٹا سا تیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل نکلے ہیں مثلاً اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے سے خدمت لینا۔ پانی کے ساتھ استنجا کرنا۔ نیز پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ڈھیلا اور پانی دونوں سے استنجا کرنا تو افضل ترین ہے جیسا کہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔

(۸۰) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: خُذْ الْإِدَاوَةَ، چنانچہ آپؐ رفع حاجت کیلئے (اتنی دور) تشریف لے فَأَنْطَلَقَ حَتَّى تَوَارَى عَنِّي، فَقَصَصِي گئے کہ میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ وہاں آپؐ حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. قضاے حاجت سے فارغ ہوئے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تواری﴾ چھپ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

حاصل کلام: آنحضرت ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردہ کا انتظام کرنا چاہئے یا ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ”اگر رفع حاجت کھلی جگہ میں کرنا پڑے اور پردہ پوشی کیلئے کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو تو ریت یا مٹی وغیرہ جو چیز دستیاب ہو اسے اوٹ کیلئے استعمال کرے ورنہ شیطان اس کی مقعد کے ساتھ تمسخر کرے گا۔“

(۸۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اتَّقُوا اللَّاعِنِينَ، الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ». (ان کے بیٹھنے آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضاء حاجت کرنے سے۔“ (مسلم)

وَرَأَى أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: رَوَايَتُ كِي هِيَ، اس میں اس طرح ہے کہ ”لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھاٹوں پر، شاہراہ عام پر اور سایہ کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔“ اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے ”جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہئے۔“ (یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں)

وَأَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ: النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الْحَاجَةِ تَحْتَ الْأَشْجَارِ هِيَ اس میں ہے کہ ”پھل دار و سایہ دار درخت المُمُورَةِ وَضَفَّةِ النَّهْرِ الْجَارِي، مِنْ كِي نِيچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضاء حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ۔ حاجت نہ کرے۔“ (اس کی سند میں بھی ضعف ہے)

لعنوی تشریح: ﴿اتَّقُوا﴾ پر ہیز کرو، اجتناب کرو۔ ﴿لَاعِنِينَ﴾ لاعن سے تشبیہ ہے۔ مطلب ہے ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لاعن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صاحب ابن کو لاہن اور صاحب تمر کو ”تامر“ کہہ دیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لاعن ملعون کے معنی میں ہو۔ ﴿الَّذِي يَتَخَلَّى﴾ جو قضائے حاجت سے فارغ ہوتا ہے۔ ﴿فِي طَرِيقِ النَّاسِ﴾ لوگوں کے عام آمد و رفت کے راستہ میں۔ یہ لعنت زدگی کے اسباب میں سے ایک ہے اور دوسرا ﴿اَوْ فِي ظِلِّهِمْ﴾ وہ مقام و جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں اور قیلوہ کیلئے استعمال میں لاتے ہوں اور

اپنے اترنے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کے طور پر استعمال کرتے ہوں اور اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سایہ کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضاء حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ ﴿الملاعن﴾ ملعن کی جمع ”میم“ پر فتح۔ ایسی جگہیں اور مقامات جو لعنت کا موجب ہوں۔ ﴿السلطنة﴾ منصوب ہے، ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر۔ ﴿البراز﴾ ”باء“ پر فتح اصل میں تو کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں، مگر یہ ﴿الغانط﴾ یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والا فضلہ سے کنایہ ہے۔ اگر البراز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ﴿فی الموارد﴾ مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ یا مقام، چشمہ یا نہر وغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کیلئے حصول پانی کیلئے جاتے ہیں (جنہیں گھاٹ کہتے ہیں) ﴿قارعة الطريق﴾ ایسے کھلے راستہ کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے، پاؤں اور چوپایوں کے ذریعے اسے پامال کرتے ہیں۔ ﴿اونقع ماء﴾ نون پر فتح اور قاف ساکن۔ جمع شدہ اور روکا ہوا پانی۔ ﴿فیہما ضعف﴾ دونوں سے۔ مراد ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابوسعید حمیری، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا، لہذا یہ روایت منقطع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے جب اس کی کتابیں خاکستر ہو گئیں تو اس نے روایات کو خلط موط کرنا شروع کر دیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے، اس کا نام نہیں لیا گیا۔ ﴿تحت الاشجار المثمرة﴾ پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے مطلب ہے جو پھل پک کر نیچے گرے وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں انہیں اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کیلئے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ ﴿صفۃ النہر﴾ ضاد پر فتح اور ”فاء“ پر تشدید۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔ ﴿بسد ضعیف﴾ اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے وہ یہ ہیں: عام راستہ پر، سایہ دار درخت کے نیچے، پانی کے گھاٹ پر، پھل دار درخت کے نیچے، رواں دواں نہر کے کنارے۔ شارع عام پر عموماً رفع حاجت ممنوع ہے البتہ جو متروک ہو چکا ہو عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راوی حدیث: ﴿معاذ﴾ انصاری تھے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا، بڑے معزز اور بزرگ فقہاء صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو یمن کا والی

(گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ۷۱ھ میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ۸۱ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔

(۸۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلَانِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلَا يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَمْقُتُ عَلَى ذَلِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَقْنُونٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب دو آدمی قضاء حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردہ میں ہونا چاہئے اور اس حالت میں ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں۔“ اس لئے کہ ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض و صَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَقْنُونٌ۔ ہوتے ہیں۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطن نے اسے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معطل ہے)

لغوی تشریح: ﴿تغوط﴾ قضاء حاجت کیلئے نکلے اور اپنی حاجت پوری کی۔ ﴿فلیستوار﴾ اس میں لام امر کا ہے اور ”راء“ پر فتح ہے۔ معنی ہے کہ چھپنا چاہئے، پردہ میں ہونا چاہئے۔ ﴿ولا یحدثا﴾ قضاء حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ ﴿یمقت﴾ مقت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔ ﴿علیٰ ذلک﴾ دونوں کے مابین آڑ اور پردہ کا نہ ہونا اور رفع حاجت کی صورت میں بات چیت کرنا مراد ہے۔ ﴿وہو معلول﴾ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے۔ البتہ امام مسلم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام: علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحییٰ بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے، اس لئے کہ یہ راوی ان کے نزدیک معلول ہے، حالانکہ عکرمہ کی روایت کو امام مسلم نے قبول کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سے استشہاداً روایت کی ہے۔ یہ حدیث واضح ثبوت ہے اس کا کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے نیز قضاء حاجت یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے اگر یہ فعل بقول بعض کے مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حضور ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کاموید ہے۔

(۸۳) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَمَسُّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ كَرْتِ وَتِ دَائِسٍ بَاتِهٍ مِنْهُ عَضْوٌ مَخْصُوصٌ وَهُوَ يَبُولُ، وَلَا يَتَمَسَّخُ مِنَ الْخَلَاءِ»

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ”تم میں سے کوئی بھی پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو نہ چھوئے اور قضاء حاجت کے بعد سیدھے

بِمِیْنِهِ، وَلَا يَتَنَفَّسُ فِي الْإِنَاءِ». مَتَّقُوا ہاتھ سے استنجا بھی نہ کرے نیز پانی پیتے وقت اس میں سانس بھی نہ لے۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لَا یَمْسُ﴾ مس سے نبی کا صیغہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے۔ ﴿وَلَا یَتَمَسَّحُ﴾ یعنی استنجا نہ کر اور ﴿تَمَسَّحُ﴾ کے معنی ہیں ہاتھ کو بننے والی چیز کے ساتھ ملنا یا پھیرنا کہ گندگی دور ہو جائے یا ناپاک چیز سے تھڑی ہو، اسے ہاتھ سے صاف کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب بھی اور کم ظرفی بھی اور دوسرا کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس لینا۔ برتن میں سانس لینا اس لئے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعہ خارج ہونے والے جراثیم پئے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدہ میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کیلئے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پئے اور سانس باہر نکالے۔

(۸۴) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِينِ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِأَقْلٍ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضاء حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر، لید اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نَسْتَنْجِي﴾ الاستنجا سے ماخوذ ہے۔ یعنی پتھریا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اور ﴿الرجيع﴾ لید یا گوبر۔

راوی حدیث: ﴿سلمان﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہو گئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی ﷺ پر ایمان لے آئے۔ سلمان الخیر ان کا لقب تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ ان کے خلوص اور محبت دین کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا کہ ”سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ اللہ میں خیرات کر دیتے۔ ۳۲ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر ۲۵ یا ۳۵ برس تھی۔

(۸۵) وَلِلْسَبْعَةِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي حَسْرَةَ الْوَيْلُوبِ النَّصَارِيِّ رَوَاهُ مُسْلِمٌ

أَيُّوبُ: لَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ بَعَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلَكِنْ مَغْرِبَ كِي جَانِبِ كُرُو بَلْكَ مَشْرِقِيَا شَرْقُوا أَوْ عَرَبُوا.

”قضاء حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب کرو۔“ اس کو ساتوں (یعنی امام بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿لَا تَسْتَدْبِرُوهَا﴾ اس کی طرف اپنی پشت بھی نہ کرو۔ ﴿وَلَكِنْ شَرْقُوا أَوْ عَرَبُوا﴾ تشریق تقریب سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے اس طرح استقبال اور استبدار دونوں سے بچ جائے گا اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہو گا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ استقبال ۱۱ استبدار قبلہ سے بچنے کیلئے اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔ حکم کا دارومدار اسی پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ﴿لَا تَسْتَقْبِلُوا وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا﴾ کا حکم نہی ایسی جگہ کیلئے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو تو وہاں کیلئے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واضح ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمیشہ ہفتہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے حجرہ کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کیلئے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں) کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجت فرما رہے تھے اور اس وقت آپ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف نہ کرے اور نہ پشت۔ یہ حکم تو اہل مدینہ کیلئے مخصوص ہے اس لئے کہ ان کیلئے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوایوب انصاری﴾ ابوایوب ان کی کنیت ہے، ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی کریم ﷺ کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار کبار اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوہ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ (۵۰ھ میں) ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔

(۸۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَنْ أَتَى الْغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. ”بیٹھنا چاہئے۔“ (ابوداؤد)

(۸۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ حَضْرَتَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا هِيَ مَرُوءِي هِيَ كِهْ نَبِي ﷺ

النَّبِيِّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْغَائِطِ قَالَ: «غُفْرَانُكَ». أَخْرَجَهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ أَبُو حَاتِمٍ وَالْحَاكِمُ.

جب قضاء حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو ”غفرانک“ فرماتے (اے اللہ! تیری بخشش اور پردہ پوشی مطلوب ہے) (اس روایت کو پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، ابوحاتم اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿غفرانک﴾ منصوب واقع ہوا ہے، فعل محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں یا پھر مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے بخش دے اچھی طرح بخشا۔

(۸۸) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ الْغَائِطُ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثًا، فَأَتَيْتُهُ بِرَوْثَةٍ، فَأَخَذَهُمَا وَقَالَ: «إِنَّهَا رِكْسٌ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ. وَزَادَ أَحْمَدُ وَالْذَاقُطْنِيُّ «الَّتَيْنِ بَغِيرَهَا».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاہ حاجت کو چلے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کیلئے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً) گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپ نے دونوں پتھر تو لے لئے اور گوبر کے خشک ٹکڑے کو دور پھینک دیا اور فرمایا ”یہ تو بذات خود پلیدی ہے۔“ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) احمد اور دارقطنی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ ”اس کی بجائے اور لے آؤ۔“

لغوی تشریح: ﴿بروثہ﴾ چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ ﴿رکس﴾ ”را“ پر کسرہ ”کاف“ ساکن۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ ﴿الثنی بغیرھا﴾ ”اتیان“ سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضاء حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کیلئے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے۔ خواہ صفائی اس سے کم ہی سے حاصل ہو جائے اور اگر تین سے بھی مطلوب صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ (یعنی پانچ، سات علیٰ ہذا القیاس) آج کل ٹشو پیپر سے بھی صفائی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعداد بھی اتنی ہی ہونی چاہئے۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی لہذا ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے۔ خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راوی حدیث: ﴿ابن مسعود﴾ نام ان کا عبد اللہ تھا۔ بزرگ اور نہایت عقلمند و دانش مند فقیہ صحابہ کرام میں شمار ہوتے تھے۔ غزوہ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم

خاص تھے۔ حضور سفر کے ساتھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ صاحب النعلین تھے۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔

(۸۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى أَنْ نَسْتَجِيعَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، فرمایا ہے، ساتھ ہی فرمایا کہ ”یہ دونوں پاک نہیں کر و قَالَ: «إِنَّهُمَا لَا يُطَهَّرَانِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ. دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿انہما لا یطہران﴾ (یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے) گوہر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے اور ہڈی میں چکناٹ ہوتی ہے۔ اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی اور تری کو خشک نہیں کر سکتی ہے اور ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنوں کا طعام ہے اور ﴿روث﴾ ان کے جانور کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

حاصل کلام: امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہڈی اور گوہر سے استنجانہ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپ نے فرمایا: نصیین کے علاقہ سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوہر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔ لہذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے، اسے گندنا نہ کرو۔ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی کھانے والی چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے یہ جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «اسْتَنْزَهُوا مِنَ الْبَوْلِ، فَإِنَّ أَكْثَرَ عَذَابِ الْقَبْرِ فِيهِ» رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، نے اسے روایت کیا ہے)

وَلِلْحَاجِمِ: «أَكْثَرُ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنَ الْبَوْلِ» وَمُو اور حاکم کی روایت میں ہے اکثر عذاب قبر پیشاب کی ضجیحہ الإشناد۔ وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿استنزهوا﴾ اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿منہ﴾ میں من تعلیلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب

سے پرہیز اور اعتنا نہ کرنے کی وجہ سے۔

(۹۱) وَعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے قضاء حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ ”ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر عَلَيِ الْبُشْرَى وَنَنْصِبُ الْيُمْنَى. رَوَاهُ ابن ماجہ بیئیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں (اس پر بوجھ کم ڈالیں)“ (اس کو یہی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا

ہے)

لغوی تشریح: ﴿علّمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے، صیغہ غائب ہے۔ ”ہا“ ضمیر متکلم جمع کی ہے اور مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فی البُشْرَى﴾ قضاء حاجت کے آداب کے بارے میں۔ ﴿نَنْصِبُ الْيُمْنَى﴾ نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑے کرنے، قائم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بسند ضعیف اس لئے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

حاصل کلام: حکیم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ حکمت خواہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں پاؤں پر بیٹھنے کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کا معدہ بائیں طرف ہوتا ہے۔ بائیں پاؤں پر بیٹھنے سے اخراج فضلہ میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراقہ﴾ سین پر ضمہ۔ سراقہ بن مالک بن جشم، جشم جیم پر ضمہ، عین ساکن اور شین پر ضمہ۔ قبیلہ مدح میں سے تھے، اس لئے مدحی کہلائے۔ ابو سفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جو ہجرت کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انعام کے لالچ میں گرفتار کرنے کیلئے آپ کے تعاقب میں نکلا اور جب آپ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ تو اس نے امان طلب کی۔ آپ نے امان دے دی۔ ۲۳ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(۹۲) وَعَنْ عِيْسَى بْنِ يَزْدَادَ حضرت عیسیٰ بن یزاد نے اپنے والد سے روایت (يُزْدَادَ) عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ بَيَان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم میں سے اللہ ﷻ: إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتُرْ جب کوئی پیشاب کرے تو عضو مخصوص کو تین مرتبہ ذَكَرَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ“. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ ابن ماجہ بھڑ لے۔“ (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ ضعیف۔ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فليستر﴾ ”نشر“ سے ماخوذ ہے۔ جو کچھ ناک کے اندر ہو اسے بھڑ کر نکالنا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ ”یزداد“ صحابی نہیں بلکہ مجہول راوی ہے اس کا بیٹا عیسیٰ بھی مجہول ہے۔

حاصل کلام: پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سونٹنا یا بھڑانا اس لئے ہے کہ اگر قابل

خارج قطرہ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ یہ روایت گو ضعیف ہے مگر پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ عذاب قبر اس لئے ہو رہا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔

راوی حدیث: ﴿عیسیٰ بن یزید﴾ یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں۔ ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کا تعارف ہے۔ یزید کو باء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(۹۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَاءٍ فَقَالَ: إِنَّ اللَّهَ يُثْنِي عَلَيْكُمْ. فَقَالُوا: إِنَّا نُسَبِّحُ الْحَجَّارَةَ الْمَاءَ. رَوَاهُ الْبَزَّازُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَضْلَهُ فِي أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، بِدُونِ ذِكْرِ الْحَجَّارَةِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے استعمال کے بعد مزید طہارت کیلئے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے ضعیف سند کے ساتھ بزار نے روایت کیا ہے۔ اس کی اصل ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اہل قباء﴾ سنال فعل کا مفعول ہے اور قباء قاف پر ضمہ اور آخر پر الف ممدودہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ﴿یثنی علیکم﴾ یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمہاری تعریف کی ہے کہ ﴿فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین﴾ (۱۰۸:۹) ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ﴿نسبح الحجارة الماء﴾ یعنی پہلے ہم پتھر سے استنجاء کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی سے صفائی حاصل کرتے ہیں اور ﴿نسبح﴾ باب افعال سے ہے اور ﴿الحجارة اس کا مفعول اول ہے﴾ الماء مفعول ثانی ہے۔ ﴿بسند ضعیف﴾ سے مراد ہے کہ چونکہ بزار نے محمد بن عبدالعزیز زہری سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شیبہ بھی ضعیف راوی ہے۔

حاصل کلام: سند بزار کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند کے دو راوی محمد بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن شیبہ ضعیف ہیں۔ ”قباء“ مدینہ طیبہ سے تین میل بجان جنوب ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر آپؐ نے پہلے بیس قیام فرمایا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استنجاء میں ڈھیل کے ساتھ پانی استعمال کرنا افضل ہے۔

۸ - باب الفضل وَخُتْمُ الْغُتْبِ غَسْلُ اور جنبی کے حکم کا بیان

(۹۴) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرمایا ”پانی کا استعمال خروج پانی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ»۔ سے ہے۔“ (یعنی جب تک منی کا خروج نہ ہو اس رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ۔ وقت تک غسل واجب نہیں ہوتا۔) (اسے مسلم نے

روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں بھی ہے)

لغوی تشریح: «الماء من الماء» اس میں ”من“ تعلق کا ہے اور بعض روایات میں «انما الماء من الماء» کلمہ حصر کے ساتھ۔ پہلے ماء سے معروف پانی مراد ہے اور دوسرے ”ماء“ سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہوگا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہوگا اگر اتنے عمل کے باوجود بھی منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ ابتداء اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب صرف جماع سے غسل واجب ہوتا ہے، انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی، مگر الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے یہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں بھی جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کو احتلام کے بارے میں سمجھا گیا ہے جماع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب آدمی کو انزال ہو۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضاء مخصوص ایک دوسرے سے ملاپ کر لیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال کی نوبت پیش نہ آئی ہو۔

(۹۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شَعْبَيْهَا چار شاخوں کے درمیان میں بیٹھے پھر اپنی پوری الْأُزْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ كُوشِش کر لے تو اس پر غسل واجب ہو گیا۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ

يُنْزِلُ.

حاصل کلام: مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ شفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خلفاء اربعہ، ائمہ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے۔ اس کو جماع پر محمول کیا جائے تو اس حدیث کو پہلی حدیث کا ناخ سمجھا جائے گا۔

(۹۶) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ - وَهِيَ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ - قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلِ إِذَا اخْتَلَمَتْ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا رَأَتْ الْمَاءَ»، الْحَدِيثُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

فقوی تشریح: ﴿لا یستحیی من الحق﴾ ”حاء“ کے بعد دو یاء ہیں ”حاء“ اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق کے بیان کرنے سے رکنا اور حیا کی بنا پر اسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی مزید کہا۔ ایسے ہی مسائل جن کو دریافت کرنے سے عورتیں عموماً شرماتی ہیں اور عذر پیش کرتی ہیں۔ ﴿اذا احتلمت﴾ جب اسے احتلام ہو جائے ایک دوسری روایت میں ﴿اذارات ان زوجها یجامعها فی المنام﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات کئے ہوئے ہے۔ ﴿اذارات الماء﴾ جب نیند سے بیدار ہو تو منی دیکھے۔

راوی حدیث: ﴿ام سلیمؓ﴾ ان کا نام رمیضاء یا غیمضاء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نضر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہو گئیں۔ اس نے اپنے

خاند کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس وجہ سے ناراض ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا اور فوت ہو گیا۔ مالک بن نضر کی وفات کے بعد ابو طلحہؓ نے ان کو پیغام نکاح دیا۔ ابو طلحہؓ ابھی مشرک تھے۔ ام سلمہؓ نے شرط پیش کی کہ اسلام قبول کر لو تو میں تمہارے ساتھ نکاح کر لوں گی۔ اس شرط کو ابو طلحہؓ نے قبول کیا اور مسلمان ہو گئے تو ام سلمہؓ نے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۹۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فِي الْمَرْأَةِ تَرَى فِي مَنَامِهَا مَا يَرَى الرَّجُلُ، قَالَ: تَغْتَسِلُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَهَلْ يَكُونُ هَذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشَّبَهُ؟»

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو خواب میں وہی کچھ دیکھے جو ایک نوجوان مرد دیکھتا ہے (احتمام) کہ وہ غسل کرے۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ام سلمہؓ نے آپؐ کے جواب دینے پر مزید دریافت کیا: کیا ایسا (عورت) کے ساتھ بھی ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، اگر ایسا نہ ہوتا تو مشابہت کہاں سے ہوتی۔

لغوی تشریح: ﴿ما یری الرجل﴾ اس سے مراد ہے احتمام۔ ﴿فمن این یکون الشبہ؟﴾ شبہ میں شبین پر کسرہ ہے اور ”با“ ساکن ہے اور دونوں پر فتح بھی جائز ہے۔ مماثلت کے معنی ہیں اور اس میں (این) استفہامیہ ہے جو دراصل حضرت ام سلمہؓ کے اس خیال کی تردید کیلئے ہے کہ آیا عورت کو بھی احتمام ہوتا ہے۔ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مشابہت رکھتا ہے اور کبھی ماں سے اور نھیال سے اور یہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ شہوت کے وقت عورت کے اندر بھی منی کو دکر خارج ہو اور بچہ کی خلقت و ساخت میں حصہ دار بنے۔ حضرت ام سلمہؓ کا انکار اس پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو احتمام بڑی نادر صورت ہے۔ یعنی بہت کم ہوتا ہے مردوں کی طرح کثرت سے نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: جس طرح مردوں کو احتمام لاحق ہوتا ہے اور ان پر غسل کرنا فرض ہے اسی طرح عورتوں کو بھی یہ صورت لاحق ہوتی ہے ان کو غسل کرنا بھی فرض ہے باقی رہا بچہ کی مشابہت کا مسئلہ تو اس بارے میں حدیث سے ثابت ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہوتا ہے تو نو مولود کی مشابہت باپ پر ہوتی ہے اور جب ماں کا پانی غالب ہو تو بچہ کی مشابہت والدہ سے ہوتی ہے۔

(۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنَ الْجَنَابَةِ، جَنَابٍ، جَمْعُهُ رَوْحٌ، سِغْلِي لُغَوَانِي كَيْفَ بَعْدَ أَوْرَمِي

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ جنابت، جمعہ کے روز، سینگلی لگوانے کے بعد اور میت

وَيَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَمِنْ الْحِجَامَةِ، وَمِنْ كُوْغْسِلَ دِينَ كِي وَجہ سے۔ (ابوداؤد نے اسے روایت
 غُسْلَ الْمَيْتِ۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ كِيَاہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)
 ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حاصل کلام: اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ جمعہ کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے البتہ امام احمد اور امام مالک کا ایک قول یہ ہے کہ وہ فرض ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے اور حافظ ابن قیم کا زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ سینگلی لگوانے سے غسل مسنون ہے فرض نہیں۔ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپؐ نے سینگلی لگوائی اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ نے غسل تو کیا کبھی وضو بھی سنگلی لگوانے کے بعد نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل، تو پہلے اس کے بارے میں بھی گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے، فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی فیصلہ ہے۔

(۹۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بِنْتِ اسْلَامِ لَانِ كِي وَاقِعِ كِي مَتَلَق مَرُو كِي كہ نبي
 اُتَالِ عِنْدَمَا اُسْلَمَ - وَامْرَهُ النَّبِيُّ كَرِيم ﷺ نِي اسے غسل كرنے كا حْكَم ارشاد فرمایا۔
 ﷺ اَنْ يَغْتَسِلَ۔ رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصْلُهُ (عبدالرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل
 مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: کافر جب اسلام لانے کیلئے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہئے۔ یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ثمامہ بن اثال﴾ دونوں لفظوں کے پہلے حرف یعنی ”ثا“ اور ”الف“ دونوں پر ضمہ ہے۔ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گشتی شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ ان کو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انہیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین روز بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انہیں آزاد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان ہو گئے اور بہت عمدہ اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب اس کی قوم کے لوگ میلہ کذاب کے فتنہ کا شکار ہو گئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(۱۰۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز غسل کرنا ہر **بَالِغٌ** پر واجب ہے۔“ (اس کو ساتوں یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے) **السُّنَّةُ**.

لغوی تشریح: ﴿محتلم﴾ بالغ کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو غسل یوم جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں ”واجب“ کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ مگر جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کیلئے سمجھتے ہیں۔

(۱۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنْ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ». رَوَاهُ الْخَنَسِيُّ، وَحَسَنُ التِّرْمِذِيُّ. حضرت سمرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جمعہ کے روز جس نے وضو کیا اس نے اچھا اور بہتر کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل تو **وَنِعْمَتْ**، وَمَنْ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ“ (اس کو پانچوں یعنی احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿فبہا﴾ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ یہ طریقہ مسنون ہے یا پھر اسے رخصت پر محمول کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے کی اجازت و رخصت ہے یا یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ جمعہ کے روز وضو پر اکتفا کرنا ایک اچھی اور عمدہ عادت ہے۔ ﴿وَنِعْمَتْ﴾ کا بھی وہی مفہوم ہے جو ﴿فبہا﴾ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مسنون بھی ہے یا اچھی اور عمدہ خصلت بھی اور یہ حدیث جمعہ کے روز غسل کے وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے، لیکن جو حدیث اس کے وجوب پر دال ہے وہ زیادہ صحیح اور راجح ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح، راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ اس لئے کہ واجب کو افضل نہیں کہا جاتا غالباً اسی وجہ سے جمہور علماء نے واجب سے لغوی معنی مراد لئے اصطلاحی نہیں۔ لغوی معنی کو تقویت مسلم کی روایت سے ملتی ہے جو اس کے فرض نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ نہایت اولیٰ بات یہی ہے کہ مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنے میں بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے۔ صاحب زاد المعاد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غسل کیلئے بہت تاکید ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ لفظ وجوب وتر کے سلسلہ میں اگر کچھ قوت رکھتا ہے تو غسل جمعہ کیلئے اس سے زیادہ باعث قوت ہے۔

راوی حدیث: ﴿سمرہ﴾ سین کے فتح اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ﴿جندب﴾ جیم کے ضمہ، نون

(۱۰۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقْرِئُنَا الْقُرْآنَ مَا لَمْ يَكُنْ جُنُبًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، وَهَذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَنُهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں ہمیں قرآن مجید پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ترمذی کے ہیں اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہئے، چنانچہ امام ابو یعلیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ ”جس کسی کو جنابت لاحق ہو اس کیلئے مناسب یہی طریقہ ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو“۔

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلُهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وَضُوءًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ

الحاکم: «فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ» .
وَلِلْأَرْبَعَةِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ يَنَامُ وَهُوَ جُبْتُ، مِنْ غَيْرِ أَنْ
يَمَسَّ مَاءً. وَهُوَ مَعْلُولٌ .

اور حاکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو)
دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت
بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے اور سنن اربعہ (یعنی
ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت
جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت
مطلوب ہے۔)

نغوی تشریح: ﴿انشط﴾ اسم تفصیل کا صیغہ ہے۔ بہت نشاط و مسرت اور فرحت و تازگی بخش ہے۔

اطیب اور اجود ہے تروتازگی اور عمدگی لذت طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ ﴿من غیروان یمس ماء﴾ اس جملہ میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ ہی غسل کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح اور صاف ہو گئی کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے وہ مستحب ہے، واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ ﴿وہو معلول﴾ اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواصلح کا ابوالاسود کے واسطے سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواصلح کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں لیکن امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی معلول اس لئے کہا کہ ان کے نزدیک بھی ابواصلح کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں مگر امام بیہقی رحمہ اللہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے، حدیث معلول نہیں رہتی۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ خورد و نوش اور مباحثت کیلئے عضو مخصوص دھو کر وضو فرما لیتے تھے۔ اکثر علماء امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں مستحب ہے۔

(۱۰۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَهُ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَاءَ فَيَدْخُلُ أَصَابِعَهُ فِي أَصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَالنَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے۔ پہلے ہاتھ دھوتے پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنا عضو مخصوص دھوتے۔ پھر وضو کرتے، پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعہ سر کے بالوں کی تہہ (جڑوں) میں داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے وجود پر پانی بہاتے (سب سے آخر میں) پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم، متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلَهُمَا فِي حَدِيثٍ مَيْمُونَةٌ: «ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الْأَرْضَ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح ہے ”پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے اور (صاف

وَفِي رَوَايَةٍ: «فَمَسَحَهَا بِالثَّرَابِ».

کرتے) ”اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔“ پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح

وَفِي آخِرِهِ: «ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالْمِنْدِيلِ»

مگر آپ نے اسے واپس لوٹا دیا اور بدن (پر جو پانی رہ گیا تھا) اسے اپنے ہاتھ سے جھاڑنا شروع کیا۔“

لغوی معنی: ﴿بفرغ﴾ افرار سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی چھڑکتے تھے۔ ڈالتے تھے۔ انڈیلتے تھے۔ ﴿یغسل فرجه﴾ عضو مخصوص اور اس کے ارد گرد کے حصے کو جو رانوں کے ساتھ ملحق ہوتا دھوتے تھے جیسا کہ ابوداؤد میں وارد ﴿مرافغ﴾ کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ ﴿مرافغ﴾ مرفغ کی جمع ہے، یعنی شرم گاہ کا ارد گرد۔ ﴿فیدخل﴾ ادخال سے بدخل بنا ہے۔ باب افعال ہے۔ ﴿فیدخل اصابعہ﴾ اپنی انگلیوں کو داخل کرتے اپنے سر کے بالوں کی جڑوں تک۔ ﴿فی اصول الشعر﴾ اپنی انگلیوں سے سر کے دائیں پہلو والے بالوں میں پہلے ڈالتے اور بائیں جانب بعد میں تاکہ بالوں کی جڑوں اور جسم کی کھال تک پانی کی تری پہنچ جائے۔ ﴿ثم حفن﴾ دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی بھر کر ڈالتے۔ ﴿حفنات﴾ حفنہ کی جمع ہے ﴿حاء﴾ اور ﴿فاء﴾ دونوں پر فتح ہے۔ ﴿حفنہ﴾ کے معنی لب اور چلو کے آتے ہیں یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں ہتھیلیوں کو پانی سے بھرنا ﴿ثم افاض الماء﴾ پھر پانی بہاتے یا انڈیلتے۔ یعنی کھائیانی جسم پر بہا دیتے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور میں کچھ پہلو وضاحت طلب ہیں۔ مختلف احادیث کے ملانے سے وضاحت ہوتی ہے کہ غسل کرنے سے پہلے آپؐ ہاتھ دھوتے۔ اس میں تعداد کا ذکر نہیں کہ کتنی بار دھوتے۔ ام المومنین میمونہؓ کی روایت میں دو یا تین بار دھونے کا ذکر ہے پھر آپؐ اپنی شرمگاہ کو دھوتے پھر ہاتھ مٹی پر مار کر ہاتھ صاف کرتے پھر اسی طرح غسل کرتے جس طرح نماز کیلئے غسل کیا جاتا ہے۔ پھر سر کے بالوں کا خلال کرتے۔ پہلے سر کے دائیں جانب بالوں میں خلال کر کے پانی کی تری جڑوں تک پہنچاتے پھر بائیں طرف والے بالوں میں اسی طرح کرتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ حضرت میمونہؓ کی روایت میں ہے کہ پہلے ایک طرف ہو جاتے پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ اسی غسل میں کئے گئے وضو سے نبی کریم ﷺ نے صبح کی دو سنتیں اور نماز فجر کے فرض ادا فرمائے گویا دوبارہ از سر نو وضو کرنے کی ضرورت و حاجت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد چہرے اور ہاتھوں اور باقی بدن پر پانی کے اثرات کو تولنے یا رومال وغیرہ سے صاف کرنا ضروری نہیں کیونکہ بعض روایات میں کپڑے سے پانی خشک کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور وضو کے پانی کو ہاتھ سے جھاڑنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور جس روایت میں ہاتھ سے پانی جھاڑنے کی ممانعت آئی ہے وہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح حدیث کی موجودگی میں ضعیف کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں۔

[illegible]

نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں البتہ اگر مسجد کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ گزرنے کا نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿الاعرابی سبیل﴾ ہے، یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے ہاں اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے اور حدیث سے مراد ٹھہرنے کی ممانعت ہے۔ نہ کہ گزرنے کی۔ امام احمد رحمہ اللہ تو آثار صحابہؓ کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہوگئی تو ایسے آدمی کیلئے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا جائز ہے۔

(۱۰۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا میں اور رسول اللہ ﷺ دونوں ایک ہی برتن سے وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، غسل جنابت کر لیا کرتے تھے۔ اس برتن میں ہمارے تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ، مِنَ الْجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے اتنا اضافہ مزید نقل کیا ہے عَلَيْهِ، وَرَدَّ ابْنُ جَبَّانَ: «وَتَلْتَقِي»۔

کہ بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔

انغوی تشریح: ﴿تختلف ایدینا فیہ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے۔ مثلاً پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں حضور ﷺ کا یا پھر پہلے حضور ﷺ کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ ﴿من الجنابة﴾ جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ ﴿تلتقی﴾ مل جاتے، چھو جاتے، ایک دوسرے سے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کیلئے باعث نقصان نہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک برتن کے پانی سے میاں بیوی کا اکٹھے غسل کرنا بھی جائز ہے۔

(۱۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنْ تَحَتَّ كُلُّ شَعْرَةٍ جَنَابَةً، (نیچے) میں جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے بالوں کو

فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا الْبَشَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَفَاهُ، وَلَاخْمَدٌ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوَهُ، وَفِيهِ زَاوٍ مَجْهُولٌ. روایت کیا ہے اور ساتھ ہی ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے)

لعوی تشریح: ﴿انقوا﴾ انقواء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (صاف کرو) ﴿البشر﴾ ”با“ اور شین پر فتح۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد و کھال کی اوپر والی سطح۔ ﴿وضعه﴾ دونوں (ابوداؤد و ترمذی) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث ابن وجیہ نامی ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ حاصل کلام: حدیث مذکور اس کی دلیل ہے کہ غسل جنابت کی صورت میں سارا جسم دھونا فرض ہے البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ بہر حال حدیث ہذا کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتیٰ کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔



تیمم کا بیان

۹ - بَابُ التَّيْمُمِ

(۱۰۹) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا» حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دہدبے سے مدد دی گئی ہے۔ ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور

وَفِي حَدِيثٍ حَذِيفَةٍ عِنْدَ مُسْلِمٍ :
 «وَجَعَلْتُ نُرْبَتَهَا لَنَا طَهُورًا إِذَا لَمْ
 نَجِدِ الْمَاءَ» .

چاہئے۔“ اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ مسلم میں
 حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”جب ہمیں
 پانی دستیاب نہ ہو تو زمین کی مٹی ہمارے لئے حصول

طہارت و پاکیزگی کیلئے پاک بنادی گئی ہے۔" مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مٹی میرے لئے حصول طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب التیمم﴾ تیمم کا لغوی معنی ہے قصد و ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک و صاف مٹی کی طرف قصد و ارادہ کرنا۔ نماز وغیرہ کو مباح کرنے کی غرض سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر مٹی ملنے کو کہتے ہیں۔ ﴿اعطیت﴾ مجھے دی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ ﴿خمساً﴾ پانچ ممتازات و خصائص۔ ﴿نصرت﴾ مدد دیا گیا ہوں صیغہ مجہول ہے۔ ﴿بالرعب﴾ ”راء“ پر ضمہ اور عین ساکن ہے۔ معنی اس کے خوف ہیں۔ ﴿مسیرۃ شہر﴾ مہینہ بھر کی مسافت و دوری سے۔ میرے دشمن پر میرا رعب و دبدبہ پڑ جاتا ہے۔ ممتازات خمسہ میں سے یہ پہلا امتیاز ہے اور دوسرا ﴿جعلت لی الارض مسجداً﴾ کا امتیاز ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے سوا کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ صرف اپنے گرجوں اور عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ ﴿وطھورا﴾ ”طاء“ پر فتح ذریعہ پاکیزگی و طہارت، جنابت اور ناپاکی کو دور کرنے اور زائل کرنے کا ذریعہ۔ اس طرح سے ادائیگی نماز کیلئے جائز ہونے کا موقع پیدا کیا گیا ہے۔ ﴿ادرکنہ﴾ اس کا وقت آپنچے، یعنی نماز کا وقت ہو جائے۔ ﴿فلیصل﴾ تو اسے نماز پڑھ لینی چاہئے خواہ مسجد نہ ملے اور پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ ﴿وذكر﴾ سے مراد راوی حدیث ہے۔ یعنی راوی نے باقی حدیث بیان کی ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں سے مصنف نے بالخصوص آپؐ کو عطا کئے جانے والے دو امتیازات و خصائص کا ذکر کیا ہے اور باقی تین یہ ہیں۔ غنائم کا حلال کیا جانا۔ یعنی دوران جنگ دشمن سے جو اموال افواج اسلام کے قبضہ میں آئیں وہ آپؐ کیلئے اور امت مسلمہ کیلئے حلال کئے گئے ہیں۔ نیز شفاعت کبریٰ بھی آپؐ ہی فرمائیں گے۔ یہ امتیاز بھی صرف آپؐ ہی کا طرہ امتیاز ہے، تاکہ روز محشر کی تکلیف سے لوگوں کو آرام و سکون اور راحت نصیب ہو اور روئے ارض کے تمام انسانوں اور جنوں کیلئے آپؐ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے یہاں آخری تین امتیازات کو حذف کر دیا ہے اور انہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق طہارت اور نماز سے ہے۔

پانی کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں شریعت اسلامیہ نے تیمم کی سہولت بہم پہنچا کر امت مسلمہ

کیلئے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم درست ہے۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات جو زمین کا حکم رکھتی ہوں ان سے بھی تیمم کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ معدنیات غبار رکھنے والی ہوں۔

(۱۱۰) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي حَاجَةٍ، فَأَجَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ، فَتَمَرَعْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَعُ الدَّابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدِكَ هَكَذَا، ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشَّمَالَ عَلَى الْيَمِينِ وَظَاهَرَ كَفَيْهِ وَوَجْهَهُ. متفق عليه وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے کسی ضرورت و حاجت کے سلسلہ میں بھیجا۔ میں جنبی ہو گیا اور پانی مجھے دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ (ضرورت سے فارغ) ہو کر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپ سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا ”تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔“ پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا پھر بائیں کو دائیں پر ملا اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر۔ (بخاری اور مسلم، اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِي رَوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ «وَضَرَبَ بِكَفَيْهِ الْأَرْضَ، وَفَنَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَيْهِ.

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور پھونک مار کر گرد و غبار اڑا دیا پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: ﴿فاجبت﴾ میں جنبی ہو گیا۔ ﴿فتمرغت﴾ لوٹ پوٹ ہوا۔ حاصل کلام: یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے ایک ضرب ہی کافی ہے اور ہتھیلیوں کی بیرونی اور اندرونی سطح پر مسح کرنا ہے۔ کہنیوں تک نہیں۔ اس باب میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو دوسری روایات ہیں یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کیلئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے، البتہ احناف اور شافعی دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کیلئے اور دوسری ہاتھوں کیلئے ہے۔ مذکورہ بالا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان کی دلیل ہے۔ اس باب میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ نیز عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و

دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے اس لئے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہئے۔ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں، لہذا جب نص قیاس کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کیلئے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک دیا۔ لہذا ضرب لگانے کے بعد پھونک دینا بھی مسنون ہے۔ ایک جنبی کیلئے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عماد بن یاسر رضی اللہ عنہ﴾ عین پر فتح، میم پر فتح اور تشدید۔ ان کی کنیت ابو یقظان تھی۔ اولین سابقین صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایہ ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ (یعنی ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ) غزوہ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا ”افسوس اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔“ ۳۶ھ میں معرکہ صفین کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۳ برس کی تھی۔

(۱۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «التَّيْمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الْأَيْمَنُ وَفَقَّهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ”تیمم دو ضربوں سے (کامل) ہوتا ہے (تیمم میں دو ضربیں ہیں) ایک ضرب چہرے کیلئے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کیلئے کہنیوں تک۔“ (اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: ﴿التیمم ضربتان الخ﴾ والی حدیث کو حاکم اور بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ائمہ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کئے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مٹی مومن مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس تک اسے پانی نہ ملے۔ مگر جب پانی دستیاب ہو جائے تو پھر اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اسے اپنے جسم پر پانی پہنچانا چاہئے۔“ (اس کو بزار نے

وَلَيْمَسَّهُ بَشَرَتُهُ». رَوَاهُ الْبُزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ تَاهِمٍ دَارِ قُطَيْبٍ نَعْنِ ابْنِ قُرَيْنٍ صَوَابٌ كَمَا هُوَ فِي تَرْغَمِ بْنِ حَضْرَتِ ابُو ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُهُ، وَصَحَّحَهُ وَالْحَاكِمُ أَيْضًا.

روایت کیا ہے اور ابن القطن نے صحیح قرار دیا ہے، تاہم دار قطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست اور قرین صواب کہا ہے اور ترمذی میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے)

لعوی تشریح: ﴿الصعيد﴾ پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ ﴿وان لم یجد﴾ اس میں ”ان“ وصلیہ ہے۔ ﴿عشر سنین﴾ دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ ﴿فلیستق اللہ﴾ اللہ سے ڈرنا چاہئے کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ ﴿ولیمسه﴾ احساس سے ماخوذ ہے۔ یعنی پانی پہنچائے۔ ﴿بشرته﴾ ”با“ اور شین دونوں پر فتح ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ ﴿صوب﴾ تصویب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔ یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جاسکتی ہیں۔ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدت کے قائل نہیں ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے، جب نماز سے فارغ ہوگا تو پھر ویسا ہی جتنی ہوگا جیسا کہ تیمم سے پہلے تھا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن المسیب، حسن بصری، زہری، سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذوری کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کیلئے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض جس کیلئے تیمم کیا گیا ہو ادا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح ہے ”ابو ذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا اس نہ آئی تو انہوں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا آپ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابو ذر رضی اللہ عنہ نے آنجناب ﷺ کی خدمت میں عرض کی ابو ذر رضی اللہ عنہ تو تباہ ہو گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ ”کیا ہوا؟“ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا ”جسے پانی نہ ملے اس کیلئے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔“

راوی حدیث: ﴿ابودر بنہ﴾ ”راء“ پر تشدید۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں جیم پر ضمہ ہے۔ ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو زاہد، دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتداء اسلام میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی ﷺ کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بہت متقی، پرہیزگار اور توکل علی اللہ کرنے والے تھے۔

(۱۱۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلَانِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَاءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيدًا طَيِّبًا، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِي الْوَقْتِ، فَأَعَادَا أَحَدُهُمَا الصَّلَاةَ، وَالْوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَذَكَرَا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: «أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجَزَأَنَّكَ صَلَاتُكَ»، وَقَالَ لِلْآخَرِ: «لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيمِيُّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے، نماز کا وقت آگیا مگر ان کے ساتھ پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر پانی بھی دستیاب ہو گیا جبکہ ابھی نماز کی ادائیگی کا وقت باقی تھا ان میں سے ایک صاحب نے وضو بھی کیا اور نماز دوبارہ ادا کر لی مگر دوسرے نے نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی فرمایا ”تو نے سنت کے مطابق کیا اور تیری نماز کافی ہو گئی“ اور دوسرے سے فرمایا ”تجھے دو گنا اجر ملے گا۔“ (ابوداؤد - نسائی)

لغوی تشریح: ﴿اصبت السنة﴾ تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ ﴿اجزأتک﴾ یعنی تجھے کافی ہو گئی۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمم کر کے نماز ادا کر لی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔ جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دو گنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم غلط اجتہاد پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(۱۱۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الْجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْفُرُوحُ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ“ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب کسی شخص کو راہ خدا میں زخم اور گھاؤ لگے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے

فَيُجْنِبُ، فَيَخَافُ أَنْ يَمُوتَ إِنَّ اور غسل کرنے کی صورت میں مرجانے کا اندیشہ ہو
اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْفُوفًا تو وہ تیمم کر لے۔ (اس روایت کو دارقطنی نے موقوف،
وَرَفَعَهُ الْبَزَّازُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ۔ بزار نے مرفوع اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا

(ہے)

لغوی تشریح: ﴿مرضی﴾ مریض کی جمع۔ بیمار آدمی ﴿علی سفر﴾ علی فی کے معنی میں استعمال
ہوا، یعنی مسافر ہو اور بعد کی آیت او جاء منكم من الغائط ولا مستم النساء فلم تجدوا ماء
فتمموا صعيدا طيبا (۶:۵) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں بیان فرمائی۔ کہ جب کسی انسان کو ایسا
زخم لگے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو اور ﴿القروح﴾ قرح کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں اور قرآنی
آیت کی روشنی میں قروح ان زخموں اور گھاؤں کیلئے استعمال ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے
لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ان بمسكم قرح فقد مس القوم قرح مثله ”اگر (آج)
تمہیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔“

حاصل کلام: اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔ اس کا مطلب یہ
ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ اس آیت میں
بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا پھنسی، خارش اور خراش تو بہر حال نہیں ہو
سکتے لہذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ بیماری کس درجہ
کی ہو تو تیمم جائز ہے اس بارے ائمہ کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری
میں تیمم جائز درست ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصہ جسم کے
ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو
تب بھی تیمم جائز ہے۔ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر
سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر
سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی
رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

محدثین کی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملہ میں دارقطنی کی رائے زیادہ صحیح
ہے کیونکہ بزار نے اس روایت کو جریر بن عطاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے حالانکہ ابن معین نے کہا ہے
کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظہ میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا اس اعتبار سے اس
کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(۱۱۵) وَعَنْ عَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا گٹ ٹوٹ گیا تو
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَرَتْ إِحْدَى میں نے رسول اللہ ﷺ سے وضو کے بارے میں

زَنْدِيٍّ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ (پوچھا کہ اب میں کیا کروں؟) تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ”بیٹوں پر مسح کر لیا کرو۔“ (اسے ابن ماجہ نے ابْنِ مَاجَةَ بِسَنَدٍ وَاهٍ جَدًّا۔ نہایت ہی کمزور و ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿زندى﴾ ”زاء“ پر فتح، نون ساکن اور ”یا“ پر تشدید۔ زندو احد، تشبیہ زندی اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور ”زند“ ہتھیلی کی جانب بازو کا جوڑ جسے رَدَسَعٌ یعنی گٹ کہتے ہیں الجبائر جبیرہ کی جمع ہے۔ کپڑے کا ٹکڑا یا لکڑی کا جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر مضبوطی سے لپیٹ کر باندھا جاتا ہے۔ ﴿واہ﴾ وہی بھمی وہبا سے ماخوذ ہے۔ نہایت کمزور اور ضعیف۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمرو بن خالد الواسطی ہے وہ نہایت جھوٹا اور دروغ گو آدمی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے۔

(۱۱۶) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي الرَّجُلِ الَّذِي شُجَّ فِي الرِّجْلِ فَغَسَلَ فَمَاتَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَتِيمَ وَيَعْصَبَ عَلَى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا، وَيَغْسِلُ سَائِرَ جَسَدِهِ. (ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں بھی اختلاف ہے) عَلٰی زَاوِيَةٍ۔

لغوی تشریح: ﴿شج﴾ شج سے ماخوذ ہے، صیغہ مجہول ہے۔ سر میں جو زخم آئے اسے شج کہتے ہیں۔ ابو داؤد نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے اس قصہ و واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں اسے احتلام کی نوبت پیش آگئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ میرے لئے تیمم کی گنجائش و رخصت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا جب تمہیں پانی کے استعمال کی طاقت ہے تو ہم تیرے لئے کوئی رخصت نہیں پاتے (یعنی ہم ایسی حالت میں تمہیں تیمم کی اجازت نہیں دے سکتے) اپنے ساتھیوں کے کہنے کی بنا پر اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ جب ہم واپس ہوئے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فوت ہونے کی اطلاع دی (اور سارا واقعہ بیان کیا) آپؐ نے فرمایا ”ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر۔ جب انہیں مسئلہ کی نوعیت کا علم نہیں تھا تو انہوں نے دریافت کیوں نہیں کیا۔ بے خبری اور عدم واقفیت کا علاج دریافت کرنا ہے۔“ پھر آپؐ نے مندرجہ بالا ارشاد فرمایا۔ ”یہ اس کیلئے کافی ہوتا۔“ الخ۔ ﴿يعصِب﴾ تعصیب سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پٹی کو مضبوطی سے باندھنا۔ زخمی جگہ پر پٹی وغیرہ باندھنے سے پہلے تیمم کرنا۔ جنابت کا اثر زائل کرنے کیلئے ہے، جیسا کہ موزے پہننے سے پہلے پاؤں دھونا طہارت کیلئے

ہوتا ہے، تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھر ان پر مسح کیا جاسکے۔

راوی حدیث: ﴿وفیه اختلاف علی راویہ﴾ اس راوی کا نام عطاء ہے۔ اس سے جابر کے حوالہ سے بھی مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بھی اور ایک نسخہ میں ﴿علی رواۃ﴾ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء کے نیچے یعنی عطاء کے شاگردوں میں اختلاف رائے ہے۔

(۱۱۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ كَرِهَ تَيْمُمُ الرُّجُلِ بِالتَّيْمُمِ إِلَّا صَلَاةً وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلَاةِ الْآخَرَى. دارقطنی نے بہت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے (اس کو رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جَدًّا۔

لغوی تشریح: ﴿من السنة﴾ نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقہ۔

حاصل کلام: حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کے راوی حسن بن عمارہ ہیں اور وہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث نمبر ۱۳۰ اس کے بظاہر خلاف ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے۔ اس لئے تیمم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔

حیض (سے متعلق احکام) کا بیان

۱۰ - بَابُ الْحَيْضِ

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ دَمَ الْحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَأَنْسِكِي عَنِ الصَّلَاةِ، فَإِذَا كَانَ الْآخِرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالْحَافِظُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضہ کی دائمی مریضہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کہ ”حیض کے خون (کی رنگت) سیاہ ہوتی ہے، آسانی سے پہچان ہو سکتی ہے۔ جن ایام میں یہ خون آ رہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب کوئی دوسرا ہو تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔“ (ابوداؤد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم کے نزدیک یہ منکر ہے)

وَفِي حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ: وَلَتَجْلِسَ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ الْمَاءِ

ابوداؤد میں مروی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں

فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالْعَصْرِ غُسْلًا كَيْلَيْهِ اِيك غسل كر لے اور اسی طرح مغرب اور وَاِحْدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ عِشَاءِ كِي نماز كیلے ايك غسل كر لے اور نماز فجر كیلے غُسْلًا وَاِحْدًا، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلًا الْك سے ايك غسل كر لے اور ان كے درميان ميں وَاِحْدًا، وَتَوَضَّأُ فِي مَا بَيْنَ ذَلِكَ. وضو كر لے۔

لغوی تشریح: (باب الحيض) حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینہ خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص دن میں ہوتا ہے، ناامیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ یعنی زیادہ عمر ہونے سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا ﴿يعرف﴾ معرفت سے ماخوذ ہے۔ میغہ مجہول۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے؟ یہ بھی ایک رائے ہے کہ ﴿يعرف﴾ باب افعال سے ہے۔ اس صورت میں ”یاء“ پر ضمہ اور ”راء“ مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ خون کی بو ہی بتا دے گی کہ کونسا خون ہے؟ ﴿فاذا كان ذلك﴾ کاف کے نیچے کسر۔ یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ ﴿فامسكى﴾ امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ معنی نماز سے رک جا۔ ﴿فاذا كان الاخر﴾ جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ ﴿واستنكر﴾ اسے منکر قرار دیا۔ اس کے منکر ہونے کی وجہ اس حدیث کی سند میں عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ ہے۔ اس کا دادا غیر معروف آدمی ہے۔ ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ﴿ممكن﴾ بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا) اس میں ”میم“ پر کسرہ اور ”کاف“ پر فتح ہے۔ ﴿فاذا رأت صفرة فوق الماء﴾ جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ ﴿فلتغتسل للظهر والعصر غسلا واحدا﴾ تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کیلئے ایک ہی غسل کر لینا چاہئے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کیلئے کر لے۔ ﴿وتنوضا فيما بين ذلك﴾ ان دونوں (ظہر اور عصر) اور مغرب و عشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کیلئے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

حاصل کلام: نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض (ایام ماہواری) دوسرا دم نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم و بیش جاری رہتا ہے اور تیسرا دم استحاضہ۔ استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس یوم کے علاوہ جاری رہے۔ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں

کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہو سکتا ہے۔ ملکی، موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ صائب ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا﴾ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی۔ وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا جن سے ایک عبد اللہ ہے۔ غزوہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ذہن نشین رہے کہ عیسٰی عربی قوائد کی رو سے تصغیر ہے)

(۱۱۹) وَعَنْ حَمَّةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيرَةً شَدِيدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحِيَّ سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَأَتْ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ أَوْ ثَلَاثَةً وَعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذَلِكَ يُجْزِيكَ، وَكَذَلِكَ فَأَفْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ، فَإِنَّ قَوِيَّتَ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعْبِلِي الْعَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَظْهَرِينَ، وَتُصَلِّيَنِ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ الْمَغْرِبَ وَتُعْبِلِينَ الْعِشَاءَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ،

حضرت حمہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے عارضہ استحاضہ میں مبتلا رہتی تھی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں استفسار کیلئے حاضر ہوئی تو آپ نے فرمایا ”یہ تو شیطان کی چوک (مار) ہے۔ لہذا تو چھ یا سات روز ایام حیض شمار کر کے پھر نہالے، جب تو اچھی طرح پاک و صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تیس روز نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔ یقیناً یہ تیرے لئے کافی ہے پس ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب پاک و صاف ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں کو اکٹھا کر پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر کے غسل کر لے اور جمع صلاتیں کر لے۔ تو ایسا کر لے (یعنی ایسا کرنے کی اجازت ہے) اور صبح کی نماز کیلئے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔“ پھر فرمایا ”دونوں

فَأَمْعَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔“
وَتُصَلِّينَ، قَالَ: وَهُوَ أَعْجَبُ (اس کو نسائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی
الْأَمْرَيْنِ إِلَيَّ)۔ رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے حسن کہا ہے)
وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ الْبُخَارِيُّ۔

لغوی تشریح: ﴿استفتیہ﴾ میں نے آپؐ سے فتویٰ پوچھا۔ ﴿رکضہ﴾ چوک مارنا وغیرہ۔ ﴿فتحیضی ستہ ایام او سبعة ایام﴾ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کسی کو سات روز۔ اس میں عمر اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ ﴿فاذا استنقأت﴾ جب تو پاک صاف ہو جائے۔ ﴿صومی و صلی﴾ روزہ رکھ، نماز پڑھ، فرض ہو یا نفلی جو جی میں آئے ﴿وہو اعجب الامرین الی﴾ الامرین سے مراد ہر نماز کیلئے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا (یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے)
حاصل کلام: اس حدیث سے حمنہ بنت جحشؓ کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایک ظہر اور عصر کیلئے دوسرا مغرب اور عشاء کیلئے اور تیسرا نماز فجر کیلئے۔ اس سے پہلے حدیث میں فاطمہ بنت ابی جحشؓ کو ہر نماز کیلئے وضو کا حکم دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے البتہ ہر نماز کیلئے از سر نو وضو فرض ضرور ہے۔ غسل بس مستحب ہے وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿حمنہ بنت جحش﴾ حمنہ میں ”حا“ اور جحش کی جیم دونوں پر فتح ہے اور ”میم“ اور ”حا“ دونوں ساکن ہیں۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کی بہن تھیں۔ پہلے یہ مصعب بن عمیرؓ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوہ احد میں مصعب شہید ہو گئے تو یہ طلحہ بن عبد اللہؓ کی زوجیت میں آگئیں۔

(۱۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الدَّمَ، فَقَالَ: «أَمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكَ حَبِضَتُكَ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، وَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلَاةٍ. رواه مسلم.

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحشؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دم استحاضہ کا شکوہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”تمہارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے سے متعین ہیں اتنے ایام میں (نماز، روزہ) چھوڑ دے۔ اس کے بعد نہادھو کر نماز ادا کرو۔“ ام حبیبہؓ اس کے بعد ہر نماز کیلئے تازہ غسل کیا کرتی تھیں۔ (مسلم)

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ ”پھر ہر نماز کیلئے وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ «وَتَوَضَّعِي

لِكُلِّ صَلَاةٍ. وَهِيَ لِأَبْنِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ اِزْ سَرْنُو وَضُو كَر لِيَا كَر۔“ ابو داؤد وغیرہ محدثین نے مِنْ وَجْهِ آخَر۔ اس حدیث کو دوسرے طریقے سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تَحْبِثُكَ﴾ تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ چنانچہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کیلئے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ، استحاضہ کے خون اور حیض کے خون کو ان کی تین علامات میں سے کسی کی بنیاد پر دونوں میں فرق کرے گی۔ جہاں تک دونوں خونوں میں تمیز کا تعلق ہے تو اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے اس کی بو بھی بڑی کریہ ہوتی ہے اور استحاضہ کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ رقیق یعنی پتلا ہوتا ہے یا پھر خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے یا پھر دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آسکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقہ اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند اور کند ذہن عورت اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے اور جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں وہ بحث بڑی دقیق، گنجشک اور مغلق ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید ہے بلکہ بہت ہی دور ہے اور یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو سہل الفہم ہے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جہور کے نزدیک تطوع کی ہے۔ ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کیلئے از سر نو غسل کرنا فرض و واجب قرار نہیں دیا۔ فسخ الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کیلئے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے۔ اس کے بعد ہر نماز کیلئے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ مذکورہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنا چاہئے۔ پھر جس علامت سے اس کو پہچان ہو جائے، اسی پر کل بند ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ام حبیبہ رضی اللہ عنہا﴾ بعض کا خیال ہے اس سے حمہ بنت جحش ہی مراد ہے۔ ایسا نہیں

بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمن بن عوف کے نکاح میں تھیں۔ مسلم کی روایت کی رو سے انہیں مسلسل سات سال تک استحاضہ کا مرض لاحق رہا۔ ۴۳ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہا بعض نے کہا کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضہ استحاضہ کا شکار تھیں۔ ایک ام المومنین زینب، دوسری حمہ اور تیسری ام حبیبہ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضہ سے محفوظ تھیں۔ کتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو مستحاضہ کے عارضہ میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لَا نَعُدُّ مَا هَوَارِيَّ كَے اختتام پر) نہادھو کر پاک و صاف ہونے الكُدْرَةِ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطَّهْرِ شَيْئًا. کے بعد گلے اور زرد رنگ کی چیز کو (اس چیز کے رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ. خارج ہونے کو) کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں (یعنی ایسے مادہ کے خروج کو حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔)

(بخاری، ابوداؤد، متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿الكُدْرَةُ﴾ میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ ﴿والصفرة﴾ زنگ والی رنگت۔ جس پر زردی غالب ہو۔ ﴿بعد الطهر﴾ ایام حیض سے پاک و صاف ہونے کے بعد۔ ﴿شئاً﴾ یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جبکہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جاتی تو ہم حیض شمار نہیں کرتے تھے۔

حاصل کلام: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی دوران ایام حیض میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور ﴿بعد الطهر﴾ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے شمار کرتی تھیں۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا۔ آپ کی اس پر خاموشی، تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ام عطیہ رضی اللہ عنہا﴾ ان کا اسم گرامی نسیبہ تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین مرتبہ کی صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوہ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ان کو

نہلایا۔ بصرہ کے ایام مقام میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی اصل حدیث غسل میت کے بارے میں ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(۱۲۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اضْغَعُوا كُلَّ شَيْءٍ (اے مسلمانو!) تم ہم بستری کے علاوہ ہر قسم کا فعل عورت کے ساتھ کر سکتے ہو۔» (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لم يواكلوها﴾ یعنی اس (ایام ماہواری میں مبتلا) عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے نہ تھے۔ ﴿الانكاح﴾ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی سے مسلمانوں کیلئے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا، لیٹنا، کھانا اور پینا سب جائز ہے صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہنود و یہود کے ہاں ہے مسلمانوں کیلئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۱۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَتَزَرُّ، فَيَبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿فاتزر﴾ باب افتعال سے صیغہ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں میں ازار پہن لیتی۔ ﴿فیباشرنی﴾ میرے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے علاوہ ہوتا تھا۔ یعنی مباشرت جماع کے معنی میں نہیں ہے۔

حاصل کلام: ﴿بأشربا شرباً مباشرة﴾ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے منکرین حدیث کی کہ انہوں نے عوام کو احادیث نبویہ سے بدظن اور متفر کرنے کیلئے اس کا معنی کیا ہے کہ نفوذ باللہ آنحضور ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں کہ احادیث جھوٹی ہیں، یہ قابل اعتبار نہیں حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانا ہے تو اس سے جماع کے معنی کرنا بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔ شریعت نے زیر ناف کے علاوہ عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(۱۲۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي رِوَايَةٍ كَرَّتْ فِيهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

ﷺ، فِي الَّذِي يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، قَالَ: «يَتَصَدَّقُ بِدِينَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِينَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَرَجَّحَ غَيْرُهُمَا وَفَقَّهَهُ. اپنی بیوی کے پاس ایسی حالت میں جائے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو ”وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ و خیرات کرے۔“ (اس حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے۔ حاکم اور ابن قتان دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے اسے موقوف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یاتی امراتہ﴾ کا معنی ہے کہ اپنی بیوی سے جماع کرے اور جہاں تک دینار یا نصف دینار خیرات کرنے کا تعلق ہے تو ایک گروہ نے اسے جائز رکھا ہے جبکہ دوسروں نے حدیث میں اضطراب اور عدم صحت کی وجہ سے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ پھر جو لوگ کفارہ کے قائل ہیں ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ دینار یا نصف بیان کرنا راوی کا تردد ہے اور ان میں سے کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ یہاں نوعیت بتانا مقصود ہے کہ اگر حیض کا آغاز ہو تو ایسی حالت میں جماع کرنے والا ایک دینار صدقہ کرے اور دوسری کوئی نوعیت ہو تو نصف دینار خیرات کرے۔ ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اختیار دیا گیا ہے خواہ دینار صدقہ کرے خواہ نصف دینار۔ بہر حال یہاں امر وجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب ہے۔ باعتبار دلیل یہی رائے قابل ترجیح ہے۔

(۱۲۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَارِشَادُ غَرَامِي هِيَ «كَيْمَا عَوْرَتُ جِبِ حَالَتِ حَيْضٌ فِيهَا هِيَ تَوْنَمَازُ اَوْر رُوْزَه چھوڑ نہی اَلْمَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟». مَنَقُوْ دیتی؟“ (بخاری، مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا کٹا ہوا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اليس﴾ اس میں ممرزہ انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جب نفی کا انکار ہو تو اثبات ثابت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ شریعت میں تو ایسی عورت کیلئے ترک صلاۃ و صوم ثابت ہے (البتہ روزے دوسرے ایام میں قضا کرے گی۔ دلائل سے یہ ثابت ہے) جبکہ نماز کی قضا نہیں۔ اس لئے اس کا قضا کرنا عورت کے بس میں نہیں ہے۔

(۱۲۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا جِئْنَا سَرَفَ حِصْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «افْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوْفِيْ طَرَح ادا کرو جس طرح دوسرے حاجی کرتے ہیں

بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهَرِيْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي الْبَيْتِ طَوَافِ بَيْتِ اللّٰهِ اَيَّامَ سَے فارغ ہو کر نماز دھو کر
حدیث طویلہ۔
کرنا۔“ (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لَمَّا جِئْنَا﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے دوران سفر کا واقعہ ہے۔ اس
وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿سُفْر﴾ سین پر فتحہ اور ”راء“ پر کسره۔ غیر منصرف
ہے دو اسباب کی وجہ سے ایک علیت یعنی جگہ کا نام اور دوسرے تانیث کی وجہ سے۔ مکہ کے قریب ایک
جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلہ پر۔ ﴿حِصْنٌ﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری
شروع ہو گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طواف
کیلئے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ناپاک عورت تو مسجد میں داخل
بھی نہیں ہو سکتی خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے۔ اس لئے طواف بدرجہ اولیٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایسی حالت
میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲۷) وَعَنْ مُعَاذِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَضْرَتِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ سَے روایت ہے کہ انہوں
تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، مَا
يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنْ اَمْرَاتِهِ وَهِيَ
حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الْاِزَارِ». حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”پاجامہ یا تہ بند میں جسم کا
زَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَهُ.

ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار

دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الازار﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو ازار سے مراد جماع و باہم ہم بستری یعنی شوہر
کیلئے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کر گزرنا جائز ہے اور دوسرا معنی پاجامہ و تہ بند کی جگہ یعنی ناف سے گھٹنے
تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ جسم سے مباشرت حلال ہے اور دوسرے معنی کی رو سے تو یہ حضرت انس
رضی اللہ عنہ کی حدیث ۱۴۱ کے الفاظ ﴿اصنعوا كل شئ الا النكاح﴾ کہ جماع کے علاوہ ہر قسم کا کام اس سے
کرو۔ کیونکہ سابقہ حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے اور اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے
حصہ سے استمتاع کی ممانعت ہے مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے۔ ثانیاً اس سے مراد صرف جماع اور وطی
ہے جس سے یہ پہلی روایت کے معارض نہیں رہتی۔

(۱۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا حَضْرَتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد
تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتْ الْفُسَاءُ رَسَالَتِ مَآبِ ﷺ میں عورتیں بچے کی ولادت کے
تَفْعُدُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ بعد چالیس روز تک ناپاک بیٹھی رہتی تھیں۔ (نسائی

نَفَاسِهَا أَرْبَعِينَ يَوْمًا . رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا كَ الْعَلَاوَةِ پَانچوں نے اسے روایت کیا ہے اور متن حدیث النَّسَائِي، وَاللَّفْظُ لِابْنِ دَاوُدَ . کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔)

وَفِي لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے بِقَضَاءِ صَلَاةِ النَّفَاسِ . ایام نفاس میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ . دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿نفاس﴾ نون پر ضمہ، فا اور سین پر فتح۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنہوں نے بچے کو جنم دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا رہتا ہے۔ ﴿اربعین یوما﴾ چالیس روز نفاس کی کثرت ہے۔ ابن ماجہ میں ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حالت نفاس میں مبتلا عورتوں کیلئے مدت نفاس چالیس روز مقرر فرمائی، البتہ اگر وہ چالیس روز سے پہلے پاک ہو جائے تو (اس کی مدت یہی شمار ہوگی) حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی اکثر مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں، ہاں اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی۔ اس حالت میں نماز، روزہ ترک نہ کئے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ البتہ نفاس کا حکم تو حیض کی طرح ہے۔ نفاس والی عورت، نماز روزہ ترک کر سکتی، مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں کر سکتی۔ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے اجتناب کرے گی۔ اس دوران جتنے روزے چھوٹ گئے تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی۔ نماز کی قضا نہیں دے گی۔



۲۔ کتاب الصَّلَاةِ

نماز کے احکام

اوقات نماز کا بیان

۱۔ باب المَوَاقِيتِ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور نماز عصر کے وقت کے آغاز تک رہتا ہے اور عصر کا وقت جب آدمی کا اصل سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے (تب شروع ہوتا ہے) اور نماز عصر کا آخری وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے اور نماز مغرب کا وقت (غروب آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوتا اور) شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت رات کے درمیان نصف تک ہے اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے آغاز سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔“ (مسلم)

(۱۲۹) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتْ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطَوْلِهِ، مَا لَمْ يَخْضِرِ الْعَصْرُ، وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفُرِ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور اسی (یعنی مسلم) میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے کہ ”سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں ہو“ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آفتاب بلند ہو۔“

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ بُرَيْدَةَ فِي الْعَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيَضَاءُ نَقِيَّةٌ» وَمِنْ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ».

لغوی تشریح: ﴿کتاب الصلوة﴾ صلاة کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں معروف

عبادت کو کہتے ہیں۔ ﴿باب المواقیت﴾ مواقیت، میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ بلحاظ زمانہ یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ ﴿اذا زالت الشمس﴾ جب سورج زوال پزیر ہو۔ یعنی آسمان کے عین درمیان سے جب بجانب مغرب سورج ڈھل جائے۔ ﴿وکان ظل الرجل کطوله﴾ اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو۔ یعنی عصر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ ﴿مالم یحضر العصر﴾ تاوقتیکہ نماز عصر کا وقت آجائے۔ یعنی آدمی کا (اصلی) سایہ اس کے قد کے برابر ہونا۔ ﴿الشفق﴾ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ ﴿الی نصف اللیل الاوسط﴾ یہاں لفظ اوسط نصف کی صفت بن رہی ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ اوسط کہلائے گا۔ اب پہلے نصف حصہ رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ ﴿نقیۃ﴾ فعیلہ کے وزن پر آیا ہے۔ صاف ستھرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا صاف و شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ ﴿مرتفعۃ﴾ آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کئے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل ثابت ہوتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام زفر رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے، ایک روایت کی رو سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے بھی اسی طرح ہے لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ علمائے احناف نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کسی صحیح مرفوع حدیث سے بھی دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اس حدیث سے ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر سرخی نمودار ہوتی ہے اس کے معاً بعد جو سفیدی ظاہری ہوتی ہے شفق سے وہ سفیدی مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

اس حدیث میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے یعنی جب سورج طلوع ہونے لگے تو نماز بند کر دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سیگوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اس لئے عین غروب شمس کے وقت نماز پڑھنی شروع

وَعِنْدَهُمَا مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ: اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، کہ آپؐ نماز عشاء «وَالْعِشَاءُ أَحْيَانًا يُقَدِّمُهَا، وَأَحْيَانًا يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَأَاهُمْ اجْتَمَعُوا عَجَلًا وَإِذَا رَأَاهُمْ أَبْطَأُوا آخَرًا، وَالصُّبْحُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيَهَا بِغَلَسٍ. وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي مُوسَى: اندھیرے ہی میں پڑھتے (بخاری و مسلم) مسلم میں «فَأَقَامَ الْفَجْرَ حِينَ انْشَقَّ الْفَجْرُ، وَالنَّاسُ لَا يَكَادُ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا». ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرمادیتے یہاں تک کہ اندھیرے کی وجہ سے صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿رحلہ﴾ ”راء“ پر فتح ”حاء“ ساکن، جائے سکونت۔ ﴿فی اقصی المدينہ﴾ گرائمر کے اعتبار سے یہ رحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینہ کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ ﴿والشمس حية﴾ اس میں ”واو“ ﴿یرجع﴾ کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں، نماز سے فراغت کے بعد جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (یعنی عصر کی نماز اتنی جلدی ادا کی جاتی تھی) اور سورج کے زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی باقی ہوتی تھی۔ اور ﴿من العشاء﴾ میں من تبعضیہ ہے مطلب یہ ہے عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپؐ کو پسند تھی۔ ﴿ینفصل﴾ ینصرف کے معنی، میں فارغ ہوتے، پھرتے ﴿الغداة﴾ فجر، صبح ﴿بالمستین﴾ ساٹھ آیات سے۔ ﴿الی المائۃ﴾ سو تک۔ یعنی آیات اگر لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر میں ساٹھ آیات تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی بھی دوسرے ساتھی کو (اچھی طرح) پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قرأت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے ﴿الغسل﴾ اول وقت ہوتی ہے اسے غلے کہتے ہیں۔ ﴿انشق﴾ پھٹنا، تاریکی شب سے سپیدہ صبح کا ظہور ہونا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں لفظ ”غسل“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپؐ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی ترتیل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجئے کہ آپؐ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھنی چاہئے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ابوبرزہ اسلمیؓ﴾ ابوبرزہ ان کی کنیت ہے۔ نفلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور بعد والے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر بعد میں خراسان میں چلے گئے اور ایک قول کے مطابق مرو میں ۶۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ھ ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَوَى عَنْهُ رَوَيْتَ كَرْتِي هِيَ كَمَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا بِمِنَازِ مَغْرِبِ نَبِيِّ كَرِيمٍ ﷺ كَسَاثَهِ يَضْهَتِ بِهَرَمٍ نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، مِّنْ سَعَةِ كَوْنِي نَمَازٍ سَعَةِ فَارِغٍ هُوَ كَرَوَافِسٍ هُوَ تَوَاتِي فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيَنْصَرِفُ مَوَاقِعَ رُوشَنِي أَهْبَى بَاقِي هَوَاتِي تَهَيُّ كَمَا تِيرَ كَرْنِي كِي جَلَّه نَبِيَّهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مواقع نبلہ﴾ موقع کی جمع۔ تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ ﴿والنبل﴾ نون پر فتح اور ”با“ ساکن۔ ان لفظوں میں اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہیں تیر۔ حاصل کلام: نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿رافع بن خدیجؓ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ کم عمری و صغر سنی کی وجہ سے غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوہ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالْعِشَاءِ، حَتَّى ذَهَبَتْ عَامَّةُ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَوْ قُتِلَ، لَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمَّتِي»، رَوَاهُ مُسْلِمٌ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کی رات کا اول حصہ زیادہ تر گزر گیا تھا۔ آپؐ نماز کیلئے تشریف لائے اور نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر (یہ وقت) گراں نہ ہوتا تو میں نماز عشاء کا یہی وقت مقرر کرتا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعتَم﴾ تاخیر کی، دیر کی اعتمام سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ﴿عتمہ﴾ میں داخل ہوئے۔ عتمہ، شفق کے غائب ہونے کے بعد، یا مطلق تاریکی کے غائب ہونے کے بعد رات کے تیسرے حصے کے گزر جانے کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ ﴿العتمہ﴾ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تاخیر اور دیر کے ہیں۔ ﴿عامۃ اللیل﴾ رات کا اکثر حصہ۔ ﴿انہ لو قتلہا﴾ اس سے مختار وقت بھی مراد ہو سکتا ہے اور افضل وقت بھی۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے

ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز کیلئے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے اگر دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ تو گویا آنحضور ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے جو چیز افراد امت کیلئے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اسے آسان اور سہل بنانے کی کوشش فرماتے۔

(۱۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا» (تھنڈے وقت میں) نماز پڑھو (یعنی ذرا انتظار کر بالصلاة، فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحٍ لَوْ كُنْتُمْ غَرَمْتُمْ). شدة جنم کی سانس کی لپیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ جہنم۔ مَنَقَّ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فابردوا﴾ ابراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ ﴿بالصلاة﴾ سے مراد نماز ظہر ہے یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ ﴿من فيح جهنم﴾ فيح کی ”فا“ پر فتح اور ”یا“ ساکن ہے۔ جنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ اور اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور جنم کے سانس کو بھی فيح کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہئے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہئے؟ اس بارے میں ابو داؤد اور نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک ہو جاتا۔ مگر علامہ خطابی نے کہا کہ یہ بھی تمام ممالک کیلئے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد و عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہر حال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔

(۱۳۴) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَصْبَحُوا بِالصُّبْحِ» (اس کو پانچوں احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے وصَّحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حَبَّانَ۔ رَوَاهُ الْخَمْسَةُ۔ موجب ہوگی۔) (اس کو پانچوں احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے وصَّحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حَبَّانَ۔ رَوَاهُ الْخَمْسَةُ۔ موجب ہوگی۔)

اسے صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿اصبحوا بالصبح﴾ اور ایک دوسری روایت میں ﴿اصبحوا بالصبح﴾ کے بجائے ﴿اسفروا بالفجر﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر

اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث فلس والی حدیث کے معارض ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قرأت لمبی کی جائے کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے ”اسفار“ کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

حاصل کلام: احناف نے اسی حدیث کی روشنی میں اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے دائمی عمل، خلفائے راشدین، جمہور صحابہؓ اور تابعینؓ کے عمل کی بناء پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ابو داؤد میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ایک بار نماز فجر فلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ فلس ہی میں پڑھتے رہے۔ حدیث کا مطلب صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

(۱۳۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”طلوع آفتاب سے پہلے جس نے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔“

(بخاری و مسلم)

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اسی طرح بیان ہے مگر اس میں رکعت کی جگہ (سجدة) کا لفظ ہے پھر کہا کہ (سجدة) سے مراد تو رکعت ہی ہے

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوَهُ، وَقَالَ: «سَجْدَةٌ» بِذَلِكَ «رَكْعَةٌ» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرُّكْعَةُ.

لفظی تشریح: ﴿لا صلاة﴾ یعنی کوئی نماز۔ اس سے نفل نماز مراد ہے۔ ﴿بعد الصبح﴾ یعنی نماز فجر کے بعد کوئی نفل نماز جائز نہیں۔ ﴿من ادرك ركعة﴾ جس نے ایک رکعت پالی۔ یعنی مکمل ایک رکعت، قیام، قراءۃ فاتحہ اور رکوع و سجود پالے۔ ﴿قبل ان تطلع الشمس﴾ یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے ﴿فقد ادرك الصبح﴾ تو اس نے صبح پالی۔ یعنی اس کی نماز ادا ہو گئی۔ (قضاء نہیں ہوئی)

حاصل کلام: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کر لی پھر طلوع یا غروب آفتاب کا موقع آگیا تو نمازی کو چاہئے کہ دوسری رکعت پوری کر لے

اس کی نماز ہو جائے گی۔

(۱۳۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ ”صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور اسی طرح نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کے الفاظ ہیں کوئی نماز، نماز فجر کے بعد نہیں۔ اور مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے۔ اول یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو تا آنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم جب سورج نصف آسمان پر ہو تا وقتیکہ وہ ڈھل نہ جائے اور سوم جس وقت سورج غروب ہونا شروع ہو۔ دوسرا حکم (یعنی نصف النہار کے وقت نماز کی ادائیگی ممنوع ہونا) امام شافعی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے، مگر اس میں (الایوم الجمعة) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو) اور ابوداؤد نے بھی حضرت ابوقحادہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مانند روایت نقل کی ہے (جس میں جمعہ کے دن کا اشتراء ہے)

وَالْحُكْمُ الثَّانِي عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ وَزَادَ: «إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ» وَكَذَا لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

لغوی تشریح: ﴿لاصلاة﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿بعد الصبح﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿نقبر﴾ ”با“ پر ضمہ اور کسرو۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿موتانا﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔ ﴿بازغہ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿الظہیرہ﴾ نصف

لغوی تشریح: ﴿لاصلاة﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿بعد الصبح﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿نقبر﴾ ”با“ پر ضمہ اور کسرو۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿موتانا﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔ ﴿بازغہ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿الظہیرہ﴾ نصف

النتہار یعنی آدھے دن کا وقت۔ جب سورج چند ساعت کیلئے سیدھا قائم ہوتا۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ ادھر، ادھر، مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ﴿تذول﴾ آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہونا۔ ﴿تنصیف﴾ بھی مائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿والحکم الشانی﴾ سے مراد عین نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ ﴿وکذا لابی داود﴾ ابو داؤد میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جو کام ممنوع ہیں ان کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا یہ کہ میت کو ان تین اوقات میں دفن نہ کریں۔ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اور دوسرا حکم یہ کہ دوپہر کا وقت ہے۔ جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو، مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنا یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جمعہ کا دن ایسا ہے کہ جس میں زوال کے وقت نوافل ادا کئے جاسکتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ جمعہ کے روز زوال کے وقت نماز جمعہ بھی ادا کی جاسکتی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جمعہ کے دن کا اشتناء صراحت کے ساتھ منقول ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے اور حدیث میں جو طلوع آفتاب کے بعد ”ترتفع“ کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے تو اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابو داؤد اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزہ مذکور ہے جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزہ برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿عقبہ بن عامر جھنی رضی اللہ عنہ﴾ عین پر ضمہ اور ”قاف“ ساکن۔ ان کی کنیت ابو حماد یا ابو عامر ہے۔ قدیم الحجاز تھے۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معرکہ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تین سال مصر کے والی رہے۔ نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لَا تَمْنَعُوا أَحَدًا طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ، (کہ وہ طواف نہ کوئے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے وَصَلَى أَبَتَهُ سَاعَةً شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بیت اللہ کا طواف کرنے والے کسی کو مت منع کرو

کو نماز پڑھنے سے منع کرو) خواہ وہ شب و روز کی

نَهَارٍ. رَوَاهُ الْحَمَّسِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ
 ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور
 جِبَانٌ.

ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿یا بنی عبد مناف﴾ عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لئے کیا ہے کہ یہ اس وقت
 کعبہ کے متولی تھے۔ ﴿وصلی اية ساعة شاء..... الخ﴾ یہ الفاظ ممنوعہ تین اوقات میں بھی نماز پڑھنے
 کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن احادیث میں ممانعت ہے یہ حدیث اس عام حکم کو بیت اللہ کی وجہ
 سے خاص قرار دیتی ہے کہ بیت اللہ میں یہ ممانعت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکور وہ کوئی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے۔ بعض
 حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ عام نوافل
 اس سے مراد نہیں مگر ابوداؤد میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل مراد
 ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے جمہور علماء
 اسے خانہ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی
 بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿جبر بن مطعم رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو امیہ تھی۔ جبر تصغیر ہے جابر سے۔
 پورا نام جبر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی تھا۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔
 خاندان قریش کے نسب نامے کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔
 ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴ھ، ۵۵ھ یا ۵۹ھ کو فوت ہوئے۔

﴿عبد مناف﴾ مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد
 مناف کہلائے۔ ورنہ ان کا نام تو مغیرہ تھا، کنیت ابو عبد شمس تھی۔ بنو مخزوم اور بنو عبد مناف دونوں سے
 تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ ﷺ کے جد امجد تھے۔ قریش کے ذی وقار سردار شمار ہوتے
 تھے۔

(۱۳۸) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ارشاد ہے کہ ”شفق سے مراد سرفی ہے۔“ (دارقطنی
 «الشفق الحُمْرَة». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ نے کہا ہے
 وَصَحَّحَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَفَقَّهُ. صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿الشفق الحُمْرَة﴾ شفق سے مراد سرفی ہے (جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق
 آسمان پر نمودار ہوتی ہے) بلوغ الحرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ لغوی بحث کیلئے اہل لغت کی طرف
 رجوع کیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں۔ ان کی بات دلیل و حجت ہے خواہ موقوف ہی

کیوں نہ ہو۔ لغت کی مشہور کتاب ”القاموس“ میں شفق کا معنی وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب سے لے کر عشاء تک یا اس کے قریب تک آسمان پر نمودار رہتی ہے۔

حاصل کلام: شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اس تعریف پر تمام آئمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تھا اس کے خلاف شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دو شاگردان رشیدان نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(۱۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْفَجْرُ فَجْرَانِ، فَجْرٌ يُحْرَمُ الطَّعَامُ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلَاةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلَاةُ، أَيُّ صَلَاةِ الصُّبْحِ، وَتَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ». رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالتَّحَاكِمُ، وَصَحَّاحُهُ، وَلِلتَّحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ فِي الَّذِي يُحْرَمُ الطَّعَامُ: إِنَّهُ يَذْهَبُ مُسْتَعِيلًا فِي الْأَفْقِ. وَفِي الْآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَّبَ الشُّرَحَانُ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”فجر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ فجر جس میں کھانا حرام ہے اور نماز ادا کرنا جائز و حلال اور ایک وہ فجر ہے جس میں نماز پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔“ (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے) اور مستدرک حاکم میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ”جس صبح میں کھانا حرام ہے وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں پھیل جاتی ہے اور دوسری بھیڑیے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿بحرم الطعام﴾ کھانا حرام کرتی ہے روزے دار کیلئے ﴿وتحل فيه الصلوة﴾ اور اس میں نماز جائز و حلال ہے یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد صبح صادق ہے۔ ﴿زاد﴾ یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ ﴿فی الذی﴾ اس فجر میں جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے یعنی مشرقی کنارے پر اور ”افق“ آسمان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس و معلوم ہوتا ہے اور بخاری کی ایک روایت میں تو اس طرح بھی منقول ہے کہ آپؐ نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر سمجھایا۔ ﴿وفی الآخر﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس سے وہ فجر مراد ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کیلئے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ ﴿کذب السرحان﴾ کاف برائے تشبیہ اور ذنب میں ذال اور نون پر فتح۔ معنی بھیڑیے کی دم۔ ﴿والسرحان﴾ سین پر کسرہ اور ”راء“ ساکن۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو یہ ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی

ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب۔ دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(۱۴۰) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الصَّلَاةُ فِي سَاعَةِ الْفَجْرِ» (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کرنا ہے)۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، کیلئے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس وَصَحَاهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ۔ حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری احادیث میں ایمان، صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ ساری احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں، ان میں موافقت اور تطابق اس طرح ہوگا۔ ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے لہذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے اور نماز کا تعلق بدنی عبادت سے ہے، یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے اور صدقہ کا تعلق مالیات سے ہے، مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی و توانائی، صحت کاسب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی منافات نہیں رہتی۔ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

(۱۴۱) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوَّلُ الْوَقْتِ رِضْوَانُ اللَّهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللَّهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جَدًّا وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوَهُ دُونَ الْأَوْسَطِ وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضًا۔ حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اول وقت میں (نماز پڑھنا) رضاء الہی کا موجب ہے اور درمیانی وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الہی کا سبب ہے اور اس کو آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ سے معافی کا موجب ہے۔“ (دارقطنی نے اسے نہایت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن

اس میں لفظ وسط مذکور نہیں اور وہ ضعیف بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿دون الاوسط﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانی وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں تو صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔ یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک دارقطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطے سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظر انداز ہی کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث

وضع کیا کرتا تھا اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے، جسے متمم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ محدثین ناقدین کی نقد و جرح کے بعد حدیث قابل اعتنا ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: ﴿ابو محذورۃ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام سرہ یا اوس تھا۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ نماز پنج گانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(۱۴۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ الْفَجْرِ إِلَّا سَجْدَتَيْنِ». أَخْرَجَهُ الْحَمَّصُ إِلَّا النَّسَائِيَّ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”فجر کی (فرض نماز) کے بعد صرف دو سنتوں کے علاوہ اور کوئی (نفل) نماز نہیں۔“ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «لَا صَلَاةَ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكْعَتَيْنِ» اور عبد الرزاق کی روایت میں ہے کہ ”طلوع فجر کے بعد صرف فجر کی دو رکعات ہیں اور دار قطنی میں ابن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ عمرو بن العاص۔

لغوی تشریح: ﴿لا صلوة بعد الفجر﴾ بعد الفجر سے مراد طلوع فجر ہے۔ ﴿الاسجدتين﴾ یہاں سجدتین کا معنی رکعتیں ہے (دو رکعتیں) اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے سجدتین کی جگہ۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔

(۱۴۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْعَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ بَيْتِي، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: شَغِلْتُ عَنْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الْآنَ. قُلْتُ: أَتَنْفِصُهُمَا إِذَا قَاتَا قَالَ: «لَا». حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض کیا یہ دو رکعت کیسی ہیں؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا ”ظہر کے فرائض کے بعد کی دو سنتیں پڑھ نہیں سکا تھا وہ اب میں نے پڑھی ہیں۔“ میں نے پھر عرض کیا کہ اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضا دیا کریں۔ فرمایا ”نہیں۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَابْنُ دَاوُدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا بِمِثْلِهِ.

کیا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

طرح کی روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿شغلت﴾ صیغہ مجہول۔ اس کا معنی ہے کہ مجھے روک دیا گیا۔ اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلہ عبد القیس کے کچھ لوگوں کی آمد نیز صدقہ کا مال بھی پہنچ گیا تھا۔ تقسیم مال اور ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں وہ میں نے ابھی پڑھی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا کریں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”تم اس وقت انہیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو۔“ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد ان سنتوں کی قضا نبی ﷺ کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کیلئے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد ہمیشہ انہیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیا تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپ کی خصوصیت تھی۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کی قضا رسول اللہ ﷺ کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ اور علامہ الیمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ ”افنقضیہما اذا فاتتا سلم قال لا“ کہ کیا جب رہ جائیں تو ہم ان کی قضا دیں؟ تو آپ نے فرمایا ”نہیں“ ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضا نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی تفصیل ”اعلام اہل العصر“ میں شارح ابوداؤد شیخ شمس الحق محدث ڈیاناوی نے خوب بیان کی ہے۔

اذان کا بیان

۲ - باب الأذان

حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو اللہ اکبر اللہ اکبر پھر اس نے ساری اذان کہی چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ بغیر ترجیع کے اور اقامت میں صرف ایک ایک مرتبہ کہا، مگر (قد قامت الصلاة) کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپ کو سنایا) آپ نے فرمایا ”یقیناً یہ خواب سچا ہے۔“ (اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

(۱۴۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَلَفَ بَنِي - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الْأَذَانَ بِتَرْبِيعِ التَّكْبِيرِ بِغَيْرِ تَرْجِيعٍ، وَالْإِقَامَةَ فَرَادَى، إِلَّا «قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ»، الْحَدِيثُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُرَيْمَةَ.

ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلَالٍ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ «الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں «الصلاة خير من النوم» کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا سنت ہے کہ السنۃ إذا قال المؤذن في الفجر «الصلاة خير من النوم» قال: «الصلاة خير من النوم».

لغوی تشریح: ﴿بتریع التكبير﴾ اللہ اکبر کی تکبیر کو چار مرتبہ کہنا۔ ﴿بغير ترجيع﴾ ترجیع کا معنی ہے کہ اذان میں ﴿اشهد ان لا اله الا الله﴾ کو پہلے پست آواز (آہستہ آواز) سے ادا کرنا، دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا ﴿والاقامة﴾ اس سے مراد کلمات اقامت ہیں ﴿فرادی﴾ اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا البتہ ﴿قد قامت الصلاة﴾ دو مرتبہ ﴿لنؤيها حق﴾ ”لام“ اس میں برائے تاکید ہے اور رویا حق کی طرف مضاف ہے یا مراد ہے وہ خواب جو عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا حق ہے۔ اس کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف تصور ہوگی اور وہ لفظ ﴿بتمامه﴾ ہو سکتا ہے یا پھر دوسری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے (الحديث) تو اس صورت میں ”اقرا الحديث وتممه“ ہوگا اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ﴿الى آخر الحديث﴾ ہوگا۔ ﴿زاد احمد في آخره﴾ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ احمد نے عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اضافہ حدیث بلال (رضی اللہ عنہ) میں ہے، تاکہ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مراد یہ امام احمد رضی اللہ عنہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں ﴿الصلاة خير من النوم﴾ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کیلئے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ بعض نے کہا نماز کیلئے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے ”بوق“ (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کیلئے اذان دی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو باواز بلند ”الصلاة جامعة“ کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں، نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت کیا اللہ کے بندے کیا ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا تم اس سے کیا کرو گے؟ عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس کے ذریعہ (لوگوں کو) نماز باجماعت کیلئے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا میں

تمہیں اس سے کہیں بہتر طریقہ سے آگاہ نہ کر دوں؟ عبد اللہ بن زید عنہما نے کہا ہاں (ضرور بتائیں) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انہیں سکھائے۔ یہی خواب عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کیا جسے آپؐ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے، ابجدیث حضرات کی رائے یہی ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا اس لئے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ جنہیں آپؐ نے یہ تعلیم دی، نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین ”اشھدان لا الہ الا اللہ“ ”اشھدان محمد رسول اللہ“ کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا، حالانکہ یہ درست نہیں۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کا انکار محض مجادلہ ہے، البتہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح جائز ہے مگر صحیحین کی روایات کی بناء پر رائج یہ ہے کہ ترجیع کے ساتھ اقامت اکر ہی کہی جائے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن زید بن عبد ربہؓ﴾ ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاریٰ خزرجی کہلائے۔ غزوہ بدر کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں انہوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی اور یہ واقعہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انہوں نے ۳۲ھ میں ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿بلال رضی اللہ عنہ﴾ یہ قبیلہ یتیم کے آزاد کردہ غلام بلال بن رباح تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ ان کو بھی غزوات بدر و احد، احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن تھے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد انہوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(۱۴۵) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ
الْأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ. أَخْرَجَهُ
مُسْلِمٌ، وَلَكِنْ ذَكَرَ التَّكْبِيرَ فِي أَوَّلِهِ
مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الْحَمْسَةُ فَذَكَرُوهُ
مُرَبَّعًا.

حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انہوں نے ترجیع کا
ذکر کیا ہے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں پہلی
دفعہ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ ابو مخذومہ
رضی اللہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور
انہوں نے اللہ اکبر کو پہلی دفعہ چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے)

نفعی تشریح: ﴿علمہ الاذان﴾ علم، تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کیلئے ہم نو ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو

مسلمانوں کا مذاق اور استہزاء اڑانے کیلئے انہوں نے اذان کہنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”میں نے ان لوگوں میں ایک خوش الحان آدمی کی اذان سنی ہے۔“ پھر ہماری طرف کسی کو بھیج کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور ہم میں سے فرداً فرداً اذان کہلوا کر سنی۔ میں سب سے آخری آدمی تھا جس نے اذان کہی۔ میری اذان سن کر آپؐ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے روہرو بٹھا کر میری پیشانی پر دست مبارک پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا ”جاؤ اور مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر اذان کہو۔“ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے پہلے اذان تو سکھائیں۔ پھر انہوں نے حدیث اذان بیان کی۔ ﴿فذكر الترتيب﴾ اس میں ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے ترتیب کا بھی ذکر کیا، یعنی کلمہ شہادتین کو دو، دو مرتبہ دہرایا۔ جمہور علماء نے اس سے ترتیب اذان (دوہری اذان) کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں۔ ﴿فذكره﴾ انہوں (پانچوں) نے اذان کے آغاز میں تکبیر (مربعاً) کو چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔ ”مربعاً“ ترتیب سے ہے۔ جس کے معنی ہیں چار مرتبہ۔ صاحب السبل شارح بلوغ المرام نے کہا ہے یہ جملہ (یعنی چار بار تکبیر) ثقہ راویوں سے محفوظ ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ اذان کے آغاز میں اللہ اکبر دو دفعہ نہیں بلکہ چار مرتبہ کہنا ہی صحیح ہے اور اذان کیلئے مؤذن ایسا منتخب اور مقرر کیا جائے جس کی آواز اچھی اور بلند ہو۔ اس سلسلہ میں انتخاب کیلئے مقابلہ اذان کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱۴۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ، وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ إِلَّا الْإِقَامَةَ. يَغْنِيهِ إِلَّا قَوْلُهُ. قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الْاِسْتِنَاءَ، وَلِلنَّسَائِيِّ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِبِلَالٍ.

نفعی تشریح: ﴿امر﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس میں حکم صادر فرمانے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ نسائی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ﴿ان یشفع الاذان﴾ یعنی ہر کلمہ کو دو، دو مرتبہ ادا کرنا۔ ﴿ویوتر الاقامۃ﴾ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہنا ﴿الا الاقامۃ﴾ جبر اقامت کے یعنی ﴿قد قامت الصلاۃ﴾ کے۔ اسے دو، دو مرتبہ کہنا ہے۔ ﴿ولم یذکر مسلم الاستثناء﴾ اور مسلم نے الا الاقامۃ کا استثناء نقل نہیں کیا۔

(۱۴۷) وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ رَضِيَ عَنْهُ حَضْرَتُ ابُو جُحَيْفَةَ رَضِيَ عَنْهُ فرماتے ہیں کہ میں نے بلال اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: رَأَيْتُ بِلَالاً رَضِيَ عَنْهُ دیکھا کہ وہ اپنا چہرہ ادھر ادھر

يُؤَدِّنُ، وَأَتَّبِعُ فَاهُ هُهُنَا وَهُهُنَا،
وَلَا ضَبْعَاهُ فِيهِ أَذُنَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ،
اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح
قرار دیا ہے۔

وَلَا بِنِدْ مَاجَهُ: وَجَعَلَ لِضَبْعَيْهِ فِي
أُذُنَيْهِ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: لَوَى عُنُقُهُ لَمَّا
بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ» يَمِينًا
وَشِمَالًا، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَضْلُهُ فِي
الصَّحِيحَيْنِ.
ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی
انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کر لیں اور ابوداؤد میں
ہے کہ جب (حی علی الصلاۃ) کہتے تو اپنے
دائیں بائیں ذرا رخ موڑ لیتے بالکل گھومتے نہیں
تھے۔ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لعوی تشریح: ﴿التبع فاه﴾ تتبع باب تفعل سے ہے۔ مطلب ہے کہ میں ان کے چرے کی طرف
نظرں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کو بغور ملاحظہ کر رہا تھا ﴿ہہنا﴾ دائیں جانب ﴿وہہنا﴾ اور
بائیں جانب۔

حاصل کلام: اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حی (علی الصلاۃ) حی علی
الفلاح) کہتے وقت دائیں بائیں اپنے چرے کی حد تک پھیرنا مسنون ہے۔ اذان کہتے ہوئے کانوں میں
انگلیاں داخل کرنے کے دو فائدے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کوئی بہرہ
آدی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے اذان کہی جا رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ﴾ ابو جحیفہ کنیت ہے۔ وہب بن عبد اللہ سوائی نام ہے۔ جحیفہ میں
جیم پر ضمہ ہے اور تغیر ہے۔ سوائی میں سین پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صفار صحابہؓ میں شمار
کئے گئے ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ تمام مشاہد و
غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں ۷۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۴۸) وَعَنْ أَبِي مَخْذُومَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
صَوْتُهُ فَعَلَّمَهُ الْأَذَانَ. رَوَاهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.
حضرت ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم
ﷺ کو ان کی آواز بہت پسند آئی۔ چنانچہ آپ نے
اسے (ابو مخذومہ رضی اللہ عنہ کو) اذان کی تعلیم خود دی۔

(اذان سکھائی) (ابن حزم)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور چناؤ اور تقریر میں آواز کو ملحوظ
رکھنا چاہئے۔ اچھی آواز دلوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(۱۴۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ
حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الْعَيْنَيْنِ، مِنْ غَيْرِ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَةٍ. (اس روایت کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں نماز عیدین باجماعت ادا کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود نہ ان کیلئے اذان کی جاتی تھی اور نہ اقامت اور امت کا بھی اس پر عمل ہے۔

(۱۵۰) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي الْحَدِيثِ الطَّوِيلِ فِي نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلَاةِ: ثُمَّ أَذَّنَ بِلَالٌ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ (ایک لمبی حدیث جس میں دوران سفر غلبہ نیند اور تھکاوٹ سفر کی وجہ سے سو جانے کا ذکر ہے) سے مروی ہے، جب نیند سے بیداری ہوئی تو پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ پڑھتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى الْمُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ.

وَلَهُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلَاةٍ وَفِي رَوَايَةٍ لَهُ: وَلَمْ يُنَادَ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی اور مسلم ہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں اور ابو داؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کیلئے حکمیر کہی گئی اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لئے بھی اذان نہیں کی گئی۔

لغوی تشریح: ﴿لَمْ يَجْمَعْ بَيْنَ الصَّلَاةِ﴾ سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح آئی ہے کہ آپؐ خیر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں کہیں پڑاؤ کیا۔ نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیدار رہنے کا حکم ارشاد فرمایا کہ جب طلوع فجر ہو تو وہ انہیں جگا دیں۔ نبی کریم ﷺ سو گئے اور بلال رضی اللہ عنہ پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بھی سو گئے۔ پس طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو

(یہ صورت حال ملاحظہ فرما کر نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا (تعمیل حکم میں) سب صحابہؓ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور آپؐ نے نماز پڑھائی۔ ﴿مزدلفہ﴾ یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے مابین واقع ہے۔ یہ حج کے مشہور شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ ﴿ولم یسألفی واحد منهما﴾ ان دونوں میں سے کسی کیلئے بھی منادی (اذان) نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز کا وقت فوت ہو جائے اور نماز باجماعت کا ارادہ ہو تو پھر نماز کیلئے اذان کہنی چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ حدیث مزدلفہ کے قیام میں مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان کہنے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ”ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ مگر یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ اولیٰ ہے کیونکہ مثبت کو منفی پر مقدم تسلیم کیا گیا۔

(۱۵۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «إِنَّ بِلَالًا يُؤَدُّنُ بَلِيلًا، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلًا أَعْمَى لَا يُنَادِي حَتَّى يَقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». فِي آخِرِهِ إِذْرَاجٌ. تَحْتَهُ۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یوذن بلیل﴾ رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ ﴿فکلوا واشربوا﴾ کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے کھا پی سکتے ہو۔ ﴿ادراج﴾ راوی کا اپنی طرف سے اضافہ (تشریح و توضیح) کی صورت میں داخل کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں ﴿وکان رجلاً اعمی﴾ کا فقرہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اول وقت سے اذان کو مؤخر کیا جائے، کیونکہ اطلاع دینے والا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب وقت اطلاع دیتا (کہ فجر ہو گئی ہے) یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا (اس وقت اسے مطلع کرتا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے۔ لیکن یہ اذان اس غرض کیلئے نہیں ہوتی جس غرض کیلئے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے

لوگوں کو بیدار کرنا کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کیلئے دو مؤذن رکھنا درست ہے۔

(۱۵۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: أَنَّ بِلَالَ أَدَّنَ قَبْلَ الْفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِي: أَلَا إِنَّ الْعَبْدَ نَامَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعْفُهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں دوبارہ اذان کہنے کا حکم دیا (تو بلال رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہہ کر منادی کی) ”خبردار! سنبندہ کو نیند آگئی تھی۔“ (ابوداؤد نے اسے

روایت کیا اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذن قبل الفجر﴾ طلوع فجر سے قبل اذان کہی، اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی) یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ قبل طلوع فجر اذان دینا مشروع نہیں تھا۔ ﴿وضعفه﴾ ابو داؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے کہ ایوب سے صرف حماد بن سلمہ ہی روایت کرتا ہے اور امام ابن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور حماد بن سلمہ نے اس میں خطا کھائی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ روایت اس موقع پر محمول ہوگی جب ابتداء میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مقرر کیا گیا تو بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح سے پہلے دیتے اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ صبح ہونے کے بعد، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عمرو یا عبداللہ بن قیس قرشی عامری تھا، جن کا ذکر سورہ عبس کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(۱۵۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا سَمِعْتُمُ النَّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ» مَثَقَّ عَلَيْهِ هِيَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح مؤذن کہہ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

وللبخاري عن معاوية رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُهُ.

اور مسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے جو

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ مُؤْذِنَ كَے جواب میں اسی طرح ایک ایک کلمہ کہنے تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ الْقَوْلِ كَمَا كِي فضیلت کے بارے میں ہے بجز (حی علی یَقُولُ الْمُؤْذِنُ كَلِمَةً سِوَى الصَّلَاةِ) اور (حی علی الفلاح) کے کہ ان الْحَيَعَلَتَيْنِ، فَيَقُولُ: لَا حَوْلَ وَلَا كَلَمَاتِ كِي جگہ (لاحول ولا قوة الا بالله) کے۔ قُوَّةً إِلَّا بِاللَّهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے، سننے والا اسی طرح کہتا جائے اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہیں خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں اور (حی علی الصَّلَاةِ) (حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوة الا بالله) کہا جائے اور جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو۔ تو یہ حکم عام ہے (حی علی الصَّلَاةِ) اور (حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوة الا بالله) کہنے کا حکم خاص ہے اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(۱۵۴) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے مروی ہے الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے میری قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! اجْعَلْنِي إِمَامًا قَوْمِي، فَقَالَ: «أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّنًا لَا يَأْخُذُ عَلَى أَذَانِهِ أَجْرًا». أَخْرَجَهُ الْخَنَسَةُ وَحَسَنَةُ الثَّرْيَذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

کرے۔“ (اس کو احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ﴾ اقتداء سے فعل امر ہے۔ یعنی اپنے نمازیوں میں سے ضعیف و کمزور نمازیوں کا خیال رکھنا، ان کی مشاء کا، ان کے احوال کا خیال رکھنا گویا کہ تم انہی کو نماز پڑھا رہے ہو۔

حاصل کلام: مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لئے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہ کرے کہ کمزور و ناتواں لوگ آکٹا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کو اذان کی اجرت نہ لینی چاہئے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بناء پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط مکاحقہ پورا کرنے کی صورت میں اس کا حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ﴾ ابو عبد اللہ ان کی کنیت تھی۔ طائف سے جو وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۵۵) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ حَضْرَتِ مَالِكِ بْنِ حُوَيْرِثٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ» الْحَدِيثُ، كَيْلَيْهِ اَذَانُ كَيْلَيْهِ پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن

ماجہ نے روایت کیا ہے)

راوی حدیث: ﴿مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوسلمان تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حصول تعلیم دین کیلئے آئے تھے۔ بیس روز تک آپ کے پاس قیام کیا جب واپس جانے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”راستہ میں جب وقت نماز آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔“ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ۷۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

(۱۵۶) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لِبَلَالٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «إِذَا أَذْنَتَ فَرَسَلْ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْذَرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ أَكْلًا مِنْ فَاغْرُغُ الْإِكْلِ مِنْ أَكْلِهِ، الْحَدِيثُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. سَكَّ» (پھر حدیث پوری بیان کی۔ اسے ترمذی نے روایت

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا
يُؤَذَّنُ إِلَّا مُتَوَضِّئًا». وَضَعْتُهُ أَيْضًا.
اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ
نے فرمایا ”وضو کے بغیر کوئی اذان نہ کہے“ (ترمذی نے

وَلَهُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «وَمَنْ أَدَّنَ فَهُوَ يَقِيمٌ». وَضَعْتُهُ
اور ترمذی نے زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا
ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اذان کہے وہی
اقامت کہے۔ اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔

وَلَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ
بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَنَا رَأَيْتُهُ، يَغْنِي
الْأَذَانَ، وَأَنَا كُنْتُ أُرِيدُهُ، قَالَ:
فَأَقِمِ أَنْتَ. وَفِيهِ صَفَتْ أَيْضًا.
اور ابو داؤد میں عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں
ہے کہ میں نے اذان کو خواب میں دیکھا تھا۔ میری
تمنا تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے آپ نے فرمایا
”تو تکبیر کہا کر۔“ اس میں بھی ضعف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿فترسل﴾ ترسل سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر آرام سے کلمات اذان ادا کر۔
جلدی اور تیزی نہ کر۔ ﴿فاحذر﴾ نصیر بن صرباب سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی جلدی جلدی ادا
کرنا۔ اس حدیث کی سند میں عبد المنعم نامی راوی ہے۔ جسے محدثین نے متروک کہا ہے۔ ﴿وضعه﴾
ایضا اس کو بھی اس نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاویہ بن یحییٰ یہ حدیث زہری سے روایت
کرتے ہیں اور زہری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور معاویہ ضعیف ہے اور زہری کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ
سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ روایت منقطع ہے اور اس لئے بھی کہ معاویہ بن یحییٰ راوی
زہری کے حوالہ سے ضعیف ہے۔ ﴿ومن اذن﴾ ما قبل پر عطف ہے اور وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے ﴿ان
اخصاء اذن﴾ یعنی صداء قبیلہ کے ایک شخص نے اذان کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا ﴿ومن اذن
فهو يقيم﴾ کہ ”جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔“ اس حدیث سے مصنف رحمہ اللہ نے یہ نکلوا حذف کر
دیا۔ مکمل حدیث اس طرح ہے کہ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے
قبیلہ صداء کے آدمی! اذان کو۔“ میں نے اذان کی۔ جب آپ نماز پڑھانے لگے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت
کہنا چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدائی بھائی نے اذان کی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے
گا۔“ ﴿صداء﴾ کے ”صا“ پر ضمہ ہے۔ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔
اس کا ضعف اس وجہ سے ہے کہ اس کی سند میں عبد الرحمن بن زیاد بن النعمان افریقی ہے، امام قحطان وغیرہ
نے اسے ضعیف کہا لیکن ثوری رحمہ اللہ نے اسے اچھا کہا ہے اور بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ حدیث کے
قریب رہنے والا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور درست بات بھی یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ طبرانی
میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تائید ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں۔ اقامت کہنا اسی کا حق ہے جس

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ .

حاصل کلام: ترمذی میں حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ بھی منقول ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! تو پھر ہم (اس وقت) کیا دعا کریں؟ فرمایا ”سلوا اللہ العفو والعافية فی الدنیا والاخرة“

کہ اللہ تعالیٰ سے غفور و بخشنش اور دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقبولیت دعا کیلئے یہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

(۱۵۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اللَّهُمَّ رَبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةُ الثَّامَةُ، وَالصَّلَاةُ الْقَائِمَةُ، آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِيلَةَ وَالْفَضِيلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا الَّذِي وَعَدْتَهُ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الْأَزْهَرِيُّ.

”اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ (مقام محمود) اور فضیلت عطا فرما اور مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے پہنچا دے (کھڑا فرما دے) تو اس کیلئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہوگی۔“

(اس کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿نداء﴾ بمعنی اذان۔ رب منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے یا پھر دوسرے منادی سے اور وہ مضاف ہے۔ ﴿ہذه الدعوة الثامنة﴾ کے قول کی طرف۔ اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ثامۃ﴾ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ رب ہی توحید کا ملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے ﴿والصلوة القائمة﴾ قیامت تک باقی رہنے والی۔ ﴿الوسيلة﴾ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہ لائق ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا ﴿والفضيلة﴾ اس مرتبہ کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو ﴿وابعنه﴾ اس کو وہاں پہنچا دے، بھیج دے ﴿مقاما محمودا﴾ یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد و ستائش کریں گے جو اس موقع پر انہیں الہام کئے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپ کو نہیں ہوگا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہوگی۔ ﴿حلت﴾ واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہوگا کہ پڑھنے والے کیلئے نبی کریم ﷺ کی بروز قیامت شفاعت ہوگی۔ جس کی آپ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ ”مقام محمود“ کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ﴿عسى ان يبعثك ربك مقاماً محموداً﴾ یعنی امید

ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

شرائط نماز کا بیان

۲ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلَاةِ

(۱۶۰) عَنْ عَلِيٍّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِّ الصَّلَاةَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دوران نماز جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے، از سر نو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔“ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن

حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿باب شروط الصلاة﴾ شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو اور اس حیثیت سے اس کیلئے لازمی اور ضروری ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ بھی نہیں رہتی۔ یعنی اس کا ہونا اس چیز کے ساتھ لازم ہے۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام نہ ہو۔ ”اذا فاسا الشرط فالتام المشروط“ جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ ﴿فسا﴾ فسو سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مقعد سے بغیر آواز کے جو ہوا خارج ہوتی ہے۔ ﴿وليعدد الصلاة﴾ ولیمعد میں بعد اعادہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی لوٹنا، دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے از سر نو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہؓ سے نواقض الوضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ لیکن جیسا پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا راجح اور قابل ترجیح یہی بات ہے کہ غیر مشروط طور پر نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن طلحہ رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام علی بن طلحہ (طاء پر فتح، لام ساکن) بن المنذر بن قیس سحمی، یمامی حنفی، بنو حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں، صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلحہ بن علی کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں۔

(۱۶۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ حَائِضٍ إِلَّا بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جسے حیض آتا ہے (یعنی وہ عورت جو بالغہ ہے) اللہ تعالیٰ اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔“ (اسے بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزيمة نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لعنوی تشریح: ﴿حائض﴾ اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے۔ ﴿الخمارة﴾ ”خاء“ کے نیچے کسرہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔ حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہئے حتیٰ کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔

(۱۶۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «إِنْ كَانَ الثُّوبُ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِهِ، يَغْنِي فِي الصَّلَاةِ». وَلَمْ يَسْلَمْ: فَخَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقًا فَاتَّزَرَ بِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا ”جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو (نماز میں) کپڑا خوب (جسم پر) لپیٹ لو“ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ کپڑا کشادہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو کندھوں پر دونوں طرف ڈال لو اور اگر کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اسے تہ بند کی صورت میں باندھ لو۔

(بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «لَا يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثُّوبِ الْوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَائِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔“

لعنوی تشریح: ﴿فالتحيف﴾ التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ چادر کے اوڑھنے یا پہننے کو کہتے ہیں۔ جس کی وضاحت اگلا جملہ کر رہا ہے۔ ﴿فخالف بين طرفيه﴾ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں بغلوں کے نیچے سے کپڑا نکال کر کندھوں پر ڈال دے۔ دائیں طرف کا بائیں کندھے پر اور بائیں طرف کا دائیں کندھے پر اور گدی کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ دے لے (یعنی گرہ لگا لے)۔ ﴿فاتزر﴾ باب افتعال سے اتر امر کا صیغہ ہے اور تہ بند باندھنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے کندھے بھی نماز میں ننگے نہیں ہونے چاہئیں۔

(۱۶۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: «أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي دِرْعٍ وَخِمَارٍ بَغِيرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «إِذَا كَانَ الدَّرْعُ سَابِغًا يُغْطِي ظَهْرَ قَدَمَيْهَا».

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی عورت تہ بند کے بغیر محض کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”کرتا اگر اتنا لمبا ہو کہ قدم کی پشت تک پہنچ جاتا ہے تو جائز ہے۔“ (اسے ابوداؤد،

وَصَحَّحَ الْأَيْمَةُ وَفَقَهُ. نے روایت کیا ہے اور ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو

صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿دع﴾ وال پر کسرہ ”راء“ ساکن۔ قمیص ﴿سابعاً﴾ اتنی لمبی چوڑی اور فراخ کہ پورے جسم کو ڈھانپ لے ﴿یغطی﴾ تغطیۃ سے ماخوذ ہے۔ پردہ پوشی کرتا ہے، ڈھانپتا ہے ﴿ظہود قدمیہ﴾ پاؤں کا اوپر والا حصہ۔ پاؤں کی بالائی سطح۔

حاصل کلام: عورت کو نماز کی ادائیگی کیلئے سارا جسم مستور کرنا ضروری ہے۔ ایک لمبے چوڑے کرتے اور ایک سر بند یعنی دوپٹہ کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ کرتہ اتنا دراز ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو اپنے پاؤں چھپانے ضروری ہیں گویا پاؤں کا ڈھانپنا بھی عورت کیلئے شرط ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں بعض علماء نے عورت کے پاؤں کو بھی ستر میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث کے موقوف ہونے کو ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے مگر امام حاکم نے اس کا مرفوع ہونا بخاری کی شرائط کے مطابق کہا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ایک ایسی حدیث جو موقوف ہے اور اس کے مضمون میں اجتہاد کا دخل نہ ہو تو ایسی حدیث محدثین کے نزدیک مرفوع کے حکم میں شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسے موقوف تسلیم کر لیا جائے تو یہ حکماً مرفوع ہے۔

(۱۶۴) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ حَدَّثَنَا عَنْ أَبِيهِ رَوَيْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، فَأَشْكَلْتُ عَلَيْنَا الْقَبِيلَةَ، فَصَلَّيْنَا، فَلَمَّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا إِلَى غَيْرِ الْقَبِيلَةِ، فَتَرَلَّتِ الْآيَةُ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَنَمَّ وَجْهُهُ اللَّهُ﴾ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَفَهُ. حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک تاریک و اندھیری رات میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، قبلہ کا رخ شناخت کرنا ہم پر دشوار و مشکل ہو گیا۔ ہم نے (اندازاً قبلہ کا رخ متعین کر کے) نماز پڑھ لی۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے تو غیر قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔ پس پھر یہ آیت نازل ہوئی ”فاینما تولوا فثم وجهہ اللہ“ ”پس جدھر تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے۔“ (اس کو ترمذی نے

روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مظلمۃ﴾ میم پر ضمہ اور لام پر کسرہ۔ تاریک رات ﴿فاشکلت﴾ مشتبہ ہو گئی ﴿تولوا﴾ رخ کرو گے۔ ﴿فثم﴾ ”پس“ پر فتح اور میم پر تشدید اور فتح۔ یہاں کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم واقفیت، ابر آلودگی یا دیگر کسی سبب کے باعث سمت قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے اور آدمی اپنی دانست کے مطابق غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر کے نماز پڑھ لے کہ قبلہ اس جانب ہوگا مردِ راصل قبلہ اس رخ پر نہ ہو تو صحیح سمت قبلہ معلوم

ہونے پر اس نماز کا اعادہ ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ اس حدیث کو وہ ضعیف کہتے ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک اعادہ کی ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ عنز بن وائل میں سے تھے۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے ان کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوہ بدر اور دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کی سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۳۲ھ، ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

(۱۶۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ هَـ» (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)۔ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ الْبُخَارِيُّ۔ (دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما بین المشرق والمغرب قبلہ﴾ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کیلئے ہے۔ اس لئے کہ مدینہ مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینہ والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے لہذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلہ سے دور دراز فاصلہ پر ہو تو اس کیلئے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کیلئے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کیلئے اپنا چہرہ اور رخ ادھر کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کیلئے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کیلئے ہے۔

(۱۶۶) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ هَـ» (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)۔ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ الْبُخَارِيُّ۔ (دیا ہے)

ولأبي داود من حديث أنس: اور ابو داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ آپ سفر کرتے اور نماز نفل پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی

اغوی تشریح: ﴿یومی براسہ﴾ اپنے سر سے رکوع و سجود کیلئے اشارہ کرتے اور سجدہ کیلئے رکوع کے بہ نسبت ذرا زیادہ جھکتے ﴿المکتوبۃ﴾ مکتوب لکھی ہوئی یعنی فرض نماز ﴿الركاب﴾ ”را“ کے نیچے کسرہ اور کاف مخففہ۔ سواری، اونٹنی یا پھر ہر وہ چیز جس سے سواری کا کام لیا جائے۔ یہاں مراد سواری اور اونٹنی ہی ہے۔

حاصل کلام: حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں نفلی نماز سواری پر ادا کی جاسکتی ہے۔ ایک دفعہ سواری کا رخ یا اپنا رخ قبلہ رو کر کے شروع کر لے پھر اگر سواری کا رخ کسی دوسری جانب ہو جائے تب بھی نماز درست ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ریل گاڑی، ہوائی جہاز اور بحری جہاز پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ ان کا حکم کشتی کا ہوگا۔ کشتی میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور تمام فقہاء بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(۱۶۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
قَالَ: «الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا
الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَامَ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ
عَلَّةٌ.

نفوی تشریح: ﴿ولہ علیہ﴾ وہ علت یہ ہے کہ حماد نے اسے موصول روایت کیا ہے جبکہ ثوری رحمہ اللہ نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور امام ثوری کی روایت صحیح ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل سند سے ہی محفوظ ہے۔ بعض حضرات نے اس کا موصول ہونا صحیح قرار دیا ہے اور اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنی درست نہیں۔ حمام میں اس لئے کہ وہ جگہ ناپاک ہے اور قبرستان میں ممانعت کا سبب سد ذرائع کے طور پر شرک سے بچنے کیلئے ہے۔ (۱۶۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُصَلَّى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: الْمَرْبَلَةَ، وَالْمَجْزَرَةَ، وَالْمَقْبَرَةَ، وَقَارِعَةَ الطَّرِيقِ، وَالْحَمَامَ، (بخاری) اور بیت اللہ کی چھت پر۔ (ترمذی نے اسے

نفعی تشریح: ﴿المزبلة﴾ ”میم“ اور ”با“ پر فتح۔ وہ جگہ جہاں گوبر اور لید وغیرہ ڈالے جاتے ہوں۔ ﴿المجزرة﴾ ”جیم“ اور ”زا“ پر فتح جہاں جانور کو ذبح اور نحر کیا جاتا ہے ﴿معاطن﴾ معطن کی جمع ہے۔ میم پر فتح اور ”طاء“ کے نیچے کسرہ اونٹوں کے باندھنے کی جگہ (باڑا) یعنی حوض کے ارد گرد ان کے بیٹھنے کی جگہ ﴿وضعہ﴾ اس روایت کی سند میں ایک راوی زید بن جبیرہ ہے، اس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں روئے زمین کو مسجد قرار دینے کے باوجود کچھ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنا شرعاً ممنوع ہے۔ جہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں، ظاہر ہے وہ جگہ پاک تو نہیں رہ سکتی۔ اس لئے جگہ ہی جب ناپاک ہو گئی تو نماز کیسے ہوگی کیونکہ جگہ کا پاک ہونا نماز کیلئے شرط ہے۔ اسی طرح مذبخ خانہ جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ خون اور دوسری گندگیاں اس جگہ کو پاک نہیں رہنے دیتیں اس لئے یہ جگہ بھی نماز کی ادائیگی کیلئے درست نہیں۔ شارع عام جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ جو راستہ تنگ ہوگا جہاں گزرنے کی پہلے ہی 'دقت اور دشواری ہو وہاں نماز پڑھنا لوگوں کیلئے موجب اذیت ہے، توجہ اور خشوع و خضوع بھی نہیں رہ سکتا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر نماز اس لئے ممنوع ہے کہ نماز میں بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی شرط ہے۔ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسا ناممکن ہے۔ جب شرط ہی نہ پائی گئی تو نماز کیسے ہوگی۔

(۱۶۹) وَعَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الْغَنَوِيِّ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا تُصَلُّوا
إِلَى الْقُبُورِ، وَلَا تَجْلِسُوا عَلَيْهَا».
رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ بعض حضرات بزرگوں کی قبروں کے پاس اس لئے مسجدیں تعمیر کرتے ہیں کہ بزرگوں کی ارواح سے فیض حاصل ہوگا۔ اس کی بھی ممانعت ہے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں بالکل واضح طور پر یہ ارشاد نبویؐ ہے کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (مسجد) بنا لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو افعال مساجد میں اللہ تعالیٰ کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں انہیں قبروں پر نہ کرے اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبروں کو سامنے رکھ کر نماز نہ پڑھی جائے۔ اس سے شرک کا شبہ بڑھ سکتا ہے۔

اور قبروں پر بیٹھنے کے بھی دو مفہوم ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے جس طرح تکیہ پر نیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا نیز قبروں پر قضاء حاجت کیلئے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ﴾ ابو مرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کاف پر فتح اور نون پر تشدید۔ کناز بن حصین بن ربیع الغنوی۔ غنوی غین اور نون دونوں پر فتح۔ قبیلہ غطفان کے ایک شخص غنی بن یعصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حمزہ بن عبد المطلب کے حلیف تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۲ھ میں ۶۶ برس کی عمر پر وفات پائی۔ مرثد میم پر فتح، ”راء“ ساکن ”ما“ پر فتح ”وال“ ساکن۔

(۱۷۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ مَسْجِدٌ فِي آتٍ تَوَسَّعَ فِيهِ دَاخِلٌ هُوَ مِنْهُ (سے پہلے) فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذًى أَوْ فِي رَأْسِهِ شَيْءٌ فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا»۔
آخر جہ أبو داؤد۔ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ۔
کہ اسے صاف کرے اور اس میں نماز پڑھ لے۔

(ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذی﴾ طابع جس سے اذیت محسوس کریں۔ ﴿قذر﴾ طابع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے ﴿اذی او قذر﴾ بھول کر، راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک و صاف ہوں۔ نیز یہ کہ جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حدیث کے بظاہر ہر لفظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اس ارشاد نبویؐ کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپؐ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے، دوران نماز ہی جبریل امینؑ نے آپؐ کو مطلع فرمایا کہ آپؐ کے جوتے نجاست آلودہ ہیں۔ آپؐ نے نماز ہی میں جوتے اتار دیئے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے امتثال فعل نبویؐ میں اپنے جوتے بھی اتار دیئے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے صحابہؓ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی، انہوں نے جواب میں عرض کیا ہم نے آپؐ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں۔ پھر آپؐ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ اس حدیث

سے یہ معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز کسی طرح علم ہو جائے تو وہ نمازی اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کر لے۔ نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(۱۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ ابُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَايَتُ كَرْتِي هِي كِي رَسُوْلُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نِي فِي رَمَا كِي ”جَب تَم مِي سِي كُوِي اِيَك ﷺ: «إِذَا وَطِئَ أَحَدُكُمْ الْأَذَى اِيْنِي موزوں سِي گندگی پَر چلے توبے شَك مِثِي اسے بِخَفِيْهِ فَطَهَّرْهُمَا التُّرَابَ». اَخْرَجَهُ أَبُوْ يَاقُ وَ صَافُ كَرْنِي وَاِي هِي۔“ (ابوداؤد نِي اسے دَاؤد، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ۔ رَوَايَتُ كِيَا هِي اور ابن حبان نِي صَحِيح قَرَار دِيَا هِي)

لغوی تشریح: ﴿وَطِئَ أَحَدُكُمْ الْأَذَى﴾ نجاست کو اپنے پاؤں سِي پامال کرے اور اس پَر سِي گزرے اور چلے وَطِئَ باب سَمِعَ يَسْمَعُ سِي هِي۔ ﴿بِخَفِيْهِ﴾ خَف کا تَشْيِيْع هِي۔ ضَمِير كِي طَرَف مَضَاف هِي۔ اس مِي ”باء“ حَرْف جَر هِي۔ يِه اور پِہلے گزری ہوئی حَدِيثُ اس پَر دَلَالَتُ كَرْتِي هِي كِي جوتے، موزے اور اِيَسِي دوسری چیزیں مِثِي سِي رُكُرنِي سِي يَاقُ ہو جاتے هِيں، خواه نجاست شَك ہو يَا تَر۔ حَاصِلُ كَلَامُ: جوتوں اور موزوں پَر اِگر كُسي قِسم كِي نجاست خواه وَه شَك ہو يَا تَر، مَرِي ہو يَا غَيْر مَرِي، خَفِيف ہو يَا غَلِيْظ، لَگ جَائے تَو وَه يَاقُ مِثِي پَر اِچھی طَرَح رُكُرنِي سِي يَاقُ وَ صَاف ہو جاتے هِيں۔ دُھونِي كِي چِنْدال ضرورت نِہیں۔ اِمَامُ ابُو حَنِيفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كَا مَسْلُكُ اس كِي بَر عَكْس هِي اَلْبِتَّةُ اِحتِافُ نِي اِمَامُ شَافِعِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كِي مَسْلُكُ كُو صَحِيحُ مَنا هِي۔ اِمَامُ شَافِعِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ اور اِيَك رَوَايَتُ كِي رُو سِي، اِمَامُ اَحْمَد رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ نِي بَہِي يِي رَائِي دِي هِي كِي جوتے، موزے اور مِثِي رُكُرنِي سِي يَاقُ وَ صَاف ہو جاتا هِي، پَانِي سِي دُھو كَر يَاقُ وَ صَاف كَرْنِي كِي ضرورت نِہیں۔

(۱۷۲) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ حَضْرَتُ مَعَاوِيَةُ بِنُ حَكَم رَوَايَتُ كَرْتِي هِي كِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نِي فِي رَمَا كِي ”كُوِي گنجائش نِہیں۔ نماز مِي تَو صَرَف تَسْبِيح (سُجْدانُ) يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ (اللہ) تَكْبِيرُ (اللہ اکبر) اور تِلَاوَتُ قُرْآنُ ہو نِي چاہِيے۔“ إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ (مُسلِم) الْقُرْآنِ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز ایک نمازی نے چھینک ماری اس نے (الحمد لله) کہا اس کے جواب میں نماز ہی میں ہوتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ نے (یرحمک اللہ) کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا حرام ہے۔

(۱۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہے کہ
إِنْ كُنَّا لَتَتَكَلَّمُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى عَهْدِ عہد رسالت مآب ﷺ میں دوران نماز ہم ایک
رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: يُكَلِّمُ أَحَدُنَا دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے اور اپنی
صَاحِبُهُ بِحَاجَتِهِ، حَتَّى نَزَلَتْ ضرورت و حاجت ایک دوسرے سے بیان کر دیتے
﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ تھے تا آنکہ "حافظوا علی الصلوات والصلوة
الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ فَأَمْرُنَا الوسطی وقوموا للہ قانتین" آیت نازل
بِالسُّكُوتِ، وَنُهِينَا عَنِ الْكَلَامِ. ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں
مَنْقُوعٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. گفتگو اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و

مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿وان کنا﴾ ان۔ یہ نون ثقیلہ ہے جو اس جگہ نون مخففہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اسم محذوف ہے یعنی انا یا انہ اور کنا اس کی خبر ہے۔ ﴿والصلاة الوسطی﴾ ”واو“ اس جگہ تخصیص کیلئے ہے یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطیٰ پر محافظت کرو اور صحیح احادیث کی روشنی میں اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ﴿فانتین﴾ ڈرتے، سسے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے معنی متعدد ہیں اور صحابہ کرامؓ نے سکوت کا معنی یہی لیا ہے۔ یہ یا تو انہوں نے قرآن کی بنا پر اخذ کیا ہے یا نبی ﷺ کی تفسیر کی روشنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔ آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راوی حدیث: ﴿زید بن ارقم رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ابو عمرو ان کی کنیت ہے۔ غزوہ خندق میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکہ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحابؓ میں شامل تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ۶۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۷۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «فِي

الصَّلَاةِ۔ اسے روایت کیا ہے اور مسلم نے ”فی الصَّلَاةِ“ یعنی نماز میں کا اضافہ کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ﴾ جب نمازی امام کو درپیش ناگمانی صورتحال سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے، بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب پر) مارے۔ حاصل کلام: جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے مرد مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سبحان اللہ وغیرہ کچھ نہیں کہے گی۔ عیسیٰ بن ایوب نے تالی پٹینے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کے باطن یعنی الٹی جانب پر مارے۔ عورت کو تالی بجا کر مطلع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی آواز غیر مرد نہ سنیں گویا عورت کی آواز بھی پردہ ہے۔ اس پر دور حاضر کی آزاد منش خواتین کو صد بار غور کرنا چاہئے۔ نیز اس میں اس کی بھی تردید ہے کہ بعض نادان لوگ سبحان اللہ کی بجائے اللہ اکبر کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

(۱۷۵) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الشَّخِيرِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ، مِنَ الْبُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الْحَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت مطرف اپنے باپ عبد اللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اس وقت آپ کے سینہ مبارک سے گریہ و زاری کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے۔ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے روایت کیا ہے

اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازیز﴾ مہمزہ پر فتح اور زار پر کسر۔ جوش مارتے وقت ہنڈیا سے جو آواز آتی ہے۔ ﴿المرجل﴾ میم کے نیچے کسرہ ”راء“ ساکن اور جیم پر فتح۔ ہنڈیا کے معنی میں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز خوف الہی سے رونا نماز کیلئے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿مطرف﴾ میم پر ضمہ اور راء پر تشدید اور کسر۔ بن عبد اللہ بن شخیر۔ شخیر۔ شین پر کسرہ اور ”خاء“ پر تشدید حرشی عامری بصری مشہور ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں، عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عن ابیہ﴾ اس سے مراد ہے عبد اللہ بن فحیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ شرف صحابیت

سے سرفراز ہیں۔ بنی عامر کا جو وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۷۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي تَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ لِي مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مَدْخَلَانِ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ تَحْتَ بَابِهِ يَصَلِّي، تَنْحَنُّ لِي. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ. (نسائی، ابن ماجہ)

لغوی تشریح: ﴿مدخلان﴾ ”میم“ اور ”حاء“ دونوں پر فتح اور درمیان میں واقع دال ساکن ہے۔ آپ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ ﴿تنحني﴾ حلق میں آواز کو گردش دینا۔ کھنکارنا (اِخ) اِخ کرنا

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کیلئے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَيْتَ كَرْتِے ہیں کہ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبَلَالٍ: مِیں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھتے كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ وَهُوَ يُصَلِّي؟ كَيْسے جواب دیتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس قَالَ: يَقُولُ هَكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. (ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿يرد عليهم﴾ علیہم میں ہم ضمیر سے اہل قباء مراد ہیں ﴿يقول هكذا﴾ عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ ﴿وبسط كفہ﴾ دراز کیا، پھیلایا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ جب بعد میں نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہو گیا۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تو اس موقع کی بات ہے جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارہ سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت و حاجت رہ جاتی ہے۔ گفتگو کی ممانعت اور اشارہ سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ

جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارہ سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلا ریب و تردد نماز کی حالت میں اشارہ سے سلام کا جواب جائز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نمازی کو سلام کہنا درست اور جائز ہے۔ البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارہ سے دینا جائز ہے۔ اس اشارہ کی نوعیت کیا تھی تو اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ مسند احمد میں حضرت مہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ جعفر بن عون نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپؐ نے اپنا ہاتھ لمبا کیا یعنی ہاتھ اوپر اٹھایا کہ ہاتھ کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے تھا اور یہی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قصہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپؐ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا تھا۔ ان احادیث سے مترشح ہوا کہ سر سے اشارہ کرے یا ہاتھ پھیلا کر یا انگشت سے اشارہ کرے۔ تینوں صورتوں میں جواب دینا جائز ہے۔

(۱۷۸) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةً بِنْتُ زَيْنَبَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَيُسَلِّمُ: «وَهُوَ يَوْمُ النَّاسِ فِي الْمَسْجِدِ».

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو گود میں لیے رہتے، جب سجدہ میں جاتے تو اسے گود سے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو اسے (دوبارہ) گود میں اٹھا لیتے۔ (بخاری و مسلم) مسلم میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ لوگوں (الناس فی المسجد)۔

کو نماز پڑھاتے ہوئے یہ عمل کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿حامل﴾ مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ ﴿امامہ﴾ حامل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿وہو یوم الناس﴾ ام یوم نصر ینصر، لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ نماز فرضی نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل ضرورت کے وقت نمازی بچے کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور یہ ”عمل کثیر“ ایسا نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھالیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اٹھالینا جائز ہے۔ اتنا عمل، عمل کثیر نہیں۔

راوی حدیث: ﴿امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا﴾ امامہ حضور ﷺ کی نخت جگر زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربح تھا۔ فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے ہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَقْتُلُوا الْأَسْوَدِينَ فِي الصَّلَاةِ: جَانُورُونَ سَانِپٌ وَأُورُونَ سَانِپٌ وَأُورُونَ سَانِپٌ» (اس حدیث کو الْحَبَّةُ وَالْعُقْرَبُ. أَخْرَجَهُ الْأَزْبَعَةُ، جَارُونَ الْبُودَاوُدُ تَرَفْدِي، نَسَائِيٌّ وَأَبْنُ مَاجَةَ رَوَايَاتُ كِيَا وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ). ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿الحبة﴾ سانپ، ﴿العقرب﴾ بچھو۔ دونوں اسودین کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ اسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں۔ خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لانا ان کی رنگت سیاہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ، بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران سانپ، بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔

نمازی کے سترے کا بیان

۴ - بَابُ سِتْرَةِ الْمُصَلِّي

(۱۸۰) عَنْ أَبِي جُهَيْنِمَ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيِّ مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الْإِنْمِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْرًا لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي الْبَزَّازِ مِنْ وَجْهِ آخَرَ: «أَرْبَعِينَ خَرِيفًا». حضرت ابو جھنیم بن حارث رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے اس میں چالیس سال کا ذکر ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب سترۃ المصلی﴾ سترہ۔ سین پر ضمہ اور ”تاء“ ساکن۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کرے خواہ دیوار ہو، ستون ہو، نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ، تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ ﴿المار﴾ مرور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا ﴿خریف﴾ سال کو کہتے ہیں نیز خریف ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا بھی نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے۔ یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے اور یہی مجاز مرسل کی شان ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ کما گیا ہے کہ ان کا نام عبد اللہ تھا۔ حارث بن مہ انصاری کے بیٹے تھے جو خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور و معروف صحابی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جہیم جہم سے تصغیر ہے اور (الصمة) صاد کے نیچے کسرہ اور میم پر تشدید ہے۔

(۱۸۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سِئِلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةٍ پوچھا گیا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے؟) تو آپ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «مِثْلُ مُؤَخَّرَةٍ» نے فرمایا ”اونٹ کے پالان کے پچھلے حصہ کی اونچائی الرَّحْلِ“۔ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔ کے برابر ہونا چاہئے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی غزوہ تبوک﴾ ۹ھ رجب کے مہینہ میں رومیوں کے خلاف یہ غزوہ واقع ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے ﴿مؤخرہ﴾ میم پر ضمہ واو ساکن ”خاء“ پر فتح اور نیچے کسرہ بھی ہو سکتا ہے اور حمزہ پر فتح اور ”خاء“ پر تشدید اور فتح اور کسرہ دونوں اور میم پر فتح اور واؤ پر سکون بھی جائز ہے اور حمزہ کے بغیر بھی ہے اور ”خاء“ کے نیچے کسرہ۔ یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جس پر سوار نیک لگاتا ہے ﴿الرحل﴾ کجاوے وغیرہ کا وہ حصہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگل میں سترہ کھڑا کرنا چاہئے۔ سترہ اتنا بلند اور لمبا ہونا چاہئے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(۱۸۲) وَعَنْ سَبْرَةَ بِنْتِ مَعْبِدٍ حضرت سبرہ بنت معبد جہنی رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں الْجُهَنِيَّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نماز (ادا کرتے وقت) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيْسَ تَرَأَوْا أَحَدَكُمْ تَمَّ مِنْ سَبْرَةٍ هِيَ قَائِمٌ كَمَا كَانَ فِي الصَّلَاةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ“۔ أَخْرَجَهُ تَابِطِ بْنِ عَمْرٍو (متدرک حاکم) الْحَاكِمُ۔

لغوی تشریح: ﴿ولو بسهم﴾ اگرچہ تیر ہی سہی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا ہار یک و پتلا۔ بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہو۔

راوی حدیث: ﴿سبرہ بنت معبد جہنی رضی اللہ عنہا﴾ مدنی صحابی ہیں۔ ذی المروة میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابو ثریہ تھی (ثاء) پر ضمہ (راء) پر فتح اور ”یاء“ پر تشدید۔ پہلا غزوہ جس میں شامل ہوئے غزوہ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کیلئے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دور حکومت میں وفات

پائی۔

(۱۸۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَقْطَعُ صَلَاةَ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ - كَلْبٌ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ مُؤَخَّرَةِ الرَّحْلِ - الْمَرْأَةِ وَالْحِمَارُ وَالْكَلْبُ الْأَسْوَدُ». الْحَدِيثُ. وَفِيهِ: «الْكَلْبُ الْمُسْلِمُ»

اور اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوُهُ دُونَ الْكَلْبِ، وَلَابِي، دَاوُدَ وَالنَّسَائِي عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُونَ آخِرِهِ، وَقَيْدَ الْمَرْأَةِ بِالْحَائِضِ۔

مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ابو داؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے اور عورت کے متعلق حائضہ ہونے کی قید لگائی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿يقطع صلاة المرء﴾ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے المرأة فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ ﴿وفيه﴾ یعنی اس حدیث کا آخری حصہ۔ ﴿الكلب الاسود شيطان﴾ کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ سے اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا۔ ﴿وله﴾ میں ہ ضمیر راجع ہے۔ مسلم کی طرف یعنی مسلم میں۔

عن ابی ہریرۃ نحوہ دون الکلب﴾ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے تو پھر مصنف کا یہ کہنا کہ دون الکلب کے علاوہ باقی روایت اسی طرح ہے اور ﴿دون الکلب﴾ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کی صفت کا ذکر نہیں ہے مطلق کتے کا ذکر ہے یعنی الکلب الاسود شيطان کا ذکر نہیں ہے۔ ﴿ولابی داود... نحوہ﴾ ابو داؤد اور نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے (دون آخرہ) سوائے آخری حصہ کے یعنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں جو ﴿الاسود الکلب شيطان﴾ ہے وہ ابو داؤد، نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں نہیں۔ نحوہ اور آخرہ دونوں میں ”ضمیر“ کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت دور ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں اصلہ ذکر کی گئی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متابعت کے طور پر۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں۔ ﴿قید﴾ تنقید سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ میں کہ حائضہ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ (عون المعبود مطبوعہ ہند۔ ج ۱، ص: ۲۵۹)

حاصل کلام: سترہ کی مشروعیت کی حکمت کیا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمت الہی اس کے سامنے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ جب نمازی سترہ اپنے سامنے قائم کر لیتا ہے تو یہ سترہ حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کی حدود میں داخل ہونے والے کے بالمقابل ہو جاتا ہے، کیونکہ پس پردہ مقابل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سترہ کے آگے سے کوئی گزرتا ہے تو رحمت اس کے مزاحم نہیں ہوتی۔ تو پھر کسی قسم کا نماز میں خلل اور نقص واقع نہیں ہوتا اور جب نمازی اپنے آگے کوئی سترہ قائم نہیں کرتا تو کوئی معین حد مقابلے میں نہیں ہوتی۔ پھر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رحمت سجدہ کی جگہ تک دراز ہوتی ہے کہ اب اگر کوئی ان جگہوں میں گزرتا ہے تو رحمت اس سے مزاحمت کرتی ہے تو یہ نماز کی برکت میں نقص اور چرے کے سامنے رحمت کے نزول کے انقطاع کا سبب بن جاتی ہے۔ جو نبی آپ اس حکمت میں ذرا تامل سے کام لیں گے اور غور کریں گے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور حق واضح ہو جائے گا۔ سترہ کے مسائل۔ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پس اتنی گفتگو اور بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ نماز کے ٹوٹنے سے مراد، نماز سرے سے باطل ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ نماز کی برکت اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جس آدمی نے سترہ قائم کئے بغیر نماز پڑھی اور اس کے آگے سے اتنے فاصلہ سے کوئی گزر گیا جتنا فاصلہ ایک چپکی کے ذریعہ پھینکے ہوئے سنگریزے کا ہوتا ہے تو گزرنے والا نماز کی برکت اور ثواب کو قطع کرنے کا موجب و باعث نہیں بن سکتا اور نہ وہ گناہ گار ہی ہو گا اس لئے کہ وہ رحمت کے نزول کے مقامات اور مواقع کے درمیان خلل انداز نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امام غیر مشروط طور پر مقتدی کیلئے سترہ کا کام دیتا ہے خواہ اس کے آگے سترہ ہو یا نہ ہو کیونکہ رحمت الہی کے متوجہ ہونے کی جگہ ان کیلئے ہے اور وہ ان مقتدیوں اور امام کے درمیان ہے اور یہ بات کہ عورت، کتا اور گدھا کا خاص کر ذکر کیوں کیا گیا؟ کیا ان کے علاوہ اور کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نماز کی برکت کو قطع نہیں کرتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کیلئے گناہ گار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آگے سے گزرنے کے گناہ والی حدیث پہلی گزر چکی ہے۔ درحقیقت بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی جگہیں گمان کی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بہ نسبت ان سے نماز کے فاسد ہونے کی وجہ سے زیادہ شدید، زیادہ گھناؤنی ہے۔ ترمذی نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپائے جانے والی چیز ہے۔ پس جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر جھانکتا اور تانکتا ہے اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر پیٹتا ہے اور جہاں تک

کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں الکلب الاسود شیطان کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس شخص نے کتا پالا جب کہ شرع میں دی گئی اجازت کے مطابق نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں دو قیراط کی کمی واقع کر لی۔

(۱۸۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتَرْه مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيَقَاتِلْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: فَإِنْ مَعَهُ الْقَرِينُ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی سترہ قائم کر کے نماز پڑھنے لگے اور کوئی آدمی اس کے سامنے (یعنی سترہ اور نمازی کے درمیان فاصلہ) سے گزرنے لگے تو (نمازی کو چاہئے کہ) وہ اسے روکنے کی کوشش کرے اگر وہ (گزرنے والا پھر بھی) باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان (بصورت انسان) ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی

ہے۔

لعنوی تشریح: ﴿یجناز﴾ گزرتا ہے ﴿بین یدیه﴾ اس کے آگے سے، سامنے سے۔ یعنی نمازی اور قائم شدہ سترہ کے درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم یعنی دفع کرنا اور لڑنا واجب پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہیں مندوب ہے ﴿فانما هو شیطان﴾ اس کا یہ عمل شیطانی اکساہٹ کی وجہ سے ہے ﴿القرین﴾ ساتھی، مراد وہ شیطان ہے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے، تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

حاصل کلام: نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ظاہر ہے کہ نزدیک تو بزور اسے روکنا واجب ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ نمازی گزرنے والے کو اشارہ سے روکنے کی کوشش کرے، اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بعد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ بس اتنی لڑائی اس سے مراد ہے، دھینکا مٹتی مراد نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز اتنے عمل سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی۔

(۱۸۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ شَيْئًا، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصًا، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَحْطْ خَطًّا، ثُمَّ لَا يَضْرِبْهُ مِنْ مَرِّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لے یا قائم کر لے اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاشھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاشھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) خط ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا نمازی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن کے مرتبہ کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿فلینصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا، قائم کرنا، کھڑا کرنا وغیرہ۔ ﴿لم یصب﴾ اصابہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ صواب کو بھی نہیں پہنچ سکا، نہیں پاسکا، حاصل نہیں کر سکا۔ سترہ قائم کرنے کی بجائے صرف خط کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اسے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ سترہ کیلئے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں خط کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترہ کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ حلالی صورت کا ہونا چاہئے (چاند کی شکل کا) یعنی محراب کی طرح قوس دار اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لباطط کھینچا جائے اور یہ بھی رائے ہے دائیں، بائیں کھینچا جائے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ ہر چیز کا ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز میسر نہ ہو تو خط بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن الصلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی بن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے۔

(۱۸۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَنْقُطُ الصَّلَاةُ شَيْئًا، وَادْرَأُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (البتہ سامنے سے) گزرنے والے کو حتی الوسع روکنے کی کوشش کرو۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے، اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿لا یقطع الصلاۃ﴾ اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی ﴿ادروا﴾ دفع کرو، ہٹاؤ، دور کرو۔

اس کی سند میں ”مجالد“ نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف کہا ہے۔

نماز میں خشوع و خضوع کی ترغیب کا بیان

۵ - باب العث عَلَى الْخُشُوعِ فِي الصَّلَاةِ

(۱۸۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِرًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَمَعْنَاهُ أَنْ يَجْعَلَ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ. وَفِي الْبُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «أَنَّ ذَلِكَ فِعْلُ الْيَهُودِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اپنے دونوں کولہوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری اور مسلم۔ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں)

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ یہودیوں کی نماز کا طریقہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب العث﴾ حث بحث حشا ترغیب دلانا، ہمت دلانا، نشاط ابھارنا ﴿الخشوع﴾ تذلل اور سکون ظاہری اور باطنی طور پر۔ یعنی تمام اعضاء انسانی آنکھ، دل، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو۔ ﴿مختصراً﴾ اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے یعنی کولہوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصہ انسان کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر سے پسلیوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

حاصل کلام: نماز چونکہ خالص اللہ کیلئے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ ایسی ہیئت، حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہئے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عاجزی و انکساری کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار اور فروتنی و مسکین صورت و ہیئت ہونی چاہئے جو اللہ کو پسند ہے۔ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے نماز میں ”اختصار“ کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ ہیئت یہودی کی ہے اس لئے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(۱۸۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ الْعِشَاءُ فَأَبْدَأُوا بِهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا کھالو۔“

(۱۸۹) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلَا يَمْسَحُ الْحَصَى، فَإِنَّ الرِّحْمَةَ تَوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْحَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَاجِدَةً أَوْفَغَ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ مُعْتَمِدٍ نَحْوُهُ بِغَيْرِ تَغْلِيلٍ.

مسند احمد میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر کنکریاں ہٹانا ہی ہیں تو ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو اور صحیح بخاری میں حضرت معقوب سے یہی روایت مروی ہے اس میں سبب کا بیان نہیں ہے)

نغوی تشریح: ﴿فلا یمسح﴾ یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ یا سجدہ کرنے کی جگہ (سے نکلیاں نہ ہٹائے) ﴿والحصی﴾ الحصیہ چھوٹے سنگریزے، چھوٹی چھوٹی نکلیاں ﴿زاد احمد فی روایتہ﴾ احمد نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر نکلیوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹالے ورنہ چھوڑ دے ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ﴿بغیر تعلیل﴾ یعنی اس میں علت بیان نہیں کی یعنی اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رحمت الہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ہمیں راہ نمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہئے اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو آغاز نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں 'نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہ رہے۔ اگر سجدہ کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر رحمت خداوندی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے، اگر نمازی ایسا فعل انجام دے گا تو رحمت سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ راوی حدیث: ﴿معقوب بن عمیقہ﴾

وجہ سے دوسی کھلائے۔ مکہ میں قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ جسہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ کی مہربوت پر متعین تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

(۱۹۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، دُورَانِ ادْهَرِ ادْهَرِ دِيكُنْهِ كَے بارے میں دریافت کیا۔ فَقَالَ: «هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الْعَبْدِ». رَوَاهُ شَيْطَانُ انْسان كِي نماز كو جھپٹ لیتا ہے۔“ (بخاری)

ترمذی کی حدیث (جسے اس نے صحیح قرار دیا ہے) میں وَلِلَّتَّرْمِذِيِّ عَنْ أَنَسٍ - وَصَحَّحَهُ - ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نماز میں اتفات : «إِيَّاكَ وَالْإِتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ، (ادھر ادھر نظر دوڑانے) سے بچنے کی کوشش کرو یہ فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَنِي موجب ہلاکت ہے۔ اگر شدید اور ناگزیر مجبوری التَّطَوُّعِ“۔ لاحق ہو تو نوافل میں ایسا کیا جاسکتا ہے۔“

لعوی تشریح: ﴿الائتفات﴾ دائیں بائیں نظر کرنا ﴿الاختلاس﴾ کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ ﴿ایاک﴾ کاف پر فتح۔ مرد کو خطاب ہے اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو اتفات سے بچاؤ ایسا کہ منصوب ہے تحذیر یعنی ڈرانے اور خوف دلانے کیلئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور اتفات سے بچنے کی کوشش کرو۔ ﴿ہلکۃ﴾ ”ہاء“ اور ”لام“ اور ”کاف“ تینوں پر فتح۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ یہ تو شیطان کی اطاعت و فرمان برداری ہے اور وہی اس پر برا گینتہ کرتا ہے۔

حاصل کلام: شیطان انسان کا اذی دشمن ہے وہ کوئی موقع انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ضائع نہیں کرتا، حتیٰ کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھیرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزء سے غافل اور بے پروا ہو جائے اور پورے ثواب سے محروم رہ جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ شدید اور سخت ضرورت کے وقت اتفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے اور گردش نہ کرنے پائے صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(۱۹۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «جَبَّ تَمَّ مِنْ سَبْعِ كَوْنِي نَمَازٍ هُوَ تَا

ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ فَلَا يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلَكِنْ عَنْ شِمَالِهِ تَحْتَ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ».

ہے تو اپنے آقا و پروردگار سے باتیں کر رہا ہوتا ہے (لہذا ایسی حالت میں) اپنے سامنے کی طرف اور دائیں جانب نہ تھو کے بلکہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے (تھو کے)“ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے۔

لغوی تشریح: ﴿یَسْأَلُ﴾ مناجاة سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ ﴿فَلَا يَبْصُرُ﴾ پس مت تھو کے۔ یہ ممانعت تھوک وغیرہ کو شامل ہے ﴿وَلَا عَنْ يَمِينِهِ﴾ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب دائیں جانب کی تعظیم و تکریم ہے اور حدیث میں اس کا سبب یہ بھی مذکور ہے کہ دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران تھوک یا ناک وغیرہ آجائے تو سامنے اور دائیں جانب تھوکنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آجائے تو کسی رومال یا کپڑے وغیرہ پر لے کر اسے مل دینا چاہئے۔ اگر کوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوک وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے پھینک دے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسجد میں قائلین وغیرہ نہ ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس جگہ کو صاف بھی کرے اور مزید برآں وہاں کوئی خوشبو چھڑک دے، تاکہ اثر زائل ہو جائے اور اس کی مجبوری کے گناہ کا کفارہ بھی بن جائے۔ بہر حال نماز میں قبلہ رو تھوکنا نہیں چاہئے۔ بعض صحابہؓ و تابعین رحمہ اللہ نماز سے باہر بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ادب و احترام اور پاکیزگی کا یہی تقاضا ہے۔ ابو داؤد وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک امام کو نماز کے دوران قبلہ رخ تھوکنے کی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرمادیا تھا۔

(۱۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، سَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكَ هَذَا، فَإِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِرُهُ تَعْرِضُ لِي فِي صَلَاتِي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

وَآتَفَقَا عَلَى حَدِيثِهَا فِي قِصَّةِ بخاری اور مسلم دونوں ابو جہم کی چادر انجانیہ کے خلل اندازی اور خرابی کا باعث بنتی ہیں۔“ (بخاری)

أَنْبَجَانِيَّةَ أَبِي جَهْمٍ، وَفِيهِ: «فَإِنَّهَا قَصَّةٌ فِي مَتَّقٍ فِيهِ اسٌّ هِىَ كِه اس ٲادر نِه اَلْهَنِي عَنِ صَلَاتِي»۔
مِجِه ميري نماز سِه غافل كر ديا۔

لغوى تشرح: ﴿قِرام﴾ قاف كِه نيچِه كسرہ۔ راءِ ٲر تخفيف۔ مختلف رِنگوں والا باريك كپڑا ﴿امبِطى﴾ مِجِه سِه دور كر دو۔ ﴿تِصاوِبره﴾ اس كِه علامات اور نقوش۔ ضرورى نِهين كِه يِه نقوش حيوانات كِه هوں كِه جس سِه حيوان اور انسان كِه تصوير كِه جواز كِه دليل بنا لى جائِے۔ ﴿تِعرِض﴾ ظاھر اور نماياں هوتِے هِیں۔ ﴿فى قِصِةِ اِنْبِجَانِيَّةِ﴾ حمزه مفتوح، نون ساكن ”با“ كِه نيچِه كسرہ اور جِيم مخفف۔ الف كِه بعد والا نون مكسوره اور ياءِ نسبتي ٲر تشديد يعنِى ”اونى ٲادر بغير نقوش كِه“ قصِه اس كا يِه هِى كِه ابو جهم ؑؑ نِه نبى كريم ؑؑ كِه خدمت ميں ايك ٲادر تحفِه كِه طور ٲر ٲيش كى۔ اس ٲادر ميں كِچِه نقوش و اعلام تِهے اور وه ٲادر تِهى بھى باريك۔ اُٲُ نِه اِسِه ٲن كِريا اوڑھ كر نماز ادا فرمائى تو اُٲُ كى نظر بھى اعلام و نقوش كى جانب مبذول هوكى۔ نماز سِه فارغ هوتِے هِى فرمايا ”اس ٲادر كو ابو جهم ؑؑ ٲاس هِى لِهے جاؤ اور اس سِه مِجِه ﴿اِنْبِجَانِيَّةِ﴾ لا دو۔“ اُٲُ نِه ابو جهم ؑؑ كى خميصِه (نقش دار ٲادر) كِه بدلِه ميں بغير نقوش والى ﴿اِنْبِجَانِيَّةِ﴾ اسى سِه طلب فرمائى تا كِه ايسانِه هو كِه ابو جهم ؑؑ كِه دل كو ٲوٹ لگِه كِه اس كِه تحفِه كو سركارِ دو عالم ؑؑ نِه واپس فرما ديا۔ ﴿فانها الهنى عن صلاتى﴾ يعنِى ابو جهم ؑؑ كى ٲادر نِه مِجِه غافل اور مشغول كر ديا ﴿الهنى لهى يلهى﴾ ”ها“ كِه نيچِه كسرہ بمعنِى غفلت، غافل كر دينا اور يِه ﴿لهالها﴾ جس كِه معنِى كِهيلنے كِه آئِه ٲس سِه ماخوذ نِهين هِى۔

حاصل كلام: اس حديث سِه يِه سبق ملتا هِى كِه هر وه چيز جس سِه نمازى كى توجِه نماز سِه هٹ كر اس كى طرف هو جانِه كا انديشِه هو اسِه دور كر دينا چاهِے، تا كِه وه نماز ميں خلل انداز نہ هو۔ اكر اسِه دور كرنا اور هٹانا بس ميں نہ هو تو خود سامنِه سِه هٹ جانا چاهِے، تا كِه خشوع و خضوع اور توجِه ميں كى ٲيدانِه هو۔
راوى حديث: ﴿ابو جهم ؑؑ﴾ يِه ابنِ حذيفِه بن غانم قرشى العدوى هِیں۔ عدى قبيلِه ميں سِه هونِه كى وجِه سِه عدوى كھلائے۔ ان كا اصل نام عامر يا عبید هِى۔ فتح مكِه كِه سال اسلام ٲبول كيا۔ عمر رسيده لوگوں ميں سِه تِهے۔ جب قریش نِه كعبِه كو تَعير كيا، اس موقعِ ٲر موجود تِهے اور ابنِ زبیر ؑؑ كِه تَعير خانِه كعبِه كِه وقت بھى۔ ابنِ زبیر ؑؑ كى خلافت كِه ابتدائى ايام ميں وفات ٲائى۔

(۱۹۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حَدَّثَنَا عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَوَيْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ نَظَرُ آسَمَانِ كى جانب اٹھانِه سِه باز آجائِیں ورنِه يَزْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي ايسانِه هو كِه ٲھران كى نظريں واپس هِى نہ آئِیں۔ الصَّلَاةِ، أَوْلَا تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ» رَوَاهُ مُسْلِمٌ (يعنِى ناينا هو جائِیں) ”مسلم“

اور مسلم هِى ميں حضرت عائشِه رضى اللہ عنہا سِه مروى هِى

عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب کھانا یَقُولُ: «لَا صَلَاةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ»، حاضر ہو اور قضائے حاجت درپیش ہو تو نماز نہیں وَلَا وَهُوَ يُدْفِعُهُ الْأَخْبَانِ»۔ ہوتی۔

لغوی تشریح: ﴿لینتھیں﴾ انتہاء سے ماخوذ ہے اور اس میں لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ آخر میں نون مشدودہ تاکید کیلئے ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں۔ یعنی رک جائیں، باز آجائیں، منع ہو جائیں ﴿اولا ترجع﴾ یعنی واپس نہیں لوٹیں گی ان کی نظریں ﴿الیہم﴾ ان کی طرف۔ یعنی وہ ناپینا ہو کر رہ جائیں گے۔ دونوں میں سے ایک کا وقوع لازمی ہے یا تو لوگ آسمان کی طرف اوپر نماز میں اپنی نظریں اٹھانے سے باز آجائیں گے یا پھر بطور سزا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کو اچک لے گا۔ ﴿ولا وهو یدفعہ الاخبان﴾ یعنی اس وقت نماز نہیں ہوتی جب نمازی پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز پڑھے

حاصل کلام: نماز کے دوران آسمان کی جانب اوپر نظریں اٹھانا حرام ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسا کرنے والے کی نماز ہی نہیں رہتی۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ اس میں سخت نہی اور وعید ہے آسمان کی طرف دیکھنے کی۔ انہوں نے اس نہی کے تحریمی ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے قضائے حاجت کی اگر شدید حاجت ہو تو اسے روک کر نماز ادا نہ کرنی چاہئے۔ ایسی نماز نہیں ہوگی۔ پیشاب، پاخانہ کی جب شدید حاجت ہو تو اس وقت یہ دونوں نمازی کو ان سے فراغت کی جانب بزور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔

(۱۹۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”جمائی کا آنا شیطانی حرکت ہے۔ تم «التَّشَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا تَنَاءَبَ» میں سے اگر کسی کو جمائی آجائے تو حتیٰ الوسع اسے أَحَدُكُمْ فَلْيَكْظُمْ مَا اسْتَطَاعَ»۔ رَوَاهُ روکنے کی کوشش کرے۔“ (مسلم اور ترمذی۔ ترمذی مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «فِي الصَّلَاةِ»۔ نے اپنی روایت میں ”نماز میں“ کا اضافہ نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿التشاوب﴾ حمزہ کے ساتھ۔ التشاوب کے معنی دل کے عضلات میں جو بخارات اور گیسوں جمع ہو جاتی ہیں ان کو خارج کرنے کیلئے منہ کا کھولنا کہ وہ خارج ہو جائیں التشاوب کہلاتا ہے۔ ﴿من الشيطان﴾ اس کا مطلب ہے کہ تشاوب (جمائی) معدہ کا خوب پر ہونا، بدن کا بوجھل اور بھاری ہونا۔ ان حواس کا مکدر ہونا جو سوء فہم اور سستی اور نیند کا موجب ہوتا ہے، کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں شیطان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جمائی شیطانی حرکت ہے ﴿فلیکظم﴾ یاء مضارع پر فتح اور ”غاء“ کے نیچے کسرہ یعنی اس کو روکے، باز رکھے، اسے روکنے کیلئے دونوں ہونٹوں کو بند رکھے یا منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

حاصل کلام: جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ جمائی نتیجہ ہوتی ہے سستی، کابلی اور معدہ کو خوب پر کرنے کا۔

ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کو اس کی طرف منسوب کر دیا ہے ”فی الصلاۃ“ کی زیادتی بخاری میں بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جمائی کے دوران آواز نہیں نکالنا چاہئے۔

مساجد کا بیان

۶ - باب المساجد

(۱۹۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا رَوَتْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ. وَأَنْ تُنْظَفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِسْنَاهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں جائے نماز متعین کرنے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ (اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، و تہذیب۔ روایہ احمد و ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب المساجد﴾ مساجد مسجد کی جمع ہے۔ مسجد میں واقع جیم پر کمرہ ہے وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہو اور جیم پر فتح بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا معنی سجدہ کرنے کی جگہ۔ ﴿فی الدور﴾ دور، دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر ”دور“ سے مراد محلہ یا قبیلہ ہے اس لئے کہ محلہ اور قبیلہ میں بہت سے گھر ہوتے ہیں یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلا معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہے ﴿وان تنظف﴾ تنظیف سے ماخوذ ہے صینہ مجہول ہے۔ گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے ﴿وتطیب﴾ تطیب سے ماخوذ ہے اور صیغہ مجہول ہے اور اس میں خوشبو از قسم بخور وغیرہ لگائی یا جلائی جائے۔

حاصل کلام: مسجد اور نماز پڑھنے کی جگہوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہئے اور ان میں خوشبو لگانی چاہئے۔ اس حدیث میں ”دور“ سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہئے۔ انہیں خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنا چاہئے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہئے جہاں سنن و نوافل ادا کئے جاسکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(۱۹۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «قَاتِلِ اللَّهَ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ، «وَالنَّصَارَى».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ یہودیوں کو عارت و برباد کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔“ (اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نصاریٰ کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے)

ولہما من حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا: کانوا إذا مات کہ ”جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا ہے تو یہ

لغوی تشریح: ﴿قاتل﴾ لعن اور اہلک کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انہیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنا لینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے ﴿زاد مسلم والنصارى﴾ مسلم نے یہود کے بعد لفظ نصاریٰ کا اضافہ نقل کیا ہے (یعنی اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں) ﴿شرار﴾ شر کی جمع ہے جو اسم تفضیل اشْر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور خلق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہے۔

حاصل کلام : قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتب ہیں جنہیں آسمانی کتب دی گئیں۔ مگر ان بد بختوں نے اپنے انبیاء کرامؑ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور جس جرم بدتر کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب۔ یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آرہی ہے، ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے، ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیح سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجدوں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف خدا کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیئے جائیں مثلاً سجدہ، رکوع کیا جائے یا دو زانو ہو کر ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے یا قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں۔ میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر یا دوسری مساجد سے انہیں متبرک سمجھا جائے۔ یہ شرعاً درست نہیں۔

(۱۹۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ يَهْلًا، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، فَرَبَطُوهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِ الْمَسْجِدِ، الْحَدِيثِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿خیلا﴾ گھوڑ سواروں کا دستہ۔ جماعت ﴿فربطوہ﴾ اس کو باندھ دیا (مضبوطی کے ساتھ) ﴿بساریہ﴾ ستون کے ساتھ ساریہ کی جمع سواری آتی ہے۔ یہ قیدی جسے یہ دستہ گرفتار کر کے لایا، ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے نیز ضرورتاً مسجد کو جیل قرار دینا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، تلاوت قرآن سنیں، صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں۔ امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بدست کھڑے دیکھیں اور ان سے تاثر قبول کریں۔ قیدی ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرہ کی غرض سے آ رہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسجد نبویؐ میں اسے نبی ﷺ نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا آخر کار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

(۱۹۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے اَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانٍ يُنْشِدُ فِي كِهِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے الْمَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ پَاس سے ہوا، وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ كُنْتُ أُنْشِدُ فِيهِ، وَفِيهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا (اس پر) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا (گھورتے کیوں ہو؟) مَنَّكَ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ.

میں تو اس وقت مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی (یعنی رسول اللہ ﷺ) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ینشد﴾ انشاد سے ماخوذ ہے ”یاء“ پر ضمہ اور ”شین“ پر کسرہ۔ اشعار پڑھنا ﴿فلحظ الیہ﴾ دیکھنا۔ ناپسندیدہ لگا ہوں سے ﴿فقال﴾ سے مراد حضرت حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿وفیہ﴾ ”واو“ حالیہ ہے یعنی جبکہ وہ مسجد میں تھے۔ ﴿من هو خیر منك﴾ اس سے نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید کے خلاف ہوں، جن میں سے شرک کی بو آتی ہو، جو مذموم اور برے اشعار ہوں یا نمازیوں کیلئے دخل اندازی کا باعث ہوں کہ نماز میں توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی بھو ہوتی تھی۔ آپؐ سن کر فرماتے تھے ”روح القدس تیری مدد فرمائے۔ تمہارے اشعار کفار کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔“

راوی حدیث: ﴿حسانؓ﴾ حسان بن ثابت انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول ﷺ کے لقب سے مشہور تھے۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابتؓ سب سے بڑے شاعر تھے۔ ۵۴ھ میں حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ كَرِهَ أَنْ يَكُونَ فِي مَسْجِدٍ أَوْ فِي مَسْجِدٍ مِنْ مَسَاجِدِ الْمَسَاجِدِ لَمْ تُبْنَ لَهُذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. مقصد کیلئے تو نہیں بنائی گئی ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بُني﴾ ”بنا“ پر فتح اور ”شُيْن“ پر ضم۔ باب نصر بنصر کے وزن پر۔ تلاش و طلب کرنا۔ ڈھونڈنا تلاش کرنے کیلئے اونچی آواز سے پکارنا ﴿ضَالَّة﴾ گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جاتا ہے ﴿لَارِدَهَا اللَّهُ عَلَيْكَ﴾ بظاہر تو لا اس میں نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کیلئے کہ خدا کرے وہ چیز جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے۔ کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ ﴿لَمْ تُبْنَ﴾ بناء سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی اس غرض کیلئے ان کی تعمیر نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر گم تو نہیں ہوتے۔ تو پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَن رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللَّهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ۔

ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿یَسْتَعِیْ﴾ یسْتَعِیْ کے معنی میں، جس کے معنی خریدنا ہے ﴿لَا اَرْحَ اللّٰہ تجارۃکَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تیری اس تجارت کو سود مند اور منافع بخش نہ بنائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مساجد میں بیع و شراء، خرید و فروخت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ مسجدیں تجارتی منڈیاں نہ بنائی جائیں۔ مسجدیں تو صرف عبادت الہی کیلئے تعمیر کی جاتی ہیں اگر ان میں بھی تجارت شروع ہو جائے تو یہ اپنا مقصد تعمیر کھو بیٹھیں گی۔ ان کو صرف یاد الہی کیلئے ہی مخصوص ہونا چاہئے۔

(۲۰۱) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ عَنْ حُزَامِ بْنِ حَزَامٍ رَوَى عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَلَا يُسْتَقَادُ فِيهَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَبُخَارِيُّ وَصَيْفِيٌّ. (اس حدیث کو ابوداؤد اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لَا تُقَامُ﴾ اقامہ سے ماخوذ ہے نہ نافذ کی جائیں نہ جاری کی جائیں۔ ﴿الحدود﴾ وہ سزائیں جن کی اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر فرمادی ہے کہ فلاں جرم کی فلاں سزا ہے اور اتنی ہے ﴿وَلَا يُسْتَقَادُ﴾ میغنہ مجہول۔ قصاص لیا جائے ﴿بِسند ضعیف﴾ ضعیف سند سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور یہی بات درست ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (مرعاۃ)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدوں میں حدود قائم نہ کی جائیں اور قصاص بھی نہ لیا جائے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ سزا پانے والے کا خون یا گندگی پیٹ سے خارج ہو جائے اور مسجد گندی ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿حکیم بن حزام﴾ حزام ”حاء“ کے نیچے کسرۃ۔ ان کی کنیت ابو خالد تھی۔ قبیلہ قریش کے اسد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی کے بیٹے (بھانجے) تھے۔ اشرف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ واقعہ فیل سے ۱۳ سال پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ۵۴ھ میں یا اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ ساٹھ برس دور جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال اسلام میں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ خود بھی نہایت شریف القدر صحابی تھے۔

(۲۰۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰہ عَنْہَا عَنْ حُزَامِ بْنِ حَزَامٍ رَوَى عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «لَا تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِي الْمَسَاجِدِ، وَلَا يُسْتَقَادُ فِيهَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَبُخَارِيُّ وَصَيْفِيٌّ. (اس حدیث کو ابوداؤد اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

قَرِيبٌ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مسجد میں مریض کے قیام کے لئے خیمہ وغیرہ نصب کرنا جائز ہے۔ نیز مسجد میں سونا، بیمار یا زخمی کی بیمار پرسی اور تیمار داری کرنا اور اس کے علاج کا بندوبست کرنا بھی درست اور جائز ہے۔

(۲۰۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتُرُنِي، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الْحَبْشَةِ يَلْعَبُونَ فِي الْمَسْجِدِ، الْحَدِيثُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ میرے لئے پردہ بنے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کے کھیل کو دیکھ رہی تھی جو وہ مسجد میں کھیل رہے تھے۔ یہ طویل حدیث کا جزء ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بسترنی﴾ آپؐ نے مجھے پردہ میں لیا ہوا تھا یعنی نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھ

ری تھیں۔ ﴿الحبشة﴾ حبشی کی جمع ہے یعنی ملک حبش کے باشندے ﴿یلعبون﴾ گرائمر میں یہ حبشہ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا کھیل نیزے اور ڈھال کے ساتھ تھا اور عید کا دن تھا۔ اس قسم کا کھیل جنگی مشق کی قسم میں سے ہے۔ اس قسم کی جنگی مشق کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خوشی کے دن جنگی کرب کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ نیز عورت اجنبی مرد کو فی الجملہ دیکھ سکتی ہے مگر تفصیل سے نہیں یعنی اجنبی مرد کے اعضاء جسم کو بغور ملاحظہ نہیں کر سکتی۔

(۲۰۴) وَعَنْهَا أَنَّ وَلِيدَةَ سَوْدَاءَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک سیاہ کَانَ لَهَا حِجَابٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَتْ رَنُكُ لُرُكِي كَاخِيْمَةِ مَسْجِدٍ مِيں تھو وہ میرے چاس باتیں تَأْنِيْنِي، فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. الْحَدِيثُ. كَرْنِي كِيْلِي آيَا كَرْتِي تَهِي. (بخاری و مسلم) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ولیدہ﴾ لونڈی ﴿حِجَابٌ﴾ ”خاء“ کے نیچے کسرہ ”باء“ مخفف۔ خیمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿فَنَحْدُثُ﴾ دراصل تَنَحْدُثُ تھا۔ تَنَحْدُثُ کے معنی میں ”بات کرنے، گفتگو کرنے کیلئے آتی ہے۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مسجد میں رات بسر کر سکتی ہے بشرطیکہ کسی فتنہ و فساد کا خطرہ نہ ہو اور اس کیلئے مسجد میں خیمہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث بخاری میں ہے۔

(۲۰۵) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَهَوُّكُنَا كَنَاهٍ هِي. اس كا كفاره وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسجد میں تھو کنا گناہ ہے۔ اس کا کفارہ

حاصل کلام: مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کیلئے تعمیر کی جاتی ہے، اسے ظاہری اور باطنی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ مسجد میں تھو کنا آداب مسجد کے خلاف ہے شائستگی اور نظافت اور ذوق سلیم پر بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس لئے تھو کنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے، تاکہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

(۲۰۶) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ». أَخْرَجَهُ الْحُسَيْنُ. لَكِيں۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے بجز ترمذی کے۔

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ینبأھی﴾ ایک دوسرے پر فخر کریں گے ﴿فی المساجد﴾ یعنی مسجدوں کی تعمیر کی بلندی میں۔ علوشان میں۔ اس کی زیبائش و تزئین میں اور خوبصورتی میں۔
حاصل کلام: قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدیں تعمیر کریں گے خوب نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کریں گے پھر باہمی مقابلہ کریں گے کہ ہماری مسجد فلاں کی مسجد سے خوبصورت اور بہترین بنی ہوئی ہے مگر آباد نہ ہوں گی۔ نمازیوں سے خالی ہوں گی، تعمیر کرنے والوں کی بے حسی اور عدم توجہ کا نوحہ کر رہی ہوں گی۔

(۲۰۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا أَمَرْتُ بِتَشْيِيدِ (بناؤ سنوار) کا حکم نہیں دیا گیا۔“ (اسے ابوداؤد نے المساجدِ). أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَّانَ. روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما امرت﴾ ”ما“ اس میں نافیہ ہے۔ میغنیہ مجہول ہے۔ ﴿بتشيد المساجد﴾ چونا گچ کرنا، آرائش کرنا، نقش نگاری کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا منع ہے۔ مسجدوں کو ذکر الہی اور خالص عبادت سے آباد کرنے کا حکم ہے۔ تزئین و آرائش سے توجہ الی اللہ میں فرق آجاتا ہے۔ مسجد کی عمارت سے مقصود تو عبادت گاہ کی علامت ہے۔ گرمی، سردی اور بارش وغیرہ سے تحفظ اور بچاؤ ہے۔ مساجد کی آرائش اور نقش و نگاری بادشاہوں کی سنت ہے۔ ولید بن عبد الملک پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نقش و نگار کرائے۔ ورنہ عہد رسالت مآب، خلافت راشدہ میں کہیں دور دور تک بھی اس کے نشانات نہیں ملتے۔ علماء حق کو مجبوراً خاموشی اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔

(۲۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أَجُورُ أُمَّتِي، حَتَّى الْقَدَاةُ يُخْرِجَهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَفْرَغَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے۔ (جو باعث ثواب ہیں) یہاں تک کہ وہ تنکا بھی میں نے ان اعمال میں دیکھا جسے آدمی مسجد سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔“ (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے غریب کہا ہے)

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی کام بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ مساجد کی صفائی اور پاکیزگی کی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ تنکا تک مسجد میں رہنے نہ دیا جائے۔ جو شخص اتنا سا معمولی کام اس نظریہ کے پیش نظر انجام دیتا ہے کہ (تینکا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے) اسے بھی اجر ضرور ملے گا۔ ترمذی نے اس کو غریب اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کی سند میں ”مطلب بن عبد اللہ عن انس“ کے واسطے سے ہے اور مطلب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بلکہ کسی بھی صحابی سے سماع نہیں کیا۔

(۲۰۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ لے۔“ (بخاری و مسلم)

عَلَيْهِ .

حاصل کلام: حدیث میں جن نوافل کے پڑھنے کا حکم ہے اسے ﴿تحیۃ المسجد﴾ کہتے ہیں۔ شوافع کے نزدیک یہ واجب ہیں جبکہ جمہور اسے مستحب کہتے ہیں۔ حدیث کے ظاہر الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء نے ان نوافل کو مکروہ اوقات میں پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے۔ اور بعض اوقات ممنوعہ میں ممنوع کہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطیب منبر پر خطبہ بھی دے رہا ہو تو اس وقت بھی مسجد میں داخل ہونے والا دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔

نماز کی صفت کا بیان

٧ - بَابُ صِفَةِ الصَّلَاةِ

(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)

(۲۱۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَاَسْبِغِ الوُضوءَ، ثُمَّ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ مَا تيسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ، ثُمَّ اذْكُرْ حَتَّى تَنْظِمَنَّ رَاكِعًا، ثُمَّ اَرْفَعْ حَتَّى

رکوع کرو۔ پھر سیدھا کھڑے (ہو جاؤ) اور پورے اطمینان سے کھڑے رہو، پھر سجدہ کرو اور پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر دو سرا سجدہ کرو اور پورے اطمینان سے کرو۔ پس پھر باقی ساری نماز میں اسی طرح (اطمینان سے ارکان نماز ادا کرو)“ (اسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ امام بخاری کے ہیں۔)

وَلَا بَيْنَ مَا جَاءَ بِإِسْنَادٍ مُّسْلِمٍ: «حَتَّى تَظْمِنَ قَائِمًا» وَمِثْلُهُ فِي حَدِيثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ أَحْمَدَ وَابْنِ حَبَّانَ. وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: فَأَقِمَّ صَلَاتَكَ حَتَّى تَرْجِعَ الْعِظَامَ.

ابن ماجہ نے مسلم کی سند سے رکوع سے کھڑے ہونے کے وقت یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ پورے اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔ احمد اور ابن حبان میں رفاعہ بن رافع بن مالک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اپنی کمر (پشت) کو سیدھا کرو کہ ہڈیاں اپنے مقام میں واپس آجائیں۔

وَلِلنَّسَائِيِّ وَابْنِ دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ: إِنَّهَا لَنْ تَتِمَّ صَلَاةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسْبِغَ الْوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى، ثُمَّ يُكَبِّرَ اللَّهَ تَعَالَى، وَيُحَمِّدَهُ، وَيُسَنِّحَ عَلَيْهِ. وَفِيهَا: فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَأَقْرَأْ، وَإِلَّا فَاَحْمِدِ اللَّهَ، وَكَبِّرْهُ، وَهَلِّلْهُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ «ثُمَّ اقْرَأْ بِأَمِّ الْقُرْآنِ، وَبِمَا شَاءَ اللَّهُ» وَلِابْنِ حَبَّانَ: «ثُمَّ بِمَا شِئْتَ».

نسائی اور ابوداؤد میں رفاعہ بن رافع سے ہے کہ جب تک وضو کامل نہ ہو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اس وقت تک نماز مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر تکبیر کے اور اللہ کی حمد و ثناء کرے اور اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے اگر تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو تو اسے پڑھ بصورت دیگر اللہ کی حمد و توصیف کر اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ۔ ابوداؤد میں ہے کہ ”پھر سورہ فاتحہ پڑھ اور مزید جو اللہ نے چاہا۔“ ابن حبان میں ہے ”پھر جو تم چاہو پڑھو۔“

لغوی تشریح: ﴿فاسبغ الوضوء﴾ اسبغ امر کا صیغہ ہے، مبالغہ کرو، پوری طرح کرو۔ ﴿تعتدل﴾ اعتدال پر آجائیں، برابر اپنی جگہ پر آجائیں۔ ﴿قائما﴾ سیدھے کھڑے ہونا جس میں دائیں بائیں جانب جھکاؤ نہ ہو ﴿فاقم صلبک﴾ رکوع سے جب سر اٹھائے تو اپنی پشت اس طرح سیدھی کر کہ اس میں

کسی قسم کا ٹیڑھ اور جھکاؤ کی جانب میلان نہ ہو ﴿العظام﴾ ہڈیاں۔ پشت کی ہڈیاں اور اس کے سرے مراد ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی ہو سکتی ہے ﴿یشنی علیہ﴾ باب افعال سے ”یاء“ پر ضمہ ہے۔ اس کی حمد و تعریف اور تعریف بھی مبالغہ کی حد تک۔ ﴿وہللہ﴾ تحلیل سے امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ لا الہ الا اللہ کو۔ یہ حدیث حدیث مسنی الصلاۃ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ نے نمازی کو ارکان نماز پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہر رکن نماز کو اپنی جگہ اور دو ارکان کے درمیانی وقفہ میں اطمینان و اعتدال واجب ہے۔ حدیث کے الفاظ ”ثم اقرا ما تيسر“ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرأت قرآن واجب ہے ایک دوسری روایت میں ”ثم اقرا بام القرآن“ کے الفاظ بھی منقول ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ماتیسرا و بام القرآن دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں اور وہ فاتحہ ہی ہے۔ اس حدیث میں نماز کی ترتیب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں امام، مقتدی اور منفرد نماز ادا کرتے ہیں، انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو آپؐ نے بدترین چور اور ایسی نماز کو منافی کی نماز قرار دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿دفاعہ بن رافع بن مالکؓ﴾ ابو معاذ ان کی کنیت ہے، زرقی انصاری مدنی مشہور ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ان کے والد انصار میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ رافع بن رافع بدر کے علاوہ باقی سب غزوات میں شریک رہے ہیں۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علیؓ کے طرفداروں میں شامل تھے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے شروع میں ۴۱ھ میں وفات پائی۔

(۲۱۱) وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ أَمَكْنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ أَسْتَوَى، حَتَّى يَعُودَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلَا قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِأَظْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلَى رِجْلِهِ الْيُسْرَى، وَنَصَبَ الْيُمْنَى، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ

حضرت ابو حمید سعدیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تکبیر (اولیٰ) کے وقت اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے دیکھا ہے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور اپنی پشت مبارک جھکا لیتے پھر جب اپنا سر رکوع سے اوپر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ہر جوڑ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا (اس کے بعد) پھر جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ (زمین) پر اس طرح رکھتے کہ نہ زیادہ سمٹے ہوتے اور نہ زمین پر بچھے ہوئے ہوتے۔ حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں۔ جب آپؐ دو رکعت پڑھ کر قعدہ کرتے

الْبُسْرَى، وَنَصَبَ الْآخَرَى، وَقَعَدَ تَوْبَايَا پَاؤں زَمِينَ پر بچھا لیتے اور دایاں پاؤں کھڑا
رکھتے اور جب آخری قعدہ کرتے تو بایاں پاؤں
عَلَى مَقْعَدَتِهِ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

(دائیں ران کے نیچے سے) آگے بڑھا دیتے اور دایاں

کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حذو منكبيه﴾ الحذو ”حاء“ پر فتح، ذال ساکن۔ مقابل برابر۔ دونوں ہاتھوں کو
کندھوں کے مقابل (برابر) اٹھاتے۔ ﴿المنكب﴾ ”میم“ پر فتح، نون ساکن۔ کاف کے نیچے کسرہ۔
کندھے اور بازو کے باہم ملنے کی جگہ ﴿امكن يديه من ركبتيه﴾ الركبة پنڈلی اور ران کے ملنے کی
جگہ امكان مضبوطی سے پکڑنا۔ یعنی دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا ﴿مصر
ظہرہ﴾ اپنی کمر جھکائی، پشت نیچے کی ﴿فقار﴾ ”فا“ پر فتح اور قاف مخفف۔ پشت کی وہ ہڈی جو اوپر سے
نیچے والے جوڑوں کو باہم ملائی ہے ﴿غير مفتش﴾ نہ پھیلانے والے اپنے بازوؤں کو ﴿ولا
قابضهما﴾ اور نہ ہاتھوں کو اپنے پلوؤں کی طرف سکیڑنے، سینے والے ﴿قدم رجله اليسرى﴾
قدم تقدیم سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگے بڑھانا، دراز کرنا۔ یعنی دائیں ران کے نیچے سے بڑھا کر دوسری
جانب ٹکانا ﴿نصب﴾ کھڑا رکھنا، قائم کرنا، دایاں پاؤں کھڑا رکھا وقعد علی مقعدته بائیں چوڑ پر بیٹھ
گئے اسے تورک کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ کی نماز کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے کہ آپ ارکان نماز کو کس
طرح ادا فرماتے تھے۔ لہذا اہل ایمان کو اسی طرح نماز ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے۔ آپ کا
ارشاد گرامی ہے ”صلوا کما رایتُمونی اصلی“ نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔
فرمان نبویؐ کی موجودگی میں اپنی سی کوشش کرنی چاہئے کہ نماز اسی طرح آرام، سکون و اطمینان سے ٹھہر
ٹھہر کر ادا کی جائے جس طرح آپؐ نے پڑھ کر عملاً تعلیم دی ہے۔ جلدی جلدی ارکان نماز ادا کر کے نماز کو
خراب نہیں کرنا چاہئے۔ تنگ وقت میں جلدی جلدی نماز پڑھنے والے کو مرغ کی ٹھونگوں سے تشبیہ دے
کر منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے۔ نمازیوں کو بہت فکر کرنی چاہئے کہ نمازیں بھی پڑھیں مگر حاصل بھی کچھ
نہ ہو۔ ایسی نمازوں کا کیا خاک فائدہ۔

راوی حدیث: ﴿ابو حمید الساعديؓ﴾ ابو حمید (تصغیر کے ساتھ) ان کا نام عمرو تھا۔ اور یہ بھی
کہا گیا ہے کہ وہ منذر بن سعد بن منذر تھے۔ بعض نے مالک انصاری خزرجی مدنی بھی نام بتایا ہے۔ خزرج
کے باپ ساعدہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ساعدی کہلائے۔ احد اور بعد کے غزوات میں شریک
ہوئے۔ ۶۱ھ میں امیر معاویہؓ کے دور امارت کے آخر میں یا یزیدؓ کے شروع دور میں فوت ہوئے۔

(۲۱۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولٍ نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو پہلے یہ دعا پڑھتے کہ ”میں

اللہ ﷻ، اَنَّهُ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَىٰ «وَجْهَتُ وَجْهِي» طرف متوجہ کیا اور میں مشرکوں سے نہیں۔ میری لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ - نماز و قربانی، میرا جینا و مرنا اللہ رب العزت ہی کے إِلَى قَوْلِهِ - مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم ہے أَنْتَ الْمَلِكُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی وَأَنَا عَبْدُكَ، إِلَى آخِرِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، مالک، تو ہی معبود ہے، تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں.....“ (آخر تک) (مسلم)

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ یہ رات کی نماز (تہجد) میں پڑھا کرتے تھے۔ وَفِي رَوَايَةٍ لَهُ إِنَّ ذَلِكَ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ.

لغوی تشریح: ﴿اِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے سے، مراد ہے تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے افتتاح کے طور پر پڑھتے۔ ﴿وَجْهَتُ وَجْهِي﴾ توجیہ سے ماخوذ ہے۔ میں نے چہرہ پھیر لیا ﴿فَطَر﴾ خلق کے معنی میں (پیدا کیا) ﴿مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ تک اس بارے میں دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں ﴿اَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ﴾ ہے۔ میں پہلا مسلمان (مطیع فرمان بندہ) ہوں۔ آیت قرآنی میں مذکور لفظ ﴿اَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ﴾ سے الفاظ کے لحاظ سے اور دوسرا ﴿اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ مصنف نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ تمام آیت اس طرح ہے ﴿اَنَا وَجْهَتُ وَجْهِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ. اِنْ صَلَاتِي وَنَسْكَی وَمَحْيَایَ وَ مَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَٰلِکَ اٰمَرْتُ وَاَنَا اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ (۶: ۷۹، ۱۲۲، ۱۶۳)﴾ (الہی آخرہ) سے مراد اس مشہور و معروف دعا کے اختتام تک۔ پوری دعا کا ترجمہ اس طرح ہے: ”میں نے اپنا رخ اس ذات اقدس کی جانب کر لیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے، یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز، میری ہر عبادت، میرا جینا مرنا بھی اسی اللہ کیلئے ہے جو تمام جانوں کا مالک و پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں (ذات، صفات، حقوق و اختیارات میں) اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مطیع فرمان بندوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی آقا و مالک نہیں۔ تو ہی میرا آقا و پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ و غلام ہوں۔ میں نے (یقیناً) اپنی جان پر ظلم کیا اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ لہذا میرے سارے (ہی) گناہ بخش دے (حقیقت بھی یہی ہے) کہ تیرے سوا کوئی بھی دوسرا گناہ بخش نہیں سکتا۔ مجھے عمدہ اور اچھے اخلاق کی طرف راہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین اخلاق کی راہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔ مجھ سے میری بری خصلتیں ہٹا دے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ تیرے سوا برے اخلاق کو ہٹا بھی کوئی نہیں سکتا۔ بار بار تیرے حضور حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں۔ بھلائی ساری کی ساری تیرے قبضہ قدرت میں ہے اور برائی تیری جانب رجوع نہیں کر سکتی۔ میں تیرے ساتھ اور تیری

جانب ہوں۔ تو ہی بہت برکت والا اور بہت بلندی و برتری والا ہے۔ بخشش و خطا بخشی کا بخشی سے طلبگار ہوں اور توبہ کی صورت میں تیری جنب میں رجوع کرتا ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ دعائیں کی نماز (تہجد) میں پڑھتے تھے۔

مشہور محقق و محدث مولانا عبدالرحمن مبارک پوری نے ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی (ج: ۱) ص: ۲۰۳ پر اس حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم شریف کے باب صلاۃ اللیل میں دو طریق سے منقول ہے۔ ان دونوں طرق سے مروی روایت میں کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں پڑھتے تھے۔ نیز اس حدیث کو ترمذی نے ابواب الدعوات میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ تینوں میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ نماز شب میں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے (تو اس موقع پر یہ دعا پڑھتے) اور ابو داؤد نے اپنی سنن کی کتاب الصلوٰۃ میں بھی دو طریق سے روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں مانگتے تھے بلکہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آپؐ جب فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے تو اس وقت یہ دعا مانگتے اور دار قطنی کی ایک روایت میں ہے جب آپؐ فرض نماز کا آغاز فرماتے تو اس وقت وجہت وجہی الخ پڑھتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابن حبان نے بھی اسی طرح اس حدیث کی تخریج کی اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کیلئے کھڑے ہوتے اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے، انہوں نے فرض نماز کی قید لگائی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اسی طرح کہا۔ یہ قول کہ یہ دعا نقلی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور فرض نماز میں مشروع نہیں بالکل ہی باطل ہے۔ حاصل کلام: اس ضروری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دعا فرض نماز کے آغاز پر کرنا منسوخ ہے۔ تلخیص میں یہ نہیں۔ سبل السلام میں تلخیص کا حوالہ ہے مگر صحیح نہیں۔

(۲۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِلصَّلَاةِ سَكَتَ هُنَيْهَةً قَبْلَ أَنْ يَفْرَأَ، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: أَقُولُ: «اللَّهُمَّ بَاعِذْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ، كَمَا يُنْقَى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تھوڑا سا وقفہ فرماتے پھر قرأت شروع کرتے (ایک روز) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! وقفہ کے دوران آپؐ کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا "اللہم باعد بینی و بین خطایای الخ پڑھتا ہوں۔ اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے مابین اتنا فاصلہ اور دوری فرما دے کہ جتنا مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے

اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالْثَلَجِ اس طرح صاف فرما دے کہ جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی، برف، اولوں سے دھو ڈال۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿هَيْهَةَ﴾ ”ہاں“ پر ضمہ۔ ”نون“ پر فتح ”یاء“ ساکن۔ ہاء پر فتح۔ تھوڑا سا وقفہ ﴿نَقْصِي﴾ ”نون“ پر فتح۔ ”قاف“ پر تشدید نیچے کسر۔ تنقیہ سے امر کا صیغہ ہے۔ پاک و صاف کر دے ﴿يَنْقِي﴾ صیغہ مجہول ﴿الدَّسَسِ﴾ دال اور نون پر فتح، میل کچیل۔ ﴿الْثَلَجِ﴾ ”ثاء“ پر فتح، لام ساکن۔ بخار جو فضا میں سردی کے درجہ انجماد تک پہنچنے کی وجہ سے منجمد ہو جاتا ہے اور سفید روئی کی طرح ہو کر زمین پر گرتا ہے (جسے برف کہتے ہیں) ﴿وَالْبَرَدِ﴾ ”باء“ اور ”راء“ دونوں پر فتح ہے۔ بادلوں کا پانی جو سرد ہوا میں جم کر اولوں کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت سے پہلے قدرے وقفہ ہے اور اس میں یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعائے افتتاح بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھنی چاہئے۔

(۲۱۴) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اِلْحُ پڑھتے تھے اے اللہ! تو «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَبَارَكَ اسْمُكَ، وَتَعَالَى جَدُّكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالدَّارِقُطْنِيُّ مَوْضُولًا، وَهُوَ مَوْقُوفٌ.

نے منقطع اور دارقطنی نے موصول روایت کیا ہے اور یہ موقوف ہے۔

وَنَحْوُهُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ اِحْمَدُ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تعوذ یعنی اعوذ باللہ السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفسه پڑھتے تھے ”میں اللہ سمیع و علیم کی شیطان

مردود سے پناہ لیتا ہوں اس کے وسوسوں سے، اس

کے پھونکنے سے یعنی کبر و نخوت سے اور اس کے اشعار اور جادو سے۔“

لغوی تشریح: ﴿وَبِحَمْدِكَ﴾ تیری حمد کے ساتھ تیری حمد و ستائش کرتا ہوں ﴿وَتَعَالَى جَدُّكَ﴾ تیری عظمت و کبریائی بلند و بالا ہے۔ ﴿مَوْصُولًا﴾ یعنی یہ حدیث متصل سند کے ساتھ مروی ہے کسی قسم کا انقطاع نہیں ہے۔ ﴿وَهُوَ﴾ یعنی دار قطنی کی یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں اور ﴿نَحْوَهُ﴾ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح ﴿وَفِيهِ﴾ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں الرحیم مردود، ذلیل، دھتکارا ہوا ﴿مِنْ هَمْزِهِ﴾ اس کے جنون سے یعنی اس سے اللہ کی پناہ کہ وہ کسی کو مجنون بنا دے۔ اس سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے ﴿وَنَفْسُهُ﴾ اس کے تکبر سے یعنی اس تکبر و نخوت سے اللہ کی پناہ جو وہ لوگوں کے دماغوں میں بھر دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر اور بڑا سمجھنے لگتے ہیں گویا ان کے دماغوں میں کبر و غرور کی ہوا بھر دیتا ہے ﴿وَنَفْسُهُ﴾ یعنی شعرہ۔ اس کے اشعار سے اللہ کی پناہ۔ اس سے وہ مذموم اشعار مراد ہیں جن کو وہ لوگوں کے دماغوں میں ڈالتا ہے اور جادو بھی اس سے مراد ہے۔ ان تینوں کلمات کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہے۔

حاصل کلام: تکبیر تحریمہ کے بعد سورۃ فاتحہ سے پہلے نبی ﷺ سے اللھم باعد الخ والی دعا ثابت ہے۔ بعض روایات کے مطابق انی وجہت وجہی والی دعا اور سبحانک اللھم الخ دونوں کو جمع بھی کیا جاسکتا ہے سبحانک اللھم والی حدیث اگرچہ موقوف ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی اسے بطور تعلیم بلند آواز سے پڑھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو سکھاتے تھے اس لئے یہ حکماً مرفوع ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نیز سورۃ فاتحہ کے شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی موافقت کرتے ہوئے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ..... الخ کے پڑھنے کا رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اس لئے تعوذ پڑھنا ضروری ہے۔

(۲۱۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَمَازَ كَاآخِزَ اللَّهِ أَكْبَرُ سے کیا کرتے تھے اور قَرَأَتْ بِالسُّجْدَةِ الصَّلَاةِ بِالتَّكْبِيرِ، الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (سورہ فاتحہ) سے شروع کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسُهُ وَلَمْ يَنْجُحْ كَرْتِے اور نہ نیچا کرتے بلکہ اس کے درمیان يَصُوبُهُ، وَلَكِنْ بَيْنَ ذَلِكَ؛ وَكَانَ إِذَا كِي حَالَتِے میں رکھتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ اس وقت تک سجدہ میں نہ جاتے جب تک کہ بالکل حَتَّى يَسْتَوِيَ قَائِمًا، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ سِيدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور جب سجدہ سے سر مِّنَ السُّجُودِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ اٹھاتے تو دوسرا سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب

جَالِسًا، وَكَانَ يَقُولُ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ رَكَعَتَيْنِ، وَكَانَ يَقْرَأُ رَجُلُهُ الْيُسْرَى، وَابْنُ يُمْنَى، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ، وَيَنْهَى أَنْ يَقْرَأَ الرَّجُلُ ذِرَاعِيهِ أَفْتِرَاشَ السَّبْعِ، وَكَانَ يَحْتِمُ الصَّلَاةَ بِالتَّسْلِيمِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

تک کہ ٹھیک آرام سے بیٹھ نہ جاتے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے اور اپنے بائیں پاؤں کو زمین پر بچھا لیتے اور دائیں کو قائم رکھتے (کھڑا رکھتے) شیطان کی چوکڑی سے منع فرماتے اور درندوں کی طرح بازو آگے نکال کر بیٹھنے سے بھی منع فرماتے تھے اور نماز کو سلام کے ساتھ ختم کرتے۔ (مسلم۔ اس کی سند معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿یستفتح﴾ آغاز فرماتے، شروع کرتے، ابتدا کرتے ﴿والقراءة﴾ منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ قرأت شروع فرماتے ﴿لم یسخص﴾ اشخاص سے ماخوذ ہے (باب افعال) اونچا نہ اٹھاتے ﴿ولم یصوبہ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے (باب تفعیل سے) یعنی بہت زیادہ نیچے نہ جھکاتے ﴿بین ذلک﴾ یعنی ان دونوں کیفیتوں (اونچ، نیچ) کے مابین رکھتے۔ ﴿فی کل رکعتین﴾ یعنی دونوں رکعتوں کے بعد ﴿التحیة﴾ یقول کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی تشہد ہے ﴿التحیات للہ﴾ اٹھ پڑھتے اور ﴿وکان یفرش رجلہ الیسری﴾ اپنا بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے یعنی اس پر بیٹھ جاتے۔ یہ کیفیت دو جہدوں کے مابین اور پہلے تشہد کے موقع پر رکھتے جیسا کہ ابو حمید سعدی رحمہ اللہ سے مروی روایت میں اس کی وضاحت ہے ﴿وعقبہ الشیطان﴾ عین پر ضمہ اور قاف ساکن (شیطان کی چوکڑی) اسے اقواء الکلب بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی سرین کو زمین پر رکھے، گھٹنے اور پنڈلیاں کھڑی کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ لے۔ اقواء کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ یہ ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کھڑے رکھے اور زمین پر بیٹھ جائے۔ یہ ممنوع نہیں ہے۔ آخری تشہد کے علاوہ ﴿افتراش السبع﴾ سبع سین پر فتح اور ”با“ پر ضمہ۔ درندوں کے پھیلانے کی طرح اور درندوں کا بیٹھنا اسی طرح ہے کہ اپنی سرین پنڈلیوں پر بچھا کر بیٹھے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا کر ان پر جھک جائے۔ ایک روایت میں لفظ الکلب مذکور ہے السبع کی بجائے ﴿ولہ علة﴾ علة اس روایت میں یہ ہے کہ ابوالجوزاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کو روایت کیا اور ابوالجوزاء کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا گیا ہے۔

(۲۱۶) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلَاةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ، وَإِذَا رَفَعَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے اور جب رکوع کیلئے اللہ اکبر کہتے تو بھی اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے۔

(رفع الیدین کرتے) (بخاری و مسلم)

رَأْسُهُ مِنَ الرُّكُوعِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

اور ابو داؤد میں ابو حمید سے مروی حدیث میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے پھر اللہ اکبر (تکبیر) کہتے۔

وَفِي حَدِيثِ أَبِي حُمَيْدٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ .

اور مسلم میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی اسی طرح منقول ہے، جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے لیکن اس میں ”کندھوں کے مقابل“ کی جگہ اپنے کانوں کے مقابل تک اٹھاتے مذکور ہے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ حُوَيْرِثٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ . نَحْوَ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ، لَكِنْ قَالَ: حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوعَ أُذُنَيْهِ .

لغوی تشریح: ﴿یحاذی﴾ مقابل کے معنی یعنی بالمقابل ﴿ثم یکبر﴾ افتتاح صلاۃ کے وقت پہلے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل اٹھاتے پھر اللہ اکبر کہتے۔ اس کے برعکس پہلے تکبیر پھر رفع الیدین اور تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کا ذکر بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل میں یہ وسعت ہے۔ ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور مصنف نے اسی پر انحصار کیا ہے۔ اس میں رکوع کے موقع پر اور رکوع سے اٹھتے وقت کا بھی ذکر ہے۔ ﴿نحو حدیث ابن عمر﴾ یعنی جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں تین مواقع پر رفع الیدین ثابت ہے ﴿فروع اذنیہ﴾ کانوں کے اطراف۔ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس میں رفع الیدین کندھوں تک کرنے کا ذکر ہے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق و موافقت اس طرح ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں تو کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے مقابل تک اٹھائے جائیں۔ یہ تطبیق اچھی ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ اسے بھی توسع پر محمول کیا جائے کہ کبھی کانوں کے برابر اور کبھی کندھوں کے برابر اٹھاتے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین مسنون ہے۔ بعض احادیث میں دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کی ابتدا میں بھی رفع الیدین ثابت ہے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ، ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور صحیح روایت کے مطابق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بلکہ زاد المعاد اور التلخیص الجبیر وغیرہ میں مروی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم زیت رفع الیدین کرتے رہے۔ خلفائے راشدین بلکہ باقی عشرہ مبشرہ سے بھی رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ اس کے برعکس رفع الیدین نہ کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ جس کی تفصیل فتح الباری، التلخیص الجبیر اور ”جلاء القینین فی تخریج روایات البخاری فی جزء رفع الیدین“ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حضرت وائل بن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اس مسئلہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ رفع الیدین پر

نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ عمل رہا۔

چنانچہ فتویٰ ہے کہ واکل بن حجر رحمہ اللہ غزوہ تبوک کے بعد ۹ھ میں دائرۃ اسلام میں داخل ہوئے (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص: ۷۵۔ شرح العینی علی صحیح البخاری ج ۹ ص: ۴۳)

آئندہ سال جب دوبارہ آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو وہ سخت سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ کو کپڑوں کے نیچے سے رفع الیدین کرتے دیکھا، یہ ۱۰ھ کے آخری مہینے تھے۔ اس کے بعد ۱۱ھ میں سرورِ دو عالم ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی زندگی کے آخری حصے تک رفع الیدین کرتے رہے۔ نہ یہ عمل منسوخ ہوا نہ اس پر عمل متروک ہوا۔ اکثر صحابہ کرامؓ بلکہ کوفہ کے علاوہ باقی تمام بلادِ اسلامیہ میں اس پر عمل رہا۔ فقہائے اسلام کی اکثریت نے اس کو پسند کیا ہے۔ (بخاری و مسلم کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے: سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، موطا امام مالک، مصنف عبدالرزاق، المصنف لابن ابی شیبہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مسند ابی عوانہ، سنن دارقطنی، سنن کبریٰ، للبیہقی وغیرہ۔)

(۲۱۷) وَعَنْ وَاِثِلَ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى يَدِهِ الْبُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ. أَخْرَجَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھ لئے۔ (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: اس حدیث سے دو مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑا ہونا مسنون ہے اور ہاتھ کھلے چھوڑنا غیر مسنون۔ شوافع، احناف اور حنابلہ سب اس پر متفق ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ہی سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے خلاف نہیں آیا۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے سوا دوسرا کوئی قول نقل نہیں کیا بلکہ مؤطا امام مالک میں بھی ہاتھ باندھنے کی روایت موجود ہے تو پھر روایت پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ سے جو ہاتھ چھوڑنے کا ذکر ہے، وہ شاذ ہے، صحیح نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہاتھ باندھے کہاں جائیں سینے پر یا زیر ناف۔ بعض حضرات زیر ناف باندھتے ہیں، مگر زیر ناف ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے، صحیح نہیں۔ متذکرہ بالا حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی تصحیح میں لکھا ہے جس کی تائید مسند احمد میں حضرت حلب کی حدیث سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے تھے اور ایک روایت میں فوق السرة کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ تحت السرة کے مقابلہ میں فوق السرة والی روایت وزنی ہے اور اہل حدیث علماء کرام کے نزدیک قوی دلائل کی روشنی میں سینے پر ہاتھ

باندھنا ہی رائج ہے اور تحت السرة یعنی زیر ناف والی حدیث ضعیف ہے، قابل اعتبار نہیں۔

راوی حدیث: ﴿وائل بن حجر رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوہنیدہ یا ابوہندہ ہے۔ حجر ”حَا“ پر ضمہ اور جیم ساکن۔ جلیل القدر صحابی تھے۔ حضرموت کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب یہ نبی ﷺ کی خدمت میں اپنے وفد کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپؐ نے (ان کے اعزاز میں) اپنی چادر مبارک ان کے بیٹھنے کیلئے بچھا دی اور ان کیلئے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضرموت کے قبائل پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خلافت معاویہؓ کے دور میں وفات پائی۔

(۲۱۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس نے (نماز میں) رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ ام القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَابْنِ حَبَّانٍ ابن حبان اور دارقطنی میں روایت ہے کہ ”جس وَالِدُ الدَّارِ قُطْنِي: «لَا تُجْزَى صَلَاةٌ لَا نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ نماز کافی نہیں يُقْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ“۔ ہوتی۔“

وَفِي أُخْرَى لِأَحْمَدَ وَأَبْنِ دَاوُدَ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان کی ایک دوسری وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حَبَّانٍ: «لَعَلَّكُمْ روايت میں ہے کہ ”شاید تم لوگ امام کے پیچھے تَقْرَءُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟“ قُلْنَا نَعَمْ؛ (کچھ پڑھتے ہو، ہم نے عرض کیا جی ہاں (پڑھتے ہیں) قَالَ: «لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ فرمایا ایسا نہ کیا کرو۔ بجز سورۃ فاتحہ کے۔ اس لئے کہ الْكِتَابِ، فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأُ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی (تو) نماز ہی نہیں۔“ بِهَا۔“

لفظی تشریح: ﴿بسم القرآن﴾ ام القرآن سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ یہ حدیث سورۃ فاتحہ کے (نماز میں) پڑھنے کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ ”لام“ نافیہ جس پر آتا ہے اس سے ذات کی نفی مراد ہوتی ہے اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے۔ یہ صفات کی نفی کیلئے اس وقت آتا ہے جب ذات کی نفی مشکل اور دشوار ہو اور اس حدیث میں ذات کی نفی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ نماز کا شرعاً معنی تو یہ ہے کہ وہ اقوال اور افعال کا مجموعہ ہے لہذا بعض یا کل کی نفی سے اس کی نفی ہوگی۔ اگر بالفرض ذات کی نفی میں دشواری پیش آئے تو پھر حقیقت کے قریب والی صفت پر محمول کیا جائے گا مثلاً اس کی صحت کی نفی اور اس کے کافی ہونے کی نفی۔ اس معنی کی تائید حدیث میں وارد الفاظ ﴿لَا تُجْزَى صَلَاةٌ﴾ سے ہوتی ہے اس کے معنی ہوئے کہ نہ نماز کافی ہوگی اور نہ صحیح۔ ابن حبان اور دارقطنی میں ہے کہ جب اس حدیث

حاصل کلام: یہ حدیث کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام ہو خواہ مقتدی یا اکیلا ہو۔ صحیح ترین مرفوع احادیث کی روشنی میں یہی مذہب حق اور مبنی بر صداقت ہے۔ شوافع، اہل حدیث اور اہل نطاہر اسی طرف گئے ہیں کہ ہر نمازی کو ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں سے جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ہر ایک کیلئے اس کا پڑھنا واجب ہے۔ اس میں امام اور مقتدی کا کوئی فرق نہیں اور نہ ہی جری اور سری کا۔ مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی الحمد (سورہ فاتحہ) کا پڑھنا لازمی اور لابدی ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا۔ جی ہاں! اس پر آپؐ نے فرمایا کہ الحمد (سورہ فاتحہ) کے سوا اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز قطعاً نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے ”ام الکلام“ اور ”التعلیق الممجد“ میں کہا ہے کہ ”کسی بھی صحیح حدیث سے فاتحہ خلف الامام کی ممانعت ثابت نہیں اور اس سلسلے میں جو نقل کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سری نمازوں میں اور جبری کے سکتات میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہئے۔ محدثین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔“ ان کے علاوہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کی ایک جماعت دلائل کی بناء پر فاتحہ خلف الامام کی قائل رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل تھے حتیٰ کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی سری نمازوں کے علاوہ جبری کے سکتات میں فاتحہ خلف الامام کو جائز قرار دیا ہے جس کی باحوالہ تفصیل تو ضیح الکلام جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبادہ بن صامتؓ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سرداران انصار میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ غزوہ بدر کے ساتھ دوسرے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو شام کی طرف قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ پہلے حمص میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں فلسطین کی طرف منتقل ہو گئے اور ”رحلہ“ میں وفات پائی اور بقول بعض ۳۴ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں بیت المقدس میں فوت ہوئے۔

(۲۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ مَاتَ وَكَانَتْ أَرْضُهُ حَقًّا لِرَجُلٍ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَتَمَّتْ لَهُ حَقُّهُ، فَلَمْ يَكُنْ يَدْرِي بِهَا شَيْئًا، فَإِذَا هُوَ فِي الْآخِرَةِ، قِيلَ لَهُ: إِنَّكَ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّكَ كُنْتَ تَحْتِلُّ بِأَرْضِهِ، فَأَنْتَ لَا تَدْرِي بِهَا شَيْئًا، فَيُقَالُ لَهُ: إِنَّكَ كُنْتَ تَحْتِلُّ بِأَرْضِهِ، فَأَنْتَ لَا تَدْرِي بِهَا شَيْئًا، فَيُقَالُ لَهُ: إِنَّكَ كُنْتَ تَحْتِلُّ بِأَرْضِهِ، فَأَنْتَ لَا تَدْرِي بِهَا شَيْئًا»

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ اور عمر رضی اللہ عنہما سب نماز کا آغاز الحمد لله رب
وَعُمَرَ كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ الْعَالَمِينَ سے کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)
بِ«الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ قراءت کے
زَادَ مُسْلِمٌ: لَا يَذْكُرُونَ «بِسْمِ اللَّهِ شروع اور آخر دونوں موقعوں پر بسم اللہ
الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ» فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔
وَلَا فِي آخِرِهَا. مسند احمد، نسائی اور ابن خزیمہ کی ایک روایت میں

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيَّ وَابْنِ خُزَيْمَةَ: لَا يَجْهَرُونَ بِبِسْمِ اللَّهِ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو جہری طور
(اوپنی آواز) پر نہیں پڑھتے تھے۔
الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ. نیز ابن خزیمہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ

وَفِي أُخْرَى لِابْنِ خُزَيْمَةَ: «كَانُوا بِسْمِ اللَّهِ» آہستہ پڑھتے تھے اور اسی پر مسلم کی نفی کو
يُسِرُّونَ. وَعَلَى هَذَا يُحْمَلُ النَّفْيُ محمول کیا جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے
فِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ، خِلَافًا لِمَنْ اُسے معلول کہا ہے۔
أَعْلَاهَا.

لغوی تشریح: ﴿لَا يَذْكُرُونَ بِسْمِ اللَّهِ﴾ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ فقرہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ
آپ کے صحابہ کرامؓ مطلقاً بسم اللہ الخ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ الخ
کو جہری (با آواز بلند) نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿يُسِرُّونَ﴾ اسرار سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرامؓ بسم اللہ بغیر آواز
نکالے آہستہ آہستہ پڑھتے تھے ﴿وَعَلَى هَذَا﴾ بسم اللہ کو بے آواز یعنی سرا پڑھنے کی بنیاد پر۔ ﴿يُحْمَلُ
مِغْنَةً مَجْمُولَ﴾ محمول کیا جائے گا ﴿النَّفْيِ﴾ بسم اللہ کی نفی کو ﴿فِي رِوَايَةِ مُسْلِمٍ﴾ مسلم کی وہ روایت
جو ابھی الفاظ میں بیان کی گئی ہے ﴿خِلَافًا لِمَنْ أَعْلَاهَا﴾ یہ توجیہ اس شخص کے خلاف ہے جو یہ کہتا
ہے کہ مسلم میں بسم اللہ کی نفی کا جو اضافہ ہے یہ معلول ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ نفی کو حقیقی پر محمول کیا
جائے گا لیکن اس کے معلول ہونے کی صورت میں اس سے دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔ علت دراصل یہ
ہے کہ اوزاعی نے یہ اضافہ قنادہ کے واسطے سے مکاتبتاً نقل کیا ہے حالانکہ یہ علت درست نہیں کیونکہ
اوزاعی اس کے روایت کرنے میں تہا نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اس کو روایت کرنے والے ہیں
جن کی روایت صحیح ہے۔ لہذا نفی کی وہ تاویل صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ (تخفہ الاحوذ ج ۱ ص:

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سورہ فاتحہ سے قرأت کا آغاز کرتے اور بسم
اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ بعض روایات میں بسم اللہ اوپنی آواز سے پڑھنے کا بھی ثبوت ہے اس لئے بسم اللہ

کو آہستہ اور اونچی آواز سے پڑھنا یعنی دونوں طرح جائز ہے تاہم اکثر اور صحیح تر روایات سے آہستہ پڑھنا ہی ثابت ہے۔ یہ موقف شارح بلوغ المرام نیز قاضی شوکانی وغیرہ اور علامہ مبارکپوری کے موقف کے خلاف ہے اور دلائل سے درست بھی نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے برعکس لکھا گیا ہے۔

(۲۲۰) وَعَنْ نُعَيْمِ الْمُجَمِّرِ قَالَ: حضرت نعیم الجمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، ثُمَّ قَرَأَ بِأَمْرِ الْقُرْآنِ، حَتَّى انہوں نے پہلے بسم اللہ تلاوت فرمائی پھر بعد ازاں ام الرَّحِيمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأَمْرِ الْقُرْآنِ، حَتَّى الْقُرْآنِ (سورہ فاتحہ) پڑھی تا آنکہ آپ ولا الضالین إِذَا بَلَغَ «وَلَا الضَّالِّينَ» قَالَ: آمِينَ۔ پر پہنچ گئے اور آمین کہی۔ راوی کا بیان ہے کہ جب وَيَقُولُ كُلَّمَا سَجَدَ، وَإِذَا قَامَ مِنْ سجدہ کیا اور جب بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوئے تو اللہ الْجُلُوسِ: اللَّهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ يَقُولُ إِذَا اُكْبَرُ كَتَمْتِ۔ پھر سلام پھیر کر فرمایا مجھے قسم ہے اس سَلَمٍ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنِّي ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! لَا شُبُهَتُمْ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ۔ یقیناً میں تم سے نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کی رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ حُرَيْمَةَ۔ کے بہت مشابہ ہوں۔ (میری نماز رسول اللہ ﷺ کی

نماز کے بہت مشابہ ہے) (نسائی، ابن خزيمة)

حاصل کلام: یہ حدیث بسم اللہ الخ اور آمین بالمر کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ جو آدمی امام سے متصل صف سے پچھلی صف میں ہوگا اسے امام کی قرأت اور دعا اسی صورت میں سنائی دے گی کہ وہ بلند آواز سے پڑھے (ورنہ اسے سنائی نہیں دے گی) پھر بسم اللہ اور آمین کے بلند آواز سے کہنے میں اختلاف رائے ہے باعتبار دلیل قابل ترجیح بات یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو آہستہ اور آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ اکثر اوقات جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھی گئی ہے اور کبھی جہری طور پر بھی۔

سورہ فاتحہ کے اختتام و اتمام پر آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے خواہ امام ہو یا مقتدی یا تھا۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک آمین کہنا واجب ہے اور اسے چھوڑنے والا گنہگار ہے۔ آمین کے معنی ہیں ”اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔“

راوی حدیث: ﴿نُعَيْمِ الْمُجَمِّرِ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ نعیم، نعیم کی تصغیر ہے۔ بچہ میں میم پر ضمہ، جیم ساکن اور دوسرے میم کے نیچے کسرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر جمعہ کو دوپہر کے بعد مسجد نبویؐ میں خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام بچہ مشہور ہو گیا۔ مشہور تابعی تھے۔ ابو حاتم، ابن معین، ابن سعد اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(۲۲۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "جب تم سورۃ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ: «إِذَا قَرَأْتُمُ الْفَاتِحَةَ فَاقْرَأُوا اللَّهَ الرَّحْمَنَ الرَّحِيمَ سَافِئًا» اس لئے بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، فَإِنَّهَا کہ وہ بھی سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہی ہے۔" إِيْحَدَى آيَاتِهَا». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَوَّبَ (دارقطنی نے اس کا موقوف ہونا درست قرار دیا ہے) وَفَقَّه.

لغوی تشریح: ﴿صوب﴾ تصویب سے ماخوذ ہے۔ حقیقت کو پہنچنے والی بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ جب بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے تو یہ جبراً پڑھنے کی دلیل ہوئی جب فاتحہ جبراً پڑھی جائے تو یہ بھی جبراً پڑھی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے مگر یہ حدیث موقوف ہے جبکہ مسلم میں صحیح حدیث اس کے معارض ہے۔ جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سورۃ کو تقسیم کیا تو پہلا جزء الحمد للہ کو قرار دیا۔ بسم اللہ کو اس میں شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

(۲۲۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَرَعَ مِنْ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ، فَارُغَ هَوْتِ تَوَآمِينَ بَلَدِ آوَاذِ سَ كَتَـ. (اسے وَحْسَنَهُ، وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. وَابِي دَاوُدَ دَارَقُطْنِي نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم وَالتِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ وَابِلِدِ بْنِ حُجْرٍ نَعُوهُ. نے اسے صحیح قرار دیا ہے نیز ابوداؤد اور ترمذی میں وائل بن حجر بنیہ کی روایت بھی اسی طرح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ سورۃ فاتحہ کی قرأت کے اختتام پر آپؐ بآواز بلند آمین کہتے تھے۔ مگر آمین بالہر اور بالسر ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ بلند آواز یا آہستہ کہنے میں ہے۔ احناف آمین آہستہ کہنے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے تین ائمہ، محدثین اور اہلحدیث بلند آواز سے آمین کہنے کے قائل ہیں۔

بہت سی صحیح احادیث سے آمین بالہر کی تائید و توثیق ہوتی ہے چنانچہ ترمذی، ابوداؤد اور داری میں وائل بن حجر بنیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو دراز کیا اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے آمین بلند آواز سے کہی۔ اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر بنیہ نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح ابن حبان، دارقطنی، حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن کی قراۃ سے فارغ ہوتے تو اونچی آواز سے آمین کہتے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح، امام بیہقی نے حسن صحیح کہا ہے اور امام دارقطنی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اور امام ابن حبان اور ابن

خزیمہ نے اپنی کتاب ”الصحيح“ میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث بھی گزر چکی ہے۔
صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ وہ جب امام کے پیچھے نماز پڑھتے لوگ بھی آمین کہتے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی آمین کہتے اور اسے سنت سمجھتے تھے۔ ان کے شاگرد نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آمین نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ہمیں آمین کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور استاد ہیں، کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے آمین کہتے اور وہ لوگ بھی بلند آواز سے آمین کہتے جو انکے پیچھے تھے یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھتی۔ امام بخاری نے اسے مطلقاً روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور مسند الشافعی وغیرہ میں یہ صحیح سند سے مروی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہود مسلمانوں سے تین باتوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں سلام کے جواب پر صفوں کی درستگی اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر۔“ امام طبرانی نے الاوسط میں اسے بیان کیا ہے اور علامہ بیہقی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہود تمہارے ساتھ کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا سلام اور آمین پر حسد کرتے ہیں۔“ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر احادیث کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نماز میں جب امام سورۃ فاتحہ ختم کرے تو امام و مقتدی کو بلند آواز سے آمین کہنی چاہئے اور علمائے احناف کے مقتدر علماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

امام ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں متوسط درجہ کی آواز سے آمین کہنے کو پسند فرمایا ہے۔ مدارج النبوة اور اشعة اللمعات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہتے اور مقتدی بھی آپ کی موافقت کرتے اور جہراً آمین کہنے کی احادیث زیادہ اور بہت صحیح آئی ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تنویر العینین میں کہا ہے کہ جہراً آمین کہنے کی احادیث اکثر اور واضح ہیں اور التعلیق المجدد میں مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ آمین زور سے کہنا دلیل کی روشنی میں قوی ہے اور یہی بات انہوں نے ”سعیہ“ میں فرمائی ہے بلکہ وہاں تو صاف طور پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ”آہستہ آمین کہنے والی روایات ضعیف ہیں جو جہراً آمین کہنے والی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“ اس اظہار حقیقت کے بعد ہم مزید کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(۲۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي
أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَيْک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور
جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھ

لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ سَكَتًا. لَهَذَا مَجْهَ كَوْنِي أَيْسَىٰ حِزْزِ سَكَا دِيسِ جُو (میری نماز شیناً، فَعَلَمَنِي مَا يُجْزِئُنِي مِنْهُ، كَلْتِ) اس کی جگہ کافی ہو جائے۔ فرمایا ” فَقَالَ: «قُلْ: سُبْحَانَ اللَّهِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ» الْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور دارقطنی وَالتَّسَائِي، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے وَالْحَافِظُ.

لغوی تشریح: ﴿فَعَلَمَنِي﴾ تعلیم سے امر کا صیغہ ہے ﴿مَا يَجْزِينِي﴾ زاء کے بعد ممرزہ ہے، معنی ہیں جو میرے لئے کافی ہو جائے ﴿مِنْهُ﴾ قرآن کے بدلہ میں ﴿الْحَوْلُ﴾ قدرت اور حیلہ۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو مجبوری کی صورت میں یہ کلمات پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ اس روایت سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ سورہ فاتحہ نماز میں فرض نہیں ہے تو یہ سینہ زوری ہے ورنہ کمال مجبوری کی حالت اور کمال غیر مجبوری۔ یہ آدمی تو معذور تھا اس لئے معذوری کے دور ہونے تک اسے متبادل راستہ بتلایا گیا ہے۔ معذور کیلئے شریعت مطہرہ نے ہر صورت رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ عارضی رعایت سے احکام میں تغیر و تبدل نہیں ہو جاتا۔ ایک معذور آدمی اگر یہ کہے کہ میں وضو نہیں کر سکتا اور کہا جائے کہ بھی پھر تم تیمم کر لو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اب وضو فرض ہی نہیں رہا ایسا کوئی بھی نہیں جو اس کا قائل ہو کہ عدم استطاعت وضو کی صورت میں تیمم کا مشورہ وضو کی فرضیت ساقط کر دے گا۔ اس لئے مجبوری کی صورت میں اگر ان کلمات کے پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے فاتحہ کی فرضیت کیسے ساقط ہو گئی؟

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن ابی اوفیؓ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو معاویہ ہے۔ ان کے والد کا نام علقمہ بن حارث اسلمی ہے۔ خود بھی شرف صحابیت سے سرفراز اور باپ بھی (باپ بیٹا دونوں صحابی) صلح حدیبیہ اور خیبر میں شریک ہوئے اور بعد والے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کوفہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ ۸۷ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں وفات پانے والے صحابہ کرام میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں۔ ان کی بیعتی جاتی رہی تھی۔

(۲۲۴) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي بِنَا فَيَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ اور کبھی ہمیں نماز پڑھاتے تھے تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے پہلی اور کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے۔ پہلی

نغوی تشریح: ﴿بفاحه الكتاب﴾ یعنی فاتحہ الکتاب (سورۃ فاتحہ) ہر رکعت میں پڑھتے تھے ﴿وسورتین﴾ ہر ایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھتے۔ ﴿یسمعنا﴾ اسماع سے ماخوذ ہے، ہمیں سناتے تھے ﴿احیاناً﴾ حین کی جمع ہے، با اوقت، بعض اوقات ﴿یطول﴾ تطویل یعنی باب تفعیل z سے۔ طول دینا، لمبا کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت بالافتاق سری (خاموشی سے) ہے۔ جبری نہیں۔ تو پھر بعض اوقات کوئی آیت سننے کی کیا حکمت اور وجہ ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نمازیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ اس وقت قرآن مجید ہی کا کوئی حصہ تلاوت فرما رہے ہیں دوسرا کوئی ذکر یا دعا نہیں پڑھ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا بھی نمازیوں کو علم ہو جائے کہ اس نماز میں فلاں سورت پڑھی جا رہی ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی رکعت میں قرأت ذرا نسبتاً لمبی اور دوسری میں چھوٹی ہونی چاہئے۔ ائمہ ثلاثہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے ساتھ امام محمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قرأت مساوی ہونی چاہئے۔ ظہر، عصر اور فجر میں تو پہلی رکعت کا لمبا ہونا نص سے ثابت ہے باقی دو کو انہی پر قیاس کر لیا ہے۔ ایسا آپ کیوں کرتے تھے؟ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو جائیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف الحمد کے سوا اور کچھ نہ پڑھے۔ لیکن بعض احادیث سے پچھلی رکعتوں میں قرأت کرنا بھی ثابت ہے۔ اس لئے آخری دو رکعتوں میں فاتحہ سے زائد نہ بھی قراءت پڑھی جائے تب بھی درست ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں کسی آیت کا بلند آواز سے پڑھنے سے سجدہ سولازم نہیں آتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا فعل آپ سے ایک مرتبہ ہی عمل میں نہیں آیا بلکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے۔

(۲۲۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ، فَحَزَرْنَا قِيَامَهُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ قَدَرِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا اندازہ لگایا کرتے تھے (کہ آپ دونوں رکعتوں میں کتنا قیام فرماتے تھے) ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں میں اتنا قیام فرماتے جتنی دیر میں سورہ

نفعی تشریح: ﴿نحز﴾ باب نصرینصر تحمید لگاتے۔ قیاس کرتے۔ اندازہ لگاتے۔ ﴿قدر الم تنزیل السجدة﴾ یعنی فاتحہ کے بعد اس سورۃ کی مقدار کے برابر قرأت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظہر کی پہلی اور دوسری رکعت میں قرأت برابر ہوتی تھی۔ یہ بات پہلی مذکور حدیث کے خلاف ہے۔ اسے اوقات کے مختلف ہونے پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی برابر پڑھتے اور کبھی پہلی رکعت بڑی اور دوسری چھوٹی ہوتی تھی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ پہلی رکعت میں چونکہ دعائے افتتاح اور تعوذ زائد پڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں احادیث میں تطابق پیدا ہو جائے گا اور اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ ﴿وفی الاخرین قدر النصف﴾ یعنی نصف مقدار ﴿من ذلک﴾ یعنی پہلی دو رکعتوں کی طوالت سے کم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر و عصر کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی مقدار قرأت کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھلی دو رکعتوں میں بھی سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری آیت پڑھنا مسنون ہے۔ جس طرح کبھی نہ پڑھنا بھی مسنون ہے، لہذا نمازی اگر آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ دوسری آیات بھی پڑھ لے تو اس کی اجازت ہے اور نہ پڑھے تب بھی گنہگار ہے۔

(۲۲۶) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: كَانَ فُلَانٌ يُطِيلُ الْأَوَّلَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفْضَلِ، وَفِي الْعِشَاءِ بَوَسْطِهِ، وَفِي الصُّبْحِ بِطَوَالِهِ، فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشَبَّ صَلَاةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ هَذَا. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

نغوی تشریح: ﴿کان فلان﴾ سے مراد امیر مدینہ عمرو بن سلمہ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے عمر

بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تو ولادت ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی ہے ﴿بخفف العصر﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخفیف ظہر کے اعتبار سے عصر کی سب رکعتوں میں ہے ﴿بقصار المفصل﴾ قصار میں قاف پر کسرہ قصیرہ کی جمع ہے اور مفصل جس کے درمیان میں فاصلہ زیادہ ہو۔ یاد رہے کہ قرآن کا آخری حصہ جن چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے۔ کیونکہ اس حصہ کی سورت چھوٹی ہے اور ہر سورت کی نوعیت یہ ہے کہ جیسے گفتگو میں فاصلہ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ مفصل کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مشہور تو یہی ہے کہ اس کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے اور یہ بھی رائے ہے کہ دوسری کسی سورت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی انتہا آخر قرآن تک ہے۔ پھر مفصل کی تین اقسام ہیں۔ طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ پس طوال مفصل سورۃ حجرات سے شروع ہو کر سورۃ بروج تک اور اوساط مفصل سورۃ بروج سے شروع ہو کر سورۃ بینہ تک اور سورۃ بینہ سے لے کر قرآن پاک کے اختتام تک قصار مفصل کہلاتی ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۃ حجرات سے لے کر اختتام قرآن مجید تک مفصلات کہلاتی ہیں۔ مفصلات کی تین اقسام ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ صبح کی نماز میں طوال مفصل اور نماز عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔

راوی حدیث: ﴿سليمان بن يسار رضي الله عنه﴾ ان کی کنیت ابو ایوب تھی۔ یسار ”یاء“ پر فتح ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد اور فقیہ تھے۔ بہت بڑے مرتبہ کے عالم تھے۔ بے شمار احادیث ان سے مروی ہیں۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۰۷ھ میں ۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۲۲۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ نَبِيَّ كَرِيمٍ ﷺ کو نماز مغرب میں سورۃ طور پڑھتے رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ شَاهِدًا. (بخاری و مسلم) بِالطُّورِ. مَنَّعَ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿بِالطُّورِ﴾ یعنی سورۃ طور نماز مغرب میں پڑھتے شاہد ہے۔

حاصل کلام: عام معمول تو آنحضور ﷺ کا یہی تھا کہ مغرب میں قصار مفصل پڑھتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے مگر بعض اوقات لمبی سورت بھی پڑھتے تھے۔ جیسا کہ اس حدیث میں سورۃ طور پڑھنا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں المص، صافات، اور حم الدخان کا نماز مغرب میں پڑھنا بھی ثابت ہے اور آپ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سفر کے دوران صبح کی فرض نماز میں صرف معوذتین کی تلاوت کی۔ بہر حال عام معمول وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا البتہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی جائز ہے۔

(۲۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَجْعَلُ رُكْعَتَيْ الْفَجْرِ رُكْعَتَيْنِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ (الم تنزيل) السَّجْدَةِ، «وَهَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِلطَّبْرَانِيِّ (مسلم) اور طبرانی میں ابن مسعود سے مروی روایت میں ہے کہ ایسا آپ ہمیشہ کرتے تھے۔
تَعَالَى عَنْهُ: «يُذِيبُ ذَلِكَ».

لغوی تشریح: ﴿یذیب ذلک﴾ ادامہ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں ان سورتوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔

حاصل کلام: ان سورتوں کا التزام کیوں کرتے تھے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت و حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم، روز قیامت بندوں کا میدان محشر میں جمع ہونا مذکور ہے اور احادیث میں مذکور ہے کہ قیامت بھی جمعہ کے روز قائم ہوگی غالباً اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آنجناب ﷺ جمعہ کے روز ان کا التزام فرماتے تھے۔ اس لئے جمعہ کے روز صبح کی فرض نماز میں ان دونوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ جن سورتوں کو نبی کریم ﷺ نے کسی نماز میں بالالتزام پڑھا ہو ہمارے لئے امتثال امر اور تعمیل عمل کرتے ہوئے ان سورتوں کو انہی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جاسکتی۔ مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انہی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی ہیں اور آج بحمد اللہ علمائے اہلحدیث اس کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۲۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَذِيفَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا مَرَّتْ بِهِ آيَةٌ رَحْمَةٍ إِلَّا وَقَفْتُ عِنْدَهَا يَسْأَلُ، وَلَا آيَةُ عَذَابٍ إِلَّا وَقَفْتُ عِنْدَهَا. أَخْرَجَهُ الْحَمَّسَةُ وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيُّ. (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وقف﴾ رک جاتے قرأت سے وقفہ فرما کر۔ ﴿یسال﴾ اللہ کی رحمت طلب فرماتے۔
حاصل کلام: یہ عمل غالباً آپ کا نماز تہجد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مسند احمد اور ابن ماجہ میں عبد الرحمن بن

ابی لیلیٰ عن ابیہ سے روایت ہے کہ ایسا آپؐ نفل نماز میں کرتے تھے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابو داؤد اور نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تہجد کی نماز میں تھا اور اگر کوئی یہ عمل فرض نماز میں بھی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جبکہ وہ اکیلا فرض نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کسی کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ (سبل السلام)

(۲۳۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَلَا وَإِنِّي نَهَيْتُ أَنْ أَقْرَأَ سُجْدَةً فِي قُرْآنٍ يَزِيدُ فِي عِظَمِ الرَّكْعَةِ أَوْ رَاكِعًا أَوْ سَاجِدًا، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَمَعْظُمُوا فِيهِ الرَّبِّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنْ كَمْ تَهَارَى دُعَا قَبُولِ كَرْلَى جَاءَ.» (مسلم)

نفوی تشریح: ﴿فَقَمِنْ﴾ اس میں ”قا“ جزاء کیلئے ہے۔ قمن میں ”قاف“ پر فتح اور میم کے نیچے کسرہ یعنی اس کی مستحق ہے۔ اس لائق ہے۔

حاصل کلام: نماز کے مختلف ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ہیئت الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے حسب حال اذکار مقرر ہیں اور سنت سے ثابت ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن رکوع و سجود میں ممنوع قرار دی ہے۔ اس کی جگہ آپؐ نے رکوع میں عظمت رب یعنی سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بعض محدثین اور امام احمد رضی اللہ عنہ کے نزدیک رکوع میں تعظیم رب اور سجدہ میں دعا کرنا واجب ہے البتہ جمہور علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ سجدہ قبولیت دعا کا ایک اہم ترین مقام ہے۔ اسی لئے آپؐ نے اس میں دعا کی ترغیب دی ہے۔ خود بھی سجدہ میں مختلف دعائیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دعا آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔

(۲۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَلَّى فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُ! اے ہمارے پروردگار! اپنی حمد و ثنا کے ساتھ۔ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي.» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اے اللہ! مجھے بخش دے۔“ پڑھا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

نفوی تشریح: ﴿وَبِحَمْدِكَ﴾ اس میں ”واو“ عطف کیلئے ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری

حمد و توصیف میں محو ہوتا ہوں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ ”واؤ“ حالیہ ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں اس حال میں کہ میں تیری حمد و ثنائیں محو ہونے والا ہوں۔ رکوع و سجود کیلئے متعدد اذکار اور دعائیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ نمازی ان میں سے جسے چاہے منتخب کر سکتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ رکوع میں (سبحان ربی العظیم) اور سجدہ میں (سبحان ربی الاعلیٰ) کے علاوہ مذکورہ بالا دعا بھی پڑھی جاسکتی ہے بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ (اذا جاء نصر الله والفتح) نازل ہونے کے بعد آپ ہمیشہ رکوع و سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ نمازی ان مسنونہ دعاؤں میں سے وقتاً فوقتاً جسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔

(۲۳۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ يُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرُكِعُ، ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِينَ يَرْفَعُ صُلْبَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، ثُمَّ يَقُولُ وَهُوَ قَائِمٌ: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَهْوِي سَاجِدًا، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَسْجُدُ. ثُمَّ يُكَبِّرُ حِينَ يَرْفَعُ، ثُمَّ يَفْعَلُ ذَلِكَ فِي الصَّلَاةِ كُلِّهَا، وَيُكَبِّرُ حِينَ يَقُومُ مِنَ الشَّيْئِينَ بَعْدَ الْجُلُوسِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب رکوع کیلئے جاتے تو اس وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور پھر جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہو جاتے تو ربنا ولك الحمد کہتے۔ پھر سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہہ کر سجدے کیلئے جھکتے پھر سجدے سے اٹھتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر سجدے میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر ساری نماز میں اسی طرح کرتے جاتے تھے۔ پھر جب دوسری رکعت کی (تکمیل) کے بعد تشہد پڑھ کر اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ربنا لك الحمد﴾ بعض روایات میں ﴿ربنا ولك الحمد﴾ بھی مروی ہے یعنی ”لك“ سے پہلے ”واؤ“ ہے بھی اور نہیں بھی۔ دونوں طرح ثابت ہے۔ ”واؤ“ کو جب ثابت رکھیں گے اس صورت میں تو محذوف پر عطف ہوگا۔ جیسے ہم نے آپ کی اطاعت اور حمد و ستائش کی یا ”واؤ“ کو حالیہ تسلیم کیا جائے گا یا پھر اسے زائدہ قرار دیا جائے۔ ساری صورتیں ممکن ہیں۔ بعض روایات میں اللهم ربنا لك الحمد بھی آیا ہے۔ ﴿یہوی﴾ باب ضرب بضر ب سے ہوی یہوی جھلکا، مائل ہو جانا، گر جانا وغیرہ۔

حاصل کلام : نماز میں جو تکبیریں کہی جاتی ہیں ان میں سے پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ، تکبیر افتتاح یا تکبیر

(۲۳۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلءَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَمِْلءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ - وَكَلَّمْنَا لَكَ عَبْدٌ - اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْظَمْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نغوی تشریح: ﴿ملء السموات﴾ ”ملء“ کے ہمزہ کو منصوب پڑھیں تو یہ مصدر ہوگا اور اگر ملء کے ہمزہ کو مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔ ﴿من شئی﴾ ”ما شئت“ کا بیان ہے۔ یعنی جو کچھ بھی تو چاہے۔ ﴿بعد﴾ مبنی علی الضم اس کے بعد مضاف الیہ محذوف ہوتا ہے، مگر نیت میں موجود ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین بھر کی حمد و ثناء کے بعد۔ ﴿اہل الشاء والمجد﴾ اگر اہل کے لام پر ضمہ پڑھیں تو اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر بنے گا۔

یعنی اسے بزرگی اور تعریف کے مالک! اور حرف نداء کے محذوف ماننے کی صورت میں اسے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور ”ثناء“ کے معنی زبان سے کسی کی تعریف کرنا ﴿والمجد﴾ عظمت و بزرگی۔ ﴿احق ما قال العبد﴾ احق کے قاف پر رفع اور ماموصولہ کی طرف مضاف ہے اور مبتداء محذوف کی خبر واقع ہو رہا ہے اور وہ ہے رینا لکھ الحمد کا قول۔ بندے کے اقوال کا وہ زیادہ استحقاق رکھتا ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ ﴿اللهم لا مانع﴾ خبر کا مبتداء ہو اور اس کا یہ قول کہ ”ہم سب تیرے بندے ہیں“ مبتداء اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ آیا ہو۔ لیکن پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ذالجد﴾ صاحب بزرگی۔ اس صورت میں کہ جد کی جیم پر فتح پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا۔ نصیب۔ وافر حصہ۔ استغنی۔ عظمت و غلبہ۔ ﴿منکھ﴾ تیرے مواخذہ اور گرفت سے یا یہ معنی کہ تیرے ہاں جو پکڑ اور مواخذہ ہے ﴿الجد﴾ دال پر رفع ہونے کی صورت میں فاعل ہے قول ﴿لا ینفع﴾ کا۔ یعنی کسی مالدار آدمی کو اس کی بزرگی اور تو نگری کوئی فائدہ نہیں دے گی اور اسے تیری پکڑ اور گرفت مواخذہ سے بچا نہیں سکتی۔ بس عمل صالح ہی وہاں نفع دے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل و حجت ہے کہ قومہ کی حالت میں یہ دعا پڑھنا مسنون و مشروع ہے۔ جن حضرات نے اس دعا کو نفل نماز کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اپنے ذہن کی بات ہے۔ مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس خیال کی تردید کیلئے کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں اس کا پڑھنا ثابت ہے۔ نیز اس دعا کے اس جملہ ”ولا ینفع ذالجد منکھ الجد“ سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے مالک و خالق کے پاس محض دنیوی جاہ و جلال اور عظمت و بزرگی کچھ بھی کام نہ دے گی اور نہ کسی حسب و نسب کا امتیاز کچھ فائدہ مند ثابت ہوگا وہاں تو عمل صالح کی قدر و قیمت ہوگی اور بس۔ کسی کا عالی نسب ہونا، بزرگوں کی اولاد ہونا، کسی معروف و مشہور خاندان سے متعلق ہونا عذاب الہی سے نہیں چھڑا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نوح علیہ السلام کا بیٹا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے حقیقی چچا ابوطالب عتاب الہی اور عذاب الہی کا شکار نہ ہوتے۔ آنحضور ﷺ نے تو اپنے خاندان والوں کو بلا کر صاف طور پر کہہ دیا کہ عمل صالح کرو ورنہ اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل اور اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف فرما دیا تھا کہ ”بیٹی! میں تجھے عذاب الہی سے ہرگز نہیں بچا سکتا، گھمنڈ اور خوش فہمی میں نہ رہ جانا کہ میں نبی آخر الزماں ﷺ کی لخت جگر ہوں۔ محض میری بیٹی ہونا تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت اور پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ عمل صالح کیا کرو جو تجھے عذاب الہی سے بچا سکے“ اولوالعزم پیغمبروں اور خاص کر رسول آخر الزماں ﷺ جب اپنی اولاد سے یہ فرما دیں تو اور کون ہے جو غرور نسب میں مبتلا ہو کر بھی کامیاب و کامران ہو جائے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قومہ میں صرف سیدھا کھڑا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسنون دعاؤں میں سے کوئی دعا مثلاً یہ ہی دعا پڑھنی چاہئے۔

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں مل کر ایک عضو ہے اگر ان کو الگ الگ عضو شمار کیا جائے تو یہ آٹھ اعضاء بن جاتے ہیں اس لئے ان دونوں کو ایک عضو ہی شمار کیا جانا چاہئے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ تینوں امام اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردان رشید امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ بھی اس کے قائل ہیں کہ صرف پیشانی یا صرف ناک زمین پر رکھ کر سجدہ کرے تو یہ سجدہ ناقص تصور ہوگا اور اسے سجدہ ہی شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عضو ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اگر زمین پر رکھا گیا تو سجدہ ہو جائے گا اور کسی قسم کا کوئی نقص نہیں رہے گا۔ لیکن ایک تو یہ اکثریت کے خلاف ہے کیونکہ تین امام اور دو مزید حنفی امام ایک طرف اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تنہا ایک طرف۔ پھر یہ مذکورہ بالا حدیث کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کمزور ہے۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے نمازی پر ہوا جس کی ناک زمین پر لگ نہیں رہی تھی۔ آپؐ نے فرمایا ”جس کسی کی پیشانی اور ناک زمین پر نہ لگے اس کی تو نماز ہی نہیں ہوتی۔“ یعنی ناک اور پیشانی دونوں کا حالت سجدہ میں زمین پر لگنا ضروری ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ سجدہ ساتوں اعضاء پر کیا جانا چاہئے ورنہ سجدہ صحیح نہیں۔

(۲۳۵) وَعَنْ ابْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلَّى وَسَجَدَ، فَرَجَّ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتَّى يَبْدُو بَيَاضُ إِبْطَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن بحیینہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے اور سجدہ کرتے تو اس حالت میں اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی بھلوں کی سفیدی

نظر آنے لگتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فَجَّ﴾ تفرق (باب تفعیل) سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی دوری اور دونوں پہلوؤں کے درمیان کشادگی اور فراخی پیدا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی رانوں کو اپنے بازوؤں سے اتنا الگ رکھے کہ بغلوں کا اندرون بھی نمایاں ہو جائے۔ اس حدیث کی بناء پر امام طبری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بغلیں جسم اطہر کے دوسرے اعضاء کی طرح سفید تھیں۔ سیاہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی دیگر خصوصیات و امتیازات کی طرح ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کی تصریح طبری نے کتاب الاحکام کے باب الاستقاء میں کی ہے کہ آپ کی بغلیں دوسروں کی طرح سیاہ نہ تھیں بلکہ سفید تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ابن بحینہ رحمہ اللہ﴾ ان کا پورا نام یہ تھا عبد اللہ بن مالک بن القشب (قاف پر کسرہ "شین" ساکن) الازدی یزور بحینہ تصغیر، ان کی والدہ کا نام ہے۔ والدہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ورنہ والد کا نام مالک ہے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ بڑے زاہد، شب زندہ دار، صائم التمار تھے۔ دنیا سے بڑے بے رغبت تھے۔ مدینہ سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع جگہ وادی ریم میں ۵۴ھ اور ۵۸ھ کے درمیان وفات پائی۔

(۲۳۶) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ حَضْرَتُ بَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷻ لِي: «إِذَا سَجَدْتَ فَصَّغْ أُنْفِئْ رَأْسَكَ وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اٹھالے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فَصَّغْ﴾ اس میں "فاء" جزاء کیلئے ہے اور ﴿ضَعْ﴾ وضع سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی اس کے یہ ہوئے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر نکادو۔ رکھ دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سجدہ کرتے وقت ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے اور کہنیوں کو اوپر اٹھانے کا حکم ہے۔ البتہ ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک روز صحابہ کرام نے سجدہ کو لمبے کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکوہ کیا تو آپ نے انہیں کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر ذرا آرام لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ مگر یہ روایت سنداً صحیح نہیں۔ بصورت دیگر یہ عذر پر تو محمول ہے۔ اکثر و بیشتر روایات میں یہی مذکور ہے کہ سجدہ میں آپ کی کہنیاں نہ زمین پر لگتیں اور نہ ہی رانوں وغیرہ سے جس کی وجہ سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ آپ کا یہ عمل امت کے ہر فرد کیلئے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ آپ کا حکم بھی یہ ہے (صلوا کما رایتُمونی اصلی) کہ "تم اسی طرح نماز پڑھو جیسا تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" کسی بھی صحیح و مرفوع روایت میں عورت کیلئے اس کے برعکس حکم ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿براء بن عازب رحمہ اللہ﴾ ابو عمارہ ان کی کنیت ہے۔ براء "باء" پر فتح ہے۔ باپ کا نام

(۲۳۷) وَعَنْ وَاثِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَكَعَ فَرَجَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَإِذَا سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ. رَوَاهُ الْحَاكِمُ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب رکوع میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں کھلی رکھتے اور جب سجدہ میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں باہم ملا لیا کرتے تھے۔ (متدرک حاکم)

(۲۳۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي مُتَرْبِعًا. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو چار زانوؤں پر بیٹھ کر نماز ادا فرماتے دیکھا ہے۔ (نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿مترعبا﴾ تربع سے ماخوذ ہے۔ تربع یہ ہے کہ دائیں پاؤں کے نچلے حصہ کو اپنی بائیں ران کے نیچے کر لینا اور بائیں قدم کا باطنی حصہ دائیں ران کے نیچے پورے اطمینان اور سکون کی حالت کے ساتھ اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھے کہ انگلیاں کھلی ہوئی ہوں جس طرح حالت رکوع میں کھلی ہوتی ہیں۔ اس طرح بیٹھنا مرض کی وجہ سے ہے اور یہ حدیث نبی ﷺ کی اس نماز کی کیفیت بیان کرتی ہے جب آپؐ گھوڑے سے نیچے گر گئے تھے اور پاؤں پر چوٹ آگئی تھی (پاؤں کا جوڑ کھل گیا تھا) (سبل السلام)

حاصل کلام: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب آدمی کسی وجہ سے معمول کے مطابق نماز ادا کرنے سے معذور ہو جائے اور قیام پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے چار زانوں بیٹھ کر نماز ادا کرنی جائز ہے۔

(۲۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے

يَقُولُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ، وَارْحَمْنِيْ، وَاهْدِنِيْ، وَعَافِنِيْ، وَارْزُقْنِيْ. رَوَاهُ الْاَزْبَعَةُ اِلَّا النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظُ لِابْنِ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اللهم اغفر لي... الخ يا الله! میری پردہ پوشی فرما دے (یا مجھے بخش دے) مجھ پر رحم فرما۔ مجھے راہ ہدایت پر چلا (اور گامزن رکھ) مجھ سے درگزر فرما (معاف کر دے) مجھے رزق (حلال) عطا فرما۔ (اسے

نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابو داؤد

کے ہیں۔ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

عافیت سے نواز۔

حاصل کلام: نماز میں مختلف مواقع پر نبی ﷺ سے مختلف دعائیں منقول ہیں۔ اسی طرح دو سجدوں کے مابین جلسہ کے موقع پر مذکورہ بالا دعا آپؐ نے پڑھی ہے۔ لہذا سب نمازیوں کو یہ دعا مسنون پڑھنی چاہئے۔ بعض روایات میں ”وارفعنی“ اور بعض میں ”واجبرنی“ کا اضافہ منقول ہے اور بعض میں مختصراً ”رب اغفر لی“ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس لئے حسب حال جو دعا پڑھ لی جائے درست ہے۔

(۲۴۰) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ حَضْرَتِ مَالِكِ بْنِ حُوَيْرِثٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، فَإِذَا كَانَ فِي وَتَرِ مِنْ صَلَاتِهِ لَمْ يَنْهَضْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَاعِدًا. رواه البخاري.

لغوی تشریح: ﴿فی وتر من صلاته﴾ یعنی جب آپؐ پہلی یا تیسری رکعت مکمل فرما لیتے اور دوسری یا چوتھی کیلئے کھڑا ہونا چاہتے (تو اس وقت ایسا کرتے) ﴿لم ینھض﴾ نہ کھڑے ہوتے۔ ﴿حتی یستوی قاعدا﴾ پہلے سیدھے مکمل طور پر بیٹھتے، اس کو جملہ استراحت کہتے ہیں اور یہ مسنون و مشروع ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے جملہ استراحت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں مگر امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں اور وہ اسے بڑھاپے پر محمول کرتے ہیں۔ مگر یہ تاویل درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مالک رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء سے فرمایا تھا "صلوا کما رایتُمونی اصلی" کہ "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" اور وہی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ جملہ استراحت کرتے تھے۔ خود راوی حدیث نے جب اسے بڑھاپے پر محمول نہیں کیا تو پھر یہ محمول محض دفع الوقتی ہے۔

(۲۴۱) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

وَجْهِ آخَرَ، وَزَادَ: فَأَمَّا فِي الصُّبْحِ
فَلَمْ يَزَلْ يَفْنُ حَتَّى فَارَقَ الدُّنْيَا.

نفعی تشریح: ﴿قَسَتْ﴾ قوت سے ماخوذ ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں۔ یہاں مراد ہے قیام کی حالت میں دوران نماز دعا کرنا۔ یہ دعا قبل از رکوع ہے یا بعد از رکوع۔ ﴿عَلٰی اَحْبَاءٍ﴾ علی اس جگہ نقصان، ضرر کیلئے استعمال ہوا ہے یا یوں بھی کہا گیا ہے بددعا کی۔ یعنی جب کسی کے نقصان اور ضرر کیلئے دعا کی جائے تو اس موقع پر دعا علیہ بولا جاتا ہے یعنی فلاں نے فلاں کیلئے نقصان و ضرر کی دعا کی اور احیاء جمع ہے ”حی“ کی۔ جس کے معنی قبیلہ کے ہیں اور یہ قبائل (عہد شکن) رعل، ذکوان، عصیہ اور بنو لیمان تھے۔ ان کیلئے رسول اللہ ﷺ نے بددعا فرمائی۔ اس لئے کہ آپؐ نے ان کی درخواست پر پروردگار کے احکامات پہنچانے اور تبلیغ اسلام کیلئے ان قبائل کی طرف اپنے ستر قاری اصحاب کرامؓ کو بھیجا تھا، جب یہ قافلہ مبلغین، بزر معونہ پر پہنچا (اور یہ کنواں یا چشمہ بنی عامر اور حرہ بنی سلیم کے علاقہ میں واقع تھا بلکہ یہ حرہ بنی سلیم سے زیادہ قریب تھا) تو بنو سلیم کے قبائل میں سے عامر بن طفیل ان کی طرف نکلا اور یہ قبائل رعل، ذکوان و عصیہ تھے۔ جہاں یہ قراء حضرات ٹھہرے ہوئے تھے وہیں ان قبائل کے لوگوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ ان قاریوں نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور مد مقابل دشمنوں سے خوب لڑے کہ سب کے سب جام شہادت نوش کر گئے۔ صرف کعب بن زید رضی اللہ عنہ زندہ بچے۔ کفار نے انہیں اس حالت میں چھوڑا تھا کہ زندگی کی رمت ابھی ان کے اندر باقی تھی مگر انہوں نے اپنے گمان کے مطابق انہیں مار دیا تھا۔ مقتولین میں سے صرف یہی بچے۔ بالآخر غزوہ خندق میں جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ المناک اور دردناک واقعہ ۳۴ ماہ صفر میں پیش آیا۔ یعنی غزوہ احد کے چار ماہ بعد۔ بنو لیمان کے حق میں بددعا کی وجہ یہ تھی کہ عضل و قارہ کے قبائل نے نبی کریم ﷺ سے ایسے (عالم) آدمیوں کا مطالبہ کیا تھا جو انہیں اسلام کی دعوت دے سکیں اور انہیں احکام شریعت کی تعلیم دے سکیں۔ چنانچہ آپؐ نے دس مردان عظیم ان کی جانب بھیجے۔ جب یہ حضرات رجب تک پہنچے (یہ جگہ رابغ اور جدہ کے درمیان واقع ہے) تو ان قبائل کے لوگوں نے ان دس آدمیوں کے ساتھ دھوکہ کیا اور بنو لیمان کو بھی اشارہ کیا (شہہ دی) یہ ہذیل کے قبائل سے ایک قبیلہ تھا۔ یہ سب لوگ ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ان کو گھیرے میں لے لیا۔ چنانچہ دو کے علاوہ باقی کو قید کر لیا یعنی صرف خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور زید بن دشن رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ ان دونوں کا قصہ مشہور و معروف

ہے یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں کے علاوہ باقی تمام کو انہوں نے یہ تیغ کر دیا اور یہ واقعہ بھی مذکورہ بالا ماہ صفر کا ہے۔ نبی ﷺ کو ان دونوں المناک واقعات کی اطلاع ایک ہی شب میں ملی۔ اس سے نبی ﷺ نہایت ہی افسردہ اور غمگین ہوئے کہ پورا ایک مہینہ ان کیلئے بددعا فرماتے رہے اور پھر بددعا کرنا ترک کر دیا۔ اس قسم کی دعاء قنوت کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔ یہ دعاء قنوت بڑے بڑے المناک اور دردناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ورنہ نبی ﷺ دعا قنوت نہیں پڑھتے تھے، الا یہ کہ مسلمانوں میں سے لوگوں کیلئے دعا فرمائیں یا کفار میں سے بد عمد، عمد شکن قسم کے لوگوں کیلئے بددعا فرمائیں۔ رہا نماز فجر میں مسند احمد اور دار قطنی کے حوالہ سے قنوت کے پڑھنے کا التزام و مواظبت کا اضافہ تو یہ قابل استدلال نہیں۔ نیز یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت آگے آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور قنوت نازلہ کسی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسے تمام نمازوں میں پڑھا جاسکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ نماز فجر میں آپ سے دعاء قنوت ثابت ہے۔ مہینہ بھر آپ عمد شکنی اور بد عمدی کی بناء پر مقتول صحابہؓ کی وجہ سے بددعا کرتے رہے۔ ظاہر ہے یہ فرض نماز ہی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد دعا فرماتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین تبلیغ ہے۔ مبلغین کی جماعت تیار رہنی چاہئے، جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جماعتی شکل میں تبلیغ کیلئے جانا چاہئے۔ نظم جماعت کی طرف بھی اس سے اشارہ ملتا ہے اور اطاعت امیر بھی اس سے ظاہر ہے۔ ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ ذاتی علم غیب نہیں رکھتے تھے اگر ان کو علم غیب ہوتا تو اپنے تیار مبلغین کو قتل کیلئے کیوں بھیجتے۔ جان بوجھ کر نعوذ باللہ تو آپ نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی اس وقت تک آپ کو اپنے بھیجے ہوئے مبلغین کی صورت حال کی کچھ خبر نہیں تھی۔ احتاف اسی حدیث کی روشنی میں عند الضرورت قنوت نازلہ کے قائل ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نماز فجر میں ہمیشہ دعاء قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں۔ طریقہ دعا یہ ہے کہ امام رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

(۲۴۲) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَقْنُتُ إِلَّا إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ أَوْ عَلَى قَوْمٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

یعنی قنوت نازلہ نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿الَا اذا دعا لقوم﴾ مگر جب کسی قوم کے نفع کیلئے دعا کرتے۔ مصیبت سے نجات و چھٹکارے کیلئے اور ﴿دعا علی قوم﴾ یا کسی قوم پر بددعا کرتے۔

حاصل کلام: بظاہر ان احادیث میں تعارض محسوس ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں نماز فجر میں قنوت کا ہمیشہ

پڑھنا ثابت ہے اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کے نفع کیلئے دعایا کسی کی ہلاکت کیلئے بددعا کرتے تھے اور تیسری کے جو اس کے بعد آرہی ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر میں قنوت پڑھنا بدعت ہے۔ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ آپؐ اور صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدینؓ نماز فجر میں قنوت پڑھتے رہے ہیں۔ جس حدیث میں بدعت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بالالتزام، مسلسل اور بلائناغہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اس التزام کو مسنون قرار دینا غیر مسنون اور بدعت ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ صبح کی نماز میں ہمیشہ بلائناغہ، بلا ضرورت قنوت نہ پڑھی جائے۔ جس حدیث میں صبح کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھنے کا ذکر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قنوت کبھی منسوخ نہیں ہوئی۔ ضرورت پیش آنے پر آپؐ قنوت پڑھتے رہے اور جس حدیث میں کسی کے حق میں دعا اور کسی کیلئے بددعا کا ذکر ہے یہ تطبیق کی صورت ہی ہے کہ ضرورت لاحق ہونے کی صورت میں دعا و بددعا کرتے تھے۔ احناف اسی کے قائل ہیں۔ نیز احناف و تروں کے علاوہ کسی نماز میں ہمیشہ اور مسلسل قنوت پڑھنے کے حق میں نہیں ہیں اور جب مسلمانوں پر کوئی ناگمانی آفت، مصیبت نازل ہو جائے مثلاً دشمن نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے، کوئی وباء پھوٹ پڑی ہے، قحط سالی کا سال پیش آگیا ہے۔ ایسے حالات میں تو احناف بھی نماز پنج گانہ میں قنوت پڑھنا مسنون سمجھتے ہیں اور شوافع حضرات آدھے آخری رمضان میں قنوت وتر کے قائل ہیں باقی ایام میں وہ قائل نہیں البتہ فجر کی نماز میں بیٹگی اور دوام کے قائل ہیں اور دوسری نمازوں میں جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے یا وباء پھوٹ پڑے تو پڑھنے کے قائل ہیں۔

(۲۴۳) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ طَارِقٍ الْأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي: يَا أَبَتِ! إِنَّكَ قَدْ صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَأَبْنَى بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ، أَفَكَانُوا يَفْتَنُونَ فِيهِ الْفَجْرَ؟ قَالَ: أَيُّ بُنَيِّ مُحَمَّدٍ. رَوَاهُ الْحَنَسِيُّ إِلَّا أَبَا دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿ای ہنسی﴾ ای حرف ندا ہے اور بنی ”با“ پر ضمہ اور ”یا“ پر فتح اور تشدید۔ ”ابن“ کی تفسیر ہے یائے شکلم مضاف ہے۔ معنی اے میرے بیٹے ﴿محدث﴾ احداث سے اسم مفعول ہے یعنی گھڑی ہوئی۔ تصنیف شدہ بات۔ (بدعت) جو دور رسالت میں موجود نہیں تھی۔ پس اس گفتگو کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ قوت نازلہ بسا اوقات پڑھنا ثابت ہے، اس پر دوام اور ہمیشگی ثابت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں یہ استدلال کرنا کہ نماز میں قنوت پڑھنا بدعت ہے درست نہیں۔ اس سلسلہ کی ضروری وضاحت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد التزام اور یقینی ہے۔

مطلقاً قنوت کی نفی مراد نہیں۔

راوی حدیث: ﴿سعد رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام سعد بن طارق بن اشیم (احمد کے وزن پر) بن مسعود اشجعی کوئی ہے۔ ان کی کنیت ابو مالک تھی۔ ثقہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۴۰ھ کے آخر پر فوت ہوئے۔
﴿طارق اشجعی رضی اللہ عنہ﴾ طارق بن اشیم بن مسعود اشجعی کوئی۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان سے صرف چودہ احادیث نقل کی گئی ہیں اور ان کے بیٹے سعد کے علاوہ ان سے کسی نے روایت نہیں کی۔ کوفیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے چند کلمات ایسے سکھائے ہیں جنہیں میں وتروں میں (دعائے قنوت کے طور پر) پڑھتا ہوں۔ اللھم اھدنی فیمن ھدیت الخ ”اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جنہیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے اور مجھے عافیت دے کر ان میں شامل فرما دے جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور جن کو تو نے اپنا دوست قرار دیا ہے ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت ڈال دے اور جس شر و برائی کا تو نے فیصلہ فرما دیا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ اور بچا لے۔ یقیناً فیصلہ تو ہی صادر فرماتا ہے تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا اور جس کا تو والی بناوہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا۔ آقا ہمارے پروردگار تو ہی برکت والا اور بلند و بالا ہے“ (اسے پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔) طبرانی اور بیہقی نے ولا یعز من عادت کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز نسائی نے ایک دوسرے طریق سے اس دعا کے آخر میں وصلی اللہ علی النبی کا اضافہ بھی روایت کیا ہے۔

(۲۴۴) وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي قُنُوتِ الْوُتْرِ: «اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَفِنِي شَرِّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ». رَوَاهُ الْحَمْسَةُ، وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ بَيْهَقٍ: «وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ». زَادَ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ فِي آخِرِهِ: «وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ». وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا دُعَاءَ نَدْعُو بِهِ فِي الْقُنُوتِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ. وَفِي سَنَدِهِ ضَعُفٌ.

اور بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں دعا سکھاتے تھے جسے ہم صبح کی نماز میں دعائوت کی صورت میں مانگتے تھے۔

(اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿تولنی﴾ یعنی میرے کام کو پھیر دے، اس کی اصلاح کر دے۔ ﴿فیمن تولیت﴾ یعنی ان لوگوں کے کاموں کی طرح جن کی تو نے اصلاح کی ہے ﴿وقنی﴾ میری حفاظت فرما ﴿شرما قضیت﴾ یعنی ہر اس شر سے جو اللہ کی تقدیر میں ہے۔ ﴿فانک تقضی﴾ یعنی تو مقدر کرتا ہے اور حکم فرماتا ہے جس کا بھی تو ارادہ کرتا ہے ﴿ولا یقضی علیک﴾ مجھ پر کسی قسم کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ﴿انہ﴾ اس کی شان یہ ہے۔۔ ﴿لا یدل﴾ ”یاء“ پر فتح اور ذال پر کسر۔ یعنی وہ ذلیل نہیں ہوتا، رسوا نہیں ہوتا ﴿من والیت﴾ یہ ”مولاء“ سے ماخوذ ہے۔ ”معاذہ“ کی ضد ہے۔ یعنی جس کا تو والی بن جاتا ہے۔ ﴿ولا یعز﴾ ”یاء“ پر فتح اور عین کے نیچے کسر۔ یعنی وہ صاحب عزت و شرف نہیں ہو سکتا۔ ﴿من عادیت﴾ یعنی جس کا تو دشمن ہو جائے۔ اس دعا کے ساتھ صبح کی نماز میں قنوت کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ﴿یعلمن﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے یعنی وہ ہمیں سکھاتے تھے۔ ”دعاء“ گزشتہ دعا یعنی اللھم اھدنی والی دعا۔ اور یہ بات کہ وہ ہمیں صبح کی نماز میں کرنے کے لئے یہ سکھاتے تھے، ضعیف ہے۔ جس طرح مصنف نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اس میں عبدالرحمن بن ہرمرز راوی ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز وتر میں یہ دعا پڑھنا چاہئے۔ یہ دعا رکوع سے پہلے اور بعد دونوں طرح درست ہے لیکن مستدرک حاکم اور بیہقی میں جو یہ الفاظ ہیں کہ جب رکوع سے اٹھو تو یہ دعا پڑھو۔ یہ الفاظ شاذ اور محل نظر ہیں جیسا کہ مرعاة المفاتیح اور ارواء الغلیل میں ہے۔ اس دعا کے آخر میں جو ”صلی اللہ علی النبی“ کے الفاظ ہیں۔ بعض حضرات نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے مگر علامہ البانی نے کہا ہے کہ یہ زیادت صحیح ہے۔ (ارواء الغلیل ج ۲ ص ۱۷۷) اور یہی بات درست ہے۔ نماز وتر کی حیثیت کیا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور یہی بات رائج ہے۔

رہا تعداد کا معاملہ۔ تو اس کی تعداد ایک سے لے کر گیارہ تک احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ احناف تین کے قائل ہیں البتہ ان کے پڑھنے کی نوعیت مختلف ہے۔ تین وتر ایک ہی تشہد سے یا دو کے بعد تشہد، درود شریف، دعا اور سلام پھر ایک وتر علیحدہ پڑھا جائے۔ اکثر احادیث میں یہی دو سری کیفیت مروی ہے۔ پانچ یا سات وتر میں بھی صرف آخر میں ایک تشہد ہے۔ البتہ نو وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو آٹھ میں تشہد درود شریف و دعا کے بعد بغیر سلام کے نویں رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیا جائے یا یہ کہ دو دو

رکعت پر سلام اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے۔ مگر احناف صرف تین وتر کے قائل ہیں اور اس میں دو تشدد پڑھتے ہیں لیکن یہ صحیح تر روایات کے خلاف ہے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے یا بعد دونوں طرح درست ہے۔ دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھنی چاہئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

راوی حدیث: ﴿حسن بن علی رضی اللہ عنہ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور ان کے دل کا سرور اور دنیا میں ان کے لئے خوشبو تھے۔ جنت کے نوجوانوں کے سرداروں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳ھ کو پیدا ہوئے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا۔ لیکن اپنی خلافت کے سات ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان خون نہ پئے۔ ۴۹ھ کو فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(۲۴۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔“ (نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ)

اور یہ حدیث واکل بن حجر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مروی

وَهُوَ أَقْوَى مِنْ حَدِيثِ وَاثِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ. فَإِنَّ لِلْأَوَّلِ شَاهِدًا مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ. وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ مُتَّفَقًا مُؤَوَّفًا.

اس حدیث سے قوی تر ہے جس میں ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں جاتے دیکھا ہے کہ آپ اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ (اس کو چاروں ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث کا شاہد ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً موقوف بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا سجد احدكم﴾ یعنی جب سجدہ کرنے کیلئے جھکے۔ ﴿فلا يبرك﴾ باب نصر بنصر سے نبی کا صیغہ ہے۔ یعنی نہ بیٹھے۔ ﴿كما يبرك البعير﴾ جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سجدہ کرنے کیلئے جھکتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنے چاہیں بعد میں گھٹنے۔ ﴿وهو﴾ سے مراد یہاں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے۔ ﴿اقوی﴾ سند کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ ﴿من حدیث واثل بن حجر﴾ واکل بن حجر سے مروی حدیث سے جس میں گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھنے کا ذکر ہے۔ ﴿فان للال﴾ سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ بالا حدیث ہے

﴿شاهد﴾ یعنی گواہ اس سے مراد حدیث کو تقویت پہنچانے والا ہے۔ جسے ”دراوردی“ نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کیا ہے مگر ﴿ودکھرہ﴾ یعنی وہ شاہد ذکر کیا ہے۔ ﴿البخاری موقوفاً﴾ یعنی بخاری نے موقوفاً چنانچہ نافع کا قول ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ بخاری نے تو موقوفاً نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرنے میں شریک تھا ہے اور وہ جب تھا کوئی روایت بیان کرے تو اس کی روایت میں محدثین نے کلام کیا ہے اور وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید گو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جو مجہول ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ باعتبار سند حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث رائج ہے اور بحیثیت معنی تو یہ معلوم حقیقت ہے کہ حیوان کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں یعنی اس کے پہلے دونوں پاؤں اور یہ مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ اونٹ جب نیچے بیٹھنے کیلئے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیکتا ہے پھر بیٹھتا ہے۔ جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں یا گھٹنے۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جس میں ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کا ثبوت ہے اور دوسری حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں پہلے گھٹنے رکھنے کا ذکر ہے۔ مصنف یعنی حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو رائج قرار دیا ہے اور اس کی تائید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عموماً محدثین اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں مگر احناف اور شوافع حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں مگر صحیح بات یہی ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے جائیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲۴۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ لِلتَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرَى عَلَى رُكْبَتِهِ الْيُسْرَى، وَكَتَبَتْ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى الْيُمْنَى، وَعَقَدَ ثَلَاثًا وَخَمْسِينَ، وَأَشَارَ بِأُصْبَعِهِ السَّبَابَةِ. (مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کیلئے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے پر رکھتے اور تہن کی گرہ دیتے (یعنی تہن کا عدد وَالْيُمْنَى عَلَى الْيُمْنَى، وَعَقَدَ ثَلَاثًا وَخَمْسِينَ، وَأَشَارَ بِأُصْبَعِهِ السَّبَابَةِ۔)

اور ایک روایت میں ہے جسے مسلم ہی نے روایت کیا ہے کہ اپنی تمام انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے۔

لعنوی تشریح: ﴿عقد ثلاثاً وخمسين﴾ اپنی انگلیوں کو گرہ دے کر تہن کے عدد کی شکل بنا لے۔ اس کی صورت اس طرح ہوتی کہ اپنے انگوٹھے کو سبابہ (انگشت شہادت) کے نیچے کر لیتے۔ ﴿سبابہ﴾

”ہا“ پر تشدید اگٹھ کے متصل انگشت کو کہتے ہیں۔ اس انگشت کا نام سببہ یعنی گالی دینے والی کیوں پڑ گیا؟ اس لئے کہ دور جاہلیت میں گالی گلوچ کے موقع پر اس انگلی سے اشارہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے مذہب زمانے میں بھی آج کل لوگ اس طرح اشارہ کر کے گالی مراد لیتے ہیں۔ روایات سے تشدد کی حالت میں بیٹھے وقت دائیں ہاتھ کو گرہ دینے کی صورت میں تین حالتیں یا صورتیں بنتی ہیں۔ پہلی تو یہی ترتیب کی شکل جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری اس طرح کی انگشت شہادت کو چھوڑ کر باقی ساری انگلیوں کو ہتھیلی کے ساتھ ملا دینا اور یہ وہی بیت ہے جس کا ”وقبض اصابعہ کلہا“ کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے اور تیسری بیت یہ ہے کہ انگشت وسطیٰ اور انگوٹھے کا حلقہ بنایا جائے۔ اسے ابن ماجہ نے وائل بن حجر رحمہ اللہ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ اس موقع پر مناسبت کے لحاظ سے یہ ذہن نشین رہے کہ حساب کا شمار کرنے کیلئے اہل عرب بھی ایک معروف طریقہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جیسے صاحب سبل السلام نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ ایک کے عدد کیلئے خضر (یعنی چھوٹی انگلی) کو ہتھیلی کے باطن (اندرونی طرف) کے قریب گرہ کی شکل میں موڑ دینا اور دو کے عدد کیلئے خضر اور بنصر (چھوٹی کے ساتھ والی) دونوں کو ہتھیلی کے اندرونی طرف موڑ دینا اور تین کیلئے انگشت وسطیٰ (بڑی درمیانی) کو بھی خضر اور بنصر کے ساتھ بند کر دینا اور چار کے عدد کیلئے خضر کو کھول دینا اور پانچ کیلئے بنصر کو خضر کے ساتھ کھول دینا اور وسطیٰ کو بدستور بند رکھنا اور چھ کے عدد کیلئے تنہا بنصر کو بند کر دینا اور باقی انگلیوں کو کھلا رکھنا اور سات کے عدد کیلئے خضر کو ہتھیلی سے ملے ہوئے انگوٹھے کے حصہ کی طرف دراز کر دینا اور آٹھ کے عدد کیلئے بنصر کو ان کے اوپر پھیلا دینا اور نو کے عدد کیلئے ان پر انگشت وسطیٰ کو پھیلا دینا۔ یہ طریقہ تو تھا اکائی کی گنتی کیلئے۔ اب دہائی کو لے لیں۔ دس کے عدد کو نمایاں کرنے کیلئے انگوٹھے کا سر انگشت شہادت کی طرف گرہ کی صورت میں موڑ دیا جائے اور بیس کے عدد کیلئے انگشت شہادت اور وسطیٰ کے درمیان میں انگوٹھے کو داخل کرنا اور تیس کے عدد کیلئے انگشت سببہ کے سر کو انگوٹھے کے سر پر گرہ کی شکل دے دیں۔ یعنی دس کے عدد کے اظہار کیلئے جو صورت بنتی ہے یہ اس کے برعکس ہے اور چالیس کیلئے انگوٹھے کو انگشت سببہ کے درمیان جہاں گرہ پڑتی ہو پر سوار کر دینا اور انگوٹھے کو اس کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور پچاس کیلئے انگوٹھے سببہ کی جڑ کی طرف موڑ دینا۔ یعنی انگوٹھے کے اندرونی حصہ کو اس خط پر رکھنا جو سببہ اور انگوٹھے کے درمیان ہے اور ساٹھ کے عدد کیلئے سببہ کو انگوٹھے کی پشت پر سوار کر دینا یعنی چالیس کی جو صورت بنتی ہے اس کے برعکس اور ستر کے عدد کیلئے انگوٹھے کے سر کو سببہ کی وسطیٰ گرہ (باطنی حصہ) پر ڈال دینا اور سببہ کی ایک طرف کو انگوٹھے کی طرف لوٹا دینا اور اسی کے عدد کیلئے سببہ کی ایک جانب کو اس کی جڑ کی طرف لوٹا دینا اور انگوٹھے کی جانب سے سببہ کے پہلو پر انگوٹھے کو پھیلا دینا اور نوے کے عدد کے لئے سببہ کو انگوٹھے کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور انگوٹھے کو اس کے اوپر پھیلا دینا پکڑنے کی صورت میں۔ رہی سینکڑوں کی گنتی کا طریقہ تو اکائیوں کی طرح ہے نو سو تک بائیں ہاتھ میں اور ہزاروں کی گنتی کا طریقہ شمار بائیں ہاتھ میں جس سے دہائیاں شمار کی گئی ہیں۔

اب رہا تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ کرنا کہ یہ کب اور کس طرح کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشہد کے آغاز ہی سے لے کر اختتام تشہد تک انگلی کو ایک ہی ہیئت میں رکھے اور یہ صورت ترین کے عدد کی سی بنتی ہے۔ یہ اشارہ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے مگر یہ روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں اس کی تردید کرتی ہے کیونکہ "واشار باصبعہ السبابة" کا عطف قول ماقبل پر ہے اور عطف مغایرت کا متقاضی ہے اور اشارہ ترین کی گرہ سے پیدا شدہ ہیئت پر زائد چیز ہے نیز ابن خزیمہ اور بیہقی میں حضرت واکل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اوپر اٹھائی پھر میں نے دیکھا کہ آپؐ اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے" ظاہر ہے کہ حرکت تو کسی چیز کو ایک ہی ہیئت پر برقرار رکھنے کے منافی ہے اور جس روایت میں آیا ہے کہ آپؐ حرکت نہیں دیتے تھے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ اشارہ اس وقت کرتے جب لا الہ الا اللہ کہتے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تشہد کی حالت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے یا تو وہ کسی محسوس چیز کی طرف ہو گا یا کسی معنی کی جانب جو ذہن میں ہو گا۔ نماز تو بہر حال کسی حسی اشارہ کا موقع و محل نہیں اور نہ امام کے سامنے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرے۔ لہذا اشارہ میں کوئی ایسی چیز ہی ہو سکتی ہے جس کا ذہن میں تصور ہو اور اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب کلمہ توحید لا الہ الا اللہ ہے کیونکہ کسی چیز کی وحدانیت بیان کرنے کیلئے ایک انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا لوگوں کے ہاں متعارف اور مشہور ہے۔ لیکن یہ بات گو عقلاً قابل توجہ ہے مگر سنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آپؐ لا الہ الا اللہ پر یوں اشارہ کرتے کہ "لا الہ" پر انگلی کو اوپر اٹھاتے اور "الا اللہ" پر نیچے کر لیتے۔ یہ اشارہ بلاشبہ اشارہ توحید بھی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ دو انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا "احد" احد کہ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو" اور اسی بنا پر یہ شیطان کیلئے بمنزلہ نیزہ کے ہے لیکن کلمہ توحید پر یوں اشارہ کی کیفیت بہر حال سنت سے ثابت نہیں۔ اس کے برعکس حدیث کے ظاہری الفاظ "بدعوبہا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد طلب مغفرت اور دعا ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشارہ ابتدا سے آخر تشہد تک ہونا چاہئے، کیونکہ آداب دعا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے جیسا کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے اور آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور لا الہ الا اللہ فی الجملہ دعا بھی ہے کیونکہ دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعائے ثنا اور دوسری دعائے طلب اور پورا تشہد دعا کی ان دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اشارہ ابتدا سے اختتام دعا تک ہونا چاہئے اور اشارہ کے ساتھ انگلی کو حرکت بھی دینی چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں (عقد ثلاثا وخمسین) تشہد میں بیٹھے ہوئے جب اشارہ فرماتے تو اپنے انگوٹھے کو پاس والی انگلی کی جڑ میں رکھتے اور باقی انگلیوں کو بند رکھتے۔ اسی طرح ہمیں کرنا چاہئے تاکہ سنت پر عمل ہو جائے۔ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ پر سب ائمہ متفق ہیں۔ ملا علی قاری

(۲۴۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَلْتَقَتُ إِيَّانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: «التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ، السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» ثُمَّ لِيَتَحَيَّرَ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ، فَيَدْعُو». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِنُبْحَارٍ.

وللنساء: «كُنَّا نَقُولُ قَبْلَ أَنْ مَالِكٌ» (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے یُفَرِّضُ عَلَيْنَا التَّشَهُُّدُ. وَلِإِحْمَدَ: أَنْ هُنَّ) (ہیں)

النَّبِيِّ ﷺ عَلَّمَهُ التَّشَهُّدَ، وَأَمَرَهُ أَنْ يُعَلِّمَهُ النَّاسَ. اور نسائی میں ہے کہ ہم تشہد فرض ہونے سے پہلے کہا کرتے تھے اور احمد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّسْبِيحَ: «التَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلَّهِ» إِلَى آخِرِهِ.

ان کو تشہد سکھایا اور حکم دیا کہ لوگوں کو اسے سکھاؤ اور مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد سکھاتے تھے (وہ اس طرح تھا التحیات المبارکات الصلوات الطیبات لله.....الم آخره)

لغوی تشریح: ﴿التحیات﴾ التحیۃ کی جمع ہے۔ معنی اس کے عظمت و بزرگی، دوام و بیہنگی یا پھر اس سے مراد قول و زبانی عبادات۔ ﴿الصلوات﴾ نماز پنج گانہ یا پھر مطلق عبادات یا عبادات فضیہ، فعلی و بدنی عبادتیں۔ ﴿الطیبات﴾ عمدہ کلام۔ مثلاً اللہ کی حمد و ثناء اور ذکر الہی اور اقوال صالحہ مراد ہیں یا پھر

ان سے اعمال صالحہ عامہ مراد ہیں یا مالی عبادات بھی مراد ہو سکتی ہیں اور ان کے طیب ہونے سے مراد ان کا ہر قسم کے شوائب سے خالص ہونا جن سے اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو۔ ﴿اعجبہ﴾ جو اسے سب سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے اور اس کے نزدیک سب سے غمہ، اچھا اور احسن ہے۔ ﴿کنا نقول﴾ مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کیا کہتے تھے بلکہ تمام حدیث کو حذف کر دیا ہے۔ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ مصنف اس پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ ﴿قبل ان یفرض﴾ کا جملہ فرضیت تشدد پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد احمد کی وہ روایت بیان کی ہے جو اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ تشدد کی تعلیم کا حکم فرمانا اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور مصنف کا مقصد تشدد کے فرض ہونے سے پہلے صحابہ کرامؓ کیا کہتے تھے کو بیان کرنا نہیں ہے۔ اس لئے اسے حذف کر دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ یہ کہا کرتے تھے۔ السلام علی اللہ۔ السلام علی جبرئیل و میکائیل۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا کہ ”اس طرح نہ کہا کرو“ بلکہ اس طرح کہا کرو: التحیات للہ..... الخ۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تشدد کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے۔ دعا کو نسی مانگی جائے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے جتنی چاہے مانگ سکتا ہے۔ تاہم نبی ﷺ کی فرمودہ دعائیں افضل ہیں۔ قرآنی دعائیں بھی مانگ سکتا ہے اور اپنی ضروریات کے لئے دیگر دعائیں بھی اس حدیث سے تشدد کا واجب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ وجوب کے قائل ہیں۔ دوسرے اہل علم کے نزدیک فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشدد کے جو الفاظ مروی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور اکثر علماء نے انہیں پسند کیا ہے کیونکہ یہ تشدد کے باب میں صحیح ترین روایت ہے اور امام شافعی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی تشدد کو اختیار کیا ہے۔

(۲۴۸) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَجُلًا يَدْعُو فِي صَلَاتِهِ، وَلَمْ يَحْمِدِ اللَّهَ، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: عَجَلَ هَذَا، ثُمَّ دَعَاهُ، فَقَالَ: إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ رَبِّهِ وَالشَّائِءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ يَدْعُو بِمَا شَاءَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

غفوی تشریح: ﴿عجل﴾ باب سمع یسمع سے عجل یعجل۔ اپنی دعا میں جلدی کی بایں صورت

کہ حمد اور درود کو چھوڑ دیا تھا۔ ﴿نم دعاہ﴾ پھر اسے اپنے پاس بلایا کہ اسے آداب دعا سکھائیں۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا جلدی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ دعا تو نام ہی عاجزی و
 انکساری اور اظہار تذلل کا ہے۔ اس لئے جب دعا کی جائے تو پورے اہتمام و اطمینان سے دعا کی جائے۔
 پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے پھر رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے پھر دعا کی جائے۔ یہ
 حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تشہد کے عین مطابق ہے کہ تشہد میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ
 کی تعریف و ثناء ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ حدیث تشہد کے بعد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کا محل تشہد
 ہے۔

تشہد میں پہلے السلام علیک ایہا النبی اور پھر السلام علینا و علی عباد اللہ
 الصالحین کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اور آپؐ ہی کی بدولت ہمیں نماز کا طریقہ و سلیقہ
 حاصل ہوا۔ اس میں خطاب کا لفظ ”السلام علیک“ دکائی ہے جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ
 میں کہا ہے۔ آپؐ خود بھی یہ کلمات یوں ہی پڑھتے تھے۔ نیز آپؐ کے انتقال کے بعد صحابہ کرام السلام
 علی النبی کے الفاظ پڑھنے لگے تھے۔ (بخاری) خطاب کبھی حاضر فی الذہن کیلئے بھی ہوتا۔ بہر نوع تشہد
 میں اس خطاب سے خرائیوں کا وجودی وحسی حاضر و ناظر مراد لینا غلط اور بے بنیاد ہے۔

راوی حدیث: ﴿فضالۃ بن عبید اللہ﴾ ”فا“ پر فتح اور عبید، عبد سے تصغیر۔ فضالہ بن عبید بن نافذ
 بن قیس۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ پہلا معرکہ، جس میں یہ شریک
 ہوئے معرکہ احد تھا۔ اس کے بعد سب غزوات میں شریک رہے۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ شام کی
 طرف نقل مکانی کر گئے تھے اور دمشق میں سکونت پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
 جنگ کیلئے نکلے اس وقت یہ وہاں کے قاضی (جج) تھے۔ ۵۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۲۴۹) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ
 الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
 قَالَ: قَالَ بَشِيرُ بْنُ سَعْدٍ: يَا رَسُولَ
 اللَّهِ! أَمَرَنَا اللَّهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ،
 فَكَيْفَ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ؟ ثُمَّ
 قَالَ: «قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى
 مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا
 صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى
 مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا
 بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ فِي الْعَالَمِينَ،
 حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ
 بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)!
 اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپؐ پر درود بھیجنے کا حکم ارشاد
 فرمایا ہے لہذا ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجیں؟
 تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا ”اس طرح کہا کرو
 اللہم صل علی محمد..... الخ اے اللہ!
 محمد (ﷺ) اور آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما جس طرح
 تو نے رحمت نازل فرمائی، ابراہیمؑ پر اور برکت نازل
 فرما محمد (ﷺ) اور آل محمد (ﷺ) پر جس طرح تو نے
 برکت نازل فرمائی ابراہیمؑ پر دونوں جہانوں میں۔ یقیناً

نفوی تشریح: ﴿امرنا اللہ ان نصلی علیک﴾ اللہ کا حکم ﴿صلوا علیہ وسلموا تسلیما﴾ میں ہے "والسلام کما علمتم" تعلیم سے صیغہ مجہول ہے۔ یعنی جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے تعلیم دی گئی ہے اور اس کا احتمال ہے کہ علم سے ماخوذ صیغہ معلوم ہو اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے التحیات للہ الخ کی صورت میں تمہیں سکھایا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ پر نماز میں درود و سلام بھیجنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سمیت بہت سے ائمہ رحمہم اللہ اسے واجب ہی قرار دیتے ہیں۔ درود شریف کے مختلف الفاظ احادیث میں مروی ہیں۔ جس کی تفصیل جلاء الانعام اور القول البدیع میں موجود ہے اور صحیح ترین روایت جو نماز میں درود شریف پڑھنے کی ہے وہ یہی ہے۔ ”آل“ میں لغوی اعتبار سے گو آپؐ پر ایمان لانے والے تمام مومن و متقی بھی مراد ہیں مگر صحیح تربات یہ ہے کہ یہاں اس سے آپؐ کے وہ رشتہ دار مراد ہیں جن پر صدقہ و زکوٰۃ حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوسعود انصاریؓ﴾ ان کا نام عقبہ بن عمرو ہے اور ابو مسعود ان کی کنیت ہے۔ انصار مدینہ میں ہونے کی بنا پر انصاری کہلائے۔ بدر میں شامل ہونے والے جلیل القدر اور بزرگ صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تو تھے مگر کم سن تھے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔

﴿بشیر بن سعدؓ﴾ ابو نعمان کنیت تھی۔ بشیر ”باء“ پر زبر ”شین“ کے نیچے کسرو اور ”یا“ ساکن بن سعد بن ثعلبہ بن جلاس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یا خلاص ”خاء“ کے فتح اور لام کی تشدید کے ساتھ)۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری اور قبیلہ خزرج میں سے ہونے کی وجہ سے خزرجی کہلائے۔ بدر اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابی تھے۔ احد و خندق اور بعد کے معرکوں میں شامل رہے۔ عین تمر میں ۱۳ھ کو شہید ہوئے۔

(۲۵۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنْ أَرْبَعٍ، يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي

أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: إِذَا قَرَعَ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّهْنِئَةِ الْأَخِيرَةِ.

ہوں اور عذاب قبر سے پناہ طلب کرتا ہوں اور موت و حیات کے فتنہ سے تیری پناہ کا طلبگار ہوں اور مسیح دجال کے فتنہ کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں۔ ”جب تم سے کوئی آخری تشدد سے فارغ ہو۔ تو اس وقت ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔“

لعنوی تشریح: ﴿فتنة المحيا﴾ محیا سے زندگی مراد ہے اور اس کے فتنہ سے مراد انسان کو جو آزمائشیں دنیا میں پیش آتی ہیں اور وہ خواہشات یا نادانی و جمالت کی وجہ سے جن دشواریوں اور پریشانیوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے یا وہ بلائیں جو صبر و تحمل نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ سب ہی مراد ہیں۔ ﴿الممات﴾ ممات سے مراد موت ہے اور موت کے فتنہ سے مراد برا خاتمہ ہے۔

حاصل کلام: تشدد میں درود و سلام کے بعد اس استعاذہ کو ابن حزم نے واجب قرار دیا ہے۔ تابعین میں امام طاووس رضی اللہ عنہ کا بھی موقف یہی تھا۔ بلکہ حافظ ابن حزم تو دونوں تشددوں میں استعاذہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی علماء اسے آخری تشدد میں درود کے بعد پڑھنے کو مستحب ہی کہتے ہیں۔

اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس کا انکار نص قرآن اور حدیث صحیح کا انکار ہے۔

(۲۵۱) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصَّدِّيقِ حَضْرَتِ ابُو بَكْرٍ صَدِيقِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سے مروی ہے کہ میں نے رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: عَلَّمَنِي دُعَاءَ اَدْعُوْ اِیسی دعا سکھائیں جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ بِہِ فِی صَلَاتِی! قَالَ: «قُلْ: اَللّٰهُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا کَثِیْرًا، وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، فَاعْفُ عَنِّی، وَارْحَمْنِی، اِنَّکَ مَغْفِرٌ مِّنْ عِنْدِکَ، اَنْتَ الْعَفُوْرُ الرَّحِیْمُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا ”یہ دعا پڑھا کرو۔ اللہم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً، ولا یغفر الذنوب الا انت، فاعف عنی، وارحمنی، انک مغفر من عندک، انت العفوور الرحیم۔“ متفق علیہ۔

دے اور مجھ پر رحم فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت لغزش اور غلطی و خطا کا امکان رہتا ہے۔ ابوبکر صدیق

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيٍّ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی صاحب نصیبہ کو تیرے بغیر کوئی نصیبہ فائدہ نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منقول دعا اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ کے ماسوا کوئی بھی معبود نہیں کہ جس کی طرف حاجات و ضروریات کی تکمیل کیلئے رجوع کیا جاسکے۔ دنیا و مافیہا اور آسمانوں کی ہر ایک چیز اس کی مخلوق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ہر وقت محتاج ہے۔ وہ قادر مطلق ہے کسی کو کچھ دینے اور نہ دینے کے جملہ اختیارات بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کی سرکار میں دنیوی جاہ و حشمت، عزت و سلطنت اس کے فضل اور رحمت کے سوا ذرا بھر بھی کارگر اور منافع بخش ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ دعا نماز فرض سے فارغ ہو کر پڑھنی مستحب ہے۔

(۲۵۴) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِمْ ذُبْرَ كُلِّ صَلَاةٍ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے آخر میں یہ تعوذ پڑھا کرتے تھے۔ اللہم انی اعوذ بک من البخل الخ ”اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں بخل سے اور بزدلی سے اور تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میں رذیل ترین عمر کی طرف لوٹا جاؤں اور میں دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿بہن﴾ ان کلمات کے ذریعہ سے مراد ہیں وہ کلمات جو اس حدیث میں مذکور ہیں ﴿دبر کل صلاۃ﴾ نماز کے اختتام کے موقع پر یا سلام پھیر دینے کے بعد۔ ﴿الجبن﴾ جیم پر ضمہ اور ”با“ ساکن۔ کمزوری اور ضعف یا پھر دشمن سے نبرد آزمائی کا خوف و اندیشہ۔ ﴿من ان ارد﴾ ارد صیغہ متکلم ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ یعنی میں لوٹا جاؤں یا اس طرف پھیرا جاؤں۔ ﴿الی اذذل العمر﴾ یعنی خیس اور ذلت آمیز عمر کی طرف وہ اس وقت ہوتی ہے جب بڑھاپا شدت اختیار کر جائے اور کبر سن انسان کو بچوں سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور حیوان سے زیادہ رذیل بنا دیتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بول و براز بھی اپنے کپڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کھانا پینا اور خورد و نوش بھی بستر پر ہو جاتا

ہے۔ اللہ سے استدعا ہے کہ ہم سب کو ایسی رسوا کن اور رذیل ترین عمر سے اپنی پناہ میں رکھے۔
حاصل کلام: حدیث کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعویذ اختتام نماز یعنی سلام پھیرنے سے پہلے بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد بھی۔ بڑی بامعنی دعا ہے۔ اس کا التزام کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ﴾ ابواسحق ان کی کنیت تھی۔ باپ کا نام مالک تھا۔ قریش سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرشی کہلائے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں نمبر ہے یا بقول بعض ساتواں نمبر۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (جنہیں حضور ﷺ نے زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری و بشارت دے دی تھی) اللہ کی راہ میں تیر اندازی کرنے والے یہ پہلے شخص ہیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ کی راہ میں انہوں نے تیر چلایا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ فاتح عراق ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ پستہ قامت مگر گٹھا ہوا بدن، گندمی رنگ، مدینہ سے دس میل دور واقع مقام عقیق میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت مدینہ طیبہ لائی گئی اور ۵۵ھ میں جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

(۲۵۵) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَنْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهِ اسْتَغْفَرَ اللَّهَ ثَلَاثًا، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، وَالسَّلَامُ تَبَارَكَتْ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.
 حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے اور پھر اللہم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام پڑھتے۔
 ”اے اللہ! میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور اے اللہ! تو سلام ہے یعنی تو ہی سلامتی والا ہے اور سلامتی تجھ ہی سے ہے اے بزرگی و برتری کے مالک! تو بڑی برکت والا ہے) (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے نماز کے ان اذکار کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کا استغفار بطور شکر اور تعلیم کے تھا اور اہل ایمان کا استغفار نماز میں کمی و بیشی، وسوس اور خیالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کمی و زیادتی اور آمد خیالات کی بنا پر نماز میں نقص واقع ہو گیا۔ بتقاضائے بشریت ہم اس کی مغفرت اور درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی عبدیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے معبود سے معافی کی استدعا کرتا ہی رہے۔

نبی ﷺ استغفار کس طرح پڑھتے تھے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے استفسار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار کون سا تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ حضور ﷺ استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ فرماتے۔

اس حدیث میں دعا کے جتنے فقرات مذکور ہیں وہی پڑھنے مسنون ہیں مگر یار لوگوں نے اس پر صبر نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے اضافہ فرما کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثلاً اسی دعا میں اس طرح اضافہ کر دیا اللہم

انت السلام ومنك السلام واليك يرجع السلام حيناً ربنا بالسلام تباركت يا ذا الجلال والكرام وغيرہ کا۔ بہر حال حدیث میں یہ اضافہ کیسے مقول نہیں اپنی طرف سے یہ اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند کے مصداق ہے۔

(۲۵۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ قَالَ: «مَنْ سَبَّحَ اللَّهَ ذُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَحَمِدَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَكَبَّرَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، فَتِلْكَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ الْمِائَةِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَخَدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةِ أُخْرَى: أَنَّ التَّكْبِيرَ أَرْبَعٌ وَثَلَاثُونَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے ہر نماز کے سلام «مَنْ سَبَّحَ اللَّهَ ذُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَحَمِدَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، وَكَبَّرَ اللَّهَ ثَلَاثًا وَثَلَاثِينَ، فَتِلْكَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ الْمِائَةِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَخَدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ» غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةِ أُخْرَى: أَنَّ التَّكْبِيرَ أَرْبَعٌ وَثَلَاثُونَ.

پھیرنے کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا اور ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور اللہ اکبر بھی ۳۳ مرتبہ یہ مجموعی طور پر ۹۹ یعنی ایک کم سو ہوئے اور سو مکمل کرنے کیلئے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وهو علی کل شئی قدیر کہا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں خواہ ان کی تعداد سمندر کی جھاگ کے مساوی ہو۔“ (مسلم) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ کے

لغوی تشریح: ﴿سبح﴾ تسبیح بیان کی یعنی سبحان اللہ کہا۔ ﴿زبد البحر﴾ زاء اور ”با“ دونوں پر فتح۔ جھاگ۔ جب پانی موجزن ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ آ جاتی ہے۔ اس قسم کی عبارت بیان کرنے سے مقصود کسی شے کی کثرت بیان کرنا ہوتا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن گناہوں اور خطاؤں کے معاف کئے جانے کا ذکر ہے ان سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ مگر جہاں تک کبار کا تعلق ہے تو ان کیلئے توبہ ناگزیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہر نماز کے اختتام پر خواہ وہ نفل نماز ہو یا فرض یہ کلمات پڑھنے مسنون بھی ہیں اور بکثرت گناہوں کے بخشے جانے کی نوید بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے ان کلمات کا فرائض کے بعد پڑھنا مشروع ہونا ثابت کیا ہے۔

اس دعا کا پس منظر جو بخاری میں مذکور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک روز فقراء ماجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مالدار صاحب ثروت لوگ تو سب نیکیاں اور بھلائیاں لوٹ کر لے گئے۔ وہ لوگ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں اور وہ صدقہ و خیرات بھی ہم سے زیادہ کرتے ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں ہے) آپ نے (انہیں تسلی دیتے ہوئے) فرمایا ”میں تمہیں ایسا عمل نہ سکھاؤں یا بتلاؤں کہ تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کا ثواب بھی حاصل کر لو اور کوئی تم سے آگے بھی نہ بڑھ سکے

بشرطیکہ کوئی وہی عمل کرے جو تم کرو۔“ اس موقع پر آپؐ نے ہر نماز کے بعد مذکورہ کلمات کہنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

ان کلمات کو پڑھنے کی دو صورتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ اور الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ یا ۳۴ مرتبہ۔ دوسرا یہ کہ ۳۳، ۳۳، ۳۳ مرتبہ تینوں کلمات اور ۳۴ مرتبہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وهو علی کل شئی قذیر پڑھ کر سو کی تعداد پوری کرے۔ اگر تینوں کلمات بالترتیب ۳۳، ۳۳، ۳۴ اور ۳۴ مرتبہ پڑھے جائیں تو پھر لا الہ الا اللہ الخ نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ اس طرح تعداد ۱۰۰ میں ایک عدد کا اضافہ ہو کر سو کی بجائے تعداد ایک سو ایک ہو جائے گی جو سنت سے ثابت نہیں۔

(۲۵۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَهُ: «أَوْصِيكَ يَا مُعَاذُ: لَا تَدَعَنَّ ذُبْرَ كُلِّ صَلَاةٍ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا ”اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے اختتام کے بعد ان کلمات کو کبھی فراموش نہ کرنا“ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک“ اے اللہ! مجھے اپنے ذکر اور شکر اور حسن عبادت کی توفیق سے نواز یا اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں ذکر کروں تیرا اور شکر ادا کر سکوں تیرا اور عمدہ اور بہتر عبادت بجالاؤں تیری۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لا تدعن﴾ دال اور عین تینوں پر فتح۔ معنی ہیں نہ ترک کرنا۔ ودع یدع سے نبی کا صیغہ ہے جب اسے چھوڑ دے، نظر انداز کر دے۔ ﴿اعنی﴾ حمزہ پر فتح اور عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید۔ ﴿الاعانۃ﴾ سے دعا کا صیغہ ہے۔ ایک نون کو دوسرے نون و قالیہ میں مدغم کر دیا گیا اس طرح وہ مشدود ہو گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ میری نصرت فرما اور مجھے توفیق سے نواز۔

حاصل کلام: ﴿لا تدعن﴾ اس پر مدلول ہے کہ اس دعا کو فرض نماز کے بعد نظر انداز کرنا اور ترک کر دینا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ نبی اصل تو تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ اس دعا کے علاوہ کتب احادیث مثلاً مسلم، ابوداؤد، نسائی، احمد اور ترمذی وغیرہ میں اور بہت سی دعائیں آپؐ سے پڑھنا ثابت ہیں۔ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ سنت پر عمل بھی ہو اور اس کی اشاعت و ترویج بھی۔

(۲۵۸) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے ہر فرض نماز کے

ﷺ: «مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ ذُبِرَ كُلُّ شَيْءٍ» ادا کرنے کے بعد آیت الکرسی پڑھی۔ اس کو جنت صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعُهُ مِنْ دُخُولِ رَوْاهُ النَّسَائِيُّ، (مرتے ہی جنت میں داخل ہو وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَزَادَ فِيهِ الطَّبْرَانِيُّ: «وَقُلُوهُ» جائے گا بشرطیکہ عقیدہ توحید صحیح ہو) (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور طبرانی

نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قل هو الله احد" بھی پڑھے)۔

حاصل کلام: آیت الکرسی کی فضیلت کے بارے میں آپ کے اور بھی ارشادات کتب حدیث میں منقول ہیں۔ اس کی اتنی فضیلت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں توحید الہی کو صاف طور پر نکھار کر بیان کیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت، اس کی قدرت اور اس کا علم ماسکان و مایکون اور کائنات کی حفاظت وغیرہ صفات کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اور سورہ اخلاص تو تہائی قرآن کے برابر ثواب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اصل میں تین بنیادی عقائد ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اس سورہ میں اللہ کی وحدانیت، اس کی صمدیت کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ سورہ بھی اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ لہذا جو آدمی اہتمام کے ساتھ ان کو نماز فرض کے بعد پڑھے گا اسے مرتے ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (انشاء اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دنیا میں کوئی منکر آج تک نہیں پایا گیا۔ نیز اس سے جنت کا وجود بھی معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت بھی مخلوق ہے یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی۔

راوی حدیث: ﴿ابو اسامہ رضی اللہ عنہ﴾ ابوامامہ کنیت ایاس بن ثعلبہ بلوی نام تھا اور انصار کے قبیلہ بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ والدہ کی تیمارداری میں مشغولیت کی وجہ سے غزوہ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔

(۲۵۹) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ حَضْرَتِ مَالِكِ بْنِ حُوَيْرِثٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ "نَمَازُ اَسَى طَرَحٍ پڑھو جس رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «صَلُّوْا كَمَا طَرَحَ مَجْهِيْ پڑھتے تم نے دیکھا ہے۔» (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے براہ راست تو خطاب صحابہ کرام سے ہے۔ لیکن عمومی حکم میں امت مسلمہ کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ امیریمانی نے کہا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں آپ نے جو افعال جس طرح ادا فرمائے بعینہ اسی طرح ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ جس کا کسی دوسری دلیل

(۲۶۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ، وَلَا فَاوِمٍ».

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا ”نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور بیٹھ کر پڑھنے کی استطاعت بھی نہیں تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ ہو سکے تو اشارہ سے ہی بڑھ لو۔“ (بخاری)

غلوئی تشریح: ﴿فعلى جنب﴾ اپنی دائیں جانب لیٹ کر۔ اس صورت میں پاؤں کا رخ قبلہ رخ نہ ہونا چاہئے بلکہ استقبال قبلہ کے وقت بائیں جانب ہونا چاہئے۔ ﴿فاوم﴾ ایما سے امر کا صیغہ ہے۔ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کسی صورت بھی معاف نہیں۔ مجرمہ ہوشی کی حالت کے۔ نیز ثابت ہوا کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے بامر مجبوری یا بیماری کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر ایسا بھی کرنا دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ ان حالتوں میں کسی پر بھی اگر قادر نہ ہو تو پھر اشاروں سے گویا نماز کسی صورت بھی ترک نہ کرے۔

(۲۶۱) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِمَرِيضٍ - صَلَّى عَلَى وَسَادَةٍ، فَرَمَى بِهَا، - وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الْأَرْضِ إِنْ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَأَوِّمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ». رَوَاهُ التَّيْمِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ، وَلَكِنْ

صَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقَفَّهُ.

لغوی تشریح: ﴿وسادہ﴾ میں ”واو“ پر تینوں اعراب آسکتے ہیں وسادۃً وسادۃً وسادۃً (تکلیف۔ جسے سونے والا اپنے سرہانے رکھتا ہے۔) فرمی بھا ﴿اس آدمی سے اسے دور ہٹا دیا۔﴾ فاوم ایماء ﴿یعنی اشارہ سے نماز پڑھو۔﴾ اخفض ﴿اسے اسفل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اس سے نیچا۔ حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ نمازی کا کسی اونچی چیز پر سجدہ کرنا درست نہیں۔ اسے زمین پر ہی سجدہ کرنا چاہئے۔ اگر کسی امر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر نمازی کو اشارہ ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

البتہ سجدہ اور رکوع کے اشارہ میں فرق کیا جائے۔ سجدہ کا اشارہ ذرا نیچے ہونا چاہئے بہ نسبت رکوع کے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا تعلق اس کے خالق و مالک سے کسی صورت اور کسی لمحہ بھی منقطع نہیں ہونا چاہئے۔ ہر آن اس کی یاد دل و دماغ میں رچی بسی رہنی چاہئے۔ یہی مقام عبدیت ہے۔

سجود سہو وغیرہ کا بیان

۸ - بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ وَغَيْرِهِ

(۲۶۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهَرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُولَيَيْنِ، وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلَاةَ، وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يُكَبِّرُ فِي كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ النَّاسُ مَعَهُ، مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوسِ.

حضرت عبداللہ بن بحدینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز ظہر پڑھائی تو دو رکعتیں ادا کر کے تشدد میں نہ بیٹھے اور سیدھے کھڑے ہو گئے اور مقتدی بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تا آنکہ جب آپ نے نماز پوری ادا کر لی، لوگ سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے کہ آپ نے بیٹھے ہی اللہ اکبر کہا اور دو سجدے کئے۔ سلام پھیرنے سے پہلے۔ پھر سلام پھیرا۔ (اسے ساتوں احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا۔ البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ہر سجدہ کیلئے اللہ اکبر کہتے تھے بیٹھے ہوئے اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا بھول جانے کے قائم مقام۔ (دو رکعت کے بعد تشدد میں بیٹھنا بھول گئے تھے اس کی تلافی کیلئے دو سجدے کئے۔

لعنوی تشریح: ﴿باب سجود السهو﴾ سہو بھول کر کی بیشی کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں نماز میں بھول مراد ہے۔ ﴿فقام فی الركعتین الاولیین﴾ یعنی دو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد۔ ﴿ولم یجلس﴾ پہلے تشدد کیلئے نہ بیٹھے۔ ﴿قضى الصلاة﴾ سلام کے ماسوا ارکان نماز سارے پورے کر لئے۔

حاصل کلام: عربی میں بھول کیلئے دو الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک سہو اور دوسرا نسیان۔ پہلے کا اطلاق عموماً افعال کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے کا بالعموم معلومات کیلئے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی بھی آجاتے ہیں۔ علماء میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے نسیان کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی ابلاغ احکام الہی اور شریعت کے پہنچانے میں

دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر تشہد اول بھول کر رہ جائے تو اس نقصان کی تلافی سجدہ سو سے ہو جاتی ہے۔ سجدہ سو قبل از سلام کیا جائے یا بعد از سلام۔ احادیث سے آپؐ کا عمل دونوں طرح ثابت ہے۔ زندگی بھر ایک لگے بندھے طریقے پر آپؐ کا عمل ثابت نہیں ہوتا کہ بس فلاں طریقہ پر ساری عمر عمل فرماتے رہے۔ البتہ جب ائمہ رحمہ اللہ کا دور آیا اور تقلید شخصی پر عمل درآمد شروع ہوا تو ائمہ کرام رحمہ اللہ کے مقلدین نے اپنے اپنے دائرہ میں صورتیں معین کر لیں۔ بہر حال ایک رائے یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جس جس مقام پر جو طرز عمل اختیار فرمایا وہاں اسی طرح عمل کیا جائے۔ مگر باقی مواقع پر جس طرح تحقیق سے ثابت ہوا ہو اس پر عمل کرے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اس طرز عمل کو بہتر قرار دیا ہے کہ نماز میں کمی واقع ہو جانے کی صورت میں سجدہ سو سلام پھیرنے سے پہلے کیا جانا چاہئے اور اگر زیادتی واقع ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے۔ البتہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ کرنا پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرنا، صحیح احادیث کی روشنی میں آنحضور ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں۔

(۲۶۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ إِحْدَى صَلَاتَيْ الْعِشِيِّ رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ قَامَ إِلَى خَشْبَةٍ فِي مُقَدِّمِ الْمَسْجِدِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهَا وَفِي الْقَوْمِ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ، فَهَابَا، أَنْ يُكَلِّمَاهُ، وَخَرَجَ سَرْعَانَ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقْصُرَتِ الصَّلَاةُ، وَرَجُلٌ يَدْعُوهُ النَّبِيُّ ﷺ ذَا الْيَدَيْنِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أُنْسَيْتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: لَمْ أُنْسَ وَلَمْ

تُقَصِّرُ، قَالَ: بَلَى قَدْ نَسِيتُ، فَصَلَّى رَمَعْتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

(سے) ذوالیدین کہہ کر بلا تے تھے، نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ (آج) بھول گئے ہیں یا نماز کم کر دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا ”نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے“۔ اس شخص نے پھر عرض کیا ہاں آپ ضرور بھول گئے ہیں۔ تو پھر آپ نے دو رکعتیں جو چھوٹ گئی تھیں پڑھیں اور سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر معمول کے سجدوں کی طرح سجدہ کیا یا اس سے ذرا لمبا پھر سجدہ سے اللہ اکبر کہہ کر سر اوپر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر زمین پر رکھا اور معمول کے سجدہ کی طرح یا ذرا اس سے طویل سجدہ کیا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنا سر اٹھایا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

وَفِي رِوَايَةٍ لِّلْمُسْلِمِ: «صَلَاةُ الْعَصْرِ». وَلِأَبِي ذَاوُدَ: فَقَالَ: أَصَدَقَ ذُو الْبَيْتَيْنِ؟ فَأَوْمَتْهُمَا أَيْ نَعَمْ. وَهِيَ فِي الصَّحِيحَيْنِ، لَكِنْ بِلَفْظٍ: «فَقَالُوا». وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَلَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَقْنَهُ اللَّهُ تَعَالَى ذَلِكَ».

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی اور ابوداؤد میں مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ”کیا ذوالبیتین نے ٹھیک کہا ہے؟“ تو لوگوں نے سر ہلا کر اشاروں سے کہا ہاں! یہ اضافہ صحیحین میں بھی ہے لیکن ان میں ”فقالوا“ کے لفظ کے ساتھ مروی ہے (یعنی زبان سے انہوں نے کہا) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کو جب تک اللہ کی جانب سے یقین نہ ہوا اس وقت تک سجدہ سو نہیں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿العشى﴾ عین پر فتح۔ شین کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ پر تشدید۔ عشی زوال آفتاب سے لے کر غروب شمس تک کے درمیانے وقت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے نماز ظہر کا تعین ثابت ہوتا ہے اور بعض سے نماز عصر کا مگر شک بدستور باقی رہا رفع نہیں ہوا۔ ﴿فی مقدم المسجد﴾ تقدیم سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔ معنی مسجد کے سامنے، آگے، دروازے پر۔ ﴿ہابا﴾ دونوں خوفزدہ ہوئے۔ ﴿سر عان الناس﴾ ان نمازیوں میں جو جلدی میں تھے۔ ”سرعان“ میں سین پر فتح راء ساکن ہے اور فتح بھی

ہے اور ایک قراءت کے مطابق سرعان کے سین پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ ﴿اقصرت؟﴾ حمزہ یہاں استفہام کیلئے ہے۔ یعنی سوالیہ۔ اس امر واقع میں یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ کسی معاملہ کے بارے میں بغیر علم کے ہفتہ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ سے اس بارے میں پوچھنے کیلئے دوڑے۔ انہوں نے دریافت کرنے کا طرز عمل اس لئے اختیار کیا کہ وہ زمانہ نسخ کا زمانہ تھا کیونکہ نبی کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود تھی۔ ایک فعل (عمل) کی جگہ دوسرے فعل کا حکم آسکتا تھا۔ ﴿قصرت﴾ قاف پر ضمہ اور راء کے نیچے کسرہ۔ میغضہ مجہول ہے اور ایک قراءت کی رو سے قاف پر فتح اور صادر پر ضمہ صیغہ معروف باب کرم بکرم کے وزن پر۔ معنی یہ ہوا کہ نماز مختصر اور چھوٹی ہو گئی ہے۔ ﴿ورجل یدعوہ﴾ اسے نام لے کر بلاتے تھے۔ ﴿ذا الیدین﴾ ذوالیدین اس کو اس لئے کہتے کہ اس کے ہاتھ نسبتاً لمبے تھے اور اس کا نام تو خرباق بن عمرو تھا۔ ﴿انسیت؟﴾ اس میں حمزہ استفہامیہ ہے اور نیت میں تا خطاب کیلئے ہے۔ ﴿ام قصرت؟﴾ صیغہ واحد غائب صیغہ معروف بھی ہو سکتا ہے اور صیغہ مجہول بھی۔ ﴿لم انس﴾ انس میں حمزہ اور سین دونوں پر فتح ہے۔ معنی ہے میں نہیں، بھولا۔ مضارع پر لم داخل ہو کر اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہ حدیث ہجود سمو کے علاوہ اور مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب نمازی کو گمان غالب ہو کہ اس نے نماز مکمل پڑھ لی ہے پھر سلام بھی پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز نماز میں کمی و بیشی کی اطلاع دینے کی صورت میں دیدہ و دانستہ اور عمدہ گفتگو کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ ﴿ہاموموا﴾ تو انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ ﴿ولکن بلفظ فقالوا﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں مروی روایت میں ﴿ہاموموا﴾ کی جگہ فقالوا کا لفظ ہے۔ یعنی انہوں نے سر کے اشارہ سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر۔ ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ ﴿بقضہ اللہ﴾ باب تفعیل سے دل میں اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سمو سرزد ہوا ہے اور یہ نبوت کے مخالف و متضاد نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ بھی انسان تھے۔ سمو وغیرہ ایک انسان سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ عالم الغیوب نہ تھے اور نہ آپؐ نے کبھی عالم ماسکان وما بکون ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر علم غیب ہوتا تو سمو کی تصدیق کیلئے لوگوں سے دریافت نہ فرماتے کہ کیا ذوالیدین نے ٹھیک اور سچ کہا ہے؟ سمو کی تصدیق ہونے پر اسے تسلیم کر لیا۔ اگر غلطی سمو جانے پر کوئی اصلاح کرے تو اسے صحیح ہونے پر مان لینا چاہئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سجدہ سمو کرتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا چاہئے۔ اس حدیث سے سجدہ سمو سلام سے پہلے ثابت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا تشہد بھول جائے تو اس کی تلافی سمو کے دو سجدوں سے ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف ”صلی النبی“ ہے، مگر بعض روایات میں ”صلی بناء“ کا لفظ منقول ہے۔ یعنی ہمیں نماز پڑھائی۔ اس صورت میں راوی حدیث بھی ان نمازیوں میں شریک تھے۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت (فوموا للہ فانھن) سے منسوخ نہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ اس

آیت کے نزول سے چار پانچ سال بعد اسلام لائے ہیں۔ صحابہؓ کی یہ گفتگو سہوا نہیں قصداً ہوئی ہے۔ لہذا اصلاح نماز کیلئے اتنی سی بات نماز کو باطل قرار نہیں دیتی۔

راوی حدیث: ﴿خبراق بن عمرو سلمیؓ﴾ بنو سلیم سے ہونے کی وجہ سے سلمی کہلائے۔ سہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ انہوں نے امیر معاویہؓ کے دور خلافت میں وفات پائی اور ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ذی شخب مقام پر وفات پائی اور بعض روایات میں ذوالیدین کی بجائے ذوالثمالین بھی وارد ہے۔ بعض کا خیال ہے دونوں سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ یہ وہم ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ دو شخص تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ذوالثمالین بدر میں شہید ہوئے ہیں اور یہ واقعہ بیان کرنے والے ابو ہریرہؓ اور عمران بن حصینؓ ہیں اور یہ دونوں تو اسلام غزوہ خیبر کے سال لائے ہیں۔

(۲۶۴) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمْ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ تَشَهَّدَ، ثُمَّ سَلَّمَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی تو آپ کو سو ہو گیا (یعنی آپ بھول گئے) تو (پہلے) دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا اور پھر سلام پھیرا۔ (اسے ابوداؤد، ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز میں بھول لاحق ہونے والا واقعہ وہی ہے جس میں ذوالیدین نے دریافت کیا تھا کہ کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپؐ بھول گئے ہیں؟ ذوالیدین والا واقعہ صحیحین اور سنن کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ کسی کتاب میں مروی حدیث میں سجود سو کے بعد تشہد کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ صحیح مسلم میں خود حضرت عمران کی اسی روایت میں تشہد کا ذکر نہیں۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ ترمذی کی اس روایت میں تشہد کا لفظ شاذ ہے جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے کہا۔ مگر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ فی الجملہ تشہد کا ذکر ثابت ہے۔ جمہور کے نزدیک سلام سے پہلے سجدہ سو ہو تو تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں، البتہ اگر سلام کے بعد سجدہ سو کیا جائے تو اختیار ہے خواہ تشہد پڑھے یا نہ پڑھے۔

(۲۶۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلَمْ يَذَرْ حَتَّى صَلَّى أَلَاثَا أَمْ أَرْبَعًا؟ فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ، وَلْيَبْنِ عَلَى مَا اسْتَيْقَنَ، ثُمَّ يَسْجُدْ

شیطان کیلئے باعث ذلت و رسوائی ہوں گے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ”فلم بدر“ را کے نیچے کسر۔ درایہ سے ماخوذ ہے مگر حرف علت (ہمزہ) حذف ہو گیا ہے مضارع پر لم کے داخل ہونے کی وجہ سے۔ معنی اسے علم نہیں، اسے معلوم نہیں۔ ”فلیطرح“ چھوڑ دے، ترک کر دے، دور پھینک دے۔ ”ولین“ بقاء سے ماخوذ ہے۔ ”علی ما استیقن“ جس پر یقین ہو۔ مثلاً جب اسے شک ہوا کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار۔ تو اس صورت میں اسے تین شمار کرنی چاہیں اور چوتھی کو پورا کرنے کیلئے کھڑے ہو کر ایک رکعت مزید پڑھ لے۔ ﴿فان کان صلی خمساً﴾ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ نمازی چار رکعت والی نماز پڑھے گا۔ ”شفعن صلاتہ“ تو دو سجدے نماز کو جفت بنا دیں گے اور یہ سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہوں گے۔ شفیع وتر کے مقابلہ میں یعنی وتر کے معنی طاق جو جوڑانہ بن سکے اور شفیع کا معنی جفت جو جوڑا بن سکے۔

”تماماً“ تماماً سے مراد چار رکعت جو نمازی کو مطلوب ہیں۔ ”ترغیماً تذلیلاً“ اور اہانتہ کے معنی میں ترغیم دراصل توناک کا مٹی کے ساتھ رگڑنا، خاک آلود کرنا، خاک آلودگی، ذلت، رسوائی اور اہانتہ کے معنی میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نمازی کو رکعات کی تعداد میں اشتباہ پڑ جائے تو اسے کم پر بنا رکھنی چاہئے۔ اس میں یقین کا امکان ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور جہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نماز میں شک واقع ہونے کی صورت میں اسے تحری کرنی چاہئے۔ یعنی یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر دیکھے اگر گمان غالب کسی طرف ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور اگر تحری کے باوجود دونوں اطراف مساوی نظر آئیں تو پھر کم پر بنا رکھے۔

(۲۶۶) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ
اللَّهِ ﷺ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَا
رَسُولَ اللَّهِ أَحَدَتْ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ؟
قَالَ: «وَمَا ذَلِكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ
كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَتَنَى رَجُلِيهِ،
وَأَسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ،

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ سلام پھیرا تو آپ کی
خدمت میں عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)
کیا نماز میں کوئی نئی چیز رونما ہوئی ہے؟ آپ نے
فرمایا ”وہ کیا ہے؟“ انہوں نے عرض کیا آپ نے تو
اتنی اتنی نماز ادا فرمائی ہے۔ ابن مسعود کا بیان ہے
کہ آنحضور نے اپنے دونوں پاؤں دوہرے کئے (اور

ان پر بیٹھ گئے) اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا ”اگر نماز میں کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہوتی تو میں خود تمہیں اس سے باخبر کرتا۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ میں بھی انسان ہوں، اسی طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم لوگ بھول جاتے ہو، لہذا جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کرا دیا کرو اور تم میں سے جب کسی نماز میں شک واقع ہو جائے تو صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کر لے پھر اپنی نماز اس بنیاد پر مکمل کر لے۔ پھر دو سجدے کر لے۔ (بخاری و مسلم)

ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «إِنَّهُ لَوْ حَدَّثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ، وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ، أَنَسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيَتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ». مَتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”(پہلے) نماز مکمل کرنی چاہئے پھر سلام پھیرے اور پھر سجدہ کرے“ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ سو سلام و کلام کے بعد کئے ہیں۔

وَفِي رَوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «فَلْيَتِمَّ، ثُمَّ يُسَلِّمُ، ثُمَّ يَسْجُدُ». وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ سَجْدَتَيِ السُّهُوِ بَعْدَ السَّلَامِ وَالْكَلامِ.

مسند احمد، ابو داؤد اور نسائی میں مروی عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت میں ہے کہ جس شخص کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرنے چاہئیں۔ (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتَّسَائِي مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ مَرْفُوعاً: مَنْ شَكَّ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انا بشر مثلکم کے الفاظ اپنے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی اصلاح کرنی چاہئے جو بشریت رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں اور قرآنی نصوص صریحہ کی یہ تاویل کرتے ہیں جو سراسر باطل اور لغو ہے کہ قرآن مجید میں تو منکروں کو خاموش کرنے کیلئے بشر کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت تو وہ بشر نہیں تھے بشریت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، لیکن ان عقلمندوں سے ذرا کوئی پوچھے کہ اس حدیث میں جن لوگوں کو (انا بشر کم مثلکم) کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں کیا وہ بھی کافر تھے کہ انہیں خاموش کرانا مقصود تھا یا وہ اہل ایمان صحابہ کرامؓ تھے جن کی صداقت ایمانی پر قرآن خود شاہد ہے۔

اس حدیث میں تحری الی الصواب کا حکم ہے۔ تحری دراصل وہ ہے جسے عبد الرحمن بن عوف

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ﴾ ابو جعفر ان کی کنیت ہے۔ عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب نام ہے۔ ان کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا۔ ہجرت حبشہ کے دوران اسلام میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے تھے۔ ۷ھ کے اوائل میں اپنے والد کے ہمراہ مدینہ میں واپس آئے۔ بڑے سخی، ہمار، پاک دامن اور خوش مزاج تھے۔ کثرت سے سخاوت کرنے کی وجہ سے بحر الجود (سخاوت کا سمندر) کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ۸۰ھ میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۲۶۷) وَعَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، قَالَ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ، فَقَامَ فِي الرُّكْعَتَيْنِ، فَاسْتَتَمَ قَائِمًا، فَلْيَمْضِ، وَلَا يَمُودْ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَتَمَ قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ، وَلَا سَهْوَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

سند ضعیف ہے)

۳۳۲

نفعی تشریح: "فقام فی الركعتین" یعنی پہلے تشہد میں نہ بیٹھے۔ "فاسم قائما" پوری طرح سیدھا کھڑا ہو جائے۔ "ضعیف" اس لئے ضعیف ہے کہ اس روایت کے تمام طرق جابر جعفی پر مدار رکھتے ہیں اور یہ سخت ضعیف ہے۔

(۲۶۸) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "كُفِيَ الْمُتَقَدِّمُ عَلَى سَجْدَةِ سَوْنًا"۔ ہاں اگر امام حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا

نغوی تشریح: ”ضعیف“ یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی خارجہ بن معب ہے، جو ضعیف ہے۔

(۲۶۹) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلَّمُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

نفوی تشریح: ﴿لکل سهو سجدةً بعد ما یسلم﴾ اس سے دو مکمل مستحب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز میں جتنی بار بھول ہوئی ہے تو ہر بھول کے عوض دو سجدے کئے جائیں۔ لیکن یہ حدیث چونکہ ضعیف ہے اس لئے اس سے احتجاج و استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ ذوالیدین والی حدیث اس کے معارض ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور پھر نادانستہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے تو انہوں نے دو سجدے ہی کئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ سجدہ سو کا موقع و محل سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ سجدہ سو کے محل وقوع میں احادیث مختلف ہیں۔ اس باب کی دو احادیث جو عبداللہ بن جعینہ اور ابوسعید الخدری سے مروی ہیں ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ سو سلام پھیرنے سے پہلے مسنون ہے اور ذوالیدین اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن جعفر کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ سو کا محل اور موقع سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر ائمہ کرامؒ کی آراء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ہر قسم و نوع کا سجدہ سو صرف سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے سلام سے پہلے سجدہ کر لے اور چاہے سلام پھیرنے کے بعد کر لے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر سجدہ نماز میں کسی اضافہ کی وجہ سے کیا جائے تو پھر سلام پھیرنے کے بعد ہے اور اگر نماز میں کسی کمی واقع ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ کسی حدیث میں جس موقع پر جس طرح سجدہ ثابت ہے اسی طرح کرنا چاہئے۔ باقی کے بارے میں قیاس نہیں کیا جائے گا۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس سو میں آنحضرت ﷺ نے پہلے سجدہ سو کیا وہاں پہلے اور جہاں بعد میں کیا وہاں بعد میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ نمازی کو اختیار ہے خواہ سلام سے پہلے کرے یا بعد میں۔ دونوں طرح درست ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی سند

نماز کے احکام 241

میں اختلاف ہے اور اسماعیل بن عیاش متکلم فیہ ہے۔ جب یہ شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور یہ روایت بھی شامیوں سے ہے اور ایک اور راوی ابوبکر بن عیاش اس میں ضعیف ہے۔ امام اثرم نے تو فرمایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ذوالیدین کی حدیث اس کے برعکس ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

(۲۷۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَجَدْنَا مَعَ رَسُولِ إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ وَسُورَةُ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. سورة اقراء باسم ربك (سورة علق) میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدہ تلاوت کیا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے سجدہ تلاوت کا مشروع ہونا ثابت ہے۔ اس کی مشروعیت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے وجوب میں اختلاف آراء ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ سجدہ تلاوت مسنون ہے، واجب نہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ سجود قرآن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سورہ ص اور مفصل کی سورتوں میں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفصل سمیت چودہ سجدے ہیں۔ سورہ حج کے پہلے سجدے کے تو قائل ہیں مگر دوسرے کے قائل نہیں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک سورہ حج کے دونوں سجدوں سمیت کل پندرہ ہیں اور زیادہ وزنی اور قائل ترجیح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲۷۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: (ص) لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ، وَقَدْ رَأَيْتُ اَلْبَتَّةَ فِيْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كُو اس میں سجدہ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَسْجُدُ فِيْهَا. رَوَاهُ کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ص﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ سورہ ص میں سجدہ تلاوت ہے۔ ﴿لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ﴾ یعنی یہ ان سجدوں میں سے نہیں ہے جن کے کرنے کیلئے تاکید کی گئی ہے، بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام سے جس سجدے کے کرنے کا ذکر ہے، اس میں صرف خبر و اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی اقتداء کے طور پر سجدہ کیا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿فَبَهَذَا هُمْ اَقْتَدَوْا﴾ (ان کی راہ راست کی اقتداء کر) کی تعمیل میں۔ اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ مسنون اعمال میں بعض کی زیادہ تاکید ہے اور بعض کی کم۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ سورہ ص میں تو آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا ہے، البتہ آپؐ نے اس کا حکم نہیں فرمایا اور اس کی تاکید نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال اگرچہ مسنون ہیں، مگر ان کے بارے میں تاکید نہیں۔ وہ بھی سنت خیر الانام کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۲۷۲) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورہ نجم میں سجدہ تلاوت کیا۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سے سورہ نجم کا سجدہ مشروع ہے۔ جو مفصل میں سجدہ تلاوت کے قائل نہیں انہیں غور کرنا چاہئے۔

(۲۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَرَأْتُ عَلَى نَبِيِّ ﷺ كُفْرًا رَوِيهِ رُوِيَ عَنْهُ النَّبِيُّ ﷺ النَّجْمَ، فَلَمْ يَسْجُدْ فِيهَا. آپؐ نے اس میں سجدہ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نبی کریم ﷺ کا سورہ نجم میں سجدہ نہ کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ النجم کا سجدہ مشروع نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ اس میں کبھی سجدہ آپؐ نے چھوڑ بھی دیا ہے۔ یہ سجود قرآن کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر واجب ہوتا تو پھر کبھی نہ چھوڑتے۔ کبھی کر لینا اور کبھی نہ کرنا ہی اس کے سنت ہونے کی کلی دلیل ہے۔ لہذا جسور کا مسلک ہی صحیح ہے۔

راوی حدیث: (زید بن ثابت رضی اللہ عنہ) ابوسعید ان کی کنیت تھی یا ابوخارجہ۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ وحی کی سب سے زیادہ کتابت یہی کیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ میں فرائض یعنی میراث کے بڑے ماہر تھے۔ خندق کا معرکہ وہ پہلا معرکہ ہے جس میں یہ شریک ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کی خدمت انہی نے انجام دی تھی اور عہد خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کی نقول بھی انہی نے تیار کی تھیں۔ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں یہود کا رسم الخط صرف پندرہ دن میں سکھ لیا تھا اور وہی آپؐ کے خطوط تحریر کیا کرتے تھے۔ کتابت کے بعد آپؐ کو پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ ۳۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مدینہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ وفات پائی۔

(۲۷۴) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: فَضَّلْتُ حج کو دو سجدہ تلاوت کی وجہ سے فضیلت دی گئی سُوْرَةُ الْحَجِّ بِسَجْدَتَيْنِ. رواہ أبو داؤد ہے۔ (اس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے) اور احمد فی المرابیل، ورواہ أحمد والنسائی مؤصلاً اور ترمذی نے عقبہ بن عامر کی حدیث سے اسے من حدیث عقبہ بن عامر، ورواہ: مَنْ لَمْ موصول قرار دیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے۔ جس

يَسْجُدُهَا فَلَا يَقْرَأُهَا. وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ. نے اس سورہ کے دونوں سجدے نہ کئے وہ اسے نہ

پڑھے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لعوی تشریح: ﴿فصلت﴾ غائب کا صیغہ ہے۔ تفضیل سے ماخوذ ہے۔ باب لفعیل ہے۔ مبنی للمفعول ہے۔ ﴿فی المراسیل﴾ سے مراد کتاب المراسیل ہے اور سنن کی کتب میں موصول بیان ہوئی ہے۔ ﴿ومن لم يسجدهما﴾ سورہ حج کے دونوں سجدے جس نے نہ کئے۔ ﴿فلا يقرأها﴾ تو پھر وہ سورہ حج نہ پڑھے اور اصول کی کتابوں میں تشنیہ کے ساتھ ہے یعنی ﴿فلا يقرأها﴾ یعنی دونوں آیات سجدہ نہ پڑھے۔ ﴿وسنده ضعيف﴾ اس کی سند میں ابن لھیع نامی راوی ہے اس لئے یہ ضعیف ہے۔ لیکن اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ شیخ عبد اللہ مبارک پوری نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجہ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو (مراعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح ج ۲ ص ۱۳۸۔ طبع اول) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو مراسیل ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ سنن ابی داؤد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورہ حج کے دونوں سجدے کرنے چاہئیں۔ نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ پھر اسے پڑھے ہی ناں۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے اور سجدہ تلاوت کرنا مسنون ہے۔ ترک سنت سے بہتر ہے کہ مستحب عمل ہی نہ کرے یعنی اس کی تلاوت نہ کرے، تاکہ ترک سنت کا مرتکب نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ، ابو درداء رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرامؓ سورہ حج میں دونوں سجدے کرتے تھے، اس لئے اس روایت کو ناقابل عمل کہنا غلط ہے۔

راوی حدیث: ﴿خالد بن معدان رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ کلاعی (کاف پر فتح) ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے۔ فقہاء تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہؓ سے ملاقات کی ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ یا ۱۰۸ھ میں ہوئی۔ معدان کے میم پر فتح اور عین ساکن ہے۔

(۲۷۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّا نَمُرُّ بِالسُّجُودِ، فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ أَصَابَ، وَمَنْ لَمْ يَسْجُدْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لوگو! ہم آیات سجدہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری) اور مؤطا میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا مگر قاری اگر چاہے تو کر سکتا

وَفِيهِ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَفْرِضِ السُّجُودَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ. وَهُوَ فِي الْمُوَطَّأِ.

لغوی تشریح: ﴿لَمْ يَفْرَضِ السُّجُودُ﴾ فرض، یفرض باب ضرب یضرب سے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اسے فرض نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس کی دلیل ہے کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

حاصل کلام: بعض نسخوں میں ان یشاء کی جگہ ان نشاء جمع کے صیغہ سے بھی منقول ہے (ہم چاہیں تو سجدہ کریں) یعنی قاری کو اختیار ہے، فرض و واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا۔ سامعین صحابہ سب خاموش رہے۔ اس سے اجماع سکوتی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز لم یفرض اور ان یشاء بھی اس کی تائید مزید ہے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ اہلحدیث بھی سجدہ تلاوت کو مسنون ہی قرار دیتے ہیں مگر احناف اسے واجب کہتے ہیں۔

(۲۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَفْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ، فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ، وَسَجَدْنَا مَعَهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ لَيْئٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے جب آیت سجدہ پر سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہی سجدہ کرتے۔ (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فِيهِ لَيْنٌ﴾ لام کے نیچے کسرہ اور ”ياء“ ساکن۔ معنی ضعف اور کمزوری، کیونکہ اس روایت کی سند میں عبد اللہ عمری ہے جو ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت کیلئے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرنا مشروع ہے۔ حاکم نے اس روایت کو عبید اللہ عمری کے حوالہ سے نقل کیا ہے جسے انہوں نے ثقہ کہا ہے اور اس حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے اور ابوداؤد کی روایت جسے متن میں بیان کیا گیا ہے عبد اللہ اکبر کی ہے، وہ ایک ضعیف راوی ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ سامع پر بھی سجدہ مشروع ہے خواہ نماز میں مصروف و مشغول ہو۔ سجدہ تلاوت کیلئے طہارت ضروری اور لازمی نہیں تاہم طہارت کا ہونا بہتر اور افضل ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، شعبی رحمہ اللہ اور ابن حزم رحمہ اللہ طہارت کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔ سجدہ تلاوت میں یہ دعا پڑھنی چاہئے: سجد وجہی للذی خلقہ وصورہ وشفق سمعہ وبصرہ وبحولہ وقوتہ ”میرا سر اس ذات کے سامنے جھک گیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت دی اور اسکو سماعت عطاء کی اور بینائی سے نوازا۔ طاقت و قوت بھی عنایت کی۔“ اور ایک روایت میں فتبارک اللہ واحسن الخالقین بھی منقول ہے۔

(۲۷۷) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ يَسْرُهُ خَرَّ سَاجِدًا لِلَّهِ. رَوَاهُ الْحَمَمَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ.

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی خوشخبری ملتی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑتے۔ (نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿یسرہ﴾ ایسا کام جو آپؐ کی خوشی، فرحت و سرور اور بشارت کا باعث ہوتا۔ ﴿خو﴾ گر پڑتے۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی نعمت کے حصول اور ناپسندیدہ کام سے بچنے کے موقع پر سجدے میں گر پڑتے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے سجدوں کیلئے با وضو ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے طہارت شرط نہیں۔

حاصل کلام: کسی نئی نعمت کے حاصل ہونے پر، کسی مصیبت سے بچ نکلنے پر، کسی خوشی و مسرت کے موقع پر سجدہ شکر بجالانا شریعت سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں اور نہ مکروہ۔ حدیث سے تائید امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی ہوتی ہے۔

(۲۷۸) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَطَالَ السُّجُودَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَقَالَ: إِنَّ جِبْرِيلَ أَتَانِي، فَبَشَّرَنِي، فَسَجَدْتُ لِلَّهِ شُكْرًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا پھر سجدے سے سر اٹھا کر فرمایا کہ ”ابھی جبریلؑ ایک خوشخبری لے کر میرے پاس آئے تو وہ مرثدہ سن کر میں نے اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: سند احمد میں یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اور اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ بشارت اور خوشخبری یہ تھی کہ جو شخص حضور ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں اپنی طرف سے نازل فرمائے گا۔ یہ خوش کن اطلاع پا کر حضور ﷺ سجدہ میں گر پڑے اور شکر یہ ادا کیا۔ لہذا جب کسی کو ایسا موقع پیش آجائے تو اسے بھی سجدہ شکر ادا کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ قریش کے زہرہ قبیلہ سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی دونوں جہزوں میں شریک تھے۔ بدر واحد کے علاوہ باقی سب غزوات وغیرہ میں شامل رہے۔ ان کا شمار ان خوش قسمت دس انسانوں میں ہوتا ہے جنہیں رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ ان چھ افراد میں سے ایک تھے جنہیں خلیفہ ثانی حضرت عمر رحمہ اللہ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے نامزد فرمایا تھا۔ عہد نبوی میں انہوں نے ایک مرتبہ چار ہزار اور پھر چالیس ہزار دینار صدقہ و خیرات کئے پھر انہوں نے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جماد کیلئے پیش کئے۔ امہات المؤمنینؓ کیلئے اپنے ایک حصہ کی وصیت کی کہ ان کی نذر کر دیا جائے، اس کی بعد میں قیمت لگوائی گئی تو وہ چار لاکھ دینار تھی۔ ۳۴ھ میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

(۲۷۹) وَعَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ سَجَدَ لِي سَجْدَةً، سَجَدْتُ لَهُ سَجْدَةً. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت براء بن عازب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو یمن کی طرف بھیجا۔

بَعَثَ عَلِيًّا إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ. قَالَ: فَكُتِبَ عَلَيَّ بِإِسْلَامِهِمْ، فَلَمَّا قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْكِتَابَ خَرَّ سَاجِدًا، شُكْرًا لِلَّهِ عَلَى ذَلِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَأَضْلَعَهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

راوی نے حدیث بیان کی جس میں اس نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کے اسلام میں داخل ہونے کی روداد حضور ﷺ کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وہ مکتوب پڑھا تو آپ اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ ریز ہو گئے۔ (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے)

حاصل کلام: آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں اہل یمن کے اسلام قبول کرنے پر سجدہ شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ باعث خوشی اور مقام مسرت ہے اور یہ بھی ایک عظیم نعمت الہی ہے اس لئے بطور شکر یہ سجدہ شکر بجالانا مشروع ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی کثرت تعداد باعث مسرت اور موجب انبساط ہوا کرتی تھی اور ایک یہ دور ہے کہ مسلمان بچوں کی پیدائش روکنے کی شب و روز سکیمیں اور عملی تدبیریں بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زور و شور سے اس مہم کو چلایا جا رہا ہے اور کروڑوں روپیہ اسے کامیاب بنانے پر صرف کئے جا رہے ہیں۔

نفل نماز کا بیان

۹ - باب صَلَاةِ التَّطَوُّعِ

(۲۸۰) عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ كَعْبٍ الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «سَلْ»، فَقُلْتُ: أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الْجَنَّةِ، فَقَالَ: «أَوْ غَيْرَ ذَلِكَ؟» فَقُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: «فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ نے مجھے (مخاطب کر کے) فرمایا ”مانگ لے (جو کچھ مانگنا ہے)“ میں نے عرض کیا میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ آپ نے فرمایا ”کچھ اس کے علاوہ مزید بھی۔“ میں نے عرض کیا بس وہی مطلوب ہے۔ آپ نے فرمایا ”تو پھر اپنے مطلب کے حصول کیلئے کثرت سجدہ سے میری مدد کر۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة التطوع﴾ یعنی نفلی نماز۔ اور نفلی عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے ہی کوئی عبادت کرے جو کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے فرض نہیں کی گئی۔ ﴿سل﴾ سوال سے صیغہ امر ہے۔ معنی ہے کہ طلب کرو، مانگو۔ ﴿مرافقتک﴾ رفاقت و مصاحبت۔ ﴿فاعنی﴾ یہ ”اعانہ“ سے امر کا صیغہ ہے اور اس میں ”یا“ یا مکمل ہے۔ ﴿علی نفسک﴾ یعنی اپنے جی کی خواہش و مراد

کے حصول کیلئے۔ ﴿بِكُثْرَةِ السُّجُودِ﴾ سجدہ سے یہاں نفل نماز مراد ہے۔ بعض نوافل کثرت سے پڑھا کر۔ سجدہ کی کثرت تو کثرت نماز کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کثرت یا قلت تو نفل نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔ (فرائض میں تو کی بیشی ناممکن ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سجدہ سے مراد نفل نماز ہی ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ کو سارے ارکان نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ سجدہ تقرب الہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرب الہی اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کیلئے کثرت سے نوافل ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو اتباع سنت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر نوافل سے اتنی رغبت نہیں جتنی تاکید ان کے بارے میں معلوم ہوتی ہے اور کچھ لوگ تو زبانی عاشق رسول ہونے کے دعویدار ہیں مگر نفل تو کچا فرائض بھی نہیں پڑھتے، رہتے پھر بھی وہ عاشق رسول ہی ہیں بلکہ نادان اور بے علم و جاہل لوگوں نے ان کو رتبہ ولایت پر بٹھا رکھا ہے جنہوں نے کبھی نماز پڑھ کر نہ دیکھی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابو فراس ان کی کنیت ہے۔ اسلم قبیلہ سے تھے اس لئے اسلمی کہلائے۔ اصحاب صفہ میں سے تھے، مدینہ کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضور میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكَعَاتٍ: رَكَعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرَبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكَعَتَيْنِ قَبْلَ الصُّبْحِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا: وَرَكَعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ فِي بَيْتِهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی ﷺ کی دس رکعتیں یاد ہیں۔ دو رکعتیں ظہر کی نماز سے پہلے اور دو بعد میں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر پر ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح دو رکعتیں عشاء کی فرض نماز کے بعد گھر پر اور دو رکعتیں صبح سے پہلے۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں یہ بھی ہے کہ دو رکعتیں نماز جمعہ کی (فرض) نماز کے بعد گھر پر پڑھتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ لَا يُصَلِّي إِلَّا رَكَعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

اور مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ صبح صادق کے بعد صرف ہلکی سی دو رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کی صرف دو رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور دو رکعتیں بعد کی ثابت ہوتی ہیں اور دوسری حدیث سے چار پہلے اور دو بعد میں کا ثبوت بھی موجود ہے۔

(۲۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَزِيدُ فِي رَكَعَاتِهِ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ. وَرَكَعَتَيْنِ. چھوٹیں اور دو رَكَعَتیں نماز فجر کی بھی نہیں قَبْلَ الْغَدَاةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. چھوٹیں۔ (بخاری)

لعنوی تشریح: ﴿لا یدع﴾ نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ جملہ بیہنگی اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ بہر حال اس سے مراد یہ ہے کہ ان رکعات کو بکثرت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ﴿اربعاً قبل الظهر﴾ ظہر سے قبل چار رکعتیں۔ یہ اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کے خلاف ہے (اس میں دو رکعتوں کا ذکر ہے اور اس میں چار کا) دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ آپؐ نے کبھی ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو ادا فرمائی ہیں۔ اس جگہ صرف دونوں صورتوں کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ کی خبر دی گئی ہے کہ آپؐ کا طرز عمل دونوں طرح تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنن رواتب میں سے نہیں بلکہ یہ تو زوال کا سایہ ڈھلنے کے وقت کی نماز تھی اور یہ ایسی گھڑی تھی جس میں آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف نظر رحمت سے دیکھتا ہے جیسا کہ بزار نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ جب یہ نماز گھر پر ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب ان کو مسجد میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ راوی نے جو کچھ جس شکل میں ملاحظہ کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے۔ پہلی صورت بہتر اور عمدہ ہے۔ ﴿قبل الغداة﴾ نماز فجر سے پہلے۔

حاصل کلام: روز و شب میں نبی کریم ﷺ فرائض کے علاوہ کچھ نوافل بھی ادا فرمایا کرتے تھے جن کا زیادہ اہتمام فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ ان کو سنت مؤکدہ اور جن پر دوام اور بیہنگی نہیں فرمائی ان کو سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا نام دے دیا گیا۔ ہیں یہ سب نوافل ہی۔ اس حدیث میں ظہر کے فرائض سے پہلے چار رکعت کا ذکر ہے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو پہلے گزری ہے دو رکعتیں پہلے اور دو بعد میں ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں میں تطبیق کی صورت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر سے قبل دو رکعتیں قابل ترجیح ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چار رکعات قابل ترجیح ہے۔ اس سلسلہ کی ساری روایات سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا عمل دونوں طرح تھا۔ اس کے باوجود چار پڑھنا دو کے مقابلہ میں زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

(۲۸۳) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ عَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنْ النَّبِيُّ ﷺ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نوافل میں سے سب سے زیادہ عَلَى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُداً اہتمام فجر کی دو سنتوں کا رکھتے تھے۔ (بخاری و مسلم) مِنْهُ عَلَى رَكْعَتَيْ الْفَجْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. اور مسلم میں ہے کہ نماز فجر کی دو (رکعتیں) (سنتیں) وَلِمُسْلِمٍ: «رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنْ دُنْيَا وَمَا فِيهَا سَابِقَةٌ»۔

لغوی تشریح: ﴿علیٰ شئی﴾ کسی چیز کی اتنی حفاظت نہیں کرتے۔ ﴿اشد﴾ اکثر کے معنی میں یعنی بہت زیادہ۔ کثرت کے ساتھ۔ گرائمر میں یہ یا تو لم یکن کی خبر واقع ہو رہا ہے یا حال یا پھر مصدر اور اس صورت میں علیٰ شئی کی خبر ہوگی۔ ﴿تعاهدا﴾ تحفظ کرنے اور اہتمام کرنے کے معنی میں۔ ﴿منہ﴾ اس سے (معنی یہ ہے کہ آپ کے کسی چیز کا اہتمام و تحفظ کرنے کی بہ نسبت) یعنی نبی ﷺ کا فجر کی دو سنتوں پر التزام و دھیان دوسری سنتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس میں شک کی ذرا برابر گنجائش نہیں کہ حضور ﷺ نے سنن رواتب میں سے فجر کی دو سنتوں کا جتنا التزام فرمایا اتنا دوسری سنتوں کا اہتمام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضور سفر میں بھی انہیں کبھی نہیں چھوڑا۔ ان دو سنتوں کی اتنی تاکید کے پیش نظر احناف نے تو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود ان کو پہلے پڑھنا لازمی قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ صراحتاً حدیث کے مخالف ہے کیونکہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے دوسری کوئی نماز پڑھنا درست نہیں۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے کہ اذا اقيمت الصلوة فلا صلاة الا المكتوبة ”کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں۔“

(۲۸۴) وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ امِّ الْمُؤْمِنِينَ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ هَبَّ رُكْعَتَيْنِ عَشْرَةَ رُكْعَةً فِي يَوْمٍ صَلَّى اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رُكْعَةً فِي يَوْمٍ وَلَبَّيْهُ بَيْنَ بَيْتَيْ فِي الْجَنَّةِ». (مسلم) اور ایک روایت میں تطوعاً بھی ہے (نفل کے طور پر پڑھے) رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ: «تَطَوُّعًا»۔

اور ترمذی کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اتنا اضافہ بھی ہے کہ ”چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت بعد میں اور دو رکعت نماز مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت صبح کی نماز سے پہلے۔“

اور پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت کیا ہے کہ ”جس شخص نے ظہر کی پہلی چار رکعتوں کی حفاظت کی اور چار رکعت بعد میں باقاعدگی سے پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آتش جہنم پر حرام کر دیا۔“

لغوی تشریح: ﴿وَاللَّحْمَةُ عَنْهَا﴾ عنہا کی ضمیر راجع ہے حضرت ام حبیبہؓ کی طرف یعنی پانچوں نے ان کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے ﴿وَارْبَعٌ بَعْدَهَا﴾ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ دو سنتیں پڑھنے کے بعد چار مزید مراد ہوں یعنی ظہر کے بعد چار رکعات اور یہ بھی احتمال ہے کہ دو پہلے جو عام طور پر پڑھی جاتی ہیں اور دو مزید ان میں شامل کر لی جائیں تو یہ چار بن جائیں گی ﴿حَرَمَهُ اللّٰهُ﴾ تحریم سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کی آگ میں داخل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب و روز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان پر التزام کرنا چاہئے کیونکہ نبی ﷺ نے ان پر اہتمام فرمایا ہے۔ ظہر کی فرض نماز کے بعد دو کی بھی گنجائش اور چار کی بھی۔ چار کی فضیلت بڑی بیان ہوئی ہے اور اگر کوئی چھ پڑھ لیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ام حَبِيبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا﴾ ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں اور ہجرت حبشہ کرنے والوں میں شامل تھیں۔ ان کا شوہر عبید اللہ بن جحش بھی ان کے ساتھ تھا مگر وہ وہاں جا کر نصرانی بن گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ یہ نکاح کے وقت وہیں حبشہ ہی میں تھیں۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں۔ ۴۲ھ یا ۴۳ھ یا ۵۰ھ میں فوت ہوئیں۔

(۲۸۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «رَجِمَ اللّٰهُ أَمْرًا صَلَّى أَرْبَعًا» (اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا وَالْتَرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَصَحَّحَهُ.)
(ہے)

حاصل کلام: نماز عصر سے پہلے یہ چار رکعتیں سنن رواتب (مؤکدہ سنتیں) نہیں ہیں بلکہ نفل ہیں۔ اس کی فضیلت پر رحم اللہ امرا کے وعایہ کلمات دلالت کرتے ہیں کہ جو یہ چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

(۲۸۶) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: «صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ، صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ»، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: لِمَنْ شَاءَ، كَرَاهِيَةً أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً. رواه البخاري.
حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ مزیٰ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ”مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ مغرب سے پہلے نماز پڑھو پھر تیسری مرتبہ فرمایا یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو پڑھنا چاہے“ آپؐ نے یہ اس اندیشہ کے پیش نظر فرمایا کہ لوگ اسے سنت نہ بنا لیں۔“ (بخاری)

وَفِي رِوَايَةٍ لَابْنِ جَبَّانَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى قَبْلَ الْمَغْرَبِ رَكَعَتَيْنِ. مغرب سے پہلے دو رکعت ادا فرمائیں اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غروب شمس کے بعد (فرض نماز سے پہلے) دو رَكَعَت پڑھتے تھے اور نبی ﷺ ہمیں ملاحظہ فرما رہے ﷺ يَرَانَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا، وَلَمْ يَنْهَنَا. ہوتے تھے، نہ تو آپ ہمیں اس کا حکم دیتے اور نہ منع فرماتے۔

لغوی تشریح: ﴿لَمَنْ شَاءَ﴾ یعنی یہ حکم اس شخص کیلئے جو پڑھنا چاہے ﴿كَرَاهِيَةً﴾ تعلیل کی وجہ سے منسوب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ نے لَمَنْ شَاءَ اس لئے فرمایا کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا ﴿ان يَتَّخِذَهَا النَّاسُ﴾ کہ لوگ اسے چھ بنالیں۔ ﴿سَنَةً﴾ ہمیشہ کیلئے مسنون طریقہ اور اسے چھوڑنا ناپسند کریں۔ اس سے یہ معنی نہیں کہ آپ نے اس کے استحباب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو کام مستحب بھی نہ ہو اس کے لئے براگینجٹ کیا جائے اور اس میں ترغیب دی جائے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب ہے اور یہ حدیث قوی ہے اور جس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے وہ فعلی حدیث ہے اور جو روایت مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ تقریری ہے۔ پس مغرب سے پہلے نفل پڑھنا سنت کی تینوں قسموں (قوی، فعلی، تقریری) سے ثابت ہے اور صحیح مسلم کے حوالہ سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿فَلَمْ يَأْمُرْنَا﴾ آپ نے ہم کو اس کا حکم نہیں دیا تو یہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایات کے منافی ہے۔ جنہیں ان کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ حکم کی روایت نہ ملی ہو یا ان کا اس سے مراد تاکید کی حکم ہو۔

حاصل کلام: مغرب کے فرضوں سے پہلے دو گانہ پڑھنا سنن زائدہ میں شمار ہوتا ہے۔ سنن موکدہ میں نہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن مغفل مزیٰ رضی اللہ عنہ﴾ مزیہ قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر مزیٰ کہلائے۔ مغفل میں میم پر ضمہ، غین پر فتح اور "فاء" پر فتح اور تشدید۔ یہ اصحاب شجر میں شمار کئے گئے ہیں۔ پہلے مدینہ میں رہائش رکھی۔ بعد ازاں مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ان دس اصحابؓ میں شامل تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو تعلیم دینے کیلئے بھیجا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز نَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فَجْرًا سے پہلے دو رکعت ہلکی پڑھتے تھے۔ میں خیال کرتی يُحَفِّفُ الرَّكَعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةٍ کہ کیا آپ نے صرف ام الکتاب (فاتحہ) ہی پڑھی

لغوی تشریح: ﴿اقرا﴾ اس میں مرہہ استفہام کیلئے اور یہاں شک و تردد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کیا آپؐ نے ام القرآن کو پڑھایا نہیں؟ اور یہ شک اس لئے واقع ہوا کہ اس میں آپؐ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ صبح کی دو سنتیں مختصر بلکی پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور علماء نے اسی بنا پر کہا ہے کہ ان دو رکعتوں میں مختصر قیام افضل ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان میں بھی لمبا قیام افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے دو تلامذہ امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے بھی ان کی مخالفت کی۔ سورۃ فاتحہ کے علاوہ آپؐ چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے۔

(۲۸۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ فِي
رُكْعَتَيْ الْفَجْرِ «قُلْ يَا أَيُّهَا
الْكَافِرُونَ، وَ «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ».
رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے
نجر کی دو رکعتوں میں سے پہلی میں قل یا ایہا
الکفرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد
پڑھی۔ (مسلم)

حاصل کلام: ان دو رکعتوں میں ان دونوں سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ اتباع سنت کے جذبہ کے تحت ان کو پڑھنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری کوئی سورۃ پڑھنا ممنوع ہے۔

(۲۸۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكَعَتَيْ الْفَجْرِ أَضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز فجر کی دو رکعت سنت پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے۔ (بخاری)

غفری تشریح: ﴿علی شقہ﴾ پہلو کے بل۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کو ادا کر کے آپؐ اپنے دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں آپؐ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

(۲۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ الرَّكَعَتَيْنِ

قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيُضْطَجِعْ عَلَى كَعْبِ لَيْثٍ جَانِبَيْهِ۔“ (اس حدیث کو احمد، ابوداؤد جَنِبِ الْاَيْمَنِ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابُو دَاوُدَ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے) وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ۔

حاصل کلام: ان دو احادیث سے فجر کی سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں پہلو پر تھوڑا سالیٹ کر استراحت حاصل کرنا مسنون ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے حضور ﷺ کا عمل اور دوسری سے آپؐ کا حکم ثابت ہے۔ اس بنا پر اہل الظواہر کے نزدیک یہ لیٹنا واجب ہے جو نمازی اس پر دیدہ دانستہ عمل نہیں کرتا اس کی نماز فجر نہیں ہوتی۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ بعض نے اسے مکروہ سمجھا ہے مگر صحیح حدیث کے مقابلے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا سنت کی بنا پر نہ تھا۔ آپؐ چونکہ رات کو طویل قیام کرتے اس لئے سنتوں کے بعد استراحت کے لئے تھوڑا سالیٹ جاتے۔ لیکن یہ ان کا قول سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس مسئلے پر شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق ڈیلوی رحمہ اللہ نے ”اعلان اہل العصر باحکام رکعتی الفجر“ میں بڑی تفصیل سے قابل دید بحث کی ہے بلکہ صبح کی سنتوں کے متعلق سب مسائل کے حل کیلئے اس رسالہ سے کوئی صاحب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(۲۹۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمْ الصُّبْحَ صَلَّى رَكْعَةً وَاحِدَةً، تُؤْتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلَّى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْحَنَفِيِّ - وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ - بِلَفْظِ «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى». وَقَالَ الشَّافِعِيُّ: مَذَابُ خَطَا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”رات کی نماز دو دو رکعت کی صورت میں (پڑھی جائے) اور جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع ہونے کا خدشہ و اندیشہ لاحق ہونے لگے تو (آخر میں) ایک رکعت پڑھ لے۔ پہلے پڑھی ہوئی اس کی ساری نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔“ (بخاری و مسلم۔ اور پانچوں احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے)

اور ابن حبان نے صلاة الليل والنهار مثنیٰ مثنیٰ ”دن رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔“ کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ نسائی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿مثنیٰ مثنیٰ﴾ دو دو رکعتیں۔ یعنی ہر دو رکعت کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا جائے۔ ﴿توتر له ما قد صلى﴾ اس کی ادا شدہ نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔ ﴿هذا خطأ﴾ یعنی روایت میں

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اوقات میں پڑھی جانے والی نماز کو دو، دو رکعتوں کی صورت میں پڑھنا چاہئے اور دو کے بعد سلام پھیرنا چاہئے۔ امت کی غالب اکثریت نے اسی کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک بھی ثابت ہے بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک ہی ہے۔ لیکن احادیث سے تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ تک کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

جہاں تک امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے لفظ النہار (یعنی دن) کو خطا کرنے کا تعلق ہے۔ ان کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس لئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی سلسلہ الصبیحین میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دن ہو یا رات نوافل دو، دو کی تعداد میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ دو دو رکعتوں کے پڑھنے کی صورت میں درود اور بعد از درود دعائیں زیادہ مرتبہ پڑھی جائیں گی۔ اس لئے ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ویسے دن کو دو، دو کر کے پڑھے یا چار، چار دونوں طرح جائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دن کو چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا بھی ثابت ہے۔

ایک رکعت وتر پڑھنے کی صورت میں تو تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا۔ اگر تین بار زائد پڑھے تو کیا صورت ہوگی؟ احمد، نسائی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں تو صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ جب تین وتر پڑھتے تھے تو صرف آخری رکعت میں ہی تشہد پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ تین رکعت وتر پڑھے جائیں تو درمیان میں تشہد نہ پڑھا جائے مگر احناف رات کے وتروں کو مغرب کی تین رکعات پر قیاس کر کے دو مرتبہ تشہد پڑھنے کے قائل ہیں۔ حالانکہ وتروں کو مغرب کی نماز کی طرح پڑھنے کی ممانعت حدیث سے صراحتاً وارد ہے۔

(۲۹۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ،
رَاتٍ كِي نَمَازِ هِے۔» (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے تہجد کی نماز کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی فضیلت پر خود قرآن مجید کی شہادت کا واضح ثبوت ہے۔ کتب احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے بعد کوئی نماز افضل ہے؟ فرمایا رات کے آخری حصہ کی نماز۔ ترمذی میں عمرو بن عبسہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے پروردگار سے تمام اوقات سے زیادہ تقرب رات کے آخری حصہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بندگان خدا کو چاہئے کہ خواصان خاص کے زمرہ میں شامل

ہونے کیلئے شب بیداری کو اپنا معمول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بارگاہ رب العزت میں حاضری اور سرگوشی و مناجات کا سب سے اچھا موقع ہوتا ہے۔

(۲۹۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ حَدَّثَنَا أَبُو الْيُوسُفَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْوُتْرُ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ، مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ الْأَزْهَرِيُّ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَرَوَّجَهُ النَّسَائِيُّ وَفُتُّهُ.

حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”وتر ہر مسلمان پر حق ہے (اس کا ادا کرنا ضروری ہے) جسے پانچ وتر پڑھنا پسند ہو تو ایسا کرے اور جسے تین وتر پسند ہوں تو وہ اس طرح کرے اور جسے ایک وتر پڑھنا پسند ہو تو وہ ایسا کرے۔“ (ترمذی کے علاوہ اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے البتہ نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الوتر حق﴾ ثابت ہے۔ شریعت میں اس کا ثبوت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دادا نے المنتقى میں بیان کیا ہے کہ ابن منذر نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں۔ الوتر حق وليس بواجب کہ وتر برحق ہے مگر واجب نہیں اور یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس حدیث میں لفظ حق وتر کی مشروعیت پر دال ہے وجوب پر نہیں۔ لہذا جس نے لفظ ”حق“ کی بنیاد پر وتر کو واجب قرار دیا ہے اس کا یہ استدلال باطل ہے۔

حاصل کلام: وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے واجب کہتے ہیں مگر جمہور علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ ”وتر کا پڑھنا حق ہے“ کے الفاظ وجوب پر تو دلالت نہیں کرتے۔ البتہ اس کی اہمیت پر ضرور دال ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں بھی ہے الوتر حق فمن لم يوتر فليس منا ”وتر برحق ہے۔ جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں۔“ اس حدیث میں بھی وتروں کو پڑھنے کی تاکید بیان کی گئی ہے مگر وجوب کا بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے سفر و حضر میں وتر پڑھے ہیں اور سواری پر بھی سفر کے دوران وتر پڑھے ہیں جو اس کی دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وتر ایک، تین، پانچ سب درست ہیں۔ احناف کا صرف تین وتر پر اکتفا کرنا صحیح اور صریح روایات کی بنا پر درست نہیں۔

(۲۹۴) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الْوُتْرُ بِحَتْمٍ كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلَكِنْ سُنَّةٌ هِيَ رِسَالَةُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَقَرَهَا مَقَرٌّ مُقَرَّرٌ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وتر فرضوں کی طرح حتمی اور لازمی نہیں ہے بلکہ الوتر بحتم کھینچنے کی طرح ہے، لیکن سنت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔

غلوئی تشریح: ﴿یس بحتم﴾ حتم کے معنی واجب اور ضروری کے ہیں۔ ﴿کھیشۃ المکتوبۃ﴾ فرض نماز کی طرح لازمی نہیں۔

(۲۹۵) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَامَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، ثُمَّ انْتَبَرُوهُ مِنَ الْقَابِلَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ، وَقَالَ: إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الْوِتْرُ. رَوَاهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت جابر رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان میں قیام فرمایا پھر اگلے دن کیلئے صحابہ آپ کا انتظار کرتے رہے اور آپ حجرت سے باہر تشریف نہ لائے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ وتر کی نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ (اس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿القبائلہ﴾ آئندہ آنے والی رات۔ ﴿ان یکتب﴾ فرض قرار دے دی جائے۔ یکتب یہاں مجہول واقع ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شب معراج میں جب اللہ نے پانچ نمازیں فرض قرار دے کر ثواب پچاس کے برابر رکھا اور فرمایا کہ میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاتی تو خوف اور اندیشہ کس بات کا لاحق ہوا؟ مصنف علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح بخاری میں اس کے تین جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے: آپ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ نوافل جن کا رات کے اوقات میں ادا کرنا صحیح ہے کہیں ایسا نہ ہو نماز تہجد کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا مقرر کر دیا جائے یا یہ خوف لاحق ہوا کہ قیام اللیل کو فرض عین کی طرح نہ سہی بہر حال فرض کفایہ کے طور پر لازمی قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ نماز عید کے سلسلہ میں لوگوں نے کہا ہے یا پھر یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ قیام رمضان کو خصوصی طور پر فرض نہ کر دیا جائے اور اس صورت میں یہ پانچ نمازوں پر ایک زائد نماز نہ ہوئی کیونکہ سال بھر میں قیام رمضان ہر روز تو بار بار نہیں کیا جاتا۔ پھر مصنف نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری دانست میں متیوں جوابات میں سے پہلا جواب ہی قوی ہے اور یہ حدیث نماز تراویح باجماعت پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اندیشہ مذکور کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مصنف نے اس حدیث کو یہاں یہ بتانے کیلئے بیان کیا ہے کہ وتر واجب نہیں۔ ضمناً یہ مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ علم غیب نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ کو علم غیب ہوتا تو اندیشہ

(۲۹۶) وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ حَذَافَةَ حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی جو تمہارے لئے بِصَلَاةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ سِرْخِ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔“ ہم نے عرض کیا النَّعَمَ، قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا اللہ؟ قَالَ: «الْوُتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ وَتَرِ نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ». رَوَاهُ ہے۔“ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اس کی مانند روایت نقل کی ہے) شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ نَحْوَهُ۔

نفوی تشریح: ﴿امدکم﴾ امداد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تمہاری مدد فرمائی ﴿بصلۃ﴾ ایک نماز سے۔ یعنی تمہارے لئے ایک اور نماز کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی اس کی دلیل ہے کہ وہ نماز لازم نہیں۔ اگر یہ واجب ہوتی تو عبارت بھی وجوب و التزام والی ہوتی۔ ﴿حمر النعم﴾ ”حما“ پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع ہے اور نعم نون اور عین دونوں پر فتح۔ چوپایہ جانور کے معنی میں اور یہاں اس سے مراد اونٹ ہے اور اہل عرب کے نزدیک اونٹ ان کے اموال میں عزیز ترین اور معزز مال شمار ہوتا تھا۔

حاصل کلام: امداد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے چیز تو موجود ہے اسے تقویت دینے کیلئے مدد دی ہے۔ اصل اور امدادی چیز کی شان یکساں تو نہ ہوگی اور نماز کو سرخ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ﴾ خارجہ بن حذافہ قرشی عدوی۔ (حذافہ کے حاء پر ضمہ اور ازال پر تخفیف)۔ یہ اتنے شجاع تھے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تین ہزار شہ سواروں کی مدد طلب کی تو انہوں نے اس کے جواب میں تین بہادر و شجاع آدمی بھیج دیے جن میں ایک زبیر بن عوامؓ دوسرے مقداد بن اسودؓ اور تیسرے خارجہ بن حذافہؓ تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر مصر کے قاضی بنے۔ ۴۰ھ میں رمضان المبارک میں قتل ہوئے۔ انہیں ایک خارجی نے عمرو بن عاصؓ سمجھ کر قتل کیا تھا کیونکہ خوارج نے حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو بیک وقت قتل کرنے کی سازش کی تھی۔

﴿عمرو بن شعيب﴾ ابو ابراہیم ان کی کنیت تھی۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن عاص سہمی

قرشی مدنی۔ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ نسائی نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔
 ﴿شعیب﴾ ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جن کا نام محمد تھا ان کے زمانہ صغریٰ میں وفات پا گئے تھے تو ان کی کفالت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے کی۔ اس سے ان کا سماع صحیح ہے۔ یہ اسناد نہ تو مرسل ہے اور نہ منقطع بلکہ متصل ہے اور حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے۔ ان کے دادا کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲۹۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت
 عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”وتر برحق
 قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْوُتْرُ ہے جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق
 حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا». نہیں۔“ (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ نقل کیا ہے
 أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ لَيْئِنٍ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے احمد کے نزدیک اس کا شاید
 وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى بھی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر وہ ضعیف
 عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ. ہے)

لعوی تشریح: ﴿الوتر حق﴾ حق کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں کہ یہ لفظ وجوب پر دلالت نہیں کرتا ﴿فمن لم یوتر فلیس منا﴾ جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نے اس سے وتر کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ابوالمنیب عبید اللہ بن عبداللہ عتکی متکلم فیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے بلکہ امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے یعنی یہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے مرفوع حدیث نہیں۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کیونکہ خلیل بن مرة عن معاویہ بن قرۃ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور معاویہ بن قرۃ کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس نے تو ان سے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس لئے یہ منقطع روایت ہے اور خلیل بن مرة بذات خود منکر حدیث ہے۔ لہذا یہ حدیث اور اس کی شاہد حدیث، دونوں ہی احتجاج کے لائق نہیں اور ان احادیث صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو وتر کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابھی ایک حدیث کے تحت ”الوتر حق“ کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد وتر کی اہمیت ہے اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو سل ہے۔ مروی منعب قضاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اور ثقہ تابعین میں شمار کئے گئے۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر میں سے تھے۔ ۱۱۵ھ میں مروی میں فوت ہوئے۔

(۲۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ
 تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے

اللہ ﷻ یَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطَوْلِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعًا، فَلَا تَسْأَلُ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطَوْلِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثًا، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُؤْتِرَ؟ قَالَ: يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ، وَلَا يَنَامُ قَلْبِي. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

زائد نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں ایسی حسن خوبی سے ادا فرماتے تھے کہ ان کے حسن اور طوالت کا کیا کہنا۔ پھر چار رکعات ادا فرماتے بس ان کی خوبی اور طوالت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ وتر ادا کئے بغیر سو جاتے ہیں۔ فرمایا ”عائشہ (رضی اللہ عنہا) میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔“ (بخاری و مسلم)

وَفِي رَوَايَةٍ لَّهُمَا عَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ عَشْرَ رَكْعَاتٍ، وَيُؤْتِرُ بِسَجْدَةٍ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتِي الْفَجْرِ، فَبَلَكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ.

اور بخاری و مسلم دونوں کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رات کو آپ دس رکعتیں پڑھتے تھے اور بعد میں ایک وتر اور اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں۔ یہ سب ملا کر کل تیرہ رکعتیں ہوتیں۔

لغوی تشریح: ﴿ماکان بزید الخ﴾ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی مسنون ہے اور بس۔ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی چیز ہے۔ ﴿یصلی اربعاً﴾ بظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چاروں رکعتوں کو مسلسل ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ آپ دو رکعت پڑھتے۔ چار کے بعد کچھ توقف کرتے اس لئے انہیں چار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا رات کی نماز دو رکعت ہے تو اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿فلا تسال عن حسنهن وطولهن﴾ دریافت کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہاں نئی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود نماز کی تعریف کرنا ہے اور یہ انتہائی عمدہ و بہترین اور طوالت سے کنایہ ہے۔ ﴿اتنام قبل ان تؤتر﴾ اس میں مہمرہ استفہام کیلئے ہے۔ گویا آپ آٹھ رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر تین وتر ادا فرماتے بغیر اس کے کہ سونے کے بعد اٹھنے کے وقت وضو فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہو گا کہ نیند نواقض وضو میں سے ہے اس لئے انہوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا، جس کا جواب آپ نے ان کو ﴿ان عینی﴾ کے فقرے میں دیا۔ عینی نون پر فتح اور ”یا“ پر فتح اور تشدید عین کا تشبیہ ہے اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور معنی یہ ہیں حدث اگر واقع ہو تو اس کا تعین ہو جاتا ہے کیونکہ میرا دل بیدار رہتا ہے سوتا نہیں اور مجرد نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ تو ہوا کے خارج ہونے

کے احتمال کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا گمان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوتے ہیں: (۱) نبی ﷺ کا دل نہیں سوتا صرف آنکھیں سوتی تھیں اور یہ آپ کی خصوصیت تھی بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انبیاء کے دل جاگتے اور آنکھیں سوتی ہیں۔ (۲) گہری نیند جس میں دل غافل ہو جائے ناقض وضو ہے۔ (۳) نماز تہجد عمدہ طریقے پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہئے۔ (۴) ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی پڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ آپ یہ نماز گہری میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے وہ اعمال جو آپ عموماً گھر میں سرانجام دیتے تھے بالخصوص رات کے ان کی صحیح خرائل خانہ ہی کو صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔

میں رکعت تراویح کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور طبرانی نے ابوشیبہ، ابراہیم بن عثمان، عن الحكم، عن مقسم، عن ابن عباس کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں، وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ ابوشیبہ کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ، ابن معین رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، امام مسلم رحمہ اللہ، ابوداؤد رحمہ اللہ، ترمذی رحمہ اللہ اور نسائی رحمہ اللہ سبھی کی یہ رائے ہے کہ یہ شخص ضعیف ہے۔ شعبہ نے تو اسے کذاب قرار دیا ہے۔ اس کے مقابل صحیح مرفوع روایات میں آٹھ رکعت تراویح کا ذکر ہے۔ اس لئے تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں کہا ہے کہ تراویح کی مسنون تعداد تو آٹھ رکعات ہے اور اس سے زائد مستحب اور نفل ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد انور کاشمیری رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ”عرف الثدی“ میں کہا ہے کہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت پڑھی ہیں اور کسی روایت سے یہ بھی ثابت نہیں کہ آپ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ (۵) اس حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز تہجد کی دس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور آخر میں ایک وتر پڑھا یوں یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ (۶) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے کبھی تیرہ رکعت بھی پڑھیں ہیں۔ جس میں آٹھ نفل اور پانچ وتر پڑھتے تھے۔

(۲۹۹) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ ﷻ رات کو تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے۔ ان میں يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وٹروں میں تشہد کیلئے رُكْعَةً، يُؤْتِرُ مِنْ ذَلِكَ بِخَمْسٍ، لَا صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔ يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ إِلَّا فِي آخِرِهَا۔

لغوی تشریح: ﴿لَا يَجْلِسُ فِي شَيْءٍ﴾ کہ پانچ وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت کے بعد نہ بیٹھتے یعنی پانچوں رکعت متصل پڑھتے تھے درمیان میں تشہد نہیں پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے

اتحاد کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو صرف تین رکعات کے تعین پر ہی اصرار کرتے اور درمیان میں تشدد پڑھتے ہیں۔

(۳۰۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عَنْهَا قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ ﷺ نے رات کے ہر حصے میں وتر پڑھا ہے اور آپ ﷺ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَأَنْتَهَى وَتَرَهُ إِلَى کے وتر پڑھنے کی انتہا سحر تک تھی۔ (دونوں روایتوں کو السَّحْرِ. نَقَّحَ عَلَيْهِمَا. بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السحر﴾ سحر سے مراد صبح کاذب ہے۔ یہ وہ سفیدی ہے جو مشرقی افق میں طلوع فجر سے پہلے سیدھے ستون کی مانند نظر آتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے وتر رات کے شروع اور وسط شب اور رات کے آخری حصہ میں پڑھے ہیں۔ ورتوں کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر طلوع فجر تک رہتا ہے جو لوگ نماز تہجد کے عادی ہوں انہیں وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنے چاہئیں اور جو سحری کے وقت اٹھ نہ سکتے ہوں وہ نماز عشاء کے بعد پڑھیں۔ کسی مجبوری اور عذر کی وجہ سے اگر وقت پر وتر نہ پڑھے جاسکیں تو فجر کی جماعت کھڑی ہونے تک انہیں پڑھ لے۔ ہاں! اگر سو جائے یا اسے یاد ہی نہ رہے تو جس وقت بیدار ہوا جس وقت یاد آئے پڑھ لے، اس کا یہی وقت ہے۔

(۳۰۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی عَنْ عَبْدِ الْعَاصِدِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا ”اے قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللَّهِ! فَلَانِ آدَمِي كِي طَرَحَ تَمَنَّهُ هُوَ جَانَا كِي وَهُ قِيَامَ عَبْدَ اللَّهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَانَ اللَّيْلُ كَرْتَا تَهَا پھر بعد میں اسے ترک کر دیا۔“ (بخاری يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ. فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ. و مسلم) نَقَّحَ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں مندوب ہے اور عمل خیر پر مداومت اور بیشکی پسندیدہ اور بہترین عمل ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب کسی مستحب و مندوب عمل کی عادت بنا لے تو پھر اس میں غفلت، تساہل اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے، اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب کوئی عمل شروع فرما لیتے تو اس پر دوام کر کے خواہ عمل معمولی سا ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کی بری عادت کسی دوسرے کے سامنے بیان کرنی ہو تو اس کا نام پس پردہ رکھا جائے۔ حضور ﷺ نے لَاتَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ فرمایا، اس شخص کا نام نہیں لیا۔ اس آدمی کا نام ظاہر نہ فرما کر پردہ پوشی فرمائی ہے۔

(۳۰۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَوْتَرُوا يَا أَهْلَ الْفُرْآنِ! فَإِنَّ اللَّهَ وَتَرٌ، يُحِبُّ الْوِتْرَ». (اسے پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روايت کیا ہے اور ابن خزيمه نے اسے صحيح قرار دیا ہے) رَوَاهُ الْحَنَسِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ.

لغوی تشریح: ﴿اوتروا﴾ یعنی وتر پڑھو۔ یہ امر واجب کیلئے نہیں بلکہ ترغیب کیلئے ہے۔ ﴿یا اهل القرآن﴾ سے مراد حفاظ قرآن ہیں اور یہ قہینہ ہے کہ وتر واجب نہیں، ورنہ محض اہل القرآن کو بالخصوص اسی کے پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ وتر سے مراد یہاں قیام اللیل ہے اور وتر بول کر اطلاق قیام اللیل پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں کے آخر میں پڑھے جاتے ہیں اور وتر باقی ساری نماز کو بھی وتر (طاق) بنا دیتے ہیں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے حفاظ قرآن کو ترغیب ہے کہ وہ قیام اللیل کا اہتمام کریں کیونکہ اس سے قرآن یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۳۰۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَأْتِيهِمْ فِي آخِرِ صَلَاتِهِمْ بِاللَّيْلِ أَوْتَرًا». (بخاری سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «اپنی رات کی آخری نماز کو وتر بناؤ۔» (بخاری) «اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ أَوْتَرًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث میں رات کی نماز کا آخری حصہ وتر بنانے کا امر واجب کیلئے نہیں بلکہ مندوب ہے۔ اگر کسی نے رات کے اول حصہ میں وتر پڑھا ہے پھر رات کے درمیان میں یا رات کے آخری حصہ میں جاگ اٹھا تو وہ جو چاہے پڑھے وتر کو نہ پڑھے یعنی جوڑا (شفع) بنانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اگر کوئی وتر کے ادا کرنے کے بعد دو رکعت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

(۳۰۴) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كُيَافَةً يَوْمَئِذٍ يَقُولُ: لَا وَتْرَانِي فِي رَاتٍ مِثْلَ رَاتِ ابْنِ مَرْثَدَةَ. (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحيح قرار دیا ہے) رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَانَ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک رات میں دو بار وتر نہیں پڑھنے چاہئے۔ بعض حضرات جو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر اول رات میں وتر پڑھے ہوں پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو تو

پہلے ایک رکعت پڑھ کر شفع بنا لے پھر نفل پڑھ کر آخر میں وتر پڑھ لے۔ یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ مزید تفصیل کیلئے امام مروزی رحمہ اللہ کی ”قیام اللیل“ ملاحظہ ہو۔

(۳۰۵) وَعَنْ أَبِي بَنْدٍ كَعْبٍ عَنْ حَضْرَةِ ابْنِ كَعْبٍ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُؤَيِّرُ «بِسَبْحِ اسْمِ رَبِّكَ الْأَعْلَى» وَقُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ» وَقُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ» - زَوَّاهُ أَخْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَزَادَ: وَلَا يُسَلَّمُ إِلَّا فِي آخِرِهِ»۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر کی صورت میں بالترتیب پہلی رکعت میں سبح اسم ربك الاعلیٰ اور ثانی رکعت میں قل یا ایہا الکفرون اور تیسری رکعت میں قل هو اللہ احد پڑھتے تھے۔ (اس کو احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے) اور نسائی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے ”اور سلام آخری رکعت میں پھرتے تھے۔“

وَلَا يُبْنِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ نَحْوَهُ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، سے اسی طرح روایت نقل کی ہے اور اس روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ تلاوت فرماتے تھے اور آخری رکعت میں قل هو اللہ احد اور «الْمُعَوَّذَتَيْنِ»۔

معوذتین پڑھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿کل سورۃ﴾ ہر رکعت میں ایک سورۃ - یعنی ایک رکعت میں ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ اور دوسری میں ”قل یا ایہا الکفرون“ مکمل سورت پڑھے ﴿فی رکعۃ﴾ سے مراد پہلی اور دوسری رکعت میں ﴿المعوذتین﴾ تعویذ سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہے۔ معوذتین کا اضافہ پہلی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی صرف سورۃ اخلاص پڑھ لیتے اور کبھی معوذتین بھی شامل فرما لیتے۔

حاصل کلام: حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر ادا فرمایا کرتے تھے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے اور آخری رکعت میں قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین وتر دو تشہد سے پڑھتے تھے۔ اگر احناف نے ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال واضح نہیں ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابومنذر ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ نجار سے ہونے کی وجہ سے انصاری، نجاری، خزرجی کہلائے۔ قراء کے سربراہ تھے اسی وجہ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کاتبین وحی میں سے تھے اور ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جمع قرآن کا شرف پایا۔ عمد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں فتویٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں

(۳۰۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
قَالَ: «أَوْتِرُوا قَبْلَ أَنْ تُضْبِحُوا».

وَرَوَاهُ مُسْلِمٌ. **وَلَا يَنْدِرُ جَبَّانٌ: مَنْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ**
وَلَمْ يُؤَيِّزْ، فَلَا وَتَرَّ لَهُ. اور ابن حبان میں ہے کہ ”جس کسی نے صبح تک
 وتر نہ پڑھے اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔“

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ وتر کا وقت صبح کے نمودار ہونے سے پہلے تک ہے۔ جب فجر طلوع ہوگئی تو ادائیگی وتر کا وقت نکل گیا "لا وتر لہ" کے معنی ہیں کہ اس کا وتر ادا نہیں ہوگا۔ رہا اس کی قضاء کا مسئلہ تو وہ جب اور جس وقت چاہے پڑھ سکتا ہے جس پر آئندہ آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔ وتر ہر وقت ادا کرنے کی بنا پر ہی آپؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا تھا کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ صبح اٹھ نہ سکیں انہیں چاہئے کہ عشاء کی نماز کے ساتھ وتر بھی پڑھ لیا کریں۔

(۳۰۷) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ نَامَ عَنِ الْوُتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيَبْصِلْ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَ». رَوَاهُ الْحَمَّصُ إِلَّا السَّامِيُّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو سو جائے بغیر وتر پڑھے یا اسے یاد نہ رہے ہوں تو اسے چاہئے کہ صبح کے وقت پڑھ لے یا پھر جب اسے یاد آئے۔“ (اسے سنائی

کے علاوہ یا نچوں نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وتر کسی بھی صورت پڑھنے سے رہ جائیں تو انہیں بہر صورت پڑھنا چاہئے۔ اس سے بھی نماز وتر کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(۳۰۸) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ خَافَ أَنْ لَا يَقُومَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ أَوَّلَهُ، وَمَنْ طَمِعَ أَنْ يَقُومَ آخِرَهُ فَلْيُوتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ، فَإِنَّ صَلَاةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُودَةٌ، وَذَلِكَ

أَفْضَلُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. پڑھنے چاہئیں کیونکہ رات کے آخری حصہ کی نماز

میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ بہت بہتر ہے۔“
(مسلم)

لعنوی تشرح: ﴿مشہودہ﴾ یعنی رات کی نماز کے وقت شب و روز کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی مخلوق ہیں۔ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے
ہیں اور ان کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ نیز ثابت ہوتا ہے کہ وتر آخری رکعت میں پڑھنے افضل ہیں
بشرطیکہ شب بیداری کی عادت ہو ورنہ پہلی رات پڑھ کر ہی سونا چاہئے۔

(۳۰۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ، فَقَدْ ذَهَبَ وَقْتُ كُلِّ صَلَاةٍ اللَّيْلِ، وَالْوُتْرِ، فَأَوْتِرُوا» (ختم ہو جاتا ہے) لئلا تم طلوع فجر سے پہلے پہلے
قَبْلَ طُلُوعِ الْفَجْرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ. وتر پڑھ لیا کرو۔“ (ترمذی)

لعنوی تشرح: ﴿کل صلاة اللیل﴾ رات کی ہر نماز سے مراد وہ نوافل ہیں جو مشروع ہیں یعنی جن
نوافل کو ادا کیا جانا شریعت محمدیہ سے ثابت ہو۔ ﴿الوتر﴾ یہ رفعی صورت میں ہے۔ اس کا عطف
”کل“ پر ہوگا یعنی رات کی ہر نماز اور وتر بھی۔ یہاں وتر کے مزید مقام و مرتبہ کی بنا پر یہاں خاص کا عام پر
عطف ہے۔

(۳۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى أَرْبَعًا، وَيَزِيدُ مَا شَاءَ اللَّهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں
ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کیا رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ کی چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور جتنی اللہ چاہتا زیادہ بھی کرتے تھے۔
(مسلم)

وَلَهُ عَنْهَا أَنَّهَا سُئِلَتْ: هَلْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى؟ قَالَتْ: لَا إِلَّا أَنْ يَجِيءَ مِنْ مَغِيْبِهِ.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز ضحیٰ پڑھتے
کبھی نہیں دیکھا اس کے باوجود میں یہ نوافل پڑھتی

ہوں۔

لغوی تشریح: ﴿کان بصلی الضحی﴾ اس مقام پر کان استمرار کا معنی نہیں دے رہا کہ آپؐ نماز ضحیٰ ہمیشہ بلا تاخیر ادا فرماتے رہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ضحیٰ کے نوافل پڑھتے تو ان کی تعداد چار ہوتی جہاں تک نماز ضحیٰ کا تعلق ہے وہ تو نفل نماز ہے، مستحب ہے جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے بارے میں نبی ﷺ سے بارہ رکعتوں سے زیادہ کچھ بھی مروی نہیں ہے ﴿مغیبة﴾ اپنے سفر سے واپسی۔ ﴿سبحہ الضحی﴾ سین پر ضمہ اور ”با“ ساکن یعنی نماز ضحیٰ کے نوافل ﴿وانی لاسبحھا﴾ تسبیح سے ماخوذ ہے یعنی میں صلاۃ ضحیٰ پڑھتی ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل باوجودیکہ انہوں نے نبی ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا اس کا سبب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کے ارشاد گرامی سے اس نماز کی فضیلت معلوم ہوگئی ہوگی یا پھر انہیں یہ بات پہنچی ہوگی کہ آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے۔ روایت کی عدم موجودگی اس کو تو مستلزم نہیں ہے کہ آپؐ نے اس کو مطلقاً پڑھا نہیں۔ یوں یہ حدیث پہلی دونوں احادیث کے معارض نہیں ہے اور ان کے درمیان تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلی حدیث تو مطلقاً اثبات پر دلالت کرتی ہے (یعنی آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے) اور تیسری مطلقاً نفی پر دلالت کرتی ہے یعنی آپؐ نے یہ عمل کیا ہی نہیں اور دوسری حدیث سفر سے واپسی کی قید سے مشروط ہے یعنی سفر سے واپسی کے وقت پڑھی ہے۔ ان کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ تیسری حدیث میں سبب کی کوئی قید نہیں ہے اور پہلی حدیث سبب کے ساتھ مقید ہے اور وہ ہے سفر سے واپسی۔ جمع کی یہ صورت پہلی سے بہتر اور اولیٰ ہے۔ اس باب کی آخری حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

حاصل کلام: نماز اشراق، صلاۃ ضحیٰ اور صلاۃ اوایین تین الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کا تین الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے اس میں ایک ہی چیز بے شمار الفاظ سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ طبرانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر نماز پڑھی اور ام ہانی رضی اللہ عنہا کو بلا کر بتایا کہ یہ اشراق کی نماز ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس کا نام صلاۃ ضحیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نماز طلوع آفتاب سے لے کر دن کے چوتھائی حصہ تک پڑھی گئی ہے اور اوایین کی نماز کا وقت جب آفتاب کی تمازت سے زمین گرم ہو جائے کہ اونٹنی کا بچہ گرمی محسوس کرنے لگے۔ اونٹ کا بچہ معمولی حرارت کی پروا نہیں کرتا بلکہ ذرا تپش زیادہ ہو تو وہ گرمی محسوس کرتا ہے۔ گویا اس نماز کا وقت سورج کے کافی اوپر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس طرح بعض کے نزدیک تینوں نمازیں دراصل ایک ہی ہیں نام مختلف ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اشراق اور ضحیٰ ایک ہی نماز کے دو نام ہیں البتہ صلاۃ اوایین ان سے الگ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نماز ضحیٰ کی رکعت کتنی ہیں؟ تو اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿الواہین﴾ اواب کی جمع ہے۔ اس میں ”واو“ پر تشدید ہے معنی اس کے بکثرت رکوع کرنے والے ہیں اور منکرات و سینات کو چھوڑنے اور ترک کرنے والے ہیں۔ ﴿حین﴾ وقت کے معنی میں۔ یہ جب جملہ کی طرف مصاف ہو تو اکثر و بیشتر مینی برفح ہوتا ہے ﴿ترمض﴾ سمع یسمع باب سے یعنی گرمی اور تمازت کی وجہ سے جلن محسوس کرے اور یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سورج کی گرم شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں اور یہ وہی وقت ہے جب سورج کافی اونچا ہو اور نصف النہار کے قریب پہنچ چکا ہو ﴿الفصال﴾ ”فا“ کے نیچے کسرہ فعیل کی جمع ہے۔ اونٹنی کے بچہ کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گویا کنایہ مقصود ہے کہ صلاۃ واہین کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب اونٹنی کے چھوٹے بچے دن کی حرارت و تمازت سے جلن اور تپش محسوس کریں اس وقت پڑھی جانے والی نماز کا نام صلاۃ واہین اس لئے ہے کہ اس وقت طبیعت انسانی آرام و استراحت اور سکون کی جانب مائل ہوتی ہے مگر یہ نماز پڑھنے والا نفس کی مراد پوری کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى الصُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رُكْعَةً، بَنَى اللَّهُ لَهُ قَصْرًا فِي الْجَنَّةِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَفْرَغَهُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے صلوٰۃ الصُّحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں محل تعمیر فرمائے گا۔“ (اسے ترمذی نے روایت بھی کیا ہے اور اسے غریب بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے غریب کہا ہے۔ اس سے نمازِ ضعیفی کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث اس کی فضیلت میں منقول ہیں مگر وہ بھی ضعیف ہیں۔

(۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قَالَ: دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِثْنِي، فَصَلَّى الضُّحَى ثَمَانِي رَكَعَاتٍ ادا فرمائیں۔ (ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے) رَكَعَاتٍ . رَوَاهُ ابْنُ حَبَّانَ فِي صَحِيحِهِ .

حاصل کلام: اس حدیث سے حضورؐ کا حضرت عائشہؓ کے حجرے میں آٹھ رکعت نماز صبحی پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، ممکن ہے اس نماز سے مراد سفر سے واپسی پر پڑھی گئی نماز ہو۔ نماز صبحی کا بڑا فائدہ مسلم کی روایت

میں منقول ہے کہ انسان کے ہر جوڑ پر ایک حق واجب ہے، انسان کے جسم میں تین سو ساتھ جوڑ ہوتے ہیں۔ اس نماز کی دو رکعت ادا کرنے سے وہ حقوق ادا ہو جاتے ہیں جو ان تمام جوڑوں پر واجب ہوتے ہیں۔

۱۰ - بَابُ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ وَالْإِمَامَةِ نماز باجماعت اور امامت کے مسائل

کامیان

(۳۱۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ حَضَرْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”باجماعت نماز پڑھنا تنہا نماز اللہ ﷻ قَالَ: صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ پڑھنے سے ستائیس گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔“ مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ سَبْعَ وَعَشْرِينَ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: ”بِحَمْسٍ“ مروی ہے کہ ”پچیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے“ اور وَعَشْرِينَ جُزْءًا وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ عَنْ بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت أَبِي سَعِيدٍ، وَقَالَ: ”دَرَجَةً“ ہے اس میں جزء کی جگہ درجہ کا لفظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة.....الخ﴾ امامت کا عطف صلاة پر ہے۔ جماعت کے لفظ پر نہیں ہے۔ ﴿من صلاة الفذ﴾ ”فا“ پر فتح اور ذال پر تشدید۔ ”فذ“ کے معنی تنہا اور منفرد ”جزء“ ”ممرزہ پر نصب۔ درجہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر درجہ اور جزء سے مراد نماز ہے ﴿وكذا للبخاري﴾ یعنی بخاری کی روایت میں بھی پچیس گنا ہے ﴿وقال درجة﴾ جزء کی جگہ درجہ کا لفظ ہے۔ رہا یہ دونوں عددوں کا اختلاف تو اس بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں کے مابین کوئی منافات نہیں۔ یہاں عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ ستائیس میں پچیس شامل ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپؐ نے پچیس گنا ثواب کا ذکر کیا ہو بعد میں ستائیس گنا کا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرق مسجد کے قریب و بعد ہونے کی وجہ سے ہے اگر مسجد دور ہوگی تو اجر زیادہ اور قریب ہونے کی صورت میں کم اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے خشوع کی قلب و کثرت مراد ہے اگر نماز میں خشوع زیادہ ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر خشوع کم ہوگا تو اجر کم ملے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرق جماعت کی تعداد کی کثرت و قلت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پوری نماز میں شمولیت ہوگی تو زیادہ ثواب ملے گا اور اگر تھوڑی سی نماز میں شمولیت ہوگی تو اجر کم ملے گا۔ واللہ اعلم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھنا

واجب نہیں کیونکہ انفرادی اور اجتماعی میں مختلف اسباب کی وجہ سے درجات میں کمی و بیشی ہوتی ہے تو گویا منفرد کی بھی نماز ہوگئی خواہ مراتب اور درجات کم ہی ہوں۔ اگر جماعت نماز واجب ہوتی تو پھر منفرد کی نماز تو جائز نہ ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

(۳۱۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَمُرَ بِحَطَبٍ فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ أَمُرَ بِالصَّلَاةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ أَمُرَ رَجُلًا فَيُؤَمِّمَ النَّاسَ، ثُمَّ أَخَالَفَ إِلَى رَجُلٍ لَا يَشْهَدُونَ الصَّلَاةَ فَأَحْرَقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ يَعْلَمُ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَرْقًا سَمِينًا، أَوْ مِرْمَاتَيْنِ حَسَنَتَيْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ». مَتَّقَ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اس ذات گرامی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کیلئے اذان کا حکم دوں پھر کسی کو نماز پڑھانے کیلئے کہوں پھر میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھروں میں موجود ہونے کی صورت میں ان کے گھروں کو ان پر آگ لگا کر جلا دوں۔ قسم اس ذات گرامی کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر یہ علم ہو جائے کہ اس کو گوشت سے پر موٹی ہڈی مل جائے گی یا دو پائے مل جائیں گے تو نماز عشاء میں لپک کر شامل ہو جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ہممت﴾ میں نے ارادہ کیا، قصد کیا ﴿بحطب﴾ ”حا“ اور ”طا“ پر فتح خشک لکڑی جو جلانے کے کام آسکے ﴿فیحتطب﴾ لکڑیاں جمع کی جائیں۔ صیغہ مجہول ہے۔ منصوب اس لئے ہے کہ اس سے پہلے واقع فعل منصوب کا جواب ہے ﴿فیؤذن﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ اذان دی جائے ﴿فیؤم الناس﴾ جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ یعنی لوگوں کا امام بن کر نماز باجماعت پڑھائے ﴿ثم اخالف الى رجال﴾ پھر میں ان کے پیچھے سے آؤں یا محض یہ معنی ہے کہ میں ان کی طرف چلا جاؤں۔ ﴿فاحرق﴾ تخریق سے ماخوذ ہے، یعنی میں آگ لگا کر جلا ڈالوں یہاں مضارع کے تمام صیغے منصوب واقع ہوئے ہیں سوائے صیغہ جمع مذکر کے۔ ﴿عرقا﴾ عین پر فتح ”را“ ساکن۔ وہ ہڈی جس پر کچھ گوشت باقی ہو اور اس کا زیادہ حصہ اخذ کر لیا گیا ہو اور اسمعی کا قول ہے کہ عرق گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ زیادہ عمدہ۔ اس جگہ پہلا ہی معنی مراد ہے کیونکہ لوگوں کی بدترین خصلت و عادت کو زیادہ شدید مبالغہ کے اظہار کیلئے ہے ﴿سمینا﴾ سمانہ سے ماخوذ ہے۔ لاغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ موٹا تازہ اس کے معنی

ہیں۔ کیونکہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے چبانے میں رغبت زیادہ ہوتی ہے ﴿مرماتین﴾ مرماتہ کا تشبیہ ہے۔ میم کے نیچے کسرہ ہے اور کبھی فتح سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بکری کا کھرا یا وہ گوشت جو دونوں کھروں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اس قسم کی سخت و شدید وعید تو صرف واجب کے ترک پر ہوتی ہے اور جس نے اس وعید کو زجر و توبخ پر محمول کیا ہے اور واجب تسلیم نہیں کیا ہے اس نے تاویل سے کام لیا ہے۔ اس کی حقیقت یہاں مراد نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض عین ہے۔ فرض کفایہ یا سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تارکین جماعت کیلئے اتنی سخت اور شدید وعید اور دھمکی نہ دی جاتی اگر یہ فرض عین نہ ہوتی۔ ظاہریہ، عطاء، اوزاعی، امام احمد، ابو ثور، ابن خزیمہ، ابن منذر اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرض کفایہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اگر جماعت کے ساتھ ادا کر لیں تو باقی لوگوں سے عدم ادائیگی کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ متقدمین شافعیہ اور بعض احناف اور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے البتہ صاحبین اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ فرض کفایہ تو اس لئے نہیں کہ جب کچھ لوگ جماعت میں شامل ہو گئے پھر شامل نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کفایہ تو چند لوگوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔

(۳۱۶) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَتَقْلُ
الصَّلَاةَ عَلَى الْمُتَأَفِّقِينَ صَلَاةَ الْعِشَاءِ
وَصَلَاةَ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا
فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبَوًّا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”متأففين“ منافقین پر سب سے ثقیل و بوجھل نمازیں، نماز عشاء اور نماز فجر ہیں اگر ان کو علم ہو جائے کہ ان دونوں میں حاضر ہونے کا کتنا (عظیم) اجر و ثواب ہے تو یہ لازماً ان میں شامل ہوتے خواہ ان کو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑتا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لاتوہما﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے یعنی ضرور آتے اتیان سے ماخوذ ہے ”ولو حبوا“ خواہ انہیں گھٹنوں پر گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔ جو ”حا“ پر فتح اور ”با“ ساکن ہے۔ بچے کا اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹنا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بچے کا اپنی سرین پر گھسٹ کر آگے بڑھنا۔ حاصل کلام: ان دونوں نمازوں کو نہایت بوجھل اور بھاری کہا گیا ہے۔ عشاء تو اس لئے ثقیل ہے کہ اس وقت تھکے ماندے لوگ سو جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اکیلے ہی نماز ادا کر کے سو جاتے ہیں۔ جماعت کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے اور فجر اس لئے گراں ہوتی ہے کہ شیطان نیند کے مارے ہوئے لوگوں کو

ٹھنھے ہی نہیں دیتا۔

(۳۱۷) وَعَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ حَضْرَتُ ابُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَے مروی ہے کہ ایک نابینا رَجُلٌ أَعْمَى فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! شَخْصِ نَبِی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا إِنَّهُ لَيْسَ لِي قَائِدٌ يَقُودُنِي إِلَى: اے رسول اللہ (ﷺ)! میرے پاس ایسا کوئی آدمی الْمَسْجِدِ، فَرَحَّصَنِي لَهُ، فَلَمَّا وَلَّى نہیں جو مجھے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ آپؐ نے دَعَاَهُ فَقَالَ: «هَلْ تَسْمَعُ النَّدَاءَ» سے رخصت عنایت فرما دی (کہ وہ گھر پر ہی نماز بِالصَّلَاةِ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: پڑھ لیا کرے) مگر جب وہ واپس جانے لگا تو آپؐ نے «فَاجِبٌ». رَوَاهُ مُنْذِرٌ. اسے واپس بلا کر فرمایا کہ ”تم اذان سنتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں، تو آپؐ نے فرمایا ”تو پھر اذان کا جواب دے (یعنی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ)“ (مسلم)

لغوی تشریح: ”رجل اعمی“ نابینا آدمی سے یہاں مراد عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ غالباً اس ارشاد کے بعد مسجد میں اتنی باقاعدگی سے حاضری دی کہ بالآخر مسجد کے منصب اذان پر مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ﴿قائد﴾ وہ آدمی جو نابینا کا ہاتھ تھام کر جہاں وہ جانا چاہے وہاں اسے لے جائے ﴿ولی﴾ تولیت سے ماخوذ ہے۔ واپس ہوا۔ واپس جانے کیلئے مڑا اور اپنا رخ پھیرا۔ ﴿النداء﴾ اذان ﴿فاجب﴾ اجابہ سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اذان کا جواب دے۔ اس سے مراد نماز باجماعت ادا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اذان کی آواز سننے کے بعد معذور آدمی کو بھی مسجد میں آنا چاہئے۔ معذور کی نماز گھر پر پڑھنے سے ادا تو ہو جائے گی مگر جماعت کا ثواب تو نہیں ملے گا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان کی آواز نہ سنا قابل قبول عذر ہے۔ سننے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ بارش، سخت آندھی، باد صحر، شدید بھوک، قضائے حاجت، بیماری اور دشمن کا خوف وغیرہ ایسے عذرات ہیں جنہیں جماعت میں عدم شمولیت کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے جماعت میں شمولیت کو فرض عین کہنے والوں نے فرضیت عین پر استدلال کیا ہے اور سنت مؤکدہ کہنے والوں نے اس حدیث کو تاکید مزید پر محمول کیا ہے۔ دونوں کیلئے اپنے اپنے نظریہ کی رو سے گنجائش موجود ہے۔

(۳۱۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ حَضْرَتُ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا سَے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص اذان سنے اور پھر نماز باجماعت میں شامل نہ ہو اس کی کوئی نماز نہیں، الا یہ کہ کوئی عذر مانع ہو۔“ (اسے ابن ماجہ، دارقطنی، ابن حبان، حاکم رَوَاهُ ابْنُ عُذْرٍ. رَوَاهُ ابْنُ عُذْرٍ. عذر مانع ہو۔)

مَاجِدُ وَالذَّارِقُطِيُّ وَابْنُ جِبَّانَ وَالْحَاجِمُ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، لَكِنْ رَجَعَ بَعْضُهُمْ وَقَفَهُ. ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے) حاصل کلام: اس حدیث سے بھی نماز باجماعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ابو داؤد میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا وہ عذر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”خوف اور بیماری“ نیز اس میں لا صلاۃ کی بجائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرتا مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ بادو باراں، باد صرصر اور خوف وغیرہ کے ساتھ یہ عذر بھی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے کچا پیاز، لسن، مولیٰ اور گندنا وغیرہ تازہ ہی کھائے ہوں تو وہ مسجد میں نہ آئے کیونکہ ان کے استعمال سے منہ میں ایسی ناخوشگوار بساند پیدا ہو جاتی ہے جو ملائکہ اور نمازیوں کیلئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ اسی طرح تمباکو نوش بھی کم از کم نماز کے اوقات میں تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز کریں، تاکہ خدا کی مخلوق کو اذیت دینے کا موجب نہ بنیں۔

(۳۱۹) وَعَنْ يَزِيدَ بْنِ الْأَسْوَدِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، إِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ لَمْ يُصَلِّيَا، فَدَعَا بِهِمَا، فَجِئَ بِهِمَا، تَرَعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فَقَالَ لَهُمَا: «مَا مَنَعَكُمَا أَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا؟» قَالَا: قَدْ صَلَّيْنَا فِي رِحَالِنَا، قَالَ: «فَلَا تَفْعَلَا، إِذَا صَلَّيْتُمَا فِي رِحَالِكُمَا ثُمَّ أَدْرَكْتُمَا الْإِمَامَ وَلَمْ يُصَلِّ فَصَلِّيَا مَعَهُ، فَإِنَّهَا لَكُمْ نَافِلَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَّانَ.

حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو دو ایسے آدمیوں پر نظر پڑی جنہوں نے نماز (آپؐ کے ساتھ) نہیں پڑھی۔ آپؐ نے دونوں کو اپنے پاس بلوایا۔ دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر کئے گئے تو (خوف کے مارے) ان کے شانے کانپ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا ”تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟“ دونوں نے عرض کیا: ہم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا ”ایسا تم کیا کرو۔ اگر تم اپنے گھر پر نماز پڑھ چکے ہو پھر تم امام کو پالو اور امام نے ابھی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کے ساتھ تم نماز پڑھو، یہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ بھی اسی کے ہیں۔۔ اس کے علاوہ تینوں (ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص پہلے نماز پڑھ چکا ہو اور پھر جماعت کے ساتھ شامل ہونے کا موقع بھی میسر آجائے تو اسے جماعت کے ساتھ شامل ہونا چاہئے خواہ کوئی نماز ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف ظہر اور عشاء دو نمازوں میں کر سکتا ہے باقی میں نہیں، لیکن جب دوبارہ نماز پڑھنے کی دلیل یہی حدیث ہے تو پھر صبح کی نماز دوبارہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ اس لئے امام شافعی کا موقف ہی درست ہے۔

راوی حدیث: ﴿یزید بن اسود رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو جابر سوائی عامری ہے۔ ان کے قبیلے کے قریش سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں فروکش ہوئے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ ان سے ان کے لڑکے جابر رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

(۳۲۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلَا تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلَا تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ» وَإِذَا قَالَ: «سَمِعَ

اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ فَقُولُوا: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ» وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَلَا تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ، وَإِذَا صَلَّى قَائِمًا فَصَلُّوا قِيَامًا، وَإِذَا صَلَّى قَاعِدًا فَصَلُّوا قُعُودًا أَجْمَعِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا لَفْظُهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

تک کہ امام رکوع نہ کرے اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور اس سے پہلے سجدہ نہ کرو تاوقتیکہ وہ سجدہ کرے اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور اس کی اصل صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے)

لعوی تشریح: ﴿لیونم﴾ تاکہ اس کی اتباع و پیروی اور اقتدا کی جائے ﴿حتی یرکع﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع میں جھک جائے، یہ معنی نہیں کہ رکوع پورا کرے (پھر تم رکوع کرو) ﴿واذا قال سمع اللہ الخ﴾ بعض علمائے احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی صرف حمد و ثناء کرے لیکن یہ حدیث اس بارے میں واضح نہیں ہے، بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد بھی کہتے تھے۔ اسی طرح مقتدی کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنا بھی درست ہے کیونکہ یہ وظیفہ انتقال ہے۔ اس حدیث میں دراصل امام اور مقتدی کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی اقتدا کس طرح کرے۔ راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی مقتدی کیلئے تسبیح و تحمید پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ الحاوی میں مطبوع ہے۔ ﴿فصلوا قعوداً﴾ تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کی مرض کے دوران نماز سے منسوخ ہو چکا ہے، اس لئے کہ آپؐ نے اس وقت امام کی حیثیت سے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی تھی اور باقی سب نمازیوں نے کھڑے ہو کر، لیکن امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے، منسوخ نہیں۔ جب امام کے عذر کے دور ہونے کی توقع نہ ہو تو اس وقت مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہئے بشرطیکہ قبلہ کا امام مستقل ہو اور نماز کی ابتدا بیٹھ کر کرتا ہو۔ ورنہ مقتدیوں کیلئے قیام ہی متعین ہے۔ مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر دراصل وجوب کیلئے ہے۔ اگر حکم کو اس بارے میں کھڑے ہونے پر محمول کریں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کے آخری عمل سے یہ منسوخ ہے اور رہا اس کا مندوب ہونے پر محمول کرنا اور مذکورہ شرائط کی قید لگانا تو پھر حدیث سے ایسی کوئی دلیل نہیں کہ نبی ﷺ نے جب اس کا حکم ارشاد فرمایا اس وقت خود ان شرائط کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد ”واذا صلی قاعدا فصلوا قعوداً اجمعین“ مطلق حکم کا مقتضی ہے اور شرائط مذکورہ کی بھی کوئی قید نہیں۔ لہذا اس حکم کے منسوخ ہونے اور مقتدیوں کیلئے قیام کی

(۳۲۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى فِي أَصْحَابِهِ تَأَخُّرًا، فَقَالَ دیکھا تو فرمایا ”آگے آجاؤ اور میری پیروی کرو اور تَقَدَّمُوا، فَاتَّبَعُوا بَنِي، وَلِيَأْتَمَّ بِكُمْ تمہارے پیچھے والے تمہاری پیروی کریں۔“ (مسلم) مَنْ بَعْدَكُمْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿تأخراً﴾ پیچھے رہ جانا، دور رہ جانا۔ یعنی وہ آپؐ کے قریب نہیں پیچھے دور ہو کر کھڑے تھے۔ آپؐ نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ ﴿فاتموا بی﴾ میری اقتدا کرو یہ اتمام سے امر کا صیغہ ہے۔ اقتداء پیروی اور اتباع کے معنی میں۔ ”ولیاتم“ اس میں لام امر کا ہے۔ یہ گرامر کے اعتبار سے ساکن بھی ہو سکتا ہے اور مکسور بھی ﴿من بعدکم﴾ تمہارے پیچھے والے۔ یعنی تم پہلی صف والے امام کے افعال، حرکات و سکنات اور احکام نماز کو پہلے نبی ﷺ سے حاصل کر لو پھر یہی افعال و احکام اور آداب و صفات نماز تم سے بعد والے یعنی کچھلی صف میں شریک نمازی سیکھ لیں اور اسی طرح ان سے کچھلی صف میں شامل لوگ اپنے سے پہلی میں شریک نمازیوں سے ان آداب و صفات کی تعلیم حاصل کر لیں۔ علیٰ هذا التماس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نماز باجماعت میں پہلی صف کا درجہ اور مرتبہ دوسری صفوں سے زیادہ ہے اور افضل ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صف والوں کو امام کی اقتداء کرنی چاہئے۔ اس ضرورت کیلئے امام کو دیکھنا جائز ہے اور دوسری صف والوں کو پہلی صف کے مقتدیوں کی اسی طرح اقتداء کرنی چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نمازی براہ راست امام کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ اس کی آواز سن سکتا ہو تو وہ دوسرے مقتدی کی پیروی کرے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی مسئلہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس براہ راست کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے دوسرے صاحب علم سے معلوم کر لینا چاہئے۔

(۳۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَحْتَجِرُ رَسُولَ
حَضْرَت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

اللہ ﷻ حُجْرَةً مُخَصَّفَةً، فَصَلَّى سے ایک چھوٹا (خیمہ نما) حجرہ بنایا اور اس میں نماز
 فِيهَا، فَتَتَّبِعْ إِلَيْهِ رَجُلًا، وَجَاءُوا پڑھنے لگے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ آئے اور
 يُصَلُّونَ بِصَلَاتِهِ، الْحَدِيثُ. وَفِيهِ: آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گئے۔ اس حدیث
 «أَفْضَلُ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ، إِلَّا فِي سَبْعٍ مِنْ شَهْرٍ» میں یہ بھی ہے کہ مرد کی اپنے گھر میں نماز افضل
 الْمَكْتُوبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ہے (سوائے فرض نماز کے)۔ (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿احتجر﴾ حجرہ کی طرح کا ایک خیمہ سا بنایا ﴿مخصفہ﴾ تخصیف سے اسم
 مفعول ہے۔ چٹائی سے بنایا ہوا۔ ﴿فتتبع الیہ رجال﴾ لوگ تلاش کی جستجو اور کاوش کر کے اس جگہ
 پہنچ گئے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز کی جماعت کرنا مشروع
 ہے۔

حاصل کلام: یہ ماہ رمضان کا موقع تھا کہ آپ نے اپنے لئے مسجد میں الگ سے ایک مختصر سی مخصوص
 جگہ بنائی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدیوں اور نمازیوں کیلئے ایسا کرنا باعث ضرر اور تکلیف نہ ہو تو
 مسجد میں مخصوص جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ مکمل روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو
 صحابہ کرام کو علم ہوا تو انہوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ آنحضرت ﷺ ایک رات دیر
 سے اس حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا ”میں نے تمہارا حال دیکھ لیا ہے اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض
 نماز کے علاوہ مردوں کی نماز گھر میں افضل ہے۔“

(۳۲۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى مُعَاذُ
 بِأَصْحَابِهِ الْعِشَاءَ، فَطَوَّلَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَتُرِيدُ أَنْ تَكُونَ يَا
 مُعَاذُ قَتَانًا؟ إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَأَقْرَأْ بِالسَّنَسِ وَضَحَاها» وَ«سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» وَ«اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ» (سورۃ اعلیٰ) واقراء باسم واللیل اذا يغشى (سورۃ
 «وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ علق و سورۃ لیل) پڑھنی چاہئیں۔“ (بخاری و مسلم
 دونوں نے اسے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم
 کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فطول﴾ تطویل (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے ”فا“ برائے تعقیب ہے۔ یعنی قراء
 ت لمبی کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۃ بقرہ پیل رکعت میں اور سورۃ نساء

دوسری رکعت میں پڑھی۔ ﴿اترید﴾ حمزہ اس میں سوالیہ ہے (استفہام کیلئے ہے) اور استفہام بھی انکاری ﴿فسنا﴾ فاف فتح اور ”تا“ پر تشدید یعنی تو عذاب اور آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہے ﴿اممت﴾ پہلی مہم پر فتح اور دوسری مہم ساکن۔ باب نصر یمنصر معنی یہ ہوئے کہ جب لوگوں کی امامت کر رہے ہو۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام کو قرأت اتنی لمبی اور طویل نہیں کرنی چاہئے کہ نمازی تنگ آجائیں اور جماعت سے گریز کریں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرأت اتنی کم ہو کہ مقصد قرأت ہی فوت ہو جائے بلکہ ادائیگی ارکان اور تلاوت کلام مجید میں اعتدال اور توازن ہونا چاہئے اور مسنون طریقے سے نماز پڑھانی چائے۔ طویل قرأت بھی جائز ہے، جبکہ نمازی متمحل ہوں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نماز کا واقعہ بخاری نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور انہوں نے قراءت معمول سے زیادہ لمبی کر دی۔ ایک راہ چلتا مسافر جس کے پاس دو اونٹنیاں بھی تھیں وہ اپنی اونٹنیاں باہر چھوڑ کر نماز میں شامل ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ قراءت بہت طویل ہے تو اس نے نماز توڑ کر الگ بغیر جماعت کے نماز پڑھی اور اپنی راہ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کہا کہ یہ منافق ہے۔ وہ شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ حضور اکرم ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے نصیحت فرمائی۔ قنہ میں مبتلا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے، کمزور و ناتواں، ضرورت مند، تھکے ماندے وغیرہ تو ان سب کا لحاظ ملحوظ خاطر رکھنا امام کیلئے ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ آکٹا کر نماز باجماعت سے گریز کرنے لگیں۔ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرض نماز پہلے نبی کریم ﷺ کی امامت میں پڑھ کر پھر جا کر محلہ کی مسجد میں نمازیوں کو فرض نماز پڑھاتے اور خود نفل ادا کرتے تھے۔ عبدالرزاق، شافعی اور طحاوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ (دوسری) نماز نفل ہوتی تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ امام اور مقتدی کی نیت اگر مختلف ہو تب بھی دونوں کی نماز صحیح ہوگی۔ مثلاً امام کی نیت نفل پڑھنے کی ہے اور مقتدی کی فرض کی یا امام نماز ظہر اور مقتدی نماز عصر کی نیت کرے یا اس کے برعکس تو دونوں صورتوں میں دونوں کی نماز جائز ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارت نکلتا ہے کہ مقتدی اگر امام کا کوئی فعل ناپسند سمجھتا ہے اور نماز توڑ کر الگ اپنی نماز ادا کر لیتا ہے (اسی جگہ) تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوتی تو حضور ﷺ اسے ضرور تنبیہ فرماتے کہ آئندہ ایسا مت کرنا اور نماز بھی دوبارہ پڑھو۔ ایسا چونکہ نہیں فرمایا اس لئے یہ جائز ہے۔

(۳۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی اس نماز کے ضمن میں نَعَالَى عَنْهَا، فِي قِصَّةِ صَلَاةِ رَسُولِ فرماتی ہیں جو انہوں نے لوگوں کو اس حالت میں اللہ ﷻ بِالنَّاسِ وَهُوَ مَرِيضٌ، پڑھائی کہ آپ بیمار تھے کہ آپ تشریف لائے اور

قَالَتْ: فَجَاءَ حَتَّى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ حضرت ابو بکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ پس آپؓ اُبی بکرؓ، فَكَانَ يُصَلِّي بِالنَّاسِ لوگوں کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت جَالِسًا، وَأَبُو بَكْرٍ قَائِمًا، يَفْتَدِي أَبُو ابو بکرؓ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نبی ﷺ کی بَكْرٍ بِصَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ، وَيَفْتَدِي اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابو بکرؓ کی پیروی (میں نماز النَّاسِ بِصَلَاةِ أَبِي بَكْرٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. پڑھ رہے تھے) (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وہو مریض﴾ یہاں ”واؤ“ حالیہ ہے۔ ایسی حالت میں تشریف لائے جبکہ آپؓ بیمار تھے اور یہ مرض الموت کا واقعہ ہے اور غالب گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آخری نماز ہے جو آپؓ نے باجماعت لوگوں کو پڑھائی۔ اس کے بعد مرض کی شدت کی وجہ سے گھر سے باہر تشریف نہیں لاسکے اور یہ نماز ظہر تھی۔ نبی ﷺ کا ابو بکرؓ کی بائیں طرف بیٹھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ امام تھے کیونکہ امام کے محل و مقام پر کھڑے تھے اور یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتدا میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے موقع پر نماز پڑھانے کے بارے میں ہے۔ واقعہ کی مختصر صورت یہ تھی کہ آپؓ بیمار ہو گئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ اس اثناء میں آپؓ ہی کے ارشاد کے بموجب حضرت ابو بکرؓ لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ ایک دن آپؓ کو قدرے آفاقہ ہوا تو آنجناب ﷺ دو آدمیوں کے سارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابو بکرؓ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپؓ حضرت ابو بکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھانا شروع کی۔ آپؓ امام تھے اس لئے بائیں طرف بیٹھے اور ابو بکرؓ مقتدی تھے اس لئے دائیں جانب رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزوری زیادہ ہو گئی تھی اس لئے تکبیروں کیلئے آواز بلند نہیں نکلتی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کبر کا کام دیتے تھے اور آپؓ کی تکبیروں کو بلند آواز ہے لوگوں کو پہنچاتے تھے تو وہ ارکان نماز ادا کرتے تھے۔ اس حدیث سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ راتب اور افضل امام کے آنے پر دوسرے امام کو اپنی جگہ دے دینی چاہئے۔ مگر ابن عبد البر نے اسے آنحضرت ﷺ کا ہی خاصہ قرار دیا ہے۔

(۳۲۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمُ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَّةَ، فَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ فَلْيُصَلِّ كَمَزُورٍ اور حاجت مند لوگ ہوتے ہیں ہاں جب تنہا كَيْفَ شَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے پڑھے۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب فرائض امامت ادا کر رہا ہو تو اس وقت نماز

میں لمبی لمبی قراءت سے احتیاط کرنی چاہئے اس لئے کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ سب کی ضروریات و حاجات پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ البتہ جب ایک آدمی اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے اپنے اشغال، ضروریات اور حالات کا اچھی طرح علم ہوتا ہے تو ایسے آدمی کو فرصت اور قوت کے اوقات میں جتنی چاہے لمبی قراءت کرے اسے اختیار ہے مگر بیماری اور ضرورت کے وقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کسی صورت میں بھی درست اور جائز نہیں۔ شریعت نے نفس کا بھی حق رکھا ہے۔

(۳۲۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے قَالَ: قَالَ أَبِي: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ حَقًّا، قَالَ: «فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤْذَنُ أَحَدُكُمْ، وَلْيُؤْمِئْكُمْ أَحَدُكُمْ قُرْآنًا»، قَالَ: ابْنُ سَلَمَةَ: «فَلَمَّا يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْآنًا مِّنِّي، فَقَدْ مُؤْنِنِي، وَأَنَا ابْنُ سَيْتٍ أَوْ سَبْعَ سِنِينَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ»

والد نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے ہاں سے حق لے کر آ رہا ہوں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ ”جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کے اور امامت ایسا شخص کرائے جو قرآن حمید کا زیادہ عالم ہو۔“ عمرو نے کہا (میری قوم نے دیکھا میرے سوا کوئی دوسرا قرآن کا عالم نہیں ہے تو انہوں نے مجھے آگے کر دیا۔ اس وقت میری عمر چھ سات برس کی تھی۔) (بخاری)

(ابوداؤد اور نسائی)

لغوی تشریح: ﴿قال ابی: جئتکم من عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقا﴾ یہ صاحب فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے آنے والے وفد میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے فتح (فتح مکہ) کا اسی طرح انتظار کر رہے تھے جس طرح باقی ماندہ عرب منتظر تھا کہ اس معرکہ آرائی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پس جب فتح مکہ کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا (مکہ فتح ہو گیا) اور اہل عرب کو خوب معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں مبنی بر صداقت اور سراسر حق ہے تو یہ لوگ پے درپے اسلام لانے کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ﴿فلم یکن احد اکثر قرآنا منی﴾ ان میں مجھ سے زیادہ ایک بھی قرآن کا عالم نہیں تھا۔ اس کا سبب اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہمارے پاس سے لوگ گزرتے تھے اور ہمیں یہ اطلاع دیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا اس طرح فرمایا۔ میں چونکہ ابھی بچہ تھا ان کی زبان سے سن سن کر قرآن مجید کا کافی حصہ ازبر کر چکا تھا اس لئے میرے قافلہ والوں نے مجھے اپنے لئے بطور امام منتخب کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نابالغ فرض نمازوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ جب فرض نماز کی امامت درست اور صحیح ہے تو نوافل کی جماعت بلا دلی کرا سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث نے امام کیلئے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو قرآن مجید زیادہ جانتا ہو، امامت کے منصب کیلئے اسی کا انتخاب کیا جائے۔ جیسا کہ عمرو بن لُحَیْہ کو اس کی قوم کے لوگوں نے منتخب کیا۔ اس حدیث سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ امامت کا منصب اذان کے منصب سے افضل ہے اس لئے کہ مؤذن کیلئے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی صرف حسن صوت اور بلند آواز والا ہونا چاہئے۔ چھ سات سالہ بچے کو امام مقرر کرنا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اسے دوسروں کے مقابلہ میں قرآن زیادہ یاد تھا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابولحدیث اس کے قائل ہیں کہ نابالغ لڑکے کی امامت میں بڑے بوڑھے لوگوں کی نماز درست ہے مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو قول منقول ہیں دونوں میں مشہور قول یہ ہے کہ بچہ (نابالغ) کی امامت میں نفل نماز درست ہے اور فرض نماز جائز نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت مقرر کیا گیا اور نہ ہی آپ سے پوچھ کر اس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ اس کا تقرر و انتخاب اگر درست نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی لازماً اسے آئندہ کیلئے روک دیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق اسلام کے بڑے اہم رکن نماز سے ہے اس لئے اگر یہ درست نہ ہوتا تو اسے ضرور ممنوع قرار دے دیا جاتا یا پھر نفلی اور فرضی امامت کی وضاحت کر دی جاتی کہ نفل میں اس کی گنجائش ہے اور فرض میں نہیں۔ ایسا بھی کہیں نہیں لہذا قرین صواب یہی ہے کہ ضرورت کے وقت ایسا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ﴾ سلمہ کے لام کے نیچے کسروہ ہے۔ جرم قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے جرمی کہلائے۔ ابو یزید یا ابو بريد کنیت تھی۔ اپنے والد کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ان کی عمر چھ سات برس تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ عمرو بن سلمہ اور قبیلہ بنو سلمہ کے علاوہ باقی تمام جگہ سلمہ کے لام پر فتح ہے اور ان دونوں پر لام کے نیچے کسروہ ہے۔

(۳۲۷) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَوْمَ الْقَوْمِ أَفْرُؤُهُمْ لِكِتَابِ اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةَ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْمًا - وَفِي رِوَايَةٍ «سِنًا» - وَلَا يَوْمَئِذٍ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لوگوں کا امام ایسا آدمی ہو جسے قرآن حمید کا علم زیادہ ہو۔ اگر اس وصف میں لوگ مساوی ہوں پھر وہ امام بنے جسے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زیادہ ہو اور اگر سنت کے علم میں بھی لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے ہجرت پہلے کی۔ اگر اس وصف میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے پہلے اسلام قبول کیا ہو اور ایک روایت

کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرہ اقتدار میں امامت نہ کرائے اور نہ گھر میں اس کی مخصوص نشست (بستر) پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اقروہم لکتاب اللہ﴾ اس جملہ کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ایسا آدمی امام بنے جسے قرآن کا زیادہ حصہ حفظ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو زیادہ جاننے والا یعنی احکام شریعت سے زیادہ واقف ہو لیکن ﴿فان کانوا فی القراءۃ سواء فاعلمہم بالسنۃ﴾ سے پہلے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿سلما﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ اسلام کے معنی ﴿وفی روایۃ سنۃ﴾ ایک دوسری روایت میں سلما کی جگہ لفظ ”سنا“ بھی منقول ہے ﴿ولا یومن﴾ امامت سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے اور نون اس جگہ نون تاکید ہے (یعنی نون ثقیلہ) ﴿الرجل الرجل﴾ پہلا الرجل فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿فی سلطانہ﴾ اس کے دائرہ اقتدار میں، ہ کی ضمیر اس میں دوسرے آدمی کی طرف راجع ہے اور اسی طرح (فی بیئہ) اور ﴿فی تکرمتہ﴾ کے قول میں بھی ہ کی ضمیر دوسرے شخص کی طرف جاتی ہے ﴿التکرمة﴾ ”تا“ پر فتح، کاف ساکن اور ”را“ پر کسر۔ ایسے بستر وغیرہ اور تکتے جو صاحب خانہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ﴿الا باذنہ﴾ بظاہر یہ اشتیاء دونوں صورتوں کیلئے ہے، امامت اور بستر مخصوص پر بیٹھنا اجازت کے ساتھ مشروط ہے اگر اجازت مل جائے تو دونوں جائز ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے امامت ایسے شخص کے سپرد کی جانی چاہئے جو قرآن کو زیادہ یاد رکھتا ہو، سنت سے باخبر ہو، دین کی خاطر ترک وطن کی سعادت، قبول اسلام میں اولیت رکھتا ہو اور عمر رسیدہ ہو کیونکہ زیادہ امید ہے کہ جس کی عمر دراز ہوگی اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے۔

(۳۲۸) وَلَا يَنْبَغُ مَا جَاءَ مِنْ حَدِيثِ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ؛ «وَلَا تَتَوَسَّنِ امْرَأَةً رَجُلًا، وَلَا أَعْرَابِيٌّ مُهَاجِرًا، وَلَا فَاجِرٌ مُؤْمِنًا»، وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ.

ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی بدوی دیہاتی کسی مہاجر کی امامت کرائے اور نہ کوئی فاجر کسی مومن کا امام بنے۔“ اس روایت کی سند (واہ) ضعیف ہے۔

نفی تشریح: اس روایت میں دیہاتی و بدوی کا مہاجر کی امامت کی ممانعت کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ بدوی لوگ ابتداء اسلام میں مہاجرین کے مقابلہ میں قرآن کی تعلیم اور علم دین سے کم واقف تھے

﴿واسنادہ واہ﴾ واہ کا معنی ضیعت و کمزور ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن محمد عدوی ایسا ہے جسے وکیع نے وضع حدیث کے الزام سے متمم کیا ہے اور عبد اللہ بن محمد کے شیخ استاد علی بن زید بھی ضعیف ہیں یہ روایت ایک اور سند سے بھی منقول ہے مگر ان میں ایک راوی عبد الملک بن حبیب ایسا ہے جسے احادیث کی چوری کرنے اور سندوں کو خلط ملط کرنے کے الزام سے متمم کیا گیا ہے۔

حاصل کلام: یہ روایت نہایت ہی کمزور سند سے منقول ہے، اس لئے اس سے مسائل کا استنباط کرنا درست نہیں۔

(۳۲۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: ارشاد گرامی ہے ”اپنی صفوں کو مضبوطی سے ملاؤ اور رُصُوا صُفُوفَكُمْ، وَقَارِبُوا بَيْنَهَا، ان کے درمیان فاصلہ کم رکھو اور اپنی گردنوں کو وَحَاذُوا بِالْأَعْنَاقِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ایک محاذ پر رکھو (برابر برابر رکھو)“ (اسے ابوداؤد والنسائی، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿رُصُوا﴾ ”را“ پر ضمہ اور صادر پر تشدید ”رُص الجدار والبناء“ سے امر ہے یعنی دیوار یا عمارت کی ایک اینٹ کو دوسری کے ساتھ ملا کر یا جوڑ کر اس طرح مضبوط اور پختہ کیا جائے کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ اس سے ”رُص الصف“ ہے جس کا مطلب ہے کہ نمازی اپنی صفوں کو ایک دوسرے سے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے کو ملا کر درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑ کر ایسی مضبوطی سے بنائیں کہ چنی ہوئی مضبوطی اور پختہ دیوار معلوم ہوں ﴿وقاربوا بينهما﴾ بایں طور کہ دو صفوں کے درمیان ضرورت سے زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں ﴿وحاذوا بالأعناق﴾ گردنوں کو ایک دوسرے کے بالتقابل رکھیں۔ بایں طور پر کہ سب نمازیوں کی گردنیں ایک ہی صف میں سیدھی معلوم ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نمازی کی گردن امام کی طرف نکلی ہوئی معلوم ہو اور کسی کی پیچھے نکلی ہوئی۔

حاصل کلام: اسلام میں صف بندی اور شیرازہ بندی کی بڑی تاکید اور اہمیت ہے۔ اس کی تربیت و ٹریننگ اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن، نماز میں صف بندی کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ جہاں میں بنیامین مرصوص کی جتنی ضرورت و اہمیت ہے۔ اس کے بیان کرنے کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں، اشارہ ہی کافی ہے۔ صف بندی میں اگر رخ پڑ جائے یا صفوں میں خلل واقع ہو جائے تو باہمی ربط و ضبط اور محبت میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ اسلام دلوں کو جوڑنے اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور اسلامی برادری میں مساوات کے ذریعہ ایک ہی صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ شیطانی دخل اندازی سے اسے

بچانا اور محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں روایت ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخ موڑ کر فرمایا کہ ”اپنی صفوں کو سیدھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کجی و ٹیڑھ اور مخالفت ڈال دے گا۔“ راوی کا بیان ہے کہ میں نے نمازیوں کو دیکھا کہ جماعت میں اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے اور اپنا قدم ساتھ والے کے قدم سے ملایا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا ”قسم ہے مجھے اس ذات اقدس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان بھیڑ کے پچہ کی صورت میں گھس جاتا ہے“ یعنی وہ نمازیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خشوع و خضوع سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ توجہ الی اللہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستگی کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں الغرض نماز باجماعت کی صورت میں صف بندی کی بہت تاکید ہے۔ مل کر کھڑا ہونا چاہئے اور درمیان میں قطعاً جگہ نہیں چھوڑنی چاہئے۔

(۳۳۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أُولُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أُولُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں کی بہترین اور سب سے زیادہ خیر و بھلائی والی صف، ان کی پہلی صف ہے اور بدترین اور بڑی صف ان کی آخری صف ہے اور خواتین کی بہترین اور خیر و بھلائی ان کی آخری صف ہے اور بدترین اور بری صف ان کی پہلی صف ہے۔ (مسلم)

لفظی تشریح: ﴿اولہا﴾ پہلی صف سے مراد وہ صف ہے جو امام کے متصل ہوتی ہے۔ ﴿وشرہا﴾ آخرہا جس میں خیر و بھلائی اور اجر و ثواب کم ہو وہ صف ہے جو سب سے آخر میں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو اس صف میں شامل ہو گا وہ گناہ گار ہو گا۔ آخری صف کو شر الصوف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ پہلی صف میں شریک نمازی سے اس کا معاملہ برعکس ہوتا ہے اور خواتین کی آخری صف کو بہترین اور خیر و بھلائی والی صف قرار دیا گیا ہے برعکس مردوں کی صفوں کے کیونکہ خواتین کا آخری صف میں ہونا مردوں سے دور رہنے کا موجب ہے نیز ان کے دیکھنے اور ان کی گفتگو سننے سے دور رہتی ہیں۔

حاصل کلام: جماعت میں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں تفاوت اپنے اندر بھلائی اور بہتری کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلی صف میں شریک نمازی عموماً وہی ہوں گے جو مسجد میں پہلے آئے ہوں۔ مسجد میں پہلے آنا بھی باعث ثواب ہے نیز پہلی صف میں شامل لوگ صاحب علم، بزرگ اور دینی فہم زیادہ رکھنے والے ہوں گے۔ امام کے دوسرے نمازیوں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تلاوت قرآن، تکبیرات سنتے ہیں۔ خواتین سے دور رہنے کی وجہ سے خلل انداز ہونے والے وسوسوں اور برے خیالات سے بچے رہتے ہیں۔ مردوں کی سب سے پچھلی صف میں شریک نمازی ان سے

محروم رہتے ہیں۔ اس لئے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ برائی اور بھلائی دونوں نسبتی معاملات ہیں۔ خواتین کی سب سے آخری صف اس لئے بہتر ہے کہ ایک عورتیں دیر سے مسجد میں آئیں گی۔ مردوں سے دور ہوں گی کیونکہ مرد و زن کا اختلاط اچھے نتائج و ثمرات برآمد نہیں کرتا۔ یہ حکم ایسی صورت واقعہ کیلئے ہے جہاں مردوں اور عورتوں کی صفیں آگے پیچھے ہوں ورنہ اگر عورتیں الگ جگہ میں ہوں تو پھر ان کی بھی پہلی صف بہتر شمار ہوگی یا یہ صورت ہو کہ عورتوں کی جماعت الگ سے ہو اور ان کی امامت (پہلی صف کے درمیان میں کھڑے ہو کر) عورت ہی کر رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی خواتین کی پہلی صف بہترین اجر و ثواب کی مستحق ہے اور آخری کم ثواب کی۔

(۳۳۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ اِيك رَاتِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَاسَاحَةِ نَمَازِ اِدَا كِ مِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقُمْتُ اَپُّ كَ بَاسِیْ جَانِبِ كُھْرَا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ عَنِ یَسَارِهِ، فَأَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنی دائیں جانب بِرَأْسِیْ مِیْنِ وَرَآئِیْ، فَجَعَلَنِیْ عَنْ كُھْرَا کر لیا۔ (بخاری و مسلم) یَمِیْنِهِ، مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھنے والے دو ہی شخص ہوں تو مقتدی کو امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اور اگر غلطی و نادانی سے مقتدی بائیں طرف کھڑا ہو جائے تو امام اسے اپنے دائیں طرف کھینچ کر (یا اشارہ سے) کر لے۔ اتنے سے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ فعل بھی نماز ہی کیلئے کیا گیا ہے۔ نماز سے باہر کے کسی کام کیلئے نہیں۔ مقتدی کو بھی فوراً تعمیل کر کے بائیں سے دائیں جانب آجانا چاہئے۔ تبدیلی مکان و جگہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی جو تبدیلی نماز کی اصلاح و درستگی کیلئے کی گئی ہو۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے۔ گویا دو کی تعداد جماعت کی تعریف میں آجاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بھی جائز ہے۔

(۳۳۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَمَازَ پڑھی اور ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ہمارے پیچھے (تما) نَمَازِ اِدَا كِ۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت جائز ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اگر اکیلی ہو تو وہ اکیلی ہی صف میں کھڑی ہوگی۔ مردوں یا بچوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی۔ مرد پہلے، بعد میں بچوں کی صف اور آخر میں عورتوں کی صف ہونی چاہئے۔ البتہ ایک آدمی ہو تو بچے کو

ساتھ کھڑا کر کے ایک ہی صف بنانی چاہئے۔ خیر و برکت کے حصول کے نقطہ نظر سے گھر میں کسی نیک شخصیت کی امامت میں نماز نفل پڑھنی جائز ہے۔ ام سلیم راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی خدمت گاری کیلئے پیش کیا تھا۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ عورت اپنے تحت جگر کے ساتھ بھی نماز ادا کرنے کیلئے ایک صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

(۳۳۳) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ أَنَّهُ أَنْتَهَى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ، فَرَكَعَ قَبْلَ أَنْ يَصِلَ إِلَى الصَّفِّ، ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ وَذَكَرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ - ﷺ -: «زَادَكَ اللَّهُ حِرْصًا، وَلَا تَعُدْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ (بخاری)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے نے بتایا کہ وہ نبی ﷺ کے پاس عین اس وقت پہنچے جبکہ آپ رکوع فرما رہے تھے۔ پس انہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تیری حرص و طمع میں اضافہ فرمائے آئندہ ایسا مت کرنا“

أَبُو دَاوُدَ فِيهِ: «فَرَكَعَ دُونَ الصَّفِّ، ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ». ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رکوع کیا صف میں شامل ہونے سے پہلے پھر حالت رکوع ہی میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔

لغوی تشریح: ﴿ولا تعد﴾ بظاہر یہ ”عود“ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے منفرد کی نماز صف کے پیچھے پڑھنا جائز ہے کیونکہ ابوبکرہ نے اپنی نماز کا آغاز صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر نبی ﷺ نے ان کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد لا تعد اس فعل کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے اور رہا یہ معاملہ کہ آپ نے اسے نماز کے لوٹانے اور دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تو وہ اس لئے نہیں دیا کہ اس وقت وہ اس کی حکمت نہیں جانتا تھا اور کسی چیز کا علم نہ ہونا عذر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر بایں صورت نماز صحیح ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تنہا آدمی صف کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس قسم کے معمولی سے فعل کو تو درگزر اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ دوڑ کر کوشش سے پہلی صف میں داخل ہونے کی نیت پہلی مرتبہ کی ہو اور جب فعل ہمیشہ اور مسلسل ہو تو پھر مستقل حکم کا تقاضا کرتا ہے جو صحت پر مبنی ہو یا فساد پر اور جس کی ابتدا اور آغاز درست اور صحیح ہو کوئی ضروری اور لازمی نہیں کہ اس کو باقی رکھنا بھی صحیح ہو۔ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی جیسا کہ آئندہ حضرت وابصہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت پالی، کیونکہ نبی ﷺ نے اسے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ مگر یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اس مسئلہ سے بخوبی آگاہ ہوں کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت

نہیں ہوتی اور یوں انہوں نے رکعت پوری کر لی ہو تو اس صورت میں نماز کو دہرانے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

(۳۳۴) وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبُدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا يُصَلِّي خَلْفَ الصَّفِّ وَخَلَدَهُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الصَّلَاةَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ.

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظرایسے آدمی پر پڑی جو صف کے پیچھے تماکھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اسے نماز کو دوبارہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلَهُ عَنْ طَلْقٍ: لَا صَلَاةَ لِمُنْفَرِدٍ خَلْفَ الصَّفِّ. وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ فِي حَدِيثِ وَابِصَةَ: أَلَا دَخَلَتْ مَعَهُمْ أَوْ اجْتَرَزَتْ رَجُلًا؟

اور اس طرح طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی اور طبرانی نے وابصہ کی حدیث میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ”تو ان کے ساتھ ہی داخل کیوں نہ ہو گیا یا پھر تو کسی نمازی کو پہلی صف میں سے پیچھے کھینچ لیتا۔“

لغوی تشریح: ”الادخلت“ مزمزہ استفہام کا ہے ساتھ ہی معنی نفی کا دے رہا ہے یا پھر مزمزہ پر فتح ہے اور لام پر تشدید ہے۔ اس صورت میں اسے حرف تخصیص قرار دیا گیا ہے۔ ابھارنے اور برا لگینے کرنے والا حرف ﴿اجترزت رجلاً﴾ اگلی صف میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ دونوں احادیث صف کے پیچھے تما نماز پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دیتی ہیں۔

حاصل کلام: اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ صف کے پیچھے منفرد (اکیلے) آدمی کی نماز درست ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہل علم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ دلیل اس کی یہی حدیث ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے ایسے آدمی کو دوبارہ نماز پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نماز ہو جاتی ہے۔ اس آدمی کو تو آپ نے بطور تنبیہ نماز دوبارہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس بارے میں صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگلی صف کو مکمل اور پورا کیا جائے اگر پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو اکیلے ہی پڑھ لو کیونکہ درمیان میں سے آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں پہلی صف میں خلا پیدا ہو جائے گا جسے پر کرنے کیلئے نمازیوں کو حرکت کرنا پڑے گی اور ایک کنارے سے آدمی کو کھینچ کر لائے گا تو نماز کی حالت میں اتنا چلنا بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ ائمہ رحمہ اللہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ طبرانی وغیرہ

میں جو پہلی صف سے آدمی کھینچنے کا حکم ہے وہ سنداً ضعیف ہے۔

راوی حدیث: ﴿وابن عبد اللہ﴾ معبد میں ”میم“ کے نیچے کسرہ ”عین“ ساکن اور ”با“ پر فتح۔ ان کی کنیت ابو قرصافہ ہے۔ انصار کے قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تھے۔ قرصافہ میں قاف کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن۔ ۹۰ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ کوفہ فروکش ہوئے۔ بعد ازاں حیرہ کی طرف چلے گئے۔ ۹۰ھ میں رقبہ میں وفات پائی۔

(۳۳۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا سَمِعْتُمُ الْإِقَامَةَ فَأَمْسُوا إِلَى الصَّلَاةِ، وَعَلَيْكُمْ السَّكِينَةُ وَالْوَقَارُ، وَلَا تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا»، مَثَقَّ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ (بعد میں) پورا کر لو۔“ بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)۔

لغوی تشریح: ﴿السکینہ﴾ یعنی حرکات میں سکون ہو اور عث حرکات سے اجتناب ہو ﴿والوقار﴾ وقار کا معنی سکینت کے قریب قریب ہے۔ وقار انسان کی ہیئت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے دائیں بائیں التفات کئے بغیر نگاہیں بچاتے ہوئے دھیمی آواز سے گفتگو کرنے اور چال ڈھال میں شریفانہ انداز اختیار کرنے کو وقار کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے نمازی جب مسجد میں نماز باجماعت کیلئے آئے تو بڑے آرام و سکون، وقار و عزت کے ساتھ آئے۔ دوڑتا ہوا نہ آئے۔ چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے۔ بولنے کی ضرورت ہو تو دھیمی اور پست آواز سے بولے۔ یوں اطمینان سے آنے کے بعد امام کو جس حالت میں پائے نماز میں شریک ہو جائے باقی نماز کو بعد میں کھڑا ہو کر پورا کر لے۔ ایسی صورت میں مقتدی نے جو نماز امام کے ساتھ پڑھی وہ اس نمازی کی پہلی رکعتیں شمار ہوں گی یا بچھلی۔ اس میں ائمہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مقتدی کی بچھلی رکعتیں شمار ہوں گی، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی یہ پہلی شمار ہوں گی۔ یہی بات حدیث کے الفاظ ”فاتموا“ کے موافق ہے۔ نیز یہ بھی مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی یہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں۔ محتاط ترین اور قرین صواب بات یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوگی۔ کیونکہ رکوع میں شامل ہونے کی صورت میں سورۃ فاتحہ اور قیام کی ادائیگی نہیں ہو پاتی، یہ دونوں فرض ہیں۔ دونوں کے فقدان سے نماز کیسے ہوگی؟

(۳۳۶) وَعَنْ أَبِي بَنْدٍ كَعْبٍ حَضَرَتِ ابْنِ بَنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷺ لَمْ يَأْمُرْ بِشَيْءٍ إِلَّا وَهُوَ كَمَا أَمَرَ بِهِ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةُ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكَى مِنْ صَلَاتِهِ وَخَدَهُ، وَصَلَاتُهُ مَعَ الرَّجُلَيْنِ أَزْكَى مِنْ صَلَاتِهِ مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَانَ أَكْثَرَ زِيَادَةً أَجْرًا وَثَوَابًا كَمَا بَعَثَ هِيَ. اِذَا طَرَحَ جَنَّةَ اِنْفِرَادٍ فَهُوَ أَحَبُّ اِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

ہے۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازکی﴾ اطہر کے معنی ہیں نہایت پاکیزہ اور بہت ہی اجر و ثواب کا موجب۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی کم از کم تعداد دو ہے۔ ایک امام اور دو سرا مقتدی (اور زیادہ کی کوئی حد نہیں) حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ نماز اللہ کے نزدیک محبوب ہوگی اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

(۳۳۷) وَعَنْ أُمِّ وَرَقَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَأْتِيَ أَهْلَ دَارِهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَزْمَةَ.

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے گھروالوں کی امامت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت فرائض امامت انجام دے سکتی ہے مگر کن کی؟ اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ گھر کے افراد میں تو مرد بھی ہوتے ہوں گے۔ لہذا اس سے تو عورت کا مرد کی امام بننا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اولاً تو اس حدیث کا راوی عبدالرحمن بن خلاد مجہول ہے۔ ثانیاً بعض روایات میں ”نساء اہل دارہا“ کی صراحت ہے کہ گھر کی عورتوں کو نماز پڑھائے۔ مردوں پر فرض نماز کیلئے مسجد میں حاضری ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس لئے یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ مرد حضور اکرم ﷺ کی اقتداء کو چھوڑ کر عورت کی اقتداء و امامت میں نماز پڑھتے ہوں۔ مردوں اور عورتوں کی صفوں میں فاصلہ والی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ مردوں کا عورتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب آپ نے جماعت کرائی تو ام سلیم اپنے بچوں کے ساتھ بھی کھڑی نہیں ہوئی۔ جب اپنے لخت جگر کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تو امامت کیسے کرائے گی۔ عورت جماعت کی امامت کے وقت مرد امام کی طرح الگ صف میں تنہا کھڑی نہیں ہوگی بلکہ بقول امام شوکانی رحمہ اللہ عورتوں کے ساتھ ہی پہلی صف میں وسط صف میں کھڑی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسی طرح نماز پڑھاتی تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ام ودفہ رُئِیَہَا﴾ بنت نوفل یا بنت عبد اللہ بن حارث۔ انصار میں سے تھیں۔ انہوں نے سارا قرآن سینے میں جمع کر رکھا تھا۔ غزوہ بدر میں شریک ہونے کی آپؐ سے اجازت طلب کی مگر آپؐ نے ان کو اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو اپنے گھر ہی شہادت کا مرتبہ ملنے والا تھا۔ آپؐ اس سے ملاقات کیلئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کو شہید کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ اس کے دو غلام (غلام اور لونڈی) تھے جن کو انہوں نے مدبر کر رکھا تھا (ان کی موت کے بعد از خود آزاد ہو جائیں گے) مگر ان دونوں نے مل کر رات کے وقت ان کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر مار دیا اور خود راتوں رات فرار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو گرفتار کروایا اور دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلے مصلوب ہیں۔ یہ خاتون تھیں جو حضور ﷺ کی اجازت سے اہل محلہ کی امامت کراتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو قرآن مجید اذہر تھا۔

(۳۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَخْلَفَ ابْنَ امِّ مَكْتُومٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كُوفًا بَنِيًّا وَهُوَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، يَوْمَ النَّاسِ وَهُوَ أَبُو دَاوُدَ نَزَّاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَنَحْوُهُ لَابِنِ جَبَّانٍ عَنْ عَائِشَةَ. (اس روایت کو احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے) کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے نقل کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو اپنا نائب مقرر کرنا جائز ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نابینا کی امامت درست اور جائز ہے۔ تیسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا دوسروں کی بہ نسبت علم شریعت کا زیادہ عالم ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ افضل کی موجودگی میں دوسرا بھی نائب مقرر کیا جاسکتا ہے۔ یہ نابینا صحابی عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں غالباً تیرہ مرتبہ اپنا نائب مقرر فرمایا اور غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامی امور وغیرہ کیلئے اپنا نائب مقرر فرمایا اور عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں نماز کی امامت کیلئے مقرر فرمایا۔

(۳۳۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «صَلُّوا عَلَى مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَصَلُّوا خَلْفَ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ» (ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا) ”جس کسی نے لا الہ الا اللہ زبان سے کہا اس کی نماز جنازہ پڑھو اور جو لا الہ الا اللہ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔“ (اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿صلوا علی من... الخ﴾ جس آدمی نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیا خواہ وہ نیک ہو یا بد اس کی نماز جنازہ پڑھو اور اسی طرح ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھو جو جس نے کلمہ شہادت کہا۔ حدیث

سند کے اعتبار سے اگرچہ کمزور اور ضعیف ہے مگر محققین کے نزدیک اس پر عمل کرنا قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ اصول اور روایات اس کی صحت کی تائید کرتی ہیں کہ جس شخص کی نماز صحیح ہے، اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ ہاں یہ مناسب ہے کہ فاجر آدمی کو امامت کیلئے آگے نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مکروہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فرائض کی پروا نہ کرنے والے کلمہ گو آدمی کی نماز جنازہ درست ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کے تو قائل ہیں مگر راہزن اور باغی کی نماز جنازہ کے قائل نہیں۔ بہر حال علماء اور بزرگ لوگوں کو فاسق و فاجر اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ البتہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ”جاؤ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔“

(۳۴۰) وَعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ. حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَنَى أَحَدُكُمْ الصَّلَاةَ، وَالْإِمَامُ عَلَى حَالٍ، فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ». رَوَاهُ ضَعِيفُ سَنَدٍ (ترمذی نے اسے)

التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ بعد میں شامل ہونے والا نمازی جس حالت میں امام کو پائے اسی میں شامل ہو جائے۔ امام اگر رکوع میں ہے تو اسے بھی رکوع میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور امام کو سجدہ کی حالت میں پائے تو اس کو سجدہ میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور اگر امام بیٹھا ہو تو مسبوق کو بھی اسی حالت میں بیٹھ جانا چاہئے۔ ترمذی کی یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر دوسری صحیح احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

۱۱ - بَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِ

وَالْمَرِيضِ.

(۳۴۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا فَرِصَتْ الصَّلَاةَ رَكْعَتَانِ، فَأَقْرَأَتْ صَلَاةَ السَّفَرِ، وَأَتِمَّتْ صَلَاةَ الْحَضَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ابتدا میں دو رکعات فرض کی گئی تھیں (سفر و حضر میں) جتنی نماز فرض کی گئی وہ دو رکعت تھی۔ اسے (سفر کی نماز کو) باقی رکھا اور حضر (مقیم) کیلئے نماز مکمل کر دی گئی۔ (چار رکعتیں کر دی گئیں) (بخاری و مسلم)

وَلِلْبَحَارِيِّ: ثُمَّ هَاجَرَ، فَقَرِضَتْ اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آپؐ نے اَزْبَعًا، وَأَقْرَتْ صَلَاةَ السَّفَرِ عَلَىٰ هَجْرَتِ كِي تَوَاجِرُ رَكَتِ فَرَضِ كَرْدِي گئیں اور سفر کی الاول۔ نماز پہلی حالت پر برقرار رکھی گئی۔

وَزَادَ أَحْمَدُ: إِلَّا الْمَغْرِبَ، فَإِنَّهَا احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے ”سوائے نماز مغرب کے وَثَرُ النَّهَارِ، وَإِلَّا الصُّبْحَ، فَإِنَّهَا کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور بجز صبح کی نماز کے تَطَوُّلُ فِيهَا الْقِرَاءَةُ۔ کیونکہ اس نماز میں قرات لمبی کی جاتی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿اول ما فرضت الصلاة﴾ حضور و سفر دونوں میں رکعتان دو، دو رکعتیں مغرب کی نماز کے علاوہ۔ گرائمر کے اعتبار سے اول مبتداء ہے اور رکعتان اس کی خبر ہے اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے، یعنی منصوب ہے اور اس کا منصوب ہونا اس لئے درست اور صحیح ہے کہ یہ قائم مقام خبر کا حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فاقرت﴾ اقرار سے ماخوذ ہے، صیغہ مجہول، معنی ہے کہ ان کو دو رکعت کی حالت پر برقرار رکھا گیا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔ ﴿واتمت﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ یعنی مکمل کر دی گئی۔ ﴿صلاة الحضر﴾ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور وہ چار پوری ہو گئیں۔ الحضر میں ”حاضر“ اور ”ضاد“ دونوں پر فتح ہے۔ سفر کے مقابلہ میں حضر کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سفر میں قصر کرنا فرض ہے اور اسے پورا پڑھنا جائز نہیں بعینہ جس طرح حضر میں چار رکعت پر اضافہ جائز نہیں۔ مدار استدلال لفظ ”فرضت“ اور ”اقرت“ ہے یعنی فرض کی گئی، برقرار رکھی گئی کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دو رکعتیں فرض ہیں رخصت نہیں اور فرائض میں نہ کمی و بیشی کرنا جائز ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ ”فرضت“ کا لفظ ”قدوت“ کے معنی کا احتمال رکھتا ہے، اس صورت میں اس میں کوئی دلیل نہیں بنتی بلکہ یہ تو تعبیر کے انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے جو محض حضور و سفر کے فرق کے بیان کرنے کیلئے آیا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس میں کوئی اشارہ رخصت یا عزیمت کی طرف پایا جاتا ہو، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راویہ ہیں انہوں نے سفر میں قصر نماز بھی پڑھی ہے اور پوری بھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور و سفر کی نماز دو، دو رکعت فرض تھی، بعد میں سفر کی نماز کو علیٰ حالہ رکھا گیا البتہ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں نماز قصر کا جو بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز ہے واجب نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے جبکہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور اسے رخصت پر محمول کرتے ہیں اور یہی قول رائج ہے۔ دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بند حسن مروی ہے کہ دوران سفر میں نے پوری نماز پڑھی۔ آپؐ کو اس کی خبر دی تو آپؐ نے میری تحسین کی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اتباع میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر متاخرین نے اس حدیث کو ضعیف

قرار دیا ہے جو صحیح ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

(۳۴۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْصُرُ فِي السَّفَرِ وَيَتِمُّ، وَيَصُومُ وَيُفْطِرُ. رکھتے بھی تھے اور افطار بھی کر لیتے تھے۔ (دارقطنی) رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ، وَزَوَّاهُ يَثَاثُ، إِلَّا أَنَّهُ مَقْلُودٌ، اس کے راوی ثقہ ہیں، مگر حدیث معلول ہے اور وَالْمَحْفُوظُ عَنْ عَائِشَةَ مِنْ فَعْلِهَا، وَقَالَتْ: إِنَّهُ لَا يَنْتُقِ عَلَى. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذاتی فعل کی صورت میں محفوظ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ

”روزہ مجھ پر گراں نہیں۔“ (بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿يقصر﴾ قصر فرماتے۔ یعنی کبھی چار رکعتوں والی نماز، دو رکعتیں ہی ادا فرماتے۔ قصر، يقصر۔ باب نصر ينصر کے وزن پر ہے۔ ﴿ويتم﴾ پوری نماز ادا فرماتے۔ یعنی چار رکعتیں پوری ادا فرماتے۔ ﴿ويصوم﴾ سفر میں بھی کبھی روزہ رکھتے اور ﴿يفطر﴾ کبھی افطار فرما لیتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا مسافر کیلئے دونوں طرح رخصت ہے اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سفر میں قصر و افطار پر عمل کرے چاہے نہ کرے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے البتہ فرمایا ہے کہ یہ معلول ہے۔ غالباً علت یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کے معارض ہے کہ آپ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ علت صحیح نہیں دونوں میں تطبیق ممکن ہے کہ کبھی اتمام کرتے اور اکثر و بیشتر قصر کرتے۔ ویسے بھی طے شدہ اصول ہے کہ مثبت ثانی پر مقدم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳۴۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخْصَةٌ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ (ابن خزيمة) اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ ابن خزيمة اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ”جیسا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کے تاکیدی احکام (فرائض) کو ادا کیا جائے“

لغوی تشریح: ﴿ان توتی﴾ گرائمر میں یہ مجہول واقع ہوا ہے اور ﴿رخصہ﴾ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ”را“ پر ضمہ اور ”خا“ پر فتح ’رخصہ‘ کی جمع ہے، یعنی جن امور میں رخصت کی گنجائش دی گئی ہے ان میں رخصت پر عمل کیا جائے۔ ﴿عزائمہ﴾ کی جمع ہے اور یہ رخصت کے بالقابل ہے۔ رخصت کا مفہوم یہ ہے کہ شارع نے بعض واجبات کی ادائیگی میں شدت اور تکلیف کی وجہ سے یا کسی عذر کی بنا پر چھوڑنے کی اجازت دے دی ہے اور بعض محرمات کو ضرورتاً مباح قرار دے دیا ہے اور عزیمت، رخصت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ عملاً یہ اگرچہ تعداد میں مکمل چار رکعتیں پڑھنے سے کم ہے مگر افضل یہی دو رکعتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنا اللہ کے ہاں اسی طرح محبوب ہے جیسے عزیمت پر عمل کرنا محبوب اور پسندیدہ ہے۔

(۳۴۴) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ جَبَّ تَيْنِ مِيلٍ يَأْتِيَنَّ فَرَسًا يَسْتَوِي سَفَرًا كَيْلَ إِذَا خَرَجَ مَسِيرَةً ثَلَاثَةَ أَمْيَالٍ أَوْ تَشْرِيفَ لَمَّا جَاءَ تَوَدُّو رَكَعَتَيْنِ (نماز قصر) ادا فرماتے ثَلَاثَةَ فَرَاسِيخَ صَلَّى رَكَعَتَيْنِ. رَوَاهُ تَحْمِيذٌ (مسلم)

مُسْنَدٌ

لغوی تشریح: ﴿امیال او فراسیخ﴾ اس حدیث کے سند کے ایک راوی شعبہ نے ”او“ بیان کر کے اپنے شک کا اظہار کیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف احوال بیان کرنا مقصود ہے۔ ”امیال“ میل کی جمع ہے۔ میل کی مقدار کیا ہے، کتنی ہے اس بارے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چھ ہزار ہاتھ جتنی مسافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چار ہزار ہاتھ اور ایک ہاتھ کی لمبائی ان دونوں اقوال میں۔ چوبیس انگشت ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ تین ہزار ہاتھ کے برابر اور ہاتھ سے مراد ہے بتیس انگشت۔ دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ تقریباً ایک ہی مقدار بنتی ہے۔ فقط تعبیر کا فرق ہے۔ رہا ”فراخ“ تو یہ فراخ کی جمع ہے۔ ایک فراخ تین میل کا ہوتا ہے اور یہ لفظ فارسی زبان کے فرسخ سے معرب ہے اور تین فراخ ساڑھے چوبیس کلومیٹر کے مساوی ہوتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک میل چھ ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے تو پھر تین فراخ کا فاصلہ پونے سترہ کلومیٹر فاصلہ کے مساوی بنتا ہے۔ یہ فاصلہ کا تعین اندازاً ہے یقینی اور حتمی نہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نو میل کی مسافت سے سفر پر نکلنے کا عزم کیا ہو اس کیلئے قصر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ وہ مسافت جس میں نماز قصر پڑھی جائے کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ مسافت چار برد ہے (اڑتالیس میل) اس کی دلیل آئندہ آئے گی۔ رہی یہ حدیث تو اس کے مطابق کسی فقہیہ کا قول ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کوئی

فقہیہ اس طرف جاتا تو اس کیلئے بڑی قوی وجہ موجود تھی۔ ہمارے زمانے کے علماء اہلحدیث کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ نو میل کی مسافت پر قصر کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں وارد الفاظ ”میل“ فرسخ“ کی تعریف تو اوپر ہو چکی ہے کہ نماز قصر کیلئے کتنی مسافت ہونی چاہئے۔ اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ قصر نماز کیلئے کوئی مسافت محدود و متعین نہیں ہے۔ مطلق سفر سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جب کوئی کسی مسافت کو سفر خیال کرے وہاں قصر نماز پڑھے۔ بلاشبہ قرآن مجید میں قصر کیلئے مطلقاً سفر کا ذکر ہے، جیسے سفر میں تیمم کے لئے سفر کی کوئی تعین نہیں مگر اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین میل کا سفر بھی شرعی سفر شمار ہوتا ہے لیکن راوی حدیث امام شعبہ رحمہ اللہ تین میل یا تین فرسخ کے قائل تھے۔ جس سے علماء نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ یہاں تین فرسخ مراد لئے جائیں اور تین فرسخ سے نو میل مسافت بنتی ہے لہذا نو میل مسافت پر نماز قصر ادا کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تین میل تک مسافت کو نماز قصر کے لئے جائز قرار دیا ہے بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک میل پر بھی جائز ہے۔ مگر ان کی پشت پر مضبوط عقلی و نقلی ثبوت نہیں ہے اور بعض حضرات نے ۳۶ میل اور بعض نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل کی مسافت مقرر کی ہے۔ بہر حال یہ سب قیاسات پر مبنی ہیں کسی کی تائید میں صحیح حدیث موجود نہیں۔ رہی چار برد والی روایت کہ چار برد (اڑتالیس میل) سے کم مسافت پر قصر جائز نہیں، سو یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے نیز اس کے ایک راوی عبد الوہاب بن مجاہد بن جبر کی روایت کو ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے بلکہ ثوری نے تو اس کو کذاب کہا ہے، اس لئے یہ استدلال کے لائق نہیں۔

(۳۴۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ہم نے قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ کے ساتھ نکل کر مدینہ سے مکہ تک الْمَدِينَةِ إِلَى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّي كَاسْفَرٍ كَمَا أَتَى الْإِسْلَامُ آپ مدینہ واپسی تک دو رکعتیں ہی ادا رَكَعَتَيْنِ رَكَعَتَيْنِ، حَتَّى رَجَعْنَا إِلَى فرماتے رہے۔ (بخاری و مسلم۔ البتہ متن حدیث کے الفاظ الْمَدِينَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ. بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی اپنے گھر سے سفر کی نیت سے نکل پڑے تو وہ مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے۔ حدود شرعی یعنی موجودہ اصطلاح میں میونسپلٹی کی حدود سے نکلنے کے بعد خواہ ایک میل کا سفر طے کیا ہو نماز قصر ادا کرنا شروع کر سکتا ہے اور واپسی تک دو گانہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

(۳۴۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ ۱۹ رُكُوعًا قِيَامًا فَرَمَايَا أَقَامَ قَصْرًا فرماتے رہے ﷺ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا يَقْصُرُ وَفِي اور ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں ۱۹ روز قیام

لَفِظُ: «بِمَكَّةَ، تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا». فرمایا۔ (بخاری) اور ابو داؤد کی روایت میں ۷ روز ہے اور ایک دوسری روایت میں ۱۵ روز ہے۔
 رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ: «سَبْعَ عَشْرَةَ». وَفِي أُخْرَى: «خَمْسَ عَشْرَةَ». اور ابو داؤد میں ہی عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپ کی مدت قیام اٹھارہ دن تھی اور اسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپ نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا اور نماز قصدا کرتے رہے، اس روایت کے راوی ثقہ ہیں، مگر اس کے موصول ہونے میں اختلاف ہے۔

حاصل کلام: مکہ میں مدت قیام کے بارے میں جو مختلف روایات منقول ہیں کہ آپ ایک روایت کی رو سے وہاں ۱۹ روز یا ۱۸ روز اور ایک روایت کی رو سے ۱۷ روز یا پندرہ روز قیام پذیر رہے۔ ان میں سے ہر مدت قیام کے حق میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ مدت قیام میں اختلاف فتح مکہ کے موقع کا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع کا نہیں ہے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ وہ تو صرف دس روز تھا۔ ان روایات میں جمع و تطبیق کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ روز والی روایت دوسری روایات کے مقابلہ میں صحیح ترین اور قوی ترین ہے۔ اس کی تائید اہل مغازی کا وہ بیان ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں بروز منگل صبح داخل ہوئے وہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور حنین کی جانب بروز ہفتہ چھ شوال روانہ ہوئے۔ پس ان ایام کی تعداد، دخول اور خروج کے ایام سمیت ۱۹ روز بنتے ہیں اور ۱۸ روز والی روایت تو اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس احتمال کے باوجود کہ راوی کے ذہن میں راتوں کی تعداد ہو، دنوں کی تعداد نہ ہو کیونکہ آپ مکہ میں داخل تو دن کو ہوئے تھے اور یہاں سے نکلے رات کو تھے۔ یوں ۱۹ دن کی تعداد پوری ہوگئی اور راتوں کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی فرق اور منافاة باقی نہ رہا اور اس تاویل کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ شب والی روایت میں لیل (شب) موجود ہے اور سترہ یوم والی روایت کی صورت میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ راوی نے مکہ میں دخول اور خروج کے دونوں دن شمار نہیں کئے لہذا دو یوم انیس میں سے نکال دیں تو باقی سترہ ہی رہ جاتے ہیں اور رہی پندرہ یوم والی روایت تو وہ روایت شاذ ہے اور ثقہ راویوں کی روایت کردہ روایات کے مخالف ہے، لہذا اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ راوی نے سترہ یوم والی روایت کو اصل قرار دے کر مکہ میں آپ کے داخل اور خارج ہونے کا دن نکال دیا ہو اس طرح سترہ میں ہے دو نکال دیئے جائیں تو باقی پندرہ دن رہ جاتے ہیں۔ ان روایات سے ہر نماز کی مدت کے تعین کا استدلال کرنا ہی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سفر تو آپ کا غزوہ اور لڑائی کا سفر تھا۔ محارب کو ہر لمحہ ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ اسے آگے بھی بڑھنا پڑے اور پیچھے بھی ہٹنا اور واپس ہونا پڑے۔ یہ صورت حال بذات خود

نبی ﷺ کو بھی پیش آئی کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپؐ کو ایک چھوٹا سادستہ مجاہدین کا عزمی کے انہدام کیلئے روانہ کرنا پڑا اور اس دستہ کی قیادت اور امارت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی۔ پھر معاً بعد دو سراسر دستہ سواح بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس لشکر کی قیادت و امارت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔ پھر تیسرا دستہ مناة بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس کی امارت پر سعد بن زید کو مقرر فرمایا اور پھر چوتھا دستہ جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا اس کی قیادت بھی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ قبائل ثقیف و ہوازن کے اجتماع کی اطلاع ملی تو آپؐ نے خود آگے بڑھ کر ان کا سامنا کیا کہ وادی حنین میں ان سے ٹکھیر ہوگئی۔ یہاں پر پھر وہ معرکہ آرائی ہوئی اور گھمسان کارن پڑا جو مشہور و معروف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاہد و سپاہی اگر قیام کا ارادہ کرے خواہ فتح یابی و کامرانی کے بعد ہی ہو اس کی نیت معتبر تسلیم نہیں کی جائے گی۔ بلکہ اس کی تو کیفیت اس مسافر کی سی ہوگی جو اس تذبذب و تردد میں مبتلا ہو کہ آج واپسی ہوتی ہے یا کل۔ پس ایسا متردد و متذبذب مسافر ہمیشہ قصر نماز ہی ادا کرتا رہے گا خواہ یہ کیفیت سالوں اور مہینوں پر محیط ہو۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ نبی ﷺ کا فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر قصر نماز ادا فرمانا، قصر نماز کی مدت متعین پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اس بارے میں راجح مسلک وہی ہے جسے ائمہ ثلاثہ امام مالک رضی اللہ عنہ، امام شافعی رضی اللہ عنہ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا ہے کہ جو آدمی داخل اور خارج ہونے کے دونوں ایام کو چھوڑ کر صرف چار روز قیام کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہئے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ نبی ﷺ نے حجة الوداع کے موقع پر مکہ اور گرد و نواح میں دس دن گزارے تھے تو آپؐ ان ایام میں قصر نماز ادا فرماتے رہے۔ آپؐ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح داخل ہوئے اور مکہ سے آٹھ ذی الحجہ کے شروع دن سے نکلے تھے۔ اس دوران آپؐ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے کہ مناسک کی تکمیل فرمائی۔ اس اعتبار سے آپؐ کے قیام کی مدت صرف تین دن بنتی ہے داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دو دن اس سے خارج ہیں۔ آپؐ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے اس مدت سے زیادہ قیام فرمایا ہو اور آپؐ نے قصر نماز ادا کی ہو، یا اس سے کم مدت قیام فرمایا ہو اور قصر نماز ادا نہ فرمائی ہو۔ مناسک حج کی تکمیل کے بعد حضور ﷺ کا ماجرین کو مکہ میں تین دن سے زائد قیام کرنے سے منع فرمانا بھی ان کی دلیل ہے کہ مسافر اگر چار دن کا ارادہ کرے گا تو مقیم سمجھا جائے گا نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے جو امام مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یسود کو حجاز سے جلا وطن کیا پھر ان میں جو تاجر کی حیثیت سے حجاز میں آنا چاہے اسے بھی تین دن قیام کی اجازت دی تھی۔ مصنف نے اسے اپنی کتاب التلخیص الحیر میں نقل کیا ہے اور ابو زرعة نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ۱۹، ۱۸، ۱۷ اور ۱۵ روز قصر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی تطبیق اور روایات کے مابین جمع کی صورت تو اوپر مذکور ہے۔ اس لیے مختلف مکاتب فکر کے ہاں مدت قیام بھی مختلف ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں تین دن۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ۱۵ دن۔ مگر جب مسافر حالت تردد میں مبتلا ہو جائے اور واپسی کا حتمی فیصلہ نہ کر پائے تو ایسی صورت

میں بھی اختلاف آراء پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اپنے اصحاب سمیت اور ایک قول کی رو سے امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایسا تردد و متذبذب مسافر تادم زیست یا واپسی تک قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے آذر بایجان میں چھ ماہ تک قصر نماز پڑھی اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نیشاپور سال یا دو سال حالت تردد میں رہنا پڑا تو قصر ہی کرتے رہے۔ اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رامہرمز میں نو ماہ تک رکنا پڑا تو وہ قصر ہی کرتے رہے۔ ان واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ تردد اور تذبذب کی حالت میں قصر کی مدت مقرر نہیں ہے، بلکہ جب تک ضرورت کا تقاضا ہو اتنی مدت تک قصر جائز ہے۔

(۳۴۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيغَ الشَّمْسُ، أَخَّرَ الظُّهْرَ إِلَى وَقْتِ الْعَصْرِ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، فَإِنْ زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب زوال آفتاب سے پہلے سفر کا آغاز فرماتے تو ظہر کی نماز کو عصر کی نماز تک مؤخر کر لیتے تھے۔ پھر سواری سے نیچے تشریف لاتے اور ظہر و عصر دونوں نمازوں کو اکٹھی ادا فرماتے اور جب آفتاب آغاز سفر سے پہلے زوال پذیر ہو جاتا تو پھر نماز ظہر ادا فرما کر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةِ الْحَاكِمِ فِي الْأَرْبَعِينَ بِالإِسْنَادِ الصَّحِيحِ: صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ ثُمَّ رَكِبَ.

اور حاکم کی اربعین میں سند صحیح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر کی نمازیں پڑھیں پھر سواری پر سوار ہوئے۔

وَلِأَبِي نُعَيْمٍ فِي مُسْتَخْرَجٍ مُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ فَرَأَتْ الشَّمْسُ صَلَوَاتِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ جَمِيعًا، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

اور ابونعیم کی ”مستخرج“ میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہوتے اور آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو آپ ظہر و عصر دونوں اکٹھی ادا فرما کر وہاں سے کوچ کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ارتحل﴾ سفر میں آرام اور استراحت کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کرنا۔ ﴿تزیغ الشمس﴾ آفتاب کا نصف النہار سے مغرب کی جانب زوال پذیر ہونا ”صلی الظهر ثم ركب“ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز ظہر ادا فرماتے تھے، عصر کی نماز کو اس کے ساتھ نہیں ملاتے تھے لیکن حاکم اور ابونعیم کی روایت میں صاف صاف ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر و عصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں اکٹھے پڑھا۔ حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے سفر میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جمع تقدیم ہو یا تاخیر دونوں طرح ثابت ہے۔ احناف جمع حقیقی کے قائل نہیں جمع صوری کے قائل ہیں۔ مگر ترمذی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمع

صوری نہیں بلکہ جمع حقیقی تھی۔ چنانچہ اس کا مفہوم ہے کہ جب آفتاب زوال پذیر ہونے سے پہلے آپ سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز فرماتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور مستخرج ابو نعیم کی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے مصنف مرحوم نے ذکر کیا ہے۔

(۳۴۸) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنْ مَوْلَى أَبِي جَبَلٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے تو آپ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھتے اور مغرب و عشاء اکٹھی پڑھتے تھے۔ (مسلم)

(۳۴۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقْصُرُوا الصَّلَاةَ فِي أَقَلِّ مِنْ أَرْبَعَةِ بُرْدٍ، مِنْ مَكَّةَ إِلَى عُسْفَانَ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ، كَذَا أَخْرَجَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر نہ کرو چار برد مکہ سے عسفان تک فاصلہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿برد﴾ ”باء“ اور ”راء“ دونوں پر ضم ہے۔ برید کی جمع ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ لہذا چار برد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ ﴿عسفان﴾ عین پر ضمہ بوزن عثمان ہے۔ بڑا قصبہ ہے مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ جس آدمی نے استدلال کیا کہ چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر جائز نہیں اس نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے۔ مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی عبد الوہاب بن مجاہد متروک الحدیث ہے اور امام ثوری رحمہ اللہ نے تو اسے کذاب تک کہا ہے اور ازدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کا اپنے باپ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ لہذا یہ حدیث منقطع اور ضعیف ہے اور ناقابل استدلال ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما خود مکہ اور طائف کے مابین جتنے فاصلہ پر قصر کرتے تھے۔ نیز مکہ اور عسفان اور مکہ اور جدہ کے مابین جتنے فاصلہ پر بھی قصر کرتے تھے اسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی مؤطامیں نقل کیا ہے مگر اس میں موقوف روایت سے فاصلہ کی تعیین نہیں ہوئی۔

(۳۵۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنْ مَوْلَى أَبِي جَبَلٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

مختصر بیان کیا ہے)

راوی حدیث: ﴿سعید بن مسیبؓ﴾ کبار تابعین کے سردار تھے۔ علم کے اعتبار سے ان سب سے وسیع علم رکھتے تھے۔ انہوں نے فقہ، حدیث، زہد، عبادت اور تقویٰ و ورع کے بارے میں بہت کچھ جمع کیا ہوا تھا۔ یعنی جمع العلوم شخصیت تھے۔ ان کی پیدائش حضرت عمرؓ کی خلافت کے دو سال بعد ہوئی تھی اور ۹۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ (مسیب) اس میں ”یاء“ پر تشدید اور فتح اور تشدید اور کسرہ دونوں طرح بڑھا گیا ہے۔

(۳۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَتْ بِي بَوَاسِيرٌ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الصَّلَاةِ، فَقَالَ: «صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ اس صورت میں میں نے نبی ﷺ سے نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ”کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو پھر بیٹھ کر پڑھو اور اس کی بھی طاقت و استطاعت نہ ہو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو۔“

(بخاری)

لغوی تشریح: ﴿بواسیر﴾ یہ بہت برا مرض ہے۔ مقعد کے امراض سے تعلق رکھتا ہے۔ مقعد کی رگوں کا پھیل جانا اس کا سبب ہے اور با اوقات خون اس میں سے بہتا ہے۔ بواسیر جمع ہے اس کا واحد باسور ہے۔

حاصل کلام: بیٹھے کی صورت بعض کے نزدیک چار زانو ہے اور بعض کے نزدیک تشدد کی سی صورت۔ دراصل بات یہ ہے کہ مریض جس طرح آسانی سے بیٹھ سکتا ہے اسی طرح بیٹھے اسے ہر طرح اجازت ہے۔ چت لیٹ کر پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کسی حالت اور کسی پہلو بھی ممکن نہ ہو تو پھر جو صورت اختیار کر سکتا ہو کر لے۔

(۳۵۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَت جَابِر رَضِيَ اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَادَ النَّبِيُّ ﷺ ایک مریض کی عیادت فرمائی تو دیکھا کہ وہ تکیہ پر مَرِيضًا، فَرَاهُ يُصَلِّي عَلَى وَسَادَةٍ فرمایا کہ ”زمین پر نماز پڑھ اگر تمہارے بس میں ہے فَرَمَى بِهَا، وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الْأَرْضِ إِنْ اسْتَطَعْتَ، وَإِلَّا فَأَوْمِ إِنْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ اسے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے اس کے موقوف ہونے وَفَّقَهُ. کو صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿عاد﴾ عیادت سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے کسی مریض سے ملاقات کرنے یا دریافت احوال کو ﴿وسادۃ﴾ تکیہ جو سونے والا اپنے سر کے نیچے رکھتا ہے۔ یہی حدیث اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

(۳۵۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ کو متربعا (چار زانو) ہو کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ يُصَلِّي مُتَرَبِّعًا. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے) الْحَاكِمُ.

لعوی تشریح: ﴿متربعا﴾ تربع سے ماخوذ ہے ہے۔ بیٹھنے کی ایک قسم ہے وہ اس طرح کہ اپنا دایاں پاؤں اپنی بائیں ران کے نیچے اور اپنا بایاں پاؤں اپنی دائیں ران کے نیچے بٹھا کر مقعد پر بیٹھنا۔ حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ چار زانو بیٹھ کر بھی نماز جائز ہے۔

نماز جمعہ کا بیان

۱۲ - بَابُ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ

(۳۵۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (دونوں) سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے سنا ہے کہ ”لوگ نماز جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ لازماً غافل اللہ عَلَى قُلُوبِهِمْ، ثُمَّ لِيَكُونَنَّ مِنَ الْغَافِلِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. لوگوں میں شمار ہوں گے۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿باب صلاة الجمعة﴾ جمعہ کے جیم اور میم پر ضمہ اور میم پر فتح اور جزم بھی جائز

ہے۔ ﴿اعواد﴾ عود کی جمع جس کے معنی لکڑی ہیں، یہاں مراد منبر کی لکڑی سے ساختہ سیڑھیاں یا یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ اس منبر پر تشریف فرما تھے جو عود سے بنا ہوا تھا۔ یہ منبر ۷ھ یا ۸ھ میں انصاری خاتون کے غلام میمون نامی نے تیار کیا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ پھر بعد میں مروان نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں پہلے منبر کے نچلے حصہ میں چھ سیڑھیاں مزید بنا دیں۔ یہ منبر ۶۵۳ھ تک باقی رہا اور مسجد نبوی جب ۶۵۳ھ میں آگ لگنے سے جل گئی تو یہ منبر رسول اللہ ﷺ بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آکر خاکستر ہو گیا۔ (ابن السلام) ﴿عن ودعهم﴾ ”واؤ“ پر فتح اور ”دال“ ساکن، مصدر ہے اور فاعل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿الجمعات﴾ اس کا مفعول ہے یعنی ان لوگوں کا جمعہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ﴿اولیٰ ختمن اللہ﴾ اللہ تعالیٰ لازماً مرگادے گا۔ ﴿علیٰ قلوبہم﴾ ان کے دلوں پر پائیں طور کہ دلوں پر رنگ چڑھا دے گا تو یہ لوگ جمعہ کے لطف اور اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے دلوں میں سختی اور سنگ دلی پیدا فرما دے گا۔ ﴿ثم لیكونن﴾ پہلے نون پر ضمہ اور دوسرے پر تشدید۔ جمع کا صیغہ ہے۔ نون ثقیلہ برائے تاکید یعنی ”پھر وہ لازماً ہو جائیں گے۔“

حاصل کلام: جمعہ کے لغوی معنی ایک جگہ جمع ہونے کے ہیں جسے دور جاہلیت میں ”عروبہ“ کہتے تھے۔ اسلام نے اس کا نام جمعہ رکھا کہ مسلمان ایک مخصوص دن میں مخصوص اوقات میں عبادت الہی کیلئے مجتمع ہوں اور مل کر سب اکٹھے عبادت کریں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر بھی ہوں اور اجتماعی فیصلے بھی کئے جاسکیں۔

اس حدیث سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، اسے بغیر کسی عذر شرعی کے ترک کرنے پر دلوں پر مہر لگ جاتی ہیں اور آدمی دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے آخر کار منافقین و غافلین کے زمرہ میں شامل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا نماز جمعہ کو معمولی سمجھ کر اس بارے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرنا رسوائی اور خذلان کا موجب ہے اور توفیق الہی سے محروم رہنے کا باعث ہے۔

(۳۵۵) وَعَنْ سَلْمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ حَضْرَتِ سَلْمَہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: كُنَّا رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے۔ جمعہ نُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ الْجُمُعَةَ، سے فارغ ہو کر جب ہم اپنے گھروں کو جاتے تو اس ثَمَّ نَنْصَرِفُ وَلَيْسَ لِلْحَيِطَانِ ظِلٌّ وقت دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم سایہ میں نَسْتَظِلُّ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. بیٹھ کر آرام کر لیتے (یا سایہ میں چل کر گھر پہنچ جاتے) وَفِي لَفْظٍ لِّمُسْلِمٍ: كُنَّا نَجْمَعُ مَعَهُ۔ (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں) إِذَا زَالَتْ الشَّمْسُ، ثُمَّ نَرْجِعُ، نَتَّبِعُ اور مسلم میں ہے کہ آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے جب زوال ہو جاتا پھر واپس ہوتے۔

لغوی تشریح: ﴿حيطان﴾ حائط کی جمع، دیوار کے معنی ہیں۔ ﴿ظل نستظل به﴾ دیواروں کا اپنا

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ بہت جلد ادا کی جاتی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے بہر حال نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وقت بھی نماز ظہر کا وقت ہی ہے۔ علماء اسلام کی اکثریت اسی طرف ہے البتہ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے بھی ہو جاتا ہے۔ نیز امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک خطبہ جمعہ تو زوال سے پہلے جائز ہے مگر نماز درست نہیں وہ زوال آفتاب کے بعد ہی ہے۔ اس دور میں جمعہ کی نماز ظہر کی نماز سے بھی زیادہ دیر سے پڑھتے ہیں جو سراسر حضور ﷺ کے عمل کے مخالف ہے۔ خطباء و ائمہ مساجد کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ﴾ ابو مسلم ان کی کنیت ہے۔ سلمہ بن عمرو بن اکوع اور اکوع کا نام سان بن عبد اللہ اسلمی مدنی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں نہایت بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے تیز رفتار تھے کہ دوڑنے میں گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بہت سخی، فاضل اور بھلائی کا پتلا تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(۳۵۶) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلَا نَتَعَدَّى إِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِسُلَيْمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (جمعہ کے روز) ہم دوپہر کا قیلولہ اور کھانا نماز جمعہ کے بعد کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں ہے ”یہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا۔“

لغوی تشریح: ﴿نقیل﴾ قیلولہ سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ قیلولہ دوپہر کے وقت ذرا ستانے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ نیند نہ آئے ﴿تسغدی﴾ غداء سے ماخوذ۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نصف النہار سے قبل نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ مگر اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ ”قیلولہ“ اور ”غداء“ کا اطلاق زوال کے بعد پر مجاز کیا گیا ہے اور مدینہ و مکہ میں لوگ قیلولہ اور دوپہر کا کھانا نماز ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری سے ثابت ہوتا ہے۔ ﴿وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهِيرَةِ﴾ (۵۸/۲۳) یعنی جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیا کرتے تھے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں نماز جمعہ جلدی ادا کی جاتی تھی۔ صحابہ کرامؓ نماز جمعہ کے بعد گھر واپس جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے پھر دوپہر کا آرام (قیلولہ) کرتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سہل بن سعد رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو العباس ہے۔ خزرجی سلمیٰ انصاری ہیں۔ ان کا اسم گرامی حزن تھا۔ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے سہل رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ برا نام ہو تو اسے بدل دینا چاہئے۔ جب آپؐ کی وفات ہوئی اس وقت سہل پندرہ برس کے تھے۔ ۹ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہی صحابی تھے۔ ان سے تقریباً ایک سو احادیث مروی ہیں۔

(۳۵۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ كَهْرُءٍ هُوَ كَرِ ارْشَادَ فَرَمَايَا كَرْتِي تَحِي كِه شَام سِي يَخْطُبُ قَائِمًا، فَجَاءَتْ عِيْرٌ مِّنْ اِيَكِ تَجَارَتِي قَافِلَهٗ اَكْيَا۔ سَبْ لُوكِ اِسْ قَافِلَهٗ كِي الشَّامِ، فَانْفَتَلَ النَّاسُ اِلَيْهَا، حَتَّى طَرَفَ چھٹ گئے سَرَفْ بَارِهٖ اَدَمِي خُطْبِهٖ سَنِي كِيلِي بَاقِي لَمْ يَبْقَ اِلَّا اَنَّا عَشَرَ رَجُلًا۔ رَوَاهُ رِهْ گئے۔ (مسلم) مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ﴿عیر﴾ عین کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ ساکن۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹ۔ مراد اس جگہ تجارتی قافلہ ہے۔ ﴿فانفتل﴾ جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگ گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ مسنون یہی ہے اور خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا۔ نماز کے بعد نہیں۔ نیز ثابت ہوا کہ بارہ افراد بھی ہوں تو جمعہ درست ہے۔ شوافع نے جو چالیس کی تعداد کو ضروری قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں۔

(۳۵۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَذْرَكَ رَحْمَةً مِّنْ صَلَاةِ الْجُمُعَةِ وَعَبَّرَهَا فَلْيُصِفْ اِلَيْهَا أُخْرَى، وَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُهُ»۔ رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهٗ وَالْذَاقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَاسْنَادُهُ صَحِيحٌ، لَكِنْ قَوَى أَبُو حَاتِمٍ اِزْسَالَهُ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے نماز جمعہ اور دیگر نمازوں میں سے کسی کی ایک رکعت (جماعت کے ساتھ) پالی تو وہ دوسری اس کے ساتھ ملا لے۔ تو بس اس کی نماز پوری ہوگئی“ (اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو قوی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمعہ کی ایک رکعت پالینے والا دوسری رکعت ساتھ ملا کر دوسری رکعت پوری مکمل کر لے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک رکعت ہی پاسکے گا اس کا خطبہ جمعہ تو فوت ہوگا۔ مگر جمعہ اس کا صحیح ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ دونوں کی یہی رائے ہے۔ خطبہ جمعہ میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ مصنف رحمہ اللہ نے گویا اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے مگر التلخیص میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن (من ادرك الركعة فقد ادرك الصلاة) کی صحت میں تو کسی کو کلام نہیں۔ جس کے عموم میں جمعہ بھی شامل ہے۔

لغوی تشریح: ﴿انباء﴾ انباء (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ جو تمہیں خبر دے، اطلاع دے۔

(۳۶۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ أَحْمَرَتْ عَيْنَاهُ، وَعَلَا صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتَّى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُولُ: «صَبِّحَكُمْ وَمَسَاكُمْ»، وَيَقُولُ: «أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ،

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تو رخ انور سرخ ہو جاتا۔ آواز بلند ہو جاتی اور جوش بڑھ جاتا (جس سے غصہ کے آثار نمایاں ہوتے۔ بس اسی طرح کی کیفیت ہو جاتی) جیسے کسی لشکر کو ڈانٹ رہے ہیں کہ ”دشمن کا لشکر صبح کو پہنچا یا شام کو پہنچا“ اور فرماتے ”حمد و صلاۃ کے بعد۔ بہترین بات اللہ کی

وَحَبَرَ الْهَدْيَ هَذِي مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا، وَكُلُّ بِذْعَةٍ صَلَاةٌ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کتب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ کاموں میں بدترین کام نئے کام ہیں (بدعت کے کام) اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔ (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: كَانَتْ خُطْبَةُ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: يَحْمَدُ اللَّهَ، وَيُنْيِي عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِنْزِلِ ذَلِكَ، وَقَدْ عَلَا صَوْتُهُ.

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے جمعہ کے روز نبی ﷺ کا خطبہ (یوں) ہوتا تھا کہ اللہ کی حمد اور اللہ کی ثناء بیان کرتے پھر اس کے بعد (خطبہ) فرماتے تو آپ کی آواز بلند ہوتی۔

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ».

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے ”جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دے یا جسے راہ ہدایت پر گامزن فرما دے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ جسے وہ گمراہ کر دے پھر اسے راہ ہدایت دکھانے اور چلانے والا کوئی نہیں۔“ اور نسائی میں ہے ”وکل ضلالۃ فی النار“ ہر گمراہی انجام کار آگ میں داخلہ کا موجب ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کانہ منذر﴾ یعنی اس شخص کی طرح جو اپنی قوم کو لشکر عظیم سے ڈراتا ہے جو غارت گری کرنے والا ہے۔ ﴿یقول﴾ وہ ڈرانے اور متنبہ کرنے والا اس قوم سے مخاطب ہے ﴿صبحکم﴾ باب تفعیل سے یعنی دشمن صبح سویرے تم پر یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ ﴿مساکم﴾ یہ بھی باب تفعیل سے ہے یعنی دشمن شام کے وقت تم پر حملہ آور ہو۔ دونوں کا مفہوم ہے کہ بالکل قریب ہے کہ دشمن تم پر نازل ہو جائے۔ ﴿الہدی﴾ ”ہاء“ پر فتح اور دال ساکن۔ راستہ اور طریق کے معنی۔ ﴿محدثاتہا﴾ ﴿فی نئی چیزیں بدعتیں۔ جن کا نہ ثبوت کلام الہی میں ہو اور نہ سنت نبویؐ میں۔﴾ یشنی علیہ﴾ انہی یشنی‘ باب افعال سے ثاء سے ماخوذ ہے ”یاء“ پر ضمہ اور نون پر کسرہ۔ تعریف اچھے اوصاف و اعمال پر ﴿ثم یقول علی الرذالک﴾ یعنی اس کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے ”اثر“ حمزہ پر فتح بھی ہے اور کسرہ بھی آسکتا ہے۔ ﴿من یهد اللہ﴾ یہ جملہ آپ حمد کے بعد اور شہادت سے پہلے ادا فرماتے ﴿وکل ضلالۃ﴾ کو ﴿کل بدعۃ ضلالۃ﴾ کے بعد کہتے۔ اس حدیث سے یہ تقسیم ثابت نہیں ہوتی کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سینہ اور دوسری بدعت حسنہ۔ بلکہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہی ہے خواہ حسنہ ہو۔ سطحی عقل و خرد کے مالک حضرات کے نزدیک۔ اس کی بنیاد دراصل اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو شارح بنانا ہے اور یہ تو کھلی گمراہی و بدراہی ہے اور جو حسنہ (نیکی و بھلائی) ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بدعت ہو اور جو بدعت ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ حسنہ (نیکی و بھلائی) ہو۔

حاصل کلام: یہ وہ خطبہ مسنونہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ثابت ہے۔ خطبہ کے دوران خطیب پر مختلف واردات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کسی وقت چہرے پر ایسے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں اس سے سامعین کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خطبہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثناء ہونی چاہئے۔ خطبہ مختصر مگر جامع ہو۔ خطبہ میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سامعین اس سے متاثر بھی ہوں اور محفوظ بھی، لیکن تکلف سے اجتناب کرنا چاہئے۔ خطبہ کو طول دینے سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مختصر، مگر جامع خطبہ سامعین کی سمع خراشی کا موجب نہیں بنتا بلکہ اسے یاد رکھنا سہل اور آسان ہوتا ہے اور اپنا بہترین اثر چھوڑتا ہے۔

(۳۶۱) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ حَضَرْتُ عُمَارَ بْنَ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقَصَرَ خُطْبَتِهِ مِثْنَةٌ مِنْ فِقْهِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمار بن یاسرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”آدمی کی نماز لمبی رسول اللہ ﷺ اور خطبہ مختصر اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قصر﴾ قاف کے نیچے کسرہ اور ”صاد“ پر فتح ہے۔ مختصر کے معنی میں ﴿مِثْنَةٌ﴾ میم پر فتح اور ممزہ کے نیچے کسرہ اور نون پر فتح اور تشدید۔ معنی علامت، نشانی۔ یہ انسان کے فقیہہ و دانا ہونے کی علامت و نشانی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خطیب کی عقلمندی کی علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی نماز لمبی اور خطبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مختصر بات یاد رکھنی، ذہن نشین کرنی آسان ہوتی ہے۔ آنجناب ﷺ کے خطبات جمعہ عام طور پر مختصر مگر جامع ہوتے تھے جنہیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا، بآسانی نوک زبان ہو جاتے تھے۔ مگر صد افسوس کہ اس دور میں ہمارے خطباء کی عموماً گنگا الٹی چلتی ہے یعنی خطبہ لمبا اور نماز مختصر، خلاف سنت اس طریقہ کی بہر نوع اصلاح ضروری ہے۔

(۳۶۲) وَعَنْ أُمِّ هِشَامِ بِنْتِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا أَخَذْتُ هَقَّ الْقُرْآنِ الْمَجِيدِ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، يَفْرَأُهَا كُلُّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورہ ق لسان مآب ﷺ سے سن کر اذہر کر لی آپؐ ہر جمعہ اس سورہ کو منبر پر کھڑے ہو کر خطاب جمعہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں سامعین کو قرآن مجید سنانا اور سمجھانا چاہئے۔ اس حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ نے عموماً سورہ ق خطبہ جمعہ میں تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ

حضرت ام حشام رضی اللہ عنہا نے سن سن کر ساری سورہ زبانی یاد کر لی۔ اس سورہ میں چونکہ موت، قیامت، جنت، دوزخ اور بند و ناصح کا ذکر ہے اس لئے عموماً آپ اس کی تلاوت کرتے، تاکہ آخرت یاد آئے اور فکر و عمل کی طرف طبیعت مائل رہے۔ خطبہ میں لایعنی قصے، بے مقصد باتیں شعرو شاعری حتی کہ شریک اشعار مزاج شریعت کے منافی ہے۔ جس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ام حشام رضی اللہ عنہا﴾ حارث بن نعمان کی بیٹی، عمرہ بنت عبد الرحمن کی ماں جانی بن۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق کی وجہ سے انصاریہ نجاریہ کہلائیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خاتون بیعت الرضوان میں شریک تھیں۔

(۳۶۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ لَا بَأْسَ بِهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے جمعہ کے روز اس وقت بات کی جب امام منبر پر کھڑا خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے کتابیں اٹھائی ہوئی ہیں اور اس کا بھی جمعہ نہیں جس نے اسے کہا کہ خاموش رہ (اسے احمد نے ایسی سند سے روایت کیا جس کے متعلق (ابن عباس) کہہ دیا ہے)

وَهُوَ يُفَسِّرُ حَدِيثَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي الصَّحِيحَيْنِ مَرْفُوعًا: «إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: أَنْصِتْ، يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ».

اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے جو صحیحین میں منقول ہے ”جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ رہ اور امام اس وقت خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو تو نے بھی لغو بات کی یا اپنا جمعہ لغو کر دیا۔

لغوی تشریح: ﴿اسفار﴾ سفر کی جمع ہے۔ سفر کے سین کے نیچے کمرہ۔ سفر کے معنی کتاب اور صحیفہ کے ہیں اور اسفار کتابوں کے معنی میں ﴿انصت﴾ امر کا صیغہ ہے، معنی ہے خاموش رہ۔ ﴿لیست له جمعة﴾ یعنی اسے جمعہ کی فضیلت نہیں ملے گی بلکہ اس سے محروم رہے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس کی نماز جمعہ تو ادا ہو جائے گی مگر وہ جمعہ کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ (سبل) جو آدمی دوسرے کو دوران خطبہ بات کرنے سے منع کرتا ہے، اس کا حال یہ ہے تو جو گفتگو کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اس کی حرمان فیسی کے کیا کہنے اور اس دھمکی و وعید کا کتنا مستحق ہے۔ ایسے شخص کو گدھے سے تشبیہ دی گئی جو کتابوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ صرف بوجھ تلے دبا ہوا ہے ورنہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جو اپنا قیمتی وقت، کاروبار، گھر چھوڑ کر نماز جمعہ کیلئے دور سے چل کر آتا ہے مگر اپنی نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے

دوران خطبہ گفتگو کا ارتکاب کر کے ثواب اور اجر سے محروم رہ جاتا ہے اور جمعہ کا ثواب اسے نہیں ملتا۔ ﴿وہو یفسر﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی متن والی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات میں لفظ لغو کی وضاحت کرتی ہے کہ لغو کا کیا معنی ہے۔ ﴿لغو﴾ یعنی تو نے لغو کام کیا اور بے فائدہ کام کا ارتکاب کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ نمازیوں کو پورے سکون و اطمینان سے پورے انہماک اور توجہ سے بغور سننا چاہئے۔ کسی قسم کی ناروا حرکت نہیں کرنی چاہئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی بولنے اور گفتگو کرنے کی حماقت بھی کرتا ہے تو اسے بھی منع نہیں کرنا چاہئے۔ پورا دھیان خطبہ کے مضامین کی طرف ہو۔

(۳۶۴) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ، فَقَالَ: «صَلَّيْتُ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَمُ فَصَلْ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جمعہ کے روز ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ نبی ﷺ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے آنے والے سے دریافت فرمایا نماز پڑھی ہے؟ وہ بولا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قم فصل﴾ تم اور صل دونوں امر کے صیغہ جس آدمی نے پہلے دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو اسے دوران خطبہ بھی دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ مستحب ہیں اور یہ حدیث اس کے استحباب پر دلیل ہے۔ یہ دونوں رکعتیں یا جمعہ سے پہلے کی ہیں یا پھر تحیۃ المسجد کی۔ اگر یہ تحیۃ المسجد کی شمار ہوں تو پھر یہ دلیل ہے اس بات کی کہ تحیۃ المسجد کسی کے پہلے بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ آپؐ کا اس آدمی کو فرمانا کہ کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص مسجد میں آکر بیٹھ گیا تھا اور نماز نہیں پڑھی تھی۔

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی دو رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے اور اس میں استماع خطبہ کے عام حکم کی تخصیص ہے۔ دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت بات چیت کر سکتا ہے بلکہ نئے آنے والے کو دو رکعت نماز پڑھنے کی تلقین بھی کر سکتا ہے۔ احناف ان دو رکعتوں کے قائل نہیں۔ یہ حدیث ان کی تردید کرتی ہے۔

(۳۶۵) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلَاةِ الْجُمُعَةِ سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عموماً جمعہ کی نماز میں سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقین پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنِ الثُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ كَانَ اور مسلم ہی کی روایت میں، جس کے راوی نعمان یَقْرَأُ فِي الْعِيدَيْنِ وَفِي الْجُمُعَةِ بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں آپ نماز عیدین اور جمعہ کی نماز میں «سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» «وَهَلْ سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (سورۃ اعلیٰ) اور وہل اَنَّاكَ حَدِيثُ الْعَاشِيَةِ» .

اتاک حدیث الغاشیة (سورۃ غاشیہ) پڑھتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض نمازوں میں آپ بالعموم مخصوص سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں وہی سورتیں انہیں نمازوں میں پڑھنی چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سورتوں کے علاوہ دوسری سورتیں پڑھنی ممنوع ہیں۔ مذکورہ بالا سورتوں کا نماز عیدین اور جمعہ میں پڑھا جانا اپنے اندر بہت سی حکمتیں پنہاں رکھتا ہے۔ ان سورتوں میں سے سورۃ جمعہ کا پڑھنا یہ حکمت رکھتا ہے کہ اس میں نماز جمعہ کیلئے آنے کی سعی و کوشش کرنے کی ترغیب ہے جو جمعہ کی اہمیت پر دلالت ہے۔ نماز جمعہ میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی آتے تھے اس لئے ان کی گوشمالی کیلئے سورۃ منافقین پڑھتے تھے کہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ نیز سورۃ اعلیٰ اور سورۃ غاشیہ میں احوال و اموال آخرت بکثرت بیان ہوئے ہیں۔ آخرت کی یاد دہانی تازہ کرنے کیلئے پڑھتے تھے۔ سورۃ جمعہ میں نبوت کی فضیلت اور اس کی چار حکمتیں بھی مذکور ہیں اور امت پر حضور ﷺ کے احسان کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ نیز ذکر الہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور سورۃ منافقین میں نفاق پر زجر و توبخ کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: (نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ) ان کی کنیت ابو عبد اللہ - انصار میں سے تھے۔ ہجرت کے ۱۴ ویں مہینہ انصار میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ پھر ان کو کوفہ کا والی بنایا گیا اس کے بعد محض کا۔ ۶۴ھ راحط کے دن خالد بن غلی کلاعی نے ان کو قتل کر کے منصب شہادت پر فائز کیا۔

(۳۶۶) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ اللہُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ نے نماز عید پڑھی اور جمعہ کے بارے میں رخصت و العید، ثُمَّ رَخَّصَ فِي الْجُمُعَةِ، اجازت دے دی اور فرمایا ”جو پڑھنا چاہے پڑھ فَقَالَ: «مَنْ شَاءَ أَنْ يَصَلِّيَ فَلْيَصَلِّ» . لے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ بجز ترمذی کے زَوَّاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ . اور ابن خزمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی دن میں جمعہ اور عید آجائیں تو آپ نے نماز عید ادا فرمائی اور جمعہ کو ہر آدمی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ”اس دن دو عیدوں کا اجتماع ہو گیا ہے پس جو چاہے عید کی نماز کو کافی سمجھ لے البتہ ہم جمعہ ضرور ادا کریں گے۔“ اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر عید کے روز جمعہ ہو تو عید پڑھنے کے بعد جمعہ ادا کرنا فرض نہیں رہتا بلکہ ظہر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر احناف اس کے قائل نہیں۔ نیز عوام

کالانعام کا یہ تصور کہ عید اور جمعہ اکٹھے ایک ہی دن آجائیں تو برسرِ اقتدار حکومت کا زوال ہوتا ہے تو یہ سراسر وہم پر مبنی ہے۔ آپؐ نے تو اسے دو عیدوں کا دن قرار دیا ہے مگر بے خبری میں عوام اس سے بدگٹھنی لیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

(۳۶۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "جَبْ تَمَّ مِثْلُ سَلَامٍ مِنْ سَلَامٍ" (مسلم)

فَلْيَصِلْ بَعْدَهَا أَرْبَعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ بلکہ اکثر علماء رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے بعد آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گھر پر جمعہ کے بعد دو اور مسجد میں چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یوں ہی کرتے تھے۔ احناف جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کے قائل ہیں مگر کسی بھی صحیح مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

(۳۶۸) وَعَنْ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذَلِكَ: أَنْ لَا نُؤْصِلَ صَلَاةَ بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سائب بن یزید رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رحمہ اللہ نے فرمایا جب تم نماز جمعہ پڑھو تو پھر دوسری کوئی نماز اس کے ساتھ نہ ملاؤ تاوقتیکہ تم سے کوئی بات کر لے یا وہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح حکم دیا تھا کہ ہم نماز جمعہ کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں تاوقتیکہ ہم کوئی بات نہ کر لیں یا وہاں سے نکل جائیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: "فلا تصلها" "وصل" سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ نہ ملا اس کے ساتھ فرض جمعہ کے ساتھ۔ "تخرج" نکل جا۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مسجد سے باہر نکل جا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں فرض نماز ادا کی ہے اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد اسی جگہ فوراً کھڑے ہو کر سنتیں نہیں پڑھنی چاہئے۔ یہ حکم صرف جمعہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر نماز کے نفل اور فرض میں فرق بذریعہ انتقال جگہ یا گفتگو کر لینی چاہئے۔ تاکہ نفل کا فرض پر اشتباہ نہ ہو۔ نبی ﷺ نوافل و سنن بالعموم گھر پر ادا فرمایا کرتے تھے اور بہتر بھی یہی ہے۔ نوافل و فرائض ایک ہی جگہ نہ پڑھنے کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا نامہ اعمال میں درج ہو جائے اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے۔

(۳۶۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ اغْتَسَلَ، ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ الْإِمَامُ مِنْ خُطْبَتِهِ، ثُمَّ يُصَلِّيَ مَعَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى، وَفُضِّلَ ثَلَاثَةٌ»

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو آدمی غسل کر کے جمعہ کیلئے آئے پھر نماز پڑھے جتنی اس کیلئے مقدر ہو۔ پھر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے کہ امام خطبہ جمعہ سے فارغ ہو پھر امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے بلکہ مزید تین دن کے اور بھی۔“ (مسلم)

آیام۔ رواہ مسلم۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز جمعہ کی بڑی ترغیب ہے۔ جو شخص غسل کر کے آئے خطیب کے آنے سے پہلے ذکر و عبادت میں مصروف رہے۔ امام خطبہ شروع کرے تو خاموشی سے خطبہ سنے اور نماز جمعہ پڑھے تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

(۳۷۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ،
فَقَالَ: «فِيهِ سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ
مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي، يَسْأَلُ اللَّهَ
عَزَّ وَجَلَّ شَيْئًا، إِلَّا أَغْضَاهُ إِثَابَهُ».
وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ
لِلْمُسْلِمِ: «وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيفَةٌ».

اور مسلم کی مروی روایت میں ہے کہ وہ وقت خفیف سا ہوتا ہے

نغوی تشریح: "یقْلِلْهَا" تَقْلِيل سے مأخوذ ہے۔ قلت وقت کی جانب اشارہ فرما رہے تھے "خفیفہ" کے معنی بھی قلیل، تھوڑا سا۔ وہ گھڑی بہت ہی مختصر سی ہے جس میں دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز ایک مخصوص وقت ایسا ہے جس میں بندے کی ہر دعا (بجز قطع رحمی اور گناہ) شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تعیین بیان نہیں فرمائی۔ اس گھڑی کو بھی شب قدر کی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا تا کہ لوگ اس کو تلاش کرنے میں اپنا زیادہ سے زیادہ قیمتی وقت صرف کریں۔ اس طرح ان کا شوق جب تو بڑھے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ ہو۔

(۳۷۱) وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلَاةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ أَنَّهُ مِنْ قَوْلِ أَبِي بُرْدَةَ.

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ”وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتام جماعت تک کے دوران میں ہے۔“ (مسلم) اور دارقطنی نے تو اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابو بردہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

وَفِي حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ عَنْ ابْنِ مَاجَةَ، وَجَابِرٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: أَنَّهَا مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ.

اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے اور جابر رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد اور نسائی نے روایت نقل کی ہے کہ وہ گھڑی نماز عصر سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصہ میں ہے۔

وَقَدْ اخْتَلَفَ فِيهَا عَلَى أَكْثَرِ مَنْ أَرَبَعِينَ قَوْلًا أَمْلَيْتُهَا فِي شَرْحِ الْبُخَارِيِّ.

اس میں مختلف علماء کے چالیس اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کو فتح الباری شرح بخاری میں لکھ دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ہی﴾ اس سے مراد جمعہ کے روز ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ ﴿املئتها﴾ یہ سارے اقوال میں نے وہاں تحریر کر دیئے ہیں ”الماء“ دراصل اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی لکھوائے اور دوسرا اسے لکھے۔ اس گھڑی کے بارے میں دو اقوال زیادہ مشہور ہیں (۱) عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کے وقت میں (۲) آغاز خطبہ سے اختتام نماز کے دوران وہ گھڑی ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے قابل ترجیح کونسا قول ہے؟ بعض نے ان کے مابین بایں طور پر جمع و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ گھڑی ان دو وقتوں میں باری باری منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جمع و تطبیق کی صورت میں یہ تطبیق سب سے اچھی ہے۔ لیکن جمع و تطبیق کی اس صورت میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان اوقات میں تو نماز پڑھنا ممنوع ہے اور گزشتہ حدیث میں ﴿وہو قائم یصلی﴾ کے الفاظ ہیں کہ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا ہو تو گویا اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا انتظار کرنے

راوی حدیث: ﴿ابوسردہؓ﴾ عامر بن ابی موسیٰ اشعری۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے حدیث سنی۔ اسی برس سے زیادہ عمر یا کر ۴۰ھ میں فوت ہوئے۔ بردہ کا اعراب۔ ”یا“ بر ضمہ اور ”را“ ساکن۔

﴿عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابویوسف ہے۔ علماء یہود میں سے بڑے معتبر عالم تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بنو قیقلق سے تعلق تھا۔ مدینہ منورہ میں نبی ﷺ کی تشریف آوری پر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ان خوش بخت و خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی گئی۔ مدینہ منورہ میں ۴۳ھ میں وفات پا کر جنت میں آرام فرما رہے ہیں۔

(۳۷۲) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: مَضَتْ السُّنَّةُ أَنَّ جَارِي رَهَاہے کہ چالیس یا اس سے کچھ اوپر کی تعداد پر جمعہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف و کمزور سند سے روایت کیا ہے)

غلوٰی تشریح: ﴿مضت السنۃ﴾ سنت طریقہ جاری ہے نافذ چلا آرہا ہے۔ ﴿فصاعدا﴾ چالیس کی تعداد سے زائد ﴿بإسناد ضعیف﴾ یہ سند اس لئے ضعیف ہے کہ اس میں ایک راوی عبدالعزیز بن عبدالرحمن ضعیف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس سے مروی احادیث کے متعلق کہا ہے کہ ان پر لکیر بھیر دو۔ اس لئے کہ وہ جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں (موضوع ہیں) نسائی نے کہا ہے کہ یہ راوی ثقہ نہیں اور دارقطنی نے اسے منکر حدیث قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس کے ساتھ احتجاج ہی جائز نہیں۔ جب تجھے یہ معلوم ہو گیا تو جمعہ کیلئے کوئی متعین مقدار کی شرط لگانا ایسی حدیث کے ذریعہ جائز ہی نہیں۔

حاصل کلام: نماز جمعہ کیلئے نمازیوں کی تعداد کے بارے میں کسی صحیح حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے علماء کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً کسی نے چار، کسی نے سات اور کسی کے نزدیک نو، بارہ اور کسی نے بیس اور چالیس اور پچاس اور ستر کی رائے دی ہے۔ ان میں سے کسی کی بنیاد و اساس مرفوع حدیث صحیح پر نہیں ہے۔ جماعت تو دو آدمی بھی کر سکتے ہیں چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ سفر میں دو آدمی ہوں تو ایک اذان کے اور جو زیادہ علم شریعت اور قرآن زیادہ جانتا ہو وہ جماعت کرائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے چالیس کی تعداد ہونا ضروری ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک امام کے علاوہ دو مزید آدمیوں کا ہونا کافی ہے۔ البتہ وہ جمعہ کیلئے بڑے شہر کی شرط عائد کرتے ہیں جو قطعاً صحیح نہیں۔ اسلام میں پہلا جمعہ جو اٹی بستی میں ادا کیا گیا جو بڑے شہر کی تعریف سے خارج ہے۔

(۳۷۳) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حَضْرَتِ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ هَرَجَعَهُ مَوْمِنَ مَرْدُوں اور عورتوں کیلئے بخشش كَانَ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ کی دعا فرمایا کرتے تھے۔ (اسے ہزار نے کنزور سند سے فِي كُلِّ جُمُعَةٍ رَوَاهُ الْبَزَارُ بِإِسْنَادٍ لَيْسَ۔ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطیب کو جمعہ میں اپنے لئے اور دوسرے مسلمان مردوں اور عورتوں کیلئے دعاء مغفرت کرنا مسنون و مشروع ہے۔ اس کی سند میں یوسف بن خالد بستی ضعیف ہے جسے بعض نے کذاب بھی کہا ہے۔

(۳۷۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِي الْحُطْبَةِ يَقْرَأُ آيَاتٍ مِّنَ الْقُرْآنِ، يُذَكِّرُ النَّاسَ۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، مُسْلِمٌ (ابوداؤد اور اس کی اصل وَأَضَلَّهُ فِي مُسْلِمٍ۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھنی مسنون ہیں۔ خطیب کو ان آیات کے ذریعہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب، اخلاق و کردار کی درستگی کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔ جتنی اصلاح آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں موضوع احادیث، من گھڑت قصوں کہانیوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۳۷۵) وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ، إِلَّا أَرْبَعَةً: مَمْلُوكٌ، وَامْرَأَةٌ وَصَبِيٌّ وَمَرِيضٌ» رواہ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے ابو داؤد وقال: لَمْ يَسْمَعْ طَارِقٌ مِّنَ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ مِنْ رِوَايَةِ طَارِقٍ۔ کی یہی روایت حاکم نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے ذکر کی ہے) الْمَذْكُورَ عَنْ أَبِي مُوسَى۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام، عورت، بچہ اور مریض پر جمعہ فرض نہیں۔ اگر پڑھ لیں تو پھر ان کو ظہر نہیں پڑھنا پڑے گی۔ ورنہ نماز ظہر ادا کریں گے۔

راوی حدیث: (طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ) یہ کوفہ کے باشندے تھے۔ قبیلہ بجیلہ سے تعلق تھا اس لئے کوئی اور بجلی کہلائے۔ نبی ﷺ کی زیارت ہوئی مگر آپ سے کچھ سنا نہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے دور

(۳۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «لَيْسَ عَلَى مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ».
اے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)
رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

(۳۷۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا اسْتَوَى عَلَى الْمِنْبَرِ، اسْتَقْبَلَنَاهُ بِوُجُوهِنَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثٍ (موجود ہے)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم اپنے رخ آپ کی طرف موڑ لیتے۔ (اسے ترمذی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اس کا شاہد ابن خزیمہ میں موجود ہے)

ضروری نہیں۔ اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اجماع ہے۔ (سبل) اس حدیث کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ ایسا راوی ہے جسے متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے مگر خود مصنف نے ذکر کیا ہے کہ اس کا شاہد موجود ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خطیب خطبہ جمعہ کے وقت کسی چیز کا سہارا لے سکتا ہے۔ یہ مستحب ہے۔ حکمت اس کی یہ ہے کہ بولنے والے کیلئے ڈھارس کا کام دیتا ہے۔ ہاتھ بے فائدہ حرکت کرنے سے بچے رہتے ہیں اور آدمی میں تھکاوٹ کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿حکم بن حزن رضی اللہ عنہ﴾ حکم میں ”حا“ اور ”کاف“ دونوں پر فتح۔ بن حزن ”حا“ پر فتح اور ”زا“ ساکن۔ ان کا پورا نام یہ ہے حکم بن حزن بن ابی وہب مخزومی۔ ان کے اسلام کے بارے میں

ایک قول یہ ہے کہ جنگ یمامہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔

۱۳ - بَابُ صَلَاةِ الْخَوْفِ - نماز خوف کا بیان

(۳۷۹) عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ رَحِمَهُ اللَّهُ، عَمَّنْ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلَاةَ الْخَوْفِ: أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ، وَطَائِفَةٌ وَجَاهَ الْعَدُوَّ، فَصَلَّى بِالَّذِينَ مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوا، فَصَفُّوا وَجَاهَ الْعَدُوَّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْأُخْرَى، فَصَلَّى بِهِمُ الرُّكْعَةَ الَّتِي بَقِيَتْ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَوَقَعَ فِي الْمَعْرِفَةِ لِابْنِ مَنْدَه: عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ، عَنْ أَبِيهِ.

حضرت صالح بن خوات رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص سے روایت کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔ اس شخص نے بیان کیا کہ ایک گروہ نے آپ کے ساتھ نماز کیلئے صف بندی کی اور ایک دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ کیلئے اس کے روبرو صف بند ہو گیا۔ آپ نے ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ صف باندھ کر کھڑے تھے ایک رکعت پڑھائی اور آپ سیدھے کھڑے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر باقی نماز مکمل کر لی اور چلے گئے۔ جا کر دشمن کے سامنے صف بند ہو گئے۔ پھر دوسرا گروہ آیا۔ آپ نے اسے باقی اپنی ایک رکعت پڑھائی اور بیٹھے رہے انہوں نے اس دوران میں اپنے طور پر نماز مکمل کر لی پھر آپ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ (بخاری و مسلم۔ مگر متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابن مندہ کی "المعرفة" میں ہے کہ صالح بن خوات اپنے والد سے بیان کرتے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿باب صلاة الخوف﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خوف کی حالت میں نماز پڑھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کفار کے لشکر کے با مقابل ہو۔ ہنوز باہمی جنگ و جدال شروع نہ ہوئی ہو۔ نیزے پھینکنے اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئی ہو۔ رہی یہ صورت کہ فریقین میں مڈبھیڑ ہو چکی ہو، ہندو قوتوں کے منہ کھل گئے ہوں، توپوں کے دھانے گولوں کی آگ اپنے دھانوں سے اگل رہے ہوں۔ ٹینک گولے برسا رہے ہوں۔ جنگی طیاروں کے ذریعہ بم گرائے جا رہے ہوں۔ تو ایسے وقت میں مخصوص طریقہ

حاصل کلام: صلاۃ خوف کئی طریقہ سے پڑھی گئی ہے جیسا موقع محل ہوتا تھا اس کی مناسبت سے نماز ادا کی گئی۔ مذکورہ بالا حدیث میں وہی صورت ذکر ہوئی ہے جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے یعنی امام نے ہر ایک گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور ایک، ایک رکعت انہوں نے اپنے طور پر پڑھی۔ پہلے گروہ نے تو خود سلام پھیرا مگر دوسرے گروہ نے نبی ﷺ کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور کے نزدیک خوف کی صورت میں سفر و حضر دونوں میں نماز خوف پڑھنا جائز ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط لگاتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ”اذا ضربتم فی الارض.....الایہ“ میں دو شرطیں ہیں۔ ایک سفر اور دوسری خوف دشمن۔ مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نماز خوف اور نماز قصر دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔ سفر میں قصر کیلئے خوف دشمن کی شرط نہیں اور صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط نہیں۔ دونوں نمازوں کے ساتھ کوئی شرط لگانا بے معنی ہے۔

راوی حدیث: ﴿صالح بن خوات﴾ خوات بن جبر بن نعمان انصاری مدنی۔ ”خا“ پر فتح اور واو پر فتح اور تشدید۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ بہت سے صحابہ کرامؓ سے حدیث سنی ہے۔ یہ حدیث انہوں نے یا تو حضرت سہل بن ابی حمزہؓ صحابیؓ سے سنی ہے یا پھر اپنے والد سے۔ جس طرح اسی حدیث کے آخر سے واضح ہو رہا ہے۔

﴿خواتین﴾ جلیل القدر صحابی ہیں۔ پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے غزوہ احد ہے اور ایک قول کے مطابق غزوہ بدر میں بھی شریک تھے۔ ۴۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۱ یا ۷۲ سال کی تھی۔

(۳۸۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ شَرِبَ مِنْ مَاءٍ لَمْ يَسْقِهِ أَحَدٌ فَهُوَ كَأَنَّهُ شَرِبَ مِنْ مَاءِي بَيْتِي

تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَبْلَ نَجْدِ فَوَازِينَا دُشْمَنَ كَبَالِكِ مُقَابِلِ صَفِ بَسْتَةٍ تَحْتَهُ كَمَا رَسُلُ اللَّهِ الْعَدُوَّ، فَصَافَفْنَاهُمْ، فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَصَلَّى بِنَا، فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَعَهُ، وَأَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى الْعَدُوِّ، وَرَكَعَ بِمَنْ مَعَهُ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ أَنْصَرَفُوا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِي لَمْ تُصَلِّ، فَجَاءُوا، فَكَرَعَ بِهِمْ رَكْعَةً، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ، فَكَرَعَ لِنَفْسِهِ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

طرف نبی ﷺ کی معیت میں کسی غزوہ میں گیا۔ ہم دشمن کے بالکل مقابل صف بستہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ، فقام رسول اللہ ﷺ، فصالی بنا، فقامت طائفة معہ، واقبلت طائفة علی العدو، ورکع ایک جماعت دشمن کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ جو جماعت آپ کے ساتھ نماز میں شریک تھی اس نے آپ کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کئے اور اس گروہ کی جگہ واپس چلی گئی جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس جماعت کے افراد آئے آپ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی دو سجدوں کے ساتھ۔ پھر آپ نے سلام پھیر دیا مگر دونوں گروہوں نے اٹھ کر الگ الگ اپنی رکعت پوری کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿قبیل﴾ قاف کے کسرہ اور فتح دونوں سے۔ طرف، جہت کے معنی میں۔ ﴿نجد﴾ بلاد عرب کی سطح مرتفع جو حجاز کے مشرق میں واقع ہے۔ ﴿فوازینا﴾ مقابلہ پر آئے۔ بالمقابل ﴿فصافنا﴾ صف بندی کی ہم نے۔ ہم دو صفوں میں کھڑے ہوئے اور یہ موقع نماز عصر کا تھا ﴿ثم انصرفوا﴾..... الخ ﴿پہلی رکعت مکمل کر کے واپس چلے گئے۔ ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی تھی اور سلام بھی نہیں پھیرا تھا اور اس وقت نبی ﷺ سیدھے کھڑے رہے﴾ ﴿فجاؤوا﴾ اس گروہ کے لوگ آئے جو پہرہ دے رہے تھے دشمن کے سامنے یا حفاظت کر رہے تھے ﴿ثم سلم﴾ پھر نبی ﷺ نے تنہا سلام پھیرا۔ ﴿فقام کل واحد﴾..... الخ ﴿ہر گروہ الگ الگ اٹھا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بقیہ رکعت ایک دوسرے کے بعد پوری کی اور ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ نے پہلے پوری دونوں رکعتوں کو ملا کر اکٹھے پڑھ لیا۔ پھر پہلے گروہ کی جگہ پر چلا گیا اور پہلا واپس آیا اور اس نے ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیرا اس طرح اس کی بھی نماز کی دو رکعتیں پوری ہو گئیں۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ کے بقول نماز خوف کے سلسلہ میں چھ یا سات صحیح احادیث بھی ثابت ہیں۔ ان میں سے جس کے مطابق پڑھی جائے جائز ہے۔ کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ حالات کے مطابق جس طور

پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ اس نماز کے مسنون و مشروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے نیل الاوطار میں اور صاحب زاد المعاد نے بھی اس نماز کی چھ یہی کیفیتیں بیان کی ہیں اور جن حضرات نے اس سے زیادہ کی ذکر کی ہیں۔ انہوں نے جہاں کہیں بیان واقعہ میں اختلاف دیکھا اسے الگ شمار کر لیا۔ حقیقت میں وہ الگ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

(۳۸۱) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ صَلَاةَ الْخَوْفِ، فَصَفَّفْنَا صَفَيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَالْعَدُوُّ بَيْنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ، وَكَبَّرْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَكَعَ، وَرَكَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَرَفَعْنَا جَمِيعًا، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ، وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ الْعَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ قَامَ الصَّفُّ الَّذِي يَلِيهِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز خوف میں حاضر تھا۔ ہم نے دو صفیں بنائیں ایک صف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑی ہوئی جبکہ دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ اکبر کہا اور ہم سب نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ نے رکوع کیا اور ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپ نے رکوع سے سر اوپر اٹھایا اور ہم سب نے بھی اپنے سر اٹھائے پھر آپ سجدے میں گر گئے اور آپ کے ساتھ والی صف بھی اور دوسری صف دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑی رہی۔ جب آپ نے سجدہ پورا کر لیا تو وہ صف جو آپ کے قریب تھی کھڑی ہو گئی۔ پھر راوی نے ساری حدیث بیان کی۔

وَفِي رِوَايَةٍ: ثُمَّ سَجَدَ، وَسَجَدَ مَعَهُ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، فَلَمَّا قَامُوا سَجَدَ الصَّفُّ الثَّانِي، ثُمَّ تَأَخَّرَ الصَّفُّ الْأَوَّلُ، وَتَقَدَّمَ الصَّفُّ الثَّانِي، وَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ، وَسَلَّمْنَا جَمِيعًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلَا يَبْنِي دَاوُدُ عَنْ أَبِي عِيَّاشَةَ الرَّزِّيِّ مِثْلَهُ، وَزَادَ: إِنَّهَا كَانَتْ بِمُسْتَفَانٍ.

ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ نے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ پہلی صف نے بھی سجدہ کیا اور جب یہ سب کھڑے ہو گئے تو دوسری صف سجدے میں چلی گئی اور پھر پہلی صف پیچھے ہٹ گئی اور دوسری صف آگے آگئی اور پہلے کی طرح ہی ذکر کیا اور آخر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور ہم سب نے بھی سلام پھیر دیا۔ (مسلم)

اور ابو داؤد نے ابو عیاش زرقی سے اس طرح روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ ”وہ عسغان مقام پر (ادا کی گئی) تھی۔“

وَلِلنَّسَائِيِّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ جَابِرٍ، اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِطَائِفَةٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَصْحَابُ رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ بَاخَرَيْنِ أَيْضًا رَكَعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ. وَمِثْلُهُ لِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

لغوی تشریح: ﴿صف خلف رسول اللہ ﷺ﴾ یعنی اس صف کے پیچھے ایک دوسری صف مراد ہے۔ ﴿ثم انحدر﴾ پھر جھکے سجدہ کرنے کیلئے۔ ﴿والصف الذی یلیہ﴾ پھر وہ صف سجدہ کیلئے جھکی جو آپ کے قریب تھی اور پہلی تھی ﴿فی نحو العدو﴾ دشمن کے مقابل میں کھڑی ہو گئی۔ ہر چیز کا اول حصہ اس کا آخر کہلاتا ہے یہ دشمن جہینہ قبیلہ کے افراد تھے ﴿فلما قضی السجود﴾ جب سجدہ پورا کر لیا اور صحیح طور پر ادا کر لیا ﴿فذکر﴾ راوی حدیث نے ذکر کیا۔ ﴿الحديث﴾ ذکر کا مفعول ہے یعنی ساری حدیث بیان کی اور اس میں ہے کہ دوسری صف سجدے میں گر گئی۔ ﴿بعسفان﴾ عسفان بروذن عثمان۔ غزوۂ عسفان ۶ھ میں عمرہ حدیبیہ کے موقع پر واقع ہوا اس میں لڑائی کی نبوت نہیں آئی۔ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکیں۔ چنانچہ انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ مکہ کے راستہ میں حائل ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نماز نظر میں دیکھا تو سوچا کہ اب مسلمان اس وقت بے خبری کے عالم میں ہیں۔ کاش! ہم ان پر حملہ آور ہوئے تو کامیاب ہو کر ان کو قتل کر سکتے ہیں پھر نماز عصر میں بھی ہجوم برقرار رہا تو اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا حکم نازل فرمایا اور یوں خالد بن ولید کو حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر صلح ہوئی۔ جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ پس عسفان وہ پہلا غزوہ ہے جہاں نماز خوف پڑھی گئی اور پہلی نماز جو اس جگہ نماز خوف کی صورت میں ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جس کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ ﴿من وجہ آخر﴾ دوسری سند سے ﴿صلی بطائفة﴾ یعنی ایک جماعت نے فرض ادا کئے اور دوسری نے نفل۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفترض کے پیچھے منتقل کی نماز جائز ہے اور یہ نماز مذکورہ نماز کے علاوہ دوسری نماز ہے۔ یہ نماز تو عسفان کے موقع پر پڑھی گئی اور یہ بطن نخلہ میں۔ نماز خوف کی صورتیں احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ خوف کے موقع پر ان انواع میں سے جس نوعیت کی نماز پڑھے، جائز ہوگی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز خوف کی ایک اور صورت ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نماز خوف اقوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو، دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس

طرح آنجناب ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں۔ تو گویا آپؐ نے دو تو فرض پڑھے اور دو نفل ہوں گے۔ کیونکہ دو مرتبہ دو، دو فرض تو نہیں ہوتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی فرض پڑھ سکتے ہیں۔ احناف نے اس مقام پر انصاف سے کام نہیں لیا بجائے اس کے قیاس کو چھوڑ کر حدیث صحیح کا اتباع کرتے بلکہ طحاوی ایسے صاحب علم و فضل نے تو اتنا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو عیاش زرقی﴾ ان کا نام زید بن ثابت ہے انصاری زرقی مشہور ہیں۔ زرقی کے ”زا“ پر ضمہ اور ”را“ پر فتح ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ ۴۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(۳۸۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ حَذِيفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى صَلَاةَ الْخَوْفِ بِهَوْلَاءِ رَكْعَةً، رَكَعَتْ۔ انہوں نے نماز کو پورا نہیں کیا۔ (اسے احمد، وَهْلَاءِ رَكْعَةً، وَلَمْ يَقْضُوا۔ رَوَاهُ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَّمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، صَحَّحَ قَرَارٌ دِیَا ہے۔ ابن خزیمہ نے ابن عباس کے حوالہ سے وَمِنْهُ عِنْدَ ابْنِ حُزَيْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا۔ بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے)

حاصل کلام: یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز خوف کم از کم ایک رکعت ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ اس نظریے کا قائل ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری رحمہ اللہ، ضحاک رحمہ اللہ، ابن راہویہ رحمہ اللہ، عطاء رحمہ اللہ، طاؤس رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ، حکم بن عتیہ رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شدت خوف کے وقت اشاروں سے صرف ایک رکعت پڑھی جائے گی۔ ان کے نظریے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے مسلم اور ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر حضرت چار رکعتیں اور اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔ مگر جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کہتے ہیں تعداد رکعات میں خوف کی کوئی تاثیر نہیں۔

ان حضرات نے پہلی احادیث کی بہت دور کی تاویلات کی ہیں مگر الفاظ حدیث ان کی تردید کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں جس حدیث میں ایک رکعت کا ذکر ہے اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں رکعتیں امام کے ساتھ پوری نہیں کیں، بلکہ ایک رکعت اکیلے اکیلے پڑھی اور دو پوری کر لیں۔

(۳۸۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”نماز خوف ایک رکعت ہی ہے صَلَاةُ الْخَوْفِ رَكْعَةً عَلَى أَيْ جِسْ طَرَحٌ بھي ادا ہو جائے۔“ (اسے بزار نے ضعیف

وَجْهِ كَانُ. رَوَاهُ الْبَزَّازُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بعض حضرات امام اور مقتدی دونوں کیلئے ایک ہی رکعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ سفیان اسی کے قائل ہیں۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبد الرحمن الیمانی راوی تھ ضعیف ہے۔ اس حدیث میں ”جس طرح بھی ادا ہو جائے گی“ سے مراد ہے قبلہ رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ سوار ہو یا پیدل۔

(۳۸۴) وَعَنْهُ مَرْفُوعاً: لَيْسَ فِي حَضْرَتِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا سَهْوٌ أَوْ خَوْفٌ فِي سَجْدَةٍ سَهْوٌ نِيسٍ. (اسے دارقطنی نے ضعیف بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باسناد ضعیف﴾ ضعیف سند کے ساتھ کیونکہ یہ روایت عبد الحمید بن السری سے مروی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ امیر الیمانی نے ذکر کیا ہے کہ علماء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ (السل)

۱۴ - بَابُ صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ نماز عیدین کا بیان

(۳۸۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَهْوٌ أَوْ خَوْفٌ فِي سَجْدَةٍ سَهْوٌ نِيسٍ. (اسے دارقطنی نے ضعیف بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة العیدین﴾ عیدین سے مراد عید قربان اور عید فطر ہے۔ عید عربوں کے ہاں اظہار مسرت کیلئے ہر موسمی اجتماع کو کہتے ہیں۔ عید اسے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سال کے بعد واپس لوٹ کر آتی ہے اور بار بار آتی رہتی ہے یا پھر یہ معنی ہیں کہ اس کے واپس آنے کی وجہ سے مسرت و سرور لوٹ آتا ہے۔ دراصل عید، عود سے ماخوذ ہے۔ عید کے عین کے نیچے کسرہ اور ”یا“ ساکن ہے واؤ کو ”یا“ میں تبدیل کر دیا گیا ”یا“ کے ساکن ہونے کی وجہ سے اس کے ماقبل کسرہ واقع ہے (تو ایسی ”یا“ کو ”واؤ“ میں بدل دیتے ہیں) عید کی جمع اعیاد ہے ”یا“ کے ساتھ یہ اس لئے کہ اعیاد جس کا معنی خشک لکڑیاں ہوتا ہے کے اور اعیاد کے درمیان فرق واقع ہو جائے (اور لوگوں کے ذہن نشین بھی رہے) عید الفطر کا آغاز ۲ھ میں ہوا اور عید الاضحیٰ جیسا کہ ایک قول ہے کہ اس کی ابتدا بھی ۲ھ میں ہوئی۔ ترمذی اور مسند احمد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا۔ قربانی کرتے رہے۔ یہ حدیث تو اس کی مقتضی ہے کہ قربانی کا آغاز ہجرت کے پہلے سال سے ہی ہوا ہے لیکن

اس کا بھی احتمال ہے کہ لفظ عشر بطور غلبہ بولا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ﴿یَفْطِرُ النَّاسَ﴾ افطار سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے یہاں عید الفطر کو بطور عید بتانا مقصود ہے۔ ﴿یَضْحَى النَّاسَ﴾ یضحیٰ تضحیہ سے ماخوذ ہے اور یہ دراصل قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں اور پھر یوم النہی (قربانی کا دن) کو عید بتانے کیلئے بغیر کسی شرط کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ وہ دن ہوں گے جن میں لوگ یہ دونوں عیدیں منائیں گے۔ بالفاظ دیگر معنی یہ ہوئے کہ اگر لوگ چاند دیکھنے میں غلطی یا خطا کر جائیں تو پھر رمضان اور ذوالقعدہ دونوں کی تعداد تیس دن مکمل کر لیں۔ پھر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کیلئے باہر نکلیں اور مناسک حج بھی انہی تین دنوں کے حساب سے ادا کریں۔ اس کے بعد اگر ان کے سامنے یہ واضح اور ثابت ہو جائے کہ انہوں نے چاند دیکھنے میں غلطی کی اور خطا کھائی ہے اور مہینہ اگرچہ ۲۹ روز کا پورا ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں ہے بلکہ وہ صحیح ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ ہو چکا۔ یہ تو محض اللہ سبحانہ تعالیٰ کی جناب سے اپنے بندوں کیلئے تخفیف اور نرمی ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اگر کسی شخص واحد نے اپنے طور پر عید کا چاند دیکھ لیا تو قاضی صرف اس ایک کی شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا لہذا تنہا یہ آدمی اپنی روایت کے یقینی ہونے کی بنیاد پر کوئی عمل نہیں کرے گا نہ وہ روزہ رکھے گا اور نہ افطار کرے گا اور نہ قربانی کرے گا۔ بلکہ ان تمام امور میں وہ عام لوگوں کے ساتھ ہی رہے گا یا پھر غالب اکثریت کے ساتھ رہے گا۔ مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں جس پر اسے ذاتی طور پر یقین ہو اس کے مطابق وہ اس بارے میں فیصلہ کرے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اہل اسلام کی صرف دو ہی عیدیں ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری یا چوتھی کسی عید کا تصور اور نشان اسلام میں کہیں دور دور تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے جو اور عیدیں منانا شروع کر رکھی ہیں ان کی شریعت اسلامیہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیدیں اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادات میں اجتماعیت کا تصور ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر کوئی عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا۔ بلکہ اسے عید الفطر اور عید الاضحیٰ ادا کرنے میں لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت کرنی چاہئے اور اگر اسے یقین کمال ہو جائے تو پھر بھی عیدین کی نماز عام لوگوں کے ساتھ ہی ادا کرے گا البتہ روزہ افطار کر سکتا ہے۔

(۳۸۶) وَعَنْ أَبِي عُمَيْرٍ بْنِ أَنَسٍ، حضرت ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک چچا صحابیؓ عَنْ عُمُومَةٍ لَهُ مِنَ الصَّحَابَةِ، أَنَّ رَجُلًا جَاءُوا، فَشَهِدُوا أَنَّهُمْ رَأَوْا الْهَلَالَ بِالْأَنْسِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَفْطُرُوا، وَإِذَا أَصْبَحُوا أَنْ يَغْدُوا إِلَى مُصَلَّاهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا سے روایت کیا ہے کہ چند سوار آپؐ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے کل شام چاند دیکھا تھا۔ آپؐ نے حکم دے دیا کہ ”روزہ افطار کر دو اور کل صبح نماز عید کیلئے عید گاہ میں آجاؤ۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے یہ الفاظ

نَفْثُهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ. ابوداؤد کے ہیں اس کی سند صحیح ہے)

لعنوی تشریح: ﴿عمومۃ﴾ عم کی جمع ہے۔ جس کے معنی بچا کے ہیں ﴿من الصحابة﴾ صحابہ میں سے۔ یہ عمومۃ کی صفت واقع ہو رہا ہے یعنی یہ بچا صحابی تھے۔ یہ حدیث متصل ہے اس کی سند میں کسی قسم کا ضعف نہیں۔ صحابی کا نام نہ لینا نقصان دہ نہیں۔ ﴿رکبا﴾ ”را“ پر فتح اور کاف ساکن، راکب کی جمع ہے سواروں کی جماعت ﴿یغدوا﴾ ”یا“ پر فتح، صبح چلیں دن کے اول حصہ میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ۲۹ رمضان کو ایسی جگہ چاند نظر آجائے جہاں کا مطلع مختلف نہ ہو تو دوسرے روز صبح قبل اعتبار ذرائع سے اطلاع ملنے پر روزہ اسی وقت افطار کر دیا جائے گا۔ اگر قبل از زوال خبر ملی تو اسی روز نماز عید بھی ادا کر لی جائے ورنہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عید عید گاہ میں پڑھنی چاہئے اور اجتماعی طور پر پڑھنی چاہئے۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ چاند کی رویت کا اعلان سرکاری طور پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اعلان جانی پہچانی شخصیت کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ فی زمانہ شہادتوں کے بعد ریڈیو، ٹی۔ وی سے اعلان کیا جاسکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عبد اللہ بن مالک الانصاری تھا۔ انس کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صغار تابعین میں شمار ہوتا ہے، ثقہ تھے۔ چوتھے درجے کے راوی ہیں، اپنے باپ کے بعد کافی دیر زندہ رہے۔

(۳۸۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يَغْدُو يَوْمَ الْفِطْرِ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يَأْكُلُهُنَّ وَثَرَاتٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَفِي رِوَايَةٍ مُتَعَلِّقَةٍ - وَوَصَلَهَا أَحْمَدُ -: رَوَايَتٌ فِيهَا يَأْكُلُ الْفِطْرَ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يَأْكُلُهُنَّ وَثَرَاتٍ. (اے بخاری نے روایت کیا ہے اور ایک معلق البخاری، وَفِي رِوَايَةٍ مُتَعَلِّقَةٍ - وَوَصَلَهَا أَحْمَدُ -: رَوَايَتٌ فِيهَا يَأْكُلُ الْفِطْرَ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يَأْكُلُهُنَّ وَثَرَاتٍ.) میں ذکر کیا ہے کہ آپؐ ان کھجوروں کو ایک ایک کر کے تناول فرماتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) نماز عید کیلئے باہر جانا مسنون ہے۔ (۲) عید الفطر کیلئے جانے سے پہلے کھجوریں طاق صورت میں کھانی مسنون ہیں۔ (۳) کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں یہ تو تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی میٹھی چیز طاق صورت میں استعمال کر لینی چاہئے۔

کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی حریص و لالچی نہ بنے اور اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور طاق ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلتے، تاکہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(۳۸۸) وَعَنْ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں
أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر
يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتَّى يَطْعَمَ، وَلَا کیلئے کچھ نہ کچھ کھائے بغیر نہ نکلتے تھے البتہ عید
يَطْعَمُ يَوْمَ الْأَضْحَى حَتَّى يُصَلِّيَ. قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرمالیتے کچھ تناول
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ. نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے

اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ولا يطعم يوم الاضحى حتى يصلي﴾ آپ عید الاضحیٰ کو نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بیہقی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے۔ البتہ کھجوروں، چھوڑوں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پر سنا کہ ہے۔

(۳۸۹) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں حکم
تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرْنَا أَنْ نُخْرِجَ دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی
الْعَوَاتِقَ وَالْحَيْضَ فِي الْعِيدَيْنِ، عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تاکہ وہ بھی مسلمانوں
يَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ، کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں۔ البتہ حائضہ
وَتَعْتَرِلَ الْحَيْضُ الْمُصَلَّى. متفق علیہ۔ عورتیں عید گاہ کے کنارے پر رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں صرف دعا میں شرکت کریں) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿امرنا﴾ صیغہ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والے کا علم ہو سکے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور بخاری کی ایک روایت تو صاف طور پر امرنا نبینا کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ﴿ان نخرج﴾ اخراج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں لے کر عید گاہ کی طرف نکلیں۔ ﴿العواتق﴾ نوجوان بالغ لڑکیاں۔ جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عاتق کی جمع ہے اور نخرج کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿والحيض﴾ ”حائضہ“ پر ضمہ اور ”یا“ پر فتح اور تشدید، حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنہیں ایام حیض آرہے ہوں۔

عواتق پر اس کا عطف ہے۔ ﴿یشہدن الخیر﴾ اس روز کی برکت اور بھلائی اور فضیلت میں حاضر ہو کر حصہ دار بنیں۔ ﴿ودعوة المسلمين﴾ دعوت کا یہاں معنی دعا کے ہیں کہ سب عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔ ﴿وتعتزل﴾ الگ رہیں۔ جائے نماز سے۔

حاصل کلام: نماز عید کیلئے خواتین کا گھروں سے نکل کر جانا اس حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خود اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں کو عید گاہ میں لے جاتے تھے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ خواتین کا نماز عید میں حاضر ہونا واجب سمجھتے تھے۔

احناف نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور اسے ابتداء اسلام کا واقعہ بتایا ہے، تاکہ اہل اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو اور کثرت تعداد اہل کفر و شرک کیلئے باعث ازیت ہو اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھے۔ مگر یہ تاویل جس پر علامہ طحاوی نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے، قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گواہی دیتے ہیں کہ ازواج مطہرات وغیرہ عید پڑھنے جاتی تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کم عمر کے تھے ظاہر ہے کہ ان کی یہ گواہی فتح مکہ کے بعد کی ہے جس وقت اظہار قوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے عورتوں کو عید گاہ میں بہر نوع حاضر ہونا چاہئے۔

(۳۹۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ يُصَلُّونَ الْعِيدَيْنِ عِيدَيْنِ سَبَّحَهُمَا مِنْ بَيْتِهِمَا. (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں نماز پہلے ادا کی جائے اور خطبہ بعد میں۔ بنو امیہ کے دور میں مروان وہ پہلا حکمران ہے جس نے نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔ اسی وقت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس پر احتجاج کیا اور برملا کہا کہ تو نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ (صحیح مسلم)

(۳۹۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى يَوْمَ الْعِيدِ رَكَعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ پڑھا اور نہ بعد میں کوئی نماز پڑھی۔ (اسے ساتوں احمد) قَبْلَهُمَا وَلَا بَعْدَهُمَا. أَخْرَجَهُ الشَّيْخُ. (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عید گاہ میں سوائے دو رکعت نماز کے اور کوئی نماز پہلے یا بعد پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت نہیں۔ البتہ واپس جب گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(۳۹۲) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الْعِيدَ بِلَا أَذَانٍ ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے وَلَا إِقَامَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے) البخاری.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز عید بغیر اذان و اقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کیلئے اذان و اقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کی قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مننون ہے۔

(۳۹۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَصَلِّي قَبْلَ الْعِيدِ شَيْئًا، فَإِذَا رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ. انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ جب واپس گھر تشریف لے آتے تو دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عید گاہ میں نہیں البتہ گھر میں دو رکعت نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ (۳۹۴) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عید الفطر اور عید قربان کیلئے عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس کا آپؐ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کی طرف کھڑے ہوتے لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپؐ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپؐ سے ثابت نہیں۔ (۲) خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہئے۔ (۳) خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہئے۔ (۴) خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کرنا چاہئے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ (۵) سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہئے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہئے۔ (۶) نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عید گاہ میں پڑھنی مننون ہے۔ آج کل بلاعذر مسجدوں میں پڑھنے کا عام رواج ہو گیا ہے جو بہر حال ختم ہونا چاہئے۔ (۷) حضور ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عید گاہ میں منبر رکھوا دیا اور اس پر خطبہ دیا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے ابن حبان کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عید ضرور ارشاد

فرمایا ہے۔ جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔

(۳۹۵) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ ﷻ: «التَّكْبِيرُ فِي الْفِطْرِ سَبْعٌ فِي عید الفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں الْأُولَى، وَخَمْسٌ فِي الْآخِرَى، اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراء وَالْقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلْتَاهُمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو ت تکبیرات کے بعد ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت داؤد، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْبُخَارِيِّ تَصْحِيحًا. کیا ہے اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿سبع فی الاولی﴾ پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعاء افتتاح خواہ تکبیرات سے پہلے پڑھے یا بعد میں دونوں طرح جائز ہے۔ ﴿وخمیس فی الاخرۃ﴾ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں اور قیام کی تکبیران کے علاوہ اس طرح چھ تکبیریں ہوں گی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے کہ عن ابیہ عن جدہ سے اگر عمرو کا باپ شعیب اور عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے، امام دارقطنی وغیرہ نے تردید کی ہے کہ شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت ہے اور یہاں ”جدہ“ سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ جمہور ائمہ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام علی بن مدینی رحمہ اللہ، امام اسحاق رحمہ اللہ، امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، امام دارقطنی رحمہ اللہ، امام دارمی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہاء اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی۔ معلوم نہیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہاں نقل کیا ہے۔ مگر مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے وضاحت کر دی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی ”اعل الکبیر“ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے ”نصب الرایہ“ ص ۲۱۷، ج ۲ میں بھی اسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہؓ کی روایات سے بھی ہوتی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہؓ و تابعین اور فقہاء مدینہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ شارح ترمذی رحمہ اللہ علامہ عبدالرحمن مبارک پوری کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ ”القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید“ قابل دید ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بعض

(۳۹۶) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ
النَّبِيُّ ﷺ يَمُرُّ فِي الْأَضْحَى وَالْفِطْرِ
بِ «ق» وَاقْتَرَبَتْ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوداؤد لیثی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی نماز میں سورہ ق اور سورہ
اقتربت الساعۃ تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(۳۹۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْعِيدِ خَالَفَ الطَّرِيقَ. (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ابو داؤد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت ہے)

نفعی تشریح: (خالف الطريق) مطلب اس کا یہ ہے کہ عید گاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ۔ نبی ﷺ کی اقتداء میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہئے، تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(۳۹۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمَدِينَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا، فَقَالَ: قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللَّهُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا: يَوْمَ الْأَضْحَى، وَيَوْمَ الْفِطْرِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو روز کھیل کود کیلئے مقرر تھے۔ آپؐ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں کے بدلہ میں ان سے بہتر دو دن عنایت فرما دیئے ہیں۔ ایک عید الاضحیٰ کا دن اور دوسرا عید الفطر کا۔“ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اس کی سند صحیح ہے)

سُورۃ تَشْرِیْح: ﴿وَلَهُمْ﴾ ان کیلئے، سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ ﴿یَوْمَانِ﴾ دو دن، عید کے۔ فرحت اور مسرت کیلئے۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کرتے تھے وہ یومِ نیروز اور یومِ مہرجان۔ یہ دونوں کلمے فارسی

سے معرب کئے گئے ہیں۔ دراصل پہلا نو روز یعنی نیا اور جدید دن۔ اصل ہیئت کے نزدیک یہ شش سال کا پہلا دن ہوتا۔ اور پہلا دن وہ ہے جس روز سورج برج حمل میں منتقل ہوتا ہے اور دوسرے کلمے کی اصل مہرگان ہے یعنی گاف کے ساتھ۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کا اس نام کے ساتھ نام موسوم کر دیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں، نہ ان میں گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں اور یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ ہنوز بھی عید کے دن ہیں۔ بعض عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقلی کی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام ان دنوں کی عید منانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا، اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے۔ البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

(۳۹۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عید گاہ کی جانب پیدل تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السَّنَةِ أَنْ يَخْرُجَ چل کر جانا سنت ہے۔ (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور إِلَى الْعِيدِ مَا شِئًا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنٌ. حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عید گاہ میں پیدل چل کر جانا مسنون ہے۔ جتنے قدم انھیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی۔ اگر عید گاہ دور ہو تو سواری پر جانا بھی ناجائز نہیں۔

(۴۰۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک موقع پر عید تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي کے روز مسلمانوں کو بارش نے آیا تو نبی ﷺ نے يَوْمَ عِيدٍ، فَصَلَّى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ انہیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ (اسے ابو داؤد نے کمزور صَلَاةَ الْعِيدِ فِي الْمَسْجِدِ.. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ سند سے روایت کیا ہے)

بِإِسْنَادٍ لَيْدٍ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جاسکتی ہے۔ آپ عموماً نماز عید باہر عید گاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ مسئلہ کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبد اللہ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عید گاہ میں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وسیع و فراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عید گاہ میں ادا فرمائی ہے

نماز کسوف کا بیان

١٥ - بَابُ صَلَاةِ الْكُسُوفِ

(گرہن والی نماز)

(۴۰۱) عَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيمُ، فَقَالَ النَّاسُ: أَنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوْتِ إِبْرَاهِيمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنْ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ، لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَبَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْهُوا اللَّهُ وَصَلُّوا، حَتَّى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتَّى تَنْجَلِيَ».

وَلِلْبَخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ: اور بخاری میں ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ
 ”فَصَلُّوْا، وَادْعُوْا، حَتَّى يَنْكَسِفَ مَا“ ”نماز پڑھو“ دعا مانگو تا آنکہ وہ کیفیت تمہارے سامنے
 سے دور ہو جائے۔“

نغوی تشریح: ﴿باب صلاة الکسوف﴾ کسوف کہتے ہیں رنمت کی سیانی مائل تبدیلی کو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ﴿کسفت الشمس وانکسفت﴾ یعنی سورج بالکل سیاہ ہو گیا اس کی شعائیں غائب ہو گئیں اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے سورج گرہن کیلئے کسوف اور چاند گرہن کیلئے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کیلئے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ ﴿یوم مات

ابراہیم ؑ ابراہیم نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ ۱۰ھ کے ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ ﴿انکسفت لموت ابراہیم﴾ یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ و تخیل کے مطابق تھا کہ کسوف و خسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتا ہے۔ ﴿آیتان﴾ نشانیاں، علامات۔ ﴿من آیات اللہ﴾ اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت، وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں یا اپنے بندوں کو ڈرانے، خوف دلانے کیلئے یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت و طاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع و نقصان اور دفع ضرر کے مالک و مختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع و نقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ ﴿حتی تنکشف﴾ یہاں تک صاف ہو جائیں اور روشن ہو جائیں کہ ان پر چھائی ہوئی سیاہی اور بے نور پن دور ہو جائے۔ حتیٰ یکشف صیغہ مجہول ہے یعنی بلند ہو جائے اور اس پر وارد کیفیت گرہن دور ہو جائے، زائل ہو جائے۔ ﴿حتی تنجلی﴾ یہاں تک صاف اور روشن ہو جائے۔ ﴿حتی یکشف﴾ صیغہ مجہول ہے، یعنی بلند ہو جائے اور ڈھل جائے۔

حاصل کلام: آفتاب و ماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اپنی قدرت کے اظہار اور بندوں کے خوف اور ڈرانے کیلئے اتنی بڑی مخلوق کو خدا کے حضور پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطہ خداوندی نہیں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطہ سے سرمو انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع و ضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ و خیال کی تردید ہے۔

اس موقع پر نماز و دعا مسنون ہے نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپؐ سے ثابت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع (واذا رايتموها) اور جب تم انہیں دیکھو کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکرمہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس صورت کے علاوہ نماز کسوف و خسوف کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں۔ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام، دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے میں اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تو دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے۔ اس میں بھی چار اقوال ہیں۔ ایک قول کی رو سے بلند آواز سے پڑھی جائے گی۔ اس رائے کے حق میں امام احمد رحمہ اللہ، اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں آہستہ پڑھ لی جائے یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ ایک تیسرا قول ہے کہ دونوں میں اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھ لی جائے اور ایک چوتھا قول یہ ہے کہ آفتاب کو گرہن لگے تو آہستہ

پڑھی جائے اور اگر ماہتاب کو گرہن لگے تو بلند آواز سے پڑھنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ابراہیم رضی اللہ عنہ﴾ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے۔ ان کی والدہ کا نام ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ۔ اسکندریہ اور مصر کے حکمران نے انہیں حضور ﷺ کو ہدیہ دیا تھا۔ آپ کے بیٹے ابراہیمؑ جمادی الاولیٰ ۹ھ کو پیدا ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۲۹ شوال ۱۰ھ کو وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جنت میں ایک دودھ پلانے والی نے اس کی مدت رضاعت کو پورا کیا ہے۔“

(۴۰۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلَاةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ فِي رَكْعَتَيْنِ، وَأُزِيعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكَعَتَيْنِ، وَأُزِيعَ سَجَدَاتٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے منادی نے منادی کی جابجاء، وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: فَبَعَثَ مُنَادِيًا يُنَادِي بِالصَّلَاةِ كَرْنِے والے کو بھیجا جو ”الصلاة جامعة“ کی منادی کرتا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿اربع رکعات﴾ رکعات سے یہاں رکوع مراد ہیں ﴿فی رکعتین﴾ ہر رکعت میں دو رکوع ﴿واربع سجدات﴾ منصوب ہے اس وجہ سے کہ اس کا عطف اربع رکعات پر ہے۔ یہ اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کہ سجود میں اضافہ و زیادتی نہیں ان کی تعداد ہر رکعت میں دو ہی رہے گی ﴿الصلاة جامعة﴾ دونوں مرفوع واقع ہو رہے ہیں، اس لئے کہ ایک ابتداء اور دو سرا اس کی خبر واقع ہو رہا ہے اور منصوب ہونے کی صورت میں پہلا فعل محذوف کا مفعول ہو گا جو احضروا ہو سکتا ہے اور دو سرا پھر حال واقع ہو گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اذان کے علاوہ نماز کسوف کیلئے کسی اور طرح اعلان کرنا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع روایت جہری (بلند) آواز سے قراءت کی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے بلکہ رکوع کا اضافہ ہے۔ اس روایت کی رو سے آپ ایک رکعت میں دو رکوع فرماتے۔ ظاہر ہے ہر رکوع سے اٹھ کر نئے سرے سے قراءت کی ہوگی۔ اس طرح قراءت کا بھی اضافہ ہوا۔ نیز اس کا خاص وقت مقرر و متعین نہیں ہے، جب آفتاب کو گرہن ہو گا اسی وقت نماز پڑھی جائے گی۔ عام نمازوں کیلئے تو اذان مقرر ہے اور صلاة کسوف و خسوف کیلئے ”الصلاة جامعة“ کما مشروع ہے۔ نماز کیلئے یہ کما ثابت نہیں ہے۔

(۴۰۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلَاةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ فِي رَكْعَتَيْنِ، وَأُزِيعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكَعَتَيْنِ، وَأُزِيعَ سَجَدَاتٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: انْخَسَفَتْ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَصَلَّى، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا نَحْوًا مِّن قِرَاءَةِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَامًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الْقِيَامِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعًا طَوِيلًا، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الْأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انْصَرَفَ، وَقَدْ انْجَلَتْ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ.

اللہ تعالیٰ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپؐ نے نماز کسوف ادا فرمائی، اس میں سورہ بقرہ کی تلاوت کے برابر قیام کیا۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا۔ پھر کھڑے ہوئے تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم، پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم (لمبا) تھا، پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا۔ پھر سجدہ کیا پھر آخر کار سلام پھیر دیا تو (اس دوران) سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورج گرہن کے موقع پر آٹھ رکوع چار سجدوں کے درمیان ادا کئے۔

حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابرؓ سے یوں بھی ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

اور ابو داؤد میں حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ.

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى، فَكَرَعَ

خَمْسَ رَكَعَاتٍ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، رکوع اور دو سجدے پہلی رکعت میں کئے اسی طرح وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذَلِكَ. دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿نحواً من قراءۃ سورۃ البقرۃ﴾ تقریباً سورۃ بقرہ کی قرأت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں سورۃ فاتحہ آہستہ پڑھی گئی ہے بلند آواز سے نہیں۔ اس لئے کہ اگر نبی ﷺ نے سورۃ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو اسے اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں تمام کی تمام ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے قریب ہی کھڑے تھے پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت حضور ﷺ نے فرمائی ہوگی۔ بعینہ وہ اسے یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو تو ان کو اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور انہوں نے سورۃ بقرہ کی قرأت کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کے باوجود بلند آواز سے پڑھنے والی روایت صحیح ترین ہے اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مثبت ہیں اور یہ اصول ہے کہ مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے۔ ﴿دون القیام الاول﴾ یعنی پہلے قیام سے کم۔ دون القیام الاولی اور دون الركوع الاول کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا۔

حاصل کلام: تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دو دو رکوع تین تین رکوع چار چار رکوع اور پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں ثابت ہوتے ہیں۔ بعض نے ان کو جمع کر کے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ کسوف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے۔ بعض علمائے کرام نے ان احادیث کو راجح قرار دیا ہے۔ جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ صحیح سورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلہ کی تسبیح و تحقیق ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین، پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس روز فوت ہوئے وہ ۱۰ ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی۔ جبکہ انگریزی ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے وقوع کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلمان

منصور پوری نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سیرت ”رحمت للعالمین“ میں ذکر کیا ہے کہ سورج گرہن کی تعداد نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور اور بالخصوص ہجرت کے بعد دس بنتی ہے۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپؐ کے نخت جگر ابراہیم کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان سب کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کا کہ کہاں واقع ہوئے ہیں، تاکہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو مسلم نے عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیز اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو حادثہ پیش آیا ہے بخدا اسے ضرور میں دیکھوں گا۔ یہ سیاق دلالت کرتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کیلئے پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے، پہلے کا نہیں۔ مسلم اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراہیم کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے۔ لہذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے پہلا گرہن ۹ یا ۲۸ ربیع الآخر بمطابق ۱۳ اگست ۶۳۰ء کو اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلہ میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا گرہن ۹ شوال بمطابق فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا اور تیسرا گرہن ۱۰ شوال بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ گرہن دو ہوئے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینے میں پہلا گرہن یہ شدید گرمی میں واقع ہوا اور ابراہیم کی وفات پر جو جنوری کے مہینے میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن ہے اور جو ۹ شوال کے مہینے میں (فروری) میں واقع ہوا وہ دوسرا گرہن ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا ملاحظہ کرنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضی ہے۔ لیکن یہ تعدد روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تلاش میں سود مند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلق روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں۔ پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین، چار چار اور پانچ پانچ رکوع کئے۔ ابراہیم کی وفات کے روز گرہن کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔

عام طور پر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھی گئی ثابت ہے۔ پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں۔ پس ہمارے نزدیک خواہ ہم متعدد واقعات سے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ وہ روایات جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے وہ قوی ترین ہیں سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے صحیح ہونے کی وجہ سے رائج بھی ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث رائج ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپؐ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(۴۰۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلَّا جَنَّا النَّبِيَّ ﷺ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا». رَوَاهُ طبرانی دونوں نے روایت کیا ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ہوا اللہ تعالیٰ عنہما قال: ما هبت الریح قط، إلا جئنا النبی ﷺ علی رُکبتَیہ، وقال: «اللہم اجعلها رحمة، ولا تجعلها عذاباً»۔

الغوی تشریح: ﴿ہبت﴾ ہبوب سے ماخوذ ہے۔ نصر بنصر باب سے ہے، ہوا کا تیز و تند چلنا ﴿ریح مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں یا تیز و تند ہوا کو۔﴾ ﴿قط﴾ ”طاء“ پر تشدید۔ اس پر ہمیشہ ضمہ ہی آتا ہے (یعنی بالضم) ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کیلئے آتا ہے جس طرح ابد کا لفظ مستقبل کیلئے آتا ہے ﴿جفا﴾ نصر بنصر باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کیلئے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اندھیری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اسے ہمارے لئے باعثِ رحمت بنا، باعثِ عذاب نہ بنا۔ ایک دوسری حدیث میں ”ریح“ کی بجائے ”ریاح“ کا لفظ بھی آیا ہے کہ یا الہی! اس تیز و تند آندھی کو ریاہ بنا دے اور ریح نہ بنا کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے ریاہ کا لفظ رحمت کیلئے ہے اور ریح کا لفظ عذاب کیلئے۔ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں دونوں کا معنی ہوا ہے۔

(۴۰۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث بھی مروی

عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى فِي زَلْزَلَةٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هَكَذَا صَلَاةُ الْآيَاتِ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْهُ، دُونَ آخِرِهِ.

ہے کہ انہوں نے زلزلے کے موقع پر نماز چار رکعت، (ست رکعت) اور چھ رکوعوں سے پڑھی اور فرمایا کہ آیات کی نماز اسی طرح پڑھی جاتی ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی زلزلۃ﴾ اس میں فی سبب بیان کرنے کیلئے ہے (”فاء“ سببی ہے) معنی ہے زلزلہ کی وجہ سے ﴿ست رکعات﴾، ﴿اربع سجعات﴾ چھ رکوع اور چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے ہوتے تھے ﴿صلاة الایات﴾ آیات سے یہاں مراد ناگمانی اور پریشان کن واقعات ہیں ﴿دون آخرہ﴾ یعنی حدیث کے آخری الفاظ یعنی ”ہکذا صلاۃ لہ الایات“ نہیں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگمانی حادثہ، ارضی و سماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے ”صلاة الایات“ کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے دور کرنے کیلئے رجوع صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا چاہئے غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ان کو مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے جس کی بخشش نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ تمام کئے کرائے اعمال اکارت جائیں۔

نماز استسقاء کا بیان

۱۶ - بَابُ صَلَاةِ الْاسْتِسْقَاءِ

(بارش مانگنے کیلئے نماز)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بڑی تواضع کے ساتھ، سادہ لباس میں نہایت عاجزی و انکساری، بہت خشوع اور بڑی زاری اور تضرع کرتے ہوئے نماز کیلئے باہر نکلے۔ عید کی نماز کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابو عوانہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

(۴۰۶) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعًا، مُتَبَدِّلًا، مُتَحَشِّعًا، مُتَرَسِّلًا، مُتَضَرِّعًا، فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي الْعِيدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هَذِهِ. رَوَاهُ الْحَنَسِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة الاستسقاء﴾ استسقاء کے معنی ہیں باران رحمت کی طلب کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سقایہ اور سقی۔ پانی اور بارش کو کہتے ہیں اس لئے کہ پینے اور سیراب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿خرج﴾ عید گاہ کی طرف نکلے ﴿متواضعا﴾ تواضع سے ماخوذ ہے تواضع کہتے ہیں بڑائی اور تکبر کی ضد کو۔ بڑائی اور تکبر اظہار شان و آن ہوتی ہے، تواضع میں عاجزی و انکساری۔ ﴿متبذلا﴾ تبذل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے زیب و زینت کو چھوڑ دینا اور پھٹا پرانا کپڑا زیب تن کرنا اور ﴿متخشعا﴾ یعنی خشوع کو ظاہر کرنے والا اور اس کے بدن، نظر اور آواز سے دھیمہ پن نمایاں ہوتا ہے۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ﴿متسرلا﴾ جلد باز نہ ہو آرام و سکون سے چلنے والا۔ ﴿متضرعا﴾ تضرع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا۔ یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت و ضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغہ اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہے کہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿لم یخطب خطبتکم هذه﴾ تمہارے خطبہ کی طرح آپ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپ خطبہ کی حالت میں دعا تضرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابو داؤد میں روایت میں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نماز استسقاء رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقاء کے لغوی معنی پانی کیلئے درخواست کرنا، دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ استسقاء کی تین قسمیں ممکن ہیں۔ ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اوسط کی صورت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد باجماعت ادا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کیلئے باہر نکل کر عاجزی و انکساری، خشوع و خضوع کی حالت میں نماز استسقاء ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔

نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے کے دوران ایک آدمی نے آپ سے بارش کیلئے دعا کی درخواست کی تو آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور دعا فرمائی جس کے نتیجے میں بارش شروع ہو گئی اور آئندہ جمعہ تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ کے دوران دعا کر سکتا ہے اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ خطبہ کے دوران خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے نماز استسقاء عید کی نماز کی طرح ادا فرمائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں بھی کیں تھیں۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ محمد اور اس کا والد عبدالعزیز دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث اس کی تائید کر رہی ہے۔

خطبہ نماز استسقاء مختصر مگر جامع ہونا چاہئے۔ خطیب مقاصد خطبہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ بے موقع و

خلاف موقع گفتگو کر کے لمبا اور طویل بھی نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز استسقاء ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھنپھانا ہو، ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرے۔ اس کے بعد امام ان کو دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قرأت بلند آواز سے کریں۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے اس دوران چادر کو الٹا کرے۔

(۴۰۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: شَكََا النَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فُحُوطَ الْمَطَرِ، فَأَمَرَ بِمَنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي الْمَضَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْمًا يَخْرُجُونَ فِيهِ، فَخَرَجَ حِينَئِذٍ بَدَأَ حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى الْمَنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللَّهَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَذَبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللَّهُ أَنْ تَذْهَبُوا، وَوَعَدْتُكُمْ أَنْ يَسْتَجِيبَ لَكُمْ، ثُمَّ قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، الرَّحْمَنَ الرَّحِيمَ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ اللَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ الْمَعْنَى، وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلَاغًا إِلَى حِينِهِ. ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتَّى رَفَعَهُ بَيَاضُ إِبْطِلِيهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَّبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپ نے عید گاہ میں منبر لے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ چنانچہ منبر عید گاہ میں لا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں وہ سارے باہر نکلیں۔ آپ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا۔ تشریف لا کر آپ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی پھر (لوگوں سے مخاطب ہو) کر فرمایا ”تم لوگوں نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ حکم دے چکا ہے کہ اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا“ پھر فرمایا ”تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ لوگوں کے حق میں بڑا مہربان اور ہمیشہ ہر وقت مہربان ہے۔ روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الہ نہیں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لئے روزی اور مدت دراز تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر

وَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ، فَأَنشَأَ اللَّهُ تَعَالَى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ کی بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہو گئے اور اپنی چادر کو پھیر کر پلٹایا۔ آپؐ اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لمحہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بادل پیدا کیا وہ بدلی گرجی اور چمکی اور بارش برسنے لگی۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ و جید ہے)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ، وَفِيهِ: (تبدیلی چادر) کا قصہ اس طرح ہے پھر آپؐ نے قبلہ فَنَوَّجَهُ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلَّى رَكَعَتَيْنِ، جَهَرَ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ. وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوْلَ رِذَائِهِ لِيَتَحَوَّلَ سَلَى بَعْدَ طَرَحٍ مَحْرَجًا.

نماز ادا فرمائی۔ ان میں قرأت بلند آواز سے کی۔ اور دارقطنی میں ابو جعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنی چادر اس لئے پھیر کر بدلی کہ قحط سالی بھی اسی طرح پھر جائے۔

لغوی تشریح: ﴿قحوط المطر﴾ قحوط میں ”قاف“ پر ضمہ۔ قحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ معنی بندش بارش، باران رحمت کا نازل نہ ہونا ﴿ووعده الناس يوما﴾ یعنی ایک دن مقرر فرما دیا ﴿بدا﴾ نمایاں ہونا ظاہر ہے ﴿حاجب الشمس﴾ سورج کا ابو، سورج کا پہلا حصہ ایک کنارہ یا آفتاب کی روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ ﴿جذب دبارکم﴾ اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت ﴿ان يستجب لكم﴾ دعا کو قبول فرماتا ہے اپنے ارشاد کے مطابق جس میں ہے ﴿ادعونی استجب لكم۔ ۲۰/۶۰﴾ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا تمہاری پکار دعا کو اور فرمایا ﴿اجیب دعوتہ الداع اذا دعان: ۱۸۶/۲﴾ میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ ﴿العیث﴾ بارش۔ ﴿بلاغاً الی حسین﴾ یعنی ایسی روزی عطاء فرما جو ہمیں لمبے عرصہ تک چلے۔ ﴿البلاغ﴾ کے معنی ہیں جو کسی کو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ ﴿حتی رئی الخ﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿الابط﴾ جو حصہ، جسم، بازو اور کندھے کے نیچے ہے ﴿حول﴾ تحویل سے ماخوذ ہے معنی ہے کہ اس نے پلٹایا، پھیرا ﴿الی الناس ظہره﴾

لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف ﴿وَقَلْبُ دَدَانِه﴾ یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف اور نچلے حصہ کو اوپر کیا اور ظاہری حصہ کو باطن بنایا اور اس کی ہر کیفیت کو برعکس بھی کیا۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ (دائیں) سے بائیں طرف سے ٹپکی طرف کو پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے حصہ کو پکڑا پھر دائیں ہاتھ سے دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے یوں تو اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ ﴿وہو رافع یدبہ﴾ یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے ﴿فانشنا﴾ پیدا فرمایا ﴿فرعدت﴾ اس میں کڑک، گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ ﴿وبرقت﴾ بادل کا چمکنا ﴿فی الصحیح﴾ اور صحیح بخاری میں ہے ﴿من حدیث عبداللہ بن زید﴾ اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ ﴿لیتحول القحط﴾ تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبزی و شادابی میں تبدیل ہو جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقاء کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ نیز عید کی طرح خطبہ استسقاء نماز کے بعد پڑھا گیا اور استسقاء کیلئے دعائیں ہاتھ اٹھاتے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوجعفر باقر﴾ ابوجعفر محمد الباقر (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب، امامیہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ باقر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا، بڑے ماہر و تبحر عالم تھے۔ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۷۷ھ میں تریٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(۴۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا دَخَلَ الْمَسْجِدَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! هَلَكَتِ الْأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَأَذْعُ اللَّهُ يَغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْنِنَا، اللَّهُمَّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا، اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، وہ بولا یا رسول اللہ! (ﷺ) اموال (مویشی) ہلاک ہو گئے اور آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی۔ یا الہی! بارش

أَغْنِنَا، اللَّهُمَّ أَغْنِنَا، فَذَكَرَ سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یا الہی! بارانِ رحمت سے الْحَدِيثَ، وَفِيهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا۔ ہماری فریاد رسی فرما۔ ساری حدیث بیان فرمائی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السَّيْلُ﴾ سبیل کی جمع ہے جس کا معنی راستہ ہے۔ ”سین“ اور ”باء“ پر ضمہ ہے۔ راستوں کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کیلئے چارہ پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہو گئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنہیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے، جب چیزیں ہی نہیں تو بار برداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمد و رفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ ﴿يَغِيثًا﴾ ”یاء“ پر ضمہ یعنی ہمیں فوری طور پر بارش سے نواز دے تاکہ ہماری تکلیف دور ہو۔ ﴿فَرَفَعَ يَدَيْهِ﴾ بخاری نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ ﴿اغْنِنَا﴾ اغناہ سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ ہمیں بارانِ رحمت سے سیراب فرما۔ ﴿فَذَكَرَ الْحَدِيثَ﴾ اس نے ساری حدیث بیان کی جس میں مذکور ہے۔ اس دعا کے بعد بارش مسلسل و لگاتار نازل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دوسرے جمعہ کے روز پھر ایک آدمی دورانِ خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرتِ بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا۔ تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہو گیا اور مصنف نے ﴿وَفِيهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا﴾ کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انبیاء کرامؑ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہِ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے ورنہ نبی کریم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ نیز صحابہ کرامؓ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی از خود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحطِ سالی سے نجات دیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کمان و ماہیکون کا علم بھی نہیں رکھتے تھے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قحطِ سالی کی وجہ سے بیرونِ شر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔

وہ آدمی کون تھا؟ اس میں اختلاف ہے کسی نے ابوسفیانؓ کا نام لیا ہے حالانکہ ابوسفیانؓ وقتِ دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ انداز گفتگو اور طرز کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل

ضرور کوئی مسلمان ہے ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپؐ کو مشکل کشا سمجھ کر آپؐ ہی سے درخواست کرتا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ مسند احمد میں ہے کہ کعب بن مرہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف دعا ہی فرمائی ہے بارش کیلئے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے غالباً اسی سے استدلال کیا ہے استسقاء کیلئے صرف دعا کرنا سنت ہے مگر دوسری احادیث سے نماز استسقاء پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بارش کیلئے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے۔ (۱) ایک دفعہ تو آپؐ لوگوں کو عید گاہ میں لے گئے، نماز پڑھائی، خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (۲) ایک دفعہ خطبہ جمعہ کے دوران ہی صرف دعا ہی منبر پر کھڑے ہوئے فرمائی۔ (۳) ایک مرتبہ آپؐ نے باقاعدہ منبر مگلوایا اور اس پر بیٹھ کر صرف دعا فرمائی یہ الفاظ مروی ہیں بلکہ حدیث میں اس کے برعکس خطبہ کے لفظ بھی کہے اور نماز نہیں پڑھی۔ (۴) ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر سب لوگوں کے ساتھ اجتماعی دعا کی۔ (۵) ایک دفعہ آبادی سے باہر نکل کر احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (۶) اور ایک دفعہ جنگ کے دوران بارش کیلئے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ (زاد المعاد۔ السبل)

(۴۰۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى
عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ
بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَالَ: اللَّهُمَّ إِنَّا
كُنَّا نَسْتَسْقِيكَ إِلَيْكَ بَنِينَا فَتَسْقِينَا،
وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِينَا فَاسْقِنَا،
فَيُسْقَوْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ کے واسطے سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا اور اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ لائے ہیں لہذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے (اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں) ان کو بارش سے سیراب کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قَحَطُوا ﴾ صیغہ مجہول وہ قحط کا شکار ہو گئے۔ ﴿ يَسْتَسْقِي بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ﴾ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اور ان سے شفاعت و سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے اس لئے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ ﴿ اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِيكَ إِلَيْكَ بَنِينَا ﴾ یا الہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان سے دعا اور سفارش کے ذریعہ سے بارش طلب کرتے تھے۔ ان کی ذات سے نہیں ﴿ وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ ﴾ اور اب ان کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا

عباس بن عبدالمطلب ؑ کو وسیلہ بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر ؓ اور حضرت عباس ؓ دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر ؓ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس ؓ نے بارگاہ رب العزت سے عرض کیا۔ الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہ کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور توبہ کے بغیر وہ دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی ﷺ کی جگہ مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے، یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں، گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب سے توبہ کے ذریعہ فریاد رسی کے طلبگار ہیں تیرے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لہذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا پھاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی، زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی۔ لوگوں میں زندگی آگئی۔ اس واقعہ کو زبیر بن بکار نے اپنی الانساب میں ذکر کیا ہے۔ (مرعاة، ج: ۲، ص: ۳۹۹ اور سل السلام)

حاصل کلام: قبہ و قبر پرستوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت عباس ؓ کو طلب بارش کیلئے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کیلئے دعا مانگی۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو زندہ و مردہ، حاضر و غائب بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کا وسیلہ پکڑنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے چچا کی عدم موجودگی میں بھی جائز ہوتا حالانکہ ایسا کسی حدیث سے اور قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہ حدیث ہمارے لئے تین باتوں کا ذکر کرتی ہے ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کیلئے خیر اور خاندان نبوت کے کسی فرد کو جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو، ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس حدیث سے حضرت عباس ؓ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر ؓ میں تواضع و انکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ نیز یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی خواہ فوت شدہ سے مرتبے و منصب میں کم تر ہو، دعا اسی سے کرانی چاہئے۔ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں نہ ثابت ہے اور نہ ہی معتبر ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت عباس بن عبدالمطلب ؓ﴾ حضورؐ کے چچا، ان کی کنیت ابو الفضل تھی۔ بیت اللہ کی آباد کاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تاکہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں۔ اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوہ بدر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوہ میں شریک بھی ہوئے۔ غزوہ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ھ میں رجب یا رمضان میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(۴۱۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بھی مروی ہے قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ کہ ہم ایک دفعہ بارش کی لپیٹ میں آ گئے اور رسول اللہ ﷺ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ تَوْبَهُ اللہ ﷻ ہمارے ساتھ تھے۔ آنجناب ﷺ نے اپنے حَتَّى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ، وَقَالَ: إِنَّهُ بدن اطہر سے کپڑا اوپر اٹھایا کہ بارش آپ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور ارشاد فرمایا کہ ”یہ اپنے آقا و خدیث عہدِ بربرہ۔ رواہ مسلم۔

مالک کے ہاں سے نئے نئے تحفہ کی صورت میں آ رہی ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فحسر توبہ﴾ حضور ﷺ نے اپنے بدن مبارک سے کچھ کپڑا اٹھالیا۔ ﴿حتى اصابه من المطر﴾ کہ بارش کے کچھ قطرے آپ کے جسم پر پڑ گئے۔ ﴿حدیث عہدِ بربرہ﴾ اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے یا یہ معنی ہے کہ اپنے مالک کے ایجاد کرنے سے بری ہے۔ یعنی بارش رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی نازل فرمایا ہے۔ لہذا اس کے ذریعہ سے برکت حاصل کی جائے۔

حاصل کلام: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش عالم قدس سے نازل ہوئی ہے۔ ہنوز یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گنگار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ نیز اس میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ بارش کے پانی میں نمانا مفید اور جائز ہے۔

(۴۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ قَالَ: «اللَّهُمَّ صَيِّبًا صَيِّبًا» اس بارش کو منافع بخش و سود مند بنا نَافِعًا. أَخْرَجَاهُ. دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿صیبا﴾ صادر پر فتح ”یاء“ کے نیچے کسرہ اور تشدید۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے یعنی اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔ ﴿اخرجاه﴾ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(۴۱۲) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي دَعَاءِ اسْتِسْقَاءٍ مِثْلُ «يَا لَيْلِي! هَمِيسَ الْبَدَلِ» جو ساری زمین پر چھایا ہوا ہو، گہرا ہو، كَثِيفًا، قَصِيفًا، دَلُوقًا، ضَحُوكًا، كَرْكَنًا والا زور سے برسنے والا، چمکنے گرجنے والا، تـ

نُطِرْنَا مِنْهُ رُذَاذًا، قِطْقُطًا، سَخْلًا، بہ تہ ہو، سے بارش کی باریک بوندیں بہت زیادہ برسا
يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ۔ اے بزرگی اور عزت کے مالک!“ (مسند ابی
عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ۔
(عوانہ)

لغوی تشریح: ﴿جللنا﴾ تجلیل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ یہ بادل روئے زمین
پر چھا جائے۔ ﴿کشیفا﴾ گاڑھا تہ بہ تہ ﴿قصیفا﴾ ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زور دار بارش
کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فعلیل کے وزن پر ہیں ﴿دلوقا﴾ دال پر فتح اور لام پر ضمہ زور سے
برسنے والا۔ جیسے کہتے ہیں سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ ﴿ضحوکا﴾ ”ضاد“ پر فتح اور ”حاء“ پر ضمہ ہے۔
چپکنے والا۔ جس میں بجلی ہو۔ ﴿رذاذا﴾ ”راء“ پر ضمہ۔ چھوٹے چھوٹے قطرے، باریک باریک بوندیں ﴿
قطقطا﴾ دونوں ”قاف“ پر کسرہ اور پہلا ”طاء“ ساکن۔ باریک بوندیں حتیٰ کہ رائی کے دانوں کے
برابر۔ ﴿سجلا﴾ سین پر فتح، جیم ساکن۔ زور دار بارش۔ مصدر ہے۔ بادل کی تعریف کی گئی ہے۔ مبالغہ
کے طور پر موسلا دھار برسنے والا۔

حاصل کلام: رسول اللہ ﷺ سے دعائے استسقاء کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں۔ یہ دعا ان
میں سے ایک ہے، جو دعا چاہے پڑھے۔

(۴۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَسْتَسْقِي، فَرَأَى نَمْلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلَى ظَهَرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَاءِ، تَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اِنَّا خَلَقْنَا مِنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنَى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «ارْجِعُوا فَقَدْ سُقِيتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”حضرت سلیمان علیہ السلام بارش
طلب کرنے کیلئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک چیونٹی کو
پشت کے بل ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے
دیکھا جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی۔
الہی ہم تیری مخلوق ہیں تیری دوسری مخلوق کی طرح۔
ہم بھی تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔
یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا چلو
واپس چلیں تمہیں بارش سے سیراب کر دیا گیا، غیروں
کی دعا کی بدولت۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم
نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مستلقیہ﴾ علی ظہرہا ﴿اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی﴾ ﴿قوائمہا﴾
قائمہ کی جمع ہے۔ پاؤں کے معنی میں۔ ﴿خلق﴾ ”حاء“ پر فتح اور لام ساکن۔ اس کی مخلوقات میں
سے ایک مخلوق۔ ﴿سقیاک﴾ سین پر ضمہ اور ”قاف“ ساکن۔ تیری بارش ﴿سقیتم﴾ صیغہ

مجبور۔ بارش کے ساتھ سیراب کر دیئے گئے تم لوگ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سابقہ پیغمبر بھی بارش کی بندش کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر بارش طلب کرنے جاتے تھے۔ چھوٹی مخلوق کے ذریعہ انسان کو بارش سے سیراب کیا جاتا ہے۔ لہذا دعاء استسقاء یا نماز استسقاء آبادی سے باہر ہی کرنی چاہئے۔ اس طرح آبادی کی گمراہی، ہنگامہ خیزی اور شور و شغف سے دور توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

(۴۱۴) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَسْقَى فَأَشَارَ بِظَهْرِ كَفِّهِ إِلَى السَّمَاءِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بارش کیلئے دعا فرمائی تو اپنے دونوں ہاتھ الٹی حالت میں آسمان کی طرف اٹھا کر ارشاد فرمایا۔ (مسلم)

نفعی تشریح: ﴿اشار بظہر کفہ الی السماء﴾ ہاتھوں کی پشت چہرے کی طرف کی۔ یہ صورت معمول کے مطابق دعا مانگنے کی صورت کے برعکس ہے۔ جب کسی ضرر کو دور کرنا مطلوب و مقصود ہو تو اس طرح دعا کرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اٹل ہاتھوں دعا مانگنے کا ذکر ہے حالانکہ عموماً آپؐ سیدھے ہاتھوں سے دعا کرتے تھے۔ ان دونوں میں علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ رحمت کی طلب کرنے کیلئے سیدھے ہاتھوں سے دعا کرنی چاہئے اور ضرر و مصیبت کو دور کرنے کیلئے دعا مانگی جائے تو اٹل ہاتھوں سے کی جائے۔ اس سے نفع اور مراد ہوتا ہے کہ حالت کو اس طرح تبدیل فرما دے۔ دعائے استسقاء کے وقت چادر کو اٹانے اور پھرنے میں بھی غالباً یہی حکمت کار فرما ہے اور ہتھیلیوں کے نیچے کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے منہ بھی نیچے کر دیئے تاکہ بارش خوب برسے اور خشک سالی کو سرسبزی سے بدل دیا۔

لباس کا بیان

١٧ - بَابُ اللَّبَاسِ.

(۴۱۵) عَنْ أَبِي عَامِرٍ الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحَرَ وَالْحَرِيرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو عامر اشعری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میری امت میں لازماً کچھ ایسی قومیں ہوں گی جو (زنا) اور ریشم کو حلال سمجھیں گی۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

فقوی تشریح: ﴿باب اللباس﴾ لباس جو حرام اور حلال ہیں، ان کا بیان ہے۔ اور کتاب الصلوٰۃ میں اس کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ نماز کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ﴿الحصر﴾ شیخ احمد محمد شاکر نے ”الباعث الحثیث ص ۳۳“ پر لکھا ہے کہ ”حر“ ”حا“ کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن کی صورت میں

زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ صحیح روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ ﴿خز﴾ ”خاء“ اور ”زاء“ کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ جس سے مراد ریشم ہے۔ مگر یہ دراصل حر سے تخفیف ہے۔ جیسا کہ حافظ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے، ملاحظہ ہو: (فتح الباری ج: ۱۰، ص: ۳۵، ۳۹)۔ ﴿الحبر﴾ ریشم کی تمام اقسام کیلئے حریر کا لفظ مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں ایک ریشم کا پہننا دوسرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا انسان کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے۔ اسی لئے اسے امت پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ زینت و لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورت کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ بخاری میں اس کی اصل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ معلق بایں طور کہ عبدالرحمن جو اس کے راوی ہیں کو شک و تردد ہے کہ انہوں نے یہ حدیث ابوعامر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے یا ابومالک سے۔

راوی حدیث: ﴿ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عبداللہ بن حاتم یا عبید بن وہب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(۴۱۶) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ مَرْوِيًّا يَقُولُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَن نَشْرَبَ فِي آيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَأَن نَّأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ ثُبَيْسِ الْحَرِيرِيِّ وَالذَّيْبَانِ، وَأَن نَّجْلِسَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے، باریک اور گاڑھا ریشم پہننے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ذیبا﴾ گاڑھے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(۴۱۷) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِي فِي أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ ثُبَيْسِ الْحَرِيرِيِّ، إِلَّا مَوْضِعَ چار انگشت۔ (بخاری و مسلم۔ اور متن حدیث کے الفاظ أَصْبَعَيْنِ أَوْ ثَلَاثٍ أَوْ أَرْبَعٍ. مَقْنَعٌ مُسْلِمٌ كَيْسٌ)

عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حاصل کلام: مردوں کیلئے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے البتہ خارش وغیرہ عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو، چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴۱۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ مَرْوِيًّا يَقُولُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَن نَّجْلِسَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

نَعَالِي عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَحَّصَ دُورَانَ سَفَرِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَزَيْدِ بْنِ

لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِي عَوَامِ رَسُولِ اللَّهِ كَو رِثْمِي قِمِصَ بِنِي كِ اِجَازَت مَرَحْمَت قَمِصِ الْحَرِيرِ، فِي سَفَرٍ، مِنْ حِجَّةٍ فَرَمَائِي۔ اس وجہ سے کہ ان کو خارش تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی سفر﴾ غزوہ کیلئے جاتے ہوئے دوران سفر میں من حکمہ خارش کی وجہ سے ”حاً“ کے نیچے کسرہ اور کاف پر تشدید۔ خارش کی ایک قسم۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جوؤں کی شکایت کی تھی تو آپؐ نے ریشم زیب تن کرنے کی اجازت عنایت فرمادی اور یہ بھی ممکن ہے کہ خارش جوؤں کی وجہ سے ہی ہوتی ہو۔ ان کو ریشم کی رخصت اس لئے دی کہ ریشم میں نرمی اور گداز پن ہوتا ہے جو خارش کی تکلیف میں کمی کا باعث ہے نیز اس کپڑے میں جوئیں بھی کم ہی پڑتی ہیں۔ گویا دفع ضرر کی حد تک ریشم کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿زبیرؓ﴾ یہ زبیر بن عوام بن خویلہ بن اسد قرشی اسدی۔ رسول اللہ ﷺ کے قریبی ساتھی، آپؐ کی پھوپھی صفیہ کے لخت جگر اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ غزوات میں اسلام کی جری اور بہادریوں میں شمار ہونا۔ جنگ جمل سے واپسی کے بعد ۳۶ھ کو فوت ہوئے۔

(۴۱۹) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَسَانِي سِرَاءَ كَاطِي دَارِ رِثْمِي جُوْا عَنْيَاتِ فَرَمَا۔ میں اسے النَّبِيُّ ﷺ حُلَّةَ سِبْرَاءٍ، فَخَرَجْتُ پین کر باہر نکلا تو میں نے حضور ﷺ کے رخ انور پر فِيْهَا، فَرَأَيْتُ الْغَضَبَ فِي وَجْهِهِ، غصہ اور ناراضگی کے آثار دیکھے تو میں نے اسے فَسَفَقْتُهَا بَيْنَ نِسَائِي۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا مَلُوكُ مَلُوكِ كَرَكِ اِپنی گھریلو خواتین میں تقسیم کر دیا۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے یہ الفاظ مسلم کے لَفْظُ مُسْلِمٍ۔

(ہیں)

لغوی تشریح: ﴿کسانی﴾ مجھے پہنایا یعنی عنایت فرمایا ﴿حله﴾ ”حاء“ پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ نیا کپڑا، نیا لباس۔ حله دراصل ایک رنگ کے دونوں کپڑے ازار (تہند) اور چادر کو کہتے ہیں۔ جو سارے بدن کو ڈھانپ لے۔ ﴿سیراء﴾ نصب کی صورت میں حله کی صفت ہے اور جر کی صورت میں حله کی جانب مضاف۔ اور سیراء کی سین کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ پر فتح۔ چادر جس میں دھاریاں ہوں یا جس میں ریشم استعمال ہوا ہو۔ فخر جت فیہا“ میں اسے پین کر باہر نکلا۔ ﴿فرايت الغضب فی وجهه﴾ میں نے آپؐ کے رخ انور پر غصہ و ناراضگی کے آثار دیکھے اس لئے کہ یہ حله ریشم سانہ تھا۔ ﴿فسفقتھا﴾ مَلُوكُ مَلُوكِ كَرَكِ تقسیم کر دیا یا بانٹ دیا۔ ﴿بین نسائی﴾ اپنے گھر کی خواتین میں ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کی البیہ، والدہ، چچا زاد بہن اور بھانج ہیں (عقیل کی بیوی) ان میں سے ہر ایک کا نام فاطمہ تھا۔ یعنی (فاطمہ بنت محمد، فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ زوجہ عقیل

رضی اللہ عنہم

حاصل کلام: نبی ﷺ کو یہ حلقہ تحفہ کے طور پر وصول ہوا تھا۔ آپؐ نے یہ حضرت علیؓ کو دے دیا۔ جسے حضرت علیؓ نے زیب تن فرمایا مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔“ چنانچہ حضرت علیؓ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے، خواہ اس کا استعمال مرد کیلئے جائز نہ ہو۔

(۴۲۰) وَعَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ عَنْهُ حَضْرَتُ ابْنِ مَوْسَى رَضِيَ عَنْهُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «أَجَلُ الذَّهَبِ وَالْحَرِيرِ لِلنَّاسِ كَيْلٌ حَلَالٌ كَرِّ دِيَاغِيَا هُوَ وَأَوْرَانُ كَيْلُ مَرْدُودٍ عَلَى أَمْنِي. وَحَرَمٌ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ حَرَامٌ۔ (اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کیلئے سونا پہننا بصورت زیور و لباس جائز ہے مگر ترغیب نہیں، اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(۴۲۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہئے۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(۴۲۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى (شہر کا نام) کے ساختہ کپڑے اور زرد رنگ کے عَنْ لُبْسِ الْقَسِيِّ وَالْمُعْصَفِرِ. رَوَاهُ کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لفظی تشریح: ﴿الْقَسِي﴾ قاف پر فتح سین کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ قس کی طرف منسوب ہے۔ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے، یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا اور ایک قول یہ

بھی ہے کہ یہ ”قر“ کی طرف منسوب ہے اور یہ ریشم کا بیکار، بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ ”زا“ اور سین کے قریب الخرج ہونے کی وجہ سے ”زا“ کو سین میں تبدیل کر دیا اور اس قر سے قس بن گیا۔ ﴿والمعصر رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفّر سے رنگا ہوا۔ عصفّر ہندی زبان میں کسبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرفی اور زردی کے بین بین ہوتا ہے۔ ہندو کاہن، سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

(۴۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَأَى ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ نَوْبَيْنِ مُعْصَفَرَيْنِ، دیکھے تو فرمایا ”کیا تیری والدہ نے یہ پہننے کا حکم دیا فَقَالَ: «أَمَّاكَ أَمْرَتُكَ بِهَذَا؟». رَوَاهُ ہے؟“ (مسلم)

مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿رای علی﴾ علی حرف جر ہے ”یاء“ پر تشدید ”یاء“ متکلم مجرور۔ ﴿امک امرتک؟﴾ امر سے صیغہ غائب ہے۔ آپ نے ایسا شدید ناپسند کیگی کے اظہار کے طور پر فرمایا۔

حاصل کلام: تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے کیا؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں اس لئے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً حضور ﷺ نے بطور تنبیہ اور زجر و توبیخ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو فرمایا ”نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔“

(۴۲۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ کا ایک رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَيْنِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَضْلَهُ فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حَتَّى فُضِّتْ، فَغَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَتَنَحَّنُ نَفْسُهَا لِلْمَرْصَى، نَسْتَنْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمَفْرُودِ: وَكَانَ يَلْبَسُهَا لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

چوغہ نکالا جس کی آستینوں، گریبان اور چاک پر دبیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں لے لیا۔ نبی کریم ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے تھے اور شفاء طلب کرتے تھے اور بخاری نے الادب المفرد میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کیلئے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿مکفوفہ﴾ منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿مکفوف﴾ کا مطلب ہے ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہوتا تھا۔ ﴿الجیب﴾ جیم پر فتحہ اور یا ساکن۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے۔ ﴿والکمین﴾ کاف پر ضمہ اور میم پر تشدید کم کا تشبیہ ہے قمیص کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ ﴿والفرجین﴾ فافر فتحہ را ساکن فرج کا تشبیہ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے با اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہوتا ہے۔ ﴿دیساج﴾ دبیز و گاڑھا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا۔ ﴿حسی قبضت﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وفات پاگئیں۔ ﴿فقبضنھا﴾ تو میں نے اس جبہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ﴿نستشفی بہا﴾ صیغہ معروف متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں بستشفی صیغہ مجہول بھی ہے یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی۔ ﴿للسود﴾ واو پر فتحہ اور فا ساکن۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر اور معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور مجمعوں کے مواقع پر زینت و زیبائش کیلئے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا معنی یہ ہے کہ یہ ریشم کے کپڑے کے عرض میں لگا ہوا (طول میں نہیں) اور آستینوں، گریبانوں اور چاک پر ان کے طول کے حساب سے جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت، امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں اور وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مجمعوں کیلئے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے اور عمدہ اور اچھا صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہئے۔ بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ فخر و ریا اور کبر و نخوت اور شان نمائی نہ ہو۔ ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا گیا ہو۔



۳۔ کِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے کے مسائل

(۴۲۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَكْثَرُ مَا ذَكَرَ هَازِمُ اللَّذَاتِ: ذِكْرُ كَثْرَتِ سَيِّئَاتِهِ» (اے ترمذی اور الموت). رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالتَّسَنُّيُّ، وَصَحَّحَهُ نَسَائِيٌّ فِي رِوَايَتِهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجنائز﴾ جیم پر فتح۔ جنازہ کی جمع ہے۔ جنازہ کی جیم پر فتح اور کسرہ دونوں اعراب ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ چارپائی پر رکھی ہوئی میت اور ایک قول کے مطابق جیم پر فتح ہے اس صورت میں اس کا معنی میت کے ہیں اور کسرہ کی صورت میں اس چارپائی کو کہیں گے جس پر میت پڑی ہو اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے یعنی فتح کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرہ کی صورت میں میت ”کتاب الصلوٰۃ“ کے معابد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجنیز و تکفین کے جملہ امور و افعال میں نماز جنازہ زیادہ اہم ہے۔ لہذا اس طرح دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق جنازہ کی مشروعیت اجری میں ہوئی۔ ﴿اکثروا﴾ اکثر سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو ﴿هاذم﴾ مضاف ہونے کی بنا پر مجبور ہے اور ”لذات“ کی طرف مضاف ہے۔ ”ذال“ کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کا معنی کاٹ ڈالنے والی توڑ دینے والی۔ اس سے مراد موت ہے۔ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی، سب ختم ہو جاتی ہیں اور آدمی کو دنیا سے بے رغبت کر دیتی ہے اور ایک روایت میں ہادم بھی منقول ہے جو ﴿هدم البناء والجدار﴾ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ ﴿الموت﴾ جر (کسرہ) کی صورت میں عطف

بیان ہوگا اور رفی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر جو ”ہو“ ہو سکتا ہے اور نصب کی صورت میں ”اعنی“ کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں وہ ہاژم کا بیان ہوگا۔

حاصل کلام: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرینش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہر ایک کے اعزاء و اقرباء، احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے، سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی، خوف، محاسبہ اعمال، قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(۴۲۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمْ الْمَوْتَ لِيُضْرَ نَزْلُ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ مُتَمَنَّيَا، فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ أَخْبِنِي مَا كَانَتْ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتْ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہو موت کی تمنا و خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہئے اے اللہ! جب تک جینا میرے لئے بہتر ہو اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب موت میرے لئے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا یتمنّین﴾ ”تمنی“ سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ ”نفر“ ضادر ضمہ اور کبھی فتح بھی آجاتا ہے۔ میرے جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے ﴿لبد﴾ ”با“ پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ ﴿احبسی﴾ حمزہ اس میں قطعی ہے یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہے مجھے زندگی عطا فرما ﴿توفنی﴾ مجھے وفات دے۔ یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آکر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے اور شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں خوف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: ایک سچے پکے مومن کیلئے زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صالح آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے، بدکردار، بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے۔ اس لئے دنیوی مصائب و آلام، مفلسی، غربت، بیماری وغیرہ سے تنگ آکر موت کی آرزو نہ کرے۔ البتہ رب کائنات سے

ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ اگر دین کے بارے میں کسی فتنہ اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت و آرزو کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو اونچا اڑانے کا باعث ہیں۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

(۴۲۷) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ”مومن کی موت کے وقت اس کی پیشانی پر پسینہ رونما ہو جاتا ہے۔“ (اس روایت کو تینوں (ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے زَوَاهِ الثَّلَاثَةِ، وَضَعَهُ ابْنُ حَبَانَ۔ اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

نغوی تشریح: ﴿بمعرق الجبین﴾ ”عرق“ پسینہ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہوتا ہے جو مومن کے گناہوں کی تطہیر کیلئے موت کے وقت اس کی پیشانی پر رونما ہوتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ طلب حلال، صوم و صلاۃ کی ادائیگی، احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلہ میں جو محنت و مشقت اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے تا آنکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(۴۲۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبْنِ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قریب قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَقَدْ تَوَاتَاكُمُ الْمَرْگ آدمی کو ”لا الہ الا اللہ“ کی تلقین کرو۔“ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔)

نغوی تشریح: ﴿لقنوا﴾ تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے معنی ہیں یاد دہانی کراؤ۔ ﴿موتاکم﴾ میت کی جمع ہے۔ جب مرنے والے کا وقت قریب ہو تو اس کو سناتے ہوئے اس کے پاس پڑھا جائے، تاکہ وہ اسے سنے اور سمجھے اور پھر خود بھی پڑھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گو صرف لا الہ الا اللہ کی تلقین کا ذکر ہے مگر اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ قریب المرگ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے پڑھیں اور جب مرنے والے کے حواس قدرے ٹھیک ہوں تو اسے بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔ نہ تو اسے مرنے والے ہی کو تلقین کرنے پر منحصر کیا جانا چاہئے اور نہ اعزاء و اقرباء اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ نبی ﷺ نے خود ایک قریب المرگ آدمی کو لا الہ الا اللہ پڑھنے کیلئے فرمایا تھا۔ (مسند احمد) جس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو بھی پڑھنے کیلئے کہا جاسکتا ہے۔

357 جنازے کے مسائل

(۴۲۹) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ حَضْرَتِ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ مِنْهُ أَنَّهُ قَالَ: «افْرُؤُوا عَلَى مَوْتَانِمْ يَسْ». لیس پڑھا کرو۔ (اسے ابوداؤد، نسائی نے روایت کیا ہے رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿افروا﴾ امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے پڑھو، پڑھا کرو ﴿علی موتانکم﴾ جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورہ یاسین پڑھنے سے میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تاہم امت کی اکثریت کا اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ معقل میں میم پر فتح، ”عین“ پر سکون اور ”قاف“ پر کرہ ہے۔ مزینہ قبیلہ کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نہر منسوب ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھودی تھی اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ ”اذا جاء نهر الله بطل نهر معقل“ جب اللہ نہر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو معقل کی نہر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ آپؐ امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر دور میں ۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک یزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(۴۳۰) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَدْ شَقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ اتَّبَعَهُ الْبَصَرُ»، فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لَا تَذْغُوْا عَلَي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَبِيرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تُوْمِنُ عَلَى مَا تَقُولُونَ»، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيْنَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَتَوَزَّ لَهُ فِيهِ، وَاخْلُقْهُ فِي حَقِيْقِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت تشریف لائے تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی آپؐ نے اسے بند کر دیا اور پھر فرمایا کہ ”جب روح بدن سے نکل جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے“ اتنے میں گھر کے لوگ آہ و بکا کرنے لگے، چیخنے لگے۔ تو آپؐ نے فرمایا ”اپنے لئے اچھی اور بہتر دعا کرنا کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں“ پھر آپؐ نے دعا فرمائی کہ ”الہی! ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما دے۔ ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ و مرتبہ بلند فرما اور اس کی قبر کشادہ و وسیع فرما دے اور اسے منور فرما دے اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں نائب و قائم مقام ہو جا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ابوسلمہ رضی اللہ عنہما﴾ ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے شوہر ﴿شق﴾ شین پر فتحہ صیغہ معلوم۔ ﴿بصرہ﴾ اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے۔ اس صورت میں کہ وہ لازم ہے اور نصی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی فعل ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی اور ﴿شق بصرہ﴾ کنایہ ہے موت سے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹی نہیں۔ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے ﴿فاغمضہ﴾ آپ نے اسے بند کر دیا یعنی آنکھ کے پپٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ ﴿قبض﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿فصح﴾ اس میں فاتعقیب کیلئے ہے، یعنی معاً اہل خانہ نے رونا، چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح واویلاہ اور واشبورہ کہہ رہے تھے اس لئے حضور ﷺ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کہ فرشتے تمہارے لئے آمین کہتے ہیں۔ ﴿نومن﴾ تامين سے ہے یعنی آمین کہتے ہیں۔ ﴿وافصح﴾ وسع و کشادہ فرما دے۔ ﴿نور﴾ تنویر سے امر کا صیغہ ہے یعنی اس کیلئے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ ﴿واخلفہ﴾ باب نصر یصمر سے۔ یعنی اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ ﴿فی عقبہ﴾ عین پر فتحہ اور قاف پر کسرہ۔ اپنے پیچھے، یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل و عیال، مال و متاع جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب و محافظ بن جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی جب روح جسد خاکی سے پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں انہیں فوراً بند کر دینا چاہئے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل و عیال اور حتی الامکان اعزہ و اقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہئے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کیلئے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت و بخشش کی دعا کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کیلئے دعا فرمائی۔ مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوسلمہ رضی اللہ عنہما﴾ ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پھوپھی زاد بھائی۔ آپ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما دونوں کا رضاعی بھائی ہے۔ ابولسب کی آزاد کردہ لونڈی نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ ہجرت اپنی المیہ کے ساتھ کی۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوہ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہو گیا مگر پھر جاری ہو گیا۔ ۴ھ جمادی الاولیٰ میں وفات پائی۔ شوال میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہما کو حرم نبوی میں داخل فرمایا۔

(۴۳۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَبَّ فُوتَ هُوَ تَوَّابٌ كَوَ اِيَكْ وَهَارِي دَارِ نُوْفِي، سَعَجِي بِرْدِ جَبَرَةٍ. مَتَّقْ عَلَيْهِ. چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿سجی﴾ تسجیہ یعنی باب تفعیل سے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں۔ ڈھانپ دیا گیا۔ ﴿ببرد حبرہ﴾ اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور صفت موصوف کی بھی اور ﴿برد﴾ کے ”پا“ پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا اور ﴿حبرہ﴾ میں ”حا“ کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے اور فتح بھی۔ تیل بوٹے والی چادر اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔ حاصل کلام: میت کو غسل سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ دوسرا آپؐ پر بھی موت وارد ہوئی۔ اس سے حیات النبیؐ کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا کہ اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی تو آپؐ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا ہے جو مرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (غسل اور تدفین و تجیز وغیرہ) (۴۳۲) وَعَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَبْلَ النَّبِيِّ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. (کی پیشانی) کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿قبل﴾ تقبیل یعنی باب تفعیل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا تعظیم و تکریم کے نقطہ نظر سے بوسہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی منقول نہیں گویا اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

(۴۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”مومن کی روح قرض کے ساتھ اس وقت «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدِينِهِ، حَتَّى يُقْضَى عَنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، (لکھی) رہتی ہے جب تک اسے ادا نہیں کر دیا جاتا۔“ (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور وَحَسَنُهُ. ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿معلقہ﴾ تعلیق تعلیق یعنی باب تفعیل سے۔ جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کیلئے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا ﴿بدینہ﴾ دال پر فتح۔ قرض جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمہ واجب ہو۔ ﴿حتیٰ یقضى عنه﴾ صیغہ مجہول یعنی تا وقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تا وقتیکہ جس کا حق تھا وہ حق دار اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار میت کے ذمے ہوتا ہے جب تک اس کی طرف سے وہ قرض ادا نہیں کر دیا جاتا۔ خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب و رفقاء میں سے کوئی یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے قرض لیا تھا۔ جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے مگر جن لوگوں نے

(۴۳۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ
فِي الَّذِي سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ، فَمَاتَ:
اغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَكَفَّنُوهُ فِي
ثَوْبَيْنِ. مَثْنً عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ
نے اس آدمی کے متعلق جو اپنی سواری سے گر کر
جاں بحق ہو جائے فرمایا کہ ”اسے پانی اور بھری کے
پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفن
دے دو۔“ (بخاری)

نفوی تشریح: ﴿فی الذی سقط عن راحلتہ﴾ یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے اونٹ سے گر گئے اور ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ ﴿بماء وسدر﴾ بیری کے پتوں کا طریق استعمال تین طرح پر ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنالی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے پھر خالص پانی سے بدن میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہوگا۔ ﴿کفنوه﴾ تکفین سے امر کا صیغہ ہے۔ (باب تفعیل ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ (۲) اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ (۳) حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بھری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ (۴) انہی احرام کے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر ڈھانکا نہ جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سرنگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لبیک اللہم کا تلبیہ پڑھتا ہوا ننگے سر اٹھے گا۔ (بخاری) بھری کے پتوں میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم بھی ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

(۴۳۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ صَاحِبِ كَرَامٍ نَبِيِّ اللَّهِ ﷺ، قَالُوا: وَاللَّهِ مَا نَذَرِي كَيْفَ تَوَانَسُوا فِي غُسْلِهِ؟ هُمْ يَسْتَعِينُونَ بِمِثْلِهَا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم! ہمیں علم نہیں کہ ہم نبی ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مَوْتَانَا اُمِّ لَآ؟ الْحَدِيثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

پھر ساری حدیث بیان کی۔ (احمد اور ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ماندری﴾ یعنی ہمیں معلوم نہیں۔ ﴿نجد﴾ تجرید سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف مرحوم رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابہ کرامؓ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی حالت میں انہوں نے کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ لہذا صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہؓ کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں انہیں تردد ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں۔ ورنہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا۔ البتہ قاتل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(۴۳۶) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُعْسَلُ ابْنَتَهُ، فَقَالَ: «اغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذَلِكَ، بِمَاءٍ وَبَسْدِرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الْأَخْيَرَةِ كَافُورًا، أَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُورٍ»، فَلَمَّا فَرَعْنَا آذَانَهُ، فَأَلْقَى إِلَيْنَا حِفْوَهُ، فَقَالَ: أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «أَبْدَأَنَّ بِمِيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا». وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَقَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلَاثَةً قُرُونًا، فَأَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپؐ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”اسے تین یا پانچ مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو، غسل پانی اور بیری کے پتوں سے دو، آخر میں کافور یا فرمایا کچھ کافور ڈالو“ جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو اطلاع بجھوا دی آپؐ نے اپنا تہ بند اتار کر ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا ”اسے جسم کے ساتھ لگا دو۔“ (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ غسل دائیں طرف سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کرنا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے سر کے بالوں کو

تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو پشت پر ڈال دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ونحن نغسل ابنہ﴾ مشہور روایت کے مطابق یہ آپؐ کی صابزدی، ابوالعاص کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ خواتین کی میت کو غسل دیا کرتی تھیں۔ ﴿ان رایتن ذلک﴾ اگر تم یہ سمجھو کہ تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ ﴿بماء وسدر﴾ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ کا تعلق ﴿اغسلنہا﴾ کے ساتھ ہے یعنی غسل پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ دو۔ ﴿فی الاخیرۃ کافورا﴾ راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ”کافور“ کہا ہے یا ”شیثا من کافور“ فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لیتا۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ ”واجعلن فی آخر ذلک کافورا“ بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ ﴿آذناہ﴾ اذان سے ماخوذ ہے۔ صیغہ جمع متکلم ہے۔ یعنی ہم نے آپؐ کو خبر دی۔ ﴿حقوہ﴾ ”حا“ پر فتح اور کسر بھی جائز ہے یعنی حاء کے نیچے کسر اور قاف ساکن ہے۔ اس سے مراد تہ بند ہے۔ دراصل تو یہ تہ بند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر مجازی طور پر ازار کیلئے بولا جاتا ہے۔ ﴿اشعرنہا ایاء﴾ اشعار سے امر کا صیغہ ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس تہ بند کو بطور شعار استعمال کرو۔ ”شعار“ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی صابزدی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ ﴿ابدان﴾ آغاز کریں، ابتداء کریں ﴿بمیا منہا﴾ میمنہ کی جمع ہے یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ ﴿فضفرنا شعرہا﴾ ﴿الضفر﴾ مینڈھی، بالوں کو اس طرح بٹ دے کر یا بن کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ ﴿ثلاثۃ قرون﴾ قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی ﷺ کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔

حاصل کلام: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہئے۔ البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ یعنی طاق کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہئے۔ غسل کا آغاز بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد حصول برکت کی غرض سے کسی بزرگ کا خاص کپڑا پہنانا بھی جائز ہے۔ خاتون میت کے سر کے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیچھے ڈال دیئے جائیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہئے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا

(۴۳۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُفِّنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي ثَلَاثَةِ أَنْوَاجٍ بَيْضَ سَحُولِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا عِمَامَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

نغوی تشریح: ﴿کفن﴾ تکفین سے ماخوذ ہے ﴿ثلاثۃ الثواب﴾ یعنی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ ﴿بیس﴾ ”با“ کے نیچے کسرہ ہے، بیض کی جمع ہے۔ ﴿سحولیۃ﴾ ”سین“ اور ”حا“ دونوں پر ضمہ اور یہ بھی منقول ہے سین پر فتح اور ”حا“ پر ضمہ۔ حول کی طرف منسوب ہے۔ یمین کا ایک قصبہ یا بستی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا۔ کیونکہ دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے حولیہ کا معنی تہیہ (صفائی و طہارت اور پاکیزگی و نظامت) کے ہوں گے۔ ﴿کرسف﴾ کاف پر ضمہ ”را“ ساکن اور سین پر ضمہ یعنی کپاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت مرد ہو تو اسے تین کپڑوں میں کفن دینا چاہئے۔ ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ ہی پگڑی اور کفن میں سوتی کپڑا بستر ہے۔ تین کپڑوں سے مراد جمہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی، تہہ بند اور بڑی چادر ہے۔

(۴۳۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تُوفِّيَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي جَاءَ ابْنُهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: أَعْطِنِي قِمِيصَكَ أَكْفُنْهُ فِيهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مَتَّفَعٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ عبد اللہ بن ابی جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپ اپنی قمیص عنایت فرمادیں کہ میں اس میں اسے کفن دے دوں۔ آپ نے اپنی قمیص اتار کر عنایت فرمادی۔ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿فاعطاه﴾ اپنی قمیص عطا فرمادی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپؐ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا۔ پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ ممکن ہے آپؐ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو، دفن کے بعد یہ وعدہ جب یاد دلایا گیا تو آپؐ نے قمیص عنایت فرمادی۔ آپؐ نے اپنی قمیص اس لئے عنایت فرمائی تھی کہ غزوہ بدر کے اسیران کو آپؐ نے لباس دیئے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے ان کا قد لمبا تھا کسی کی قمیص انہیں پوری نہیں آتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تو انہیں پوری آگئی۔ حضور ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے اس لئے یہ قمیص اس کو پہنائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی، اس واقعہ سے اندازہ لگالیں۔ اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ (بلکہ منافق کی خواہش کا بھی احترام کیا) راہنمایان و لیڈر حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن ابی﴾ جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہوئے کے بعد منافقین کا لیڈر بنا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوہ احد کے موقع پر لشکر اسلام کا تہائی حصہ لے کر واپس ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورہ منافقین میں آیت (لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منها الاذل) اسی کا قول ہے۔ ۹ھ میں ذی قعدہ میں فوت ہوا۔ ”ابی“ ہمزہ پر ضمہ اور یا پر تشدید۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

﴿ابنہ﴾ اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول مراد ہیں۔ عظیم صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمانہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں بہت سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے لئن رجعنا..... الخ کہا تھا تو انہوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(۴۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الْبُسُوءُ مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيْضِ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفُّنُوا فِيهَا مَوْتَكُمْ». علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے رَوَاهُ الْحَنَسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ. صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس آنحضور ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا۔ گو آپؐ نے کبھی کبھی رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہئے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(۴۴۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ دَعَا سَاعِدَيْهِ لِيُحْسِنَ كَفَنَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اچھا و عمدہ کفن

دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہئے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ آری ہے۔

(۴۴۱) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اور انہی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبی ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أَحَدٍ شَهِيدٍ شَهِدَا أَحَدٍ کے دو آدمیوں کو ایک لباس میں فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «أَبْنَاهُمْ» جمع کرتے تھے پھر فرمایا ”ان میں سے قرآن کس کو أَكْثَرَ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ؟“ فَيَقْدُمُهُ فِي زیادہ یاد تھا۔ جسے زیادہ یاد ہوتا“ اسے لحد میں پہلے اللَّحْدِ، وَلَمْ يُعْسَلُوا، وَلَمْ يَصَلَّ اتارتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ہی ان عَلَيْنِهِمْ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔ کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿قتلی﴾ قتل کی جمع ہے۔ معنی مقتول کے ہی ہیں۔ ﴿احد﴾ ”حمزہ“ اور ”حا“ دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوہ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا۔ جو تاریخ اسلام میں معروف ہے۔ یہ غزوہ ۳ھ میں شوال کے مہینہ میں ہوا تھا جس میں ستر صحابہ کرامؓ نے جام شہادت نوش کیا اور نبی کریم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ ﴿ایہم اکثرا اخذا للقرآن﴾ جسے قرآن زیادہ اذہر ہو۔ ﴿فیقدمہ﴾ تقدیم سے ماخوذ ہے یعنی اسے آگے رکھا جائے۔ ﴿اللحد﴾ میت کو قبر میں رکھنے کیلئے قبر کے پہلو میں جو شکاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفنانا درست ہے۔ (۲) دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کیا جانا چاہئے۔ (۳) شہداء فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا کہ ”ان کو غسل مت دو۔ ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک کی سی خوشبو دے رہا ہوگا۔“ (۴) شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کیلئے دعائے مغفرت ہے۔ ورنہ شہید کی نمازہ جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(۴۴۲) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ فرماتے سنا کہ (ہمت) قیمتی کفن نہ دیا کرو۔ وہ تو بہت يَقُولُ: «لَا تَغَالُوا فِي الْكَفْنِ، فَإِنَّهُ جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

يُسَلَّبُ سَرِيْعًا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿لَا تَعَالَوْا﴾ معالاء سے ماخوذ ہے یا تعالیٰ سے۔ اس صورت میں ایک ”تا“ محذوف ہوگا۔ اس کے معنی ہیں ”بہت جیتی“ ﴿يُسَلَّبُ﴾ صیغہ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔ حاصل کلام: بہت جیتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ دیر یا سویر بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ روایت سند اکمزور ہے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دینا۔ زندہ آدمی نئے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (بخاری)

(۴۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان ہے کہ نبی ﷺ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: نے انہیں فرمایا کہ ”اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو لَوْ مِتُّ قَبْلِي لَفَسَلْتُكَ، الْحَدِيثُ. جائے تو میں تمہیں غسل دوں گا۔“ (اسے احمد اور ابن رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ. ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر اپنی اہلیہ کو غسل دے سکتا ہے۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام کا عمل امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ (رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر کو خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں اور یہی بات رائج ہے۔

(۴۴۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ تَحْيَی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ تَحْيَی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ وصیت کی يُعَسِّلَهَا عَلَيَّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. (دارقطنی) رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حاصل کلام: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہو گیا۔

راوی حدیث: ﴿فَاطِمَةُ بِنْتُ النَّبِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا﴾ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار۔ ۳۲ رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ھ رمضان المبارک میں نبی ﷺ

(۴۴۵) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْعَامِidi، الَّتِي أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزَّانَا - قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصُلِّيَ عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت بريدہ رضی اللہ عنہ سے غامیہ کے قصہ میں مروی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں رجم و سنگساری کا حکم دیا تھا کہ آپ نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا پھر خود اس کی جنازہ پڑھی اور اسے دفن کیا گیا۔ (مسلم)

نفی تشریح: ﴿فی قصۃ العامدیۃ﴾ غامدیہ غامد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے غامدیہ کہلائی۔ عیینہ کی ایک شاخ تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو خود اس کا اعتراف کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ لہذا نبی ﷺ نے بچہ کا دودھ پلائی کا زمانہ گزار کر دودھ چھڑانے کے بعد رجم کا فیصلہ فرمایا اور حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ رجم کہتے ہیں مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حاصل کلام: صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ آنجناب ﷺ نے بذات خود غلہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مثلاً خود کشتی کرنے والا زنا کرنے والہ وغیرہ کے بارے میں قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہئے، تاکہ فساق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(۴۴۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَتَيْتُ
النَّبِيَّ ﷺ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ
بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ
مُسْلِمٌ.

نغوی تشریح: ﴿اسی﴾ صیغہ مجہول لایا گیا ﴿بمشاقص﴾ مشقص کی جمع۔ مشقص کے میم کے نیچے کسہ ہے۔ چوڑا نیزہ، ﴿فلم یصل علیہ﴾ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ یعنی بطور عبرت اور اس جیسا فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے، دھمکانے کیلئے آپؐ نے نماز جنازہ نہ پڑھی۔

حاصل کلام: خود کشی کرنے والے کی نمازہ جنازہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز و فضلاء تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ نسائی میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔“ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ جیسے ابتداء میں آپؐ مقروض کا جنازہ

نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہؓ کو فرمادیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو۔

(۴۴۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْمَرْأَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَتْ: قَالَ: فَسَأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلَا كُنْتُمْ أَذْنُومُونِي؟» - هِيَ: آپؐ نے فرمایا ”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ گویا انہوں نے اس کے معاملہ وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ۔“ انہوں نے آپؐ کو اس کی قبر کر راستہ بتا دیا۔

آپؐ نے وہاں جا کر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَرَأَى مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَاتِنِي جَاتِي هِيَ۔“ اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے پھر آپؐ نے فرمایا ”یہ قبریں اہل قبور کیلئے اندھیروں سے بھری ہوئی ہیں اور میری نماز سے ان کی قبروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿نقم﴾ قاف پر ضمہ اور میم پر تشدید یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیوں، کپڑے کے چیتھڑوں کے ذریعہ کوڑا کرکٹ اور غبار اور بھوسا وغیرہ نکال باہر کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام ام مَجْن تھا۔ ﴿آذنمونی﴾ اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ ﴿صغروا﴾ نبی ﷺ کی عظمت کے پہلو کے اعتبار سے انہوں نے اس کی وفات کو معمولی اور حقیر سمجھا۔ ﴿دلونی﴾ دال پر ضمہ۔ دلالت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿فدلوہ﴾ دال پر فتح اور لام پر ضمہ دلالت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ﴿ظلمہ﴾ منصوب ہے تمییز واقع ہونے کی بنا پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپؐ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (۲) مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انہی قبروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔۔ (۳) مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ (۴) مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ (۵) مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا

(۴۴۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْهَى
 (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے
 اسے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿النسعی﴾ موت کی اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع تو ممنوع نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے دور کے طریقے سے منادی کرنا ممنوع ہے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس منادی میں نوحہ ہوتا اور مرنے والے کے افعال حمیدہ بیان کئے جاتے تھے۔

(۴۴۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ، وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلَّى، فَصَفَّ بِهِمْ، وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کی موت کی اطلاع دینا ثابت ہو رہا ہے اور نماز غائبانہ بھی ثابت ہو رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ مگر احناف اور مالکی علماء اسے آپ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر کسی نے جنازہ نہ پڑھی ہو تو غائبانہ اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بات گو زنی ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ نجاشی پر حبشہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔

راوی حدیث: ﴿نجاشیؒ﴾ نون پر فتنہ۔ حبشہ کے بادشاہ کا لقب۔ جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے۔ نجاشی کا اصل نام اسمہ بن ابجرؒ تھا۔ کفار مکہ کے فتنہ سے اپنے دین کو بچانے کیلئے مسلمانوں نے اسی بادشاہ کے دور میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ نبی ﷺ نے ۶ھ کے آخر میں یا محرم ۷ھ میں عمرو بن امیہ ضمریؒ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آپؐ کے مکتوب گرامی کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے بھی لگایا اور اپنے تخت شامی سے نیچے اتر آیا اور حضرت جعفر بن ابی طالبؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ کو یہ ساری صورت حال تحریر کر کے بھجوا دی۔ غزوہ تبوک ۹ھ کے بعد ماہ رجب میں وفات پائی۔ پھر نبی ﷺ نے اس کے نائب کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

(۴۵۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں نے

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ مَيِّتٍ، فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلًا، لَا يُشْرِكُونَ بِاللَّهِ شَيْئًا، إِلَّا شَفَعَهُمُ اللَّهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ”کوئی مسلمان نہیں مرتا کہ اس کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مرنے والے کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کثرت جنازہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں چالیس موحد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے کہ بعض دوسری احادیث میں سو کی تعداد بھی ہے اور بعض میں تین صفوں کا ذکر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپؐ نے تعداد کا ذکر فرمایا۔

(۴۵۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ حَدَّثَنَا عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نَفَاسِهَا، فَقَامَ وَسَطُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپؐ اس نفاسیہا، فقام وسطہا۔ متفق علیہ۔ کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿فی نفاسیہا﴾ بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان میں کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مسند امام احمد، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے بلکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلہ میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منہ ایمان ہے اس لئے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ مگر یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

(۴۵۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: وَاللَّهِ لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى ابْنَتِي بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (مسلم)

حاصل کلام: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ دونوں مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی شرعی و نقلی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رحمہ اللہ کا جنازہ حضرت عمر رحمہ اللہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ نیز مسند سعید منصور میں ہے کہ حضرت عمر رحمہ اللہ خلیفہ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت مہیب رحمہ اللہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ اگر ایسا کرنا جائز و مکروہ ہوتا تو خلفاء راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابہؓ کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی قسم کی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جاسکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بیضاء﴾ سھل اور سھیل کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فہرہ ہے اور ان کے خاوند کا نام وہب بن ربیعہ قرشی ہے۔ سھل تو ان لوگوں میں سے تھا جس نے قریش کے اس صحیفہ کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا اور ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رحمہ اللہ نے شہادت دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ رہے سھیل تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے ہیں۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل رہے ہیں۔ غزوہ تبوک ۹ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ دو تو یہ تھے اور تیسرا صفوان تھا۔ غزوہ بدر میں قتل ہو کر جام شہادت نوش کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کے کافئ عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(۴۵۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ زَيْدٍ بْنِ أَرْقَمٍ قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمٍ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَازَتِنَا أَرْبَعًا، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةِ خُمُسًا، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَبَّرِيں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے پانچ، چھ سات اور آٹھ تکبیریں بھی منقول ہیں۔ مگر اکثر روایات میں چار

تکبیروں کا ذکر ہے۔ بھتیگی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے چار تکبیریں کہنے کا حکم فرمایا۔ بعض نے اسے اجماع قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے چار سے زائد تکبیریں بھی ثابت ہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد کی تکبیرات میں میت کیلئے دعا ہوتی ہے۔ تکبیرات جنازہ میں رفع الیدین صحابہ سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں بلکہ بعض علمائے احناف کا بھی اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ابی لیلیٰ﴾ انصاری مدنی ہیں۔ پھر کوفہ میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوفی کہلائے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت سے سماع ثابت ہے۔ ان کی کنیت ابو عیسیٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ جب ان کی پیدائش ہوئی۔ ۸۶ھ میں معرکہ جہاد میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نہر بصرہ میں ڈوب کر جاں بحق ہوئے۔

(۴۵۴) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حُفَيْفِ بْنِ سَهْلٍ أَنَّ كَبِيرَ عَلِيٍّ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ سَمِعَهُ يَقُولُ: إِنَّهُ بَدْرِيٌّ. رَوَاهُ فَرْمَايَا كَمَا فِي بَدْرِيٍّ تَحْتَهُ. (اسے سعید بن منصور نے سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ وَأَصْلُهُ فِي الْبَحَارِيِّ. روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿بدری﴾ بدری ہیں سے مراد ہے کہ وہ غزوہ بدر میں شریک تھے۔ بدری ہونے کا شرف و بزرگی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے چھ تکبیریں کہیں کہ اس طرح اس کیلئے زیادہ دعا مانگی جاسکے۔ حاصل کلام: اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ چار سے زائد تکبیریں کسی کی بزرگی اور شرف کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی جاسکتی ہیں۔

راوی حدیث: ﴿سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ﴾ حنیف تصغیر ہے حنیف کی۔ انصاری اسی مدنی۔ بدر اور باقی غزوات و مشاہد میں حاضر تھے۔ غزوہ احد میں نبی ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرہ پر عامل مقرر کیا اور صفین میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ماہین مؤاخاۃ ہوئی۔ ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(۴۵۵) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حُفَيْفِ بْنِ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُكَبِّرُ عَلَيَّ جَنَائِزَنَا أَزْبَعًا، وَيَقْرَأُ تَكْبِيرًا فِي سُوْرَةِ فَاتِحَةٍ (بھی) پڑھتے تھے۔ (اسے شافعی نے بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي التَّكْبِيرَةِ ضعیف سند سے روایت کیا ہے) الْأَوَّلَى. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حاصل کلام: اس سے اور آئندہ آنے والی روایت دونوں سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کی پہلی تکبیر میں سورہ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ اب یہ کہنا کہ قراءت کی نیت سے نہ پڑھے بلکہ صرف دعا کی نیت سے

(۴۵۶) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ، فَقَالَ لَتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت طلحہ بن عبد اللہ بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انہوں نے اس میں سورہ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے اس لئے سورہ فاتحہ پڑھی ہے) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لَتَعْلَمُوْا اَنَّهُا سَهْلَةٌ﴾ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ یہ طریقہ نبی ﷺ سے ماخوذ ہے۔ یہاں سنت سے وہ سنت مراد نہیں جو فرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ یہ فقہاء کرام کی جدید اصطلاح ہے۔ لہذا یہ اس کے وجوب کے منافی نہیں۔

حاصل کلام: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورہ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی اور وجہ بھی بیان کر دی کہ تمہیں بتانے کیلئے کہ یہ مسنون ہے۔ گویا نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحہ بن عبد اللہ بن عوف﴾ عبد الرحمن بن عوف مشہور و معروف صحابی کے بھائی کے بیٹے تھے۔ طلحہ ندی کے لقب سے مشہور تھے۔ ثقہ اور بڑے پایہ کے فقیہ تھے۔ اوساط تابعین میں شمار کئے گئے ہیں۔ ۹۷ھ میں ۷۲ برس کی عمر ا کر فوت ہوئے۔

(۴۵۷) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى جَنَازَةٍ،
فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ،
وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ،
وَأَكْرِمْ نَزْلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاعْسِلْهُ
بِالْمَاءِ، وَالتَّلَجِ، وَالْبَرْدِ. وَنَفِّهِ مِنَ
الْحَطَايَا، كَمَا نَقَبْتَ الثُّوبَ الْأَبْيَضَ
مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَارًا خَيْرًا مِّنْ
دَارِهِ، وَأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ

الْجَنَّةِ، وَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَعَذَابِ اَهْلِ وِعَالٍ سِمْتِ اَهْلِ وِعَالٍ عَطَا فَرَا، اِسَ جَنَّتِ النَّارِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

دوزخ سے محفوظ رکھ۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نزله﴾ ”نون“ اور ”زا“ دونوں پر ضمہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”زاء“ ساکن ہو۔ خورد و نوش کی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی کوئی چیز اور یہاں اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿وسع﴾ توسیع باب تفعیل سے۔ کشادہ و وسیع کر۔ ﴿مدخله﴾ میم پر ضمہ، جائے داخلہ۔ مراد یہاں قبر ہے۔ ﴿البرد﴾ ”با“ اور ”را“ دونوں پر فتح اولے مراد ہیں۔ ﴿نقه﴾ ”قاف“ پر تشدید۔ تنقیہ سے ماخوذ ہے، دعا ہے کہ پاک کر دے صاف ستھرا کر دے۔ ﴿الندنس﴾ دال اور نون دونوں پر فتح میل یکجہ۔ ﴿ابدله﴾ ابدال سے ماخوذ ہے (باب افعال) بدل دے۔ اس کے عوض دے ﴿وقه﴾ اس میں واؤ عطف کی ہے۔ ”قاف“ کے نیچے کسرہ ہے۔ وقایہ سے ماخوذ ہے۔ دعا ہے اور ”هَاء“ ضمیر میت کی طرف راجع ہے۔ بچا اے، حفاظت فرما اس کی، محفوظ رکھ اسے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی۔ تبھی تو حضرت عوف بن مالکؓ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ ابوداؤد وغیرہ میں تو ”سمعت“ کا لفظ صراحتاً منقول ہے کہ میں نے یہ دعا آپؐ سے سنی اور یہ بھی امکان ہے کہ راوی نے آپؐ سے بعد میں پوچھ کر یاد کر لیا ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے اور بعض بآواز بلند کے بھی قائل ہیں۔ بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رات کے اوقات میں بآواز بلند اور دن میں آہستہ آواز سے مانگی جائے۔ دعائیں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے اس لئے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو رائج قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباسؓ کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عوف بن مالکؓ﴾ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلہ ایشیع سے تعلق کی وجہ سے ایشیع کہلائے۔ غزوہ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلہ اجمع کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(۴۵۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: ”الهي! همارے زندوں اور مردوں، ہمارے حاضر و غائب، اَغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِينَا، وَغَائِبِينَا، وَصَغِيرِنَا، عورتوں کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الهي! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور

أَحْيَيْنَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ ، جیسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز
وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ ، فرما۔ الہی! ہمیں اس کے اجر و ثواب سے محروم نہ
اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ ، وَلَا تَفْتِنَا رُکھو اور نہ ہمیں اس کے بعد گمراہ کرنا۔ (اسے مسلم
بَعْدَهُ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالْأَزْهَعِيُّ۔ اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت

کیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿شاہدنا﴾ جو حاضر ہیں۔ ﴿صغیرنا﴾ کم عمر اور چھوٹے عمر والوں کے حق میں بلندی
درجات کی دعا یا اس کی دعا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ ﴿
فاحیہ﴾ احیاء سے ماخوذ ہے۔ زندگی کی دعا۔ ﴿لا تحرمنا﴾ ”تا“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ۔
حرمان سے ماخوذ و مشتق ہے۔ نہ محروم رکھ ہمیں۔ ﴿اجرہ﴾ اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا
ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ ﴿لا تفتننا﴾ دوسرے ”تا“ کے نیچے کسرہ اور نون جمع پر تشدید۔ باب ضرب
بضرب سے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و
آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لئے مقام عبرت بنا دے۔ یہ حدیث مسلم میں نہیں
ہے۔ مگر غالب یہ ہے کہ یہ کسی کاتب کی کرم فرمائی ہے، مصنف کی نہیں۔

(۴۵۹) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے
«إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ» فرمایا ”جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو خوب
الِدُّعَاءُ“۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ۔ خلوص دل سے اس کیلئے دعا کرو۔“ (اسے ابوداؤد نے

روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز جنازہ پڑھنے والے دراصل مرنے والے کیلئے رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی
سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو اس لئے سفارش کرنے
والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے۔ لہذا اس کیلئے جتنے
خلوص قلب سے دعا کی جاسکتی ہو کرنی چاہئے۔ لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں۔ خلوص
نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے اور دو تین منٹ میں جنازے کا جھٹکا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(۴۶۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے
«أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكَ صَلَاحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكَ سَوَى ذَلِكَ، فَسَرُّ تَضُمُونَهُ عَنْ» فرمایا ”جنازہ لے جانے میں جلدی کیا کرو۔ اس
لئے کہ اگر مرنے والا صالح اور نیک آدمی تھا تو اس کیلئے بہتر ہوگا کہ اسے بہتر جگہ کی طرف جلدی لے
جاؤ اور اگر دوسرا ہے (برا آدمی ہے) تو اپنی گردن

رِقَابِكُمْ۔ مَنَقَنَ عَلَيْهِ۔ سے اتار کر رکھ دو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اسرعوا﴾ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کو جلدی لے جاؤ اور تجیزو تکفین میں جلدی کرو ﴿تضعونه﴾ وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانا ہوتا ہے اور یہ کنایہ اپنے سے دور کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے دفن کرنے میں بلا ضرورت تاخیر کرنا خلاف سنت ہے۔ میت کو جلدی دفن کرنے کی تاکید حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھی۔ نیز طبرانی میں سند حسن سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اسے روک نہ رکھو بلکہ اسے قبر کی طرف جلدی سے لے جاؤ۔“

(۴۶۱) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قَبْرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قَبْرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا الْقَبْرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الْجَبَلَيْنِ الْعَظِيمَيْنِ». مَنَقَنَ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «حَتَّى تُوَضَّعَ فِي اللَّحْدِ»۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔“ دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”دو قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔“ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے ”میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔“ اور بخاری کی روایت میں ہے ”جس نے کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿قیراط﴾ ”قاف“ کے نیچے کسرو۔ نصف دانق اور دانق درہم کا چھٹا حصہ۔ قیراط سمجھ میں جلدی آجانے والا پیمانہ وزن تھا اس لئے قیراط بولا گیا ہے۔ اس زمانہ میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مذکور قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی پیمانہ مطلوب و مقصود تھا کہ اس کو دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ ﴿ایمانا و

احتساباً ۽ دونوں منصوب ہیں علت کی بنا پر یا پھر حال واقع ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازہ میں شرکت کے ساتھ طلب اجر و ثواب کی غرض ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازہ میں شرکت کا اہتمام کریں۔ اس روایت میں لفظ ”قیل“ سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ابو عوانہ میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال آپ سے کیا تھا کہ قیراط کیا ہے؟

(۴۶۲) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ حَضَرَ سَالِمُ ابْنُ أَبِيهِ وَالِدَ سَالِمٍ رَوَى عَنْهُ حَضْرَتُ ابْنِ مَرْجَانٍ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، انهمُ نَبِيٌّ ﷺ حَضَرَ ابْنُ مَرْجَانٍ وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَابْنُ جَبَّانٍ، وَأَعْلَهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةُ رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، جَنَازَةَ كَيْسِ بْنِ مَرْجَانٍ (اس کو پانچوں نے وَصَّحَهُ ابْنُ جَبَّانٍ، وَأَعْلَهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةُ رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، جَنَازَةَ كَيْسِ بْنِ مَرْجَانٍ اور ایک گروہ نے اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا بِالْإِسْنَادِ۔)

(ہے)

حاصل کلام: جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہئے یا پیچھے۔ مختلف روایات سے آپ کا عمل دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرح ثابت ہے مگر بہتر کونسا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ جمہور علماء امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ تینوں ائمہ آگے آگے چلنے کو بہتر خیال کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ پیچھے چلنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے پیچھے ہر سمت چلنا جائز ہے۔ کسی پر فوقیت و برتری اور ترجیح نہیں۔ چلنے والے جس طرح سہولت پائیں، اس پر عمل کریں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیدل چلنے والے آگے چلیں اور سوار جنازے کے پیچھے پیچھے۔ یہ رائے سفیان ثوری اور کچھ دیگر علماء کی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ خواتین بھی ہوں تو اس صورت میں مردوں کو جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے ورنہ پیچھے چلیں گے۔ بہر حال جس طرح کی صورت درپیش ہو چلنے والے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

راوی حدیث: (سالم) ان کی کنیت ابو عبد اللہ یا ابو عمر ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ سالم بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے فقہاء سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم و فضل میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۰۶ھ میں ذی القعدہ یا ذی الحجہ کے مہینے میں فوت ہوئے۔

(۴۶۳) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: نَهَيْتُنَا عَنْ اتِّبَاعِ الْجَنَازِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا مگر یہ ممانعت ہم پر لازمی قرار نہیں دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نہینا﴾ صیغہ مجہول ہے مگر یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ بخاری میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ ﴿لم یعزم﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی یہ ممانعت ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دی گئی بلکہ یہ نفی کرامت و ناپسندیدگی کیلئے تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہو گیا تو جس طرح آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے نسائی، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ ایک جنازہ میں عورتیں شریک ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”انہیں جانے دو۔“

(۶۶۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ الْجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ تَبِعَهَا فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى تَوَضَّعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم کسی جنازے کو آتے دیکھو تو الجنازۃ فقوموا، فمَنْ تَبِعَهَا فَلَا يَجْلِسُ حَتَّى تَوَضَّعَ“۔ متفق علیہ۔

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فقوموا﴾ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری دو ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قیام چھوڑ دیا تھا (حتیٰ توضع) آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔

حاصل کلام: موت کا عمل انسان کیلئے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے۔ نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ کو علم ہوا کہ جنازہ کیلئے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپؐ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنا نہیں چاہئے۔ نسائی میں حضرت ابو ہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ نبی ﷺ کسی جنازے پر حاضر ہوئے ہوں اور جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے ہوں۔

(۶۶۵) وَعَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، أَنَّ حضرت ابواسحقؓ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يَزِيدَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَذْخَلَ الْمَيِّتَ مِنْ قَبْلِ رَجُلِي فِي الْقَبْرِ، وَقَالَ: هَذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میت کو اس کے پاؤں کی طرف سے قبر میں اتارا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿من رجل القبر﴾ یعنی اس جانب سے جس جانب سے میت کے پاؤں ہوتے ہیں یہ حال کا اطلاق محل پر ہے۔ یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہئے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعیؒ و احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو اسحاق﴾ عمرو بن عبد اللہ سبی ممدانی کوئی۔ مشہور تابعی کثیر الروایہ۔ مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عبد اللہ ابن یزید رضی اللہ عنہ﴾ عظمیٰ انصاری۔ قبیلہ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

(۴۶۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُورِ، فَقُولُوا: بِسْمِ اللَّهِ، وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعْلَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوَقْفِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو ”بسم اللہ“ وعلی ملہ“ رسول اللہ“ کہو۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے نکالا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے معلول قرار دیتے ہوئے اسے وقوف کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ امام دارقطنی رضی اللہ عنہ کی طرح نسائی نے اس روایت کو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔

(۴۶۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «كَسَرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكْسَرِهِ زَنْدَةً لِنَاسِكٍ كِي هَدَى تَوْتُنْ كِي گناہ کی طرح ہے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کسی مردے کی ہڈی توڑنے (کا گناہ) زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے گناہ کی طرح ہے۔“

حَیًّا۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، (اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرط کی سند سے روایت کیا ہے) وَزَادَ ابْنُ مَاجَهٍ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: فِيهِ أَوْرَابُ ابْنِ مَاجَهٍ نَعَى أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ أَبِيهَا مِنْ رِوَايَةِ مَرْوَى رَوَايَةِ فِيهِ الْإِنْمِ۔ اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (گناہ میں)۔“

لغوی تشریح: ﴿فی الانم﴾ گناہ میں۔ یعنی کہ مردہ کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسا ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنے کا ہے۔ یہ درد اور الم و تکلیف کے پہلو سے نہیں کیونکہ زندہ کو اس سے تکلیف ہوگی جبکہ مردے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسلمان خواہ وہ مردہ ہی ہو اس کی عزت و احترام کا سبق ملتا ہے۔ احترام میں زندہ اور مردہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھا۔ مگر اس دور میں سرجری نے اتنی ترقی کر لی ہے جس کا صدیوں پہلے خواب و خیال بھی نہ تھا۔ علماء کرام نے جرم کی تحقیق و تفتیش کیلئے پوسٹ مارٹم اور علاج معالجہ کیلئے چیرپھاڑ کی اجازت دی ہے۔

(۴۶۸) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَلْحَدُوا لِي لَحْدًا وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبْنَ نَضْبًا، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے لئے بغلی لحد والی قبر بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں چننا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔ (مسلم)

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ کی قبر زمین سے صرف ایک باشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ”قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔“

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الْأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُنْبَى عَلَيْهِ۔

لغوی تشریح: ﴿الحدوا﴾ فتح یفتح سے امر کا صیغہ۔ لحد۔ قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں جہاں سے میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے ﴿وانصبوا﴾ ضرب بضر ب سے صیغہ امر ہے۔ اقبموا کے معنی میں یعنی نصب کرو، قائم کرو ﴿اللبن﴾ لام پر فتح اور ”با“ کے نیچے کسرہ، اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے جب اسے آگ میں پکایا جائے تو ”آجر“ کہتے ہیں یہ جیم پر ضمہ اور ”را“ پر تشدید ﴿قدر شبر﴾ شین پر کسرہ اور ”با“ ساکن۔ یہ فاصلہ ہے جو انگوٹھے کے سر سے لے کر چھٹکی کے سر تک۔ یعنی باشت۔ ﴿ان

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ (۱) قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہئے۔ (۲) قبر کو بغلی بنانا آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (۳) کچی اینٹیں اندر لگانی چاہئیں۔ (۴) قبر پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا اور قبر کو پختہ بنانا شرعاً منع ہے اور یہ ممانعت تحریمی ہے۔ (۵) نیز قبر کو کوئی مخصوص شکل دینا بھی درست نہیں۔ نبی ﷺ کی ابدی آرام گاہ کو بان نما تھی اور ایک بالشت سے بلند نہیں تھی اور یہی کیفیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرنے کے بعد وہاں موجود آدمیوں کو تین تین مٹھیاں بھر کر مٹی کھڑے کھڑے ڈالنی چاہئے۔

(۷۰) وَعَنْ عُمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: أَسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ، وَسَلُّوا لَهُ التَّيِّبَاتِ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ رِزَاةَ أَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عثمان رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ ”اپنے بھائی کیلئے بخشش مانگو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے باز پرس کی جائے گی۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت سے قبر میں باز پرس ہوتی ہے۔ تدفین کے بعد دعا کرنا

(۷۱) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيبٍ -
أَحَدِ التَّابِعِينَ - قَالَ: كَانُوا
يَسْتَحِبُّونَ إِذَا سُويَ عَلَى الْمَيِّتِ
قَبْرُهُ وَأَنْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ
عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلَانُ! قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلَانُ! قُلْ:
رَبِّيَ اللَّهُ، وَدِينِي الْإِسْلَامُ، وَنَبِيِّ
مُحَمَّدٌ ﷺ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْفُوعًا،
وَالطَّبْرَانِيُّ نَحْوَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أَمَامَةَ مَوْفُوعًا
مُطَوَّلًا.

نفوی تشریح: ﴿کانوا یستحبون﴾ پسند کرنے والوں سے یہاں صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ﴿سوی﴾ تسویہ سے ماخوذ ہے، علامہ ابن قیم نے المنار میں کہا ہے کہ تلقین کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک موضوع ہونے میں ذرا بھر شک نہیں۔ اسی طرح انہوں نے ”الہدیٰ“ میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

حاصل کلام: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اہل شام کے علاوہ میں نے یہ عمل کسی اور کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راوی حدیث: ﴿ضمہ بن حبیب﴾ ان کی کنیت ابو عتبہ ہے۔ ضمہ میں ضا پر فتح اور میم ساکن۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ ضمہ بن حبیب بن مصعب زبیدی۔ زبیدی کی ”زا“ پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے اس لئے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(۴۷۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحَصْبِ حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ». زَادَ ابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتُزَكِّدُهُ فِي الدُّنْيَا».

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب ان کی زیارت کرو۔“ (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔“ اور ابن ماجہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنا دیتی ہے۔“

لغوی تشریح: فروروا زیارت سے امر کا صیغہ ہے۔ ممانعت کے بعد اجازت کے معنی میں ہے۔ ﴿تذکر﴾ تذکیر سے ماخوذ ہے یعنی یاد دہانی کراتی ہے۔ ﴿تزہد﴾ تزہید سے ماخوذ ہے۔ یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ابتداء میں آپؐ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

(۴۷۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کیلئے جانے والی خواتین پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث خواتین کا قبور کی زیارت کیلئے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کیلئے جانا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت و رخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت و رخصت دی گئی تو اس میں مرد و عورت شامل ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تا حال زیارت قبور کی حرمت خواتین کیلئے برقرار ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع و فزع، آہ و بکا کثرت سے کرتی ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عموماً حرام کام کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں، روتی پٹختی اور بین کرتی ہیں، جزع و فزع کرتی ہیں اور جیتی چلاتی ہیں، یہ امور اسلام کی تعلیم کے منافی ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے، اخروی یاد دہانی و تذکیر کیلئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں ”زوارات“ کا لفظ ہے کہ عورتوں کے باکثرت قبرستان جانے پر آپؐ نے لعنت فرمائی۔ عبرت کیلئے لگاہے لگاہے جانا جائز ہے۔

(۴۷۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالْمُسْتَمِعَةَ. فرمائی ہے۔ (ابوداؤد) أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

(۴۷۵) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ لَا نَنُوحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت کے موقع پر یہ عہد لیا تھا کہ ہم میت پر نوحہ نہ کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

(۴۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نَيْحَ عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنْ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”مرنے والے کو اس پر نوحہ کرنے والوں کے سبب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم نیز ان دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطے سے اسی طرح روایت بیان کی ہے۔)

نفوی تشریح: ﴿المیت یعذب﴾ اس حدیث میں ایک اشکال ہے کیونکہ اس کی رو سے دوسرے کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ثابت ہو رہا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا تذروا رزقہ وزر اخری (۱۵/۱۷) کہ ”کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“ اس لئے علماء کرام نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک قول ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ ہو اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا ہو پھر تو اسے عذاب ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو۔ بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

نغوی تشریح: ﴿شہدت بنتا﴾ یہ آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثومؓ تھیں۔ جنہوں نے ۹ھ میں وفات پائی۔ ﴿تدفن﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ ﴿تدمعان﴾ ”تا“ اور میم دونوں پر فتح یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے۔ نبی ﷺ کے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ بھی گریہ و زاری کرتے ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا ”یہ بے صبری کی وجہ سے نہیں بلکہ شفقت پوری کی بنا پر ہے۔“ گویا غم کی وجہ سے شفقت پوری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قاتل مذمت و ملامت نہیں البتہ زبان سے جح و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(۴۷۸) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلَّا أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَأَصْلُهُ فِيهِ مُسْلِمٌ، لَكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ فِي اللَّيْلِ حَتَّى يُمْضَى عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الا یہ کہ تم اس کیلئے مجبور ہو جاؤ۔“ (ابن ماجہ) اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپؐ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا الا یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

لغوی تشریح: ﴿ لا تدفنوا ﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ ﴿ زجر ﴾ زجر سے ماخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔ مسلم کی حدیث میں رات کے اوقات میں میت کو دفن کرنے کی ممانعت صرف اس گمان کے تحت ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے۔

حاصل کلام: یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت کفن اچھی طرح نہ دیا جاسکے گا۔ اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی جائے اور کسی عذر سے دفن کی نوبت رات کو آئے تو یہ منع نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ کو رات ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی رات ہی کو ہوئی تھی بلکہ خود رسالت مآب ﷺ نے ایک صحابی کو رات کو دفن کیا تھا۔ (ترمذی، ابن ماجہ) یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کو کسی خاص وجہ کے بغیر بھی دفن کرنا جائز ہے۔ جمہور اسی

کے قائل ہیں۔ مگر امام حسن بصری رحمہ اللہ، سعید بن مسیب رحمہ اللہ اور متاخرین میں ابن حزم رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ رات کو بلا ضرورت دفن کرنا مکروہ ہے۔

(۴۷۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ، جِئْنَا قَبِيلَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اضْنَعُوا لِأَلِ جَعْفَرٍ رحمہ اللہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو۔ ان کو ایسی طَعَامًا، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ». تکلیف دہ اطلاع ملی ہے جو ان کو کھانا پکانے سے أَخْرَجَهُ الْخَفْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ. مشغول رکھے گی۔“ (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے

روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو ان کو کھانا کھانا مسنون ہے۔ ہمسایہ کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اعزاء و اقرباء کیلئے سنت ہے باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔

راوی حدیث: ﴿جعفر بن ابی طالب رحمہ اللہ﴾ حضرت جعفر، ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علی رحمہ اللہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا ”مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے اتنی مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔“ انتہائی سخی انسان تھے۔ ۸ھ میں موت کے معرکہ میں جاں شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکہ میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ کے بدلہ ان کے دو پر لگا دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔“ اسی وجہ سے ان کو جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر زوالجناحین بھی انہی کا لقب ہے۔

(۴۸۰) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، حَضْرَتِ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب قبرستان جاتے تو رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ان کو سکھلاتے کہ یوں کہو۔ سلام یَقُولُوا: السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ! مومنوں اور مسلمانوں میں سے مَنْ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ، وَإِنَّا إِن اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں

شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، نَسَأُ اللَّهُ اور ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے عافیت کا لَنَا وَلَكُمْ الْعَافِيَةَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. سوال کرتے ہیں۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿اہل الدیار﴾ ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار، دار کی جمع ہے۔ گھر کو قبر سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے کہ قبر میت کیلئے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر ان کیلئے اور اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ”من المؤمنین والمسلمین“ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک، کافر اور ملحد کے لئے دعا و بخشش جائز نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس، مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یہ سب کام خلاف شرع ہیں اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سلیمان بن بريدہ بن حصیب اسلمی مروزی رحمہ اللہ﴾ مشہور تابعی ہیں۔ ابن معین اور ابوحاتم نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کیس مذکور نہیں مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث مسلم میں منقول ہیں۔

(۴۸۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِقُبُورِ الْمَدِينَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ الْقُبُورِ! يَغْفِرُ اللَّهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالْآثَرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ کے قبرستان پر ہوا۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ”اے اہل قبور! تم پر سلام ہو۔ اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔ اہل القبور! یغفر اللہ لنا ولکم، انتم سلفنا، ونحن بالآثر“۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے۔)

لعنوی تشریح: ﴿انتم سلفنا﴾ سلفنا میں سین اور لام دونوں پر فتح ہے۔ یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ ﴿نحن بالآثر﴾ اثر میں ممرہ اور ”ثا“ پر فتح، ہم تمہارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور تمہیں ملنے والے ہیں۔

(۴۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، (بخاری) ترمذی نے مغیرہ کے حوالہ سے اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مردوں کو گالی مت دو اس لئے کہ انہوں نے جو بھیجا ہے اسے حاصل کر لیا ہے۔“

وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُعِيزَةِ نَحْوَهُ، لَكِنْ قَالَ: رَوَيْتُ كَيْفَ لَكِنْ اس میں فتوٰ ذوا الاحياء ہے
یعنی گالی سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔

لغوی تشریح: ﴿لَا تَسُبُّوا﴾ سب سے ماخوذ ہے۔ باب نصر بنصر گالی گلوچ، سب و شتم، برے اور قبیح
وصف سے پکارنا۔ ﴿افْضُوا﴾ افضاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں۔ پاچکے ہیں ﴿إِلَى مَا قَدَّمُوا﴾ جو اعمال
و افعال وہ آگے بھیج چکے ہیں یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ ﴿فَتَوَذَّاءُوا بِالْأَحْيَاءِ﴾ ایذا سے ماخوذ ہے۔ یعنی
تمہارا مردوں کو برا بھلا کہنا، سب و شتم کرنا، زندوں کیلئے باعثِ اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے
قربیت داری کا تعلق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو سب و شتم نہیں کرنا چاہئے۔ ابو لہب کی بیٹی
ورہہ مسلمان ہوئی تو بعض نے کہا اللہ کے دشمن کی بیٹی مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے اس کی شکایت رسول
اللہ ﷺ سے کی تو آپؐ نے فرمایا ”مرنے والوں کو برا مت کہو۔ اس سے ان کی مسلمان ہونے والی اولاد کو
تکلیف پہنچتی ہے۔“ (مسند احمد) غور فرمائیں جب کفار کو ان کی مسلمان اولاد کے سامنے گالی دینا جائز نہیں
تو مسلمانوں کے اکابرین کو گالی دینا اسلام کی کوئی خدمت ہے؟



٤ - كِتَابُ الزَّكَاةِ

زکوٰۃ کے مسائل

(۴۸۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
بَعَثَ مُعَاذًا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى
الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ: «إِنَّ
اللَّهَ قَدْ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي
أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدُّ
عَلَى فُقَرَائِهِمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ
لِلْبُخَارِيِّ.

لغوی تشریح: ﴿کتاب الزکاة﴾ لغت میں زکوٰۃ نمولیعنی زیادہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور پاکیزہ ہونا۔ زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مال کو پاک کر دیتی ہے اور صاحب مال کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے کے مال کو اور بڑھا دیتی ہے اور اس کے وقت فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ھ میں فرض ہوئی، رمضان کی فرضیت سے پہلے اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ میں ہی ہو گئی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں ۲ھ کو نازل ہوئے ہیں۔ ﴿بعث معاذالی یمن﴾ آپؐ نے ۱۰ھ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا اور ایک قول کے مطابق ۹ھ میں اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ھ میں بھیجا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر شام کا رخ کیا اور طاعون عمواس کے زمانہ میں وفات پائی۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کیلئے وصیت تھی کہ انہیں اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک انجام دینا ہے ﴿افترض﴾ فرض قرار دی گئی۔ ﴿فترد﴾ اس میں ”فا“ تعقیب کیلئے ہے یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ﴿ترد﴾ رو سے ماخوذ ہے

اور صیغہ مجہول ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے عہد باسعادت سے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہو گیا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکوٰۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مقامی فقراء سے اگر زکوٰۃ بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکوٰۃ منتقل کی جاسکتی ہے۔ یہ غریاء کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔

(۴۸۴) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ كَتَبَ لَهُ: هَذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ، الَّتِي فَرَضَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، وَالَّتِي أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولُهُ: «فِي كُلِّ أَرْبَعٍ وَعِشْرِينَ مِنَ الْإِبِلِ فَمَا دُونَهَا الْغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٍ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وَعِشْرِينَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلَاثِينَ، فَفِيهَا بَنْتُ مَخَاضٍ أُتْنَى، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ فَأَبْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَثَلَاثِينَ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِينَ فَفِيهَا بَنْتُ لَبُونٍ أُتْنَى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَأَرْبَعِينَ، إِلَى سِتِّينَ، فَفِيهَا حِقَّةٌ طَرَوْقَةُ الْجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّينَ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِينَ، فَفِيهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتًّا وَسَبْعِينَ، إِلَى تِسْعِينَ، فَفِيهَا بَنْتُ لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِينَ، إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ، فَفِيهَا حِقَّتَانِ طَرَوْقَتَانِ الْجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو دیا تھا کہ اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری جب تعداد پچیس سے بڑھ کر پستتیس ہو جائے تو اس تعداد پر ایک سالہ اونٹنی اگر میسر نہ ہو تو پھر دو سالہ نر بچہ اور جب چھتیس سے تعداد بڑھ کر پینتالیس تک پہنچ جائے تو ان میں دو سالہ اونٹنی اور جب چھیالیس سے بڑھ کر ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں تین سالہ جوان اونٹ کی جفتی کے قابل اونٹنی اور جب اکٹھ سے بڑھ کر پچھتر تک پہنچ جائے تو ان میں چار سالہ اونٹ اور جب چھتر سے تعداد بڑھ کر نوے ہو جائے تو ان میں دو، دو سالہ دو اونٹیاں اور پھر اکانوے سے بڑھ کر تعداد ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو ان میں تین، تین سالہ دو جوان اونٹیاں۔ جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد

وَمِائَةٌ، فَفِي كُلِّ أَرْبَعِينَ بَنْتُ لَبُونٍ، وَفِي كُلِّ خَمْسِينَ حِقَّةٌ. وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ إِلَّا أَرْبَعُ مِنَ الْإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَفِي صَدَقَةِ الْغَنَمِ، فِي سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِينَ، إِلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ شَاةٍ، فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِينَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ، فَفِيهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ، إِلَى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِيهَا ثَلَاثُ شِيَاهٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلَاثِمِائَةٍ، فَفِي كُلِّ مِائَةٍ شَاةٍ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عَنْ أَرْبَعِينَ شَاةٍ، شَاةٍ وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا، وَلَا يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلَا يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشِيَةَ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنْ خَلِيطَيْنِ، فَإِنَّهُمَا يَتَرَا جَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَةِ. وَلَا يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرَمَةٌ، وَلَا دَاثُ عَوَارٍ، وَلَا تَيْسٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْمُصَدِّقُ. وَفِي الرِّقَّةِ: فِي مِائَتِي دِرْهِمٍ، رُبْعُ الْعُشْرِ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ إِلَّا تِسْعِينَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيهَا صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةُ الْجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الْحِقَّةُ،

پر کوئی زکوٰۃ نہیں الا یہ کہ ان کا مالک چاہے اور بکریوں کی زکوٰۃ کہ جو باہر چرنے جاتی ہوں، چالیس سے لے کر ایک سو بیس کی تعداد پر صرف ایک بکری زکوٰۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے گی تو دو بکریاں زکوٰۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائے گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے گی تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ وصول ہوگی، اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم تعداد میں ہوں تو مالک پر کوئی زکوٰۃ نہیں الا یہ کہ مالک چاہے۔ زکوٰۃ کے ذر سے نہ تو الگ الگ چرنے والیوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ ہی اکٹھی چرنے والیوں کو الگ الگ۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہوں وہ مساوی طور پر زکوٰۃ کا حصہ نکالیں۔ زکوٰۃ کی مد میں بوڑھا اور نہ یک چشم جانور اور نہ ساند لیا جائے الا یہ کہ زکوٰۃ دینے والا آپ چاہے اور چاندی کے سکوں کا نصاب دو سو درہم ہے اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم سے ایک درہم بھی کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں الا یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکوٰۃ میں چار سالہ اونٹ واجب الوصول ہو اور اس کے پاس اس عمر کا اونٹ نہ ہو اور یہ اس کے پاس تین سالہ ہو جو ان اونٹنی تو اس سے دو بکریاں اور تین سالہ جفتی کے لائق جو ان اونٹنی وصول کیا جائے بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب

وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنْ اسْتَيْسَرَ تَا
لَهُ، أَوْ عَشْرِينَ دِرْهَمًا. وَمَنْ بَلَغَتْ
عِنْدَهُ صَدَقَةُ الْحَقِّهِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ
الْحَقُّهُ، وَعِنْدَهُ الْجَذَعَةُ. فَإِنَّهَا تُقْبَلُ
مِنْهُ الْجَذَعَةُ، وَيُعْطِيهِ الْمُصَدَّقُ
عَشْرِينَ دِرْهَمًا أَوْ شَاتَيْنِ. رَوَاهُ

(بخاری)

البخاری.

لغوی تشریح: ﴿کتاب لہ﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تحریر کر کے دیا جب ان کو بحرن کی طرف زکوٰۃ کی وصولی پر عامل بنا کر بھیجا۔ ﴿ہذہ فریضۃ الصدقۃ﴾ یہ فریضت زکوٰۃ کا نوشتہ ہے۔ اس تحریری مکتوب کا آغاز اس سے ہوتا ہے۔ بخاری میں مکتوب سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے ﴿فما دونہا﴾ اس تعداد سے کم کا مطلب ہے چوبیس سے کم۔ الغنم بکری اور بھیڑ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں الغنم مبتداء مؤخر ہے اور اس کی خبر ﴿فی کل اربع وعشرین فما دونہا﴾ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس تعداد و مقدار میں بکری یا بھیڑ زکوٰۃ میں نکالنا ہے۔ ﴿فی کل خمس﴾ ہر پانچ کی تعداد میں سے مراد اونٹ ہیں۔ جب پانچ اونٹ ہوں گے تو زکوٰۃ کا نصاب شروع ہوگا اور اس تعداد پر ﴿شاة﴾ ایک بکری یا بھیڑ دینا ہوگی ﴿بنت مخاض﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ ”مخاض“ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ چکی ہو کہ وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت تو رکھتی ہو مگر ہنوز حاملہ نہ ہوئی ہو۔ اسے مخاض اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا شمار ان میں ہے جو حاملہ ہوتی ہیں اور مؤنث کی قید تاکید کیلئے ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ زاونٹ وہ کام نہیں دے سکتا جو مادہ دے سکتی ہے۔ ﴿ابن لبون﴾ لبون کے لام پر فتح ہے۔ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ ﴿بنت لبون﴾ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿حقہ﴾ ”حاء“ کے نیچے کسرہ اور قاف پر تشدید۔ مادہ (اونٹنی) جو تین سال کی عمر پوری کر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کی جمع حقائق آتی ہے اور مذکر اس کا ﴿حق﴾ ”حاء“ کا کسرہ ہے۔ ”حقہ“ اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سواری کی جاسکتی ہے اور بار برداری کے قابل ہو جاتی ہے اور نر کی جفتی کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ﴿طروقة الجمال﴾ کہا گیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ نر اگر اس پر جفتی کے ذریعہ وطی کرے تو کر سکتا ہے خواہ اس سے وطی نہ کی ہو۔ ﴿جذعہ﴾ جیم اور ذال دونوں پر فتح جو پورے چار کو پہنچ چکی ہو اور پانچویں میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿فاذا زادت﴾ جب تعداد اس سے زیادہ ہو جائے ﴿علیٰ عشرين﴾

ومائۃ ﴿ ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔ ﴿ ففی کل اربعین ﴾ تو ان کو چالیس اور پچاس کے دو زمروں میں تقسیم کر لیں گے۔ مثلاً جب مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں اس تعداد کو تین مرتبہ چالیس شمار کیا جائے گا اور ایک کے زائد عدد کا کوئی وزن نہیں۔ تین دفعہ چالیس کی صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی۔ یہ ایک سو تیس تک کی زکوٰۃ ہوگی اور ایک سو تیس کی صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس پر دو بنت لبون، بس اسی طرح دس کے اضافہ کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکوٰۃ ہوگی تا وقتیکہ یہ تعداد ایک سو انیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضا کلام یہ ہے کہ سروس کو شمار میں نہیں رکھا جاتا اور تمام دہائیوں میں زکوٰۃ ہے (مثلاً دس، بیس، تیس علیٰ ہذا القیاس)۔ (عون المعبود اور سبل الاسلام) الا ان یشاء ربہا الا یہ کہ اونٹوں کا مالک رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکوٰۃ کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ اس پر واجب نہیں ہے۔ ﴿ ففی سائمۃ ﴾ سے مراد زکوٰۃ میں وصول کی جانے والی بکریاں ”سائمۃ“ وہ بکری جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنا ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔ ﴿ الیٰ عشرين ومائۃ شاة شاة ﴾ ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے پہلا ”شاة“ کا لفظ مائۃ کی تیز ہے اور دوسرا شاة مرفوع ہے اور یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ ﴿ ففی صدقۃ الغنم ﴾ ہے اور شاة کے لفظ میں زروادہ، بھڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاہ کا مترادف ہے یعنی شاة اور غنم دونوں ہم معنی ہیں اور ﴿ فاذا زادت علی عشرين ومائۃ ﴾ جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو اس میں دو بکریاں ہیں اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں ﴿ فاذا زادت علی ثلاث مائۃ ففی کل مائۃ شاة ﴾ اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ تعداد چار سو تک پہنچ جائے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی۔ پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے ”کہ جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے“ جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ فاذا كانت سائمة الرجل ﴾ جب آدمی کے جانور جنگل میں چرنے چکنے والے چالیس سے تعداد میں کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکوٰۃ دینا نہیں بنتی۔ ﴿ ناقصۃ ﴾ منصوب ہے۔ کانت کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ﴿ من اربعین شاة واحدة ﴾ دونوں شاة پر فتح ہے اس لئے منصوب ہے پہلی صورت میں عدد سے تمیز واقع ہو رہی ہے اور دوسری صورت میں حرف جر محذوف ہے جسے نزاع الیٰ فضل کہتے ہیں یعنی بشاة واحدة یا پھر یہ ناقصہ مفعول ہے۔ مطلب ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے

پاس باہر چرنے چھٹنے والے جانوروں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور جب تعداد ایک سے بھی زیادہ کم ہو پھر تو کسی صورت بھی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ولا یجمع﴾ صیغہ مجمول (نہ جمع کیا جائے گا نہ اکٹھا کیا جائے گا) ”ولا یفرق“ ”را“ پر تشدید (صیغہ مجمول) ﴿خشبة الصدقة﴾ منصوب، مفعول لہ واقع ہو رہا ہے یعنی زکوٰۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر زیادہ کا اندیشہ ہو تو مالک کو ہوگا اور کم کا خوف زکوٰۃ وصول کرنے والے کیلئے۔ دونوں فریقین کیلئے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ کی صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب آتی ہے اس طرح مجموعی طور پر تین بکریاں دینا پڑتی ہیں مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو انہوں نے بکریاں جمع کر لیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح ان کو صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں دو سو اور ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ دینا لازمی ہے مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کر لیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ ایسے مال کے مالکوں کو اس طرح حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی یہ صورت ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم نہ شریک ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا ہے، ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو بیس یا کم و بیش بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں از خود جمع کرتا ہے اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ تین بکریاں وصول کر لیتا ہے اور جدا اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملک میں ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کر لیتا ہے۔ بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ﴿خشبة الصدقة﴾ کا معنی یہ ہوا کہ کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا تعداد کی قلت کے نقطہ نظر سے دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿وما کان من خلیطین﴾ خلیطین کا معنی شریک ہیں اور اس میں ”من“ موصول کے بیان کیلئے ہے ”والخلطۃ“ اور شرکت یہ ہے کہ چرواہا، چراگاہ، نر اور پانی پلانا ایک طرح کا ہے۔ فانہما یتراجعان بینہما بالسویۃ سویۃ میں ”یا“ پر تشدید ہے معنی مساوات برابری کی سطح پر اور ”تراجع“ کا معنی یہ ہے کہ جب زکوٰۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعہ پر واجب زکوٰۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کر لیتا ہے حالانکہ اس کے ذمہ تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔ تو اب زکوٰۃ وصول کرنے والا دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کر دے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بالسویۃ یہی ہے۔ ہی برابری مراد ہے۔ ﴿لایخرج﴾ صیغہ مجہول نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿ہرمۃ﴾ فتح اور کسرہ۔ ”ہا“ پر فتح ”را“ کے نیچے کسرہ۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ ﴿ولا ذات عوار﴾ عوار کے عین پر فتح اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ عیب کے معنی میں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے عین پر فتح کی صورت میں اس کا معنی عیب ہوگا اور ضمہ کی صورت میں کانا ہوگا اور بہتری ہے کہ اسے فتح سے ہی پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ ﴿ولا تیس﴾ ”تا“ پر فتح ”یا“ ساکن۔ ساند بکرا جو بکریوں پر جفتی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ ﴿الان یشاء المصد﴾ مصدق کے صادر پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ پہلے کا اصل متصدق یعنی زکوٰۃ و صدقہ دینے والا۔ یعنی مال کا مالک۔ اس میں اشتناء فقط لفظ تیس کی طرف راجع ہے۔ یعنی ساند بکرا کا لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا صاد مخفف ہے۔ جس کا معنی صدقہ لینے والا، اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا اور اشتناء تینوں کی طرف راجع ہے یعنی بوڑھی گھونٹ۔ عیب والی اور ساند بکرے (بوک) کی طرف الایہ کہ زکوٰۃ لینے والا اس کے لینے میں مصلحت سے زیادہ موافقت محسوس کرے اور مساکین کیلئے زیادہ اچھا سمجھے۔ ﴿وفی الرقۃ﴾ اور چاندی میں زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہے۔ رقۃ کے ”را“ کے نیچے کسرہ۔ دراصل یہ ورق سے ہے۔ ورق ”واؤ“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ۔ چاندی کو کہتے ہیں ﴿ربع العشر﴾ ربع کے راء اور عشر کے عین پر ضمہ ہے اور ”با“ اور شین ساکن ہیں یا دونوں پر ضمہ ”ربع“ کسی چیز کا چوتھا حصہ اور ”عشر“ دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا اور دو سو درہم باون تولہ اور چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں یعنی سات سو پینتیس گرام اور درہم تین ماشے ایک رقی کا اور پانچ رقی بڑے رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿فان لم تکن﴾ اور اگر چاندی ﴿الاتسعین ومائۃ﴾ ایک سو نوے درہم ہو یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ سو پورا ہونے سے پہلے آخری گنتی نوے ہی ہے اور حساب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب احاد سے اکائی تجاوز کر جائیں تو دہائیوں سے گنتی کی جاتی ہے۔ جیسے دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ (فانہا تقبل منه الحقۃ) جذع کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ ﴿ویجعل﴾ مالک ساتھ شامل کرے گا۔ ﴿معہا شاتین﴾ دو بکریاں نقصان و کمی کی تلافی کرنے کیلئے کیونکہ حقہ جذع سے چھوٹا ہوتا ہے ﴿ان استیسیرتالہ﴾ بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں ﴿او عشرین درہما﴾ او یہاں بخیر کیلئے ہے یعنی اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہے تو یہ دے دے، چاہے وہ دے دے۔ ﴿ویعطیہ المصدق﴾ دال پر تشدید۔ زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے والا سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مال و مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب مذکور ہے نیز اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا طریق کار۔ زکوٰۃ میں وصول کئے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام

مذکور ہے۔ نہ تو مالک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی سرکاری اہل کار کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہر قسم کے مویشیوں پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چگنے والوں پر ہے۔

(۴۸۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَيَّحَا: اِنْ كُوْهُم دِيَا كِه وَه تَمِيں گَايُوں پَر اِيك سَالِه كُلُّ ثَلَاثِيْنَ بَقْرَةً تَبِيْعًا اَوْ تَبِيْعَةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ كُلُّ اَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ دِيْنَارًا، اَوْ عَذْلَه مَعَاْفِرِيًّا. رَوَاهُ الْحَسَنُ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَنُهُ التِّرْمِذِيُّ، وَأَشَارَ إِلَى اخْتِلَافٍ فِيْ وَصْلِهِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ تَرْمِذٍ فِيْ اِسْتِثْنَاءِ اِسْمِ اَبِيْ جَبَانَ وَالْحَاجِمِ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو یمن کی طرف (عامل مقرر کر کے) بھیجا۔ ان کو حکم دیا کہ وہ تیس گائیوں پر ایک سالہ مادہ گائے یا زرخیز و وصول کرے اور ہر چالیس کی تعداد پر ایک دو سالہ بچھڑا لیا جائے اور ہر نوجوان سے ایک دینار یا معافری کپڑا لیا جائے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ احمد کے ہیں اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور اس کے موصول ہونے کے بارے میں اختلاف کا اشارہ کیا ہے ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من كل ثلاثين بقرة﴾ یہ نصاب متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تیس سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زہری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کر کے کہا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور ”بقرة“ اسم جنس ہے اور ”تا“ اس میں ”وحدة“ کی علامت ہے، تانیث کی نہیں۔ یہ مذکور مونث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔ تبعا او تبعة تبعا اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور ”او“ اس میں تیخر کیلئے ہے یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے اور چاہے نہ وصول کرے۔ مسنة اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں یعنی جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ تحفة الاحوذی (ج ۲، ص ۴) میں ہے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر چالیس کی تعداد پر منہ یا مسن ہے ﴿ومن كل حالم﴾ ہر بالغ سے۔ خواہ احتلام سے دوچار ہوا ہو یا ہنوز نہ ہوا ہو پر ”دینارا“ ایک دینار بطور جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ﴿داو عدله﴾ عین پر فتح۔ دال ساکن ہے مراد ہے اتنی قیمت۔ اس کے برابر مساوی قیمت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح اور کسرو دونوں برابر ہیں۔ ﴿معافریا﴾ وہ چادریں جو یمن کی بنی ہوئی ہیں۔ ”معافر“ بروزن مساجد ہے یہ حمدان کا ایک قبیلہ ہے۔ انہی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گائے کے نصاب کی تفصیل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سے جزیہ وصول کرنے کا بھی حکم ہے۔ بلا اتفاق علماء نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اس کی حلت اور زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو گائے کا

ہے۔

(۴۸۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تُؤْخَذُ صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِينَ ارشاد گرامی ہے کہ ”مسلمانوں سے زکوٰۃ ان کے عَلٰی مِأْهِمِهِمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلَا يَنْبَغُ فَاوَدُ: پانی پلانے کی جگہوں پر وصول کی جائے گی۔“ (احمد) اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے صَدَقَاتُ ان کے گھروں ہی پر حاصل کئے جائیں گے۔

لعنوی تشریح: ﴿علی مِأْهِمِهِمْ﴾ مِأْہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کیلئے لے جاتے ہیں۔ ﴿الافی دورہم﴾ دور، دار کی جمع ہے۔ ان کی اپنی رہائش گاہیں، جائے رہائش، مکانات، پانی کے گھاٹ، ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ سرکاری زکوٰۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ کی وصولی کرے۔ ایسا نہیں کہ خود دور دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آکر زکوٰۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے لوگوں کے پاس ان کے گھروں، مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے۔ تاکہ کسی قسم کے دھوکے میں مبتلا نہ کیا جاسکے اور وہ اپنی حاکمیت کی دھونس بھی نہ جما سکے۔ بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جا کر زکوٰۃ وصول کرے۔ جابر بن عتیق کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری نمائندے آئیں گے جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو خوش آمدید کہو اور جس چیز کا وہ مطالبہ کریں، وہ ان کے سپرد کر دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو انہیں ثواب ملے گا اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انہی پر پڑے گا۔“ اگر یہ زکوٰۃ مقدار وجوب سے زیادہ طلب کریں تو صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں زیادہ ہرگز نہ دی جائے۔

(۴۸۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ”غلام میں زکوٰۃ نہیں مگر صدقہ فطر سے۔“

القطر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔ یعنی جو غلام اپنی خدمت کیلئے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لئے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اگر برائے تجارت

(۴۸۸) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «فِي كُلِّ سَائِمَةٍ إِبِلٌ فِي أَزْبَعَيْنِ بَنْتٍ لَبُونٍ، لَا تَقْرُقُ إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا، مَنْ أَغْطَاهَا، مُؤْتَجِرًا بِهَا، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَمَنْ مَنَعَهَا، فَلَنَا آخِذُوهَا وَشَطَرَ مَالِهِ، عَزَمَةٌ مِنْ عَزَمَاتِ رَبَّنَا، لَا يَحِلُّ لِأَلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَعَلَّقَ الشَّافِعِيُّ الْقَوْلَ بِهِ عَلَى ثُبُوتِهِ.

صحیح قرار دیا ہے اور شافعی نے اس کے ثابت ہونے پر اپنے قول کو معلق رکھا ہے۔)

نفعی تشریح: ﴿مائمتہ اہل﴾ مائمتہ، اہل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿فی اربعین بنت لبون﴾ یعنی فی الجملہ چالیس میں ”بنت لبون“ دو سالہ اونٹنی ہے۔ حضرت انس کی روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے ۳۶ سے زیادہ ۴۵ تک میں ایک بنت لبون کا ذکر ہے اور اس حدیث میں چالیس کی تعداد اس وقت مراد ہے جب ایک سو بیس سے اونٹ زیادہ ہوں تو پھر چالیس پر بنت لبون ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل موجود ہے یا یہ کہ ۴۰ کی تعداد بھی ۳۶ سے ۴۵ کے مابین ہے۔ ان دونوں کے مابین جتنے اونٹ ہوں ۴۰ ہوں یا اس سے کم و بیش ان پر زکوٰۃ ہے، یہ مفہوم ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں منطوق راوی ہے اس لئے اعتبار اسی روایت کا ہے۔ ﴿لا یفرق﴾ تفریق سے ماخوذ ہے۔ مٹی للمفصول ہے یعنی الگ الگ اور جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ ”اہل عن حسابہا“ اس کا معنی ہے کہ مالک اپنی ملکیت کی چیزوں کو دوسرے کی ملکیت سے الگ نہ کرے جبکہ دونوں کے مویشی اکٹھے ہوں۔ جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی ہوں گے کہ تمام اونٹوں کو فی چالیس کے حساب سے شمار کیا جائے، اس صورت میں نہ مرہل و کمزور کو چھوڑا جائے گا نہ کسی فربہ کو، نہ چھوٹے کو اور نہ بڑے کو ﴿موتجرابہا﴾ اجر و ثواب کے حصول کے ارادے سے ان کو زکوٰۃ میں دینا ﴿ومن منعہا﴾ جس نے

نہ دیا ﴿لانا اخذوها﴾ تو ہم اسے بزور و زبردستی وصول کریں گے۔ ﴿وشطر ماله﴾ کچھ مال یا آدھا مال۔ نہ زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر ﴿اخذوها﴾ میں جو ضمیر مجبور ہے، اس پر اس کا عطف ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کر دے اور بہترین و افضل حصہ خود وصول کر لے۔ ﴿عزمۃ﴾ رفی حالت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں مصدر۔ مطلب ہے کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے ﴿من عزمات دننا﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ﴿لایحل لال محمد﴾ الخ آل محمد کیلئے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم، بنو عبد المطلب بن عبد مناف مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد بالخصوص آل علی، آل عباس اور آل عقیل اور آل حارث بن عبد المطلب ہیں۔ ﴿اوعلق الشافعی﴾ علق تعلیق سے ماخوذ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قول اس کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس کا دارودار بھڑ بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے والے سے مقدار زکوٰۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام: زکوٰۃ کے ایک مسئلے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ بنو ہاشم، بنو عبد المطلب زکوٰۃ نہیں لے سکتے۔ بنو ہاشم میں اولاد علی، اولاد عباس، اولاد عقیل اور اولاد حارث بن عبد المطلب شامل ہیں۔ یہ بھی زکوٰۃ کا استحقاق نہیں رکھتے۔ امام یوسف کے بقول سید، سید کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بہز بن حکیم﴾ ابو عبد الملک ان کی کنیت ہے۔ بھڑ کی ”با“ پر فتح اور ہا ساکن۔ بھڑ بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ۔ حیدہ کی ”حا“ پر فتح ”یا“ ساکن اور ”وال“ پر فتح، تغیر ہے۔ بھڑی ہے۔ طبقہ سادہ کے تابعی ہیں۔ اس حدیث سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کا خیال ہے کہ اس کی احادیث صحیح ہیں۔ ابن معین، ابن مدینی اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابوحاتم نے کہا ہے، اس سے احتجاج نہیں کیا جاتا اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتے ہیں۔ ۱۴۰ھ کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۶۰ھ کے بعد۔

﴿عن ابیہ﴾ یعنی حکیم بن معاویہ، یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ ﴿عن جدہ﴾ معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر، بن کعب قشیری صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔

(۴۸۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مَائَتَا دِرْهَمٍ، بِرُحْمَةٍ أَوْ بِرُحْمَتَيْنِ، فَزَكَّاهَا، فَإِنَّكَ تَكُونُ فِيهَا بِمِثْلِهَا، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا خُمْسُهُ»۔ جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا خُمْسُهُ ہے۔ جب تک تیرے پاس بیس دینار نہ ہوں اور ان

دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عَشْرُونَ دِينَارًا، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَحِسَابُ ذَلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهُوَ حَسَنٌ، وَقَدْ اخْتَلَفُوا فِي زَنْعِهِ.

پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اس وقت تک تجھ پر کوئی چیز نہیں جب بیس دینار ہوں تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہوگا تو اسی حساب سے زکوٰۃ ہوگی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے) اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو مالی سال کے

وَلِلتَّزْمِيزِ عَنِ ابْنِ عُمرَ: مَنْ اسْتَفَادَ مَالًا، فَلَا زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. وَالرَّاجِعُ وَقْفُهُ.

دوران حاصل ہو اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں اور رائج بھی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿حال علیہا الحول﴾ یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ ﴿عشرون دینارا﴾ بیس دینار موجود وزن کے مطابق ساڑھے سات تولہ یعنی ۱۰۵ گرام بنتا ہے۔ ﴿فما زاد فبحساب ذلك﴾ اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہوگا خواہ وہ قلیل ہے یا کثیر، اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ﴿من استفاد مالا﴾ جو حاصل ہوا ہو۔ ﴿والراجع وقفه﴾ رائج بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتماع کیلئے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث میں سونے اور چاندی کی مقدار زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سواتین ماشہ ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے بلون تولہ نصاب زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے اور سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے بیس مثقال کے یا نوے ماشہ کے جو ساڑھے سات تولہ بنتا ہے اور ایک حسب اس طرح بھی لگایا گیا ہے کہ درہم سواتین ماشہ کا ہوتا ہے، اس لحاظ سے محتاط اندازے کے مطابق پچاس تولے مقرر کیا گیا ہے اور زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال بیس قیراط کا وزن تین ماشہ ایک رتی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے تو بیس مثقال سونے کے ساڑھے باٹھ ماشہ بنتے ہیں (یعنی پانچ تولہ اڑھائی ماشہ) اور اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ کلندی نوٹ جو روپیہ کا بدل ہے اس میں بھی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دو طریق سے منقول ہے۔ ایک عاصم بن ضمرہ عن علی اور دوسرا حارث الامور عن علی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں طریق صحیح ہیں۔

(۴۹۰) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ بَيْلُونَ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (اسے ابوداؤد اور دارقطنی الْعَوَامِلُ صَدَقَةً. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ نے روایت کیا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔) وَالذَّارِقُطْنِيُّ، وَالرَّاجِعُ وَفَقَهُ أَيْضًا.

لغوی تشریح: ﴿البقر العوامل﴾ عوامل عاملہ کی جمع ہے۔ عامل وہ جانور جو کھیتی باڑی کیلئے جوتے ہیں، گاہے کا کام لیتے ہیں، کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے کام لیا جائے یعنی آلات و ذرائع کے طور پر استعمال ہوں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(۴۹۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَّجِرْ لَهُ، بَنِي أَسَے چاہئے کہ مال یتیم کو تجارت میں لگائے۔ وَلَا يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ ہی التِّرْمِذِيُّ وَالذَّارِقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ اسے کھا جائے۔“ (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت مَرْسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، البتہ امام شافعی کے پاس

ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من ولی﴾ علم، بعلم کے باب سے معروف کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ جو شخص متولی ہے اور لام پر تشدید کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ ﴿فلیتجر﴾ باب افستعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ ”ولا یترکہ“ نہی کا صیغہ ہے یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ ﴿حتی تاکلہ الصدقہ﴾ کہ زکوٰۃ اسے کھا جائے۔ یعنی سال بہ سال اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

(۴۹۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: رَسُولُ اللَّهِ ﷺ کی خدمت میں جب لوگ زکوٰۃ لے

حاصل کلام: نسائی میں ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کیلئے ان الفاظ میں دعا دی۔ اللھم بارک فیہ وفی اھلہ۔ الہی! اس شخص اور اس کے اھل میں برکت نازل فرما۔“ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کیلئے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔

نفوی تشریح: ﴿ قبل ان تحل ﴾ مقررہ وقت آنے سے پہلے، بحل، حلول سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب بضرب ہے۔ یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ سال گزرنے اور وقت مقررہ سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

حاصل کلام: زکوٰۃ فرض تو سال گزرنے کے بعد ہوتی ہے مگر نبی ﷺ نے پیشگی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج ایسی عبادات اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے یہ بھی اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتی۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے حالانکہ یہ استدلال و قیاس کچھ زیادہ وزنی نہیں اس لئے کہ زکوٰۃ کا دیگر عادات کی طرح ٹائم فیمل متعین نہیں۔ اسے اگر قدرے تاخیر سے دیا جاسکتا ہے تو پیشگی بھی ادا ہو سکتی جس کی دلیل یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جمہور اہل عالم کی بھی یہی رائے ہے۔

(۴۹۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، قَالَ: «لَيْسَ فِيْمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الْوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيْمَا دُونَ خَمْسِ دَوْدٍ مِنَ الْإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيْمَا دُونَ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح اونٹوں کی تعداد پانچ سے کم ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم کھجوروں پر بھی زکوٰۃ نہیں۔“ (مسلم)

اور مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

خَمْسَةَ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةً. پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلہ میں زکوٰۃ نہیں۔
رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ؛ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و
لَيْسَ فِيهَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِنْ مُسْلِمٍ فِيهِ
تَمْرٌ وَلَا حَبٌّ صَدَقَةً. وَأَصْلُ حَدِيثِ
أَبِي سَعِيدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿اواق﴾ اس پر تین ہے اور قاف کے بعد ”یاء“ مشدودہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے۔ اوقیہ کی جمع ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ اور ”یا“ پر تشدید۔ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانہ کی اصطلاح کے مطابق یہ سات سو پینتیس گرام بنتا ہے۔ ﴿الورد﴾ ”واؤ“ پر فتح اور ”را“ پر کسرہ اور ”را“ ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی ”ذود“ ذال پر فتح اور ”واؤ“ ساکن۔ اونٹ کے معنی میں۔ یہ اسم جمع ہے اس میں مذکر و مؤنث سبھی شامل ہیں۔ اسی لئے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ ﴿اوسق﴾ ہمزہ پر فتح ”واؤ“ ساکن اور سین پر ضمہ، وسق کی جمع۔ وسق کی ”واؤ“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور ایک صاع میں چار مد آتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے۔ پس صاع جدید پیمانہ کی زبان میں اڑھائی کلو گرام کے قریب ہوتا ہے ﴿اوساق﴾ وسق کی جمع ہے، اوسق کی طرح ہے۔ ﴿حب﴾ ”حا“ پر فتح اور ”با“ پر تشدید۔ بیج، تخم مثلاً گندم کا بیج، جو، مسور وغیرہ اور لفظ ﴿دون﴾ چاروں جگہ ﴿اقل﴾ کے معنی میں ہے یعنی کم از کم مراد یہ ہے کہ مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تفاوت و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہو گئے کوئی تفاوت نہ رہا۔ تین سو صاع مجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلہ سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ ہے مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسالت مآب ﷺ نے جب خود وزن مقرر فرمایا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ اپنی جانب سے کم و بیش کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر اس جنس میں جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً گندم، چاول، جو، باجرہ، مکئی، ماش، مونگ، پنے وغیرہ۔

(۴۹۵) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت

عَنْ أَبِيهِ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا، أَلْعُسْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُسْرِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلَا يُبْنَى دَاوُدُ: أَوْ كَانَ بَعْلًا أَلْعُسْرُ، وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوْ النَّضْحِ نِصْفُ الْعُسْرِ.

کرتے ہیں، انہوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”جو زمین آسمانی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا رطوبت والی ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے (عشر ہے) اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو۔ اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔“ (بخاری) ابوداؤد کی روایت میں ”بعلا العشر“ کا لفظ ہے ”العشر“ کی جگہ اور اگر جانوروں کے ذریعہ یا ڈول سے پانی نکال کر سیراب کی جاتی ہو اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ﴾ اس سے مراد بارش، اُلے، برف، شبنم وغیرہ ہے اور یہ خبر مقدم ہے۔ ﴿وَالْعُيُونُ﴾ عین کی جمع ہے۔ چشمے کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتا ہے اور بلا کسی مشقت و محنت کے اس کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا﴾ ”عین“ اور ”ثا“ دونوں پر فتح ہے اور ”را“ کے نیچے کسرہ اور ”یا“ پر تشدید۔ زمین میں جو رطوبت ہوتی ہے، اس میں سے خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے کیونکہ پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زمین بغیر سیراب کئے اور پانی چھوڑے پانی حاصل کر لیتی ہے ”العشر“ متداء مؤخر ہے۔ عین پر ضمہ ہے اور شین ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لئے جائیں تو اس کا ایک جزء عشر کہلائے گا۔ ﴿وَفِيمَا سُقِيَ﴾ صیغہ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے ﴿بِالنَّضْحِ﴾ نضح کے نون پر فتح اور ”ضاد“ ساکن ہے۔ اصل میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا بلکہ خوب پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعہ پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح نیل اور گدھے جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ ﴿بَعْلًا﴾ یعنی ﴿عَثَرِيًّا﴾ کے بدلے بعلا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بعلا کی ”با“ پر فتح اور عین ساکن۔ وہ زمین جو سیراب کئے بغیر زمین کی نمی و رطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو۔ اس کا معنی بھی قریب قریب وہی ہے جو عثری (نمی والی زمین) کا ہے یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ ﴿بِالسَّوَانِي أَوْ النَّضْحِ﴾ سوانی سانیه کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ سانیه اور نضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر عموماً علماء نے انہیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیه جانوروں کے ذریعہ پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور ”نضح“ عام ہے اس میں سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع و وسائل سے سیراب کرنے کی صورت میں زکوٰۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ مثلاً جو زمین مشقت طلب ذریعہ سے سیراب ہو جیسے اونٹ، نیل

(۴۹۶) وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ
وَمُعَاذٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ
النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: لَا تَأْخُذَا فِي
الصَّدَقَةِ إِلَّا مِنْ هَذِهِ الْأَصْنَافِ
الْأَرْبَعَةِ: الشَّعِيرِ، وَالْحِنْطَةِ،
وَالزَّبِيبِ، وَالتَّمْرِ. رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ
وَالْحَاجِمُ.

وَلِلدَّارِ قُطْنِيٍّ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ: قَأْمَا
الْقِثَاءِ وَالْبَطِيخِ وَالرَّمَانِ وَالْقَصَبِ،
فَقَدْ عَفَا عَنْهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. وَإِسْنَادُهُ
ضَعِيفٌ.

لغوی تشریح: ﴿الزبیب﴾ خشک انگور (کشمش) ﴿القشاء﴾ ”قاف“ کے نیچے کسرہ اور ”ثا“ پر تشدید۔ کھیرا ﴿الطبیخ﴾ ”با“ کے نیچے کسرہ ”طاء“ پر تشدید۔ تربوز ﴿الرمان﴾ ”را“ پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ انار۔ ﴿القصب﴾ قاف اور صاد دونوں پر فتح۔ گنا۔ یہ حدیث زکوٰۃ کی فرضیت کو غلہ اور پھلوں میں انہی چار اصناف پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو اور جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ حصر اضافی ہے اس مناسبت سے کہ جو اجناس اس دور میں یمن میں دستیاب تھیں اور ان سبزیوں کی مناسبت سے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ پس چاول اور مکئی وغیرہ غلہ قسم کی اجناس جنہیں شہروں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں، میں زکوٰۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

حاصل کلام: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو دار قطنی کے حوالہ سے ہے اس میں ضعف اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ضعیف ہے اور سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التخیص میں وضاحت بیان کی ہے۔

(۴۹۷) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَنْمَةَ حَضْرَتِ سَلِّ بْنِ ابِي حَنْمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ سَعِ مَرُوۤیۡ هَی کَہ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوا، وَدَعُوا الثَّلَثَ فَإِنْ لَمْ تَدْعُوا الثَّلَثَ، فَدَعُوا الرَّبِيعَ». رَوَاهُ الْحَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ”جب تم غلہ کا تخمینہ اور اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ دیا کرو اگر تہائی نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھائی چھوڑ دیا کرو۔“ (ابن ماجہ کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا خرصتم﴾ یہ خطاب زکوٰۃ وصول کرنے والے عمال کو ہے اور ان کیلئے جو وصولی زکوٰۃ کیلئے دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتے ہیں اور ”خرص“ اندازہ لگانے، تخمینہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں خرص سے مراد انگور اور ترکھور کا درختوں پر اندازہ ہے۔ ان دونوں کا اندازہ کس طرح لگایا جائے۔ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اندازہ لگانے والا مرد درخت کے گرد چکر لگائے۔ جب انگور اور کھجور میں مٹھاس پیدا ہو جائے تو سارے پھل پر سرسری طور پر نظر دوڑائے پھر اندازہ لگائے کہ جب یہ انگور خشک ہو کر کشش کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت ان کی مقدار اور وزن اتنا رہ جائے گا اور یہ کھجور جب خشک ہوگی تو اتنی مقدار میں باقی رہ جائے گی۔ اس تخمینہ اور اندازہ لگانے کیلئے ایک ہی آدمی کافی ہے بشرطیکہ وہ منصف مزاج اور عادل ہو ﴿فخذوا﴾ پس تخمینہ کے مطابق تم زکوٰۃ وصول کر لو۔ ”خذوا“ امر کا صیغہ ہے اور اخذ سے ماخوذ ہے۔ ﴿ودعوا الثلث الخ﴾ مال کے مالکوں کیلئے تخمینہ لگائی گئی مقدار میں سے ۱/۳ حصہ چھوڑ دو ایک قول یہ ہے کہ یہ ۳/۱ یا ۴/۱ حصہ جو مال کے مالکوں کیلئے چھوڑا جاتا ہے وہ اس لئے چھوڑا جاتا ہے کہ مالک خود اپنے اعزاء و اقرباء اور اپنے ہمسایوں کو اور اندازہ لگانے کے وقت پاس سے گزرنے والوں پر صدقہ و خیرات کر سکے اور مالک سے اس کا تقاضا و مطالبہ اسے کسی تنگی اور حرج میں مبتلا کئے بغیر کچھ محتاجوں اور مساکین کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۳/۱ یا ۴/۱ عشر نکالنے سے پہلے ہی اصل مال سے الگ رکھا جائے گا فراخ دلی کے خیال سے کہ پھلوں کا مالک خود اور اپنے اہل و عیال کو کھلا سکے اور ان کی فروخت اس وقت ہوگی جبکہ کھجور رنگ پکڑ کر سرنخی مائل ہو جائے۔ اہل و عیال، ہمسائے اور مہمانوں کو فوقیت اور ترجیح دینے کیلئے۔ یہ مقدار جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، ان سبزیوں کے قائم مقام ہے جن پر زکوٰۃ نہیں۔ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کی خوبیوں اور محاسن میں سے ہے۔ صاحب سبل السلام نے بتایا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ جب پھل پک جائے تو مال کے مالک کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ خود اور اس کے اہل و عیال وہ پھل کھائیں اور لوگوں کو اس قدر کھلائیں کہ وہ ذخیرہ کر کے نہ رکھے جاسکیں۔ عرف عام میں خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کو ان سبزیوں کی جگہ تصور کیا جاتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی نہیں جاسکتیں۔

راوی حدیث: ﴿سہل بن ابی حشمہ رضی اللہ عنہ﴾ سہل کے سین پر فتح اور ”حاء“ ساکن ہے۔ ان کا نام عبداللہ یا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاری خزرجی مدنی ہے۔ صغار صحابہؓ میں شمار ہوتا ہے۔ ۳۷ھ میں پیدا

(۴۹۸) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أَاسِنِدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُحْرَصَ الْعِنَبُ، كَمَا يُحْرَصُ النَّحْلُ، وَتُؤْخَذَ زَكَاتُهُ رَيْبًا. رَوَاهُ الْحَمَّسِيُّ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ”ہم انگوروں کا اندازہ بھی اس طرح لگائیں جس طرح کھجوروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش وصول کی جائے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں

انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں انقطاع ہے اس لئے کہ اسے سعید بن مسیب، عتاب بن اسید سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب کا عتاب سے سماع ہی ثابت نہیں۔ مگر امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ﴾ عتاب میں عین پر فتح اور ”تا“ پر تشدید۔ بن اسید۔ اسید کے ممرہ پر فتح اور سین کے نیچے کسرہ۔ بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی کی۔ مشہور صحابی ہیں۔ جب نبی ﷺ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو ان کو مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(۴۹۹) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امْرَأَةً أَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَهَا ابْنَتُهُ لَهَا، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: «أَتُعْطِينَ زَكَاةَ هَذَا؟» قَالَتْ: لَا، قَالَ: «أَيْسُرُكَ أَنْ يُسَوِّرَكَ اللَّهُ بِهِمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَوَارِينَ مِنْ نَارٍ؟» فَالْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ.

نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان امراء﴾ اس خاتون کا نام اسماء بنت یزید بن سکن ہے۔ ﴿مسکین﴾ کے معنی مسکین اور کاف تینوں پر فتح ہے اور یہ مسکین کا تشبیہ ہے یعنی کنگن جو ہاتھوں میں پہنا جاتا ہے۔ فارسی میں کہا جاتا ہے دست برنجن اور کنگن بھی کہا جاتا ہے۔ مسکین پازیب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پازیب وہ زیور ہے جو پاؤں میں اس طرح پہنا جاتا ہے جس طرح کنگن ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ ”ایسرک“ اس میں ممرہ استفامیہ ہے اور فعل مضارع ہے، سرور سے ماخوذ ہے اور کاف مؤنث کے خطاب کیلئے ہے۔ معنی ہے کیا تجھے یہ پسند ہے، خوش لگتا ہے، باعث سرور و مسرت ہے۔ ﴿ان یسورک﴾ تسویر سے ماخوذ ہے، کنگن پہننے کو کہتے ہیں۔ ﴿بہما﴾ ان دونوں کی جگہ ان دونوں کے بدلہ میں یا یہ معنی ہے کہ ان دونوں کے سبب تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں۔ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت میں۔ ﴿فالقہما﴾ اس نے وہ دونوں کنگن پھینک مارے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ لیکن اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکوٰۃ اسے عاریتاً دینا ہے، الگ زکوٰۃ نہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زیورات میں صرف ایک ہی بار زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ رائج قول یہی ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ فرض ہے اور یہ صحیح حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض آثار کی بنا پر جو کہا گیا ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں وہ قائل التفات نہیں۔ (سبل)

(۵۰۰) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ تَلْبَسُ سَوْنَةَ كَازِيْرٍ يَمْنُ رَكَهَا تَهَا۔ انہوں نے دریافت کیا اَوْضَاحًا مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ (ﷺ)! كَيْفَ وَهَ كَنْزٌ هُ؟ فرمایا ”جب تو رَسُولَ اللَّهِ! أَكَنْزٌ هُو؟ فَقَالَ: «إِذَا نَے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی تو پھر یہ کنز نہیں۔“ (اے أَذْبَتِ زَكَاتُهُ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ“۔ رَوَاهُ أَبُو ابوداؤد اور دارقطنی دونوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے داؤد وَالْذَّارِقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اوضاحا﴾ ”ضاد“ اور ”حا“ کے ساتھ ”وضح“ کی جمع ہے ”وضح“ کے معنی ہیں پازیب یعنی پاؤں کا زیور ﴿اکنزو﴾ اس میں ممرہ استفامیہ ہے۔ یعنی دریافت کیا کہ آیا یہ کنز کی تعریف میں آتا ہے جس کے بارے میں قرآن حید میں سخت وعید وارد ہے۔ والذین یکنزون الذہب والفضة ولا ینفقونها فی سبیل اللہ فبشرهم بعذاب الیم یوم یحمی علیہا فی نار جہنم فتکوی بہا جیاهم وجنوبہم وظہورہم، هذا ما کنزتم لانفسکم، فذوقوا ما کنتم تکنزون ۹)

۳۴-۳۵) ”یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے.....“ ﴿اِذَا ادْبِيتْ زَكَاتُهُ﴾ اس سے زیور میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ جب مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا زیور ہو گا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اوصاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا واضح کی جمع ہے، وضع کہتے ہیں روشن اور چمک دکھ کر۔ دراصل تو یہ زیور چاندی سے تیار ہوتا تھا۔ اس ظاہری چمک دکھ اور سفیدی کی وجہ سے اسے اوصاح کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ زیور سونے کا بھی تیار کیا جانے لگا۔ اس حدیث سے بھی سونے چاندی سے ساختہ زیورات پر زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ چاندی کے زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے دیکھے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ”اے عائشہ! تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا ”اچھا تو پھر جہنم کی آگ میں سے تمہارے لئے یہی کافی ہیں۔“ حاکم نے اس کی سند کو شیخین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔

(۵۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حضرت سمروہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ نِكَالَ كَالْحَمِّ دِيَا كَرْتِ تَحْتِ۔ (اے ابو داؤد نے کمزور سند الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نَعُدُّهُ لِلْبَيْعِ۔ رواہ کے ساتھ روایت کیا ہے)

ابو داؤد، وإسناده لَيِّنٌ.

لفوی تشریح: ﴿نَعْدَهُ﴾ ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کیلئے حاضر کرتے تھے۔ ﴿نَعْدَهُ﴾ میں نون پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ اعداد سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ ﴿واسنادہ لیسن﴾ ابو داؤد نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ پھر منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (عون المعبود، ج ۲ ص ۳)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مجاہد نے اس کی فرضیت پر قرآن مجید کی آیت ﴿انفقوا من طيبات ما كسبتم﴾ سے استدلال کیا ہے اور ابن منذر نے اس کی فرضیت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ فقہاء سب سے بھی اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ ظاہریہ اس کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن سمروہ مجہول ہے۔ لیکن متقدمین کا اتفاق اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مؤید ہیں۔

(۵۰۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «فِي الرِّكَازِ الْخُمْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. - (بخاری و مسلم)

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «فِي الرِّكَازِ الْخُمْسُ»۔

لغوی تشریح: ﴿فِي الرِّكَازِ﴾ اس میں ”واو“ پہلے جملہ پر عطف کیلئے ہے اور وہ جملہ ہے ﴿العجماء جبار‘ والبشر جبار‘ والمعدن جبار﴾ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اتنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ ﴿الرِّكَازِ﴾ ”را“ کے نیچے کہو۔ جاہلیت کے زمانہ کا زمین میں مدفون خزانہ جو بغیر کسی کثیر عمل و مشقت کے حاصل ہوا ہو۔ ﴿الْخُمْسُ﴾ خا اور میم دونوں پر ضم۔ کسی چیز کے پانچ برابر حصے کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصہ پانچواں حصہ کہلاتا ہے اور یہ مبتداء مؤخر ہے اور خبر اس کی پہلا جملہ ﴿فِي الرِّكَازِ﴾ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رکاز کے مال میں زکوٰۃ نہیں بلکہ خمس ہے۔ اس کی حیثیت اموال غنیمت کی سی ہے۔ اس میں خمس واجب ہے جو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور باقی تمام کا مالک وہ شخص ہوگا جسے یہ خزانہ ملا۔

(۵۰۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ فِي كَنْزٍ وَجَدَهُ رَجُلٌ فِي خَرِبَةٍ: «إِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ فَرَفَعَهُ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ فَفِيهِ الرِّكَازُ الْخُمْسُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهٍ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عمرو بن شعیبؓ، اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خزانے کے بارے میں جو کسی آدمی کو خرابی میں ملا ہو (ملا ہو) فرمایا ”اگر تو نے یہ خزانہ کسی آباد جگہ سے پایا ہے تو اس کی تحقیق کیلئے اعلان کرو اور اگر تو نے کسی غیر آباد جگہ سے پایا ہے تو اس میں اور معدنیات میں (پانچواں حصہ) ہے۔“

(اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فِي خَرِبَةٍ﴾ ”خا“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کہو۔ شکستہ، بے آباد مقام جہاں کوئی رہتا نہ ہو۔ ﴿فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ﴾ جہاں لوگ آباد ہوں۔ یعنی یہ ویران اور بے آباد جگہ آبادی میں ہو ﴿فَعَرَفَهُ﴾ تعریف سے امر کا صیغہ ہے تو لوگوں میں اس کا اس وقت تک اعلان کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو کہ یا تو اس کا مالک آجائے اور یا پھر سال بھر اس پر گزر جائے تو ایسی صورت میں تمہارے لئے اس کا کھانا صحیح اور درست ہے تو گویا اس خزانے کی نوعیت گری پڑی چیز کی سی ہوگی۔ ﴿وَإِنْ وَجَدْتَهُ﴾ اور اگر تو اسے غیر آباد جگہ میں پائے تو اس کا حکم، رکاز کا حکم ہوگا اور دونوں کے حکم کی نوعیت اموال غنیمت کے حکم کی ہوگی۔ ﴿فِي الرِّكَازِ﴾ واو عطف اس بات کا متقاضی ہے کہ جب خزانہ زمین کے پیٹ سے نہ نکالا جائے تو اسے رکاز نہیں کہتے ہیں۔

(۵۰۴) وَعَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ، عَنْ بِلَالِ بْنِ حَارِثٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَعْدٍ رَوَيْتَ عَنْهُ

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے قبلِ جگہ میں واقع کانوں سے
 ﷺ أَخَذَ مِنَ الْمَعَادِنِ الْقَبِيلِيَّةِ زَكَاةَ وَصُولِ كِي۔ (ابوداؤد)
 الصَّدَقَةَ۔ رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ۔

لغوی تشریح: ﴿معادن﴾ ”معدن“ کی جمع ہے۔ ”معدن“ میں وال کے نیچے کسرہ ہے۔ کان، زیرِ زمین
 اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سونا، چاندی اور جواہرات وغیرہ اللہ تعالیٰ نے بکثرت پیدا فرمائے ہوں۔ ﴿
 القبلیۃ﴾ ”قاف“ پر فتح اور ”با“ پر بھی ”قبل“ کی طرف نسبت ہے۔ ”فرع“ کے نواح میں ایک جگہ
 کا نام ہے اور ”فرع“ میں ”قا“ پر ضمہ ہے اور ”را“ ساکن ہے اور ایک قراءت کے مطابق دونوں پر ضمہ
 بھی ہے۔ مدینہ کے بلالی حصہ میں ساحل سمندر پر واقع زمین جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ سے آٹھ برد
 (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلہ پر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس
 میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان میں
 خمس نہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دینہ) دونوں ایک نہیں ہیں۔ لغوی اعتبار سے، حکماً نہ شرعاً۔

راوی حدیث: ﴿بلال بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ بلال بن حارث مزنیہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے مزنی
 کہلائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ھ میں نمائندہ کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ میں سکونت
 اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہو گئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انہوں نے مزنیہ قبیلہ کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی
 عمر میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

صدقہ فطر کا بیان

۱۔ بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ

(۵۵۵) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ، عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكْرِ وَالْأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ، مِنَ الْمُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ۔
 مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

ولابنِ عَدِيٍّ وَالذَّارِقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: أَغْنَوْهُمْ عَنْ الطَّوَافِ فِي هَذَا الْيَوْمِ۔
 ابنِ عَدِيٍّ اور دارقطنی میں ضعیف سند سے ہے کہ
 اس روز غریاء کو در بدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔

لغوی تشریح: ﴿باب صدقة الفطر﴾ رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ قسطلانی کے بقول فطرانہ کی فرضیت رمضان المبارک کے آغاز سے صرف دو روز پہلے ۲ھ میں ہوئی۔ ﴿فرض﴾ بمعنی واجب اور لازم۔ یعنی اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقہ فطر (فطرانہ) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض قدر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ ﴿من المسلمین﴾ کافروں میں سے نہ ہو۔ اس لئے کافر غلام کا صدقہ فطر نہیں نکالا جاتا۔ ﴿اغنہم﴾ اغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر منصوب فقراء کی طرف راجع ہے یعنی ”ہم“ ضمیر سے مراد محتاج و ضرورت مند لوگ ہیں۔ ﴿عن الطواف﴾ دست سوال دراز کرنے کیلئے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں سے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ دن کے پہلے حصہ میں ادا کر دیا جائے تاکہ ضرورت مند لوگ اپنی ضروریات کا سامان خرید سکیں اور بے فکر ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے سب افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرہ کے ضرورت مند حضرات اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ اس فطرانہ کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں۔ البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمہ ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ فطر کیلئے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحق بن راہویہ رحمہ اللہ نے تو فطرانہ کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(۵۰۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعًا مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ زَبِيبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعًا مِنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيدٍ: أَمَّا أَنَا فَلَا أَزَالُ أَخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أَخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ. وَلَا بَيْنِي دَاوُدَ: «لَا أَخْرِجُ أَبَدًا إِلَّا صَاعًا».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانہ میں گندم سے ایک صاع اور کھجور سے ایک صاع اور جو سے ایک صاع اور کشمش (منقہ) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نکالا کرتا تھا اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس امر میں بالکل واضح ہے کہ فطرانہ ایک صلہ ہی مسنون ہے۔ خواہ کوئی جنس ہو۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا یہی موقف تھا۔ انہوں نے ایک صلہ ہی دینے کا اظہار اسی لئے فرمایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آدھا صلہ گندم کو پورے صلہ جو کے برابر کر دیا اس لئے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ ہم تو اتنا ہی فطرانہ ہر جنس سے ادا کرتے رہیں گے جتنا آپ کے دور میں کرتے رہے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد سے کام لیا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب ﷺ کے ارشاد اور اس پر عمل صحابہؓ کو دلیل بنایا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی رائے وزنی ہے، اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے صلہ کا اعتبار کیا ہے جنس کی گرانی اور ارزانی کا نہیں جبکہ دوسرے حضرات نے صلہ کا نہیں بلکہ قیمت اشیاء کا اعتبار کیا ہے۔

(۵۰۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طَهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ، فَمَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ فِيهَا زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلَاةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ .

رَوَاهُ أَبُو ذَاوَدَ وَابْنُ مَاجَهٗ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿طہرۃ﴾ ”طا“ پر ضم۔ منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے۔ معنی روزہ دار کے نفس کی طہارت کیلئے۔ ﴿من اللغو﴾ لغو کا تعلق زبان و قول سے ہے، دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ﴿والرفث﴾ فحش کلامی۔ ﴿طعمۃ﴾ ”طا“ پر ضم۔ مراد کھانا اور اس کا عطف طہرۃ کے لفظ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ فطر بھی انہی کا مخصوص استحقاق ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقہ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے۔ من اداھا قبل الصلاۃ قبل صلاۃ سے مراد ہے نماز عید سے پہلے ﴿صدقۃ من الصدقات﴾ یعنی پھر یہ عام صدقہ ہوگا۔ صدقہ فطر نہیں ہوگا، اور آدمی فریضہ کا تارک ہی رہے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہئے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہوگا، فطرانہ عید نہیں ہوگا۔

۲ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ نفلی صدقے کا بیان

(۵۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمْ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ» - فَذَكَرَ الْحَدِيثَ - وَفِيهِ: «وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ بِيَمِينِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایسے روز میں سایہ عطا کرے کہ گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔“ پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ ”ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے جو ایسے طریقہ سے مخفی طور پر صدقہ دے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہونے پائے کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿سبعۃ﴾ سات اقسام و انواع کے لوگ۔ ﴿یظللہم﴾ باب افعال سے ماخوذ ہے۔ یعنی ان کو سایہ میں جگہ دے گا۔ ﴿فی ظلہ﴾ اپنے سائے میں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی حمایت و حفاظت میں لے لے گا۔ ﴿یوم لا ظل﴾ جس روز کوئی سایہ نہ ہوگا اس سے مراد قیامت کا دن ہے ﴿فذکر الحدیث﴾ پھر حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان ساتوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں۔ (۱) امام عادل۔ (۲) وہ نوجوان جس کی نشوونما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ (۳) وہ آدمی جس کا قلب مسجد سے معلق ہو۔ (۴) ایسے دو آدمی جن کی باہمی

محبت اللہ کیلئے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطر اور اگر جدا جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کیلئے ہو۔ (۵) وہ آدمی جسے حسب و نسب والی حسین و جمیل نوجوان عورت دعوت برائی دے اور وہ یہ کہہ کر کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں، اس کی دعوت کو ٹھکرا دے۔ (۶) وہ آدمی جو تنہائی اور کج عزت میں ذکر الہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ (۷) اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ ﴿حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ﴾ بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ آرائی ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ و گمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اس روز عرش الہی کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ عرش کیا ہے۔ اس کی صحیح کیفیت و نوعیت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

اس حدیث میں مرد کی قید اتفاقی ہے ورنہ انہی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب ملے گا۔ نیز اس حدیث سے صدقہ و خیرات مخفی طریقہ سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں رغبت و شوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی حیثیت کی حامل ہو اور ریا بھی مطلوب نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۵۰۹) وَعَنْ عُثْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ عَنْهُمَا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ اِسْمِهِ يَصِلُ إِلَى رَأْسِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنْ كَانَ يَتَّقِي اللَّهَ وَيَتَّقِي النَّاسَ. (ابن حبان اور مستدرک حاکم)

رواہ ابن حبان والحاکم۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی و تمازت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہوگی۔ سایہ کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ سایہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سایہ میں کھڑا سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوگا یا دوسرا معنی یہ کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ صدقات نفلیہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکوٰۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(۵۱۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّ امْرِئٍ فِي ظِلِّ اِسْمِهِ يَصِلُ إِلَى رَأْسِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنْ كَانَ يَتَّقِي اللَّهَ وَيَتَّقِي النَّاسَ. (ابن حبان اور مستدرک حاکم)

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”جو مسلمان اپنے برہنہ بھائی قَالَ: اَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز ریشمی عَلٰی غُرَيْدٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرٍ کپڑے پہنائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی بھوکے الْجَنَّةِ، وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ اَظْعَمَ مُسْلِمًا مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت عَلٰی جُوعٍ اَظْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارٍ کے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے پیاسے الْجَنَّةِ، وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِمًا مسلمان بھائی کو پانی (یا مشروب) پلائے گا اللہ تعالیٰ عَلٰی ظَمٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيقِ اسے جنت کی مہربند پاکیزہ شراب پلائے گا۔“ (اسے الْمَخْتُومُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ لِيْنٌ. ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿کسا﴾ کے معنی ہیں کسی کو لباس پہنانا۔ ﴿علی عری﴾ ﴿عری﴾ کے عین پر ضمہ اور ”را“ ساکن یہ مصدر واقع ہو رہا ہے۔ یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہیں۔ من خضر الحنہ - خضر کے ”خا“ پر ضمہ اور ضاد ساکن یہ احضر کی جمع ہے۔ یعنی جنت کا سبز لباس۔ ﴿علی جوع﴾ بھوکے کو۔ ﴿جائعا﴾ بھوکا، خالی پیٹ۔ ﴿علی ظما﴾ شدید پیاس کی حالت میں۔ ”ظا“ اور ”یم“ دونوں پر فتح یعنی پیاسا۔ ﴿الرحیق﴾ خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ ﴿المختوم﴾ مہربند جسے مہر لگا کر منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جس کو کستوری کی مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے عمل کا آخرت میں جو بدلہ عنایت فرمائے گا وہ اس کی جنس سے ہوگا۔ البتہ جنت کا لباس دنیا کے لباس سے عمدہ، بہترین، خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔ بدلہ اسے ملے گا جس کا عمل شرف قبولیت سے مشرف ہوگا۔ قبولیت عمل کیلئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشروع و منسوں ہو غیر مشروع نہ ہو اور دوسرا اس سے مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول ہو۔ شہرت و ریا کاری اور دکھاوا مطمع نظر نہ ہو۔

حدیث میں پیاسے، ننگے اور بھوکے کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ بٹے کٹے نوجوان توانا کو اور مالدار اور پیشہ ور گداگر کو نہ دیا جائے۔ حقیقی ضرورت مند و حاجت مند کو دیا جائے۔ اس سے غرباء کی امداد پر جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی بشارت ملتی ہے۔ مہربند شراب پیش کرنے سے عز و شرف بھی حاصل ہوگا اور شراب میں کسی قسم کی آمیزش بھی نہ ہوگی۔ اس حدیث میں کمزوری جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ اس کی سند میں ابو خالد یزید بن عبدالرحمن مختلف فیہ راوی ہے۔

(۵۱۱) وَعَنْ حَكِيمٍ بْنِ حِزَامٍ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا ”اوپر والا ہاتھ نیچے قَالَ: اَلْبِدُّ الْعُلْبَا خَيْرٌ مِنَ الْبِدِّ والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ آغاز و ابتداء ان سے کر

السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنَى، وَمَنْ يَسْتَغْفِرَ يُعْفِهِ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَعْنِ يُعْنِهِ اللَّهُ. مُتَقَدِّمٌ عَلَيْهِ، وَاللَّهُ لَلْبَخَارِيِّ.

(ہیں)

نچے

والے ہاتھ سے مراد ہے لینے والا، سوال کرنے والا۔ ﴿ابدا﴾ شروع کر، ابتداء و آغاز کر یعنی دو اور خرچ کرو۔ ﴿بمن تعول﴾ جن کاٹان و نفقہ تیرے ذمہ ہو۔ ﴿ماکان عن ظہر غنی﴾ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور لفظ ظہر محض کلام میں وسعت کیلئے استعمال کیا ہے۔ ﴿ومن يستعفف﴾ جو سوال کرنے، مانگنے سے بچنا چاہے۔ ﴿يعفه الله﴾ باب افعال سے اعف یعف سے ہے۔ اے اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ ﴿ومن يستغن﴾ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خواہ کم مقدار میں ہو یا کثیر، اسی پر قناعت کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند و محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھروالوں پر صرف کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔ اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جواز خود مانگنے سے بچنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔

(۵۱۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جَهْدُ الْمُقِلِّ، وَأَبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”کم مال والے کا صدقہ اور صدقہ کی ابتداء ان سے کر جن کی تو کفالت کرتا ہے۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزمہ، ابن حبان اور

وَالْحَاكِمُ. حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿جهد المقل﴾ الحمد کے ”جہم“ پر ضمہ اور ”ہا“ ساکن۔ ہمت، طاقت اور اگر فتح پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے میم پر ضمہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ قلیل مال والا آدمی ہے معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس دوسری حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبر و برداشت کر سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے غنی سے نفس و ضمیر کا استغناء مراد ہے اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ امیر و مالدار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں۔ اس لئے اپنے گھروالوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہے۔

(۵۱۳) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَصَدَّقُوا»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! عِنْدِي دِينَارٌ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ وَالْحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدقہ و خیرات کرو۔“ ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔ ”آپؐ نے فرمایا ”اسے تو اپنی ذات پر خرچ کر۔“ وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔“ اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔“ اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، ”آپؐ نے فرمایا ”اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر۔“ وہ بولا حضور ﷺ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ ”آپؐ نے

فرمایا ”اس کے خرچ کرنے کی تجھے زیادہ سمجھ بوجھ

ہے۔“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن

حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿تصدق به علی نفسک﴾ ”تصدق“ انفق کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خرچ کر۔ صدقہ کا لفظ بول کر مراد اتفاق لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقدار کیلئے خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ ﴿انت ابصر﴾ یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کونا زیادہ مستحق ہے؟ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر پھر اولاد پر پھر بیوی پر پھر خادم پر جو کچھ بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھے، آئندہ کسی کام آئے گا۔ لہذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تاکہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(۵۱۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِزَوْجِهَا أَجْرُهُ بِمَا اكْتَسَبَ، وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذَلِكَ، لَا يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب عورت اپنے گھر کے مال سے فضول خرچی کئے بغیر خرچ کرے تو اسے خرچ کرنے کے بدلے میں اجر و ثواب ملے گا اور اس کے شوہر کیلئے کمانے کا ثواب اور اسی طرح خزانچی کیلئے بھی اجر ہے ہر ایک کا ثواب دوسرے کے ثواب میں سے کچھ یَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئًا“ متفق علیہ۔

لعنوی تشریح: ﴿غیر مفسدہ﴾ یعنی فضول خرچی، اسراف و تبذیر بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت۔ شوہر کی جانب سے بیوی کو صریح طور پر اجازت ملنے پر محمول کیا جائے گا یا کسی اشارہ وغیرہ پر۔ جیسا کہ معاشرہ میں یہ چیز معروف و معلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مؤاخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

حاصل کلام: عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ و خیرات نہیں کرنا چاہئے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کیلئے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ معمولی

صدقہ مثلاً سائل کو روٹی دے دی یا تھوڑا بہت آٹا دے دیا یا پڑوسی کو تھوڑی بہت نمک مرچ دے دی وغیرہ۔ اس صدقہ میں بیوی کے ساتھ اس کا شوہر کما کر لانے کی وجہ سے، خزانچی اس کی حفاظت کرنے کی وجہ سے اور خادم خدمت گاری کی بنا پر اجر و ثواب کے مستحق ہیں کسی کے اجر میں سے کسی نہیں کی جائے گی، ہر ایک کو اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔

(۵۱۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَدَّثَنَا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَتْ زَيْنَبُ امْرَأَةُ ابْنِ مَسْعُودٍ، فَقَالَتْ: عَرَضَ كَيْفَ يَأْتِي رَسُولَ اللَّهِ (ﷺ)! أَتَيْتُكَ أَجْزَ صَدَقَةٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّكَ أَمَرْتَ الْيَوْمَ بِالصَّدَقَةِ، وَكَانَ عِنْدِي حُلِيٌّ لِي، زِيورٌ هُوَ فِيهِ مِنْ أَسْوَاقِ صَدَقَةٍ كَرْنَا جَاهَتِي هُوَ۔ عَبْدُ اللَّهِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ، فَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُودٍ بَنِيَّ كَيْفَ خِيَالٍ هُوَ كَمَا وَهْ أَوْرَ انْ كِي اَوْلَادِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ وَلَدَهُ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «صَدَقَ ابْنُ مَسْعُودٍ، زَوْجُكَ وَوَلَدُكَ أَحَقُّ كِي اَوْلَادِ تِيرِ صَدَقَةِ كِي زِيَادَةِ مُسْتَقِي هِي۔» مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حلی﴾ ”حلی“ پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں اور ”لام“ پر کسرہ اور تشدید اور ”یا“ پر بھی تشدید۔ حلی کی جمع ہے حلی کی ”حلی“ پر فتح اور لام ساکن۔ سونے چاندی کے وہ زیور جو عورت تزئین و آرائش کیلئے پہنتی ہے یا پھر اس سے ڈورے میں پروئے ہوئے گھونگے، سلیمانی منکے یا کوڑیاں مراد ہیں۔ نیز شیشے وغیرہ کے سوراخ دار دانے اور عمدہ پتھر کے ٹکینے وغیرہ۔ یہ اس امر کے جواز کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کے معاملات و مصالح میں اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے بشرطیکہ شوہر محتاج اور عیال دار ہو۔

حاصل کلام: لفظ صدقہ نقلی صدقہ اور فرض زکوٰۃ اور صدقہ فطر (فطرانہ) سب پر مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی زکوٰۃ کی تقسیم کے مصارف کے موقع پر لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے اگر اس بات کا کوئی قرینہ واضح موجود نہ ہو کہ یہاں عام صدقہ مراد ہے تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ (فرضی صدقہ) ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرضی صدقہ ہے اس لئے کہ نقلی صدقہ کے متعلق پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی مگر ان کا یہ قول اس صریح حدیث کے مخالف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شوہر اپنی اہلیہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ اس حدیث کی روشنی میں جب بیوی فرضی زکوٰۃ دے سکتی ہے تو نقلی بدرجہ اولیٰ دے سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿زینب رضی اللہ عنہا﴾ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ بنو ثقیف سے

ہونے کی وجہ سے ثقفیہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبداللہ بن معاویہ یا ابو معاویہ ہے۔ یہ نبیؐ اور اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور حضرت عمرؓ سے بھی۔ ان سے ان کے بیٹے، بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے روایت کیا ہے۔

(۵۱۶) وَعَنْ أَبِي عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جو لوگ گداگری اور ﷺ: «لَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، بَهِكٍ مَانِكَةً كُوَيْشَةٍ هِيَ بِنَا لِيَتِي هِيَ قِيَامَتِ كِي رُوز حَتَّى يَأْتِيَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي أَيْسَى حَالَتِ مِثْلِ آئِسَى كِي كِي ان كِي چرے پر وَجْهِهِ مُزْعَةٌ لَحْمٍ». مَنَقَدٌ عَلَيْهِ. گوشت نہیں ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مُزْعَةٌ﴾ اور ایک نخہ میں ﴿مُزْعَةٌ﴾ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے، اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور ذلیل و خوار اور گری ہوئی توقیر کے ساتھ آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اسے اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چرے کا گوشت تک اڑ جائے اور جب اٹھایا جائے تو چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی خولہ ڈھانچہ رہ جائے اور اسے اس کی پہچان کی علامت بنا دیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کے پیشہ کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کیلئے جائز ہے۔ ایک وہ شخص جو آفات ناگہانی کی زد میں آجائے اور سارا مال برباد ہو جائے۔ خورد و نوش کیلئے بھی باقی کچھ نہ بچے۔ اسے اپنے گزارہ کی حد تک مانگنے کی اجازت ہے اور ایسے آدمی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی ناحق تادان یا قرض کے گرداب میں پھنس جائے تو وہ مانگ کر اتنی رقم پوری کر سکتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو دیانت داری سے کام کرتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود کام نہ مل سکے یا جائز مصارف و اخراجات سے آمدنی کم ہو اور گھریلو معاشی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور فاقہ کشی کی نوبت کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایسا آدمی بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مانگ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر مستحق لوگ محض پیسہ جمع کرنے کی خاطر مانگتے ہیں ان کا انجام قیامت کے روز وہی ہوگا جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہوا ہے۔

(۵۱۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو آدمی اپنا مال بڑھانے اور زیادہ ﷺ: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ كَرِهَ كِي غرض سے لوگوں سے مانگتا ہے تو ایسا آدمی تَكْثَرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَنْمَرًا، فَلَيْسَتْفَلَّ اپنے لئے انگاروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انہیں کم کر لے چاہے

زیادہ۔ (مسلم)

نفوی تشریح: ﴿تکسوا﴾ مال کو زیادہ کرنے کی غرض سے۔ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں۔ ﴿جمرا﴾ آگ کا دھکتا ہوا انگارا۔ ﴿فلیستقل الخ﴾ یعنی چاہے کم لے یا زیادہ حاصل کرے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے گد اگری کا پیشہ ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ توانا و قوی الجشہ آدمی کا سوال کرنا معاشرہ میں بے عزت کرنے کا موجب ہوتا ہے جن لوگوں نے بلاوجہ مانگنے کو اپنا معمول بنا لیا ہو ان کو خیرات دینا محل نظر ہے۔

(۵۱۸) وَعَنْ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ، فَيَسِينَهَا، فَيَكُفَّ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

نفوی تشریح: ﴿بحزمہ الحطب﴾ حزمہ ”حا“ پر ضمہ اور ”زا“ ساکن۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ﴿فیکف اللہ بها وجهہ﴾ یعنی اللہ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو محفوظ رکھتا ہے اور دست سوال دراز کرنے کی رسوائی سے باز رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گداگری اور بھیک مانگنا قابلِ مذمت فعل ہے۔ کما کر کھانا، محنت و مشقت کر کے حاصل کرنا بہتر ہے۔ سوالی و گداگر کو اگر کچھ مل بھی جائے تو سوال کرنے کی ذلت کیا کچھ کم ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت و آبرو نہیں رہتی۔ معاشرہ میں وقار کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایسے آدمی کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔ مفت خوری کی بد عادت ایسے آدمی کو کاہل و ست بنا کر رکھ دیتی ہے۔ معاشرے کی ترقی متاثر ہو جاتی ہے۔ نوبت بسا اوقات بایں جا رسید کہ خود کشی کی نوبت اور چوری اور ہیرا پھیری ایسی بری عادات کا خوگر بن کر رہ جاتا ہے۔

(۵۱۹) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حَضَرْتُ سَمُرَةَ بْنَ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمَسْأَلَةُ كَذِبٌ يَكْذِبُ بِهَا الرَّجُلُ وَجَهَهُ، إِلَّا أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَانًا أَوْ فِي أَمْرٍ لَا بُدَّ

مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿كَدَحٌ﴾ ”کاف“ اور ”دال“ دونوں پر ضم۔ کدح کی جمع ہے اور کدح کے کاف پر فتح اور دال ساکن ہے۔ خراش، زخم کو کہتے ہیں یعنی اس کے چرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی یا یہ کہ اس کے چرے پر ذلت و رسوائی اور اہانت کے نشانات ہویدا ہو رہے ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کسی سے مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہئے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے سوال اپنے حق کے حصول کیلئے ہے۔ اس میں کسی کے امتنان و احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

۲ - بَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ - اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان

(۵۲۰) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضَرْتُ ابُو سَعِيدٍ خُدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِعَفْيٍ إِلَّا لِحَنْسَةٍ لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، أَوْ مُسْكِينٍ. اللَّهُ جَمَادُ كَرْنِ وَالَا (۵) مُسْكِينٍ پر جو صدقہ کیا گیا ہو تُصَدَّقَ عَلَيْهِ مِنْهَا فَأَهْدَى مِنْهَا اس میں سے وہ کچھ مالدار کو تحفہ کے طور پر دے۔» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، (اسے احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَعْلَى بِالْإِسْلاَمِ. نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے مرسل ہونے سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لِعَفْيٍ﴾ غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں اوقیہ کے مساوی چیز ہو یا اتنی کہ صبح و شام اس کیلئے کافی ہو جائے۔ ﴿لِعَامِلٍ عَلَيْهَا﴾ عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقہ کی وصولی کیلئے کام کرتا ہے۔ مثلاً اسے اکٹھا کرنے والا، حساب رکھنے والا، تحریر کرنے والا۔ اس کیلئے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿غَارِمٍ﴾ مقروض، قرضدار۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باہمی رقابت و دشمنی کی اصلاح کیلئے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے اسے اتارنے کیلئے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کیلئے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرہ میں شامل ہوگا ورنہ اسے غنی شمار کیا جائے گا اس لئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کیلئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں۔ غنی کون ہے؟ اس کی تعریف

میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابو داؤد میں ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح و شام کی گزر بسر ہو سکے۔“ اور نسائی میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ ”جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ (دس روپیہ) ہو پھر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چٹ کر سوال کیا۔“

(۵۲۱) وَعَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَدِيٍّ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَدِيٍّ بْنِ الْخِيَارِ، أَنَّ رَجُلَيْنِ حَدَّثَاهُ: هُنَّ كِي دُو آدِيُوں نِي اُنِيں اِيْنَا وَاْقَعِي سُنَايَا كِي وَه اُنْهُمَا اَتِيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْأَلَانِيَهٗ مِنْ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيْهِمَا الْبَصَرَ، وَنُوْنُوں نِي اُنْ اُنْ سِي صَدَقِي كَا سُوَالِي كِيَا۔ اُنْ نِي اِن فَرَاَهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَيْتُكُمَا، وَلَا حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ، وَلَا لِقَوِيٍّ مُّكْتَسِبٍ۔ رَوَاهُ اَحْمَدُ، وَتَوَاهُ اَبُو تُوْتَمِيْس صَدَقِي دِي دِيْتَا هُوْن مَكْرَمَالِدَار اُوْر صَحْت مَنَد كَمَاؤِ آدِي كِي لِيِي اِس مِيْن كُوْنِي حَصِي نِيْس۔“ (ا سِي دَاؤُدُ وَالنَّسَائِي).

احم نے روایت کیا ہے اور ابو داؤد اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فقلب فيهما البصر﴾ آپؐ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے ان کو دیکھا۔ ﴿جلدين﴾ جیم پر فتم اور لام ساکن اور اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی ﴿لاحظ﴾ کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ ﴿لقوی مكتسب﴾ صیغہ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا ﴿ان شئتما اعطيتكما﴾ یعنی صدقہ صحت مند اور غنی کیلئے لینا زلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپؐ نے ان سے زجر و توبخ کے طور پر فرمائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کیلئے صدقہ و زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہئے کہ مسائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی تلقین کرے اور اس کو برے انجام سے خبردار کر دے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالله بن عدی بن خیار قرشی نوفلی﴾ خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش عمد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے عمرؓ و عثمانؓ وغیرہ سے روایت کی ہے اور ایک قول کے مطابق ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے۔ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فتناء و علماء میں ہوتا ہے۔ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور میں وفات پائی۔

(۵۲۲) وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهَلَالِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَجُلُ إِلَّا لِأَحَدٍ ثَلَاثَةً: رَجُلٌ تَحْمَلُ حِمَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاَحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشِهِ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُومَ ثَلَاثَةً مِنْ ذَوِي الْحِجَبِ مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشِهِ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سُخْتُ، يَأْكُلُهُ صَاحِبُهُ سُخْتًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ خُرَيْمَةَ وَابْنُ جَبَّانَ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سوال کرنا صرف تین آدمیوں کیلئے حلال ہے“ ایک وہ شخص جو کسی کا بوجھ اٹھالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا قرض وغیرہ ادا ہو جائے پھر وہ سوال کرنے سے باز آجائے اور دوسرا وہ جو کسی ناگمانی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہو گیا ہو اسے گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور تیسرا وہ شخص جسے فاقہ آرہے ہوں اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی اسے فاقہ کشی کا سامنا ہے اسے بھی گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور ان کے علاوہ اے قبیصہ! سوال حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔“ (مسلم، ابوداؤد، ابن خزیمہ، اور صحیح ابن حبان)

لعفی تشریح: ﴿ثلاثة﴾ اس پر تین ہیں ﴿رجل﴾ تلاش سے بدل ہونے کی وجہ سے مجبور ہے یا پھر رفع ہے۔ اس صورت میں ﴿احدهم﴾ محذوف ہوگا۔ ﴿تحمل﴾ برداشت کیا، کفالت کی ”حمالہ“ کا پر فتح ہے۔ وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کر لی ہو اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو وہ دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ ﴿ثم یمسک﴾ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ ﴿جائحه﴾ آسمانی یا زمینی آفت مثلاً ٹالہ باری سے اس کی فصل تباہ ہوگئی، آگ لگنے سے اور ڈوب کر مرنے کی صورت میں تلافی مافات کیلئے ﴿اجتاحت﴾ ہلاک ہوگئی۔ ﴿قواما﴾ قاف کے نیچے کسر۔ قوام جس سے کوئی اپنی حاجت و ضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ ﴿الحجی﴾ ”حا“ کے نیچے کسر یعنی عقل مند ﴿سخت﴾ سین پر ضمہ اور ”حا“ ساکن معنی حرام۔ یسحت البرکۃ کے معنی ہیں جو برکت کو لے اڑے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سوال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرنے کیلئے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل و دانش آدمی اس کی حالت، کمپری اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کو سوال جائز ہے اور سائلین کی پوزیشن کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند افراد گواہی دے دیں تو اس کیلئے سوال کرنا جائز ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت و مزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿قبیصہ بن مخارق الہلالیؓ﴾ ابو بشر کیت ہے۔ قبیصہ میں ”قاف“ پر قحہ اور ”باء“ پر کسہ ہے۔ اور مخارق میں میم پر ضمہ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ قبیصہ بن مخارق بن عبد اللہ بن شراد العامری الہلالی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے، اور نبی ﷺ کے یاس وفد کے ساتھ آئے اور آپؐ سے احادیث سنیں چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(۵۲۳) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَنْبَغِي لِأَلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ». وَفِي رَوَايَةٍ: «وَأِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِأَلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْنِدُ.

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدقہ آل محمد ﷺ کیلئے مناسب ہی نہیں۔ یہ تو لوگوں کے اموال کی میل کچل ہے“ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”صدقہ محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کیلئے حلال نہیں۔“ (مسلم)

نفعی تشریح: ﴿اوساخ الناس﴾ وسخ کی جمع ہے۔ میل کچل۔ آل محمد (ﷺ) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر کتاب الزکوٰۃ کی ایک ابتدائی حدیث میں گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ربيعة بن ربيعة بن ربيعة﴾ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ربيعة بن ربيعة بن ربيعة۔ مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ۶۲ھ میں وہیں پر وفات پائی۔

(۵۲۴) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَسَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَعْظَمْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمْسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةِ وَاحِدَةٍ، فَقَالَ

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے مروی ہے کہ میں اور عثمان بن عفانؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ نے بنو عبدالمطلب کو خیر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا ہے اور ہمیں نظر انداز فرمایا حالانکہ آپؐ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ سن کر

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلَبِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”بنو عبدالمطلب اور بنو وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَاحِدٌ“. زَوَاهُ ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔“ (بخاری) البخاری.

لغوی تشریح: ﴿من خمس خبیر﴾ خمس میں خا اور میم دونوں پر ضم۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کیلئے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ ﴿ونحن وهم﴾ ”ہم“ سے یہاں بنو عبدالمطلب مراد ہیں ﴿بمنزلۃ واحدۃ﴾ آپ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبد مناف سے تھا اس طرح دونوں ہاشم بن عبد مناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس، نوفل اور مطلب، ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ ﴿انما بنو عبدالمطلب وبنو ہاشم شئی واحد﴾ اس لئے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی مولاۃ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ یہ لوگ قرابت داروں کو حصہ دینے میں شریک ہیں۔ اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں یہ تنبیہ کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ بنو عبدالمطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکوٰۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں۔ یعنی دونوں کیلئے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ”ہم اور بنی مطلب برابر ہیں“ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وفاداری اور اطاعت کی جیسی جیسی بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرمانبرداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں۔ جتنا کچھ استحقاق قرابت انہیں آپ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سے تھے ان کو شرف دامادی بھی حاصل تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم قریش میں بالکل برابر کے قبائل شمار ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب مطلب کی اولاد ہیں۔ ہاشم، مطلب، نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اس طرح حضرت جبیر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تعلق نبی ﷺ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔

نبی ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ زمانہ قدیم سے بنو ہاشم اور بنو امیہ برابر چلے آرہے ہیں۔ آپ نے اس حیثیت سے تفریق نہیں فرمائی بلکہ اس حیثیت سے فرمائی کہ بنو ہاشم بنو امیہ کی بہ نسبت آپ کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کیلئے زکوٰۃ لینا حرام قرار دے دیا اور بنو امیہ کیلئے

حرام نہیں کیا۔ اس لئے بنو ہاشم کو خمس میں سے دیا گیا اور بنو امیہ کو خمس میں سے نہیں دیا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خمس میں سے نہیں دیا گیا۔

(۵۲۵) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِي مَخْزُومٍ، فَقَالَ لِأَبِي رَافِعٍ: اضْحَبْنِي، فَإِنَّكَ تُصِيبُ مِنْهَا: فَقَالَ: لَا، حَتَّى آتِيَنِي النَّبِيُّ ﷺ، فَأَسْأَلُهُ، فَأَتَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لَنَا الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَالثَّلَاثَةُ وَابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ.

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابورافع رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تجھے اس میں سے کچھ حصہ مل جائے گا۔ اس نے کہا میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں آیا اور آپ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ”قوم کا غلام بھی انہیں میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ (زکوٰۃ) حلال نہیں ہے۔“ (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی)

لعوی تشریح: ﴿بعث رجلاً﴾ آپ نے ایک آدمی کو بھیجا اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں ﴿تصیب منها﴾ اس حاصل شدہ صدقہ میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کیلئے خود زکوٰۃ کا لینا حرام ہے اس کے غلام پر بھی حرام ہوتی ہے۔ ابورافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی ﷺ کے غلام تھے اس لئے ان کیلئے بھی زکوٰۃ لینا حرام تھا۔

راوی حدیث: ﴿ابورافع رضی اللہ عنہ﴾ ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ہرمزیا ثابت یا ابراہیم، قطبی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انہوں نے انہیں نبی ﷺ کو بہہ کر دیا تھا۔ غزوہ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابورافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ۳۶ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(۵۲۶) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ جَبَّ عُمَرَ، كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ،

حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز عطا فرماتے تو حضرت عمر

فَقَبُولُ: اَعْطِهٖ اَفْقَرَ مِنِّي، فَيَقُولُ: ﷺ عرض کرتے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ غریب خُذْهُ، فَتَمَوَّلُهُ، اَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا هِيَ اَنْهِيَ عَطَا فَرَادِيحَتْ۔ اس کے جواب میں آپؐ جَاءَكَ مِنْ هَذَا الْمَالِ، وَأَنْتَ غَيْرُ فَرَادِيحَتِ اسے لے لو اور مالدار ہو جاؤ یا اسے صدقہ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمَالًا وَخَيْرَاتٍ کر دو جو مال بغیر عوض و لالچ اور مانگنے کے فَلَا تَتَّبِعُهُ نَفْسُكَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ تمہارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿العطاء﴾ کام کرنے کا معاوضہ اور اجرت یا عطیہ ہو ﴿افقر﴾ افعال التفضیل کا صیغہ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ ﴿فتمولہ﴾ امر کا صیغہ ہے یعنی اسے اپنا مال بنا لو۔ ﴿مشرف﴾ اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص و لالچی ہونا۔ ﴿فلا تتبعہ﴾ اتباع سے امر کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ بل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہئے واپس نہیں کرنی چاہئے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کیلئے ہے یعنی ایسا کرنا مندوب ہے فرض و واجب نہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لے لینا چاہئے۔ لہذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں ”عطاء“ سے مراد یہی ہے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث میں ہے یہ حضرت عمرؓ ﷺ کو وصولی زکوٰۃ کی اجرت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا۔ یہ امر مستحب ہے، ایجابی نہیں اور اس سے مراد ہر عطیہ بھی ہے، جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص و طمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔



٥ - كِتَابُ الصَّيَامِ

روزے کے مسائل

(۵۲۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقْدُمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلَا يَوْمَيْنِ، إِلَّا رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْمًا فَلْيُصِمْهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو اسے چاہئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔“ (بخاری و مسلم)

نغوی تشریح: ﴿لَا تَقْدُمُوا﴾ یہ اصل میں "لا تتقدموا" تھا یعنی رمضان کے استقبال کیلئے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو ﴿كَانَ يَصُومُ صَوْمًا﴾ یعنی معمول کے گئے چنے دنوں میں جو وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتہ میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آگیا تو اس طرح روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا ہے۔ ﴿فَلْيَصُمْهُ﴾ اس میں لام امر جواز کے بیان کیلئے ہے یعنی معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

(۵۲۸) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا الْقَاسِمِ عليه السلام. ذَكَرَهُ الْبَحَّارِيُّ تَغْلِيْفًا، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ (بخاری نے اسے تعلیقاً اور پانچوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الیوم الذی یشک فیہ﴾ یشک صیغہ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں روز ہے جبکہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

حاصل کلام: شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو اس روز روزہ رکھنا مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء بھی لازماً قابل اعتماد و یقین نہیں۔

(۵۲۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَاقْضُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَافْطَرُوا، فَإِنْ غَمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْضُوا لَهُ». مَنَّكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: فَإِنْ أَغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْضُوا لَهُ ثَلَاثِينَ. وَلِلْبُخَارِيِّ: فَاقْضُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ. وَلَهُ فِي حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: فَاقْضُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ”جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (عید کے لیے) چاند دیکھ لو تو افطار کرو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کیلئے اندازہ لگا لو۔“ (متفق علیہ) مسلم کے الفاظ ہیں کہ ”اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لئے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو اور بخاری کے الفاظ ہیں ”پھر تیس روز کی گنتی و تعداد پوری کرو۔“ اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ”پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اذا رايتموه﴾ جب تم اسے دیکھ لو، اسے مراد چاند ہے یعنی جب چاند تمہیں نظر آجائے۔ ﴿فان غم﴾ غم کے غین پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ صیغہ مجہول۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔ ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے۔ ﴿فاقدوا له﴾ قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فاقدوالہ کے دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ مکمل مہینہ کی گنتی اور تعداد پوری کرو اور تیسویں روز افطار کرو۔

(۵۳۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ، فَأُخْبِرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنا شروع کیا تو میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: تراى الناس الهلال لوگ عید کا چاند دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کیلئے خبر واحد یعنی صرف ایک آدمی

کی شہادت مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزہ کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند نظر آجائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرے۔ اگر انیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کئے جائیں اور اسی طرح اگر انیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو روزے تیس پورے کئے جائیں۔ اگر گرد و غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آجائے تو روزہ سارے شہر، قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رویت قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ جنہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کیلئے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کیلئے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، سب متفق ہیں۔

(۵۳۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَغْرَابِيًّا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الْهَالَ، فَقَالَ: أَتَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَا بِلَالُ أَنْ يَصُومُوا عَدًّا. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَانَ، وَرَجَّحَ الشَّيْخُ إِسْمَاعِيلُ.

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحرا نورد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا ”کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الہ نہیں؟“ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟“ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا بلال اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھا جائے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿فأذن﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کیلئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

(۵۳۲) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے صبح صادق سے

ﷺ قَالَ: «مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصَّيَّامَ قَبْلَ» پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔“
 الفَجْرِ فَلَا صِيَّامَ لَهُ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان
 وَمَا الزَّمِيذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَى تَرْجِيحِ وَفَقُوا، اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور
 وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعًا ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ. ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے) اور
 وَلِلدَّارِ قُطَيْبِي: «لَا صِيَّامَ لِمَنْ لَمْ» دار قطنی کی روایت میں ہے ”جس نے رات کو اپنے
 بِفَرْضِهِ مِنَ اللَّيْلِ.“ آپ پر واجب نہ کر لیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔“

لعنوی تشریح: ﴿من لم یبیت﴾ الخ تبیین سے ماخوذ ہے۔ یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا ﴿لم
 بفرضه﴾ باب ضرب بضرب سے ہے۔ یعنی اس کو اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس
 نے اس کی نیت نہ کی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے ہونی ضروری ہے
 گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جاسکتی ہے۔ نیت
 اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے
 روزے کیلئے الگ الگ نیت شرط ہے۔ البتہ روزہ کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت
 ہے کیونکہ نیت دل کا عمل ہے، زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام
 رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما﴾ پہلے یہ خنیس بن حذافہ بھی
 کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوہ بدر کے موقع پر یہ وفات پانگے تو رسول اللہ ﷺ نے
 ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ ۳ھ کی بات ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں
 شعبان ۴۵ھ میں فوت ہوئیں۔

(۵۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ قُلْنَا: لَا، قَالَ: فَإِنِّي إِذَا صَائِمٌ، ثُمَّ أَنَا يَوْمًا آخَرَ، فَقُلْنَا: أَهْدِي لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِنِيهِ فَلَقَدْ أَضْبَحْتُ صَائِمًا، فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.
 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ ”کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟“ ہم نے عرض کیا، نہیں۔ تو آپ نے فرمایا ”اچھا تو میں روزہ سے ہوں۔“ اس کے بعد پھر ایک روز تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ حلوہ کا تحفہ ہمیں (کہیں سے) دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ”ذرا مجھے تو دکھاؤ صبح سے میں روزے سے تھا۔“ (یہ فرما کر) آپ نے حلوہ

لغوی تشریح: ﴿ما عجلوا الفطر﴾ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔ یہ تعجیل سے ماخوذ ہے یعنی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو فوراً روزہ افطار کر دینا چاہئے۔ اس عجلت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اہل

اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کا بھی یہی تقاضا ہے اس لئے شعار اسلام کا اہتمام کرنا اور شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیر و برکت کا باعث ہے۔

حاصل کلام: مطلع صاف ہو، گرد و غبار اور ایر آلودگی نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اور مصابیح میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر و دیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے۔ لہذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہئے۔

(۵۳۵) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”سحری کھایا کرو اس لئے رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي» کہ اس میں بڑی برکت ہے۔“ (بخاری و مسلم) السَّحُورِ بَرَكَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لعوی تشریح: ﴿السحور﴾ سین پر فتح کی صورت میں طلوع فجر سے پہلے سحریلئے جو کچھ کھایا پیا جائے اسے سحور کہتے ہیں اور اس پر اگر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے یہود و نصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔ اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵۳۶) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے النَّبِيُّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ روزہ افطار کرے تو اسے کھجور سے افطار کرنا چاہئے۔ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ پھر اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ». رَوَاهُ لے اس لئے کہ وہ پاک ہے۔“ (اسے پانچوں نے الْحَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ جَبَّانٍ روایت کیا ہے۔ ابن خزيمة، ابن حبان اور حاکم نے اسے وَالْحَافِظُ. صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو کھجور سے افطار کرنا چاہئے کیونکہ کھجور مقوی معدہ، مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار بہتر ہے۔ نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ﴾ سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث النضی۔

مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش رکھی تھی۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے ماسوا کوئی بھی ضعی صحابی نہیں۔

(۵۳۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ: فَإِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «وَأَيُّكُمْ مِنِّي؟ إِنِّي أَبِئْتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الْوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْمًا، ثُمَّ يَوْمًا، ثُمَّ رَأَوْا الْهَلَالَ، فَقَالَ: «لَوْ تَأَخَّرَ الْهَلَالَ لَزِدْتُكُمْ»، كَالْمُنْكَلِ لَهُمْ حِينَ أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا، مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ! آپ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ”تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔“ جب لوگوں نے وصال سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے ساتھ ایک دن پھر دوسرے دن کا وصال کیا۔ پھر انہوں نے چاند کو دیکھ لیا تو آپ نے فرمایا کہ ”اگر چاند آج نظر نہ آتا تو میں تمہارے لئے زیادہ دن وصال کرتا۔“ گویا آپ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الوصال﴾ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے پئے اور نہ سحری کے وقت۔ جمہور علماء اسلام کا قول یہ ہے کہ وصال کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپ کیلئے جائز اور امت کیلئے ناجائز ہے۔ ائمہ ثلاثہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وصال کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری بہر نوع کھانی چاہئے۔ ﴿یطعمنی ربی ویسقینی﴾ میرا رب مجھے کھلاتا ہے، پلاتا ہے۔ جمہور نے اسے مجازاً قوت پر محمول کیا ہے کہ کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ وہ قوت مجھے عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض نے اسے حقیقت پر معمول کرتے ہوئے کھانے پینے سے جنت کا کھانا پینا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے معارف کی ایسی غذا کھلاتے ہیں جس سے آپ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے اور اللہ کی محبت کی نعمت سے آپ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں افزونی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپ کو اللہ کی

جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپؐ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تخصیص از زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۴، ۱۵۵) ﴿كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ﴾ تنکیل سے ماخوذ اسم فاعل ہے۔ معنی زجر و توبخ، ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ بھی ان کے ساتھ مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ یہ بیان صرف جواز کیلئے نہیں ہے بلکہ زجر و توبخ کیلئے ہے اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ پس جب انہوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پئے بغیر روزہ رکھنا انسانی قویٰ کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی یا غذا کی قوت مل جاتی تھی اس لئے آپؐ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے نیکی کے جذبہ اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپؐ نے سبق سکھانے کیلئے مسلسل روزے رکھنا شروع کئے تو اتنے میں چاند نظر آگیا تو آپؐ نے زجر و توبخ کے طور پر فرمایا کہ ”کرو وصال کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں وصال صوم کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمہیں سبق ملے۔“ البتہ بخاری میں ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”وصال نہ کرو ہاں! اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔“ جس سے امام احمدؒ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری کا کھانا شعائر اسلام سے ہے۔ اس لئے سحری کھانا چاہئے اور رات دن کا وصال آنحضرتؐ کی خصوصیت ہے۔

(۵۳۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالْعَمَلَ بِهِ، وَالْجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». (بخاری اور ابوداؤد۔ اور الفاظ ابوداؤد ضرورت نہیں۔) (کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لم يدع﴾ نہ چھوڑا، ترک نہ کیا۔ ودع سے ماخوذ ہے۔ ﴿الزور﴾ زاپر ضمہ اور ”واو“ ساکن معنی جھوٹ ﴿الجهل﴾ حماقت و بیوقوفی اور سختی ﴿فليس لله حاجة﴾ تو اللہ کو اس کی طرف التفات و توجہ کی حاجت و ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ، غلط بیانی، جہالت و نادانی

کے کام بھی ترک کر دینے چاہئیں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے روزے کی حالت میں ایک روزے دار کا بچنا نہایت ضروری ہے۔ روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ، دغا، فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہی مقصود حاصل نہ ہو تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(۵۳۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُقْبَلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُنَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلِكِنَّهُ كَانَ أَمْلَكَكُمْ لِإِزْبِهِ. نسبت اپنی طبیعت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط کرنے مُتَقَنِّ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «فِي» والے تھے۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ یہ دونوں فعل رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿يُقْبَلُ﴾ تقبیل سے ماخوذ ہے۔ ﴿يُنَاشِرُ﴾ (یباشر) میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا، بغل گیر ہونا۔ ﴿لَارِبَهُ﴾ دونوں پر فتح ہے۔ یعنی حاجت، خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق) اور ایک قراءت کے مطابق ہمرہ کے نیچے کسرہ اور راء ساکن۔ اس صورت میں حاجت اور عضو مخصوص کا احتمال ہے۔ اس حدیث سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کیلئے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو اور یہ رعایت ایسے آدمی کیلئے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلہ میں تمام اقوال و آراء میں زیادہ مناسب اور جہتی برعدل ہے۔

(۵۴۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَضْرَتِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ أَسْتَحْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاسْتَحْتَجَمَ وَهُوَ لُكْوَاءَ۔ (بخاری) صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ چھپنے یا سیٹگی لگوانے سے نہ احرام میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے اور نہ روزے میں کوئی کمی آتی ہے۔ دونوں حالتوں میں چھپنے لگوانے جائز ہیں۔ البتہ اگر کمزوری واقع ہو جائے اور اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ و خطرہ پیدا ہو تو پھر چھپنے لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اکثر ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ چھپنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(۵۴۱) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ حَضْرَتِ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ سے مروی ہے کہ نبی

الْحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، وَكَانَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ اور انس رضی اللہ عنہ روزہ کی حالت میں سیکنی لگواتے تھے۔ يَخْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ وَقَوَاهُ. (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کو قوی کہا ہے) لغوی تشریح: ﴿بعد﴾ کے وال پر عموماً ضمہ ہے۔ اسے بنی علی الضم کہتے ہیں۔ نیت میں مضاف الیہ ہونے کے باوجود اسے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے ﴿بعد ذلک﴾ اس میں ”ذلک“ ذہن میں ہوتا ہے مگر اسے حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے بعد پر ضمہ پڑھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ سیکنی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گذشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۵۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَكْتَحَلَ رَمَضَانَ فِي رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ ماجہ نے بیان کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: لَا يَصِحُّ فِيهِ شَيْءٌ. اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں)

حاصل کلام: سرمہ لگانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ، ابن مبارک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ روزہ دار کیلئے سرمہ لگانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ اس بارے میں گو مرفوعاً احادیث سب ضعیف ہیں، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر ان کا موید ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿لاباس باسناده﴾ ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ نے تو کہہ دیا ہے کہ سرمہ ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں ہے کہ ”روزہ اندر جانے والی چیز سے ٹوٹ جاتا ہے) اور سرمہ وغیرہ کا اثر حلق میں اتر جاتا ہے۔ مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ سرمہ وغیرہ کا اثر مساموں کے ذریعہ حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ براہ راست کھانے کی جگہ نہیں جیسے کوئی تمہ پاؤں کے تلوں پر ملے تو اس کی کڑواہٹ منہ میں محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس سے کوئی بھی روزہ ٹوٹ جانے کا قائل نہیں۔ مزید برآں یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں فضل بن الحجاز اور شعبہ مولیٰ ابن عباس دونوں ضعیف ہیں۔ رہی ابوداؤد کی ایک حدیث کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے پرہیز کرے تو اس کے بارے میں خود امام ابوداؤد نے وضاحت کر دی ہے کہ امام یحییٰ بن معین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ (نیل، سبل)

(۵۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيَتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا

اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

أَطْعَمَهُ اللَّهُ، وَسَقَاهُ. مُتَّقَ عَلَيْهِ. اور امام حاکم سے یوں روایت ہے کہ ”اگر کوئی وَلِلْحَاكِمِ: مَنْ أَفْطَرَ فِي رَمَضَانَ نَاسِيًا فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلَا كَفَّارَةَ. اور کفارہ نہیں۔“ (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

(۵۴۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ الْقَيْءُ فَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنْ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ». اس کو معلول کہا ہے اور امام دارقطنی نے اسے قوی کہا رَوَاهُ التَّحْنُصِيُّ، وَأَعْلَاهُ أَخَذَ، وَقَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. (ہے)

لغوی تشریح: ﴿ذَرَعَهُ الْقَيْءُ﴾ یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے اور ”استسقاء“ کے معنی یہ ہیں کہ جو قصد اور ارادہ خود سے کرے۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے مگر امام دارقطنی رحمہ اللہ، امام ابن حبان رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہما، زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کا اس روایت کے مطابق یہی قول ہے کہ قصداً قے کرنے سے ہی روزہ ٹوٹتا ہے بلکہ امام ابن منذر نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات قے سے روزہ ٹوٹ جانے اور اس کی قضاء کے قائل نہیں مگر یہ قول دلیل کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہے۔

(۵۴۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ، فِي رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الْعَمِيمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَبَيَّلَ لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أَوَّلِيكَ الْعُصَاةَ، أَوَّلِيكَ الْعُصَاةَ»۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ آپ کُرَاعِ الْعَمِيمِ (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ پھر آپ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا ”یہی لوگ نافرمان ہیں، یہی لوگ نافرمان ہیں۔“ اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ آپ سے کہا

مُسْلِم

(۵۴۷) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو
الْأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ
قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أَجِدُ بَيْنِي
قُوَّةَ عَلَى الصَّيَامِ فِي السَّفَرِ، فَهَلْ
عَلَيَّ جُنَاحٌ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:
«هِيَ رُحْصَةٌ مِّنَ اللَّهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا
فَحَسَنَ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّقِ
عَلَيْهِ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو

سؤال۔
 راوی حدیث: ﴿حمزہ بن عمرو اسلمیؓ﴾ حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت ابو صالح یا ابو محمد ہے۔ ان سے ان کے فرزند اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ وہ ۶۱ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

(۵۴۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا حَفَظَتْ عَدْلُ اللَّهِ بَنِي عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا مِنْ رِوَايَتِهِ كَمَا

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رُخْصَ بَرِيٍّ عَمْرُوَالِ بُوْزْهِ كُو رُخْصَتِ دِي گئی ہے کہ وہ لِلشَّيْخِ الْكَبِيرِ أَنْ يُفْطَرَ وَيُطْعِمَ عَنْ انظار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کُلْ يَوْمَ مُسْكِينًا، وَلَا قَضَاءَ عَلَيْهِ. کھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ (اسے دار قطنی اور زَوَاهِد الدَّارَقُطْنِي وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّاحُ۔ حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿رخص﴾ یہ ”رخصت“ سے ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ ﷺ نے کی ہو۔ ﴿وَيُطْعِمُ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مُسْكِينًا﴾ کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح علاج سے مایوس مریض کا بھی یہی حکم ہے کہ یومیہ ایک مسکین کے کھانے کے برابر صدقہ کرے۔ ایک روایت میں کھانے کا اندازہ آدھا صاع گندم آیا ہے۔ یعنی سوا کلو گندم۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے کھانا تیار کرایا اور تین مسکینوں کو بلا کر کھلایا۔ امام دار قطنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک ضروری ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور بعض نے کھانا کھلانے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یعنی اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ (سبل، فتح)

(۵۴۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: هَلَكْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَ؟» قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِي فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُغْنِي رَقَبَةً؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَابِعَيْنِ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّينَ مُسْكِينًا؟» قَالَ: لَا، ثُمَّ جَلَسَ، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيهِ تَمْرٌ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! (ﷺ) میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا ”کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟“ اس نے کہا میں رمضان میں اپنی عورت سے مباشرت کر بیٹھا۔ تو آپ نے فرمایا ”کیا تجھ میں اتنی طاقت ہے کہ ایک گردن کو آزاد کر دے؟“ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟“ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ”کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟“ اس نے کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ تو نبی

فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهَذَا»، فَقَالَ: أَعْلَى أَفْقَرَنَا؟ فَمَا بَيْنَ لَا بَيْتَهَا أَهْلُ بَيْتِ أَخْوَجَ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «أَذْهَبْ فَأَطْعِمْنَاهُ أَهْلَكَ». رَوَاهُ الشُّعْبَةُ وَاللُّنْظُ لِمُسْلِمٍ.

ﷺ کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”ان کو خیرات کر دو۔“ اس نے کہا کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں)؟ کیونکہ دو سنگلاخ پہاڑوں (مدینہ) کے مابین کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ تو نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہو گئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔“

(اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿جاء رجل﴾ آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ منخر بیاضی تھا۔ ﴿وقعت علی امراتی﴾ میں اپنی بیوی پر پڑ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے میں نے اس سے وطی کی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ﴿هلکت﴾ میں ہلاک ہو گیا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عدا یہ حرکت کر لی۔ جس سے وہ شخص اس حکم سے خارج ہے جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ ﴿رقبة﴾ سے مراد غلام یا لونڈی ہے اور یہ ﴿ماتعتق﴾ میں ”ما“ کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿فاسی﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ ﴿بعرق﴾ سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔ ﴿فیہ تمر﴾ جس میں پندرہ صاع یعنی ساٹھ مہ کھجوریں تھیں۔ یہ اس لئے کہ ہر مسکین کیلئے ایک مہ ہے اور دار قطنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا ہر مسکین کیلئے ایک مہ ہو ﴿اعلیٰ افقر﴾ میں حمزہ استنہام ہے اور ”علی“ حرف جر ہے۔ یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے اہل بیت سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ ﴿فما بین لابتيہا﴾ میں ﴿لابتيہا﴾ لابتہ کا ﴿تفنیة﴾ ہے اور باء پر فتح ہے۔ یعنی وہ سیاہ پتھریلی زمین جسے آگ نے جلایا ہو اور ”ہا“ کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف ہے اور ”لابتان“ سے معروف دو حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غربی جانب ہیں۔ ایک کا نام ”حرۃ الواقم“ اور دوسرے کا ”حرۃ الوبرة“ ہے اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقع ہے۔ لہذا ”لابتین“ سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔ ﴿انباہ﴾ یہ ”ناب“ کی جمع ہے اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو ”رباعی“ کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور ”رباعی“ ثنایا کے ساتھ والے دانت کو کہتے ہیں اور ”ثنایا“ سے سانے کے دو دانت مراد ہوتے ہیں اور اس کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سانے کے دو دانتوں پر ہوتا ہے۔ ﴿اطعمہ اہلک﴾ یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ یہ حدیث اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ فقیر پر کفارہ نہیں یا فقیر کا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہی کافی ہے بلکہ یہ تنگ دستی کی بنا پر کفارہ مؤخر ہونے کی دلیل ہے کہ جب میرے آئے تب کفارہ ادا کرے۔

نفی تشریح: ﴿وعلیه صیام﴾ یعنی اس کے ذمہ روزہ لازم و واجب ہو کیونکہ ”علی“ کا لفظ وجوب کیلئے ہے۔ ﴿صام عنہ ولیہ﴾ اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہئے اور روزہ میں نیابت جائز ہے اور جن حضرات نے

کہا ہے کہ روزہ میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ رائج یہی ہے کہ روزہ میں نیابت ہے۔

حاصل کلام: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھانا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ میں نیابت بھی جائز ہے اور یہی بات رائج ہے۔ نیز حج کی طرح لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے کوئی اور دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلیبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل)

۱ - باب صَوْمِ التَّطَوُّعِ، نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ

وَمَا نَهَى عَنْ صَوْمِهِ رُكْنَا مَنَعَ كَيْفَا هِيَ كَابِيَان

(۵۵۲) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْأَثْنَيْنِ، فَقَالَ: «ذَلِكَ يَوْمٌ وَلَدْتُ فِيهِ، وَبُيعْتُ فِيهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرفہ (و ذوالحجہ) کے دن روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ”یہ (روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔“ اور آپ سے عاشورہ کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ”یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔“ اور آپ سے سوموار کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ ”اس دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔“

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یوم عرفہ﴾ عرفہ کا دن، ذی الحجہ کا نواں دن ہوتا ہے اور جو میدان عرفات میں نہ ہو اس کیلئے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کیلئے روزہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ﴿یکفر﴾ یہ تکفیر سے ہے یعنی اس کی برکت سے پہلے اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور ان گناہوں سے صغیرہ

(۵۵۳) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِنًا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے یہ عمل سارے سال (روزے رکھنے) کی مانند ہوگا۔“ (مسلم)

(۵۵۴) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: "كُوِيَ شَخْصٌ أَيْسًا نَهَى جَوْ اللَّهِ فِي رَاحَةٍ مِنْ أَوَّلِ دُنِ رَوْزَةٍ رَكَعَ مَرَّ اللَّهُ تَعَالَى اس كَے چرے كو ستر سال كِلئے جَنَمِ كِ اُگ سے دور كر دیتے ہں۔"

غوی تشریح: ﴿فی سبیل اللہ﴾ اللہ کی راہ میں، جب مطلقاً یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جماد ہوتا ہے۔ یعنی جماد کے دوران جو ایک دن روزہ رکھتا ہے اسے یہ فضیلت حاصل ہوگی لیکن اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آجائے اور جماد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ ”خبریفہ“ سے مراد ایک سال ہے۔

(۵۵۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَصُومُ حَتَّى نَقُولَ لَا يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتَّى نَقُولَ لَا يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلَّا رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِي شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْمُسْلِمِ.

روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپؐ کبھی افطار نہیں کریں گے اور آپؐ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے تھے (اسی طرح) آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے کبھی سوائے رمضان کے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں اور میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپؐ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم و بیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مشاغل کی بنا پر کئی کئی دن روزہ نہ رکھتے۔ البتہ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے آپؐ شعبان میں رکھتے تھے۔

(۵۵۶) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، ثَلَاثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ التَّيْمِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم ہر ماہ تین دن کے روزے رکھیں یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ (تاریخ کو)۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

(۵۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَرَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلَّا بِإِذْنِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «فِي رَمَضَانَ».

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کسی عورت کیلئے حلال نہیں کہ وہ روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو۔ الا یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔“ (بخاری و مسلم) یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور ابو داؤد نے ”سوائے رمضان“ کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزہ سے مقدم ہے۔ نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے۔ البتہ فرضی روزہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ فرض کی ادائیگی بہر نوع مقدم ہے۔

(۵۵۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(۵۵۹) وَعَنْ نَيْسَنَةَ الْهَذَلِيَّ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «أَيَّامُ الشَّرِيقِ أَيَّامُ أَكْلٍ
وَشَرْبٍ وَذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ
مُسْلِمٌ.

حضرت نیشہ الہذلیؓ سے روایت ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا: ”شریق کے دن کھانے، پینے اور
اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دن ہیں۔“ (مسلم)

نفعی تشریح: ﴿ایام التشریق﴾ تشریق کے دن یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کے دن کے بعد۔ مزید تین دن ہیں۔ ﴿ایام اکل وشرب﴾ کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں روزہ رکھنا حرام ہے۔
 راوی حدیث: ﴿نبیۃ ﷺ﴾ تغیر کے ساتھ، ان کے والد کا نام و نسب یوں ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عتب الحذلی۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انہیں ”نبیۃ الخیر“ کہا جاتا تھا۔

(۵۶۰) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَا: لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ أَنْ يُصَمَّنَ إِلَّا لِمَنْ لَمْ يَجِدِ الْهَدْيَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لَمْ يَرْخَصْ﴾ یہ صیغہ مجہول ہے کہ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہؓ اور ابن عمرؓ) نے سورہ بقرہ کی اس آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو۔ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ... کہ جو حدی نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے۔ ﴿ان يَضْمَنَّ﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ ﴿الْاَلَمَنْ يَجِدُ الْهَدْيَ﴾ سوائے اس شخص کے جو حدی نہ پائے۔ ”حدی“ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص حج تمتع یا قرآن کرنے والا ہو یا عمر ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کیلئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں کیونکہ یہ حدیث حقیقی طود پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں مرفوع روایات میں ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

حاصل کلام: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی متعدد احادیث میں ممانعت آئی ہے اور اس بارے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ بعض اہل علم مطلقاً ان دنوں روزہ رکھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہے مگر یہ حقیقتاً مرفوع نہیں۔ احتمال ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کے ظاہری سیاق سے یہی سمجھا ہو کہ ”ایام حج“ سے مراد یہی ایام تشریق ہیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ یوم النحر سے پہلے اور ایام تشریق کے بعد کے دن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سنن دارقطنی وغیرہ میں جو یہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدی نہ رکھنے والے متمتع کو روزہ کی رخصت دی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی یحییٰ بن سلام قوی نہیں۔ اس لئے راجح یہی ہے کہ ایام تشریق میں بہر نوع روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(۵۶۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «دُوسَرَى رَاتُوں مِیں سَے جَمْعَ کِ رَات کو قِیَام کَرْنِے کِیلِے مَخْصُوص نہ کَرُو اور نہ ہی دُوسَرِے دِنُوں مِیں سَے جَمْعَ کِ دِن کو روزہ کِیلِے الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ الْأَيَّامِ، مَخْصُوص کَرُو سَوَائِے اِس کِے کَے جَمْع کا دِن ایسے دِن اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ مِیں آجائے جِس دِن روزہ رکھتا ہو۔“ (مسلم) اَحَدُكُمُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿لَا تَخْصُوصُ أَيُّومَ الْجُمُعَةِ﴾ یعنی اکیلا جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص نہ کرو۔ اس لئے کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے بھی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں ابن مسعود رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بہت کم جمعہ کا روزہ چھوڑتے تھے۔ مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ نے بلا ریب جمعہ کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعہ میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کا دن روزہ اس سے ایک روز پہلے یا بعد روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ ﷺ نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کی بعد کی حدیث میں آ رہا ہے۔

(۵۶۲) وَعَنْهُ أَيْضاً قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلَّا أَنْ يَصُومَ يَوْمًا قَبْلَهُ، أَوْ يَوْمًا بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(۵۶۳) وَعَنْهُ أَيْضاً أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ﷻ نے فرمایا کہ ”جب شعبان آدھا ہو جائے تو تَصُومُوا“۔ رَوَاهُ الْحَمْسَةُ، وَاسْتَكْرَاهُ أَحْمَدُ۔ روزہ نہ رکھو۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد ﷺ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: یہ ممانعت اس لئے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو جائے اور رمضان المبارک کے روزہ میں قوت بحال رہے۔ یہ نہی تزییہ ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ امام احمد ﷺ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبد الرحمن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ نیز اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عاداتاً رکھے جاتے ہیں مثلاً جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں روزہ رکھنا جائز ہے۔ (فتح الباری وغیرہ)

(۵۶۴) وَعَنْ الصَّمَاءِ بِنْتِ بُسْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَصُومُوا يَوْمَ السَّبْتِ إِلَّا فِيمَا افْتَرَضَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلَّا لِحَاءً عَنِبَ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ، فَلْيَمْضُغْهَا»۔ رَوَاهُ الْحَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ نَفَاحٌ، اضْطُرَبَ بِهِ شَكَّ إِمَامُ مَالِكٍ ﷺ نے فرمایا ”ہفتہ کے دن کا روزہ نہ رکھو۔ سوائے اس روزہ کے جو تم پر فرض کیا گیا ہے۔ پس اگر تم میں سے کوئی انگور کا چھلکا یا کسی درخت کا تنکا پائے تو چاہئے کہ اس کو کھالے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں اضطراب ہے۔ بے شک امام مالک ﷺ نے اس کا انکار کیا ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ منسوخ ہے) قَالَ أَبُو دَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ۔

لغوی تشریح: ﴿لِحَاءً عَنِبَ﴾ کے لام پر فتح اور کسرہ دونوں طرح پر ہے اور آخر میں مد ہے۔ جس کے معنی ہیں چھلکا اور ”العنب“ کی عین کے نیچے زیر اور نون پر فتح ہے۔ مشہور پھل یعنی انگور کو ”عنب“ کہتے ہیں۔ ﴿فَلْيَمْضُغْهَا﴾ یہ باب نصر اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی اسے کھالے اور اس سے روزہ افطار کر لے۔ امام ترمذی ﷺ نے کہا ہے کہ ”ہفتہ کے روز روزہ کی یہ ممانعت اس لئے ہے کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔“ اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿الصَّمَاءُ بِنْتُ بُسْرِ﴾ صادر پر زبر اور میم مشدد ان کا نام بھیہ تھا اور بھیہ کی باء پر پیش ”حاء“ مفتوح اور باء مشدد اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بھیہ میم کے اضافہ کے ساتھ تھا۔ ”بسر“ کی باء پر پیش اور راسا کن قبیلہ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبد اللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(۵۶۵) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَكْثَرَ مَا كَانَ يَصُومُ مِنَ الْأَيَّامِ، يَوْمَ السَّبْتِ، وَيَوْمَ الْأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أَخَالِفَهُمْ». أَخْرَجَهُ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ”یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔“ (اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں)

النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهَذَا لَفْظُهُ.

حاصل کلام: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناخ بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لئے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے۔ کیونکہ یہود ہفتہ کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں۔

(۵۶۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے)

غَيْرِ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالْحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ الْمُعْتَلِيُّ.

حاصل کلام: امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے منکر اس لئے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مہدی بن حرب الجری سے روایت کی ہے اور حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثین نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا فیصلہ بھی تقریب التہذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ البتہ مہدی الجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی تائید کی ہے اور امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے ثقات میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”مقبول“ کہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رحمہ اللہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ ”یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے“ یعنی اہل عرفہ کیلئے یہ دن عید کا ہے۔ اس لئے انہیں اس روز روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم

عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(۵۶۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا صَامَ مَنْ صَامَ اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا۔» (بخاری و مسلم) اور الْأَبَدَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِإِسْلَامِهِ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں کہ ”نہ روزہ بَلْفِظَ: «لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ»۔ رکھانہ افطار کیا۔“

لغوی تشریح: ﴿لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ﴾ میں ”الابد“ ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ﴿لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ﴾ یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور ”نہ افطار کیا“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

۲ - بَابُ الْاِغْتِكَافِ وَ قِيَامِ رَمَضَانَ

(۵۶۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «بِجُودِ اِيْمَانٍ اور ثواب کی نیت مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَ اِحْتِسَابًا سے رمضان کا قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ کر دیئے جاتے ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بَابُ الْاِغْتِكَافِ﴾ کے لغوی معنی روکنے اور بند کرنے کے ہیں اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا اور ”قیام رمضان“ سے مراد رات کو نماز پڑھنا یا قرآن پاک کی تلاوت کرنا ہے اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ ﴿اِيْمَانًا﴾ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب پر یقین رکھتے ہوئے اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص کی نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریاء و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ ﴿اِحْتِسَابًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے جو قیام کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کتنے بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین و تر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپ

نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (ابن حبان) اس لئے سنت نبوی ﷺ تو بہر نوح گیارہ رکعت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(۵۶۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دھاکہ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ، - أَيِ الْعَشْرِ رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ الْأَخِيرَةُ مِنْ رَمَضَانَ، - شَدَّ مِئْزَرَهُ، (بخاری و مسلم) وَأَحْيَا لَيْلَهُ، وَأَيَّقَطَ أَهْلَهُ مُتَّقٍ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿شد میزہ﴾ مندر کی میم کے نیچے زیر، حمزہ ساکن ہے۔ یعنی اپنی چادر باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپ عبادت کے لئے کمر بستہ باندھ لیتے اس کیلئے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات سے عبادت کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ﴿واحیا لیلہ﴾ یعنی نماز وغیرہ میں شب بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ ﴿وایقظ اہلہ﴾ یعنی اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کیلئے نیند سے اٹھاتے۔

(۵۷۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے أَنْ يَغْتَكِفَ، صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ اور پھر اعتکاف کی جگہ داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم) مُتَّقٍ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿صلی الفجر﴾ صبح کی نماز پڑھتے، اکیس رمضان کی نماز مراد ہے۔ ﴿ثم دخل معتكفه﴾ اسم ظرف کا صیغہ ہے یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ نماز فجر کے بعد آپ علیحدگی اختیار کر لیتے، یوں نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کے ابتداء کا ہے بلکہ اعتکاف کیلئے تو آپ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے، جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ حدیث میں وضاحت ہے کہ آپ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(۵۷۱) وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اَعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم) ابھی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تا آنکہ آپ وفات پا گئے۔ آپ کی بیویاں آپ کے بعد اعتکاف کرتیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل)

(۵۷۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَيَدْخُلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ، - فَأَرْجُلُهُ، (اعتکاف کی حالت میں) مسجد میں ہوتے۔ پس میں وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةٍ، آپ کو کنگھی کرتی اور جب آپ اعتکاف میں إِذَا كَانَ مُعْتَكِفًا. مُتَّقَى عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ هُوَ، تو آپ سوائے ضروری حاجات کے گھر میں دُخْلًا نہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے لِبُخَارِيٍّ.

(ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان کان﴾ یہ ”ان“ حرف تاکید ہے اور یہ ان ثقیلہ سے خفیفہ استعمال ہوا ہے، اصل کلام ”انہ کان“ تھا ﴿لیدخل﴾ ادخال سے ہے یعنی داخل ہوتے ﴿علی﴾ یہ علی حرف جار نہیں بلکہ یاء مشدودہ ہے یعنی میری جانب ﴿فارجلہ﴾ تو میں آپ کو کنگھی کرتی۔ آپ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی، تیل لگاتی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے اور اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ ﴿الاحاجۃ﴾ مگر ضروری حاجت کیلئے۔ اس سے بول و براز، غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ مراد ہے جو مسجد میں نہیں کئے جاسکتے۔

(۵۷۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: السُّنَّةُ عَلَىٰ حَضْرَةِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا مَرِيضًا، وَلَا يَشْهَدُ جَنَازَةً، وَلَا يَمَسُّ امْرَأَةً، وَلَا يَخْرُجُ لِحَاجَةٍ إِلَّا لِمَا لَازِمًا، وَلَا يَغْتَكِفُ إِلَّا حَاجَاتٍ ضَرُورِيَّةٍ كَالْحَاجَةِ إِلَى الْمَاءِ، وَلَا يَغْتَكِفُ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ كَالْمَسْجِدِ الْكِبِيِّ، وَلَا يَغْتَكِفُ إِلَّا فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلَا بَأْسَ بِرَجَالِهِ، إِلَّا رَاوِيوں میں کوئی خلل نہیں لیکن راجح یہ ہے کہ اس کے اُخْرَى الْفَظ مَوْقُوفٌ هِيَ. (آخری الفاظ موقوف ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان لا یعود مریضاً﴾ یہ عیادت سے ہے یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کیلئے نہ نکلتے۔ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ولا یمس امرأة﴾ یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ﴿ولا یبشیرھا﴾ اور نہ اس سے جماع کرتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”لمس“ سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ مراد ہو۔ ﴿ولا اعتکاف الا بصوم﴾

اور روزہ کے بغیر اعتکاف نہ کرتے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے، دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کے ساتھ روزہ مشروط نہیں ہے۔ ﴿مسجد جامع﴾ وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ ﴿الان الرجاء وقف آخرہ﴾ یعنی آخری جملہ ﴿والاعتکاف الا بصوم﴾ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا ہے کہ مرفوع حدیث صرف ﴿لا یخرج لحاجۃ﴾ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے اور یہاں فرمایا ہے آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے عبدالرحمن بن اسحق کے علاوہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ یہ سنت ہے۔

(۵۷۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلَّا أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى نَفْسِهِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَالرَّاجِزُ وَفَقَهُ أَيْضًا. ہونا ہی رائج ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الا قَالَ: «لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔“ (اسے رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالْحَاكِمُ، وَالرَّاجِزُ وَفَقَهُ أَيْضًا۔ ہونا ہی رائج ہے)

حاصل کلام: صحیح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور اس میں سے ﴿لا یخرج لحاجۃ﴾ کا جملہ ہی مرفوع ثابت ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اعتکاف بہر نوع مسجد میں ہونا چاہئے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کیلئے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہئے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ روزہ شرط ہے لیکن کوئی واضح نص اس بارے میں منقول نہیں۔ تاہم رسول اللہ ﷺ سے بلاصوم اعتکاف کرنا ثابت نہیں۔ لیکن اس سے روزہ شرط ہونا لازم نہیں آتا۔

(۵۷۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ، فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَجَرِّبَهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے کچھ مردوں کو آخری ہفتہ میں شب قدر دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں تمہاری خواب کو دیکھتا ہوں جو آخری ہفتہ میں موافق آیا ہے۔ اگر کوئی اس کو تلاش کرنے والا ہو تو وہ آخری ہفتہ میں اسے تلاش کرے۔“ (بخاری و مسلم)

السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿اروا﴾ ارأء سے مبنی بر مفعول ہے۔ ﴿فی السبع الاواخر﴾ سے آخری سات دن مراد ہیں جس کی ابتداء تیس کی رات سے ہوتی ہے۔ ﴿ادی﴾ کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ ﴿تواطیات﴾ کے معنی موافقت کے ہیں۔ ﴿متحریہا﴾ جو اس کا طالب ہو۔ یہ ”التحری“ سے ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہے۔

(۵۷۶) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ: «لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعَشْرِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالرَّاجِعُ وَفَّقَهُ.

وَقَدْ اخْتُلِفَ فِي تَعْيِينِهَا عَلَى أَرْبَعِينَ قَوْلًا، أَوْ رَدَّتْهَا فِي فَتْحِ الْبَارِي.

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شب قدر کے بارے میں فرمایا ”یہ ستائیس کی رات ہے۔“ (ابوداؤد) اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ رائج ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ) شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے، اس بارے میں چالیس اقوال ہیں۔ جنہیں میں نے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفہ﴾ یعنی رائج یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نبی ﷺ کا یہ فرمان نہیں۔ البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ ﴿قد اختلف﴾ اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چالیس قول نقل کئے ہیں مگر ان میں رائج اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس، کبھی تیس، کبھی پچیس، کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو اور جن روایات میں بڑے جزم سے تعین کا ذکر ہے جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تیس کا ذکر ہے تو یہ اس لئے کہ اس سال اسی رات شب قدر تھی یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(۵۷۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَا
رَسُولَ اللَّهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيُّ
لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدَرِ، مَا أَقُولُ فِيهَا؟
قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، نُحِبُّ

الْعَفْوُ، فَاعْفُ عَنِّي». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ سِوَا ابْنِ أَبِي شَيْبَةَ. (اسے ابوداؤد کے علاوہ پانچوں نے ابی داؤد، وَصَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ. روایت کیا ہے اور اسے ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارایت﴾ آپ مجھے بتلائیں یہ ﴿اخرنی﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ای لیلۃ﴾ مفعول ہونے کے اعتبار سے ﴿ای﴾ پر نصب اور مبتداء ہونے کے ناطے ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہے۔ ﴿عفو﴾ کے عین پر زبر اور واؤ مشدود ہے۔ یعنی بہت درگزر کرنے والا، بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

(۵۷۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوسَعِيدٍ خَدْرِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَشْدُوا الرَّحَالَ (کسی کیلئے) کجاوے نہ باندھو۔ (یعنی) مسجد الحرام، میری إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، الْمَسْجِدِ اس مسجد اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ۔» (بخاری و مسلم) الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿لا تشدوا الرحال﴾ ”الرحال“ رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے اور کجاوے باندھنا سے کنایہ یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ حصول برکت و فضیلت، سفر مت کرو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ تبرک کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مختص ہے۔ البتہ دوسرے اغراض و مقاصد کیلئے سفر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ با اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف و فضل پر دال ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے، وہاں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مقدور بھر کوشش کی جائے۔



۶۔ کِتَابُ الْحَجِّ

حج کے مسائل

(۱) بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانُ مَنْ فَرَضَ
عَلَيْهِ

(۵۷۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”عمرو دوسرے عمرے تک دونوں کے مابین گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت بینہما، والحق المبرور لیس لہ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الحج﴾ کی حاء پر فتح اور کسرہ دونوں آتے ہیں، جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا اور لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف باکثرت قصد کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے اور یہ بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ﴿العمرة﴾ لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے کئے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد احرام طواف، سعی، صفا و مروہ، سر منڈانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہی اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ ﴿الحج المبرور﴾ سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کئے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب قریب ہیں، ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

نفعی تشریح: ﴿علی النساء جہاد﴾ کہ کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام مخذوف ہے اور حج و عمرہ پر جہاد کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ﴿واصلہ فی الصحیح﴾ اس کی اصل ﴿الصحیح﴾ میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے اور یہ حدیث عمرہ کے وجوب کی دلیل ہے۔

(۵۸۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَغْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَخْبِرْنِي عَنْ الْمُمْرَةِ، أَوْاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «لَا، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِعُ وَفَقَهُ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ ضَعِيفٍ. وَعَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعاً: «الْحَجُّ وَالْمُمْرَةُ قَرِيبَتَانِ».

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفہ﴾ رائج بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے انہی سے ایک صحرا نور بدو نے سوال کیا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے بلکہ اس کی سند ضعیف اور ناقابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوزی (ج ۲: ص ۱۱۳) میں دیکھی جاسکتی ہے ﴿من وجہ آخر ضعیف﴾ ایک اور ضعیف سند سے کیونکہ وہ عبد اللہ بن لہیع عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے اور ابن لہیع اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم رحمہ اللہ ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید

سے سماع بھی نہیں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ بھی حضرت زیدؓ کا قول ہے مگر سند میں انقطاع ہے۔ (سبل الخلیص) عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ رائج قول یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(۵۸۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا السَّبِيلُ؟ قَالَ: «الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِنْ سَأَلَهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضًا، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ”سبیل“ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا ”راستے کا خرچ اور سواری۔“ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر رائج اس کا مرسل ہونا ہے اور ترمذی نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں

کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما السبیل﴾ ”سبیل“ کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو وجوب حج کیلئے ”سبیل“ کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۃ ال عمران میں یوں ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (۳: ۹۷) ﴿الزاد والراحله﴾ راحلہ سے مراد سواری، خواہ وہ جانور ہو، موٹر کار ہو، بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز اور الزاد سے واپسی تک اہل و عیال کے خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(۵۸۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْبًا بِالرُّوْحَاءِ، فَقَالَ: «مَنْ الْقَوْمُ؟» قَالُوا: الْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «رَسُولُ اللَّهِ»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ أَمْرَأَةٌ صَبِيًّا، فَقَالَتْ: أَلِهَذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحاء مقام پر کچھ سواروں سے ملے تو آپ نے فرمایا تم کون ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا، ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا ”اللہ کا رسول ہوں۔“ پھر آپ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور پوچھا کیا اس کا حج ہے؟ آپ نے فرمایا ”ہاں! اس کا ثواب تجھے ملے گا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿رکبا﴾ راہ پر زبر اور کاف ساکن یہ ”راکب“ کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ ﴿بالروحاء﴾ راہ پر فتح آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿فقالوا من انت﴾

تو انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انیس رات کے وقت ملے ہوں اور وہ آپ کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انہوں نے آپ کو نہ دیکھا ہو ﴿ولکن اجر و ثواب تمہیں ملے گا اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ حج اس سے بلوغت کے بعد کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آئندہ چوتھی حدیث کے تحت آ رہا ہے۔

(۵۸۴) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الْفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَجَاءَتْ أَمْرَأَةٌ مِنْ خَنَعَمَ، فَجَعَلَ الْفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الْفَضْلِ إِلَى الشَّقِّ الْآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ قَرِيبَةَ اللَّهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الْحَجِّ أَدْرَكَتْ أَبِي شَيْخًا كَبِيرًا، لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأُحِجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے کہ قبیلہ خنعم کی ایک عورت آئی تو فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی اور نبی ﷺ فضل رضی اللہ عنہما کا منہ دوسری جانب پھیرتے تھے۔ پس اس عورت نے کہا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک حج، اللہ کا فرض ہے اس کے بندوں پر۔ میرا باپ بڑی عمر والا بوڑھا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا ”ہاں! اور یہ حجة الوداع کا واقعہ ہے۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ردیف﴾ ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو ”ردیف“ کہتے ہیں۔ ﴿خنعم﴾ خاء پر زبر اور ثاء ساکن اور عین پر زبر، یمن کے مشہور قبیلہ کا نام ہے اور اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ ﴿الشق﴾ یعنی جانب۔ آپ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کا چہرہ اس لئے پھیر دیا تاکہ شیطان انہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ ﴿حجة الوداع﴾ یہ وہ حج ہے جو نبی کریم ﷺ نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپ وفات پا گئے اور ”الوداع“ کے واؤ پر زبر ہے اس کا مصدر ”ودع توديعا“ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ کے نیچے کسرہ ہے یوں یہ موادة کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجة الوداع اس لئے رکھا گیا کہ آپ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری جس کے دور

ہو جانے کا امکان ہو، میں نیابت درست نہیں یہ شرط حج فرض کیلئے ہے نفلی حج کیلئے اس میں بلا شرط نیابت جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے اور حج بدل کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کا قربی ہی نائب بنے۔

راوی حدیث: ﴿فضل بن عباس رضی اللہ عنہ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابة الکبریٰ بنت الحارث الہلالیہ تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کیلئے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال ۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے یرموک میں شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی۔ ان کے جسم پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر تھی۔

(۵۸۵) وَعَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أَمْلِكٍ دَبْنٌ أَكُنْتُ قَاضِيَتَهُ؟ أَفْضُوا اللَّهَ، فَإِنَّهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»۔
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ قبیلہ جھینہ کی ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا: بے شک میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کر سکی اور فوت ہو گئی ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں! اس کی طرف سے حج کر، اگر تیری ماں کے ذمہ ادھار ہوتا تو کیا تو وہ قرض نہ اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿جھینہ﴾ جیم پر پیش، ہا پر زیر۔ یہ تغیر ہے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے یہ قطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔ ﴿حجی﴾ امر مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ ”دین“ وال پر زیر یعنی قرض اور اسے دین اس لئے کہا گیا تاکہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

(۵۸۶) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الْحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى»۔
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے اور جو غلام حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔“ (اسے ابن ابی شیبہ اور

حدیث موقوف ہے)

(۵۸۷) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «لَا يَخْلُونَ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أَمْرًا تَنِي خَرَجْتُ حَاجَةً، وَإِنِّي اكْتَسَبْتُ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «انْطَلِقِي فَحُجِّ مَعَ امْرَأَتِكَ». مَتَّقِ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

نغوی تشریح: ﴿لَا يَخْلُونَ﴾ یہ نون تاکید کے ساتھ ”خلوة“ سے نھی کا صیغہ ہے ﴿ذو محرم﴾ میم اور راء پر زیر اور ان کے مابین حاء ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے۔ جیسے باپ، بیٹا، بھائی وغیرہ ﴿اکتنب﴾ باب افعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے۔ فلاں غزوہ کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کیلئے یہ بھی فی الجملہ ”من استطاع الیہ سبیلاً“ کے حکم میں شامل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کیلئے تنہائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کو تنہا محرم کے بغیر سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض اولہ کی بنا پر بوڑھی، قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس کے خلاف ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں۔ البتہ

نفلی حج ہو تو عورت کو بہر نوع اجازت لے کر جانا چاہئے۔

(۵۸۸) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: لَتَبَيْتِكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ؟» قَالَ: أَخِي، أَوْ قَرِيبِي، قَالَ: «حَبَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَالزَّاجِلِيُّ عِنْدَ أَحْمَدَ وَفُلَّه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے سنا، وہ کہہ رہا تھا: ”شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپ نے فرمایا ”شبرمہ کون ہے؟“ اس نے کہا میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ تو آپ نے فرمایا ”تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا“ پہلے اپنی طرف سے کر کر پھر شبرمہ کی طرف سے کر لیتا۔“ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور

امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا رائج ہے)

لغوی تشریح: ﴿شبرمہ﴾ شین اور راء پر پیش ہے ان کے مابین باء ساکن۔ ﴿او قریب لسی﴾ یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کہا یا کہ وہ میرا قریبی ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر کسی نے خود حج نہیں کیا تو وہ دوسرے کی طرف سے نیابت نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کسی کی جانب سے حج کی نیت سے احرام باندھا ہو تو وہ اسی کی جانب سے قرار پائے گا۔ دوسرے کی طرف سے نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے اس کے مرفوع ہونے کی نفی کی ہے مگر امام احمد رحمہ اللہ سے اس کی تصحیح بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ ابن حبان رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے مرسل کہا ہے۔ بہر نوع اگر اسے موقوف بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کسی بھی صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ حج بدل میں نائب پہلے خود حج کرے پھر نیابت کرے۔

(۵۸۹) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ»، فَقَامَ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُمْهَا لَوَجَبَتْ. الْحَجُّ مَرَّةً، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَضْلَهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے“ تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کیا ہر سال، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ نے فرمایا ”اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار ہے پس اس سے جو زائد ہے وہ نفل ہے۔“ (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا

ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی

(روایت سے ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے اس سے زائد نفل ہے اور اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر یہ نہیں کہتا تا کہ امت پر مشقت نہ پڑ جائے۔ اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر آنحضرت ﷺ بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اسے درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ آنحضرت ﷺ کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول و عقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

راوی حدیث: ﴿اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ﴾ یہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جو وفد بنو تمیم کا آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس میں شامل تھے اور مؤلفہ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

(احرام کے) میقات کا بیان

۲ - باب المواقیب

(۵۹۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتْ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحَفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ، هُنَّ لَهُنَّ، وَلَمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ ذُوْنَ ذَلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أُنْشَأَ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ، شام والوں کیلئے جحفہ، نجد والوں کیلئے قرن منازل اور یمن والوں کیلئے یلملم کو احرام باندھ کر نیت کرنے کی جگہیں مقرر کیا ہے اور یہ میقاتیں ان کیلئے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کیلئے بھی، جو دوسرے شہروں سے ان کے پاس سے حج یا عمرہ کے ارادہ سے گزریں اور جو کوئی ان میقاتوں کے ورے (اندروں) ہو وہ جہاں سے چلے وہیں سے (احرام باندھے) یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب المواقیب﴾ یہ میقات کی جمع ہے۔ وہ ہے جو ایک عبادت کے وقت اور جگہ کی حد بنتی کرتا اور متعین کرتا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنہیں شارع علیہ السلام نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ ﴿وقت﴾ یعنی

احرام کیلئے میقات مقرر کیا اور یہ توقیت سے تحدید و تعین کے معنی کیلئے ہے۔ ﴿ذوالحلیفہ﴾ حاء پر ضمہ، تصغیر ہے، جو مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر ہے جو آج کل ”بئر علی“ کے نام سے مشہور ہے۔ ”الحجفہ“ جیم پر پیش اور حاء ساکن، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل (مرحلہ ایک دن کی مسافت کے برابر فاصلے کو کہتے ہیں) پر اور مدینہ طیبہ سے پونے چھ مراحل پر واقع ہے اس کا نام مہیجہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہا لے گیا جس کی بنا پر اسے حجفہ کہا جانے لگا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے۔ اسی لئے آج کل اس سے کچھ پہلے ”راغ“ مقام سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ ﴿قرن المنازل﴾ اسے ﴿قرن الثعالب﴾ بھی کہا گیا ہے یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمکدار پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ہے۔ ﴿یللم﴾ یاء اور دونوں لام پر فتح ہے اور درمیانی میم ساکن، جو مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ہن﴾ یعنی یہ میقات اور مقامات ﴿لہن﴾ ان مذکورہ اہل بلدان کے لئے ہیں۔ ﴿ممن اراد الحج والعمرة﴾ جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو حج اور عمرہ کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ﴿ومن كان دون ذلك﴾ اور جو اس کے ورے ہو یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہو تو وہ احرام باندھے ﴿من حيث انشاء﴾ جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی سے ہی احرام باندھے۔ ﴿حتى اهل مكة من مكة﴾ یہاں تک کہ اہل مکہ مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرہ کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں جو حکماً اہل مکہ میں سے ہیں وہ بھی وہیں احرام باندھیں اور آج کل جو عمرہ کے احرام کیلئے میقات سے باہر جا کر احرام باندھنے کا طریقہ چل نکلا ہے، اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۵۹۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتْ اہل عراق کیلئے ذات عرق کو۔ میقات مقرر کیا (اسے لِأَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ۔ رَوَاهُ أَبُو الْوَدَّادُ اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم داؤد و التَّيَمِيُّ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی جابر، إِلَّا أَنَّ رَوَاهُ شَكٌّ فِي زَعْمِهِ۔ نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے)

وَفِي صَحِيحِ الْبُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔ احمد، ابوداؤد اور ترمذی

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ نبی ﷺ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے مشرق والوں کیلئے عقیق کو میقات مقرر فرمایا

وَقَتَّ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيقَ. تھا۔“

لغوی تشریح: ﴿ذات عرق﴾ عین کے نیچے کسرہ ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور وہ قرن منازل کے شمال میں اس کے برابر واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ ﴿وفی البخاری.....﴾ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق حضرت عمرؓ نے میقات مقرر کیا۔ تو یہ بظاہر حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت کے خلاف ہے اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ ﴿العقیق﴾ یہ ”ذات عرق“ سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”ذات عرق“ کی حدود میں داخل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ہر وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں اور اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ ”ذات عرق“ میقات واجب ہے اور ”عقیق“ میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

حاصل کلام: خوب یاد رہے کہ وادی ”مر الظہران“ جو آج کل وادی فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے، وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب جدہ کے قریب بحر احمر کے مغربی جانب جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو ”قرن المنازل“ کہتے ہیں اور دوسرا شمالی کنارہ ضریہ کے قریب ہے جسے ”ذات عرق“ کہتے ہیں۔ جہاں سے اہل عراق، اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے محاذات ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا جب وہ نبی ﷺ کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو شخص ان پانچوں میقات میں کسی ایک میقات پر سے نہ گزرے تو اسے چاہئے کہ وہ جو نئے میقات کے برابر سے گزرے۔ وہاں احرام باندھ لے۔ حضرت عمرؓ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ سے ہی ذات عرق کو اہل عراق کیلئے مقرر کیا تھا اور تمام علماء اس اصول و ضابطہ پر متفق ہیں۔ محاذات کا مفہوم یہ ہے کہ جو میقات کسی کے دائیں یا بائیں جانب ہو اور وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا۔ لہذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہو گا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے برابر کا خط ہے۔

اس لئے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا اس لئے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور ان کو ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے لہذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستے پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز حج کرنے کیلئے جاتے ہیں ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات پر سے گزرے ہیں اور نہ ہی کسی میقات کے برابر سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں ہے جبکہ ان کے اور حدود میقات کے مابین تقریباً ایک سو میل کی مسافت ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے منبج کی طرف ذوالحلیفہ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے جا رہا ہو۔ بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات کے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات کے پیچھے ہوگا اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پر جا کر نہ اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

۲ - بَابُ وَجْهِهِ الْإِحْرَامِ وَصَفَتُهُ احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(۵۹۲) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ وَغُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ وَأَهَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُومِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوا حَتَّى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مَتَّقْ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حج اور عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے حج کیلئے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جنہوں نے عمرہ کیلئے لبیک کہا تھا وہ حلال ہو گئے اور جنہوں نے حج کیلئے لبیک کہا یا حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب وجوه الاحرام و صفتہ﴾ الوجوه وجہ کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام

مراد ہیں۔ اور وہ حج یا عمرہ یا دونوں ہیں اور صفت سے مراد محرم کی وہ کیفیت ہے جسے وہ حالت احرام میں اختیار کرتا ہے۔ ﴿خرجنا﴾ ہم نکلے۔ حج کیلئے نبی کریم ﷺ کی معیت میں نکلنا ہفتہ کے روز نماز ظہر کے بعد تھا جبکہ ذی القعدہ کے پانچ دن ابھی باقی تھے۔ ﴿حجۃ الوداع﴾ حجۃ الوداع دس ہجری میں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا اور اسے حجۃ الوداع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہا تھا۔ ﴿اہل بعمرة﴾ یعنی صرف عمرہ کا احرام باندھا ایسے شخص کو متمتع کہتے ہیں۔ ﴿اہل بحج و عمرہ﴾ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ ایسے شخص کو ”قارن“ کہتے ہیں اور جس نے صرف حج کیلئے احرام باندھا ہو اسے ﴿مفرد﴾ کہتے ہیں اور ﴿الاہلال﴾ بلند آواز کو کہتے ہیں اور اس سے مراد احرام باندھنے کے بعد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے۔ ﴿فحل﴾ یعنی وہ حلال ہو گیا اور یہ تب ہوتا ہے جب بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں یا کٹوائے جاتے ہیں اور احرام کھول دیا جاتا ہے۔ ﴿یوم النحر﴾ نحر یعنی قربانی کا دن اور وہ دس ذی الحجہ ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تہاجج کا احرام باندھا تھا یعنی حج مفرد کیا تھا لیکن دوسرے بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ قارن تھے اور حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا تھا اور یہی بات صحیح ہے اور اقسام حج میں یہی قسم سب سے افضل ہے جس کی تفصیل دو بڑی بڑی شروح احادیث میں موجود ہے اور جو شخص ”مفرد“ ہوتا ہے تو وہ صرف قربانی کے دن ہی حلال ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم کی ان روایات کے بھی مخالف ہے جن میں آپؐ نے جن صحابہ کرامؓ کے پاس حدی یعنی قربانی نہ تھی انہیں فرمایا تھا کہ تم حج کو عمرہ بنا لو۔ عمرہ کو مکمل کر کے حج کا احرام مکہ سے باندھ لو۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دراصل ان صحابہ کرامؓ کے متعلق ہے جن کے پاس قربانی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج قرآن، حج تمتع، حج افراد۔ ان تینوں میں سے افضل کونسا حج ہے؟ عموماً اہل حدیث اور احناف حج قرآن کو افضل قرار دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے یہی حج پسند کیا۔ اس میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر نفیس بحث کی ہے۔ مگر امام احمد رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ حج تمتع کو افضل کہتے ہیں کہ اس میں سہولت ہے اور آنحضرت ﷺ نے ایک مرحلہ پر اس کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور بعض حضرات حج افراد کو افضل قرار دیتے ہیں مگر پہلا قول ہی دلائل کے اعتبار سے بوجہ رائج ہے۔

۴ - باب الإِحْزَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ. احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان

(۵۹۳) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ حُضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول
تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ: مَا أَهْلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نے نہیں لبیک پکارا مگر صرف مسجد کے

اللہ ﷻ إِلَّا مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . پاس۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الاحرام﴾ احرام کا باب، یہ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔ ”احرام“ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ ﴿الامن عند المسجد﴾ مگر صرف مسجد کے پاس۔

حاصل کلام: مسجد سے مسجد ذوالخليفة مراد ہے۔ جس وقت آپؐ اپنی اونٹنی پر سیدھے کھڑے ہوئے تھے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ”بیداء“ کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے تین بار لبیک پکارا تھا۔ جب آپؐ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں۔ یعنی آپؐ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپؐ نے لبیک کہا اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپؐ ”بیداء“ کی چوٹی پر چڑھے تو آپؐ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپؐ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنہوں نے وہاں آپؐ کے احرام کا مشاہدہ کیا انہوں نے اسی کا ذکر کیا اور جب آپؐ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر باواز بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اب آپؐ نے احرام باندھا ہے۔ پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے یہاں سے احرام باندھا ہے گویا ہر فرقہ نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ اس لئے ان روایات میں کوئی تاقض نہیں۔

(۵۹۴) وَعَنْ خَلَادِ بْنِ السَّائِبِ ، خَلَادِ بْنِ سَائِبٍ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : «أَتَانِي جَبْرِيلُ ، فَأَمَرَنِي أَنْ أَمُرَ أَصْحَابِي ، أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالْإِهْلَالِ . رَوَاهُ الْحَنَسَةُ . بلند کریں۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَّانَ . اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے لبیک کہنی چاہئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابہ کرامؓ اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علماء کرامؓ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہئے۔ (السل)

راوی حدیث: ﴿خلاد﴾ کی خاء پر زبر اور لام مشدود۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سوید انصاری خزرجی ہیں۔ ثقہ تابعی ہیں جنہوں نے انہیں صحابی کہا انہیں وہم ہوا۔

﴿ابیہ﴾ ان کے والد سائب رحمہ اللہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابو سلمہ ہے۔ اور وہ بدر میں شہید

ہوئے۔ غلام عمد معاویہ رضی اللہ عنہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمن کا عامل مقرر کیا اور اے میں فوت ہوئے۔

(۵۹۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ نَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ ثَابِتِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ مَرْوَى هِيَ كَهْ نَبِي اللَّهِ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ كَرِيمٌ مَلِيحٌ لَمْ يَلْبَسْ أَحْرَامَ بَانِدِ هُنَّ كَ وَتِ كَ بَرُ لَإِهْلَإِلِهِ، وَاعْتَسَلَ. رَوَاهُ الشَّرْمِذِيُّ، أَتَارَے اور غَسَلَ كَـ (اے ترمذی نے روایت کیا ہے وَحَنَّهُ۔ اور اے حَسَنَ كَـ)

حاصل کلام: امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر امام عقیلی رضی اللہ عنہ نے اے ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اس لئے احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے۔

(۵۹۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ تَعَالَى عَنْهُمْ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ سُبُلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «أَنْ يَلْبَسَ الْقَمِيصَ، وَلَا الْعَمَامَةَ، وَلَا السَّرَاوِيلَ، وَلَا الْبُرَانِسَ، وَلَا الْخِفَافَ، إِلَّا أَحَدًا لَا يَجُزُّ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ، وَلَا تَلْبَسُوا رَنَگَ كِ خُشْبُو دَارِ بُؤِيْ) لَگَا هُوَا هُو۔“ (بخاری و مسلم شَيْئًا مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الرِّعْفَانُ، اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں) وَلَا الْوَرَسُ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَالْفَقُّ لِمُسْلِمٍ۔

لغوی تشریح: ﴿العمامة﴾ یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے اور ﴿السراويل﴾ چادر کی جگہ ٹانگوں میں پہنی جاتی ہے۔ جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ﴿البرانس﴾ یہ برنس کی جمع ہے باء اور نون پر ضمہ اور راء ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ ﴿الخفاف﴾ خاف کے نیچے زیر۔ خف کی جمع ہے یعنی موزے۔ ﴿من الكعبين﴾ کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران ٹخنے ننگے رہیں اور ”کعب“ سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پٹلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ﴿الودس﴾ واؤ پر زبر اور راء ساکن زرد رنگ کی خوشبودار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لئے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

(۵۹۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَطِيبُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَنْ يَطُوفَ بِالْبَيْتِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں رسول اللہ ﷺ کو احرام کے وقت اور احرام کھولنے کے وقت خوشبو لگاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ آپ بیت اللہ کا طواف کریں۔ (بخاری و مسلم)

نغوی تشریح: ﴿اطیب﴾ یہ تطیب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے کہ اس میں خوشبو لگاتی تھی۔ ﴿لاحرامہ﴾ یعنی احرام پہننے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کی حالت میں خوشبو لگانا حرام ہے۔ ﴿قبل ان یطوف بالبيت﴾ بیت اللہ کے طواف سے پہلے، اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار، قربانی اور حلق یعنی سرمنڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

(۵۹۸) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”احرام والا نکاح نہ کرے“ قَالَ: «لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلَا أَوْ لَا يَنْكِحُ»۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ﴿لا ینکح المحرم﴾ یعنی خود نکاح نہ کرے ﴿ولا ینکح﴾ یہ پہلے نکاح سے ہے یعنی نہ کسی دوسرے کو نکاح دے۔ ﴿ولا ینخطب﴾ یہ خطبہ خاء کی زیر سے ہے یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کیلئے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا یا کسی کو نکاح دینا کسی کو اپنے لئے یا کسی اور کیلئے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۵۹۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کے جنگی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ غَدَهٍ کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انہوں نے صَبِيدِ الْحِمَارِ الْوَحْشِيِّ وَهُوَ غَيْرُ احرام نہیں باندھا تھا، مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مُحْرِمٌ - قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا اور وہ احرام والے تھے لِأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ - : هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ طرف کسی چیز سے اشارہ کیا تھا؟“ انہوں نے کہا بَشِيرٍ؟ قَالُوا: لَا، قَالَ: «فَكُلُوا مَا نَحْسُ، نَحْسُ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ جو بیچ گیا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی قصۃ الحمار الوحشی﴾ جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصد میں، اس قصہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابو قتادہؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کہیں نکلے تھے مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابو قتادہؓ نے احرام نہیں باندھا تھا مگر ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جب وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظر انداز کر دیا مگر جب ابو قتادہؓ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاشی پکڑاؤ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ابو قتادہؓ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابو قتادہؓ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہو گئے۔ بالآخر جب وہ آنحضرت ﷺ سے جا ملے تو آپؐ نے یہ سارا ماجرا عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی اعانت نہ کی ہو اور نہ ہی

(۶۰۰) وَعَنْ الصَّنْبِ بْنِ جَثَامَةَ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ أَهْدَى لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ حِمَارًا وَخَشِيًا، وَهُوَ بِالْأَنْوَاءِ أَوْ بَوْدَانَ، فَرَدَّهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلَّا أَنَا حُرْمٌ». مَقْفَرٌ عَلَيْهِ.

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک وحشی گدھا بطور تحفہ بھیجا اور آپؐ ”ابواء“ یا ”بودان“ مقام پر تھے تو آپؐ نے وہ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا کہ ”ہم نے یہ اس لئے واپس کیا کہ ہم احرام والے ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

راوی حدیث: ﴿صعب بن زہرہ﴾ کی صادر زہرہ اور عین ساکن۔ بن ﴿جشامہ﴾ جیم پر زہرہ اور ”ما“ مشدّد، اللبیثی یث قبیلہ سے تھے۔ ودان اور الابواء میں رہتے تھے۔ خلافت صدیقی میں ان کا انتقال ہوا مگر بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمان تک زندہ رہے۔

(۶۰۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَے مروی ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جانوروں میں سے پانچ سب کے سب
 ۞: خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ شَرِيرٌ ہیں۔ حل اور حرم (سب جگہوں پر) مار دیئے
 قَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: جائیں اور وہ ہیں بچھو، چیل، کوا، چوہا اور کٹ کھانے
 الْعَقْرَبُ، وَالْحِدَاةُ، وَالْعُرَابُ، وَالْاَكْتَا۔“ (بخاری و مسلم)
 وَالْفَأْرَةُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

لغوی تشریح: ﴿الدواب﴾ باء پر شد ہے اور دابة کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا
 ہے پھر عموماً اس کا استعمال چوپائے جانوروں پر ہونے لگا۔ ﴿قواسق﴾ فاسقہ کی جمع اور ان کا فسق اور
 شران کی خباثت اور کثرت نقصان کی بنا پر ہے۔ ﴿الحداة﴾ حاء کی کسر کے ساتھ ”عسبة“ کے وزن
 پر وہ خمیٹ جانور جسے چیل کہتے ہیں۔ ﴿العقرب﴾ یعنی بچھو اور اس میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ ﴿
 والکلب العقور﴾ عین پر زبر ﴿عقر﴾ سے ہے جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں اور اس سے
 مراد ہر چیز نے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے۔ جیسے شیر، چیتا، بھیرا وغیرہ۔

(۶۰۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بے شک نبی ﷺ نے سیگی لگوائی جب کہ آپ
 احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری و مسلم) اِحْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔

(۶۰۳) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ
 إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَالْقَمْلُ يَتَنَازَرُ عَلَى وَجْهِي، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أَرَى
 الْوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرَى، أَنْتَجِدُ شَاةً؟» قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَصُمْ ثَلَاثَةَ
 أَيَّامٍ، أَوْ أَطْعِمِ سِتَّةَ مَسَاكِينٍ، لِكُلِّ مَسْكِينٍ نِصْفُ صَاعٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔
 حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے
 رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور جو میں
 میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا ”میرا
 یہ خیال نہ تھا کہ تم کو بیماری نے اس حالت کو پہنچا
 دیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں، کیا تیرے پاس بکری
 ہے؟“ میں نے عرض کیا کہ: نہیں۔ آپ نے فرمایا
 ”تین دن روزہ رکھ یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع ہر
 مسکین کے حساب سے کھانا دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حملت﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ ﴿القمل﴾ قاف پر زبر اور میم
 ساکن جنہیں جو میں کہتے ہیں۔ ﴿یتناثر﴾ یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں
 اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ انہیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ ”ما کنت اری“ اری کے حمزہ پر پیش
 صیغہ مجہول کی وجہ سے یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ ﴿الوجع﴾ یعنی تکلیف ﴿ما اری﴾ حمزہ پر زبر۔ دیکھنے
 کے معنی میں۔ یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ﴿انتجد شاة﴾ یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپ
 نے انہیں سرمندوانے کا حکم دیا اور اس کے کفارہ کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کا روزہ رکھنے

کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ﴾ عجرہ کے عین پر پیش اور جمیم ساکن، یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ ”البسلی“ سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۶۰۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَتْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ تَمَّانَ قَبْلِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةٌ مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلَا يَنْفِرُ صَيْدُهَا، وَلَا يُخْتَلَى شَوْكُهَا، وَلَا يَحِلُّ سَاقِطُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرِينَ»، فَقَالَ الْعَبَّاسُ: إِلَّا الْإِذْخَرَ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلَّا الْإِذْخَرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کی فتح دی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی حمد و ثنائیاں کی اور فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی پر حلال نہ تھا مگر میرے لئے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کیلئے حلال نہیں ہو گا یعنی نہ اس کا شکار بھگایا جائے، نہ اس کا کوئی کانٹے دار درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس کی گری ہوئی چیز سوائے شناخت کرنے والے کے کسی پر حلال ہے اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے وہ دو بہتر سوچے ہوئے کاموں میں سے ایک کام میں اختیار رکھتا ہے۔“ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! ازخر (ایک قسم کی گھاس) کے سوا، کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور چھتوں میں رکھتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا ”سوائے ازخر کے“ (یعنی اسے کانٹے کی اجازت ہے۔)“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حبس﴾ یعنی روکا اور منع کیا۔ ﴿الفیل﴾ ہاتھی جسے ابیرہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کیلئے لے کر آیا تھا۔ جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ ”وسلط“ یہ تسلط سے ہے یعنی غلبہ کے معنی میں ﴿ساعة من نہار﴾ دن کی ایک گھڑی اور اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ ﴿لا ینفر﴾ صیغہ مجہول تنفیر سے ہے یعنی بھگایا نہ جائے ﴿ولا یختلی﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی نہ کاٹا جائے۔ ﴿ساقطہا﴾ یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ ﴿اللمنشد﴾ یہ انشاد

سے ہے یعنی اس کی گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے البتہ اس کو اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے تاکہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ ﴿قتیل﴾ یعنی مقتول۔ ﴿فہو﴾ یعنی مقتول کا ولی۔ ﴿بخیر النظرین﴾ یعنی ولی کو دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے، چاہے تو قصاص لے یا دیت وصول کرے۔ ﴿الا الذخیر﴾ یعنی آپؐ یہ فرمائیں ”الا الذخیر“ ذخیر کے سوا کہ اس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ ذخیر کے معنی خزانہ اور خزانہ کے نیچے زیر ہے اور ذال ساکن۔ یہ لمبے پتوں والی خوشبو دار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں بسنے والوں کو قتل کرنا حرام ہے جو اس میں داخل ہو گیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹی کاٹنا حرام ہیں۔ اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کیلئے اٹھانی حرام ہے۔

(۶۰۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدٍ بْنِ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ؛ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمَدَّهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبد اللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تحقیق ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی اور اس کے بسنے والوں کیلئے دعا کی اور بے شک میں نے مدینہ کو حرمت دی۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کے صاع اور اس کے مد کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی طرح دعا کی جو مکہ میں بسنے والوں کے متعلق تھی۔“

(بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿حرم مکہ﴾ یہ تحریم سے ہے یعنی اس کو حرم بنایا اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا شکار حرام ہے۔ اس کے درخت کاٹنے حرام ہیں اور وہاں بدعات کا ارتکاب حرام ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی کا مفہوم یہ ہے کہ دعا سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان اللہ حرم مکہ کہ اللہ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے۔

(۶۰۶) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «الْمَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَبْرٍ إِلَى نُورٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مدینہ حرم ہے عیر سے نور کے درمیان۔“

لعوی تشریح: ﴿عیر﴾ عین کے نیچے زیر اور یاء ساکن۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

کے جنوب مغرب میں قباء واقع ہے ﴿نور﴾ ثناء پر زیر، واؤ ساکن، یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے ”ما بین عیر واحد“ کہ عیر اور احد کے درمیان یعنی ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ جبل ثور کم کمرہ میں بھی ہے۔ اس میں ہجرت کے موقع پر آپؐ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے ”اذھما فی الغار“ یہاں سے یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے مثلاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ شرفاً غرباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے کہ ”انھا حرام ما بین لابتیھا“ کہ دو حروں کے درمیان جو کچھ ہے حرام ہے اور اس سے مراد ایک ”حرۃ و برہ“ ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا حرۃ و اقم جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے یوں چاروں سمت حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

۵ - باب صِفَةِ الْحَجِّ وَذُخُولِ حَجِّ كَاطَرِيقِهِ اور مکہ میں داخل ہونے کا مَنَکَہ

بیان

(۶۰۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الْحُلَيْفَةِ قَوْلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «اغْتَسِلِي، وَاسْتَنْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي»، وَصَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ الْقُصَوَاءَ، حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى الْبَيْدَاءِ، أَهَلَ بِالتَّوْحِيدِ: «لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ، لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ، لَا شَرِيكَ لَكَ»، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا الْبَيْتَ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلَاثًا، وَمَشَى أَرْبَعًا، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچہ جنا۔ آپؐ نے فرمایا ”غسل کر اور کسی کپڑے سے لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔“ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (آپؐ کی اونٹنی کا نام) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپؐ بیداء کے برابر آئے تو آپؐ نے توحیدی تلبیہ پکارا ”حاضر ہوں“ اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بلا شک سب تعریفیں اور انعامات تیرے ہیں۔ بادشاہت بھی تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔“ یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ رکن (اسود) کو آپؐ نے بوسہ دیا، تین بار رمل کیا اور چار بار معمول کے مطابق چلے۔ پھر آپؐ مقام ابراہیم پر

الرُّكْنِ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنْ
الْبَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ
الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ
شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ»،
فَرَفَعِي الصَّفَا حَتَّى رَأَى الْبَيْتَ،
فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللَّهَ، وَكَبَّرَهُ،
وَقَالَ: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ، لَا
شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ،
وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ،
وَهَزَمَ الْأَخْزَابَ وَحْدَهُ»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ
ذَلِكَ قَالٍ مِثْلَ هَذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ
نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى الْمَرْوَةِ، حَتَّى
إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِي بَطْنِ الْوَادِي
سَعَى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَشَى إِلَى
الْمَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ
عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ:
فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى
مِنَى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا
الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ
وَالْفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيلًا حَتَّى
طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى
عَرَفَةَ، فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ
بِمِرَّةٍ، فَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ
الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقُضَاءِ فَرُجِلَتْ لَهُ،
فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي، فَخَطَبَ النَّاسَ،
ثُمَّ أَدَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ،

آئے اور نماز پڑھی پھر رکن (حجر اسود) کی طرف
واپس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر مسجد حرام کے
دروازہ سے صفا کی طرف نکلے جب صفا کے نزدیک
پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ ”تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ
کی نشانیوں میں سے ہیں۔“ (پھر فرمایا) ”میں شروع
کرتا ہوں (سعی کو) اس مقام سے کہ جہاں سے اللہ
نے شروع کیا ہے۔“ پھر صفا پر چڑھے۔ یہاں تک کہ
آپؐ نے بیت اللہ کو دیکھا۔ پھر قبلہ رخ ہوئے اور
اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا ”اللہ کے
سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک
نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر
چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے
اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار
کی جماعت کو اکیلے اسی نے شکست دی۔“ پھر اس
کے درمیان تین بار دعا کی۔ پھر صفا سے اترے اور
مروہ کی طرف گئے۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے
دونوں پاؤں وادی کے نشیب میں پڑے تو دوڑے
یہاں تک کہ آپؐ نشیب سے اوپر چڑھے اور مروہ
کی طرف چلے۔ مروہ پر وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔
پھر جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ
ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذی الحج) ہوا تو لوگ منیٰ
کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار تھے پھر
وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز پڑھی۔
پھر تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورج نکل آیا
تو وہاں سے روانہ ہوئے اور مزدلفہ سے گزرتے
ہوئے عرفات میں پہنچے تو خیمہ میں اترے جو آپؐ

ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَوْقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقُضْوَاءَ إِلَى الصَّخْرَاتِ، وَجَعَلَ جَبَلَ الْمُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيلاً، حَتَّى إِذَا غَابَ الْقُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَقَّ لِلْقُضْوَاءِ الزَّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيبُ مَوْرِكَ رَحْلِهِ، وَيَقُولُ بِيَدِهِ الْيُمْنَى: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَسَكِنَّةً، أَلَسَكِنَّةً»، وَكُلَّمَا أَتَى جَبلاً أَرْخَى لَهَا قَلِيلاً حَتَّى تَضَعَدَ، حَتَّى أَتَى الْمُرْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الْفَجْرُ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى الْمَشْعَرَ الْحَرَامَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسَّرٍ، فَحَرَّكَ قَلِيلاً، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيقَ الْوُسْطَى الَّتِي تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِي

کیلئے نمہ میں لگایا گیا تھا۔ پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپ سوار ہو کر وادی کے درمیان میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا پھر اذان دلوائی پھر اقامت کھلوائی تو نماز ظہر ادا کی پھر اقامت کھلوائی تو عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی۔ پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور راہ چلنے والوں کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلہ کی جانب کر لیا۔ پھر آپ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ سورج غروب ہونے لگا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی حتیٰ کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا پھر آپ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ آپ نے قصواء کی باگ اتنی تنگ کر رکھی تھی کہ اس کا سر آپ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے ”اے لوگو! تسکین و اطمینان اختیار کرو“ اور جب بھی آپ کسی ٹیلے پر آتے تو باگ تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے کہ وہ اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی۔ پھر لپٹ گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر سوار ہو کر مشعر حرام پر آئے۔ پس آپ قبلہ رو ہوئے دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ آپ وہاں اچھی طرح

عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ سَفِيدٍ ظَاهِرٍ هُوْنَ تَكَ تَهْرُءِ رَهْ پھر سورج نکلنے
حَصَبَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ سے پہلے واپس ہو کر وادی محسر کے نشیب میں آگئے
مِنْهَا، مِنْ حَصَى الْخَذْفِ، رَمَى تُو سُواری کو کچھ تیز کر دیا۔ پھر درمیانی راستہ پر چلے جو
مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، ثُمَّ انْصَرَفَ اِلٰی جمرہ کبریٰ (بڑا شیطان) پر پہنچتا ہے پھر آپؐ اس جمرہ پر
الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللّٰهِ آئے جو درخت کے پاس ہے تو اسے سات کنکریاں
بِطَلْحٍ فَأَفَاضَ اِلٰی الْبَيْتِ، فَصَلَّى وادی کے نشیب سے ماریں، ہر کنکری کے ساتھ اللہ
بِمَكَّةَ الظُّهْرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُّطَوَّلًا۔ اکبر کہتے تھے، ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیے

کے دانے) کے برابر تھی۔ پھر آپؐ قربان گاہ کی طرف
گئے اور وہاں قربانی کی پھر رسول اللہ ﷺ سوار
ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر مکہ
میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان
کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اسماء بنت عمیس﴾ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو
بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ ﴿واستغفری﴾ یہ ”استغفار“ سے امر کا صیغہ ہے جس کے
معنی ہیں لگٹو کسنا اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز یا (رسی یا ازار وغیرہ) بند باندھ لیتی ہے پھر
ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ ﴿واحرمی
احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ ﴿القصواء﴾ قاف
پر زیر اور صا ساکن، اس کے اصل معنی تو کان کٹا ہوا، کے ہیں مگر یہاں یہ آنحضرت
ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ ﴿البيداء﴾
در اصل بیابان جگہ جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ اسے ”البيداء“ کہتے ہیں مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب
مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ ﴿اهل﴾ اہلال سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند
کیا۔ ﴿بالتوحيد﴾ یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لا شریک کا ذکر کیا جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں
شریکہ کلمات بھی کہتے تھے۔ ﴿لبیک﴾ لبی کا مصدر ہے جب ”لبیک“ کہے کا تو یہ مصدری معنی میں
منسوب ہوگا اور اس کا عامل محذوف ہوگا اور مکرر ”لبیک“ سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں
حاضر ہوں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ یعنی آپ کی اطاعت پر قائم۔ آپ کی اطاعت پر قائم ہوں اور
یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا، قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ
در اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حج کا جواب ہے۔ ﴿ان الحمد﴾ حمزہ کے نیچے زیر ہے جملہ
مستأنفہ کی بنا پر مگر تغلیل کی صورت میں اس پر زیر آئے گی۔ ﴿استلم الركن﴾ رکن یعنی حجر اسود

پر ہاتھ رکھا اور اس کا بوسہ لیا۔ ﴿فرمل﴾ یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ ﴿فلاٹا﴾ یعنی سات میں سے تین چکر یوں دوڑ کر پورے کئے۔ ﴿ومشی اربعاً﴾ اور باقی چار حسب عادت چل کر پورے کئے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں نیز اسے طواف دخول، طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ ﴿مقام ابراہیم﴾ وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خود بخود اوپر ہو جاتا تھا۔ ﴿فصلی﴾ پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکفرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد پڑھی۔ ﴿من الباب﴾ یعنی الصفا کا معروف دروازہ۔ ﴿دنا﴾ قریب ہوئے۔ ﴿شعائر﴾ یہ شیعرة کی جمع ہے یعنی علامت اور یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انہی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ ﴿ابدا بما بدا اللہ﴾ یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور مروہ کا بعد میں ﴿فرقی﴾ بل السلام میں ہے کہ قاف پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی۔ یعنی چڑھے ﴿انجوز وعده﴾ یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبہ کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ ﴿نصر عبده﴾ اپنے بندے کی مدد کی۔ بندہ سے خود آپ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ﴿وہم الاحزاب﴾ یہ حزب کی جمع ہے اس کے معنی جماعت اور لشکر ہے۔ یعنی ان کے لشکر کو ختم کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ ﴿ثم دعابین ذلک﴾ یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ ﴿ثلاث مرات﴾ تین مرتبہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپ نے یہ ذکر تین بار کیا۔ ﴿حتی اذا انصب﴾ یہ انصباب سے ہے یعنی وادی میں نیچے اترے۔ ﴿حتی اذا صعد﴾ یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی، مگر مصنف رحمہ اللہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ ﴿یوم الترویہ﴾ ثناء پر زبر راء ساکن اور واؤ کے نیچے زیر اور یاء مخفف یہ مصدر ہے۔ "ارواء" یعنی پینے کے معنی میں اور "یوم الترویہ" ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی دن حجاج میدان عرفات کی ضرورت کیلئے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ﴿توجهوا﴾ یعنی انہوں نے قصد کیا اور روانہ ہو گئے۔ ﴿فصلی بھا﴾ یعنی مٹی میں پیچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا ﴿ثم مکث قلبلاً﴾ یعنی نوزی الحج کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ ﴿فاحجاز﴾ یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے ﴿حتی اتی عرفہ﴾ یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ ﴿القبۃ﴾ قاف پر پیش، چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ ﴿بنمرۃ﴾ نون پر زبر، میم کے نیچے زیر اور راء پر زبر میدان عرفات سے کچھ پہلے معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں۔ ﴿فرحلت﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ ترحیل سے ہے یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ ﴿فاتی بطن الوادی﴾

اس وادی سے مراد وادی عرنہ ہے جس کے عین پر پیش راء پر زبر اور اس کے بعد نون۔ وادی عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ﴿الموقف﴾ قاف کے نیچے زیر یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿الی الصخرات﴾ پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ ﴿حبل المشاة﴾ حاء کے اوپر زبر اور باء ساکن اور مشاة کی میم پر پیش "ماش" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں پیدل چلنے کا راستہ۔ ریت کے درمیان ٹیلے کو بھی جبل کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ "جبل" بھی آیا ہے۔ ﴿وذہبت الصفرة قليلا﴾ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہو گئی۔ جس سے اس کے غروب کا یقین ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے تک ٹھہرا جائے اور میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی طلوع فجر تک ہے۔ جو شخص اس وقت میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا موقف صحیح ہے اور جو اس دوران یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہو گیا۔ ﴿حتى اذا غاب القرص﴾ یعنی جب سورج کی نکیہ غائب ہو گئی اور وہ اچھی طرح غروب ہو گیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ ﴿دفع﴾ یہ "اذا" کا جواب ہے یعنی آپ عرفات سے روانہ ہوئے۔ ﴿وقد شق﴾ واؤ حالیہ ہے اور ﴿شفق﴾ کی نون پر زبر یعنی ملا اور کھینچنے سے تنگ ہوا۔ ﴿الزمم﴾ زاء کے نیچے زیر یعنی اونٹنی کی مہار یعنی مہار کو کھینچنا تنگ کیا تاکہ وہ نہ بھاگے۔ ﴿ليصب﴾ لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے یعنی چھوٹا تھا اور پہنچ جاتا تھا۔ ﴿موردك﴾ میم پر زبر واؤ ساکن راء کے نیچے زیر۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ ﴿السكينة﴾ اس پر زبر ہے یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ ﴿كلما اتى حبلا﴾ حاء کے ساتھ یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے ﴿ارحى لها﴾ تو اس کی مہار ڈھکی کر دیتے ﴿لم يسبح﴾ یہ تسبیح سے ہے یعنی نفل نہیں پڑھے۔ ﴿اضطجع﴾ یعنی سونے کیلئے لیٹ گئے۔ ﴿لاتبين﴾ یعنی ظاہر ہوا۔ ﴿لمشعر الحوام﴾ یہ مزدلفہ میں مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿وهلل﴾ یہ تحلیل سے ہے یعنی لا الہ الا اللہ پڑھا۔ ﴿اسفر﴾ یعنی جب روشن ہو گیا۔ ﴿بطن محسر﴾ میم پر پیش حاء پر زبر سین کے نیچے زیر اور شد مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ ہی مزدلفہ کا اس کا نام "وادی محسر" اس لئے رکھا گیا کہ ابرہہ کے ہاتھی یہاں رک گئے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آ گئے۔ ﴿فحركك﴾ یہ تحریک سے ہے یعنی آپ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تاکہ وہ تیز چلے اس لئے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے جیسے آپ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی بستی سے جلدی سے گزر گئے تھے۔ ﴿ثم سلك الطريق الوسطی﴾ دونوں راستوں کے درمیان والے راستہ پر چلے اور یہ وہ راستہ تھا جو عرفات کے راستہ کے علاوہ تھا ﴿النبي تخرج على الجمرة الكبرى﴾ اسے جمرۃ عقبہ بھی کہتے ہیں اور "جمرة" کنکریوں

کے جمع ہونے کا نام ہے۔ ﴿حَتَّىٰ آتَى﴾ یعنی یہاں تک کہ آپؐ وہاں پہنچے۔ ﴿الْجُمُرَةُ الَّتِي عِنْدَ الشَّجَرَةِ﴾ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد کیلئے منیٰ کا حصہ نہیں۔ آپؐ کے زمانہ میں وہاں درخت تھا تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ ﴿الْخُذْفُ﴾ فاء پر زبر ذال ساکن، انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لویا کے دانہ کے برابر ہوتی ہو۔ ﴿رَمَىٰ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي﴾ یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں۔ بایں طور پر کہ منیٰ، عرفہ اور مزدلفہ آپؐ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ﴿الْمَنْحَرُ﴾ یعنی قریان گاہ اور وہ منیٰ ہے۔ ﴿نَحْرُ﴾ یہ لہ سے ہوتا ہے جیسے حلق سے دوسرا جانور ذبح کیا جاتا ہے ﴿افاض﴾ یعنی آپؐ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ ﴿الْحِجَابُ﴾ یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کیلئے اور اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑے گا۔

(۶۰۸) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ حَضَرْتُ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَّغَ مِنْ تَلْبِيَّتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ فَرَغَ هَوْتِ تَوَلَّى اللَّهَ تَعَالَى مِنْ اس کی رضامندی اور عُمْرَةً سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالْجَنَّةَ، جنت طلب کرتے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ سے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَّتِهِ﴾ اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دعا مستحب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فراغت سے مراد وہ وقت ہو جب لبیک کہنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کا راوی محمد بن ابی زائدہ ضعیف ہے۔ راوی حدیث ﴿حَضَرْتُ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ﴾ انصار کے قبیلہ اوس کی عظمیٰ شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابوعمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن عظمیٰ قبیلہ کا جھنڈا آپؐ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ہمراہ تھے اور اسی موقع پر شہید ہوئے۔

(۶۰۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هَهُنَا، وَمِنَى كُلُّهَا مَبْنَحَرٍ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هَهُنَا، وَعَرَفْتُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ، حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں نے قریانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قریان گاہ ہے۔ لہذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قریانی کر دو اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام

وَوَقَفْتُ هَهُنَا، وَجَمَعْتُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ». ہے اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے رَوَاہُ مُنْقِلِمٌ۔ قیام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وجمع کلہا موقف﴾ الجمع میں جیم پر فتح اور میم ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے جمع اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا کو جنت سے زمین پر اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے یا اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے "الجمع" کہا گیا ہے۔

(۶۱۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلَاهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج کیلئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس موقع پر مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور جب واپس جانے کیلئے مکہ سے نکلے تو زیریں حصہ سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بیان ہوا کہ آپؐ تثنیہ علیا کے راستے سے داخل ہوئے اور تثنیہ سفلی سے واپس ہوئے۔ بعض کے نزدیک حج کیلئے مکہ میں داخل ہونا انہی راستوں سے مسنون ہے اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخلہ کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلہ کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(۶۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ لَا يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلَّا بَاتَ بِبَذِي طُوى، حَتَّى يُصْبِحَ، وَبَغَسِلَ، وَيَذْكُرُ ذَلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو بذی طوی میں صبح تک شب بسر کرتے اور غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بات﴾ رات گزارتے۔ ﴿بذی طوی﴾ طوی کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تینوں۔ مکہ کے قریب ایک مقام و جگہ۔ (کہ جو آج کل --- ایک پرانے کنویں کی وجہ سے --- بڑی طوی کے نام سے مشہور ہے)

(۶۱۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ حجر

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يُقْبَلُ اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے۔ الْحَجَرُ الْأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا) الْحَاكِمُ مَرْفُوعًا، وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ مَوْقُوفًا. (ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن اس حدیث میں وہم اور اضطراب پایا جاتا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حجر اسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ص: ۴۴) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

غالباً مطلب یہ ہے کہ اس پر اپنی پیشانی رکھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اسے جائز سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا شذوذ ہے۔

(۶۱۳) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ نبی قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا كَرِيمٌ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ تین چکروں ثَلَاثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعًا، وَأَنْ میں تیز قدم چلیں اور دونوں رکنوں کے درمیان چار يَمْشُوا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿امرہم﴾ ہم سے مراد آپؐ کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کو حکم ارشاد فرمایا تھا۔ ﴿ان یرملوا﴾ میم پر ضم۔ دوڑتے ہوئے۔ ﴿اشواط﴾ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چکر لگانا۔

(۶۱۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا (أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ طوافِ قدوم (پہلا طواف) کرتے تو اس کے پہلے تین بِالْبَيْتِ الطَّوَّافِ الْأَوَّلِ خَبَّ ثَلَاثًا چکروں میں پہلوانوں کی سی چال چلتے اور (باقی) چار وَمَشَى أَرْبَعًا. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ میں آہستہ چلتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عمل أَوْ الْعُمْرَةَ أَوَّلَ مَا يَفْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعَى بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) میں نے اللہ کے ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ بِالْبَيْتِ وَيَمْشِي رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ نے حج یا عمرہ کے لیے أَرْبَعَةً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. بھی جب طواف قدوم کیا تو اس کے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور باقی چار میں آپؐ آہستہ چال چلتے۔

(متفق علیہ)

(۶۱۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں قَالَ: لَمْ أَرِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَسْتَلِمُ کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سوائے دونوں یمنی مِّنَ الْبَيْتِ غَيْرِ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ۔ رکنوں کے بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ نہیں دیکھا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یستلم﴾ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے ﴿غیر الرکنین الیمانیین﴾ نون کے بعد والی ”یا“ مخفف ہے اور یمن کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اس پر تشدید ہے اور یمن کی طرف ان کا رخ ہے، اس لئے ان کو رکن یمنی کہتے ہیں اور ﴿رکن البیت﴾ یعنی حجر اسود کا رخ بھی اسی طرف ہے اور یہ دونوں رکن حجر اسود اور دوسرا رکن وہ ہے جو کعبہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ دونوں شامی رکنوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(۶۱۶) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حجر تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَلَ الْحَجَرَ الْأَسْوَدَ، اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ مجھے اچھی طرح معلوم وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لَا ہے کہ تو پتھر ہے کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَلَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ۔ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(۶۱۷) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے اللہ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ آپؐ نوکیلے سرے والی چھڑی جو آپؐ کے پاس تھی، الرُّكْنَ بِمِخْجَنِ مَعَهُ، وَيُقَبِّلُ سے حجر اسود کو چھوتے اور اس چھڑی کو بوسہ دیتے الْمِخْجَنَ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ تجھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بمخجن﴾ میم پر کسرہ۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا۔ خم دار چھڑی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اژدھام اور رش زیادہ ہو اور حجر اسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ”تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجر اسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں فارغ وقت میسر آجائے تو ہاتھ سے مس کر لیا کرو بصورت دیگر حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہی کہہ لیا کرو۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج کے ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں اور اگر حجر اسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہئے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو تہجی بوسا دینا ہے جب وہ حجر اسود سے لگیں۔

راوی حدیث ﴿ابوالطفیل رضی اللہ عنہ﴾ عامر بن واثلہ لیثی کنانی رضی اللہ عنہ۔ حیات نبی ﷺ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ھ میں وفات پائی اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۳ھ کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بننے والے صحابہ کرامؓ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(۶۱۸) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مُضْطَبِعاً بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ أَبُو بَكْرِ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے طواف کیا جس کو اللہ ﷻ مضطبعاً ببرد اخضر۔ رواہ آپؐ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مضطبعاً﴾ اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصہ کو اپنی دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔ اس طرح دایاں کندھا نگاو برہنہ رہتا ہے۔

حاصل کلام: اضطباع پہلے پہل عمرہ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کیلئے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کیلئے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں۔ البتہ یہ اضطباع صرف پہلے سات چکروں کیلئے اور بعض نے کہا ہے کہ صرف رمل کی صورت میں اضطباع ہے بعد کے چار چکروں میں نہیں۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو صفوان تہمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابی رسول ہیں۔ حنین، طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے عامل مقرر کئے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک بعید حیات رہے۔

(۶۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: كَانَتْ يَهُلُّ مِنَّا الْمُهْلُ كَچھ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے، اسے بھی برا نہیں فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. ان کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منی سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تبلیہ کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(۶۲۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: كَانَتْ يَهُلُّ مِنَّا الْمُهْلُ كَچھ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے، اسے بھی برا نہیں فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (منی کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی الشقل﴾ ٹا اور قاف دونوں پر فتح۔ سامان مسافر ﴿الضعفة﴾ ضاع، عین اور فا پر فتح ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین، بچے، خادم وغیرہ ﴿من الجمع﴾ مزدلفہ سے منی کی طرف لے جانے کیلئے مجھے بھیجا۔ ﴿بلیل﴾ رات کے وقت۔ طبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور و ضعیف حضرات کو اڑدھام کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کیلئے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منی کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور جو اس اڑدھام اور کثرت میں آئے اس کیلئے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔

(۶۲۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: كَانَتْ يَهُلُّ مِنَّا الْمُهْلُ كَچھ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے، اسے بھی برا نہیں فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (منی کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری بھر کم جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منی کی طرف جانے کی رخصت و اجازت ہے۔

راوی حدیث ﴿حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ رضی اللہ عنہا﴾

(۶۲۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لَنَا
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَرْمُوا الْجَمْرَةَ
حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ». رَوَاهُ الْحَمَّانُ إِلَّا
النَّاسِي، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ”طلوع آفتاب سے
پہلے کنکریاں نہ مارو۔“ (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے
روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات کو رمی جائز نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک رمی طلوع آفتاب کے بعد جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آدھی رات کے بعد جائز ہے۔ امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قادر اور باہت آدمی طلوع فجر کے بعد رمی کرے۔ مجبور رات کو بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف طلوع آفتاب کے بعد ہی رمی کے قائل ہیں۔ ﴿وفیہ انقطاع﴾ اس کی سند منقطع ہے۔ اس لئے کہ اس کے راوی حسن عرفی کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں۔

(۶۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُرْسِلَ النَّبِيُّ ﷺ
بِأَمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ، فَرَمَتْ
الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ، ثُمَّ مَضَتْ،
فَأَفَاضَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ
حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ
نے ام سلمہ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا کو قربانی والی رات پہلے بھیج دیا تھا۔
انہوں نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے کنکریاں
ماریں پھر جا کر طواف افاضہ کیا۔ (ابو الداؤد نے
روایت کیا۔ اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔)

منسلحہ۔
 لغوی تشریح: ﴿ فرمت الجمرۃ قبل الفجر ﴾ انہوں نے فجر سے پہلے رمی کی یہ رعایت صرف عورتوں کیلئے اور ان کمزوروں کیلئے ہے جو ان کے ہمراہ جائیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے کہ اس وقت ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بھی دوسروں کیلئے کنکریاں مارنا جائز ہے۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے سند کے اعتبار سے رائج ہے۔ اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(۶۲۴) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ مَضْرُوسٍ عَنْ حَفْصِ بْنِ غَزْوَةَ بْنِ مُضَرَّسٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ "جَوْ كَوْنِي مُزْدَلِفَةٍ فِي هَذِهِ الْأَرْضِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلَاتَنَا نَماز میں شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں ہذِهِ، يَغْنِي بِالْمُزْدَلِفَةِ، فَوَقَّفَ مَعَنَا تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے قبل عرفات میں حَتَّى نَذْفَعُ، وَقَدْ وَقَّفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ رات یا دن میں قیام کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا ذَلِكَ لَيْلًا أَوْ نَهَارًا، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، اور اس نے اپنی میل کچیل اتار لی۔» (اسے پانچوں نے وَقَضَى تَفْتَهُ، رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حُزَيْمَةَ۔ ہے)

لغوی تشریح: ﴿من شہد صلاتنا ہذہ﴾ جس نماز کیلئے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ ﴿لیلا و نہارا﴾ اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذی الحجہ کی صبح تک جو عرفات میں قیام پذیر رہا اس نے حج پالیا جیسا کہ خطابی نے کہا ہے۔ ﴿فقد تم حجه﴾ اس نے حج کو پورا کر لیا سے مراد ہے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے ﴿وقضی تفتہ﴾ اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لئے۔ ”تفت“ دراصل سر کے بال منڈوانے یا ترشوانے کے بعد محرم حلال ہونے کے موقع پر جو کچھ کرتا ہے اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج ادا کرنے بھی شامل ہیں کیونکہ ”تفت“ تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں ”تفت“ میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ عروہ بن مضرس نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپ نماز کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا میں ”طے“ کے پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو دوڑا دوڑا کر تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر قیام کرتا رہا ہوں، کیا اب بھی مجھ پر حج کے کوئی ارکان باقی ہیں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔

راوی حدیث ﴿عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ﴾ میم پر ضمہ، ضاد پر فتح اور راء مشدد اس کے نیچے زیر، سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابن اوس بن حارث بن لام الطائی۔ حمید الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

(۶۲۵) وَعَنْ عَمْرِو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مشرکین طلوع آفتاب تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ الْمُشْرِكِينَ كَانُوا کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے شیر تو (ایک لَا يُمَيِّضُونَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، پہاڑ کا نام) روشن ہو گیا اور نبی ﷺ نے ان کی وَيَقُولُونَ: أَشْرِقَ بُيُوتُ! وَإِنَّ النَّبِيَّ مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے واپس تشریف ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَقْضَى قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، لے آئے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لا یفیضون﴾ واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ ﴿اشرق﴾ اشراق

سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو۔ یعنی چاہیئے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ شیر کی ٹا پر فتح اور باء کے نیچے کسرہ۔ مبنی علم الضم ہے۔ نداء محذوف کا منادئی ہونے کی وجہ سے شیر ہے۔ مبنی کی طرف جانے والے کے بائیں پہلو معروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ ہذیل کے شیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اسی پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے ”کیما نغیر“ تاکہ ہم غارت گری کر سکیں۔ یا ہم چل سکیں۔ اس کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں تاکہ ہم چلیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہئے اور جو طلوع سورج تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہو گیا۔

(۶۲۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأَسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَا: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَّةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ (چھوٹا شیطان) کو کنکری مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ (بخاری)

غلوئی تشریح: ﴿حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ﴾ جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جو نہی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

(۶۲۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهِ، وَمِنَى عَنْ يَمِينِهِ، وَرَمَى الْجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصَيَّاتٍ، وَقَالَ: هَذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

نہیں۔

راوی حدیث ﴿اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو زید تھی۔ اسامہ کے حمزہ پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور محبوب آزاد کردہ غلام کا بیٹا۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ۔ انہی وفات سے

حاصل کلام: پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(۶۲۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَزِمِي الْجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصِيَّاتٍ، يُكَبِّرُ عَلَى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ، فَيَقُومُ طَوِيلًا، وَيَذْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَزِمِي الْوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ، ثُمَّ يَذْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُومُ طَوِيلًا، ثُمَّ يَزِمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ، مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هَكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقْعُلُهُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

نغوی تشرح: ﴿الجمرة الدنيا﴾ وال پر ضمہ اور کسرو دونوں طرح ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ مسجد خیف کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ﴿الجمرة الدنيا﴾ کہا گیا ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں ٹکریاں ماری جاتی ہیں۔ ﴿ثم يسهل﴾ یہاں ”یا“ پر ضمہ معنی اس کے

میدان کی طرف آنے کے ہیں۔ زمین کا نشیبی حصہ۔ ﴿برمی الوسطی﴾ وسطیٰ سے مراد جمرہ ثانیہ (دوسرا جمرہ) جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ کو سنگریزے مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آکھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے۔ لہذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہئے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آکر طویل دعا ہاتھ اوپر اٹھا کر کرنی چاہئے۔ اس طرح اڑدھام کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(۶۳۰) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «اللَّهُمَّ اَرْحَمِ الْمُحْلِقِينَ»، قَالَوا: وَالْمَقْصُرِينَ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمَقْصُرِينَ». مَثَّقٌ عَلَيْهِ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”الٰہی سرمنڈوانے والے حاجیوں پر رحم فرما۔“ صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بال ترشوانے والے پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا ”بال ترشوانے والوں پر بھی۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿المحلقین﴾ تحلیق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈواتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینا۔ ﴿والمقصرین﴾ یہ عطف تلقین ہے یعنی آپ یہ کہیں قل والمقصرین اور تقصیر بال ترشوانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف نہیں کئے جاتے۔

(۶۳۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ، فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْغُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ، قَالَ: «اذْبَعْ وَلَا حَرَجَ»، وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْغُرْ، فَتَحَرَّثُ قَبْلَ أَنْ أَزِمِّي، قَالَ: «ازِمِ وَلَا حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ يَوْمَئِذٍ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ: «افْعَلْ وَلَا حَرَجَ». مَثَّقٌ عَلَيْهِ. حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہو گئے۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ کسی نے کہا مجھے علم نہیں تھا میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوائی۔ آپؐ نے اسے فرمایا قربانی کرو کوئی حرج نہیں اور ایک آدمی نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا ”اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔“ اس روز آپؐ سے کسی عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق استفسار پر آپؐ نے فرمایا ”جاؤ اب کر لو، کوئی حرج نہیں۔“

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وَقَفَ فِي حِجَّةِ الْوُدَاعِ﴾ دسویں ذی الحجہ کے روز زوال آفتاب کے بعد جب آپؐ اپنی سواری پر سوار رہتے ہوئے جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کھڑے ہوتے۔ ﴿لَمْ اشْعُرْ﴾ اشعر میں عین پر ضمہ، معنی ہے مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ ﴿قَدَمٌ وَلَا أُخْرَ﴾ قدم، اخیر دونوں باب تفعیل سے ماخوذ ہیں صیغہ مجہول ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمہ چار کام بالترتیب انجام دینا ہوتے ہیں۔ پہلا جمرہ عقبہ کو سنگریزے مارنا۔ دوسرا قربانی کرنا۔ تیسرا سر منڈانا یا بال ترشوانا۔ چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر تو اتفاق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(۶۳۲) وَعَنْ الْمُسَوِّرِ بْنِ مَخْرَمَةَ عَنْ مَخْرَمَةَ بِنْتِ مَخْرَمَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ، وَأَمَرَ بِهَلْكِهِ» (بخاری)

راوی حدیث: ﴿مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما﴾ مسور کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ سین ساکن اور ”واو“ پر فتح، بن مخرمہ۔ مخرمہ میں میم پر فتح اور ”خاء“ ساکن اور ”راء“ پر فتح۔ زہری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہو گئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۳ھ کے آغاز میں مکہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے ان کو منجنیق کا گولہ آکر لگا اور وہ وفات پا گئے۔

(۶۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمْ الطَّيْبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلَّا هَرَجِزَ حُلَالٍ هُوَ كَيْفِيٌّ» (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا)

لغوی تشریح: ﴿الانساء﴾ یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے ﴿وفی سندہ ضعف﴾ اس لئے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاة ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔

(۶۳۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا عَنْ مَرْوَى عَنْ نَبِيِّ كَرَمٍ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا کہ ”عورتوں کیلئے سر منڈوانا نہیں قَالَ: «لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، بَلْ كُنَّ كَمَا كُنَّ»۔“ (اسے ابو داؤد وَانَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ۔ رَوَاهُ أَبُو نے حسن سند سے روایت کیا ہے) دَاؤدُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانا نہیں بلکہ انہیں صرف بال کترنا چاہئے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کیلئے بال کترنا ہی مشروع ہے۔

(۶۳۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ الْعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اسْتَأْذَنَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَبِيتَ بِمَكَّةَ لَيْلًا مَنَى، مِنْ أَجْلِ وَهَبَ زَمْزَمَ يَأْتِيهِمْ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم) دی۔

لغوی تشریح: ﴿لیالی منی﴾ منی کی راتوں سے مراد ۱۱ ویں، ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں کی راتیں ہیں۔ یہ اجازت انہوں نے اس مقصد اور غرض کیلئے طلب کی کہ وہ اور اس کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ اس کو تقسیم کرتے تھے۔ ”فاذن لہ“ یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کو منی ہی میں یہ راتیں گزارنی واجب ہیں اور جس کو کوئی عذر پیش آجائے مثلاً منی میں نیچے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن و مشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منی میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(۶۳۶) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَرْخَصَ لِرِعَاةِ الْإِبِلِ فِي الْبَيْتُوتَةِ عَنْ مَنَى، يَزْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَزْمُونَ الْعَدَّ وَمِنْ بَعْدِ الْعَدِّ لَيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَزْمُونَ يَوْمَ النَّفَرِ. رَوَاهُ الْحَسَنُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَانَ. (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے، ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) دی۔

لغوی تشریح: ﴿ارخص﴾ اور ایک نسخہ میں رخص ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی رخصت و اجازت دے دی۔ ﴿دعاء﴾ ”را“ پر ضمہ راع کی جمع ہے۔ ﴿فی البیتوتہ﴾ بات کا مصدر ہے۔ رات

گزارنا کے معنی ہیں اور رات گزارنے سے مراد منیٰ میں مذکورہ راتوں میں سے رات کا بسر کرنا۔ عن منیٰ عن یہاں بعد اور دوری کیلئے ہے۔ یعنی منیٰ سے باہر اس سے دور رہتے ہوئے یعنی نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال اور منیٰ سے دوران کی حفاظت و حراست کیلئے منیٰ میں رات نہ گزارنے کی اجازت دے دی۔ ﴿ثم يرمون الغد ومن بعد الغد ليموين﴾ یعنی وہ گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مارتے تھے۔ مراد ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو جمع کرتے تھے۔ ﴿ثم يرمون يوم النفر﴾ منیٰ سے واپسی کا دن اور اس سے مراد ہے تیرہویں تاریخ۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عام حاجیوں کیلئے منیٰ میں شب باشی واجب ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ رخصت و اجازت واجب ہی کی صورت میں ہوتی ہے ورنہ اجازت کی ضرورت ہی نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عاصم بن عدیؓ﴾ ان کی کنیت ابو عبید اللہ یا ابو عمرو ہے۔ بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ بنو عبید کا تعلق بنو عمرو بن عوف جو انصار سے تھے، کے ساتھ تھا۔ غزوہ بدر اور بعد کے غزوات میں حاضر رہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بدر کے روزیہ قبائل عالیہ پر امیر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کیلئے حصہ مقرر فرمایا۔ ۴۵ھ میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جنگ یمامہ کے روز شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(۶۳۷) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، الْحَدِيثُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَكَرَّرَ - (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: حج کے دورانیہ میں نبی کریم ﷺ سے کئی خطبے ثابت ہیں۔ مالکیہ اور احناف کے نزدیک ایک خطاب ساتویں ذی الحجہ کو اور دوسرا عرفہ میں اور تیسرا گیارہویں ذی الحجہ کو۔ دسویں ذی الحجہ یعنی قربانی کے دن کے خطاب کو مالکیہ اور حنفیہ خطبہ نہیں صرف چند مسیحیتیں کہتے ہیں۔ یہ عید کا خطبہ نہیں کیونکہ آنحضور ﷺ نے نماز عید تو ادا فرمائی نہیں تھی۔ بعض اسے بھی خطبہ ہی کہتے ہیں اس طرح چار خطبے مسنون ہو جاتے ہیں۔

(۶۳۸) وَعَنْ سَرَاءَ بِنْتِ نَبْهَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ الرُّءُوسِ فَقَالَ: «أَلَيْسَ هَذَا أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ؟» - نہیں ہے؟» اور ساری حدیث ذکر کی۔ (اسے ابو داؤد الحَدِيثُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ۔ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

غروی تشریح: ﴿یوم الرووس﴾ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یوم الرووس سے ذوالحجہ کی ۱۳ویں تاریخ مراد ہے۔ اس کا نام یوم الرووس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس روز کثرت سے قربانی کے جانوروں کے

سروں کو پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ ﴿اوسط ایام التشریق﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس سے اس دن کے افضل ہونے کا بھی احتمال ہے اور اوسط سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوم النحر بھی ایام تشریق میں شامل ہے مگر بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کیلئے دھوپ میں رکھتے تھے۔ اس لئے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراء بنت نبهان رضی اللہ عنہا﴾ سراء کے راپر فتح اور تشدید اور نبھان کے نون پر فتح اور باساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبد الرحمن نے اس سے روایت بیان کی ہے۔

(۶۳۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: "تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا «طَوَّافُكِ بِالْبَيْتِ، وَسَعْيُكَ بَيْنَ صفا اور مروہ کے مابین سعی کر لینا حج اور عمرے کیلئے الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، يَكْفِيكَ لِحَجِّكَ كَافِي»۔" (مسلم) وَعُمْرَتِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تبلیہ عمرہ کا کہا تھا۔ مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہو گئیں تو ان سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا "عمرے کو چھوڑ دو اور ان سے فرمایا کہ حج کا احرام باندھ لو۔" ﴿رفضها﴾ کے معنی ہیں اسے ترک کر دے اور عمرے کے اعمال و افعال کو نظر انداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال کا فعل حج اور عمرہ میں صحیح نہیں۔ بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انہوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارن بن گئیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ قارن کیلئے حج اور عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(۶۴۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَزْمُلْ فِي السَّبْعِ الَّذِي أَفَاضَ فِيهِ. (پھیروں) میں کسی چکر میں بھی رمل نہیں فرمایا۔ رَوَاهُ الْخَنَسَةُ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فِي السَّبْعِ الَّذِي أَفَاضَ فِيهِ﴾ طواف افاضہ کے طواف کے ساتھ پھیرے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ میں رمل نہیں اور نہ ہی طواف وداع میں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ طواف قدوم اس طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں پہلے داخلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کیلئے ہے۔ خواتین کیلئے نہیں ہے ہاں اگر

کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ گیا ہو تو اس کی تلافی کیلئے طواف افاضہ میں رمل کر لے۔

(۶۴۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ صَلَّی نے (بالترتیب اپنے اپنے وقت میں) ظہر اور عصر، الظَّهْر وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور پھر مقام ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمَحْصَبِ، ثُمَّ رَكِبَ محصب پر تھوڑا سو گئے پھر سوار ہو کر بیت اللہ کی إِلَى الْبَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. جانب تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿رَقَدَ رَقْدَةً﴾ یعنی تھوڑا سا سو گئے۔ ﴿بِالْمَحْصَبِ﴾ محصب اس جگہ کا نام ہے جہاں آپؐ نے نمازیں ادا فرمائیں اور استراحت بھی فرمائی اور یہ کوچ کا آخری دن تھا۔ یعنی ایام تشریق کا تیسرا دن۔ محصب بروزن محمد۔ جگہ کا نام ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ نسبت مکہ سے منی کے زیادہ قریب ہے اسے ابطح اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ فطاف بہ۔ اس سے طواف وداع مراد ہے اور یہ حج کا سب سے آخری طواف ہوتا ہے۔

(۶۴۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا عَنْ النَّبِيِّ ﷺ صَلَّی میں فروکش ہونے کا عمل نہیں کرتی تھیں اور فرماتی ذَلِكْ - أَيْ النَّزُولَ بِالْأَبْطَحِ - تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر اس لئے وَقَفُوا: إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قیام فرمایا تھا کہ یہاں سے واپسی میں آسانی و سہولت لِأَنَّهُ كَانَ مَنْزِلًا أَسْمَحَ لِخُرُوجِهِ. رَوَاهُ زیادہ تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بِالْأَبْطَحِ﴾ ابطح سے محصب مراد ہے۔ ﴿أَسْمَحَ﴾ زیادہ سل و آسان ﴿لِخُرُوجِهِ﴾ مکہ سے مدینہ کو جانے کیلئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محصب میں قیام کرنا ان مناسک حج میں سے نہیں ہے جو مستحب ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ آپؐ اس مقام پر اس لئے اترے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم سے نبوت کے ساتویں سال میں قطع تعلق کا عہد و پیمان کیا اور وہاں بیٹھ کر اس بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور نبی ﷺ یہاں اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے اترے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول کو غلبہ عطا فرمایا۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ حاجیوں کو یہاں فروکش ہونا چاہئے۔ مگر میرے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

(۶۴۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَمَرَ النَّاسُ اللّٰهُ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ سب سے آخر میں أَنْ يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ، إِلَّا تَهَارًا عَمَلَ بَيْتَ اللّٰهِ كَاطَافٍ هُوَ مَكْرِيَامٍ مَاهَوَارِي وَالِي

أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ . عورتوں کیلئے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)
 حاصل کلام: یہ طواف واداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمہ اللہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا پڑتا ہے مگر ان عورتوں کیلئے معاف ہے جو ایام ماہواری میں ہوں۔

(۶۴۴) وَعَنْ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ، مُقَابِلَهُ فِي هَذَا مِثْلُهَا فِي مَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةٍ فِي مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلَاةٍ». رَوَاهُ: کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔
 حضرت ابن الزبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہے۔ بجز مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں سو نماز پڑھنے سے افضل ہے۔“ (اسے احمد نے روایت فی مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلَاةٍ)۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسجد نبویؐ اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپؐ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ ہذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے یہ مطلب مفہوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد نبویؐ عہد نبویؐ میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبویؐ کے ساتھ ملحق ہے اس لئے وہ بھی مسجد نبویؐ کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ صد نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی کا دوسری مساجد میں ایک لاکھ پڑھی جانے والی نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن الزبیر رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ نام ان کا عبد اللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہے۔ قریش کے قبیلہ اسد سے ہیں۔ اس لئے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ جن ہی یہ بقاء پہنچیں ابن زبیر کی ولادت ہو گئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ پہلا نومولود تھا۔ بکثرت روزے رکھتے۔ بہت نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسیم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ تکلیف کو پہنچنے والے تھے۔ ۶۳ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز، عراق، یمن، مصر اور اکثر علاقہ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور ان

کو ۷۳ھ میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

۶ - باب الفوات والإحصار

حج سے رہ جانے اور روکے جانے کا

بیان

(۶۴۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَدْ أُحْصِرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتَّى اغْتَمَرَ عَامًا قَابِلًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا گیا تو آپؐ نے اپنا سر منڈوایا اور قربانی کی اور اپنی ازدواج و جامعہ نساءؑ، و نحَرَ ہدیہ، حتیٰ اغتَمَرَ عَامًا قَابِلًا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿باب الفوات والاحصار﴾ فوات کے فاء پر فتح۔ یعنی اس کا کیا حکم ہے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے۔ جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے اور احصار کے معنی رکنا ہے۔ جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اسے بیت اللہ پہنچنے میں رکاوٹ ہو۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ ﴿احصر﴾ صیغہ مجہول یعنی عمرہ سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کر دے۔ ﴿حتى اعتمر عاما قابلا﴾ حتیٰ کہ آئندہ سال عمرہ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ کی قضاء واجب ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپؐ نے کیا اور یہ وجوب کو مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ یہ عمرہ آپؐ کا پہلے عمرہ کی قضا تھی۔ بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرۃ القضاء تو صرف اس لئے رکھا گیا کہ حدیبیہ کے موقع پر اس مسئلہ کا فیصلہ دونوں فریق کیلئے تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ احرام بند ہو کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپؐ نے وہیں احرام کھول دیا، قربانی کی اور سر کے بال منڈائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیئے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے وہیں خرو و ذبح کر دیئے۔

احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجالانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے

کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی خواہ وہ جگہ حل ہو یا حرم اور یہی قول رائج ہے۔ مگر احناف کے نزدیک قربانی ہر صورت میں حرم میں ذبح و نحر ہونی چاہئے اور اسے کسی کے ذریعہ سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ناممکن ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے تمام اصحاب کے پاس حدی تو نہیں تھی اگر واجب ہوتی تو پھر سب کیلئے اس کا وجوب ہوتا۔ حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات رائج معلوم ہوتی ہے۔

(۶۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا بِنْتِ زَيْبِرِ بْنِ عَبْدِ الْمَطْلَبِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى ضَبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ ابْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، (ﷺ) میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنْ مَحَلِّي جَمَالَ أَعْلَى اللَّهِ! تَوَلَّيْتُ جَهْمَ رُكَاةً» (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿شاکہ﴾ بیمار۔ ﴿محلی﴾ میم پر فتح اور ”حا“ کے نیچے کسرہ یعنی حج سے خروج کا وقت اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ یعنی وقت اور مقام دونوں کا بیان مقصود ہے۔ ﴿حبستنی﴾ صغہ مخاطب یعنی اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

(۶۴۷) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنْ حُجَّاجِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَ، وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَا: صَدَقَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے حجاج بن عمرو انصاری رحمہ اللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کا پاؤں توڑا جائے یا لنگڑا ہو جائے وہ احرام سے باہر آگیا اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی و ضروری ہے۔“ عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حجاج بن عمرو نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

قَالَ مُصَنَّفُهُ - حَافِظُ الْعَصْرِ، بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر، قاضی القضا
قَاضِي الْقَضَاءِ أَبُو الْفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ (چف جسٹس) ابوالفضل احمد بن علی بن حجر الکنانی
عَلِيِّ بْنِ حَجَرَ الْكَتَانِي الْعَسْقَلَانِي الْعَقْلَانِي مصري اللہ تعالیٰ ان کو بھلائیوں میں ہمیشہ
الْمِصْرِي، أَبْقَاهُ اللَّهُ فِي خَيْرٍ -: زندہ رکھے نے کہا ہے کہ اتنا حصہ جزء اول کا
آخِرُ الْجُزْءِ الْأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ آخری حصہ ہے اور وہ اس کتاب کا نصف ہے۔
هَذَا الْكِتَابِ الْمُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ انہوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ھ ماہ ربیع الاول کی ۱۲/
الْفَرَاعُ مِنْهُ فِي ثَانِي عَشَرَ شَهْرٍ رَبِيعِ تاریخ کو اس سے فارغ ہوا اور یہ عبادات کے
الْأَوَّلِ سَنَةً سَبْعَ وَعِشْرِينَ چوتھائی کا آخری حصہ ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسرا
وَتَمَانِمَائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ نصف کتاب الیہود کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے
الْعِبَادَاتِ، يَتْلُوهُ فِي الْجُزْءِ الثَّانِي کتاب اور اس کے والدین اور جمیع مسلمین کو اپنے
كِتَابُ الْيُيُوعِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى دامن مغفرت میں ڈھانپ لے اور اللہ ہمارے لئے
سَيِّدَنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّم کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔
تَسْلِيمًا كَثِيرًا دَائِمًا أَبَدًا. غَفَرَ اللَّهُ
لِكِتَابِيهِ وَلِوَالِدَيْهِ وَلِكُلِّ الْمُسْلِمِينَ،
وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ.

لعنوی تشریح: ﴿کسر﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿اوعرج﴾ عین اور را دونوں پر فتح۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو
پیدائشی نہ ہو اور جب پیدائشی ہو تو اس صورت میں عرج را کو کسر سے پڑھا جائے گا۔ ﴿فقدحل﴾ یعنی
اس کیلئے احرام ترک کر دینا جائز ہے اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ ﴿وعليه
الحج من قابل﴾ آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرضی حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی
نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ الیمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوا
کہ حرم احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے۔ (۱) احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی مانع کی
وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ (۲) اس نے شرط کر لی ہو۔ (۳) کسی حادثہ کی وجہ سے پاؤں وغیرہ میں چوٹ آگئی ہو یا
وہ لنگڑا ہو گیا ہو۔ جس شخص کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو اس کے بارے میں
ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرہ کیلئے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمرؓ اور زید
بن ثابتؓ سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عمرہ کے لئے تلبیہ کہے گا اور ازسرنو
دوبارہ احرام باندھے گا پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کیلئے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے
کہ دم دینا واجب نہیں ہے۔ (دم دینا۔۔۔ یعنی قربانی کرنا)

حدیث کے بعد والی عبارت ۱۲۹۹ھ کے مطبوعہ نسخہ مطبع صدیقیہ جو بھوپال کا ایک سرکاری مطبع ہے میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ کا مطبع ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخہ سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخہ میں ان کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام بھی ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ انہوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا۔ مثلاً امام یوسف جو مصنف کی اولاد ہیں۔ شیخ عبدالباسط بن احمد میثمی، ازہری، شیخ محمد بن عبداللطیف ملمعی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی طباعت نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی مؤلف روح المعانی کے پوتے کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ضباعہ بنت زبیر﴾ ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ضادر پر ضم۔ پورا نام ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علیؓ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔ ﴿عکرمہ﴾ عکرمہ کے عین پر کسرہ، کاف ساکن اور راء پر کسرہ۔ ابو عبداللہ کنیت۔ عکرمہ مدنی، عبداللہ بن عباسؓ کے غلام تھے۔ بربر قبیلہ سے تھے۔ بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہاء مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے درجے میں شامل ہیں۔ ۱۰۷ھ میں اسی سال کی عمر یا کر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

﴿حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ﴾ ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

بلوغ المرام

من أدلة الأحكام

جلد دوم

تألیف: ابو الفضل شهاب الدین ابن حجر عسقلانی

شاح / مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

دار السلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

اس کتاب کے جملہ حقوق ترجمہ، نقل و اشاعت محفوظ ہیں

جمادی الاول ۱۴۱۸ھ ستمبر ۱۹۹۷ء



دارالافتاء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۳۳ ریاض ۱۱۴۱۶ مملکت سعودی عرب

فون نمبر ۲۰۳۳۹۶۲ فیکس ۲۰۲۱۶۵۹

(برانچ پاکستان)

دارالافتاء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

۵۰۔ لوئر مال (نزد ایم اے او کالج لاہور) فون: ۲۲۰۰۰۲۲ فیکس: ۲۵۴۰۰۲۲

(سیل سنٹر) رحمن مارکیٹ (غزنی سٹریٹ) اردو بازار لاہور پاکستان

بُلُوغُ الْمَلِكِ

مِنْ أَدِلَّةِ الْأَحْكَامِ

جلد دوم

تألیف

ابو الفضل شهاب الدین احمد بن حجر عسقلانی

(۷۸۵۲-۷۷۳ھ)

شرح بُلُوغُ الْمَلِكِ

مترجم
مولانا عابد الوکیل علوی

شرح
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

تصحیح و تنقیح
مولانا ارشاد الحق الاثری

دارالانشاء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ریاض - لاہور

۲۳۶	نکاح کے مسائل کا بیان	۵۰۶	خرید و فروخت کے مسائل
۶۵۴	کفو (شغل، ہمسری) اور اختیار کا بیان	۵۰۶	بیع کی شرائط و اور بیع منوعہ کی اقسام
	عورتوں (بیویوں) کے ساتھ رہن سہن و	۵۴۱	بیع میں اختیار کا بیان
۶۶۵	میل جول کا بیان	۵۴۵	سود کا بیان
۶۷۴	حق مہر کا بیان		بیع عرایا، درختوں اور (ان کے) پھلوں کی
۶۸۱	ولیمہ کا بیان	۵۵۵	بیع میں رخصت
۶۸۸	بیویوں میں باری کی تقسیم کا بیان	۵۵۹	پیشگی ادائیگی، قرض اور رہن کا بیان
۶۹۳	خلع کا بیان		مفلس قرار دینے اور تصرف روکنے کا
۶۹۵	طلاق کا بیان	۵۶۵	بیان
۷۰۷	(طلاق سے) رجوع کرنے کا بیان	۵۷۴	صلح کا بیان
۷۰۸	ایلاء، نہار اور کفارہ کا بیان	۵۷۷	ضمانت اور کفالت کا بیان
۷۱۲	لعان کا بیان	۵۸۰	شراکت اور وکالت کا بیان
۷۱۹	عدت، سوگ اور استبراء رحم کا بیان	۵۸۴	اقرار کا بیان
۷۳۰	دودھ پلانے کا بیان	۵۸۴	ادھار لی ہوئی چیز کا بیان
۷۳۷	نفقات کا بیان	۵۸۷	غصب کا بیان
۷۴۴	پرورش و تربیت کا بیان	۵۹۰	شفعہ کا بیان
۷۵۰	جنايات (جرائم) کے مسائل	۵۹۵	مضاربہ کا بیان
۷۶۴	اقسام دیت کا بیان	۵۹۷	آپاشی اور زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا بیان
۷۷۳	دعویٰ خون اور قسامت	۶۰۲	بے آباد و بنجر زمین کو آباد کرنے کا بیان
۷۷۷	باغی لوگوں سے جنگ و قتال کرنا	۶۰۷	وقف کا بیان
	مجرم (بدنی نقصان پہنچانے والے) سے	۶۱۰	حبہ، عمری اور ربئی کا بیان
۷۸۰	لڑنے اور مرتد کو قتل کرنے کا بیان	۶۱۷	لقطہ (گری پڑی چیز) کا بیان
۷۸۶	حدود کے مسائل	۶۲۳	فرائض (وراثت) کا بیان
۷۸۶	زانی کی حد کا بیان	۶۳۱	وصیتوں کا بیان
۸۰۰	تہمت زنا کی حد کا بیان	۶۳۵	ودیعت (امانت) کا بیان
۸۰۳	چوری کی حد کا بیان		

فہرست مضامین

۸۹۴	شہادتوں (گواہیوں) کا بیان	۸۱۱	شراب پینے والے کی حد اور نشہ آور چیزوں کا بیان
۸۹۹	دعویٰ اور دلائل کا بیان	۸۱۶	تجزیر اور حملہ آور (ڈاکو) کا حکم
۹۰۵	غلامی و آزادی کے مسائل	۸۲۰	مسائل جہاد
۹۱۰	مدبر، مکاتب اور ام ولد کا بیان	۸۳۵	جزیہ اور صلح کا بیان
۹۱۶	متفرق مضامین کی احادیث	۸۵۰	گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان
۹۱۶	ادب کا بیان	۸۵۴	کھانے کے مسائل
۹۲۳	نیکی اور صلہ رحمی کا بیان	۸۶۰	شکار اور ذبائح کا بیان
۹۲۹	دنیا سے بے رغبتی اور پرہیز گاری کا بیان	۸۶۷	(احکام) قربانی کا بیان
۹۳۷	برے اخلاق و عادات سے ڈرانے اور خوف دلانے کا بیان	۸۷۳	عقیقہ کا بیان
	مکارم اخلاق (اچھے عمدہ اخلاق) کی	۸۷۶	قسموں اور نذروں کے مسائل
۹۵۶	ترغیب کا بیان		قاضی (جج) وغیرہ بننے کے
۹۶۶	ذکر اور دعا کا بیان	۸۸۷	مسائل



۷۔ کتابُ البیوع

خرید و فروخت کے مسائل

بَابُ شُرُوطِهِ وَمَا نَهِيَ عَنْهُ مِنْهُ بیع کی شرائط و اور بیع کی ممنوعہ اقسام کا بیان (۶۴۸) عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سئِلَ أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟ قَالَ: «عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ، وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ». رَوَاهُ الْبُزَّارُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. بیع کی روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا۔

لغوی تشریح: ﴿کتاب البیوع﴾ بیوع بیع کی جمع ہے، لغت میں مال دے کر کوئی چیز خریدنے کا نام بیع ہے۔ شرعی اصطلاح میں بھی اس کے یہی معنی ہیں، لیکن اس میں باہمی رضامندی کی قید کا اضافہ ہے۔ جمع اس لئے لائے ہیں کہ اس کی بہت سی اقسام و انواع ہیں اور تمام بیوع کی چار قسمیں ہیں (۱) "بیع العروض بالعروض" یعنی سلمان کو سلمان کے بدلہ فروخت کرنا، اسے مقابلہ (بیع تبادلہ) بھی کہتے ہیں۔ (۲) "بیع العروض بالنقد" یعنی نقدی کے ذریعے سلمان کی بیع کرنا اور اسی کو ہی بیع کہا جاتا ہے، کیونکہ بیع کی ساری قسموں میں یہ سب سے زیادہ مشہور ہے اور یہی زیادہ معمول بہ ہے۔ (۳) "بیع النقد بالنقد" نقدی کے بدلے نقدی کی بیع یعنی مروجہ سکہ کو مروجہ سکہ کے بدلے خرید و فروخت کرنا، اسے بیع صرف بھی کہتے ہیں۔ (۴) "بیع المنفعۃ بالمال" یعنی منافع کو مال کے بدلے بیچنا، بصورت سلمان ہو یا نقد۔ اسے "اجارہ" کہتے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کے تحت ۲۲ ابواب قائم کئے ہیں۔ جبکہ کئی باب ایسے ہیں جن کا بیع سے کوئی تعلق نہیں، اگر مصنف اس کا نام کتاب البیوع کی بجائے "کتاب البیوع والاموال" رکھتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔

﴿باب شروطہ﴾ شروط میں "وہ" ضمیر کا مرجع بیع ہے۔ یعنی بیع کی شروط کا بیان۔ شرط اسے کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ پائی جائے تو اس کا حکم و سبب بھی معدوم ہو جائے۔ ﴿وما نہی عنہ﴾ بیعہ مجہول بیع کی

خرید و فروخت کے مسائل 507

شروط حسب ذیل ہیں۔ (۱) بیع کرنے والا عاقل و متمیز ہو۔ (۲) عقد کا لفظ ماضی کے ساتھ ہو۔ (۳) مال ایسا ہو جو قابل قیمت اور طے شدہ ہو۔ (۴) فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ طے پائے۔ (۵) فروخت کی جانے والی چیز بیچنے والے کی ملکیت میں ہو یا اس کی ولایت یعنی سرپرستی میں ہو۔ ﴿اطیب﴾ باعتبار عمل سب سے زیادہ فضیلت والا ہو اور برکت بھی زیادہ ہو اور اس کا کھانا حلال ہو۔ ﴿وکل بیع مبرور﴾ مبرور بر سے ہے، یعنی نیکی اور یہ اثم یعنی گناہ کی ضد ہے۔ لہذا بیع مبرور وہ بیع ہے جس میں نہ دھوکہ و فریب ہو اور نہ ہی جھوٹی قسم۔ اور ہاتھ کے عمل کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ (۱) زراعت۔ (۲) صنعت۔ ہاتھ کے عمل کو ”بیع مبرور“ سے مقدم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ افضل ہے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ دونوں مساوی ہوں اور ”واو“ عاطفہ ترتیب کیلئے نہیں، بلکہ مطلق جمع کیلئے ہو۔

(۶۴۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ عَامَ الْفَتْحِ، يَهُوَ بِمَكَّةَ: «إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْحَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخَنزِيرِ وَالْأَصْنَامِ». فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ هِيَ أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ؟ فَإِنَّهَا تَطْلَى بِهَا السُّنَنُ، وَيُذْهَنُ بِهَا الْجُلُودُ، وَيَسْتَصْبَحُ بِهَا النَّاسُ، فَقَالَ: «لَا هُوَ حَرَامٌ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «عِنْدَ ذَلِكَ: «قَاتَلَ اللَّهُ الْيَهُودَ، إِنَّ اللَّهَ لَمَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ شُحُومَهَا غَارَتْ كَرَّةٌ كَرَّ جَبَلُوهُ، ثُمَّ بَاغَوْهُ، فَأَعْلَوْا ثَمَنَهُ». کیلئے حرام کر دیا تو انہوں نے اسے کچھلا کر فروخت مَنَقَعٌ عَلَيْهِ۔ کیا اور اس کی قیمت کھائی۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عام الفتح﴾ عام الفتح سے مراد فتح مکہ کا سال ہے اور یہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا۔ ﴿ان اللہ ورسولہ حرم﴾ یہاں اللہ اور اس کے رسول دو کا ذکر ہے، مگر حرم صیغہ مفرد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں حرام کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا رسول تو حکم الہی کا اظہار کرنے والا ہے، آپ کا حکم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہوتا ہے، اس لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿اربت شحوم المیتة﴾ مردار کی چربیوں کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ ان کی تجارت حلال ہے یا نہیں؟ اور مسند احمد

خرید و فروخت کے مسائل 508

کی روایت میں ہے کہ مردار کی چربیوں کی تجارت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ﴿فانہ﴾ شان یہ ہے ”یطلى“ طلا سے ماخوذ ہے، اور باب ضرب یضرب سے صیغہ مجہول ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کشتیاں اس سے طلاء کی جاتی ہیں (یعنی چربی سے ان کی طمع سازی کی جاتی ہے کہ جس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ نمبراً چربی سے دراڑیں بند ہو جاتی ہیں اور پانی اندر نہیں جاتا۔ نمبراً۔ چربی، تختوں کو پانی کی خرابی سے محفوظ کر دیتی ہے۔ مترجم) ﴿السفن﴾ سین اور فادونوں پر ضمہ ہے۔ سفینہ کی جمع ہے یعنی کشتیاں ﴿یدھن﴾ ادھان یا تدھین سے ماخوذ اور صیغہ مجہول ہے۔ ﴿ویستصبح بها الناس﴾ لوگ اس کے ذریعہ چراغ جلاتے اور دیئے روشن کرتے ہیں۔ پوچھنے والے کے پیش نظریہ تھا کہ جس سے اتنے فوائد اور مصالح حاصل ہوتے ہیں وہ اس کی تجارت کی صحت کو متقاضی ہیں۔ ﴿فقال لا هو حرام﴾ ہو ضمیر کے متعلق ایک رائے اور قول یہ ہے کہ فانہا تطلى بها السفن میں جو انتفاع کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس کی طرف لوٹتی ہے لیکن رائج بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ضمیر (هو) بیع کی جانب راجع ہے، کیونکہ مسائل نے صرف اس کی بیع کے بارے میں سوال کیا تھا اور گفتگو بھی اسی کیلئے کی تھی۔ اس کی تائید حدیث کا آخری حصہ ثم باعوه سے بھی ہوتی ہے۔ ﴿حملوه﴾ جیم اور میم دونوں پر فتح۔ انہوں نے اسے پکھلایا۔ اس میں مذکورہ تاویل کی بنا پر ضمیر منصوب شحوم کی طرف راجع ہے، یا پھر چربیوں میں سے جو چربی ذہن میں تھی، اس کی طرف راجع ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جس چیز کا ذکر ہوا اسے فروخت کرنا حرام ہے، بلکہ مردار کے تمام اجزاء کی فروخت حرام ہے، البتہ اس کا چمڑا جب اسے رنگ دیا جائے، اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ آغاز کتاب میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی گزر چکا ہے، ﴿ایما اصاب دبغ فقد طهر﴾ جو کچا چمڑا دباغت دے دیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ جمہور نے مردار کے بالوں اور اون کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ ان پر مردار کا اطلاق نہیں ہوتا اور نہ اس پر زندگی وارد ہوتی ہے اور جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام نہیں کیں، ان سے فائدہ حاصل کرنے اور نفع اٹھانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ مثلاً چراغ جلانا، شکرے اور باز کو کھلانا۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان سے انتفاع مطلقاً حرام ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں جواز ہے جن کی ظاہری اور باطنی ہیئت و شکل تبدیل ہو جائے اور علامہ خطابی نے بلاجماع ان سے انتفاع کے جواز پر استدلال کیا ہے کہ جب کسی کا جانور مر جاتا ہے تو اسے شکاری کتوں کے کھانے کیلئے پیش کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح مردار کی چربی سے کشتیوں کو طلاء کرنا بھی جائز ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں، جیسا کہ عون المعبود (ج ۳) ص: ۲۹۸ میں فتح الباری کے حوالہ سے منقول ہے اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (ج ۴) ص: ۲۴۲ میں کہا ہے کہ یہ بات معلوم رہنی چاہئے کہ انتفاع کا باب، بیع سے زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جسے فروخت کرنا حرام ہے، ضروری نہیں کہ اس کا انتفاع بھی حرام ہو۔ ان دونوں کے مابین تلازم نہیں ہے لہذا جس چیز کا فروخت کرنا حرام ہے اس سے حرمت انتفاع اخذ نہیں کی جائے گی۔ اصنام (ہوں) کی خرید و فروخت تو صرف اس لئے حرام کی گئی ہے کہ یہ شرک کے آلات میں سے ایک آلہ ہیں

509 خريد و فروخت کے مسائل

اور اسی سے ہر آلہ شرک کی حرمت مستفید ہوتی ہے اور اسی پر باجے اور گانے بجانے کے آلات کو قیاس کیا گیا ہے اور شراب کی حرمت میں ہر نشہ آور چیز کی حرمت شامل ہو گئی۔ خواہ وہ چیز مائع (بننے والی) ہو یا منجمد و جامد۔ کشید کی گئی ہو یا پکا کر تیار کی گئی۔ یہ حدیث تین قسم کی اجناس کی حرمت پر مشتمل ہے۔ مشروبات (پینے کی اشیاء) جو عقل کو فاسد کر دیتے ہیں۔ کھانے جو طباع میں فساد پیدا کرتے ہیں اور خبیث غذا بنتے ہیں اور نقود (دولت) جو فساد ادیان کا باعث ہوتے ہیں اور فتنہ اور شرک کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ (الحدی) اس حدیث میں تنبیہ شدید ہے کہ ہر وہ حیلہ جو حرام کو حلال بنانے کے راستے کی طرف لے جاتا ہو وہ باطل ہے۔

(۶۵۰) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا اخْتَلَفَ فَرْخُكَ فِي شَيْءٍ مِنْ مَتَابِعِ الْمَتَابِعَانِ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ، اخْتَلَفَ وَاقِعٌ هُوَ جَائِزٌ أَوْ حَرَامٌ، فَالْقَوْلُ مَا يَقُولُ رَبُّ السَّلْعَةِ أَوْ يَأْسُ نَهْ هُوَ تَوْ صَاحِبُ مَالٍ كِي بَاتٍ مَعْتَبَرٌ هُوَ كِي يَ وَه يَنْتَارَكَانِ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. (اے پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا اختلف فرخك﴾ متبايعان سے مراد سودا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا۔ اختلاف خواہ تعین قیمت میں ہو، یا فروخت شدہ چیز کے بارے میں، یا کسی شرط کے طے کرنے میں ﴿بینة﴾ یعنی شہادت و گواہی اور دلیل ﴿رب السلعة﴾ فروخت شدہ چیز کا مالک اور ﴿السلعة﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ یعنی ساز و سامان ﴿ینتارکان﴾ دونوں فروخت شدہ چیز کو واپس کر دیں اور بیع کو فسخ کر دیں اور صاحب مال کی بات کو تسلیم کیا جائے گا، جب کہ قواعد شرع کے مطابق وہ قسم کھائے، جس کی بات کو تسلیم کیا جائے گا قسم بھی اسی پر لازم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب فروخت کنندہ اور خریدار کے مابین کسی چیز کے بارے میں اختلاف واقع ہو جائے تو فروخت کرنے والے کی بات کو ترجیح ہوگی، ورنہ خریدار اپنی ادا شدہ رقم واپس لے اور فروخت کرنے والا اپنی فروخت شدہ چیز واپس لے اور سودا فسخ کر دیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہی چیز اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ فروخت کنندہ کو قسم کھا کر کہنا ہوگا کہ جو بیان میں دے رہا ہوں وہ درست اور ٹھیک ہے اور قسم بھی شرعی قواعد کے مطابق ہوگی۔

(۶۵۱) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا اخْتَلَفَ فَرْخُكَ فِي شَيْءٍ مِنْ مَتَابِعِ الْمَتَابِعَانِ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ، اخْتَلَفَ وَاقِعٌ هُوَ جَائِزٌ أَوْ حَرَامٌ، فَالْقَوْلُ مَا يَقُولُ رَبُّ السَّلْعَةِ أَوْ يَأْسُ نَهْ هُوَ تَوْ صَاحِبُ مَالٍ كِي بَاتٍ مَعْتَبَرٌ هُوَ كِي يَ وَه يَنْتَارَكَانِ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. (اے پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

خرید و فروخت کے مسائل 510

الْكَلْبِ، وَمَهْرِ الْبَغِيِّ، وَخُلُوفِ الْفَرَمَايَا۔ (بخاری و مسلم)
الْكَاهِنِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

لعوی تشریح : ﴿ البغی ﴾ ”با“ پر فتح اور غین کے نیچے کسرہ اور یا پر تشدید۔ یعنی زانیہ یہاں فعلیل فاعلہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بغی، بغاء سے ماخوذ ہے۔ بغاء میں ”با“ کے نیچے کسرہ۔ اس کے معنی زنا ہیں اور مہر البغی سے مراد وہ اجرت و کمائی ہے جو زنا کاری کے عوض فاحشہ عورت حاصل کرتی ہے اسے مجازاً مہر کہا گیا ہے۔ ﴿ الکاهن ﴾ اس کو کہتے ہیں جو مخفی و پوشیدہ رازوں کے جاننے اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق پیشگی مطلع کرنے کا دعویدار ہو۔ مثلاً نزول بارش کی اطلاع کا دعویٰ۔ وباء کے پھوٹ پڑنے اور واقع ہونے کے متعلق دعویٰ، قتل و قتل اور جنگ و جدال کے ظہور کا دعویٰ وغیرہ۔ ان چیزوں کی معرفت کا جو بھی دعویدار ہو وہ اس میں شامل ہے جیسے عرف، نجومی، رمال، کنکریوں پر مار کر بتانے والا اور جفر کا عامل (اسرار حروف کے علم کا دعویدار) وغیرہ اور ﴿ حلوان الکاهن ﴾ حلوان کے ”حا“ پر ضمہ اور لام ساکن۔ وہ معاوضہ و اجرت جو کاهن کو اس کے عمل کمات کے بدلہ میں دی جاتی ہے۔ یہ حلاوت کے لفظ سے ماخوذ ہے۔ شیریں چیز کے ساتھ اس کی مشابہت سے مراد یہ ہے کہ یہ بغیر کسی مشقت و کلفت کے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے مذکورہ بالا چیزوں کی حرمت ثابت ہے۔ مگر بعض ائمہ نے شکاری کتے کی قیمت کو مستثنیٰ کیا ہے اور اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، لیکن جمہور علماء نے کتے کی مطلقاً قیمت کو حرام قرار دیا ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں کتے کی قیمت اور بازاری عورت کی زنا کی کمائی اور کاهن کی کمات کی اجرت حرام قرار دی گئی ہے۔ کتابذات خود نجس ہونے کی بنا پر حرام ہے۔ حرام چیز کی قیمت لینا بھی حرام ہے۔ زنا اسلام میں قطعی حرام ہے اس کی کمائی بھی حرام۔ پیشہ کمات حرام ہے تو اس کی اجرت بھی حرام ہے۔

(۶۵۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ حَضْرَتِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يَسِيرُ عَلَى جَمَلٍ لَهُ قَدْ أَغْنَا، فَأَرَادَ تَحْتَهُ . انْصَرَفَ فِي سَفَرٍ كَرِهَ أَنْ يُسَبِّهُ، قَالَ: فَلَحِقَنِي النَّبِيُّ ﷺ، حَضْرَتِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ كَايِيَانِ هُوَ أَنَّهُ فِي سَفَرٍ مَعَهُ قَدْ دَعَا لِي، وَضَرَبَهُ، فَسَارَ سَبْرًا لَمْ يَبْغِيهِ، قَالَ: بَغْيِيهِ بِأَوْقِيَّةٍ، وَأَشْتَرْتُ خُمْلَانَهُ إِلَى أَنَّهُ لَمْ يَبْغِيهِ، قَالَ: بَغْيِيهِ فَبَغْتُهُ اس سَبْلَةَ اِيْسَى تِيْز رَقَاْرَى سَ نَسِيْ جَلَا تَحَا . اِيْسَى بِأَوْقِيَّةٍ، فَلَمَّا بَلَغْتُ أَتَيْتُهُ بِالْجَمَلِ، فَرُوْخْتُ كَرُوْ . ”مِيْسَ نَ عَرْضَ كَاْيِيَانِ . اِيْسَى نَ

فَقَدَنِي ثَمَنُهُ، ثُمَّ رَجَعْتُ، فَأَرْسَلَ بِحُرٍّ دُونَ مِائَةِ دِينَارٍ، فَقَالَ: أَتُرَانِي مَا كُنْتُكَ لَا تَأْخُذُ جَمَلَكَ؟ خُذْ جَمَلَكَ وَالْوَلَدَ تَكُنْ سَوَارًا هُوَ كَرِجَاؤُكَ. (پس جو نبی (مدینہ) وَدَرَاهِمَكَ، فَهُوَ لَكَ. نَبَقْتُ عَلَيْهِ. وَعَدَا) پانچا تو میں وہ اونٹ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے اس کی نقد قیمت مجھے ادا فرمادی۔

پھر میں (رقم وصول کر کے) واپس آگیا۔ آپ نے میرے پیچھے (اونٹ) بھیج دیا اور فرمایا کہ ”تیرا خیال ہے کہ میں نے اونٹ کی قیمت کم کی تاکہ تیرا اونٹ لے لوں؟ اپنا اونٹ لے لو اور رقم بھی اپنے پاس رکھو یہ تیرے لئے ہے۔“ (بخاری و مسلم، یہ سیاق مسلم میں ہے)

لعنوی تشریح: ﴿اعیاء﴾ تھک گیا، درمائدہ ہو گیا، چلنے سے رہ گیا۔ ﴿یسبہ﴾ باب تفعیل سے ہے، معنی ہے اسے آزاد چھوڑ دے، جہاں چاہے چلے پھرے ﴿وقبہ﴾ ”داؤ“ پر ضمہ، قاف کے نیچے کسرہ اور ”یا“ مشدود۔ اسے اوقیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اوقیہ کے حمزہ پر ضمہ ”داؤ“ ساکن۔ ”یا“ پر تشدید بھی ہے اور تخفیف بھی۔ چاندی کے چالیس درہم۔ ان کا وزن ساڑھے دس تولہ کے مساوی ہوتا ہے، جدید بیانہ کے مطابق ۱۳۷ گرام بنتا ہے۔ ﴿حملانہ﴾ ”عما“ پر ضمہ، اس پر سوار ہونا، یعنی میں نے آپ سے یہ شرط طے کر لی کہ مدینہ تک سوار ہو کر جاؤں گا۔ ﴿فنقدنی﴾ باب نصر ینصر سے۔ مجھے اس کی قیمت نقد ادا فرمادی۔ ﴿انری﴾ حمزہ اور ٹا پر فتح اور حمزہ کے نیچے کسرہ اور ”عما“ ساکن بھی منقول ہے۔ میرے پیچھے، میرے نقش قدم پر ﴿انسانی﴾ استفہام انکاری ہے۔ فعل صیغہ مجہول، ظن کے معنی میں، یعنی کیا تو نے گمان کر لیا اور میرے بارے میں سمجھ لیا کہ ﴿ماکسک﴾ صیغہ متکلم۔ ماکسہ سے ماخوذ ہے، یعنی میں نے قیمت کم کرنے کی کوشش کی۔ آپ کا یہ اشارہ اس طے شدہ قیمت کی طرف تھا، جو بیع کے وقت طے ہوئی تھی۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ چوپائے کو مشروط طور پر فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے اور جمور کی رائے بھی یہی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ شرط جائز ہے، بشرطیکہ سفر کی مسافت تین روز سے زیادہ نہ ہو، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دوسرے علماء و فقہاء کے نزدیک مطلق جائز نہیں۔ مگر یہ حدیث ان اقوال میں سے کسی قول کے ساتھ مکمل مطابقت نہیں رکھتی۔ حدیث کا سیاق بتاتا ہے کہ دونوں سفر سے گھر واپس آرہے تھے اور دونوں کا راستہ بھی ایک ہی تھا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو سوار ہو کر گھر پہنچنے کی حاجت و ضرورت تھی اور نبی ﷺ کو بھی ایسے آدمی کی خدمت درکار تھی جو اسے ہانک کر مدینہ پہنچا دے۔ اس صورت میں جانبین و طرفین کیلئے اس شرط میں کوئی

512 ————— خرید و فروخت کے مسائل

مضانقہ و حرج نہیں تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دونوں کیلئے اس میں نرمی و آسانی تھی اور دونوں کی مصلحت کی رعایت بھی تھی۔ پس حدیث میں اس سے زائد شرط کی کوئی دلیل نہیں کہ فروخت کنندہ اور خریدار کی مصلحتوں کا جو خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے، وہ جائز ہے، یوں نہیں کہ یہ شرط مطلقاً جائز ہے، خواہ خریدار کا اس میں نقصان ہی ہو اور نہ ہی مطلقاً ممنوع ہے، کیونکہ اس میں بغیر کسی مناسب وجہ کے حدیث کی تردید پائی جاتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی سے ازخود یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی فلاں چیز اسے فروخت کر دے، جائز ہے۔ قیمت طے کرنا اور قیمت میں کسی کا تقاضا کرنا بھی جائز ہے۔ اگر سواری ہو تو یہ شرط لگانا کہ میں اپنے گھر تک اس پر سوار ہو کر جاؤں گا، جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کسی کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو یا رہائشی جگہ ہو تو خریدار سے کچھ مدت تک کیلئے رہائش کی شرط طے کرنا جائز ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مکان فروخت کیا۔ خریدار سے ایک ماہ تک رہائش کی شرط طے کر لی۔ اس حدیث سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ کسی چیز کی قیمت کم کرانے میں جائز حدود سے اپنے اثر و رسوخ اور منصب کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اسوۂ رسول سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ ایثار سے کام لینا چاہئے اور اپنے بھائی کی حیثیت کا خیال رکھنا چاہئے۔ نیز اونٹ کی تیز رفتاری سے حضور ﷺ کا معجزہ بھی ثابت ہوا۔

(۶۵۳) وَعَنْهُ قَالَ: أَغْتَقَ رَجُلٌ مِنَّا حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ عَبْدًا لَهُ عَنْ دُبُرٍ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ ہم میں سے کسی شخص نے اپنا غلام مدبر کر دیا۔ اس غَیْرُهُ، فَذَعَا بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَبَاغَهُ. مَنَعَهُ غلام کے سوا اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی ﷺ نے اس غلام کو بلوایا اور اسے فروخت کر دیا۔
(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿رجل منا﴾ بعض انصار میں سے کوئی آدمی۔ اس کا نام ابو مذکور انصاری تھا اور اس کے غلام کا نام یعقوب تھا اور وہ قبلی تھا۔ عبد اللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور امارت کے آغاز ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ ﴿دبر﴾ دال اور بادونوں پر ضمہ، معنی پیچھے۔ کسی چیز کا آخری حصہ۔ یعنی اس نے غلام سے کہا کہ میری وفات کے بعد تو آزاد ہے۔ ﴿فباعہ﴾ آپ نے اسے آٹھ سو درہم میں فروخت کر دیا اور نعیم بن حمام رضی اللہ عنہ نے اسے خرید لیا۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ مقروض تھا، اسی لئے آپ نے اسے فروخت کیا تاکہ اس کا قرضہ اتار دیا جائے۔) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدبر غلام کو ضرورت و حاجت کے وقت فروخت کرنا جائز ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ، اہل حدیث اور عام فقہاء اس کی مطلقاً فروخت کے قائل ہیں۔ حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع پر فروخت کرنا جائز ہے۔

(۶۵۴) وَعَنْ مِمْوَنَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت ميمونة رضی اللہ عنہا زوجہ رسول مقبول ﷺ سے

روایت ہے کہ ایک چوہیا گھی میں گر کر مر گئی۔ اس کے متعلق نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ (جواب میں) آپ نے فرمایا ”اسے نکال کر باہر پھینک دو اور اس کے ارد گرد کا گھی بھی باہر ڈال دو اور (بقیہ) استعمال کر لو۔“ (بخاری) نسائی اور احمد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے۔ ”منجد گھی میں۔“

(۶۵۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا وَقَعَتِ الْفَارَةُ فِي السَّنَنِ، فَإِنْ كَانَ جَامِداً فَأَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا، وَإِنْ كَانَ مَائِعاً فَلَا تَقْرُبُوهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَقَدْ حَكَمَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو حَنِيمٍ بِالْوَهْمِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب چوہا گھی میں گر جائے۔ اگر گھی منجمد ہو تو اس چوہے کو اور اس کے ارد گرد کے گھی کو باہر پھینک دو اور اگر گھی سیال ہو تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکو۔“ (اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری اور ابوحاتم نے اس پر وہم کا حکم لگایا ہے)

حاصل کلام: ﴿ماحولہا﴾ وہ حصہ جو اس چوہے کے جسم سے لگ ہو گیا ہو۔ ﴿مانعاً﴾ بننے والا سیال ہو۔ اسے باہر پھینکنے کا حکم اور اس کے قریب پھٹکنے کی ممانعت، اس بات کی دلیل ہیں کہ نجس چکنائی (گھی، تیل) سے انشغال مطلقاً جائز نہیں۔ لیکن پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ انشغال کا باب، باب نجس سے کیس زیادہ وسیع ہے۔ تمام دلائل میں تطبیق یوں ہے کہ یہ ممانعت صرف انسان کے کھانے اور بطور تیل استعمال کرنے پر محمول ہے۔ جب اس کا کھانا اور بطور تیل استعمال کرنا درست نہیں تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھانا بلا دلی حرام ہے۔

جلد اور مانع کا فرق اس لئے ہے کہ جلد میں چوہے کی تمیز ہو سکتی ہے جبکہ مانع میں اس کا امکان نہیں کہ کس اور کتنے حصے سے چوہے کا بدن ملوث ہوا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ نے اس پر وہم کا حکم لگایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث مسند میمونہ کی ہے۔ مسند ابی ہریرہ سے نہیں ہے، لہذا اس پر وہم کا حکم سند کے اعتبار سے ہے متن کے اعتبار سے نہیں۔

(۶۵۶) وَعَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ قَالَ: سَأَلْتُ جَابِرًا عَنْ ثَمَنِ السَّنُورِ وَالْكَلْبِ. فَقَالَ: زَجَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذَلِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتَّسَنُّيُّ وَزَادَ: «إِلَّا

حضرت ابو الزبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پبی اور کتے کی قیمت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ نے اس بارے میں زجر و توبیخ فرمائی ہے۔ (مسلم و نسائی) اور

514 خرید و فروخت کے مسائل

کَلْبَ صَنِيدًا۔ نسائی میں اتنا اضافہ ہے کہ ”شکاری کتے کے علاوہ۔“

لغوی تشریح: ﴿السنور﴾ سین کے نیچے کمرہ اور نون پر تشدید اور فتح، واؤ ساکن، معنی بلا۔ ﴿زجر﴾ ڈانٹ ڈپٹ کر روک دیا، منع کر دیا۔ بھی دراصل تحریم کیلئے ہے۔ بالخصوص جبکہ ڈانٹ ڈپٹ بھی ساتھ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ بلی کا فروخت کرنا حرام ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ اس کا فروخت کرنا جائز ہے اور اس حدیث میں جو بھی ہے اس سے کراہت تنزیہی مراد ہے اور اس کا فروخت کرنا مکرم اخلاق اور مروت میں سے نہیں۔ یہ بات بھی مخفی نہیں کہ بغیر کسی مقضیٰ کے بھی کو اس کے حقیقی معنی سے خارج کرنا درست نہیں، جیسا کہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے اور جو شکاری کتے کے اشتہاء کا اضافہ ہے تو اس کے متعلق نسائی نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس لفظ سے باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ جیسا کہ صاحب سبل السلام نے کہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوالزبیر﴾ محمد بن مسلم بن مدرس الاسدی المکی، یہ حکیم بن حزام کے غلام تھے، تابعی تھے۔ ان کے ثقہ ہونے اور ان کی روایت کے حجت ہونے پر سبھی کا اتفاق ہے، البتہ مدلس ہیں۔ ۱۲۸ھ کو فوت ہوئے۔

(۶۵۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَنِي بَرِيرَةُ، اللَّهُ عَمَّا (لوندی) میرے پاس آئی اور کہنے لگی میں نے اپنے مالک سے نو اوقیہ چاندی پر مکاتبہ کر لی ہے کہ ہر سال میں ایک اوقیہ ادا کرتی رہوں گی۔ فَأَعْيَنِينِي! قُلْتُ: إِنْ أَحَبَّ أَهْلُكَ أَنْ لَنَدَامِيرِي (اس بارے میں) مدد کریں۔ میں نے (اسے) کہا کہ اگر تیرے مالک کو یہ پسند ہو کہ میں تیری مجموعی رقم یکمشت ادا کر دوں اور تیری دلاء میری ہو جائے تو میں ایسا کرنے کو تیار ہوں۔ بریرہ مِنْ عِنْدِهِمْ، وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ جَالِسٌ، فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ عَرَضْتُ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ فَأَبَوْا، إِلَّا أَنْ يَكُونَ الْوَلَاءُ لَهُمْ، فَسَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ، فَأَخْبَرَتْ عَائِشَةُ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «خُذِيهَا وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الْوَلَاءَ فَإِنَّمَا

خرید و فروخت کے مسائل 515

الْوَلَاءَ لِمَنْ أَعْتَقَ»، فَفَعَلْتَ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي النَّاسِ حَظِيْبًا، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «أَمَّا بَعْدُ، فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرُطُونَ شُرُوطًا لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ؟ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللَّهِ فَهُوَ بَاطِلٌ، وَإِنْ كَانَ مِائَةً شَرْطٍ، قَضَاءُ اللَّهِ أَحَقُّ، وَشَرْطُ اللَّهِ أَوْثَقُ، وَإِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، وَعِنْدَ مُسْلِمٍ قَالَ: «اشْتَرَيْنَهَا، وَأَغْنَيْنَهَا، وَاشْتَرَيْتُ لَهَا الْوَلَاءَ».

یہ بات نبی ﷺ نے سنی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس واقعہ سے نبی ﷺ کو باخبر کیا۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا ”اسے لے لو اور ان سے ولاء کی شرط کر لو کیونکہ ولاء کا حق دار وہی ہے جو اسے آزادی دے۔“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ لوگوں میں خطاب فرمانے کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی پھر فرمایا ”لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں۔ (یاد رکھو! کہ) جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے، خواہ سینکڑوں شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ کا فیصلہ نہایت برحق ہے اور اللہ کی شرط نہایت ہی پختہ اور پکی ہے۔ ولاء اسی کا حق ہے جو آزاد کرے۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) مسلم کے ہاں ہے کہ آپ نے فرمایا ”اسے خرید لو اور آزاد کر دو اور ان سے ولاء کی شرط کر لو۔“

لعوی تشریح: ﴿کاتبت﴾ مکاتب سے ماخوذ ہے۔ مکاتب وہ پیمان ہے جو مالک اور اس کے غلام کے مابین ایک متعین رقم کے بدلہ میں طے ہوتا ہے کہ غلام جب وہ طے شدہ رقم ادا کر دے، وہ آزاد ہے۔ ﴿اہلی﴾ میرے مالک و آقا اور وہ قبیلہ انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ ﴿اواق﴾ اوقیہ کی جمع ہے، ایک اوقیہ چالیس درہم (سکہ چاندی) کا ہوتا ہے۔ ﴿فی کل عام اوقیہ﴾ یعنی قسط وار۔ ہر سال ایک اوقیہ خرید و فروخت میں اس طرح قسط طے کر لینا جائز ہے، یہ شرط کے طور پر نہیں تھا۔ ﴿فاعینینی﴾ اعانہ سے ماخوذ ہے۔ امر سے مؤنث مخاطبہ کا صیغہ۔ مطلب ہے کہ میری مدد و اعانت کرو۔ ﴿الولاء﴾ ولاء کی واؤ پر فتح۔ مالک اور غلام کے درمیان آزادی سے حاصل ہونے والا ربط۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالک آزاد کردہ غلام کی میراث کا مستحق ہو جاتا ہے جبکہ اس کے نہ اصحاب فروض ہوں اور نہ ہی نسبی عصبہ۔ ﴿فابوا﴾ اباء سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے اس شرط کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ﴿خذیہا﴾ اخذ سے امر کا صیغہ ہے۔ اسے خرید کر لے لو۔ ﴿واشترطی لہم الولاء﴾ اور تو ان سے ولاء کی شرط کر لے۔ یہاں لام، علی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔ ”وان اساتم

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں، مثلاً غلام اور اس کے مالک و آقا کے درمیان متعین رقم اور مقرر مدت کی صورت میں مکاتبہ جائز ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص غلام کی طے شدہ رقم ادا کر دے اور اسے آزادی دے دے تو ایسا بھی جائز ہے۔ اس کے ترکہ و میراث کا حقدار یہ آزاد کرنے والا ہوگا۔ اگر غلام اپنی مکاتبہ کی رقم ادا کرنے کیلئے کسی صاحب حیثیت سے سوال کرے تو یہ جائز ہے۔ مکاتبہ کی رقم قسط وار ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر مستحق آدمی سوال کرے تو اس کی مدد کرنی چاہئے۔ ناجائز شرط اگر عائد کرنے کی کوشش کی جائے تو اس شرط کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ اعتبار صرف شرعی شرط کا ہوگا۔ اس حدیث سے باہمی مشورہ کرنا بھی ثابت ہے۔ بیوی شوہر سے مشورہ طلب کرے تو شوہر کو صحیح مشورہ دینا چاہئے۔ جس مسئلہ کا لوگوں کو علم نہ ہو وہ مسئلہ عوام کے سامنے بیان کرنا چاہئے۔ مسئلہ کسی کا نام لے کر نہیں، بلکہ عمومی صورت میں بیان کرنا چاہئے۔ عوام سے خطاب کرنے کے موقع پر سب سے پہلے خالق کائنات کی حمد و ثناء بیان کرنی چاہئے۔ پھر اپنا مدعا و مقصد بیان کرنا چاہئے۔ کسی سے درخواست و استدعا کرنے کا بھی یہی اسلوب و انداز ہونا چاہئے۔ مکاتبہ لونڈی اور غلام کو فروخت کرنا جائز ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ و امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ہیرۃ بنی سہیل﴾ ”باء“ پر فتح اور ”راء“ پر کسره ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھیں۔ مغیث جو کہ آل ابی احمد بن جہش کے غلام تھے، ان کی یہ بیوی تھیں۔ جب یہ آزاد ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اختیار دیا تو اس نے اپنے خاوند مغیث جو کہ ابھی غلام ہی تھا، کو چھوڑ دیا۔

(۶۵۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى عُمَرُ عَنْ بَيْعِ أُمَّهَاتِ الْأَوْلَادِ، فَقَالَ: لَا تُبَاعُ، وَلَا تُؤَهَّبُ، وَلَا تُؤَرَّثُ، يَسْتَمْتِعُ بِهَا مَا بَدَأَ لَهُ، فَإِذَا مَاتَ فِيهَا حُرَّةٌ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَمَالِكٌ، وَقَالَ: رَفَعَهُ بَعْضُ الرُّوَاةِ قَوْهَمَ.

(جو وہم ہے)

لغوی تشریح: ﴿عَنْ بَيْعِ امْهَاتِ الْاَوْلَادِ﴾ ان لونڈیوں کی بیع جن کی ان کے مالکوں سے اولاد پیدا ہو چکی ہو۔ ﴿لَيْسَ مَتَّعَ بِهَا﴾ اس کا مالک فائدہ اٹھائے۔ ﴿مَابِدَا﴾ جب تک چاہے۔
حاصل کلام: امہات الاولاد کا واحد ام ولد ہے، اس لونڈی کو کہتے ہیں جو اپنے مالک کا بچہ جنم دے۔ جب تک مالک زندہ رہے اس وقت تک وہ اس کی لونڈی ہے، اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب فوت ہو جائے تو از خود آزاد ہو جاتی ہے۔ آقا کی اولاد کا اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں رہتا۔ لونڈی جب مالک سے بچہ جنم دے دے تو کیا اسے بیچا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ام ولد کی خرید و فروخت حرام ہے۔ خواہ بچہ زندہ ہو یا نہ ہو۔ مگر امام داؤد ظاہری کے نزدیک یہ جائز ہے۔ آگے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ممانعت کا فرمان حرمت بیع کی تائید کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان اس وقت کا ہو جب بیع کی ممانعت کا فرمان جاری نہ ہوا ہو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت کے مرفوع ہونے سے اختلاف ہے۔ محدثین کے طریق پر یہ حدیث اس حیثیت سے مرفوع ہو سکتی ہے کہ اس میں اجتہاد کو دخل نہ ہو۔ عموماً صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو قبول کیا ہے اور جمہور کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۶۵۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ ہم ام ولد نَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَبْنِي سَرَارِينَا لَوْنْدِيَّوْنَ كُوْنِي مِلْكِيَّةً فِي مَوْجُوْدِيَّةٍ فِي فَرْوَحَتِ كُرْدِيَا اُمَّهَاتِ الْاَوْلَادِ، وَالنَّبِيِّ ﷺ حَيًّا، كَرْتِي تَحْتِي۔ آپ اس میں کوئی قباحت و مضائقہ لَا يَرَى بِذَلِكَ بَأْسًا۔ رَوَاهُ الشَّيْخَانِ وَابْنُ نَهْمٍ سَمِعْتُهُ تَحْتِي۔ (اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی تینوں مَاجِيَةُ وَالْاَوَّلَادِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَانَ۔ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿سَرَارِينَا﴾ اس میں ”یا“ پر تشدید، سریہ کی جمع ہے، ”سریہ“ کے ”سین“ پر ضمہ ”را“ پر تشدید اور ”یا“ پر بھی تشدید۔ لونڈی جو کسی کی ملکیت میں ہو۔ یہ حدیث ام الولد کی بیع کے جواز کی مقتضی ہے، لیکن اکثر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ متاخرین کی ایک جماعت نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسے فروخت کرنے سے منع کرنا اور صحابہ کا مخالفت نہ کرنا، اس کی دلیل ہے کہ وہ اس کی ممانعت پر متفق تھے اور ان کی تائید نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے ایما امرہ ولدت من سیدھا فہی معتقۃ عن دبرمنہ کہ جو لونڈی اپنے مالک سے بچہ کو جنم دے، وہ اس کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔ اسے احمد، ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے اور بھی بہت سے طرق اور الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو عون المعبود (ج ۳، ص: ۴۷) اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل عام اور ضابطہ کلیہ پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ

(۶۶۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حَدَّثَنَا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ فَوَاحِشٍ مُسْلِمَةٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «وَعَنْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ» روايت میں یہ اضافہ ہے کہ اونٹ کی جفتی کا بیع ضراب الجنل۔ معاوضہ لینا بھی ممنوع ہے۔

لغوی تشریح: ﴿عن بیع فصل الماء﴾ زائد از ضرورت پانی سے مراد وہ پانی ہے جو ایسی مباح زمین میں ہو جو کسی اور کی ملکیت نہ ہو، اس پر جو سبقت کر کے پہلے پہنچ جائے، اس کیلئے خود پانی پینا، اپنی زمین کو سیراب کرنا اور جانوروں کو پلانا درست ہے۔ اپنی ساری ضرورت پوری کرنے کے بعد جتنا کچھ پانی بچ جائے اسے فروخت کرنا، اس کیلئے جائز نہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ ایک آدمی اپنی ملکیت والی زمین میں گڑھا کھودتا ہے اور اس میں باہر سے پانی ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اپنی زمین میں کنواں کھودتا، یا اس میں چشمہ پھوٹ پڑتا ہے تو بلا ریب وہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔ اب اس پر واجب و لازم نہیں کہ جو اس کی اپنی اور مویشیوں کی ضرورت کے بعد بقیہ پانی ہے، وہ اسے بطور عطیہ و بخشش کے دوسرے کو دے۔ عام فقہاء کی یہی رائے ہے، مگر شوکانی نے نیل الاوطار میں بیان کیا ہے ”بظاہر اپنی مملوکہ زمین میں جمع ہونے والے پانی اور مباح زمین میں پائے جانے والے پانی کا کوئی فرق نہیں خواہ وہ اپنے پینے کیلئے ہو، یا غیر کیلئے، خواہ جانوروں کی ضرورت کیلئے ہو، یا زمین کو سیراب کرنے کیلئے، خواہ وہ کسی وسیع بیابان میں ہو، یا اور کسی دوسری جگہ“ رہا اس آدمی کا معاملہ جس نے اپنے مشکینہ یا برتن میں پانی ذخیرہ کیا ہو تو وہ اس حدیث میں مذکور نہیں۔ وہ تو دوسرے مباحات کی طرح ہے کہ جب وہ اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے، مثلاً لکڑیاں، گھاس اور نمک وغیرہ تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے (الحدی، ج ۴ ص ۲۵۹) میں وضاحت کی ہے۔ ﴿وعن بیع ضراب الجمل﴾ الضراب میں ضاد کے نیچے کسرہ۔ ز جانور کا اپنی مادہ سے جفتی کرنے کو کہتے ہیں، تاکہ وہ ز اس جفتی سے مادہ کو حاملہ کر دے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس جفتی کا کرایہ اور اس کے ڈالے ہوئے پانی کی اجرت و معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ جمہور کے نزدیک بھی تحریم کیلئے ہے اور صحیح بات بھی یہی ہے۔

(۶۶۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَزْرَ كِي جَفْتِي كَ مَعَاوِضَ كُو مَمْنُوعٍ قَرَارِ دِيَا

بَخَّارٍ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ . رَوَاهُ . (بخاری)

البَخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿عَسْبِ الْفَحْلِ﴾ دونوں کلمے اپنے پہلے حرف پر فتح کے ساتھ ہیں اور دوسرے کے سکون کے ساتھ۔ ”فحل“ نر حیوان کو کہتے ہیں، گھوڑا ہو، یا اونٹ، یا بکرا وغیرہ اور عَسْب کہتے ہیں نر کی جفتی کو، یا اس سے خارج ہونے والے پانی کو، یا اس کی نسل اور اولاد کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور جفتی کے عوض کرایہ دینے کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ صاحب قاموس نے کہا ہے اور اس حدیث میں بھی کامور دراصل وہ معاوضہ ہے جو نر کی جفتی کے عوض لیا جاتا ہے۔

(۶۶۲) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبْلِ الْحَبْلَةِ، وَكَانَ بَيْعًا بَيْنَايَعُهُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ، كَانَ الرَّجُلُ يَتَنَاقَشُ الْجَزُورَ إِلَى أَنْ تُنْتَجَجَ النَّاقَةُ، ثُمَّ تُنْتَجَجَ الْتَوِي فِي بَطْنِهَا. مُتَّفَقٌ. (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ غلّیہ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ).

(بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿حَبْلِ الْحَبْلَةِ﴾ حبل اور حبلہ دونوں پر فتح ہے اور حبل مصدر ہے۔ مراد اس سے حمل ہے یعنی پیٹ میں جنین اور حبلہ، حائل کی جمع ہے جیسے ظلمۃ اور کسبۃ ظالم اور کاتب کی جمع ہے اور حائل جس کے پیٹ میں بچہ ہو۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنین کی فروخت ممنوع ہے، جبکہ وہ اپنی ماں کے شکم میں ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مادہ کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے، اس کا بچہ فروخت کرنا ممنوع ہے۔ یعنی اونٹنی کے حمل کا حمل۔ اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچہ معدوم اور مجہول دونوں پہلو رکھتی ہے۔ اور اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کو قبول کیا جائے، کیونکہ ایک طرح یہ دھوکے کی بیع ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کی بیع اس وقت تک کہ اونٹنی بچہ جنم دے، یا اس اونٹنی کا بچہ جوان ہو کر بچے بنے۔ اس میں بھی کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیع ایسی ہے جس کی مدت نامعلوم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جس بیع کی ممانعت مذکور ہے، اس کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں: ایک یہ کہ اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے، وہ پیدائش کے بعد جوان ہو کر جو بچہ بنے گی، اسے میں خریدتا ہوں اور اس کی قیمت اتنی آج مجھ سے لے لو اور دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ یہ اونٹنی میں تجھے دیتا ہوں اس قیمت پر کہ یہ جو بچہ بنے گی، اس کا بچہ مجھے دینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی تو کیفیت و ہیئت اور نوعیت ہی نامعلوم اور مجہول ہے، اس لئے مجہول اور نامعلوم چیز کا فروخت

520 ————— خرید و فروخت کے مسائل

کرنا، اسلام میں ممنوع ہے۔ نیز اس میں دھوکہ دہی کی بیع کا بھی اشتباہ ہے اور بیع غرر بھی اسلام میں ممنوع ہے۔ یہی مذہب ہے امام احمد رحمہ اللہ اور اسحق رحمہ اللہ وغیرہ کا۔ اس کی جو تفسیر و مکان بیع الخ کے ساتھ نافع یا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائیگی قیمت کی میعاد مقرر کی جاتی تھی، اس طرح کہ جو بچہ اس وقت اونٹنی کے پیٹ میں زیر پرورش ہے اس کے جوان ہونے پر جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس اونٹ کی قیمت ہوگی۔ اس تفسیر کو امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ اس صورت میں ممانعت کی توجیہ کرتے ہیں کہ رقم کی ادائیگی کی میعاد غیر متعین ہے، اس لئے ایسی بیع بھی ممنوع ہے۔

(۶۶۳) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هَبْتِهِ. مَثَقٌ رسول اللہ ﷺ نے ولاء کے فروخت کرنے اور اس کے حباب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں ولاء کے فروخت کرنے اور اسے حباب کرنے کی ممانعت ہے۔ ولاء وراثت کے حق کو کہتے ہیں۔ جو آزاد کرنے والے کو آزاد کردہ غلام کی طرف سے ملتا ہے۔ اہل عرب آزاد ہونے والے کی وفات سے پہلے ہی غلام کو فروخت کر دیتے، یا ہمہ کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ممنوع قرار دے دیا، تاکہ ولاء آزاد کرنے والے کے وارثوں کو ملے، یا اگر خود زندہ ہے تو وہ خود حاصل کر لے۔ لہذا ایسے غلام کا فروخت کرنا یا اسے ہمہ کرنا جائز نہیں۔ جمہور علماء سلف و خلف سب کا یہی مسلک ہے۔

(۶۶۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکری پھینک کر تجارت کرنے اور دھوکہ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ، وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ. کی تجارت سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عن بيع الحصة﴾ یہ مصدر کی اضافت اپنی نوع کی طرف ہے۔ مصدر کی اضافت اس کے مفعول کی طرف نہیں ہے اور کنکری پھینک کر بیع کی نوعیت یہ تھی کہ فروخت کرنے والا کتنا تھا کہ یہ کنکری پھینکو جس کپڑے پر جا لگی، وہ درہم کے عوض تمہارا اور اس کی تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی اتنی زمین اسے فروخت کر دے گا جہاں پھینکی ہوئی کنکری پہنچے گی اور یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی مٹی میں کنکریاں بند کر کے کتا۔ فروخت شدہ چیز کے بدلے جتنی کنکریاں میری مٹی سے نکلیں، اتنی چیزیں میری ہوں گی، یا وہ کوئی سودا فروخت کرتا اور اپنی مٹی میں کنکریاں بند کر لیتا اور کتا کہ ہر کنکری کے بدلے میرا ایک درہم اور یہ تفسیر بھی ہے کہ ایک مٹی بند کر لیتا اور اس کے ایک ہاتھ میں کنکریاں ہوتیں اور وہ کتا جو مٹی کنکریاں نیچے گریں بیع واجب ہو جائے گی اور یہ تفسیر بھی ہے کہ دونوں سودا کرتے اور ایک دوسرے سے کتا کہ جب میں تیری طرف کنکری پھینکوں، بیع واجب ہو جائے گی اور یہ تفسیر بھی ہے کہ

خرید و فروخت کے مسائل 521

بکریوں کا ریوڑ اس کے سامنے آتا اور وہ کنکریاں مٹھی میں پکڑ کر کہتا جس بکری کو یہ کنکری جا لگے وہ تمہاری اتنی قیمت کے بدلہ۔ یہ تمام صورتیں فاسد ہیں، کیونکہ مال کو ناحق و باطل طریقہ سے، نیز ایسے دھوکہ اور ایسی شرط لگا کر کھانے کو، جس میں قمار و جوئے کا اشتباہ ہے، متضمن ہے، جیسا کہ علامہ ابن قیم نے (المدی: ج ۴، ص: ۲۶۶) میں بیان کیا ہے۔ ﴿وعن بیع الغرر﴾ اس میں مصدر کی اضافت اپنے نوع کی طرف ہے اور ”غرر“ کے غین اور راء دونوں پر فتح ہے۔ اس دھوکہ اور فریب کو کہتے ہیں جس میں یہ گمان ہو کہ جب بیع واقع ہوگی تو اس وقت رضامندی ہوگی یا نہیں اور جس کا انجام نامعلوم ہے۔ اس خطرے کی وجہ سے جس کے متعلق معلوم ہی نہیں کہ آیا یہ بیع متحقق بھی ہوگی یا نہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دھوکہ کی خرید و فروخت سے ممانعت کتاب البیوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصل ہے اور اس میں بے شمار اور ان گنت مسائل داخل ہیں۔ مثلاً بھاگے ہوئے غلام کو فروخت کرنا۔ معدوم و مجہول شے کی بیع۔ جسے آدمی کسی کے سپرد کرنے کی قدرت ہی نہ رکھتا ہو اور وہ چیز جس پر بیچنے والے کی ملکیت مکمل نہ ہوئی ہو۔ کثیر پانی میں موجود مچھلی کی بیع، جانور کے تھنوں میں موجود دودھ کی بیع، پیٹ میں موجود جینن کی بیع اور مبہم (غیر واضح) غلہ کے انبار و ڈھیر میں سے بعض حصہ کی بیع۔ بہت کپڑوں میں سے کسی ایک کپڑے کی بیع اور بہت سی بکریوں میں سے کسی ایک بکری کی بیع وغیرہ، ایسی ہی دیگر مثالیں موجود ہیں۔ اس قسم کی ہر بیع باطل ہے، کیونکہ اس میں بلا ضرورت دھوکہ پایا جاتا ہے۔ معلوم رہے کہ بیع ملامسہ، بیع منابذہ، بیع حبیل الحبلة، بیع الحصاة اور عسب الفحل وغیرہ سے ملتی جلتی بیوع کی ایسی صورتیں جن کے بارے میں بالخصوص نصوص وارد ہیں، یہ سب دھوکہ کی بیع کی ممانعت میں داخل ہیں۔ لیکن خاص طور پر بیع غرر کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دور جاہلیت کی مشہور و معروف بیوع میں سے ہے۔ (شرح مسلم للنووی)

(۶۶۵) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول قَالَ: مَنْ اشْتَرَى طَعَامًا فَلَا يَبِيعُهُ اللَّهُ ﷻ نے فرمایا ”جو شخص کوئی غلہ خریدے تو حَتَّى يَكْتَالَهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. جب تک اسے ماپ نہ لے، اسے آگے فروخت نہ کرے۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿حتی یکتالہ﴾ یعنی جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ لے اور ناپ تول نہ لے۔ یعنی جب ایک شخص کوئی چیز ناپ کر لیتا ہے اور اس پر اپنا قبضہ بھی کر لیتا ہے، اس کے بعد اسے فروخت کرتا ہے تو اسے پہلی ناپ تول پر آگے فروخت کرنا اس وقت تک جائز نہیں، جب تک کہ از سر نو اسے ناپ یا تول نہ لے۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ دوسرے شخص کو فروخت کرتے وقت نئے سرے سے اسے ناپنے یا تولنے کے حکم کی وجہ اور علت عین ممکن ہے یہ ہو کہ دوبارہ وزن کرنے سے یہ متحقق ہو جائے کہ تول و ماپ میں کوئی دھوکہ اور فریب نہیں۔ (تخصیص از سبل السلام)

خرید و فروخت کے مسائل 522

(۶۶۶) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ابُوهريره رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّهُ يَبْعُ فِي بَيْعَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ. اللَّهُ ﷻ لَمْ يَبْعَ فِي بَيْعَةٍ. (احمد و نسائی) اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے
وَلَا يَبْنِي دَاوُدَ: «مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِيهِ» صحيح قرار دیا ہے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ
بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكُسُهُمَا أَوْ الرِّبَا. جس کسی نے ایک چیز کی دو قیمتیں مقرر کیں، وہ یا تو
کم قیمت لے لے، یا پھر وہ سود ہوگا۔

لغوی تشریح: ﴿عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: پہلا یہ کہ ایک شخص
دوسرے شخص سے یوں کہے کہ میں تجھے فلاں نقد ادائیگی کی صورت میں دس روپیہ میں فروخت کرتا
ہوں اور ادھار کی صورت میں بیس روپیہ میں اور وہ اس سے دونوں میں سے کسی بیع پر الگ نہیں ہوتا۔
دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ میں اپنا یہ مکان اتنی قیمت کے عوض
تمہارے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، بشرطیکہ تو اپنا غلام مجھے اتنی رقم کے بدلہ میں بیچ دے۔ جب تیرا غلام
میرے لئے واجب و ثابت ہو جائے گا تو میرا گھر تیرے لئے واجب و ثابت ہو جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں
ترمذی نے اہل علم سے نقل کی ہیں۔ بعض علماء نے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے کہ وہ ایک ماہ کیلئے
ایک دینار کے عوض ایک قفیز گندم دے گا۔ جب میعاد مقررہ پوری ہوگئی تو اس نے اس سے گندم کا
مطالبہ کر دیا اور کہا کہ جو گندم تجھ پر میری ادا کرنی آتی ہے اسے تو مجھے دو ماہ کیلئے فروخت کر دے تو یہ
دوسری بیع ہوئی جو پہلی بیع میں داخل ہوگئی۔ پس اس طرح یہ ایک ہی چیز کی دو بیع ہوئیں۔ دونوں نقصان
کی طرف ہی پلٹیں گی۔ یہی اصل ہے۔ اگر دونوں بیع مٹانی پر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ پہلی بیع کا باہمی
تقاضا کئے بغیر تو اس صورت میں دونوں سود خور ہوتے ہیں۔ یہ خطابی کا قول ہے۔ (ملاحظہ ہو عون المعبود ج
۳، ص: ۲۹۰) اس کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی شکلیں ہیں۔ ﴿فَلَهُ أَوْكُسُهُمَا﴾ الخ دونوں
صورتوں میں بہت کم اور بہت نقصان کی صورت میں ملے گا۔ یہ حدیث ان الفاظ سے بیان میں یحییٰ بن
زکریا عن محمد بن عمرو بن علقمہ منفرد ہے۔ اپنے عام ساتھیوں کے بیان کردہ الفاظ کی مخالفت کی ہے۔ لہذا یہ
روایت شذوذ سے خالی نہیں اور محمد بن عمرو ایسا راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کلام
کیا ہے۔ لہذا یہ روایت ان الفاظ سے قابل استدلال نہیں ہے۔

(۶۶۷) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّهُ يَبْعُ فِي بَيْعَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ. اللَّهُ ﷻ لَمْ يَبْعَ فِي بَيْعَةٍ. (احمد و نسائی) اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے
وَلَا يَبْنِي دَاوُدَ: «مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِيهِ» صحيح قرار دیا ہے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ
بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكُسُهُمَا أَوْ الرِّبَا. جس کسی نے ایک چیز کی دو قیمتیں مقرر کیں، وہ یا تو
کم قیمت لے لے، یا پھر وہ سود ہوگا۔

رَوَاهُ الْحَمَّانُ، وَصَحَّحَهُ التَّزَمِيذِيُّ وَابْنُ حُزَيْمَةَ نَحْنُ اور جو تیرے (اپنے) پاس موجود نہ ہو اس کا فروخت کرنا بھی جائز و حلال نہیں۔“ اسے پانچوں نے

وَأَخْرَجَهُ فِي عُلُومِ الْحَدِيثِ، مِنْ رِوَايَةِ أَبِي حَنِيفَةَ، عَنْ عَمْرِو الْمَذْكُورِ، بِلَفْظٍ «نَهَى عَنْ بَيْعِ» ابوخنیفہ کی روایت سے مذکورہ عمرو رضی اللہ عنہ کے واسطے وَشَرْطٍ. وَمِنْ هَذَا الْوَجْهِ أَخْرَجَهُ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ ”آپ“ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ، وَهُوَ غَرِيبٌ. نے بیع شرط کے ساتھ منع فرمائی ہے“ (اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں اسی طریق سے نقل کیا ہے اور وہ غریب ہے)

لغوی تشریح: ﴿سلف﴾ سین، لام، دونوں پر فتح۔ قرض ﴿وبیع﴾ قرض کے ساتھ۔ یعنی ایسی بیع حلال نہیں جس میں قرض کی شرط ہو۔ بایں طور کہ وہ کہے کہ میں یہ کپڑا تیرے ہاتھ دس روپے میں فروخت کرتا ہوں۔ بشرطیکہ تو مجھے دس روپے قرض دے، یا یوں کہے کہ میں تمہیں دس روپے قرض دیتا ہوں، بشرطیکہ تم اپنا سلمان مجھے فروخت کرو اور میرے سوا کسی اور کو نہ بیچو۔ ﴿ولا شرطان فی بیع﴾ اس کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ایک بیع میں دو بیع ہیں اور امام احمد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کی شکل یہ ہے کہ میں یہ کپڑا تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اس شرط پر میں ہی اسے درزی سے سلواؤں گا اور میں ہی اس کی کٹائی کروں گا۔ امام احمد رضی اللہ عنہ کا یہ قول ترمذی نے ذکر کیا ہے ﴿ولا بیع مالم یضمن﴾ بیع کے معنی منافع اور فعل صیغہ مجہول ہے۔ یعنی جب تک وہ اس کا مالک نہ ہو اور اسے اپنے قبضہ میں نہ لے۔ یعنی کسی سلمان کا منافع حاصل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اسے خرید کر اپنے قبضہ میں نہ لے لے۔ پس جب اسے اپنے قبضہ میں لے لے گا اور وہ چیز اس کی ضمانت میں داخل ہو جائے گی تو اس وقت اس کا فروخت کرنا اور اس پر منافع لینا جائز ہے۔ ﴿مالیس عندک﴾ ایسی چیز کی خرید و فروخت جو فروخت کے وقت اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ ﴿نہی عن بیع وشرط﴾ علامہ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے اپنے فتاویٰ میں کہا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے۔ مسلمانوں کی کتابوں میں اس کا کچھ بھی وجود نہیں، یہ تو منقطع حکایات میں بیان کی گئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوخنیفہ رضی اللہ عنہ﴾ ائمہ اربعہ میں سے ایک مشہور و معروف امام۔ نعمان بن ثابت کوئی نام۔ بنو تیم اللہ بن ثعلبہ کے مولیٰ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ابناء فارس میں سے ہیں۔ ریشم فروش تھے۔ روایت حدیث میں ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے اور دوسرے لوگوں نے ضعیف۔ ابن مبارک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ فقہ میں میں نے ان کا ثبیل نہیں دیکھا۔ اپنی خدا داد شہرت کی وجہ سے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ فقہ، ورع، زہد اور سخاوت میں مشہور ہیں۔ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں

وفات پائی۔

(۶۶۸) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ. رَوَاهُ مَالِكٌ، قَالَ: بَلَّغْنِي عَنْ عُمَرُو بْنِ شُعْبَةَ بِهِ.

حضرت عمرو بن شعیب ہی نے اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا۔ (اسے مالک نے روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے عمرو بن شعیب سے یہ روایت پہنچی ہے)

لغوی تشریح: ﴿عربان﴾ عین پر ضمہ اور ”را“ ساکن۔ عربان۔ بیعانہ کو کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی سے پلاٹ یا مکان کا سودا کیا۔ قیمت طے ہونے کے بعد خریدار نے فروخت کنندہ کو ہزار روپیہ بیعانہ کے طور پر ادا کر دیئے اور مدت طے کر لی کہ اتنی مدت تک اگر میں نے باقی رقم ادا کر دی تو مکان میرا اور رقم کی ادائیگی کے موقع پر ہزار روپیہ بیعانہ والا وضع کر لوں گا، اگر میعاد مقررہ پر بقیہ رقم ادا نہ کر سکوں تو ہزار روپیہ بیعانہ تمہارا۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اسی روایت کی بنا پر اس بیع کو ناجائز کہتے ہیں، مگر یہ روایت قطعی بلاغات میں سے ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں یہ متصل بھی مروی ہے مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ اس کے برعکس حضرت عمر رحمہ اللہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام احمد رحمہ اللہ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ (سبل)

(۶۶۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: ابْتِغْتُ زَيْنًا فِي السُّوقِ، فَلَمَّا اسْتَوْجَبْتُهُ لَقِينِي رَجُلٌ فَأَعْطَانِي بِهِ رِبْحًا حَسَنًا، فَأَرَدْتُ أَنْ أَضْرِبَ عَلَى يَدِ الرَّجُلِ، فَأَخَذَ رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِي بِذِرَاعِي فَالْتَفْتُ فَإِذَا هُوَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، فَقَالَ: لَا تَبِعْهُ حِينَ ابْتِغَيْتَهُ، حَتَّى تَحُوزَهُ إِلَى رَحْلِكَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى أَنْ تُبَاعَ السَّلْعُ حِينَ تُبْتَنَعُ، حَتَّى يَحُوزَهَا التُّجَّارُ إِلَى رِحَالِهِمْ. رَوَاهُ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے بازار سے روغن (زیتون) خریدا۔ جب میرا سودا پکا و السوق، فلما استوجبته لقيني رجل فأعطاني به ربحاً حسناً، فأردت أن أضرب على يد الرجل، فأخذ رجل من خلفي بذراعي فالتفت فإذا هو زيد بن ثابت، فقال: لا تبعه حين ابتغيته، حتى تحوزها إلى رحلك، فإن رسول الله ﷺ نهى أن تباع السلعة حين تبتاع، حتى يحوزها التجار إلى رحالهم. رواه

میں نے اس آدمی سے سودا دینے کی پیش کش کی۔ میں نے اس آدمی سے سودا اُضرب على يد الرجل، فأخذ رجل من خلفي بذراعي فالتفت فإذا هو زيد بن ثابت، فقال: لا تبعه حين ابتغيته، حتى تحوزها إلى رحلك، فإن رسول الله ﷺ نهى أن تباع السلعة حين تبتاع، حتى يحوزها التجار إلى رحالهم. رواه

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ زید بن ثابت رحمہ اللہ تھے۔ انہوں نے کہا جس جگہ سے تم نے سودا خریدا ہے، اسی جگہ پر اسے فروخت نہ کرنا، تاوقتیکہ اسے اٹھا کر اپنے گھر نہ لے جاؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں سے چیزیں خریدی جائیں، وہیں پر فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے، جب تک کہ تاجر و سوداگر حضرات اس خریدے ہوئے مال و

أَخَذُوا أَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ اسباب کو اپنے گھروں میں لے نہ جائیں۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ وَالْحَاقِمُ۔)

ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿ابتعت﴾ اشتریت کے معنی میں۔ یعنی میں نے خریدا۔ ﴿استوجبته﴾ خرید و فروخت کے معاملہ کی صورت میں وہ میری ملکیت میں آگئی ہو۔ ﴿ان اضرب علی ید الرجل﴾ میں اس سے سودا بچتہ کر لوں۔ کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا اس زمانے میں سودا طے کرتے وقت اہل عرب کی عادت تھی۔ ﴿فالتفت﴾ میں نے توجہ کی ﴿حتی نحوزه الی رحلک﴾ یعنی اسے جمع کرے، اکٹھا کر کے اپنے مکان کی طرف منتقل کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے قبضہ میں کر لے۔ خریدار کے قبضہ کی غالب صورت یہی تھی کہ وہ خریدے ہوئے مال و متاع کو اس کے محفوظ کئے جانے کی جگہ پر لے آئے۔ ﴿السلع﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام پر فتح۔ سلعة کی جمع ہے سلمان، مال و متاع، خریدی ہوئی چیز۔

(۶۷۰) وَعَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أَبِيعُ الْإِبِلَ بِالْبَقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ، وَأَخْذُ الدَّرَاهِمِ، وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ، وَأَخْذُ الدَّنَانِيرِ، أَخْذُ هَذَا مِنْ هَذِهِ، وَأَعْطِي هَذِهِ مِنْ هَذَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَتَفَرَّقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ». رَوَاهُ الْخَنَسُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاقِمُ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں بقیع میں اونٹوں کی تجارت کرتا ہوں۔ دینار میں فروخت کر کے درہم وصول کرتا ہوں اور (کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) میں فروخت تو درہم میں کرتا ہوں اور وصول (یعنی) دینار کرتا ہوں (یعنی) دینار کے بدلہ میں درہم اور درہم کے بدلہ میں دینار لیتا ہوں۔ اس کے عوض وہ لیتا ہوں اور اس کے بدلہ میں یہ دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر اسی روز کے بھاؤ سے ان کا تبادلہ کر لو اور خرید و فروخت کرنے والوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے رقم کا کوئی حصہ کسی کے ذمہ باقی نہ رہے تو جائز ہے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔)

لعنوی تشریح: ﴿بالبقیع﴾ بقیع الغرقہ مدینہ کا قبرستان مراد ہے۔ اسے قبرستان بنائے جانے سے پہلے یہ جگہ بطور تجارتی منڈی کے تھا اور ایک نسخہ میں ”بقیع“ بھی ہے، یعنی ”باء“ کی جگہ نون۔ جو مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿فابیع بالدنانیر﴾ دینار، سونے کا مروج سکہ۔ ﴿واخذ الدراهم﴾ درہم چاندی کا سکہ۔ سونے کے سکہ کے بدلہ میں چاندی کا سکہ لے لیتا ہوں۔ ﴿بسعربومها﴾ سحر

526 خرید و فروخت کے مسائل

کے سین کے نیچے کسرہ۔ منڈی کا مروج روزمرہ کا بھاؤ۔ فارسی میں اسے نرخ کہتے ہیں، یعنی دینار کے بدلہ میں دراهم لینے میں کوئی حرج نہیں، جبکہ ان کا تبادلہ منڈی کے روزمرہ کے نرخ کے مطابق ہو۔ ﴿مسالم تستفرقا وینکما شئی﴾ یعنی اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا اور الگ نہ ہونا جب تک کہ تمہارے درمیان کسی واجب الادا چیز کی ادائیگی باقی (یعنی جدائی اور علیحدگی سے پہلے پہلے باہمی ادائیگی کر لینا) یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سونے چاندی کا تبادلہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ دست بدست ہو اور پوری ادائیگی موقع پر ہو۔ ادھار نہ ہو۔

(۶۷۱) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ النَّجَشِ. مَنَّ عَلَى. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع نجش سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نجش﴾ نون پر فتح اور جیم ساکن۔ نجش کی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی سامان فروخت پڑا ہوا دیکھتا ہے، لوگ اس کی قیمت لگا رہے ہیں، فروخت کرنے والے مالک سامان سے خریدنے کی بات کرتے ہیں اور یہ شخص وہاں حاضر ہو کر اس سامان کی تعریف و توصیف کر کے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے، یعنی محض اس چیز کی قیمت بڑھانے کی خاطر زیادہ بولی دینا شروع کر دیتا ہے، جبکہ وہ اس چیز کا خریدار نہیں ہوتا، محض قیمت میں اضافہ کرنے کیلئے ایسا کرتا ہے، جس سے لوگوں کو دھوکا دینا اور فریب میں مبتلا کرنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ چیز کی قیمت زیادہ لگے اور فروخت کنندہ سے پہلے ہی طے کر لیتا ہے اور طے شدہ بات کے مطابق اس سے کچھ وصول کر لیتا ہے، چونکہ یہ شخص حقیقت میں خریدار نہیں، بلکہ خریدار کے روپ میں دھوکہ باز ہے اور اس میں دھوکا پایا جاتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بیع بالاجماع حرام ہے۔

(۶۷۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ ﷺ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ، وَالْمَخَابَرَةِ، وَعَنِ الثَّنْيَا، إِلَّا أَنْ يُفْرَأَ الْخُمُسُ إِلَّا ابْنَ فَاحِجَةٍ، وَصَحَّحَهُ. حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع محاقلہ، مزابنہ، مخابره و الثنیا، نہی فرمایا ہے مگر اس صورت میں (بیع اشتاء) جائز ہے کہ اس کی مقدار مقرر کر لی جائے۔ (اسے ابن ماجہ کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا۔ الترمذی)

(ہے)

لغوی تشریح: ﴿المحاقلة﴾ بایوں میں کھڑی کھیتی کو غلہ کے عوض فروخت کرنا، جیسے گندم کے کھیت کے بدلہ میں گندم فروخت کرنا۔ ﴿المزابنة﴾ درختوں پر لگے ہوئے پھل کو اسی جنس کے اتارے ہوئے خشک پھل کے عوض فروخت کرنا۔ مثلاً خشک کھجوروں کے بدلہ کھجور کے درخت پر تازہ اور تر

(۶۷۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَيْعَ مُحَاقِلَةٍ، وَالْمُخَاضِرَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ. حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع محاقلہ، مخاضرہ، ملازمہ، منابذہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

نوعی تشریح: ﴿المخاضرة﴾ یعنی پھلوں اور غلہ جات کی فروخت ان کے پکنے سے پہلے۔ ﴿

الملازمة والمنابذة ﴿مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ان دونوں کی تفسیروں ہے کہ ملازمہ وہ بیع ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے کپڑے کو بغیر کسی تامل کے چھوئیں اور اسی چھونے کو بیع قرار دیں اور منابذہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی جانب کپڑا پھینکیں، بغیر دیکھے اور اسی کو بیع قرار دیں اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ان دونوں بیعوں کی تفسیر اس طرح وارد ہے کہ خریدار دن ہو یا رات دوسرے کے کپڑے کو بغیر دیکھے اور الٹ پلٹ کئے بغیر بس ہاتھ لگا دے اور اسی پر سودا طے کر لے۔ اور ”منابذہ“ یہ ہے کہ دونوں (خریدار و فروخت کنندہ) ایک دوسرے کی جانب اپنا اپنا کپڑا پھینکیں اور یہ پھینکنا ہی دونوں کے درمیان بغیر دیکھے اور باہمی رضامندی کے ساتھ بیع قرار پائے اور محض ہاتھ لگانا اور کپڑا پھینکنا ہی دیکھنے اور ملاحظہ کرنے کے قائم مقام ہو، اس کے بعد پھر کسی کو دیکھنے کا اختیار باقی نہ رہے، یا اسے ایجاب و قبول کے قائم مقام ہی سمجھا جائے، یا مجلس کے اختتام کیلئے یہ قطعی اور حتمی ہو۔

(۶۷۴) وَعَنْ طَاوُسٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَلْقُوا الرُّحْبَانَ، وَلَا يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ»، قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: مَا قَوْلُهُ ﷺ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ؟ قَالَ: لَا يَكُونُ لَهُ سِمْسَارًا.

حضرت طاووس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سامان تجارت لے کر آنے والے قافلوں کو آگے جا کر نہ ملو اور کوئی شہری کسی دیہاتی کا سامان بیچے۔“ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ”شہری دیہاتی کا سامان فروخت نہ کرے“ کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ شہری دیہاتی کا دلال نہ بنے۔

(بخاری ومسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لَا تَلْقُوا الرِّكْبَانَ﴾ شہر کی منڈی میں پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں ان سے نہ ملو۔ ”رکبان“ شترسواروں کی جماعت۔ رکب شتربانوں کو کہتے ہیں جو سفر پر ہوں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غلہ، خوردو نوش کی اشیاء اور دیگر استعمال کا سامان منڈیوں میں لاتے ہیں۔ خواہ وہ سوار ہو کر آئیں یا پیدل۔ گروہوں کی صورت میں آئیں یا اکیلے اکیلے۔ ان کو رکبان ان کے غالب احوال کی بنا پر کہہ دیا ہے۔ راستے میں ملنے کی صورت جسے مجمع البہار میں نقل کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شہری آدمی بدوی کو شہر کی مارکیٹ میں پہنچنے سے پہلے پہلے راستے ہی میں جا ملے تاکہ بھاء کے متعلق غلط بیانی کر کے اس سے سامان سستے داموں خرید لے اور اس کی اصل قیمت سے کم قیمت پر اس سے حاصل کرے۔ منع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ فروخت کرنے والا دھوکہ دہی اور ضرر رسائی سے بچ جائے۔ غبن اور خدع سے محفوظ ہو جائے اور اسی طرح جو لوگ منڈی میں سامان خریدنے کیلئے آتے ہیں وہ لوگ فائدہ اور منافع حاصل کر لیتے ہیں، یہ تو معمول کا رواج ہے کہ قافلے اپنا ساز و سامان منڈی کے عام بھاء سے قدرے سستا فروخت

خرید و فروخت کے مسائل 529

کرتے ہیں، نیز یہ بھی معمول ہے کہ جب مارکیٹ و منڈی میں سامان زیادہ مقدار میں آجاتا ہے تو اس کا نرخ اور بھاؤ گر جاتا ہے اور عام لوگ اس سے زیادہ نفع کھاتے ہیں ﴿ولایبیع حاضر لباد﴾ حاضر سے مراد شہری باشندہ۔ اس میں شہروں، بڑے بڑے قصبوں اور سرسبز و شاداب علاقوں کے رہنے والے بھی داخل ہیں اور ”البادی“ سے مراد بادیہ نشین، خانہ بدوش، بادیہ اور بدو دیہاتی کے معنی میں جو شہری کے مقابلہ میں ہوتے ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ ایک اجنبی آدمی دیہات سے، یا دوسرے شہر سے ایسا ساز و سامان جس کی بھی کو ضرورت ہے، اس روز کے نرخ کے مطابق فروخت کرنے کیلئے لے کر آتا ہے، مگر اسے شہری کہتا ہے کہ اس سامان کو میرے پاس چھوڑ دے، تاکہ میں اسے بتدریج اعلیٰ نرخ پر بیچ دوں۔ (انتہی) ﴿ماقولہ لایبیع الخ﴾ یعنی اس قول کا کیا مطلب ہے کہ شہری دیہاتی کا سامان فروخت نہ کرے؟ ﴿سمسار﴾ سین کے نیچے کسر، میم ساکن، ایسا دلال جو بڑھ کر بولی دینے والا ہو۔ سبیل السلام میں ہے کہ اس کے اصل معنی تو ناظم و منتظم کے ہیں جو معاملہ کا نگران و نگہبان ہو اور حفاظت کرنے والا ہو۔ پھر دوسرے کا مال معاوضہ لے کر فروخت کرنے کی وجہ سے خرید و فروخت کا نگران و محافظ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

راوی حدیث: ﴿طاؤس﴾ ان کی کنیت ابو عبد الرحمن ہے اور نسب یوں ہے۔ طاؤس بن کیسان حمیری۔ حمیر قبیلہ والوں کے مولا ہیں۔ فارسی النسل ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام ذکوان ہے اور طاؤس ان کا لقب ہے۔ ثقہ ہیں۔ نہایت فاضل فقیہ ہیں اور تیسرے طبقہ سے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے پچاس صحابہ کرامؓ کو پایا ہے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میرا گمان ہے کہ طاؤس جنتی ہے۔ عمرو بن دینارؓ کا قول ہے کہ میں نے ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ۱۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۶۷۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَلْقُوا الْجَلْبَ، فَمَنْ تَلَقَّى آگے جا کر نہ ملو۔ جس کسی سے راستہ ہی میں ملاقات فاشتری مِنْهُ فَإِذَا أَتَى سَيِّدَهُ السُّوقِ کر کے اس کا سامان خرید لیا گیا تو منڈی میں بیچنے کے فَهُوَ بِالْخِيَارِ». رَوَاهُ مُسْنَدُ.

یا منسوخ کر دے) (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الجلب﴾ جیم اور لام دونوں پر فتح، مصدر ہے۔ مجلوب کے معنی میں۔ کہتے ہیں جلب الشیء یعنی تجارت کیلئے ایک شہر سے دوسرے شہر میں سامان لایا۔ مراد یہاں قابل فروخت اشیاء اور ان اشیاء کے مالک ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی بے خبر لوگوں سے سستے داموں اشیاء خریدنے کی ممانعت ہے۔ مسلمان، مسلمان کا خیر خواہ اور ہمدرد و غمگسار ہونا چاہئے۔ اس طرح تو خود غرضی اور مفاد پرستی کو تقویت

(۶۷۶) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَبْنَعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا يَبْنِيَ الرَّجُلُ عَلَى بَنِعٍ أَحْيَاهُ، وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خِطْبَةٍ أَحْيَاهُ، وَلَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا، لَتَكْفَأَ مَا فِي إِنْائِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْمُسْلِمِ: لَا يَسُومُ الْمُسْلِمُ عَلَى سَوْمِ أُخْيَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿لَا يَبِيعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ﴾ لا بیع مزارع مرفوع اور ”لا“ اس پر نافیہ ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ اپنے بھائی کی بیع پر کسی کی بیع نہیں اور مجزوم بھی ہے، اس صورت میں لاضحیٰ کا ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بیع خیار واقع ہوئی ہو۔ جتنی مدت اختیار کیلئے دی گئی اسی دوران ایک آدمی آجاتا ہے اور خریدار سے کہتا ہے کہ تو اس سے سودے کو فتح کر دے اور میں تجھے اس سے ارزاں اور اس سے عمدہ اور بہترین فروخت کر دیتا ہوں۔ تو جس طرح بیع پر بیع جائز نہیں، اسی طرح شراء پر شراء بھی جائز نہیں۔ وہ بایں صورت کہ فروخت کرنے والے سے مدت خیار کے دوران یوں کہے کہ تو یہ بیع فتح کر دے، میں تجھ سے یہی چیز اس سے زیادہ قیمت پر خرید لوں گا۔ (بل السلام اختصار اور تبدیل کے ساتھ) ﴿وَلَا يَخْطُبُ عَلَى خُطْبَةِ أَخِيهِ﴾ خطبہ کے ”خا“ کے نیچے کسرہ۔ عورت سے شادی کا مطالبہ کرنا۔ یعنی جب ایک آدمی کسی عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے، ایک دوسرے کی طرف میلان اور جھکاؤ ہو جاتا ہے اور باہمی اتفاق ہو جاتا ہے۔ بس اب صرف دونوں میں عقد نکاح باقی رہ جاتا ہے تو اس وقت اس عورت کو دوسرے کا پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔ تاآنکہ وہ دونوں نکاح کر لیں تاکہ کسی دوسرے کیلئے اس کا دروازہ ہی بند کر دیں، یا ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں۔ اب ہر ایک کیلئے دروازہ کھلا ہے جو چاہے اس سے نکاح کر لے۔ ﴿لَتَكْفَا مَافِي أَسْأَلِهَا﴾ یہ کفء الاناء سے ماخوذ ہے۔ یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب برتن اوندھا اور پلٹ کر جو کچھ اس میں موجود ہو اسے نیچے گرا کر خالی کر دیا جائے۔ یعنی کسی اجنبی عورت کیلئے یہ جائز نہیں جو کسی مرد سے نکاح کرنا چاہتی ہو کہ اس سے پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ و تقاضا کرے، تاکہ جو سہولتیں اس عورت کو اپنے شوہر سے حاصل ہیں۔ نان و نفقہ، لباس اور رہن سہن کی آسانیاں وغیرہ سے اسے محروم کر کے خود حاصل کرے۔ اسی طرح کسی بیوی کیلئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے شوہر سے اپنی سوکن کو طلاق دینے کا تقاضا کرے۔ تاکہ وہ بلا شرکت غیرے تمام حقوق

(۶۷۷) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ وَالِدَةٍ وَوَلَدِهَا فَرَّقَ اللَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَحَبِّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الشَّيْخُ أَبُو الْحَكِيمِ، لَكِنْ فِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ.

حاصل کلام: اس حدیث میں صلہ رحمی کا درس دیا گیا ہے کہ غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرتے وقت ماؤں سے ان کے نابالغ بچوں کو جدا نہ کیا جائے۔ جدا جدا جگہ اور الگ الگ آدمیوں کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائے، اس سے ماں کی مامتا متاثر ہوتی ہے۔ دار قطنی اور حاکم کی روایت میں نابالغ کی تصریح موجود ہے۔ جو شخص اس دنیا میں بے رحمی اور قطع رحمی کا ارتکاب کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قریبی عزیزاء و اقرباء کے درمیان میں جدائی ڈال دے گا۔

(۶۷۸) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ أَبِيعَ غُلَامَيْنِ أَحْوَيْنَ، فَبِعْتُهُمَا، فَفَرَّقْتُ بَيْنَهُمَا، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «أَذَرَكُهُمَا فَارْتَجِعْهُمَا، وَلَا تَبِعْهُمَا إِلَّا جَمِيعًا». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ،

خرید و فروخت کے مسائل 532

وَقَدْ صَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ وَابْنُ جَبَّانٍ خَزِيمَةَ ابْنِ جَارُودٍ ابْنِ حَبَانٍ حَاكِمٌ طَبْرَانِيٌّ اور ابن قطان نے
وَالْحَاكِمُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَابْنُ الْقَطَّانِ . صحیح قرار دیا ہے

حاصل کلام: پہلی حدیث ماں اور بچے میں جدائی کی حرمت پر دلالت کرتی ہے، خواہ وہ علیحدگی بیع کے ذریعہ سے ہو، یا جہ کی صورت میں، یا دھوکہ بازی سے الگ کرنے وغیرہ کی شکل میں اور والدہ کے لفظ کا اطلاق والد پر بھی ہے، یعنی ماں باپ سے جدا نہ کیا جائے اور یہ حدیث بھائیوں کے درمیان تفریق و جدائی کی حرمت پر دلالت کرتی ہے اور قیاس کے ذریعہ ان کے ساتھ دوسرے ذوی الارحام کو بھی ملا لیا گیا ہے، مگر شوکانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ ذوی الارحام کو اس میں شامل کرنا محل نظر ہے، کیونکہ ان کی جدائی سے وہ مشقت و پریشانی نہیں ہوتی جو ماں اور بچے کے مابین یا بھائی، بھائی کے درمیان جدائی سے حاصل ہوتی ہے۔ لہذا دونوں میں واضح فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے ساتھ نہ ملایا جائے اور صرف نص پر توقف کیا جائے۔ انتہی۔

اور یہ بات بھی معلوم رہے کہ تفریق کی حرمت چھوٹے نابالغ بچے کے ساتھ مخصوص ہے۔ بالغ کی جدائی کب جائز ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ باعتبار دلیل راجح یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ ہو جائے اور بچی کو ایام حیض شروع ہو جائیں، اس وقت تفریق حرام نہیں۔

(۶۷۹) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: غَلَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ كَے عَمَدٍ مِّنْ مَّنْوَرَةٍ مِّنْ جِزْرِوْنَ كَا بَھَاؤُ چڑھ گیا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ فقال النَّاسُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! غَلَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ! اشیاء کے نرخ (بڑے) تیز ہو گئے ہیں، آپ السَّعْرُ، فَسَعَّرَ لَنَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ہمارے لئے (ان کے) نرخ مقرر فرمادیں۔ رسول اللہ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ، وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ رَوْزِ دینے والا وہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ أَلْقَى اللَّهُ تَعَالَى وَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ فِي دَمٍ وَلَا مَالٍ». تعالیٰ سے میں اس حال میں ملاقات کروں کہ کوئی رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانٍ. شخص تم میں سے مجھ سے خون میں اور مال میں ظلم و ناانصافی کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔“ (نسائی کے علاوہ

اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

نعوی تشریح: ﴿غلا﴾ غلاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی نرخ چڑھ گیا، بھاؤ بڑھ گیا۔ معمول کے انداز سے

533 ————— خرید و فروخت کے مسائل

زیادہ ہو گیا۔ ﴿سَعَرْنَا﴾ تسعیر سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی بھاؤ و نرخ مقرر فرما دیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ سلطان یا اس کا نائب یا کوئی حاکم منڈی میں فروخت کرنے والوں کو احکام کے ذریعہ پابند کر دے کہ وہ اتنے نرخ سے زائد اپنی اشیاء فروخت نہ کریں۔ نرخ کے اتار چڑھاؤ، کمی و بیشی کو مصلحتاً روک دیں۔ ﴿ان الله هو المسعر﴾ عین پر تشدید اور نیچے کسرہ۔ یعنی وہ تنہا کی اور بیشی کرنے والا ہے ﴿بمظلمة﴾ میم پر فتح اور لام کے نیچے کسرہ۔ یعنی جو حق کے بغیر لیا جائے اور لام کے فتح کے ساتھ بھی ہے۔ اس صورت میں ظلم کا مصدر ہو گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری کنٹرول ممنوع ہے۔ اس سے ایک طرف اگر تجارت پیشہ حضرات کو نقصان پہنچتا ہے تو دوسری جانب تاجروں کا اشیاء کو روک لینا خط کا سبب بن جاتا ہے۔ عوام ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں بلیک مارکیٹنگ کا بازار گرم ہوتا ہے۔ عوام معاشی بد حالی کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے معاشرے میں بے چینی، اضطراب اور بد امنی جنم لیتی ہے۔

(۶۸۰) وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ حَضْرَتِ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: «لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا أُنْدُوزِي كُوفِي نَهِيں کرتا۔» (مسلم) خَاطِيءٌ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿لا یحتکر﴾ احتکار سے ماخوذ ہے یعنی غلہ کو روک لینا، فروخت نہ کرنا۔ اس انتظار میں کہ نرخ چڑھے، عوام کو اس کی شدید ضرورت ہو۔ فروخت کرنے والا اس سے مستغنی ہو۔ ﴿الاخاطی﴾ یعنی نافرمان، گناہ گار، خطا کار۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک آدمی کوئی چیز خرید کر ذخیرہ کر لے کہ جب نرخ بڑھیں گے تو اس وقت اسے فروخت کروں گا، حالانکہ عوام میں اس کی بہت مانگ ہو۔ حدیث کے الفاظ عام ہیں، مگر جمہور نے اس سے مراد صرف انسانوں اور حیوانوں کے خورد و نوش کی چیزیں لی ہیں۔ دوسری اشیاء اس نئی سے مستثنیٰ ہیں۔ احتکار ایسی شکل میں تو بلاشبہ حرام ہے کہ اشیاء صرف کی قلت پیدا ہو جائے اور جن کے پاس یہ چیزیں ہوں وہ انہیں چھپا کر رکھ لیں۔ احتکار تجارت پیشہ حضرات کیلئے حرام ہے۔ زمیندار اپنی پیداوار روک لے تو اس کیلئے گنجائش ہے۔ مگر جب غلہ کی قلت شدت اختیار کر جائے تو پھر ان کیلئے غلہ کو روک لینا بھی جائز نہیں ہو گا۔

راوی حدیث: ﴿معمربن عبداللہ بن نافع بن نضلہ بن حوثان العدوی رضی اللہ عنہ﴾ وہ ابن ابی معمر ہیں۔ بڑے مرتبہ کے صحابی اور قدیم الاسلام ہیں۔ ہجرت حبشہ کی اور مدینہ کی طرف ہجرت میں ذرا تاخیر ہوئی تو پھر مدینہ کی جانب بھی ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کی۔

(۶۸۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لَا تُصَرُّوا الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ، فَمَنْ ابْتَاعَهَا بَعْدَ فَهْوٍ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلُبَهَا، إِنْ شَاءَ أَمْسَكَهَا، وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ». مَتَّقْ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: فَهُوَ بِالْخَبَارِ ثَلَاثَةَ أَثَامٍ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ عَقْلَهَا الْبُخَارِيُّ: «وَرَدَّ مَعَهَا صَاعًا مِنْ طَعَامٍ لَا سَمَرَاءَ». قَالَ الْبُخَارِيُّ: وَالْتَمَرُ أَكْثَرُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ”اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کا دودھ فروخت کرتے وقت ان کے تھنوں میں روکے نہ رکھو۔ جو شخص ایسا جانور خرید لے تو اسے دو باتوں میں سے بہتر کے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، چاہے اس جانور کو اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو ایک صاع کھجور ساتھ دے کر واپس کر دے۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اسے تین دن تک اختیار ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے، جسے بخاری نے تعلیقاً نقل کیا ہے کہ ”اس کے ساتھ ایک صاع کسی کھانے والی چیز سے واپس کرے۔ گندم نہیں۔“ بخاری نے کہا کہ اکثر روایات میں کھجور کا ذکر ہے۔

لغوی تشریح: ﴿لَا تُصَرُّوا﴾ ”تا“ پر ضمہ اور صا پر فتح اور ”را“ پر تشدید۔ تصریہ سے ماخوذ ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اونٹنی یا بھیڑ بکری کا دودھ تھنوں سے نہ نکالا جائے، تاکہ وہ تھنوں میں جمع ہوتا رہے اور کثیر مقدار میں معلوم ہو کہ خریدار کو دھوکہ اور فریب دیا جائے اور وہ سمجھے کہ یہ تو بڑی دودھیل جانور ہے۔ اس جھانہ میں آکر خریدار اس کی قیمت زیادہ دینے کیلئے آمادہ ہو۔ ﴿فَمَنْ ابْتَاعَهَا بَعْدَ فَهْوٍ﴾ کا لفظ ایسا ہے جس پر ضمہ ہی آتا ہے، اسے مبنی بر ضمہ کہتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مضاف الیہ نیت میں ہوتا ہے، مگر عبارت میں مذکور نہیں ہوتا اور بعد گویا اصل میں بعد ذلک ہے۔ ﴿فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ﴾ نظریں اس مقام پر دورائے کیلئے استعمال ہوا ہے، یعنی خریدار کو دورایوں میں سے ایک کو جسے وہ مناسب اور اچھی سمجھے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ ﴿وَصَاعًا﴾ صاعا کا ضمیر منصوب پر عطف ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”واو“ مع کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں معنی ہو گا کہ خریدار واپس کرتے وقت جانور کے ساتھ ایک صاع کھجوریں بھی دے گا۔ ﴿سَمَرَاءَ﴾ سین پر فتح اور میم ساکن۔ معنی گندم اور ایک صاع کھجوریں ساتھ واپس دینے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اس جانور سے حاصل کردہ دودھ کا معاوضہ ہو جائے، کیونکہ کچھ دودھ تو خریدار کی ملکیت میں نئی چیز ہے اور کچھ دودھ اس نے خریدا ہے۔ اب چونکہ خریدار کو یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ کتنا دودھ خریدا ہوا ہے اور کتنا نیا داخل ہے، چنانچہ عدم تمیز کی بنا پر اسے واپس کرنا یا اس کی قیمت واپس کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے شارع نے

(۶۸۲) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ اشْتَرَى
شَاةً مُحَفَّلَةً فَرَدَّهَا فَلْيُرَدِّ مَعَهَا
صَاعًا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ الْإِسْمَاعِيلِيُّ؛
«مِنْ تَمْرٍ».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص
ایسی بکری خریدے جس کا دودھ تھنوں میں روک دیا
گیا ہو، پھر وہ اسے واپس کرے تو اسے چاہئے کہ
اس کے ساتھ ایک صاع واپس کرے۔ (بخاری) اور
اسماعیلی نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ایک صاع
کھجوریں۔

لغوی تشریح: ﴿محفلہ﴾ محفلہ میں ”فا“ پر فتح اور تشدید۔ وہ جانور جس کا دودھ تھنوں میں ہی زیادہ دکھانے کیلئے روک دیا گیا ہو اور محفلہ دراصل ”من حفل القوم واحتفلوا“ سے ماخوذ ہے۔ جب ان کی تعداد بہت جمع ہو جائے اور ہوں سب ایک ہی مقصد کیلئے اور حافل عظیم کے معنی میں بھی مستقل ہے۔ اس کا نام محفلہ اس لئے رکھا گیا کہ دودھ اس بکری کے تھنوں میں کثیر مقدار میں جمع ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا فتویٰ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کی مکمل تائید کر رہا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہ پر احناف کے اکثر مسائل کا دارومدار ہے۔ سوچ لیں اگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہ اور درایت سے خالی ہیں تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

(۶۸۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ بِكَافِرٍ طَعَامَ غُلَّةٍ كَإِكِّ دُهِيرٍ هَوَا. آپ

عَلَى صُبْرَةٍ مِنْ طَعَامٍ، فَأَذْخَلَ يَدَهُ، فَتَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلًا، فَقَالَ: نَمِي لَگي۔ آپ نے فرمایا ”اے اناج کے مالک! یہ کیا مَا هَذَا؟ يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ! قَالَ: مَا هَذَا؟ يَا رَسُولَ اللَّهِ! (ﷺ) اس پر بارش برس گئی تھی۔ آپ نے فرمایا قَالَ: «أَفَلَا جَعَلْتُهُ فَوْقَ الطَّعَامِ،» ”پھر تو نے نَمِي زدہ حصہ کو اناج کے اوپر کیوں نہ ڈال کُنِي يَرَاهُ النَّاسُ، مَنْ عَشَّ فَلَيْسَ دیا تاکہ خریدار لوگ اسے دیکھ لیتے۔ جس نے مَنِي“۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

”ہو کہ دیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿صبرہ﴾ صادر پر ضمہ اور با ساکن۔ اناج و غلہ وغیرہ جو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے، جیسے مٹی کا اونچا ڈھیر ہوتا ہے۔ اس کی جمع صبر آتی ہے، صادر کے ضمہ اور ”با“ کے فتح کے ساتھ اور ﴿طعام﴾ سے مراد اناج و غلہ وغیرہ ﴿فَنَالَتْ﴾ محسوس کیا، پایا۔ ﴿السَّمَاء﴾ سے مراد یہاں بارش ہے۔ ﴿مَنْ عَشَّ﴾ غش سے ماضی کا صیغہ ہے اور یہ نصیح یعنی خیر خواہی و ہمدردی کے متضاد ہے، یعنی خیانت اور دھوکہ ﴿فَلَيْسَ مَنِي﴾ تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الاصول میں ”یاء“ متکلم کے ساتھ ہی منقول ہے اور معنی اس کا ہے کہ اس نے میری ہدایت کے مطابق راہ طلب نہیں کی اور میرے علم و عمل کی اور میرے عمدہ طریقہ و راستہ کی پیروی نہیں کی۔ سفیان بن عیینہ اس طرح کی تفسیر کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس ارشاد کی تاویل سے رک جائیے، تاکہ وہ دلوں میں زیادہ اثر انداز ہو اور زجر و توبخ میں زیادہ مبالغہ آمیز ثابت ہو۔ (مختصاً)

(٦٨٤) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، حضرت عبداللہ رحمہ اللہ نے اپنے والد بریدہ رحمہ اللہ سے عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ شَرَبَ الْغُرَابَ فِي يَوْمٍ مِنْ أَيَّامِ الْفَيْفِ، حَتَّى تَأْكُلَ مِنْهُ خَبْثًا، فَقَدْ تَغَصَّصَ النَّارَ عَلَى بَصِيرَةٍ“۔ رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي هَوَاكَ۔ (اسے طبرانی نے اوسط میں حسن سند سے روایت الاوسط بإسناد حسن۔)

کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿من حبس العنب﴾ انگور کو روک لیا اور اسے فروخت نہ کیا۔ ﴿ایام القطف﴾ قطف کے قاف کے نیچے کمرہ اور فتح بھی جائز ہے۔ وہ موسم جس میں انگور اتارے جاتے ہیں اور قطف کہتے ہیں انگور کی بیل سے انگور اتارنے کو اور قطف قاف کے کمرہ سے پگھلے اور خوشے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں قطف کی جمع بیان ہوئی ہے ﴿قُطِفُوا دَانِيَةً ۖ ۶۹: ۲۳﴾ یعنی جنت کے خوشے جھکے

ہوئے ہوں گے۔ ﴿تفحم النار﴾ اس میں اپنے آپ کو داخل کر لیا اور بغیر دیکھے اپنے آپ کو اس میں پھینک دیا۔ ﴿علی بصیرۃ﴾ یعنی سبب دخول کا علم رکھنے کے باوجود۔

(۶۸۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قَالَ رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”آمن ضمان (کفالت) کا بدلہ ہے۔“
﴿الْخَرَجُ بِالْضَّمَانِ﴾. رَوَاهُ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ بخاری اور ابوداؤد نے الْحَسَنُ، وَصَعْفَةُ الْبَحَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ؛ وَصَحَّحَهُ اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ترمذی، ابن خزمہ، ابن جارود، الترمذی، وَابْنُ حُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ وَابْنُ جَبَانَ ابن حبان، حاکم اور ابن قتان نے اسے صحیح کہا ہے) وَالْحَاكِمُ وَابْنُ الْفَقَّانِ.

لغوی تشریح: ﴿الخراج﴾ ”خا“ پر فتح۔ گھر کے کرایہ کی آمدن یا زمین کا حاصل اور کرایہ۔ یعنی وہ فوائد و منافع جو فروخت شدہ چیز سے حاصل ہوں۔ خواہ وہ غلام ہو یا لونڈی، حیوان ہو یا کوئی دوسری چیز۔ ﴿بالضمان﴾ ضاد پر فتح۔ کفالت و ذمہ داری اور ”با“ اس میں محذوف سے متعلق ہے یعنی فروخت شدہ چیز کو قبضہ میں لینے کے بعد اس سے حاصل ہونے والے منافع اور فوائد خریدار کیلئے باقی رہتے ہیں، اس ضمان کے بدلہ میں جو اس پر لازم ہے، فروخت شدہ چیز کے تلف ہونے اور اس کے خرچ ہونے اور اس پر مشقت برداشت کی صورت میں اور اسی سے یہ قول ماخوذ ہے جس پر تاوان ہے۔ اس کا فائدہ و مفاد بھی اسی کیلئے ہے اور اس طرح کہ وہ ایک چیز خریدتا ہے اور ایک مدت تک اس سے استفادہ کرتا ہے، اس کے بعد اسے اس چیز کے قدیم عیب کا علم ہوتا ہے، جس کا علم فروخت کرنے والے کو نہیں تھا اور نہ ہی اس سے باخبر تھا۔ بایں صورت خریدار کیلئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ فروخت شدہ چیز کو بعینہ واپس کر کے اپنی قیمت وصول کر لے۔ اس دوران خریدار نے اس چیز سے جتنا مفاد حاصل کیا، یہ اسی کا استحقاق تھا، کیونکہ اگر فروخت شدہ چیز اس سے ضائع ہو جاتی تو اس کا ذمہ دار بھی وہی ہوتا اور فروخت کنندہ پر کوئی چیز لازم نہ آتی۔ جیسا کہ ضعی نے کہا ہے۔ (ملخصاً) اور صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب فروخت شدہ چیز کی آمدنی ہو اور گھر کے کرایہ کی آمد یا زمین کا حاصل ہو تو (غلام) کا مالک جو اس کا ذمہ دار ہے، اس کی آمدن کا مالک ہوگا، اس کی اصل کی ذمہ داری و کفالت کی وجہ سے۔ پس جب کسی آدمی نے کوئی زمین خریدی اور اس کو استعمال بھی کیا، یا چوپایہ خریدا اور اس نے بچے کو جنم دیا، یا چوپایہ خریدا اور اس پر سوار ہوا، یا غلام خریدا، اس سے خدمت لی، پھر اس میں کوئی نقص و عیب پایا تو اس کیلئے اس غلام کو واپس کرنے کی گنجائش ہے اور جتنا فائدہ اس سے حاصل کیا ہے اس کے عوض اس پر کوئی چیز نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ فسخ و عقد کی مدت کے درمیان تلف و ضائع ہو جاتی تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوتی۔ تو پھر اس کی آمدن کا بھی وہی حقدار ہے۔

(۶۸۶) وَعَنْ عُرْوَةَ الْبَارِقِيِّ رَضِيَ حضرت عروہ باریقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

حدیث کے ضمن میں اسے روایت ہے، مگر یہ الفاظ نقل نہیں کئے اور ترمذی نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو اس کے لیے بطور شاہد بیان کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے چند نہایت بنیادی چیزوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً (۱) وکیل مؤکل کے مال میں تصرف کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے، جبکہ اسے مال کی وکالت سپرد کی جائے اور اسے اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی آزادی دی جائے۔ ورنہ طے شدہ اور حدود کے اندر ہی وکیل کو کام کرنا ہوگا۔ (۲) دوسرے کا مال اسے اطلاع دیئے بغیر فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اطلاع ملنے پر مالک رضامندی کا اظہار کرے۔ (۳) قربانی کیلئے خرید اگیا جانور فروخت کیا جاسکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا جانور خریدنا جائز ہے۔ (۴) جو مالک کیلئے ایسی ضرورت انجام دے اس کیلئے دعاء خیر و برکت کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿عروہ باردقی رحمہ اللہ﴾ انہیں ابن الجعد اور ابن ابی الجعد دونوں طرح بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے والد کا نام عیاض تھا۔ بارق کی طرف نسبت کی وجہ سے بارق کہلائے۔ بارق میں ”را“ کے نیچے کروہے۔ یہ قبیلہ ازد کی شاخ ہے اور نسب نامہ اس طرح ہے، بارق بن عدی بن حارث۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بارق نامی ایک پہاڑ کے پاس فروکش ہونے کی وجہ سے بارق کہلائے۔ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت عمر رحمہ اللہ نے ان کو اپنے دور خلافت میں کوفہ کے منصب قضاء پر فائز فرمایا۔ انہوں نے کوفہ ہی میں سکونت اختیار کر لی، انہی میں شمار کئے گئے اور اہل کوفہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(۶۸۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَنَعَ كَوْاسَ كَيْ يَدِائِشَ مِنْ أَمْرِ خَرِيدَةٍ مِنْ نَبِيٍّ

حَتَّى تَضَعَ، وَعَنْ بَيْعٍ مَا فِي ضُرُوعِهَا، وَعَنْ شِرَاءِ الْعَبْدِ وَهُوَ أَبْقَى، وَعَنْ شِرَاءِ الْمَغَانِمِ حَتَّى تُقَسِّمَ، وَعَنْ شِرَاءِ الصَّدَقَاتِ حَتَّى تُقْبَضَ، وَعَنْ ضَرْبَةِ الْغَائِصِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَزَّازُ وَالْأَثَرُظِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

تھنوں میں (جمع شدہ) دودھ کو دوہنے سے پہلے فروخت کرنے سے اور بھاگے ہوئے غلام کو خریدنے سے اور اموال غنیمت کو ان کی تقسیم سے پہلے خریدنے سے اور صدقات کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے خریدنے سے اور غوطہ لگانے والے کو اس کے ایک غوطہ کا معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ابن ماجہ، بزار اور دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿تضع﴾ یعنی بنے۔ ﴿ما فی ضروعہا﴾ جو کچھ تھنوں میں ہو، سے مراد دودھ ہے اور ﴿ضرع ضرع﴾ کی جمع ہے، جانور کے تھن کو کہتے ہیں جس طرح عورت کے پستان ہوتے ہیں، اسی طرح حیوان کے تھن ہوتے ہیں۔ ﴿آبق﴾ بھاگنے والا، ﴿المغانم﴾ مغنم کی جمع ہے۔ مغنم اور غنیمت ان اموال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کی افواج دوران جنگ دشمنوں سے بھیجی گئی اور حاصل کرتی ہیں۔ ﴿الغائص﴾ غوص سے ماخوذ ہے۔ پانی میں نیچے اترنے کو کہتے ہیں۔ غائص غوطہ خور کو کہتے ہیں۔ غوطہ مارنے کی نوعیت اس طرح کہ غوطہ لگانے والا غوطے کے خریدار سے کہے کہ میں سمندر میں غوطہ لگاتا ہوں۔ اس غوطہ میں جتنا کچھ حاصل ہوا وہ اتنے مال کے بدلہ میں تمہارا ہے۔ اس بیع سے منع اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں دھوکہ اور فریب ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ایک غوطہ میں کیا حاصل ہوتا ہے اور وہ طے شدہ مال سے کم قیمت کا ہے یا زیادہ کا۔

(۶۸۸) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَشْتَرُوا السَّمَكَ فِي الْمَاءِ، كَيْونَكَ يَدُوهَا»۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور فائز غرر)۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَأَشَارَ إِلَى أَنَّ اس طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ اس روایت کا موقوف الصواب وثقہ۔

ہونا قرین صواب ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے پانی میں موجود مچھلی کی خرید و فروخت ممنوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی میں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ مچھلیوں کی تعداد و مقدار کتنی ہے، کوئی مچھلی ہے، عمدہ اور بہترین نسل کی ہے یا کم تر نسل کی، جسامت و ضخامت میں بڑی ہے یا چھوٹی ہے، مچھلیاں ہیں یا مگر مچھ ہیں؟ جب صحیح علم ہی نہیں تو پھر فروخت کس چیز کی؟ نہ فروخت کنندہ کے قبضہ میں ہے اور نہ اس کی ذاتی ملکیت، اگر ذاتی تالاب وغیرہ بھی ہوں تب بھی مقدار و تعداد اور تعین جنس ناممکن ہے۔

خرید و فروخت کے مسائل —

یہ حدیث موقوف ہے، نیز ضعیف بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں یزید بن ابی زیاد ضعیف راوی ہے اور مسیب بن رافع اور عبد اللہ بن مسعود کے مابین ارسال ہے۔ لیکن اس کا شہاد بھی ہے (تلخیص)

(۶۸۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُبَاعَ ثَمَرَةٌ حَتَّى تُطْعَمَ، هَوْنَةً مِنْهُ سَبْعُونَ سَلْعًا، وَلَا يُبَاعَ صُوفٌ عَلَى ظَهْرٍ، وَلَا لَبَنٌ فِيهِ ضَرْعٌ. رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ وَالذَّارِقُطِيُّ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرْاسِيلِ لِعَكْرِمَةَ، وَهُوَ الرَّاجِحُ، وَأَخْرَجَهُ أَيْضًا مُؤَوَّفًا عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ. وَرَجَّحَهُ النَّبْهِيُّ. ابوداؤد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابوداؤد نے عکرمہ کی مراسیل میں بیان کیا اور یہی راجح ہے اور اسے ابوداؤد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف قوی سند کے ساتھ

بھی روایت کیا ہے اور تبہقی نے اس کو ترجیح دی ہے

لغوی تشریح: ﴿حتى تطعم﴾ باب افعال سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ پھل کھانے کے قابل ہو جائے اور اس کا کھانا عمدہ اور لذیذ ہو جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پھل پکنے اور پختہ ہونے دیا جائے۔ ﴿اخرجه ابوداؤد فی المراسیل لعکرمہ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک نہیں پہنچی اور نہ انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ روایت مرسل ہے۔

(۶۹۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْمَضَامِينِ وَالْمَلَاقِيحِ. رَوَاهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ. مِثْلُهُ فِي الْمَرْاسِيلِ لِعَكْرِمَةَ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ. ابوداؤد نے مضامین اور ملاقیح کی جمع ہے اور ملاقیح ملقوحتہ کی۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”الہدی“ (ج ۴، ص ۲۶۶) میں لکھا ہے کہ ابوعبید کے نزدیک ملاقیح سے مراد چارپایوں کے پیٹ میں جو بچے ہیں اور مضامین سے مراد نراونٹ وغیرہ کی پشتوں میں منی کے قطرات، جن سے بچے بنتے ہیں۔ وہ لوگ مادہ اونٹنی کے پیٹ میں جو بچے ہوتے ہیں اور جو اونٹ وغیرہ جفتی لگاتا ہے اسے سال یا کئی سالوں کیلئے فروخت کرتے تھے۔ کسی شاعر نے کہا ہے

ان المضامين التي في الصلب ماء الفحول في الظهور الحذب

یعنی بے شک ”مضامین“ سے نراونٹوں کی کبڑی پشتوں میں منی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ان دونوں قسم کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کا سبب بیع

بھول اور دھوکہ ہے، جو حرام ہے۔

(۶۹۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا بَيْعَتَهُ أَقَالَ اللَّهُ عَثْرَتَهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَّانٍ وَالتَّحَايِمِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو فروخت کنندہ، کسی مسلمان سے فروخت شدہ مال واپس کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ و لغزشیں معاف فرما دے گا۔“ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اقال﴾ اقالہ سے ماخوذ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے، خرید و فروخت کرنے والے دونوں فریقوں کے مابین جو معاہدہ طے پایا ہے، اسے ختم کر دینا۔ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے۔ ﴿اقال اللہ عشرتہ﴾ اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو خطاؤں کو معاف فرما دے گا اور ﴿اقالہ﴾ کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کسی سے کوئی چیز خریدتا ہے۔ پھر اس میں دھوکہ کے ظاہر ہونے یا ضرورت و حاجت کے ختم ہونے اور یا کسی وجہ سے وہ نادم و پریشان ہوتا ہے تو وہ فروخت کنندہ سے التماس کرتا ہے کہ وہ اپنی فروخت کردہ چیز کو واپس لے کر اس کی قیمت واپس کر دے۔ جب فروخت کرنے والا خریدار کو ادائیگی واپس کر دے گا تب اقالہ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچے گا اور خریدار پر اس کا احسان ہوگا، کیونکہ بیع تو مکمل ہو چکی تھی اور خریدار اسے فسخ نہیں کر سکتا۔

بیع میں اختیار کا بیان

۲ - باب الخيار

(۶۹۲) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا ابْتَاعَ رَجُلَانِ فُكِّلَ وَاحِدٌ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا وَكَانَا جَمِيعًا، أَوْ يُخَيَّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ، فَإِنْ خَيَّرَ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ فَبَيَا عَلَى ذَلِكَ فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ، وَإِنْ تَفَرَّقَا بَعْدَ أَنْ تَبَايَعَا وَلَمْ يَتْرُكْ وَاحِدٌ مِنْهُمَا الْبَيْعَ فَقَدْ وَجَبَ الْبَيْعُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ”جب دو آدمی آپس میں سودا کرنے لگیں تو جب تک وہ اکٹھے رہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں، ان میں سے ہر ایک کو اختیار ہے، یا ایک دوسرے کو اختیار دے دے، اگر ایک دوسرے کو اختیار دے دے، پھر اس پر سودا طے ہو جائے تو سودا بچتہ ہو گیا اور اگر سودا طے کرنے کے بعد ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں اور دونوں میں سے کسی نے بھی بیع کو فسخ نہ کیا ہو تو بیع بچتہ ہو جائے گی۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ۔)

(مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿باب الخیار﴾ خیار میں خاء کے نیچے کسرہ اور یاء پر تخفیف۔ اختیار یا تیجر سے اسم ہے۔ اختیار یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملے میں صاحب اختیار ہو۔ چاہے اسے عملی جامہ پہنائے یا چاہے چھوڑ دے اور یہاں خیار سے یہ مراد ہے کہ سودے کو جاری رکھتا ہے، یا اسے فسخ کرنا ہے۔ بیع میں خیار کی بہت سی اقسام و انواع ہیں۔ اس باب میں مصنف نے صرف دو پر اکتفاء کیا ہے اور وہ یہ ہیں ”خیار الشرط“ اور ”خیار المجلس“ اور بالعموم انہیں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے اور اکثر انہی دونوں پر عمل ہوتا ہے۔ ﴿اذا ابتاع رجلاً﴾ دونوں میں سودا پختہ ہو گیا اور بیع ہر پہلو سے مکمل ہو گئی ہو صرف جدا ہونے کے سوا اور کوئی چیز باقی نہ رہی ہو۔ ﴿مالم یسفرقا﴾ اور ایک روایت میں ﴿یسفرقا﴾ بھی ہے۔ معنی یہ ہے کہ اختیار کی مدت دونوں کے جدا نہ ہونے تک دراز ہے۔ ﴿وکنا جمیعاً﴾ دونوں ایک ہی مجلس میں اکٹھے ہوں۔ یہ پہلے کا بیان اور اس کی تاکید ہے۔ باہمی اجتماع اس بات کی دلیل ہے کہ جدا اور الگ ہونے سے مراد دونوں کے بدن اور جسم ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ گفتگو کے ذریعہ سے علیحدگی اور جدائی مراد نہیں اور بلاشبہ یہ اس کو متقاضی ہے کہ جب تک وہ ایک مجلس میں ہوں، اس وقت تک اختیار دینا واجب و لازم ہے، خواہ خاموش رہیں یا باتیں کرتے رہیں اور خواہ ایک ہی نوع کی گفتگو ہو، یا باہم مختلف پہلوؤں پر باتیں کریں۔ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی پر ہم نے لوگوں کے معاملہ کو پایا ہے، اہل لغت نے پہچانا ہے اور کلام کا بھی ظاہر بتاتا ہے کہ جب ﴿تفرق الناس﴾ (لوگ جدا جدا ہو گئے) کہا جاتا ہے تو اس سے بدنوں کا الگ ہونا مراد لیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ گفتگو اور رائے کا الگ اور جدا ہونا اس وقت ہی سمجھا جاتا ہے جب اس کے ساتھ کوئی قید ہو اور کوئی قرینہ ہو اور اگر حدیث کی وہ تاویل کی جائے جس کی جانب امام نخعی گئے ہیں، یعنی گفتگو سے جدائی تو پھر اس حدیث کا کوئی فائدہ نہیں رہتا اور اس کے معنی ہی ساقط ہو جاتے ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ خریدار میں جب تک فروخت شدہ چیز کی قبولیت نہ پائی جائے، اس وقت تک اسے اختیار ہے۔ بعینہ فروخت کنندہ کا خیار اس چیز کی ملکیت سودا طے ہونے سے پہلے تک ثابت ہے اور یہ ایسی معروف بات ہے جو اپنے معنی میں بالکل ظاہر ہے، بایں طور اس حدیث میں خریدار کے اختیار کا ذکر بے معنی ہے۔ (لخصاً) ﴿اویخیر احدہما الآخر﴾ یخیر تخمیر سے ماخوذ ہے۔ صیغہ فعل مضارع معلوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں میں سے ایک، دوسرے کو ایک متعین مدت تک اختیار دیتا ہے تو پھر علیحدگی سے خیار ختم نہیں ہوتا، بلکہ مدت معینہ تک دراز ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک دوسرے کو بیع کے نافذ کرنے کا اختیار دے اور دوسرا نافذ کرنے کو علیحدگی سے پہلے منتخب کر لے تو اسی وقت بیع کچی اور پختہ ہو جائے گی اور خیار کو پھر جدائی تک باقی نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ جدائی کا اعتبار باطل ہو جائے گا۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ہوتی ہے ﴿فان خیبر احدہما

خرید و فروخت کے مسائل 543

الاخر... الخ) گویا کہ اس نے کہا کہ بیع کے نافذ کرنے کو اختیار کر یا اسے مسح کر۔ ﴿فبیباعا علی ذالک﴾ پس دونوں نے اس پر سودا طے کر لیا ﴿فقد وجب البيع﴾ پس سودا پکا ہو گیا۔ یعنی بیع مکمل اور نافذ ہو گئی، خواہ دونوں اسی جگہ ہوں اور جدا نہ ہوئے ہوں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بیوپاری اور سوداگر کو خرید و فروخت کے رکھنے یا توڑنے کا حق دیا گیا ہے۔ اختیار یا خیار کا بھی یہی معنی ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ کو سودا باقی رکھنے یا توڑنے کا حق ہے۔ اس کی بہت سی انواع ہیں۔ ان میں سے دو کا بالخصوص یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک خیار مجلس جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ دوسرا خیار شرط۔ یہ کہ دونوں میں سے ایک یا دونوں یہ شرط کر لیں کہ اتنی مدت تک سودے کا باقی رکھنے، یا واپس کرنے کا اختیار رہے گا۔ اگر خریدار اسے واپس کرنا چاہے تو فروخت کنندہ کو بغیر لیت و لعل اور حیل و حجت کے واپس لینا ہو گا۔ اس کے علاوہ دو تین صورتیں مزید یہ ہیں۔ ﴿خیار عیب﴾ یہ کہ خریدنے والا کہے گا کہ اگر اس میں کوئی نقص و عیب ہوا تو میں اسے واپس کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ ﴿خیار رویت﴾ یہ ہے کہ خریدار کہے کہ سودا تو طے ہوا، مگر میں اسے دیکھ کر ہی فیصلہ کروں گا، اسے لینا ہے یا نہیں۔ دیکھنے پر اسے یہ سودا منظور نہ ہوا تو بیع منعقد نہ ہوگی۔ ”خیار تعین“ یہ کہ خریدار کہے کہ ان میں سے جو چیز یا جانور مجھے پسند ہو گا، وہ لے لوں گا۔ بہر حال شریعت نے فریقین کے لئے بے شمار آسانیاں اور سولتیں رکھی ہیں، تاکہ کسی طرح جھگڑا اور تنازع نہ ہو۔ خریدنے اور فروخت کرنے میں دونوں کی باہمی رضامندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

(۶۹۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے، انہوں
عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے
قَالَ: «الْبَائِعُ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ حَتَّى فرمایا ”خریدار اور فروخت کرنے والے کو اختیار
يَتَفَرَّقَا، إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَفْقَةً خِيَارًا، حاصل ہے، تاوقتیکہ ایک دوسرے سے جدا ہوں،
وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَفَارِقَهُ خَشْيَةً أَنْ بشرطیکہ سودا اختیار والا ہو اور سودا واپس کرنے کے
يَسْتَقْبِلَهُ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَه، وَرَوَاهُ اندیشے کے پیش نظر جلدی سے الگ ہو جانا حلال
الدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ حُرَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ، وَفِي نہیں ہے۔“ (اسے ابن ماجہ کے سوا پانچوں نے روایت کیا
رَوَايَةً: «حَتَّى يَتَفَرَّقَا مِنْ مَكَانَيْهِمَا». ہے۔ نیز دارقطنی اور ابن خزیمہ اور ابن جبارود نے بھی

روایت کیا ہے)

اور ایک روایت میں ہے کہ ”جب تک وہ اپنی جگہ سے جدا (نہ) ہو جائیں۔“

لعنوی تشریح: ﴿صفت خیار﴾ صفت پر رفع ہے۔ کان کے تامہ ہونے کی وجہ سے، یعنی اگر سودے میں خیار پہلے ہی موجود ہے اور صفتہ کو منصب پڑھیں تو پھر کان ناقصہ ہو گا۔ اور اس کا اسم

(۶۹۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: ذَكَرَ رَجُلٌ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ يُخَدَعُ فِي الْيُبُوعِ، فَقَالَ: «إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ: لَا خِلَافَةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ذکر درجہ﴾ یعنی اس کے اہل نے اس کا ذکر کیا۔ اس شخص کا نام حبان بن منقذ بن عمرو انصاری ہے۔ حبان کی ”حاً“ پر فتح ہے اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کے والد تھے۔ ان کے سر میں ایک غزوہ کے دوران جو انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ لڑا تھا، پتھر سے شدید

خرید و فروخت کے مسائل 545

زخم آگیا تھا جس کی وجہ سے ان کے (حافظے اور) عقل میں کمزوری واقع ہو گئی اور زبان میں بھی تغیر پیدا ہو گیا تھا، لیکن ہنوز تمیز کے دائرہ سے خارج نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳۰ سال کی ہو گئی تھی۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے۔ ﴿لا خلاصۃ﴾ کی ”خا“ کے نیچے کسرہ۔ مطلب یہ تھا کہ دین میں دھوکہ و فریب نہیں، کیونکہ دین تو نصیحت و خیر خواہی کا نام ہے اور دین اسلام تو ہے ہی خیر خواہی کا نام اور لا کا کلمہ نفی جنس کیلئے ہے اور اس کی خبر مہذوف ہے۔ صاحب سبل السلام نے یہ بات کہی ہے کہ ابن اسحاق نے یونس بن بکیر اور عبد الاعلیٰ کی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ”پھر تم کو اس سودے میں جسے تو نے خریدا ہے، تین راتیں تک اختیار ہے، اگر تجھے سودا پسند ہو تو اسے رکھ لو اور اگر پسند نہ ہو تو واپس کر دو۔“ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خرید و فروخت میں غبن کی صورت میں بھی خیار ثابت ہے۔ لیکن مطلقاً نہیں، بلکہ اس وقت جب آدمی ضعیف العقل ہو اور سامان کی قیمت سے واقف نہ ہو اور اسے دھوکہ کا اندیشہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ غبن فاحش کے معلوم ہونے پر خیار ثابت ہے۔ یہ رائے امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی ہے، مگر جمہور علماء اس کے قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حبان بن منقذ کو بالخصوص یہ اجازت اس لئے دی کہ ان کی عقل اور زبان میں کمزوری واقع ہو گئی تھی۔ جیسا کہ مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ - صحیح بات یہ ہے لا خلاصۃ کی صدا لگانا بھی اپنی جگہ ایک طرح کی شرط ہے، جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ دھوکہ اور فریب کے باوجود مشتری کیلئے خیار کا ثبوت ملتا ہے اور خیار الشرط بھی اسی کو کہتے ہیں۔ آپؐ نے جو الفاظ ان کو تلقین فرمائے ان الفاظ کی برکت سے انہیں بعد میں کبھی دھوکہ نہیں ہوتا تھا۔

سود کا بیان

۳ - بَابُ الرِّبَا

(۶۹۵) عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَكَلَ الرِّبَا وَمُؤْكَلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدِيهِ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَابْنُ خَرَّازٍ. نَعُوذُ مِنَ خَبِيثَةِ أَبِي جُحَيْفَةَ.

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے اور اس کے تحریر کرنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ نیز فرمایا کہ ”گناہ کے ارتکاب میں) یہ سب مساوی اور برابر ہیں۔“ (مسلم، اور بخاری

میں ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اسی طرح ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الربا﴾ ربا میں ”راء“ کے نیچے کسرہ ہے۔ ربا کے معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے اور وہ ہے خرید و فروخت میں ایک جنس کے تبادلہ کے وقت زیادہ مقدار میں حاصل کرنا اور ہر قسم کی حرام بیع پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور امت کا اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ ﴿اکل الربا﴾ سود خور۔ ضروری نہیں

حاصل کلام: اس حدیث میں سود کی حرمت اور لینے، دینے والے اور تحریر کرنے والے اور اس پر گواہیاں ثبت کرنے والے پر لعنت کا ذکر ہے۔ سود نص قرآنی سے حرام ہے، اس سے باز نہ آنے والوں کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ ایسی لعنت ہے جس میں دنیا بھر کے لوگ گرفتار اور مبتلا ہیں۔ اس لعنت سے چھٹکارے کی صدق دل سے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہئے۔

نغوی تشریح: ﴿ایسرھا﴾ ہلکا اور گناہ میں سب سے کم اور قلیل۔ ﴿ارسی الریبا﴾ سب سے بڑا اور سب سے عظیم۔ ﴿عرض الرجل المسلم﴾ غیبت و چغلی کے ذریعہ اس کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہونا، بہتان تراشی اور سب و شتم کرنا اور عیب جوئی اور جو چیز اسے بری محسوس ہو اس کے ذکر سے تکلیف دینا اور جو برائی اس نے نہ کی ہو، اسے اس کے سر ڈال دینا۔ یہ بیماری ہمارے زمانہ میں وبا کی طرح عام ہو گئی ہے۔ اس مرض نے لوگوں کو عاجز و درماندہ کر کے رکھ دیا ہے اور ہر طرف پھیل گئی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

(۶۹۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا تَبِعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَلَا تُشِفُوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ، وَلَا تَبِعُوا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ إِلَّا مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَلَا تُشِفُوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ، وَلَا تَبِعُوا مِنْهَا

عَائِيًا بِنَاجِزٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مثلاً بمثل﴾ دونوں میں میم کے نیچے کسرہ اور "ٹا" ساکن ﴿سواء بسواء﴾ کے معنی میں، جس کے معنی برابر، برابر ہیں۔ ﴿ولا تشفوا﴾ اشفاق سے ماخوذ ہے، زیادہ نہ کرو، اضافہ نہ کرو۔ ﴿الودق﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ چاندی۔ ﴿غائباً﴾ جو چیز مجلس میں موجود نہ ہو۔ ﴿بناجز﴾ ناجز کے معنی حاضر اور موجود۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ سونے کا سونے سے اور چاندی کا چاندی سے مبادلہ میں کمی بیشی حرام ہے اور یہی سود کی اصل ہے۔ نیز یہ اس کی بھی دلیل ہے کہ یہ خرید و فروخت اس وقت تک صحیح نہیں تاوقتیکہ دونوں فریق برابر برابر مقدار و وزن میں چیز ایک دوسرے کے قبضہ میں نہ دے دیں۔

(۶۹۸) وَعَنْ عَبْدِ بْنِ الصَّامِتِ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، الْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّنْمُرُ بِالتَّنْمُرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سِوَاءٍ بِسِوَاءٍ، يَدَا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا هُوَ» (مسلم)

کَانَ يَدَا بِيَدٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے عوض، گندم، گندم کے عوض، جو، جو کے عوض، کھجور، کھجور کے عوض اور نمک، نمک کے عوض ایک دوسرے کی طرح، برابر برابر اور نقد بنقد (فروخت و المِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، سِوَاءٍ بِسِوَاءٍ، يَدَا بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا هُوَ" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اذا كان يدا بيدا﴾ علامہ خطابی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جن اشیاء میں سود کا حکم ہے خواہ وہ سونا ہے یا چاندی یا ان کے علاوہ کھانے کی اشیاء کہ ان میں بیع و شراء کی صحت کیلئے قبضہ شرط ہے۔ اگرچہ جنس مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سودی اشیاء میں جنس ایک نہ ہو تو ان میں ادھار اور قاضل جائز ہے۔ جیسے سونے کو گندم کے بدلہ اور چاندی کو جو کے بدلہ اور اس کے علاوہ دوسری ماپ وغیرہ والی اشیاء میں قاضل جائز ہے۔ نیز اس پر بھی سب متفق ہیں کہ کسی چیز کو اسی چیز کے بدلہ میں فروخت کرنا جائز نہیں، جبکہ ان میں سے ایک ادھار ہو۔ (انتہی) یہ حدیث دلیل ہے کہ ان مذکورہ چھ اشیاء میں سود پایا جاتا ہے اور اس پر ساری امت کا اتفاق ہے۔ البتہ ان چھ کے علاوہ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ سود کی علت جہاں پائی جائے گی، وہ بھی سود ہی ہو گا۔ لیکن ہر کوئی نص وارد نہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں علماء کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم اہل ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ سود صرف سابق الذکر منصوص علیہ اشیاء میں ہوتا ہے۔

(۶۹۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”سونا سونے کے بدلہ میں، وزن میں
﴿الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَزْنًا بِوَزْنٍ﴾ برابر برابر۔ اور قسم میں ایک ہو چاندی، چاندی کے
مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَزْنًا بدلہ میں، وزن میں برابر برابر، اور قسم میں ایک جیسی
بِوَزْنٍ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، فَمَنْ زَادَ أَوْ ہو پھر اگر کوئی زیادہ لے یا زیادہ دے پس وہ سود
اِسْتَرَادَ فَهُوَ رِبًا“۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿زاد او استزاد﴾ زیادہ دے یا زیادہ کا مطالبہ و تقاضا کرے۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ
جو چیزیں ماپ یا تول کر فروخت کی جاتی ہوں، ان کا تبادلہ ماپ تول کے ذریعہ کرنا جائز ہے، محض اندازہ و
تخمینہ درست نہیں۔ (اور قسم میں ایک جیسا / جیسی کا مطلب ہے کہ ”قیراط“ میں دونوں برابر ہوں۔
مترجم)

(۷۰۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ وَابْنِ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَيْبَرٍ، فَجَاءَهُ بِتَمَرٍ جَنْيَبٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَكُلْتُ تَمْرَ خَيْبَرٍ هَكَذَا؟» فَقَالَ: لَا، وَاللَّهِ، يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالثَّلَاثَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: لَا تَفْعَلْ، بَعِ الْجَمْعَ بِالْدِّرَاهِمِ، ثُمَّ اتَّبَعَ بِالْدِّرَاهِمِ جَنْيَبًا، وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذَلِكَ. مَثَقُ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «وَكَذَلِكَ الْمِيزَانُ»۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل مقرر کیا۔ پس وہ آپ کی خدمت میں بہت عمدہ کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ”کیا خیبر میں پیدا ہونے والی سب کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟“ اس نے عرض کیا نہیں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! خدا کی قسم! ہم دوسری کھجوریں دو صاع اور (کبھی) تین صاع دے کر یہ کھجوریں ایک صاع لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ایسا نہ کرو۔ گھٹیا کھجوروں کو دراہم کے عوض فروخت کر کے عمدہ اور اچھی کھجوریں بھی درہموں کے عوض خریدو اور فرمایا تولنے والی اشیاء بھی اسی کی مانند ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

مسلم میں ہے کہ ”تول میں بھی اسی طرح۔“

لغوی تشریح: ﴿استعمل رجلاً﴾ اسے عامل بنا کر بھیجا (تحصیل دار زکوٰۃ) اس آدمی کا نام سواد بن غزیہ تھا۔ سواد میں سین پر فتمہ اور واؤ پر تخفیف۔ اور غزیہ بروزن عطیہ۔ انصاری ﴿جانب﴾ جید اور عمدہ۔ یہ کھجوروں میں سے خاص قسم و نوع کی کھجور تھی۔ ﴿الجمع﴾ جیم پر فتمہ اور میم ساکن یعنی ردی اور گھٹیا قسم کی کھجور اور ایک قول اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد مختلف انواع کی ملی جلی

خرید و فروخت کے مسائل 549

کھجوریں ہیں۔ ﴿وَقَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذَلِكَ﴾ یعنی جو چیزیں وزن کر کے فروخت کی جاتی ہیں، جب اسی جنس کے مبادلہ میں فروخت کی جائیں گی تو زیادہ مقدار میں خرید و فروخت نہیں کی جائے گی، بلکہ پہلے انہیں درہم کے عوض فروخت کیا جائے گا پھر درہم کے عوض ہی خرید کی جائیں گی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی چیز ہم جنس کے تبادلہ میں فروخت کی جائے گی تو اس میں کمی بیشی جائز نہیں۔ خواہ دونوں عمدگی اور گھٹیا پن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔

(۷۰۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے کھجوروں کے کسی ایسے ڈھیر کو رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مَنْ جس کا ماپ نہ کیا گیا ہو، کھجوروں کے معین ماپ کے التَّمْرِ لَا يُعْلَمُ مَكِيلُهَا بِالْكَيْلِ بدلہ میں فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں کسی چیز کے ڈھیر کی صورت میں جس کا وزن یا ماپ معلوم نہ ہو، اسے معین مقدار یا وزن کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ ڈھیر کی مقدار اور وزن معلوم نہیں، اس لئے اسے فریقین میں سے ایک کو نقصان اور دوسرے کو بلاوجہ فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کمی بیشی کا جہاں احتمال ہوگا، وہ بھی اسی ممانعت کے تحت شمار ہوگی۔

(۷۰۲) وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حضرت معمر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنِّي كُنْتُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ ”طعام أَسْمَعُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «الطَّعَامُ (انا)ج طعام کے بدلے، ایک ہی قسم کا ہو، ان دونوں بِالطَّعَامِ مِثْلًا بِمِثْلٍ، وَكَانَ طَعَامُنَا ہمارا طعام (انا)ج جو ہوتے تھے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے طعام (انا)ج کو اگر فروخت کرنا مقصود ہو اور وہ بھی طعام کے عوض تو اس میں برابری ضروری ہے، کمی بیشی ممنوع ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گندم اور جو دو الگ الگ جنس ہیں، ایک نہیں۔ صحابہ کرامؓ کی بھی یہی رائے ہے، اس لئے جو اور گندم کے تبادلہ میں بھی برابری ضروری نہیں۔ مگر امام مالک رضی اللہ عنہ دونوں کو ایک جنس قرار دیتے ہیں اور ان میں برابری لازم سمجھتے ہیں۔

(۷۰۳) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَشْتَرَيْتُ نے خیبر کے روز ایک ہار بارہ دینار میں خریدا۔ اس یَوْمَ خَيْبَرَ فَلَادَةً بِأَثْنِي عَشَرَ دِينَارًا، میں نے ان کو الگ کر

550 خرید و فروخت کے مسائل

فِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ، فَفَصَّلْتُهَا، دیا تو میں نے اس میں بارہ دینار سے زیادہ سونا پایا۔
فَوَجَدْتُ فِيهَا أَكْثَرَ مِنْ اثْنَيْ عَشَرَ مِثْقَالًا، میں نے اس کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا
دِينَارًا، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، ”جب تک ان کو الگ الگ نہ کر لیا جائے فروخت
فَقَالَ: «لَا تَبَاغُ حَتَّى تُفَصَّلَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ نہ کیا جائے۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿قلادہ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ ہار جسے عورتیں گلے میں پہنتی ہیں۔ ﴿خرز﴾ خاور را
دونوں پر فتح۔ عمدہ پتھر، خرزہ کی جمع ہے۔ فارسی میں اسے مھرہ کہتے ہیں۔ ﴿ففصلتها﴾ الگ کر دیا میں
نے ان کو اس طرح کہ سونے کو مہروں سے الگ کر کے میسر کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سونے کی بنی ہوئی کسی چیز میں کسی اور چیز کا جزاؤ ہو تو اسے
الگ کئے بغیر سونے کو فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ جب تک دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا، صحیح
اندازہ نہیں ہو سکتا کہ جس کے عوض اسے فروخت کیا جا رہا ہے وہ اس کے مساوی ہے یا نہیں؟ امام
شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

(۷۰۴) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حَضَرَ سَمُرَةُ بْنُ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
نَهَى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا
نَسِئَةً. رَوَاهُ الْحَمَّسِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حَسَّانٍ ہے۔ ترمذی اور ابن حارود نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

الْحَارَوُ.

لعوی تشریح: ﴿نسیئہ﴾ یاء کے بعد ہمزہ کے ساتھ کسریمہ کے وزن پر ہے اور ادغام کی صورت
میں عطیہ کے وزن پر ہو گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ نون پر فتح اور سین کے نیچے کسرہ اور حمزہ پر فتح، یا
کے بغیر۔ تمیز واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور لغت میں اس کے معنی تاخیر، دیر کے ہیں۔ اس سے
مراد ادھار ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حیوان کے بدلہ میں حیوان کی ادھار فروخت جائز
نہیں، مگر اسی باب میں آنے والی عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت اور دیگر روایات اس کے
معارض ہیں، اسی بنا پر جمہور حیوان کے بدلہ حیوان کو مطلقاً ادھار فروخت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، اگرچہ
کی بیشی بھی ہو اور بعض اس سے منع کرتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ان دونوں کے درمیان تطبیق
یوں دی ہے کہ یہاں ادھار سے دونوں طرف سے ادھار مراد ہے۔ اس لئے کہ نسیئہ کا لفظ اس کا
احتمال رکھتا ہے کہ یہ ادھار کے بدلہ ادھار بیع کی صورت ہے اور یہ کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔
خطابی رحمہ اللہ نے اس تطبیق اور جمع کی صورت کو پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ جمع کی یہ صورت اچھی اور عمدہ
ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کا رجحان منع کی احادیث کی طرف ہے، مگر میرے نزدیک راجح وہی رائے ہے جسے
امام شافعی رحمہ اللہ، علامہ خطابی رحمہ اللہ اور جمہور نے اختیار کیا ہے۔

(۷۰۵) وَعَنْ ابْنِ عُمرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضَرَ ابْنُ عُمرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ میں نے

تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ، وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ مِنْ رِوَايَةِ نَافِعٍ عَنْهُ، وَفِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ، وَلَا حَمْدَ نَحْوَهُ مِنْ رِوَايَةِ عَطَاءٍ، وَرِجَالُهُ يَفَاقُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْقَطَّانِ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم عینہ کی تجارت کرنے لگو گے اور بیلوں کی دھیں پکڑنے لگو گے اور زراعت و کھیتی باڑی کو پسند کرو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو (اس وقت) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت و خواری کو مسلط کر دے گا۔ اس (ذلت) کو تم سے اس وقت تک دور نہیں فرمائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ نہیں آؤ گے۔“ (اسے ابوداؤد نے نافع رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے اور اس کی سند میں کلام ہے اور سند احمد میں مروی عطاء رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں اور ابن قطان نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿العینہ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور ”یا“ ساکن۔ عینہ کی بیع یہ ہے کہ آدمی ایک چیز مقرر قیمت پر ایک مقرر وقت تک کیلئے فروخت کرے، جب یہ میعاد مقررہ مکمل ہو جائے تو خریدار سے وہی چیز کم قیمت پر خرید لے کہ زیادہ رقم اس کے ذمہ باقی رہ جائے۔ عینہ اس کا نام اس لئے رکھا گیا کہ فروخت کردہ وہی چیز اسی حالت میں حاصل ہو جائے اور اصل مال خریدار سے لوٹ کر فروخت کنندہ کے پاس پھر پہنچ جائے۔ جیسا کہ صاحب سبل السلام نے کہا ہے۔ بیع عینہ کے عدم جواز کے امام مالک رضی اللہ عنہ، امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام احمد رضی اللہ عنہ قائل ہیں۔ البتہ امام شافعی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب اس کے جواز کے قائل ہیں۔ (نیل الاوطار) اور امام ابن قیم رضی اللہ عنہ نے بیع عینہ کے عدم جواز کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے۔ ﴿اخذتم اذناب البقر﴾ گائے کی دم پکڑنے سے کنایہ مراد ہے کہ جہاد کو ترک کر کے زراعت و کھیتی باڑی میں مشغول و مگن ہو جاؤ گے۔ زراعت سے رضامندی کا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی کا مطمع نظر اور مقصود زندگی یہی بن کر رہ جائے گا اور ساری توانائیاں اور قوتیں اسی میں صرف ہونے لگیں گی۔ (سبل السلام) ﴿ذلا﴾ ذال پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں۔ ذلت، ناقدری، ضعف اور مسکنت۔ ﴿وفی اسنادہ مقال﴾ سبل السلام میں ہے اس لیے کہ اس کی سند میں ابو عبد الرحمن خراسانی جس کا نام اسلحق ہے جو عطاء خراسانی سے روایت کرتا ہے۔ اس کے متعلق امام ذہبی رضی اللہ عنہ نے ”میزان“ میں کہا ہے یہ روایت اس کی مناکیر میں سے ہے ﴿ولا حمد نحوه﴾ احمد کی روایت میں اسی طرح ہے۔ مصنف کہتے ہیں میرے نزدیک جس حدیث کو ابن قطان نے صحیح قرار دیا وہ بھی معلول ہے، کیونکہ اس کے راویوں کا ثقہ ہونا اس بات کیلئے لازمی نہیں کہ یہ حدیث بھی صحیح ہو، اس لئے کہ اس میں اعش مدلس ہے اور وہ اپنے استاد عطاء سے سماع کا ذکر ہی نہیں کرتا اور عطاء کے متعلق احتمال ہے کہ وہ عطاء خراسانی ہو تو پھر عطاء اور ابن عمر رضی اللہ عنہما

552 خرید و فروخت کے مسائل

کے درمیان سے نافع کو ساقط کر دینے سے یہ ﴿تدلیس تسویہ﴾ ہوگی اور یوں یہ حدیث پہلی حدیث ہی بن جائے گی اور یہی قول مشہور ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بیع عینہ کا ذکر ہے، نیز زراعت و کھیتی باڑی اختیار کرنے اور ہمارا کو ترک کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذلت و خواری مسلط کئے جانے کی خبر ہے۔ بیع عینہ میں چونکہ فروخت شدہ چیز عینہ کم قیمت کے عوض فروخت کرنے والے کے پاس پلٹ کر واپس آ جاتی ہے، اس لئے اسے عینہ کہتے ہیں۔ ایک صورت اس کی یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی دوسرے سے کوئی چیز ادھار مانگتا ہے، وہ جواب دیتا ہے کہ بھائی میں تمہیں یہ چیز ادھار نہیں دے سکتا۔ مگر فلاں چیز میرے پاس ہے جس کی قیمت دس روپے ہے اگر تم راضی ہو تو میں وہ چیز تجھے پندرہ روپے میں دے سکتا ہوں اور پھر دوبارہ خود ہی وہ اس سے دس روپے میں واپس خرید لے۔ اس طرح پانچ روپے خواہ مخواہ خریدار کے ذمہ قرض ہو گیا، یا یوں سمجھیں کہ کسی نے ایک کتاب ایک سال کی مدت تک کیلئے سو روپے میں خریدی اور وعدہ کیا کہ سال کے بعد سو روپیہ ادا کر دوں گا۔ مگر کسی وجہ سے وہ سو روپیہ کا بندوبست نہ کر سکا تو بیچنے والا اس سے وہی چیز ۹۰ روپے میں واپس خرید لے، اس طرح دس روپے اس کے ذمہ قرض رہ گیا۔ اس بیع میں چونکہ ایک فریق کو نقصان ہوتا ہے، اس لئے اسے ممنوع قرار دے دیا۔

راوی حدیث: ﴿نافع﴾ ابو عبد اللہ نافع بن سرجس مدنی، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام مراد ہیں۔ آپ ثقہ، ثبت اور مشہور و معروف فقیہ ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث کا بڑا حصہ ان ہی کے گرد گردش کرتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نافع کے توسط سے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ نافع، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کرتا ہے تو پھر مجھے کسی اور سے حدیث سننے کی پروا ہی نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ صحیح ترین سند مالک عن نافع عن ابن عمر ہے۔ ان سے کثیر مخلوق خدا نے روایت کیا ہے۔ ۷۰۶ یا اس کے بعد فوت ہوئے۔

﴿عطاء﴾ سے مراد غالباً عطاء بن ابی مسلم میرہ خراسانی ہیں، جو مہلب بن ابی صفہ کے غلام تھے اور ان کی کنیت ابو عثمان تھی۔ شام میں فروکش ہو گئے تھے۔ مشہور و معروف لوگوں میں سے تھے۔ ثقہ اور بڑے تہجد گزار تھے، مگر حافظہ ردی و خراب تھا اور کثیر الوہم تھے۔ ۸۵ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۷۰۶) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «مَنْ شَفَعَ لِأَخِيهِ شَفَاعَةً فَأَهْدَى لَهُ هَدِيَّةً عَلَيْهَا، فَقَبِلَهَا، فَقَدْ أَتَى بَابًا عَظِيمًا مِنْ أَبْوَابِ الرَّبِّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس کسی نے اپنے بھائی کیلئے کوئی سفارش کی (اس کے بعد) وہ اسے کوئی تحفہ دے اور وہ اسے قبول کر لے تو وہ سود کے بہت ہی بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا

وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ. ہے اور اس کی سند میں کلام ہے)

لعنوی تشریح: ﴿فقد اتى بابا عطيما﴾ تو وہ سود کے بہت بڑے دروازے پر آیا۔ دونوں میں (تحفہ اور سود میں) مشابہت کی وجہ سے استعارۃً اسے سود کہا گیا ہے اور وہ یوں کہ سود بھی کسی کے مال کو بلا معاوضہ حاصل کرنے کا نام ہے اور یہاں بھی سفارش کے بدلے میں رقم لی ہے کسی چیز کے بدلے میں نہیں۔ اس روایت میں کلام کا سبب یہ ہے کہ اس کا راوی ابو عبد الرحمن قاسم بن عبد الرحمن الدمشقی متکلم فیہ ہے۔ (سبل)

(۷۰۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت بن عبد العاص رضی اللہ تعالیٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور عنہما، قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ ”(اسے الراشسي والمرتشي. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ابو داؤد اور ترمذی دونوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے والترمذي، وَصَحَّحَهُ. اسے صحیح کہا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿الراشي﴾ رشوت دینے والا ﴿ والمرتشي﴾ رشوت لینے والا اور رشوت کتے ہیں باطل و ناحق طریقہ سے حصول مال کیلئے مال خرچ کرنے کو۔ رشوت رشاء سے ماخوذ ہے۔ رشاء اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کنوئیں کے پانی تک پہنچتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کوئی اپنا حق حاصل کرنے، یا اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو دور کرنے کیلئے مال خرچ کرتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ دینے والے کے حق میں رشوت شمار نہیں ہوگی، بلکہ یہ فقط لینے والے کے حق میں رشوت شمار ہوگی۔

(۷۰۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ہی مروی أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يُجَهَّزَ جَيْشًا، ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اونی ختم ہو گئے۔ تو آپ نے ان کو صدقہ کے اونیوں پر (ادھار اونی) لینے کا حکم ارشاد فرمایا راوی کہتے ہیں میں ایک اونی، صدقہ کے دو اونیوں کے بدلہ لیتا تھا۔ (اسے حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے اس رَوَاهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ أَبِي عَاتِقٍ، وَرَجَّاهُ يَقَاتُ. کے راوی ثقہ ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿ان يجهز جيشا﴾ وہ ساز و سامان تیار کریں، جس کی لشکر کو ضرورت ہے۔ سواریاں، اسلحہ وغیرہ۔ ﴿فنفدت الابل﴾ نفدت میں نون پر فتح ”فا“ کے نیچے کسرہ اور وال محملہ۔ ختم ہو گئے، کم رہ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مجاہد کو ایک اونی دے دیا، مگر اس کے باوجود کچھ آدمی ایسے رہ گئے جن کو اونی نہ دیئے جاسکے، اس لئے کہ اونی کم رہ گئے تھے۔ ﴿ان ياخذ على قلائص الصدقة﴾

554 خرید و فروخت کے مسائل

فلانص قلوصل کی جمع ہے۔ قلوصل کے قاف پر فتح ہے۔ جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ یعنی آپ نے ان کو حکم ارشاد فرمایا کہ ”جتنے اونٹ کم رہ گئے ہیں اتنے ادھار خرید لیں کہ باقی لوگوں کو پورے آجائیں اور جب عاملین صدقہ صدقات کے اونٹ لے کر آئیں گے، اس وقت ان کی قیمت ادا کر دینا۔“ ﴿الہی ابل الصدقة﴾ یعنی اس وقت تک ادھار جب صدقہ کے اونٹ بیت المال میں آجائیں۔ یہ حدیث حیوان کو حیوان کے بدلہ ادھار فروخت کرنے کو جائز قرار دیتی ہے۔ جبکہ ادھار ایک طرف سے ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو قرض خریدنا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور جمہور اس بیع کو جائز کہتے ہیں جبکہ احناف حیوانات کا قرض لینا جائز نہیں سمجھتے۔

(۷۰۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْمُرَابَنَةِ: أَنْ يَبِيعَ ثَمَرٌ كَيْفَ كَانَ نَحْلًا يَتَمَرُ كَيْلًا، وَإِنْ كَانَ كَرْمًا أَنْ يَبِيعَهُ بِزَيْبٍ كَيْلًا، وَإِنْ كَانَ زَرْعًا أَنْ يَبِيعَهُ بِكَيْلٍ طَعَامٍ، نَهَى عَنْ ذَلِكَ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باغ کی تازہ کھجوریں خشک کھجوروں سے یا تازہ انگوروں کو کشمش و منقہ سے ماپ کر سودا کرے اور اگر کھیتی ہو تو اس کا سودا غلہ سے کرے۔ آپ نے ان سب صورتوں میں ہونے والی بیع سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿نہی﴾ ”نہی“ کے ساتھ، پھل کے معنی میں۔ ﴿کرما﴾ کاف پر فتح اور ”را“ ساکن۔ انگور کی بیل۔ اس جگہ انگور مراد ہے۔

(۷۱۰) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، وَسُئِلَ عَنْ: اشْتِرَاءِ الرُّطْبِ بِالثَّمَرِ، فَقَالَ: «أَيَنْقُصُ الرُّطْبُ إِذَا بَيْسَ؟» قَالُوا: نَعَمْ، فَنَهَى عَنْ ذَلِكَ. زَوَّاهُ الْخَنَسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِينِ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَّانٍ وَالْحَاكِمُ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ سے سوال کیا جا رہا تھا کہ تازہ کھجوریں خشک کھجوروں کے بدلے فروخت کی جاسکتی ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ”کیا وہ خشک ہو کر وزن میں کم رہ جاتی ہیں؟“ لوگوں نے کہا ہاں! تو آپ نے اس سے منع فرمادیا۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن مدینی، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔)

(۷۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِيِّ بِالْكَالِيِّ، يَغْنِي الدِّينَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ادھار کے بدلہ ادھار یعنی قرض کے بدلہ قرض کو فروخت کرنا منع فرمایا ہے۔ (اسے اعلیٰ اور ہزار نے

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ادھار کی ادھار کے بدلہ بیع ناجائز ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں کہ مثلاً: اسلم نے احمد سے ایک سکوڑ پانچ سو روپے میں ایک سال کی مدت پر ادھار خریدا۔ جب سال بھر کی مدت پوری ہو گئی تو احمد اسلم سے کہتا ہے میں رقم کا بندوبست نہیں کر سکا۔ مجھے از سر نو چھ سو روپے میں یعنی سو روپے زائد پر فروخت کر دے۔ اس طرح گویا اسلم نے احمد کو سو روپیہ مزید مہلت کا دیا ہے۔ اصل چیز دونوں میں سے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے خالد سے سو روپیہ لینا ہے اور صادق نے خالد سے کوئی کپڑا لینا ہے پس صادق زید سے کہے جو کپڑا میں نے خالد سے لینا ہے وہ میں تیرے پاس سو روپے میں فروخت کرتا ہوں یہ بیع بھی ناجائز ہے۔

الغرایا،
وَبِيعَ الْأَصُولَ وَالشَّارَ

کی بیع میں رخصت

(۷۱۲) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ
رَخَّصَ فِي الْعَرَايَا أَنْ تُبَاعَ بِحَرْصِهَا
كَيْلًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: رَخَّصَ فِي الْعَرِيَّةِ
يَأْخُذُهَا أَهْلُ الْبَيْتِ بِحَرْصِهَا تَمْرًا،
يَأْكُلُونَهَا رَطْبًا.

نغوی تشریح: ﴿باب الرخصة﴾ یاد رہے کہ اہل عرب قحط کے دنوں میں اور خشک سال کے ایام میں اپنے بانات میں سے فقیروں اور مسکینوں کے درختوں کو چھوڑ کر ان کے پھل صدقات کی صورت میں دیا

خرید و فروخت کے مسائل 556

کرتے تھے کہ فلاں کھجور کے درخت کی کھجوریں تمہاری۔ اس طرح عطیہ میں دی گئی کھجور کو ”عریہ“ کہتے تھے، یعنی ان کی فروخت میں اجازت کا مفہوم یہ ہے کہ مساکین ان کے باغات میں ان درختوں کا پھل کھانے جایا کرتے تھے، اس لیے ان کے داخلے سے مالک باغات کو تکلیف ہوتی تھی، یا پھر یہ ہوتا کہ مساکین اپنی ضرورت و محتاجی کی وجہ سے ان کے پکنے کا انتظار نہ کر سکتے تھے تو وہ اپنے حصہ کے پھل فروخت کر دیتے جب کہ پھل ابھی درختوں پر ہی ہوتے تھے اور ان کے بدلے خشک کھجوریں لے لیتے۔ اور مالک باغات روز مرہ کی آمدورفت کی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے مسکینوں سے درختوں پر تر کھجوروں کو خشک کھجوریں دے کر خرید لیتے۔ یہ بیع بعینہ بیع مزاہبہ ہی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے بیع مزاہبہ کو ممنوع قرار دیا تو ضرورت و حاجت رفع کرنے کی بیع عرایا کی اجازت مرحمت فرمادی، اس شرط پر کہ کھجور کے ان درختوں پر پھل کا تخمینہ لگا کر ان کے بدلے ماپ کراتی کھجوریں دے دیں۔ نووی کی رائے یہ ہے کہ ”عریہ“ یہ ہے کہ اندازہ و تخمینہ لگانے والا کھجور کے درختوں پر موجود کھجوروں کا اندازہ لگائے اور کہے کہ یہ تر کھجوریں جو درختوں پر ہیں، یہ خشک ہو کر اتنی مقدار، یا اتنے ماپ میں رہ جائیں گی۔ مثلاً اس سے خشک ہونے کے بعد تین وسق کھجوریں حاصل ہوں گی، یا مثلاً ان کھجوروں کو اگر فروخت کرے گا تین وسق ملیں گی، اسی مجلس میں بائع اپنی قیمت اور مشتری اپنی بیع پر قابض ہو گئے۔ پس خریدار خشک کھجوریں حوالے کرے گا اور فروخت کنندہ کھجور کا درخت سپرد کر دے گا۔ یہ بیع پانچ وسق سے کم مقدار میں جائز ہے اور پانچ وسق سے زائد کی بیع جائز ہیں۔ پانچ وسق کے جواز کے بارے امام شافعی کے دو اقوال ہیں۔ اور دونوں میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ اسے جائز نہیں سمجھتے۔ بیع عریہ کی اور بہت سی صورتیں اور شکلیں ہیں ان کی یہاں گنجائش نہیں۔ بڑی کتابیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اور ﴿بیع اصول﴾ سے مراد ہے درختوں کی جڑ کا فروخت کرنا۔ اور ان کے پھلوں کی فروخت سے مراد ہے کہ درختوں کے علاوہ صرف ان کے پھلوں کی فروخت۔ ﴿یاخذھا اهل البیت﴾ ”کھجور کے درختوں کے مالک“ ﴿بخرصھا﴾ اندازہ لگائی گئی کھجوریں خشک رہ جانے کے بعد جتنی رہ سکتی ہوں اس کے بدلہ میں۔

(۷۱۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَخَّصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْ فِي خَمْسَةِ أَوْسُقٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عرایا میں اجازت و رخصت عنایت فرما دی۔ بایں صورت کہ تازہ کھجوروں کو خشک کے عوض اندازے سے فروخت کر لیا جائے، جبکہ یہ پانچ وسق کی مقدار سے کم ہوں، یا پھر پانچ وسق ہوں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فیما دون خمسة اوسق او فی خمسة اوسق﴾ او کے لفظ پر راوی کا شک ہے،

557 خرید و فروخت کے مسائل

یعنی راوی کو شک ہے کہ یہ الفاظ فرمائے یا نہیں۔ دلائل بہر حال اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ پانچ وسق کی فروخت بھی حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں پانچ اوسق سے کم یا زیادہ سے زیادہ پانچ وسق تک فروخت کی اجازت ہے۔ مگر یہ راوی کا شک ہے جس راوی نے شک کیا ہے اس کا نام داؤد بن حصین ہے۔ اس شک کی وجہ سے پانچ وسق سے کم مقدار کی فروخت ہی درست ہوگی۔ ایک وسق میں چار من ہوتا ہے تو پانچ وسق کی مقدار میں من ہوئی۔ اس طرح گویا میں من سے کم تک کی فروخت کی اجازت ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا خرم یعنی اندازہ و تخمینہ شرع میں جائز ہے بشرطیکہ تخمینہ لگانے والا اس فن سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو اور کسی کی رو رعایت کئے بغیر ایمان داری سے اندازہ لگاتا ہو تو ایک ہی آدمی کا تخمینہ درست تسلیم کیا جائے گا۔

(۷۱۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثَّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْ صَلَاحِهَا سَأَلَ: حَتَّى تَذْهَبَ آفَتُهَا أَوْ نَقْصَانُهَا كَالْأَنْدِيشَةِ نَهَى رَجُلًا عَنْ بَيْعِ الثَّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْ صَلَاحِهَا سَأَلَ: حَتَّى تَذْهَبَ آفَتُهَا أَوْ نَقْصَانُهَا كَالْأَنْدِيشَةِ نَهَى رَجُلًا عَنْ بَيْعِ الثَّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْ صَلَاحِهَا سَأَلَ: حَتَّى تَذْهَبَ آفَتُهَا أَوْ نَقْصَانُهَا كَالْأَنْدِيشَةِ نَهَى رَجُلًا عَنْ بَيْعِ الثَّمَارِ حَتَّى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا، نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿صلاحها﴾ پھلوں کی سرخی اور زردی۔ یعنی پکنے کی صلاحیت نمایاں ہو جائے۔ قطلانی کا قول ہے کہ ہر چیز میں اس کے پکنے کی صلاحیت کے ظہور سے مراد ہے کہ اس میں وہ صفت پیدا ہو جائے جو غالب طور پر مطلوب ہوتی ہے۔ ﴿عاشتھا﴾ اس کی آفت۔ اس پر وارد ہونے والی آفت کا اندیشہ نہ رہے۔

(۷۱۵) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثَّمَارِ حَتَّى تَزْهُو، قِيلَ: وَمَا زَهُوْهَا؟ قَالَ: «تَحْمَارُ» فَرُمَا بِهَا «وَهْ سَرَخٌ رَنُكَ كَمَا هِيَ جَائِيَةٌ» وَتَضْفَارُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ. حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے پھلوں کو پکنے سے پہلے فروخت کرنا ممنوع فرمایا ہے۔ کہا گیا کہ پکنے سے کیا مراد ہے؟ ارشاد قیل: وَمَا زَهُوْهَا؟ قَالَ: «تَحْمَارُ» فرمایا کہ ”وہ سرخ رنگ کا ہو جائے اور پھر زرد و تَضْفَارُ“۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ وَاللَّفْظُ لِلْبَخَارِيِّ۔ رنگ کا“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿حسی تزهو﴾ کہا جاتا ہے زہا النحل یزہو یہ اس وقت بولتے ہیں جب پھل درخت پر نمودار ہونا شروع ہو جائیں اور ازہمی یزہمی اس وقت بولتے ہیں جب وہ سرخی اور زردی اختیار کر لیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں کے معنی سرخ اور زرد رنگ والے ہونا مراد ہے اور یہ اشارہ

(۷۱۶) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْعِنَبِ حَتَّى يَسْوَدَّ، وَعَنْ بَيْعِ الْحَبِّ حَتَّى يَشْتَدَّ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا السَّائِقِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی اس کے بھی راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے انگور کو سیاہ رنگ اختیار کرنے سے پہلے اور دانے کو سخت ہونے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے سنائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یسود﴾ دال پر تشدید۔ سیاہ ہو جائیں، یعنی پک جائیں اور امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ جب دانا سیاہ رنگ اختیار کر لیتا ہے تو آفت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ﴿یشدد﴾ دانے کا سخت ہونا، سے مراد ہے اس کا قوی و مضبوط اور سخت ہونا۔

حاصل کلام: احناف اس کے قائل ہیں اور شوافع کے نزدیک وہ غلہ بایوں میں فروخت کرنا جائز ہے جس کے دانے صاف نظر آتے ہوں جیسے چاول، جو، جوار، باجرہ اور جو غلہ نظر نہ آئے، اسے جائز نہیں سمجھتے، مثلاً گندم، مکئی، موگ، ماش وغیرہ۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ دونوں کو الگ کر کے فروخت کیا جائے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔

(۷۱۷) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَوْ بَعْتَ مِنْ أَحْيِكَ ثَمْرًا، فَأَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ، فَلَا يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا، بِمِ تَأْخُذُ مَالَ أَحْيِكَ بِغَيْرِ حَقٍّ؟» رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ.

لغوی تشریح: ﴿جائحہ﴾ وہ آفت جو پھلوں پر وارد ہوتی ہے اور ان کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ جیسے شدید بارش، ژالہ باری، ہڈی دل، آندھی، آگ اور قحط وغیرہ۔ آسمانی اور زمینی آفات اور جو مصیبت انسانوں کے ہاتھوں پہنچ جائے، مثلاً چوری، ڈکیتی وغیرہ، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ ﴿امر بوضوح الجوائح﴾ جوائح، جائحہ کی جمع ہے۔ یعنی نبی ﷺ نے فروخت کرنے والے کو حکم فرمایا ہے کہ وہ خریدار سے اتنی قیمت وصول نہ کرے جتنی آفت کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو چکی ہے۔ حدیث کے ظاہر

559 خرید و فروخت کے مسائل

سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آفات سے ہر حال میں نقصان کو وضع کیا جائے، خواہ وہ پھل پکنے سے پہلے برباد ہوئے ہوں، یا ان کے پکنے کے بعد۔ خواہ نقصان معمولی ہوا ہو، یا بہت زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ تیسرا حصہ یا اس سے کچھ زائد وضع کیا جائے گا اور تیسرے حصہ سے کم نقصان کی صورت میں وضع نہیں کیا جائے گا۔ ابوداؤد رحمہ اللہ نے یحییٰ بن سعید سے نقل کیا ہے کہ راس المال کے تیسرے حصہ کے نقصان کی صورت میں آفت زدہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ یحییٰ کا قول ہے کہ یہ طریقہ و سنت مسلمانوں میں جاری ہے۔

(۷۱۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ ابْتِاعَ نَخْلًا بَعْدَ أَنْ تُوْبِرَ، كَعَمَلٍ كَعَمَلٍ بَعْدَ خُرِيدٍ، تَوَّاسٍ صَوْرَتِ فِيهِ بَهِيمٌ فَتَمَرَتْهُا لِلْبَائِعِ الَّذِي بَاعَهَا، إِلَّا أَنْ فُرِخَتْ كَرْنِ وَالِ كَعَمَلٍ هُوَ كَعَمَلٍ الْآيَةِ كَعَمَلٍ بِشَرَطِ الْمُبْتَاعِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

خریدار پھل کی شرط کر لے۔“ (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿مَنْ ابْتِاعَ نَخْلًا﴾ یعنی کھجور کے درخت خریدے ﴿بَعْدَ أَنْ تُوْبِرَ﴾ تابیر سے مجبول کا صیغہ ہے۔ تابیر کہتے ہیں پیوند کاری اس طرح کہ نہ کھجور کا گودا لے کر مادہ کھجور کے خوشے میں رکھ دیتے ہیں۔ جب وہ خوشہ کھلتا اور پھٹتا ہے تو اللہ کے اذن سے وہ پھل زیادہ دیتا ہے۔ ﴿فَتَمَرَتْهُا لِلْبَائِعِ﴾ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کا درخت جب تک اس میں پیوند کاری نہیں کی گئی تو اس وقت تک اس کا پھل بیع میں شامل ہے اور وہ خریدار کا حق ہے۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ پیوند کاری سے پہلے اور بعد میں دونوں صورتوں میں فروخت کنندہ کا حق ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے یہ مطلقاً خریدار کا حق ہے مگر یہ دونوں احادیث کے مخالف ہیں۔

۵ - أَبْوَابُ السَّلَمِ وَالْقَرْضِ - پیشگی ادائیگی، قرض اور رہن کا بیان وَالرَّهْنِ

(۷۱۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِينَةَ، وَهُمْ يُسْلِفُونَ فِي الثَّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ، فَقَالَ: «مَنْ أَسْلَفَ فِي ثَمَرٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ، أَوْ تَوَلَّى مَقَرَّ مَقَرٍّ لِي مَقَرٍّ مَقَرٍّ إِلَى أَجَلٍ دَعَا» (بخاری و مسلم) اور بخاری میں ”مَنْ أَسْلَفَ“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے اور اہل مدینہ پھلوں میں ایک سال اور دو سال کی قیمت پیشگی ادا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ”جو شخص پھلوں کی پیشگی دے تو اسے چاہئے کہ ماپ، تول اور مدت مقرر کے لیے دے۔“ (بخاری و مسلم)

مَعْلُومٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْبَحَارِ: «مَنْ فِي ثَمَرٍ» كِي بجائے ”من اسلف فی شئی“ کے اَسْلَفَ فِي شَيْءٍ. الفاظ ہیں۔ ”جو شخص کسی چیز میں پیشگی دے۔“

لعنوی تشریح: ﴿ابواب السلم﴾.. سلم کے سین اور لام پر فتح ہے۔ بیع السلف کو ہی سلم کہتے ہیں، وزن اور معنی دونوں اعتبار سے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اہل عراق کی لغت میں سلم اور اہل حجاز کی لغت میں سلف کہتے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی، ج: ۲، ص: ۲۷۰) اور جزری نے النہایۃ میں کہا ہے کہ بیع سلم یہ ہے کہ سونے یا چاندی یا مروجہ سکہ کے بدلے میں پیشگی قیمت دیکر ایک معلوم و متعین مدت تک چیز لینے کا سودا طے کرنا۔ بالفاظ دیگر گویا تو نے صاحب مال کو قیمت سپرد کر دی اور بیع سلم کر لی۔ صاحب تحفۃ الاحوذی کہتے ہیں کہ جو قیمت جلدی ادا کر دی جائے وہ ”راس المال“ کہلاتی ہے۔ یعنی مقررہ وقت پر سپرد کرنا اور جو چیز موجد فروخت کی جائے اسے مسلم فیہ کہتے ہیں۔ اور قیمت ادا کرنے والے کو ”رب السلم“ اور جسے وہ چیز فروخت کی جائے اسے ”مسلم الیہ“ (جس کے سپرد کی گئی) کہتے ہیں اور قیاس اس عقد کے جواز سے انکاری ہے، کیونکہ یہ صورت بھی اس ضمن میں آجاتی ہے کہ جس کے پاس مال موجود نہ ہو اور وہ اسے فروخت کرے، مگر اسے صحیح احادیث وارد ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے سورۃ البقرۃ کی آیت المداینۃ (جس میں لین دین کا مسئلہ بیان ہوا ہے) بھی اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور ﴿دھن﴾ میں ”راء“ پر فتح اور ”هاء“ ساکن۔ قرض کے بدلہ میں کوئی مال دستاویز کی بنا پر دینا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کسی آدمی سے قرض حاصل کرتے ہیں اور اس قرض کے بدلہ میں کوئی چیز اس کے پاس رکھ دیتے ہیں، تاکہ اسے اعتماد و بھروسہ رہے کہ آپ اس کا قرض ادا کر دیں گے۔ پس جو نہی آپ اس کا قرض ادا کریں گے آپ کی رکھی ہوئی چیز آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ اس عمل کو ”دھن“ کہتے ہیں اور آپ ”راہن“ کہلائیں گے۔ اور جس کے پاس چیز رکھی گئی ہے اسے ”مرتھن“ کہیں گے اور رکھی چیز ”مرھون“ اور ”دھین“ کہلاتی ہے۔ ﴿وہم یسلفون﴾ یسلفون میں ”یا“ پر ضمہ ہے۔ اسلاف سے ماخوذ ہے۔ قیمت مال (فوری) ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض مال تاخیر سے حاصل کرتے ہیں۔ ﴿السنة والسنتين﴾ دونوں منصوب ہیں، حرف جر کے محذوف ہونے کی وجہ سے جو دراصل الی السنة والسنتين ہے۔ ﴿فی ثمر﴾ سبل السلام میں ہے، ثمر۔ ”ٹھا اور تا“ دونوں طرح ہے اور وہ ثناء سے زیادہ عام ہے۔ ﴿فی کیل معلوم.....﴾ اس میں اس بات کی دلیل ہے ماپ اور تول کروں کی جانے والی اشیاء کا ماپ اور وزن کر کے دینا واجب ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کے بارے میں بے خبری و جہالت خرید و فروخت کو فاسد اور خراب کرنے والی ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ میعاد کا بھی اعتبار ہے۔ جمہور کی رائے اسی جانب ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بیع سلم کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ جبکہ شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ بیع جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیع سلم کرتے وقت جس موجود نہ بھی ہو پھر بھی بیع درست ہے البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ اختتام مدت پر اس چیز کا دستیاب ہونا ممکن ہو، یا موجود ہو۔ ائمہ میں سے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہی ہے، البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک معاہدہ کے آغاز سے لے کر اختتام مدت معاہدہ تک وہ چیز دستیاب رہے، اس دوران کسی موقع پر اس کا فقدان نہ ہو اور ملنا دشوار و محال نہ ہو۔ پہلے ائمہ کی رائے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگر ایسی شرط ضروری ہوتی تو صحابہ کرامؓ ضرور ان سے پوچھ لیتے کہ یہ چیز اب سے لے کر وقت ادائیگی تک بازار میں دستیاب رہے گی۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمان بن ابزی رضی اللہ عنہ﴾ ابزی کے معنی پر فتح اور ”با“ ساکن اور ”زا“ پر فتح۔ قبیلہ خزاعہ سے تھے۔ صغار صحابہ میں شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ خزاعہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نبی ﷺ کو پایا

خرید و فروخت کے مسائل 562

اور آپؐ کی امامت میں نماز ادا کی۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں ان کو خراسان پر عامل مقرر فرمایا اور کوفہ میں وفات پائی۔

(۷۲۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ أَدَاءَهَا وَأَدَّى اللَّهُ عَنْهُ، وَمَنْ أَخَذَهَا يُرِيدُ اسْتِثْلَاقَهَا أَتْلَفَهَا اللَّهُ تَعَالَى». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص لوگوں کا مال (بطور قرض) لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اَدَّى اللہ عَنْہُ، وَمَنْ أَخَذَهَا يُرِيدُ اس کا (قرضہ) ادا فرمادے گا اور جو شخص ان (کے) اسْتِثْلَاقَهَا أَتْلَفَهَا اللَّهُ تَعَالَى. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ضائع کر دے گا۔“ (بخاری)

لعنوی تشریح: ﴿استلافہا﴾ اموال کو ضائع و ہلاک کرنا اور ان کو ادا نہ کرنا۔

(۷۲۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ فُلَانًا قَدِمَ لَهُ بَزٌّ مِّنَ الشَّامِ، فَلَوَّ بَعَثَتْ إِلَيْهِ، فَأَخَذَتْ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ بَنَسِيْقَةٍ إِلَى مَيْسَرَةٍ، فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِ، فَأَمْتَنَعَ. أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَرَجَّاهُ بَقَاتٌ.

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ”یا رسول اللہ ﷺ! فلاں صاحب کا شام سے کپڑا آیا ہے۔ آپؐ بھی کسی کو بھیج کر دو کپڑے کشادگی تک ادھار خرید لیں۔ آپؐ نے اس کی طرف ایک آدمی کو بھیجا مگر اس نے (ادھار دینے سے) انکار کر دیا۔ (اسے حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿بز﴾ ”باء“ پر فتح اور ”زاء“ پر تشدید۔ کپڑا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿میسرہ﴾ سین پر فتح اور ضمہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ فراخی، کشادگی، وسعت، تو نگری و مالداری۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے چیز کا ادھار خریدنا جائز ہے۔ اس کپڑے بیچنے والے نے حضور ﷺ کو دینے سے انکار غالباً ذاتی عداوت و عناد کی وجہ سے کیا تھا۔ شارحین نے لکھا ہے کہ وہ یہودی تھا، آپؐ کی ذات اقدس سے اسے دشمنی تھی، اس لئے اس نے انکار کیا تھا۔

(۷۲۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا، وَلَبِنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُونًا وَعَلَى الَّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”رہن رکھے ہوئے جانور پر (اس پر اٹھنے والے) مصارف و اخراجات کے بدلے سواری کی جاسکتی ہے۔ اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ (اس پر اٹھنے والے) مصارف کے بدلے پیا جاسکتا ہے، جبکہ وہ رہن ہو اور جو آدمی سواری کرتا ہے

اور دودھ پیتا ہے۔ اس کے اخراجات کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔“ (بخاری)

لعنوی تشریح: ﴿الظہر﴾ ظہر بمعنی پشت، کمر، پیٹھ۔ چوپایہ کی پشت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد مضبوط اور طاقتور اونٹ ہے ﴿یسرب﴾ صیغہ مجہول۔ خبر ہے امر کے معنی میں اور اسی طرح ﴿یشرب﴾ کا معاملہ ہے۔ یعنی صیغہ مجہول ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں ﴿لسن الدر﴾ در کے دال پر فتح اور ”را“ پر تشدید۔ مصدر ہے، دارۃ کے معنی میں۔ دودھ والی ﴿بنفقتہ﴾ اس پر اٹھنے والے اخراجات کے بدلہ میں۔ سوار ہونے اور پینے والے سے مراد ہے جس کے پاس رہن رکھی گئی ہے۔ کیونکہ رہن رکھنے والا تو بر بنائے ملکیت ان پر سوار ہو سکتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر ”بنفقتہ“ کہنے کا کیا مطلب۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب مرہونہ کی دیکھ بھال اور حفاظت کی ذمہ داری مرتھن پر ہے تو اس کے لیے اس سے انتفاع بھی جائز ہے خواہ اس چیز یا جانور کا مالک اس کی اجازت نہ دے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحق رحمہ اللہ وغیرہا کی یہی رائے ہے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں جس کے پاس چیز رہن رکھی گئی ہے وہ اس پر اٹھنے والے اخراجات کے بقدر اس کے دودھ اور سواری سے فائدہ لے سکتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور نہ اخراجات سے زیادہ فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ مرہونہ چیز سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں، بلکہ سارے فوائد رہن رکھنے والا اٹھا سکتا ہے۔ اس پر جو مشقت و محنت اور مصارف ہوں گے، وہ بھی اس کے ذمہ ہوں گے، مگر یہ حدیث جمہور کے خلاف ججت ہے۔

(۷۲۴) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَغْلُقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهْنَهُ، لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ». رَوَاهُ الدَّارِ قُطْنِي وَرِجَالُهُ نَفَاقًا، إِلَّا أَنْ السَّخْفُوظُ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ إِزْسَالُهُ. (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ کے نزدیک اس کا مرسل ہونا محفوظ ہے)

لعنوی تشریح: ﴿لا یغلق﴾ باب سمع یسمع سے ہے۔ صیغہ معروف ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ مرہونہ چیز روکنے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ راہن (رہن رکھنے والا) کی ملکیت سے نکل جائے اور مرتھن (جس کے پاس رہن رکھی گئی ہو) کا اس پر قبضہ ہو جائے، اس وجہ سے کہ جو چیز اس نے قرض لی ہے وہ ادا نہ کر سکے اور وقت مقرر پر اسے چھڑانہ سکے۔ یہ اہل عرب کی عادت تھی۔ نبی ﷺ نے اس سے

(۷۲۵) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَسْلَفَ مِنْ رَجُلٍ بَكْرًا، فَقَدِمَتْ عَلَيْهِ إِبِلٌ مِنْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ، فَأَمَرَ أَبَا رَافِعٍ أَنْ يَفْضِيَ الرَّجُلَ بَكْرَهُ، فَقَالَ: «لَا أَجِدُ إِلَّا خَبَارًا رَبَاعِيًّا»، قَالَ: «أَعْطِهِ إِيَّاهُ، فَإِنَّ خَبَارَ النَّاسِ أَحْسَنُهُمْ قَضَاءً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نغوی تشریح: ﴿استسلف﴾ قرض لیا اور ادھار لیا۔ ﴿بکرا﴾ ”باء“ پر فتح اور کاف ساکن۔ نو جوان اونٹ۔ ﴿بمضی﴾ اس آدمی کو اس کا اونٹ ادا کر دے۔ ﴿خیارا﴾ ”حاء“ کے نیچے کسرہ۔ عمدہ، اچھی، خیار چیز، جو بہتر اور افضل۔ ﴿رباعیا﴾ ”راء“ پر فتح اور ”یا“ مخفف۔ سامنے کے ثنیہ اور کچلیوں کے درمیان دانتوں والا اونٹ۔ یعنی وہ اونٹ جو ساتویں سال میں قدم رکھ چکا ہو اور اس کے رباعی دانت گر چکے ہوں۔ یہ بہترین اور عمدہ اونٹ شمار ہوتا تھا اور جوان سے اچھا اور عمدہ سمجھا جاتا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مقروض انسان اگر خود بخود اپنی آزاد رضامندی سے ادائیگی، قرض کے وقت واجب الادا قرض سے مقدار میں زیادہ یا بہتر اور عمدہ ادا کرے تو یہ جائز ہے۔ اگر قرض خواہ قرض دیتے وقت یہ شرط طے کرے کہ ادائیگی کے موقع پر میں تجھ سے اتنا مزید لوں گا، یا یہ کہ قرض میں زیادہ عمدہ اور بہتر چیز لوں گا تو یہ سود شمار کیا جاتا ہے اور سود ہر صورت میں حرام ہے۔

(۷۲۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُّ قَرْضٍ جَرَمٌ مَنفَعَةٌ فَهُوَ رِبَاٌ». (اسے حارث بن ابی اسامہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ساقط الاعتبار (ضعیف ہے) اور اس کا زور شاذ بہیقی کے ہاں فضالہ بن عبید اللہ کی حدیث ہے اور بخاری

عُبَيْدُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ مِثْلِهِ فِي حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ الْمُبْهَغِيِّ، وَآخَرُ مَوْقُوفٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ (مروی ہے) بِنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ الْبُخَارِيِّ.

لغوی تشریح: ﴿اسنادہ ساقط﴾ ساقط ضعیف کے معنی میں مستعمل ہے ایسی ضعیف کہ قابل احتجاج نہیں، اس لئے کہ اس کی سند میں سوار بن معب ممدانی تھے جو ناپینا موذن تھے اور وہ متروک راوی شمار کئے گئے ہیں۔

۶ - بَابُ التَّفْلِيسِ وَالْحَجْرِ مَفْلَسٌ قَرَارٌ دِينَهِ أَوْ تَصَرُّفٌ رُكْنٌ كَا

بیان

(۷۲۷) عَنْ أَبِي بَكْرٍ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ أَذْرَكَ مَالَهُ بِعَيْنِهِ عِنْدَ رَجُلٍ قَدْ أَفْلَسَ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ابوداؤد اور مالک نے ابوبکر بن عبدالرحمن سے ان الفاظ کے ساتھ مرسل روایت بیان کی ہے کہ ”کوئی آدمی اگر کوئی چیز بیچے اور خریدنے والا مفلس ہو جائے اور بیچنے والے کو اس کی قیمت میں سے ابھی کچھ بھی نہیں ملا تو (اس صورت میں) اگر وہ بعینہ اپنا مال پالیتا ہے تو وہ اس مال کا زیادہ حقدار ہے اور اگر خریدار مر جائے تو پھر صاحب المتاع (مستتر) اسوۃ الغرماء۔ ووصلہ البیہقی۔ خواہوں کے برابر ہے۔

(یعنی نے اسے موصول بیان کیا ہے اور ابوداؤد کی اتباع میں اسے ضعیف کہا ہے)

وَرَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهَ مِنْ رِوَايَةِ عُمَرَ بْنِ خَلْدَةَ، قَالَ: أَتَيْنَا أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي صَاحِبٍ لَنَا قَدْ أَفْلَسَ، فَقَالَ: نَعَمْ، لَأَقْضِيَنَّ فَبَقَضَاءِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: مَنْ أَفْلَسَ أَوْ مَاتَ، فَوَجَدَ رَجُلٌ مَتَاعَهُ بَعِيْنَهُ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ. وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَضَعَّفَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَ أَيْضًا هَذِهِ الزِّيَادَةُ فِي زَكْرِ الْمَوْتِ. (میں ہے، ضعیف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب التفليس والحجر﴾ ”تفليس“ کہتے ہیں کہ قاضی کا کسی کو مفلس قرار دینے کی منادی کرنا، شحیر کرنا۔ اور ”مفلس“ کہتے ہیں جس کے پاس پیسے نہ ہوں۔ ”والحجر“ ”حاء“ پر تینوں حرکات جائز ہیں۔ معنی ہے روکنا۔ وہ اس طرح کہ حاکم مقروض کو اس کے اپنے مال میں تصرف سے منع کر دے۔ ﴿بعینہ﴾ ہو ہو۔ اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہوا ہو۔ تصرفات شرعیہ کی رو سے وہ چیز نہ تو معنوی طور پر ہلاک ہوئی ہو اور نہ حسی طور پر۔ ﴿افلس﴾ کنگال ہو گیا۔ ایسا شخص جس کے پاس بشمول راس المال کچھ بھی باقی نہ بچے، جیسے کہتے ہیں افلس فلان۔ فلان مفلس ہو گیا، یعنی اس کا مال باقی نہیں رہا، فلائج ہو گیا یا ایسی حالت میں پہنچ گیا کہ اب اس کے پاس کوئی بیسہ نہیں۔ ﴿فہو احق بہ﴾ وہ شخص جس کا در حقیقت مال ہے، وہی اس مال کا زیادہ حقدار ہے۔ ﴿من غیرہ﴾ دوسرے سے، خواہ کوئی ہو۔ اس کا وارث ہو یا قرضدار و قرض خواہ ہو۔ جسور علماء کی یہی رائے ہے، البتہ حنفیہ نے اس رائے کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جو چیز مفلس کے ہاتھ میں باقی ہے اس کا دوسرے کی بہ نسبت یہ زیادہ استحقاق نہیں رکھتا، یہ بھی دوسرے قرض خواہوں کی طرح ہے۔ یہ حضرات اس پر ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے جو فائدہ مند ہو، بجز قیاس معکوس کے، جو نص صریح کے مقابلہ میں ہے۔ صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ ”بعینہ“ کے قول کا یہ فائدہ ہے کہ جب قرض دینے والا یا فروخت کرنے والا جب اپنی چیز اسی حالت میں نہ پائے جس حالت میں اس نے دی تھی اور اس میں کوئی صفت تبدیل ہو چکی ہو، یا اس میں کی بیشی واقع ہو گئی ہو تو پھر اس صورت میں یہ صاحب ہی اس کا استحقاق نہیں رکھتے، بلکہ پھر سارے قرض خواہ میں مساوی ہوں گے۔ یعنی فروخت کر کے حصہ بقدر حصہ کے حساب سے تقسیم کی جائے گی۔ ﴿ولم یقبض الذی باعہ من ثمنہ شیئاً.....﴾ اس میں اس بات کی دلیل ہے جس کی طرف جسور گئے ہیں کہ جب خریدار فروخت کنندہ کو کچھ رقم ادا کر دے تو پھر صرف یہی فروخت کرنے والا اس رقم کا حق دار

نہیں ہوگا جو خریدار نے ادا کر دی ہے، بلکہ اس میں سارے قرض خواہ برابر کے شریک ہوں گے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی فروخت کنندہ ہی زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ یہ قول ان کا نیل الاوطار میں مذکور ہے۔ ﴿وان مات المشتري فصاحب المتاع اسوه الغرما﴾ اگر خریدار فوت ہو جائے تو سامان کا مالک قرض خواہوں کے مساوی ہے۔ ”غرما“ غین پر ضمہ اور ”راء“ پر فتح، غریم کی جمع ہے۔ قرض خواہ، یعنی وہ شخص جس کا دوسرے پر قرض ہو ﴿واسوة﴾ ممرہ پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح۔ یعنی وہ شخص اب سب کیلئے یکساں مساوی ہے، یعنی ان سے جس طرح ایک آدمی لے گا تو دوسرے بھی اسی طرح وصول کریں گے اور جس طرح ایک محروم رہے گا، اسی طرح دوسرے بھی محروم رہیں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ افلاس اور موت میں فرق ہے۔ یہ رائے امام احمد رحمہ اللہ و امام مالک رحمہ اللہ کی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ موت اور افلاس دونوں میں کوئی فرق نہیں اور مال کا اصل مالک ہی دونوں صورتوں میں زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے سے استدلال کیا جسے عمر بن خالد نے روایت کیا ہے، مگر وہ ضعیف ہے۔ جیسا کہ مصنف نے ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ ﴿ووصله البيهقي وضعفه تبعا لابی داود﴾ اور بیہقی نے اسے موصول بیان کیا ہے اور ابوداؤد کی اتباع میں اسے ضعیف کہا ہے۔ اس عبارت سے بسا اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابوداؤد نے اسے موصول روایت نہیں کیا اور صرف بیہقی نے ہی موصول روایت کیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ ابوداؤد نے مرسل اور موصول دونوں طرح بیان کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ مالک کی روایت صحیح ترین ہے۔ حالانکہ مالک کی روایت مرسل ہے۔ پس اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ اس کا موصول ہونا ضعیف ہے۔ رہی روایت عمر بن خالد کی جسے مصنف نے ابوداؤد کے حوالہ سے ضعیف نقل کیا ہے۔ تو صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ میں نے سنن ابی داؤد کی مراجعت کی مگر مجھے عمر بن خالد کی روایت کی تضعیف نہیں ملی۔ مگر صاحب عون المعبود نے کہا ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ ابوداؤد نے کہا کون ہے جو اسے پکڑتا ہے، حاصل کرتا ہے؟ ابو المعتمر کون ہے؟ یہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے نہیں جانتے۔ یہ عبارت اکثر نسخوں میں پائی گئی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب سبل السلام کو وہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا جس میں یہ عبارت ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے مصنف رحمہ اللہ پر ابوداؤد کی اس روایت کو ضعیف قرار دینے کے خلاف انکار کیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی قسم کا مال خریدے اور اس کی رقم اس پر قرض ہو۔ اس کے بعد وہ مفلس و قلاچ ہو جائے اور ادائیگی قرض کیلئے اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ اس صورت میں اس مال کے فروخت کرنے والے کو حق پچھتاہے کہ اگر اس کی فروخت کردہ چیز بعینہ موجود ہے تو وہ اسے بلا تردد حاصل کر لے۔ معاہدہ بیع کو فسخ کر دے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے، لیکن احناف کے نزدیک وہ تنہا اس مال کو نہیں لے سکتا، بلکہ وہ بھی عام قرض خواہوں کی طرح کا ایک قرض خواہ ہے۔ جس تناسب سے دوسرے قرض خواہوں کو قرضہ کی واپسی ہوگی اسے بھی اسی

تاسب سے قرض واپس ہوگا۔ لیکن یہ حدیث کے خلاف ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابوبکر بن عبد الرحمن کی مرسل حدیث جسے انہوں نے موصول بیان کیا ہے اس میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ہے، جسے ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر اسماعیل شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ درست ہے اور اس حدیث میں اس نے حارث زبیدی شامی سے روایت کیا ہے۔ تاہم امام ابوداؤد نے مرسل کو ہی اصح اور عمر بن خلدہ کی روایت میں ابوالعتر کو امام ابوداؤد، طحاوی اور ابن منذر نے مجہول کہا ہے اور امام ابن ابی حاتم نے اس سے صرف ابن ابی ذب ہی روایت کرنے والا ذکر کیا ہے۔ اسی لئے امام ابوداؤد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (التلخیص)

راوی حدیث: ﴿ابوبکر بن عبدالرحمان﴾ ابوبکر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی مدنی۔ مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ ان کے نام کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام محمد تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام مغیرہ تھا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام ابوبکر اور کنیت ابو عبد الرحمن ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ بڑے فقیہ، عبادت گزار اور ثقہ آدمی تھے۔ تیسرے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ولید بن عبد الملک کے دور خلافت میں وفات پائی۔ حضرت ابوہریرہ رحمہ اللہ سے ان کا سماع ثابت ہے۔ شعبی اور زہری وغیرہ نے ان سے روایت کیا ہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ یا ۷۵ھ۔

﴿عمر بن خلدة﴾ ابو حفص ان کی کنیت تھی۔ مدینہ منورہ کے انصار میں سے تھے۔ قاضی کے عہدہ و منصب پر فائز رہے۔ نہایت پرہیزگار، پاک دامن و عقیف، بڑے بہادر۔ حریف کے مقابل شمشیر براں، بڑے بارعب انسان تھے۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے اور ان سے ربیعہ الرائی نے اور خلدہ کے ”خا“ پر فتح۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان کے دادا ہیں اور ان کے والد کا نام عبد الرحمن ہے۔

(۷۲۸) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ،
عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:
«لِيَ الْوَاحِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ».
رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ،
وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.
روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مالدار آدمی کا اداہنگی قرض میں ٹال منول کرنا، اس کی بے عزتی اور سزا دینے کو حلال کرنا ہے۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے تعلق کے طور پر نقل کیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لی الواجد﴾ لی کے ”لام“ پر فتح اور ”یا“ پر تشدید۔ ٹال منول، لیت و لعل، بغیر کسی عذر و رکاوٹ کے واجب الادا قرض کی رقم کو ادا کرنے سے گریز کرنا۔ ”الواجد“ مالدار آدمی، صاحب

ثروت انسان۔ ﴿یحل عرضہ﴾ یحل میں ”یا“ پر ضم۔ مضارع کا صیغہ ہے۔ یعنی قرض دینے والے کیلئے ایسی صورت میں سخت کلامی اور درشتی سے پیش آنا جائز ہے اور اس کی بے عزتی اور رسوائی کرنا درست ہے۔ ﴿عقوبتہ﴾ سزا، پابں صورت کہ اسے قید کر دیا جائے۔ محبوس کر دیا جائے، یا پابں صورت کہ قاضی اس کا مال و متاع فروخت کر کے اس پر واجب الادا قرض ادا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مال دار اور صاحب ثروت آدمی محض اپنی خساست طبع کی وجہ سے ادائیگی، قرض میں حیلے بہانے، ٹال مٹول اور لیت و لعل کرے، جبکہ وہ آسانی سے قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو تو ایسے آدمی کو قرض خواہ زبانی کلامی بے عزت بھی کر سکتا ہے اور بذریعہ عدالت اسے سزا دلوانے کا بھی مجاز ہے۔ جمہور علماء نے تو صرف دس درہم تک کی مالیت یا مقدار کی مساوی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے شخص کو فاسق اور مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿عمرو﴾ ان کی کنیت ابوالولید عمرو بن شریذ (شین پر فتح ”راء“ پر کسرہ) بن سوید۔ طائف کے قبیلہ ثقیف سے تھے، اسی لئے ثقیفی طائفی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں۔ تیسرے طبقہ سے ہیں۔ ﴿شرید رضی اللہ عنہ﴾ شرید بن سوید ثقیفی۔ ان کا نام مالک تھا۔ نبی ﷺ نے ان کا نام شرید رکھا۔ اس وجہ سے یہ نام رکھا کہ وہ اپنی قوم کا ایک فرد قتل کر کے مکہ میں آگئے تھے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ (تلفیح لابن الجوزی) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق حضرموت سے تھا اور اس کا شمار قبیلہ ثقیف میں تھا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہیں اہل طائف میں شمار کیا جاتا تھا۔

(۷۲۹) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أُصِيبَ رَجُلٌ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي ثَمَارِ ابْتِاعَهَا، فَكَثَرَ دَيْنُهُ، فَأُفْلَسَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ»، فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَبْلُغْ ذَلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ، اس کے قرض خواہوں سے فرمایا (یہی کچھ ہے) جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ اس کے علاوہ تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لیس لکم الا ذاک﴾ اس عبارت سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ صدقہ کا حکم جو قرض کی ادائیگی کیلئے آپؐ نے فرمایا تھا، وہ علی وجہ الاستحباب تھا، جب پھل کسی آفت کی زد میں آکر برباد ہو جائے تو ایسی صورت میں فروخت کنندہ کے مال سے وضع کیا جائے گا، خریدار کے مال سے نہیں۔ جیسا کہ

خرید و فروخت کے مسائل 570

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو وضع الجائحہ کے تحت پہلے گزر چکی ہے، میں بیان ہو چکا ہے۔ البتہ قرض، قرضدار کے حالات کے ناموافق و نامساعد ہونے کی وجہ سے بھی ساقط نہیں ہوگا۔ فی الحال اس سے ادائیگی کا تقاضا و مطالبہ مؤخر کر دیا جائے گا۔

(۷۳۰) وَعَنْ ابْنِ كَعْبٍ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَجَرَ عَلَى مُعَاذٍ مَالَهُ، وَبَاعَهُ فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارِقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَارْتَجَحَهُ أَبُو دَاوُدَ مُرْسَلًا، وَرَجَّحَ إِزْنَاءَهُ. روايت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کے مال میں تصرف سے روک دیا تھا اور اس کا مال اس قرض کی رقم کے عوض میں فروخت کر دیا جو اس کے ذمہ تھی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور اس کے مرسل ہونے کو قابل ترجیح ٹھہرایا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حجر علی معاذ مالہ﴾ اسے اپنے مال میں تصرف سے روک دیا۔ یہ ۹۰ کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کو یمن کی طرف بھیج دیا تھا کہ اپنے مال کا نقصان پورا کر لے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی پر قرض کا بار گراں آن پڑے اسے سربراہ ریاست یا اس کا نمائندہ اس کے اپنے مال میں تصرف سے روک سکتا ہے، تاکہ قرض داروں کا قرض ادا کیا جاسکے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر اس کے مال سے زیادہ قرض ہو اس کا یہی حکم ہے کہ اسے مالی تصرف کے حقوق سے عارضی طور پر معطل کر دیا جائے اور سرکاری اہلکار اس کا مال خود فروخت کر کے قرض خواہوں کو ادائیگی کر دے۔ ایسا نہ کرے گا تو اثر و رسوخ والا آدمی اس کا مال غصب کر لے گا۔ خود اسے (یعنی مالک مال) اور دوسرے قرض خواہوں کو محروم کر دے گا۔ جو باہمی دشمنی اور رقابت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

راوی حدیث: ﴿ابن کعب﴾ ابو الخطاب ان کی کنیت ہے۔ عبدالرحمن بن کعب بن مالک انصاری ان کا نام ہے۔ مدینہ کے باشندے تھے۔ کبار تابعین میں سے تھے اور ثقہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد نبویؐ میں پیدا ہوئے اور سلیمان بن عبد الملک کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

﴿کعب بن مالک رضی اللہ عنہ﴾ کعب بن مالک بن ابی کعب انصار کے قبیلہ سلیم سے تھے۔ مدینہ کے باشندے، اور شاعر تھے۔ ان شعراء میں سے ایک تھے جنہیں شعراء نبوی کے معزز و مکرم خطاب سے نوازا گیا ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے۔ بدر و تبوک کے ماسوا باقی تمام غزوات میں شریک رہے۔ یہ بزرگ ان تین معزز بزرگ ہستیوں میں سے ایک تھے جو غزوہ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی توبہ دربار الہی میں قبولیت کے شرف سے مشرف ہوئی تھی۔ ایک قول کے مطابق ۵۰ھ میں اور ایک قول کے

مطابق ۵ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت یہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔

(۷۳۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: عُرِضْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ، وَأَنَا ابْنُ أَرْبَعِ عَشْرَةَ سَنَةً، فَلَمْ يَجْزِنِي، وَعُرِضْتُ عَلَيْهِ يَوْمَ الْخَنْدَقِ، وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ عَشْرَةَ سَنَةً، فَأَجَازَنِي. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبَيْهَقِيِّ: فَلَمْ يَجْزِنِي وَلَمْ يَرِنِي بَلْعَتْ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ. اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے مجھے اجازت نہ دی اور مجھے بلع نہیں سمجھا۔ (ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿عرضت﴾ صیغہ مجہول۔ لڑائی کی جانب جانے کیلئے پیش کیا گیا۔ ﴿لم یجزنی﴾ اجازت سے ماخوذ ہے، یعنی مجھے لڑائی اور خرید و فروخت کرنے کے قابل نہیں سمجھا اور مجھے جنگجو اور مقاتلین کیلئے جو واجب حکم ہے میں شامل نہیں فرمایا اور نہ اپنے ساتھ نکلنے کیلئے جو حکم صادر فرمایا تھا اس میں شمار کیا اور ایک قول کے مطابق اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آپؐ نے میرے لیے انعام نہیں لکھا۔ جائزہ کا معنی مجاہدین و غازیوں کا رزق و انعام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے تصرفات کی عمر پندرہ سال میں شروع ہو جاتی ہے، جسے قابل قبول اور قابل تسلیم سمجھا گیا ہے۔ مصنف بھی اس حدیث کو اس باب میں اسی لئے لائے ہیں کہ خرید و فروخت کس عمر کی قابل اعتبار ہے۔ گویا پندرہ سال سے پہلے بچہ اور پندرہ سال کا جوان، مردوں کے حکم میں آجاتا ہے۔ اس حدیث سے نوجوانوں کا شوق جہاد ملاحظہ ہو۔ آگے بڑھ کر خود اپنے آپ کو خدمت جہاد کیلئے پیش کرتا ہے۔ پہلی بار ناکامی کے بعد اگلے سال پھر قسمت آزمائی کرتا ہے اور اپنے عزم و ارادے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا فوج میں بھرتی کیلئے اس سے کم عمر والوں کو نہیں لینا چاہئے۔ اس سے یہ اصول بھی نکلا کہ فوج کی بھرتی کیلئے پہلے جسمانی ٹسٹ لینا چاہئے، اگر فٹ نہ ہو تو واپس بھیج دیا جائے۔

(۷۳۲) وَعَنْ عَطِيَّةَ الْفَرُطِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: عُرِضْنَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ قُرَيْظَةَ، فَكَانَ مَنْ أَنْبَتْ فُتَيْلًا، وَمَنْ لَمْ يُنْبِتْ خَلَى

حضرت عطیہ قرطیؓ سے روایت ہے کہ بنو قریظہ سے جنگ کے موقع پر ہمیں نبی ﷺ کے روبرو پیش کیا گیا، جس کے زیر ناف بال آگے ہوتے تھے، اسے قتل کر دیا گیا اور جس کے نہیں آگے تھے اسے چھوڑ

خرید و فروخت کے مسائل 572

سَيِّئُهُ، فَكُنْتُ مِمَّنْ لَمْ يَنْبِتْ، فَخَلَّى دیا گیا۔ میں بھی ان میں سے تھا جس کے بال نہیں سَبِّلْنِي۔ رَوَاهُ الْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ اگے تھے، لہذا مجھے بھی چھوڑ دیا گیا۔ (اسے چاروں نے وَالْحَاكِمُ روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یوم قریظہ﴾ ۵۵ ذی قعدہ میں غزوہ احزاب کے فوراً بعد یہ غزوہ واقع ہوا۔ اس غزوہ کے برپا ہونے کا سبب غزوہ خندق کے ایام میں بنو قریظہ کی عہد شکنی اور غدراری تھی اور مسلمانوں سے طے شدہ معاہدہ کو پس پشت پھینک کر عہد شکنی کا ارتکاب تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ طے شدہ معاہدہ کو توڑ دیا۔ مسلمانوں کے خلاف مشرکین سے خفیہ اجلاسوں میں مشورے کئے۔ اس غزوہ کی انتہا بنو قریظہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم تسلیم کرنے پر ہوئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اس خیال کے پیش نظر تسلیم کیا تھا کہ وہ ان سے رحم و کرم کا معاملہ کریں گے، کیونکہ بنو قریظہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قبیلہ اوس کے درمیان زمانہ قدیم سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فیصلہ تسلیم کر لیا تو انہوں نے ان کے قاتل جنگ مردوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو اور ان کے بچوں کو لونڈیاں اور غلام بنانے کا فیصلہ کیا تو ان کی یہ سزا مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور مشوروں اور غدراری کے عین مطابق تھی۔ لہذا جو بالغ تھا اسے قتل کر دیا گیا اور جو نابالغ بچہ تھا، اسے چھوڑ دیا گیا اور جس کے بارے میں بالغ اور نابالغ ہونے میں شک ہوتا، اسے برہنہ کر کے ملاحظہ کیا جاتا، جس کے زیرِ ناف بال اگے ہوتے، بغلوں میں بال اگے ہوتے اور شرم گاہ کے ارد گرد بال اگے ہوتے اسے قتل کر دیا جاتا ﴿خلی سبیلہ﴾ اس کا راستہ کھلا چھوڑ دیا جاتا، یعنی اسے قتل نہ کیا جاتا، بلکہ چھوڑ دیا جاتا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ بالوں کا اگنا بلوغت کی نشانی ہے اور جس کے یہ بال نکل آئیں ان پر احکام شرعیہ نافذ ہوں گے اور اس پر تقریباً اجماع ہے۔ امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ امام احمد رضی اللہ عنہ اور اسحاق رضی اللہ عنہ نے بالغ ہونے کی تین نشانیاں بتائی ہیں۔ عمر پندرہ سال یا احتلام۔ اگر عمر کا تعین نہ ہو سکے اور احتلام کا بھی پتہ نہ چل سکے تو پھر زیرِ ناف بالوں کی موجودگی بلوغت کی علامت ہے۔

راوی حدیث: ﴿عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ﴾ قرظی کے ”قاف“ پر ضمہ ”را“ پر فتح۔ بنو قریظہ کی طرف نسبت کی وجہ سے قرظی کہلائے۔ صغیر صحابی ہیں۔ ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ میں ان کے والد کے نام سے واقف نہ ہو سکا۔ ان سے مجاہد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

(۷۳۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ داؤا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ﷺ قَالَ: «لَا يَجُوزُ لِمَرْأَةٍ عَطِيَّةٌ إِلَّا فرمایا ”کسی عورت کا اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر

بِإِذْنِ زَوْجِهَا»۔ عطیہ دینا جائز نہیں اور ایک روایت میں ہے کہ
وفي لفظ: لَا يَجُوزُ لِلْمَرْأَةِ أَمْرٌ "کسی عورت کو اپنے ذاتی مال میں کوئی معاملہ کرنے
في مالِهَا، إِذَا مَلَكَ زَوْجُهَا" کا اختیار نہیں جب اس کا شوہر اس کی عصمت کا
عِصْمَتَهَا۔ زَوَّاهُ أَحْمَدُ وَأَصْحَابُ السُّنَنِ، إِلَّا مَالُكَ هُوَ۔" (اسے احمد اور اصحاب سنن نے (ترمذی کے
الترمذی، وَصَحَّحَهُ الْحَاجُّمُ۔
علاوہ) روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿لَا يَجُوزُ لِمَرْأَةٍ عَطِيَّةٌ﴾ کہ عورت کو عطیہ دینا جائز نہیں۔ امام خطابی نے فرمایا ہے
کہ یہ حکم اکثر علماء نے حسن معاشرت پر اور باہم ایک دوسرے کے دل کو پاک صاف رکھنے پر محمول کیا
ہے کہ اس طرح رہن سہن میں اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یا اس سے غیر سنجیدہ، بے سلیقہ، رشد و ہدایت
سے عاری خاتون مراد ہے، جسے اپنے نفع و نقصان کا چنداں شعور نہ ہو۔ ورنہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے
کہ آپؐ نے عید کے جمع میں عورتوں کو "تصدقن" فرما کر صدقہ کی ترغیب دلائی، جس کے نتیجہ میں
عورتوں نے اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جانب پھینک دیں اور انہوں نے اپنی چادر میں
جمع کر لیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عطیات جو اس موقع پر عورتوں نے دیئے وہ شوہروں کی اجازت کے بغیر ہی
دیئے۔ (مختصاً) ﴿لَا يَجُوزُ لِمَرْأَةٍ امْرُؤِي مَالِهَا﴾ یعنی اس کے قبضہ میں خاوند کا جو مال ہے اس میں سے
خرچ کرنے کا اسے اختیار حاصل نہیں اور عورت کی طرف مال کی نسبت مجازاً ہے، کیونکہ اس کے تصرف
میں دیا گیا ہے۔ اس صورت میں نہی تحریمی ہے۔ بعض علماء کرام نے کہا ہے کہ اس سے اس کا اپنا ذاتی
مال مراد ہے اس صورت میں یہ ممانعت ان کی ناقصات العقل ہونے کی بنا پر ہے۔ لہذا اس کیلئے مناسب
نہیں کہ اپنے خاوند سے مشورہ کئے بغیر اسے خرچ کرے۔ یہ حکم ادباً اور استحباباً ہے اور یہ ممانعت بھی
تذریبی پر محمول ہے۔ (عون المعبود، ج: ۳، ص: ۳۱۷)

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے ذاتی اثاثہ میں اپنے شوہر کی
اجازت و رضامندی کے بغیر کسی قسم کا تصرف کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ مشہور تابعی حضرت طاؤس رضی اللہ
اسی حدیث کی روشنی میں یہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ کوئی عورت اپنے ذاتی مال میں بھی شوہر کی اجازت کے
بغیر تصرف نہ کرے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عورت صرف ۱/۳ حصہ میں شوہر کی اجازت کے بغیر
تصرف کر سکتی ہے، مگر باقی ائمہ ثلاثہ اور جمہور علماء عورت کے اس کے ذاتی مال میں تصرف کو جائز سمجھتے
ہیں اور عورت کا ذاتی مال وہ ہے جو اسے مہر کی صورت میں شوہر کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی طرح والدین
کی طرف سے ملنے والا مال اور اس کی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے دیئے ہوئے تحائف و عطیات وغیرہ۔
نیز اس کا تجارتی منافع بھی اس کا ذاتی مال ہے اس پر شوہر یا کسی اور کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے وہ اسے اپنی
مرضی سے صرف کر سکتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں اتفاق فی سبیل اللہ کا عمومی حکم اس کا مقتضی
ہے۔ تاہم عورت اگر خاوند سے مشورہ کرے، یا اس سے اجازت حاصل کرے تو یہ ان کے مابین حسن

سلوک اور باہمی اعتماد میں اضافے کا باعث ہو گا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

(۷۳۴) وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الْهَلَالِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَجُلُّ إِلَّا لِأَحَدٍ ثَلَاثَةٍ: رَجُلٌ تَحْمَلُ حِمْلَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ، حَتَّى يُصِيبَ قَوَامًا، ثُمَّ يُمْسِكَ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَنَحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ، حَتَّى يُصِيبَ قَوَامًا مِنْ عَيْشِهِ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُولَ ثَلَاثَةً مِنْ ذَوِي الْحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بے شک تین آدمیوں میں سے کسی ایک کے سوا کسی دوسرے کیلئے سوال کرنا حلال نہیں۔ ایک وہ آدمی جس نے ضمانت کا بوجھ اٹھایا ہو۔ اس کیلئے تاوان و ضمانت کی مقدار تک سوال کرنا جائز ہے اس کے بعد سوال کرنا چھوڑ دے اور ایک وہ آدمی جسے کوئی آفت پہنچی ہو اور اس نے اس کا مال تباہ و برباد کر دیا ہو اس کیلئے سوال کرنا حلال ہے تاوقتیکہ اس کیلئے گزران کی کوئی فاقہ، حَتَّى يَقُولَ ثَلَاثَةً مِنْ ذَوِي الْحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ۔“ رواہ مسلم۔

قابل اعتماد آدمی دیں۔ اس کیلئے سوال کرنا حلال ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں صرف تین قسم کے آدمیوں کے لئے دست سوال دراز کرنے کی اجازت ہے اور وہ بھی محدود وقت کے لئے۔ انہی میں سے ایک ضامن ہے، وہ اگر مفلس نہ بھی ہو تب بھی اسے سوال کر کے ضمانت دی ہوئی رقم کو ادا کرنا جائز ہے اور جو شخص فاقہ میں مبتلا ہے اس کیلئے تین افراد کی گواہی کا حکم استحباب اور احتیاط کے پہلو سے ہے۔ اس کی حیثیت شرط کی نہیں کہ اس کے بغیر وہ سوال ہی نہیں کر سکتا جیسا کہ عمومی اولہ کی بنا پر علماء نے کہا ہے۔

صلح کا بیان

۷ - بَابُ الصُّلْحِ

(۷۳۵) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزْنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ، إِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا، أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا، وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ. إِلَّا

حضرت عمرو بن عوف مزی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے مگر ایسی صلح جائز اور درست نہیں جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے۔ مسلمان اپنی شرائط پر قائم ہیں (ان کی تمام شرائط ٹھیک ہیں) مگر بجز اس شرط کے جن سے کوئی حلال چیز حرام ہو جائے یا حرام

575 خرید و فروخت کے مسائل

شَرْطاً حَرَمَ حَلَالًا، أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَأَنْكَرُوا صحیح کہا ہے اور دوسرے محدثین نے ان پر انکار کیا ہے عَلَیْهِ، لِأَنَّ زَاوِيَةَ كَلِمَتَيْ بَيْنَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ غُفَرٍ ضَعِيفٌ، وَكَأَنَّهُ أَغْتَبَرَهُ بِخُفْرَةِ طَرَفِهِ، وَقَدْ صَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ۔ کیونکہ اس کا ایک راوی کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن غوف ضعیف ہے۔ ایسا محسوس و معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی نے کثرت طرق کی وجہ سے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث

(۷)

لعنوی تشریح: ﴿باب الصلح﴾ صلح کی بہت سی اقسام ہیں۔ مثلاً دولٹنے والوں کے درمیان صلح، بیوی خاوند کے درمیان صلح اور حقوق والاک میں نزاع کو ختم کرنے کے لئے صلح اور اس مقام پر مالی معاملات کے بارے میں صلح مراد ہے کیونکہ اسی کی یہاں خرید و فروخت کے من وجہ نسبت ہے۔ اور فقہاء کرام بھی کتاب البیوع میں اس باب کو اسی بنا پر لائے ہیں۔ ﴿والمسلمون على شروطهم﴾ یعنی مسلمان اپنی شرائط پر قائم ہیں یعنی ان پر ثابت قدم ہیں ان شرطوں سے پھرتے نہیں۔ ﴿الا شروطا حراما حلالا﴾ مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام کر دے۔ مثلاً یہ کہ کوئی یہ شرط کرے کہ مظلوم اور پریشان حال کی مدد نہ کرے۔ فقیروں اور محتاجوں کی اعانت نہ کرے ﴿واحل حراما﴾ یا حرام کو حلال کرے۔ مثلاً یہ شرط کرے کہ ظالم کی مدد کرے، باغی سے تعاون کرے یا مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی شرط کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمانوں کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ شریعت اسلامی کے احکام کے مخاطب اور مکلف مسلمان ہی ہیں۔ ورنہ جہاں تک صلح کا تعلق ہے تو وہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی جائز ہے اور مشرکین اور دہریہ لوگوں کے ساتھ بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بذات خود اہل کتاب سے بھی صلح کی ہے۔ میثاق مدینہ میں یہود مدینہ کے ساتھ صلح ثابت ہے۔ نصاریٰ، نجران کے ساتھ صلح ثابت ہے۔ صلح حدیبیہ میں آپؐ نے مشرکین مکہ سے صلح فرمائی۔ صلح کیلئے ضابطہ اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ صلح شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو جس سے کوئی حرام چیز حلال ہو جائے یا حلال چیز حرام ہو جائے۔ حرام کو حلال کرنے والی شرط یہ ہے مثلاً ایک آدمی کہے کہ میں تمہاری حمایت میں فلاں صاحب کی بے عزتی لازماً کروں گا خواہ وہ بے قصور و بے گناہ ہی کیوں نہ ہو اور حلال کو حرام کی مثال یہ ہے کہ کوئی مسلمان کو ریشمی کپڑا اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ وہ خود اسے ضرور پہنے گا یا یوں کہے کہ میں تیری خاطر اپنی اہلیہ سے قطع تعلق کر لوں گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے سوا تینوں ائمہ کرام ہر اس صلح کو جائز قرار دیتے ہیں جو شریعت کی عائد کردہ شرائط کے مخالف نہ ہو۔ ہر حال صلح میں فریق ثانی کو مجبور کر کے صلح کرنا صحیح نہیں۔ فریقین کا رضامند ہونا ہی صلح کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اور جائز شرائط کو پورا کرنا واجب ہے۔

576 = فرید و فروخت کے مسائل

راوی حدیث: ﴿عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ﴾ عمرو بن عوف بن زید بن ملحہ المزنی (مزنی) کے میم پر ضمہ اور زاء پر فتح) یہ کثیر بن عبد اللہ کے جد امجد ہیں، قدیم الاسلام تھے بدر میں حاضر ہوئے نبی ﷺ نے انہیں حرم مدینہ کا عامل مقرر کیا۔ بہت زیادہ روئے والے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں فوت ہوئے۔

﴿کثیر بن عبد اللہ﴾ امام شافعی رضی اللہ عنہ اور ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں کہا ہے جھوٹے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ نے اسے منکر الحدیث کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ نسائی نے کہا کہ یہ ثقہ نہیں۔ ابن حبان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کے پاس اس کے باپ عن جدہ کے حوالہ سے گھڑا ہوا نسخہ ہے۔

(۷۳۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرَزَ خَشَبَةً فِي لَكْزَى كَاؤُنَ مِنْ مَنَعٍ نَهَى عَنْهُ». پھر حضرت جدارہ، ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، مَا لِي أَرَاكُمْ عَنْهَا تَهْتِكُنَّ اس پر عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے دیکھ رہا اللہ بَعَالَى عَنْهُ: وَاللَّهِ لَاؤْمِنِينَ بِهَا بَيْنَ هَوْنٍ۔ اللہ کی قسم! میں تو اسے تمہارے کندھوں پر اُكْنَا فِيكُمْ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ ماروں گا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یغرز﴾ ”راء“ کے نیچے کسرہ۔ یغرز یضع کے معنی میں رکھے۔ ﴿مالی اراکم عنہا﴾ یعنی اس سنت سے یا اس ارشاد سے اعراض کر رہے ہو۔ یہ انہوں نے اس لئے فرمایا کہ جب یہ لوگ ان سے حدیث سنتے تو اپنے سر نیچے جھکا لیتے۔ واللہ لاؤمین بھا اس سنت کو یا اس ارشاد کو۔ کندھوں کے درمیان مارنے یا رکھنے سے مراد یہ ہے کہ میں اس سنت کو اعلانیہ اور کھلم کھلا عمل کرا کے چھوڑوں گا اور اس کے اعلان سے لوگوں پر حجت قائم کر کے دم لوں گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ضمیر کا مرجع خشبہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں یہ لکڑی تمہارے کندھوں کے درمیان ماروں گا اور یہ کنایہ ہے کہ میں اس سنت کو باوجود ناپسندیدگی کے زبردستی نافذ کر کے رہوں گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ طیبہ کے امیر تھے اور امیر کیلئے لازم ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو نافذ کرے۔ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مخاطب صحابہ کرامؓ نہ تھے بلکہ عام لوگ تھے جو احکام شرعیہ سے واقف نہ تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ہمسایہ کے ہمسایہ پر حقوق کی نشان دہی ہوتی ہے کہ تعمیرات کے موقع پر ایک دوسرے سے تعاون و معاونت کریں اور یہ بھی حق ہمسائیگی ہے کہ ہمسایہ ہمسائے کی دیوار پر اپنا شہتیر یا اپنا لینٹر رکھنا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ اور اسحق رضی اللہ عنہ کے نزدیک تو یہ

خرید و فروخت کے مسائل 578

”تاً“ پر تشدید۔ صیغہ معروف۔ حوالہ کو قبول کر لینا چاہئے۔
 مہزہ ہوتا ہے اور اکثر مہزہ کو ترک بھی کر دیتے ہیں اور ”یا“ پر تشدید دے دیتے ہیں۔ ﴿فلیتبع﴾

حاصل کلام: اس حدیث میں حوالہ کا بیان ہے۔ حوالہ کے دو معنی کئے گئے ہیں ایک یہ کہ مقروض اپنے قرض میں شخصی ضمانت دے یعنی ایک شخص دوسرے سے کہے کہ فلاں صاحب کو قرض دے دو ادائیگی کا میں ذمہ لیتا ہوں اور دوسرا یہ کہ مقروض قرض خواہ کو اپنے مقروض کے سپرد کر دے۔ مثلاً زید نے خالد سے ہزار روپیہ لینا ہے اور خالد نے حمید سے ہزار روپیہ لینا ہے تو خالد زید سے کہے کہ تم میرا قرض حمید سے وصول کر لو۔ شریعت نے اس صورت کو بھی جائز رکھا ہے بشرطیکہ حمید اس بات کا اقرار کر لے کہ میں نے واقعی خالد کا قرض دینا ہے اور وہ ہزار روپیہ میں تجھے ادا کر دوں گا۔

اس حدیث کے الفاظ فلیحتل اور فلیتبع دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ اسے اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہئے۔ یہ حکم اہل ظاہر کے نزدیک وجوب کیلئے ہے۔ مگر جمہور نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے۔ عرب ممالک کے بنکوں میں ڈرافٹ کو ”حوالہ“ کہا جاتا ہے۔ اور ڈرافٹ بنا کر دینے والا بنک، رقم جمع کرانے والے کو ایک رسید جاری کرتا ہے کہ اس رسید کے ذریعہ فلاں بنک سے یہ رقم وصول کر لی جائے۔ یہ حوالہ کا جدید مروجہ نظام ہے جو کہ شریعت کی اجازت کے عین مطابق ہے۔ انشاء اللہ۔

(۷۳۹) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: ثَوَّفَنِي رَجُلٌ مِّنَّا، فَقَسَّسْنَا، وَحَنَطْنَاهُ، وَكَفَّنَاهُ، ثُمَّ أَتَيْنَا بِهِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَقُلْنَا: تَصَلِّيْ عَلَيْهِ، فَحَطَا حُطًا، ثُمَّ قَالَ: أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟ قُلْنَا: دَيْنَارَانِ، فَأَنْصَرَفَ، فَتَحَمَّلَهُمَا أَبُو قَتَادَةَ، فَأَتَيْنَاهُ، فَقَالَ أَبُو قَتَادَةَ: الدَّيْنَارَانِ عَلَى، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «حَقَّ الْغَرِيمُ؟ وَبَرِئَ مِنْهُمَا الْمَيْتُ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَصَلَّى عَلَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ وَالْحَاكِمُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی فوت ہو گیا ہم نے اسے غسل دیا، خوشبو لگائی اور کفن پہنایا۔ پھر ہم اسے اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے اور عرض کیا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپ نے چند قدم آگے بڑھنے کیلئے اٹھائے اور دریافت فرمایا کہ ”کیا اس کے ذمہ قرض ہے؟“ ہم نے عرض کیا دو دینار تھے۔ یہ سن کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے دو دینار کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔ پھر ہم آپ کے پاس آئے تو ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا دو دینار میرے ذمہ ہیں۔ آپ نے فرمایا ”مقروض کی طرح لازم و حق ہو گیا اور میت اس سے بری الذمہ ہو گئی۔“ اس نے کہا کہ ہاں! پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (اسے احمد، ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے

لغوی تشریح: ﴿حنطناه﴾ تحنيط سے ماخوذ ہے یعنی غسل کے بعد میت کے جسم پر مختلف قسم کی خوشبوئیں لگانا۔ ﴿فخطا خطا﴾ چند قدم آگے چلے۔ خطا میں خاء پر ضمہ مدی کے وزن پر خطوة کی جمع یعنی چند قدم آگے بڑھے کہ نماز جنازہ پڑھیں۔ ﴿فتحملهما﴾ دو دینار کے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ ﴿حق الغريم﴾ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، شروع میں صرف استفہام محذوف ہے یعنی کیا اس کی ادائیگی تم پر اسی طرح لازم ہے اور حق ہے جس طرح مقروض پر اس کا ادا کرنا حق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوئے ہیں۔ (۱) میت کی جانب سے قرض ادا کرنے کی ضمانت درست ہے۔ (۲) ضمانت دینے والا آدمی ضمانت کی رقم مرنے والے کے ترکہ میں سے نہیں لے سکتا، اسے اپنی جیب خاص سے زر ضمانت ادا کرنا ہوگا۔ (۳) میت کے حقوق مالیہ جو اس پر واجب ہیں مثلاً حج، زکوٰۃ اور قرضہ کی ادائیگی وغیرہ کا مرنے والے کو فائدہ پہنچتا ہے اس کی جانب سے دوسرے کے ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں۔ (۴) قرض ہو یا دوسرے حقوق العباد جب تک ان کی ادائیگی نہ کی جائے یا مقدار یا قرض خواہ خود معاف نہ کر دے کبھی ساقط نہیں ہوتے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی از خود معاف نہیں ہو جاتے۔ (۵) قرضہ لینا بہت ہی سنگین اور سخت معاملہ ہے حتیٰ الوسع لینے سے گریز ہی کرنا چاہئے اگر لینا اشد مجبوری اور ناگزیر ضرورت ہو تو اسے جلد از جلد ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

(۷۴۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يُؤْتِي بِالرَّجُلِ الْمُتَوَقِّى عَلَيْهِ الدِّينُ، فَيَسْأَلُ، «هَلْ تَرَكَ لِدِينِهِ مِنْ قَضَاءٍ؟» فَإِنْ حَدَّثَ أَنَّهُ تَرَكَ وَفَاءً، صَلَّى عَلَيْهِ، وَإِلَّا قَالَ: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ»، فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْمُتَوَحَّ قَالَ: أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، فَمَنْ تُوْفِيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَعَلِمَى قَضَاؤُهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِبُخَارِي: فَمَنْ مَاتَ وَلَمْ يَتْرَكَ وَفَاءً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مقروض آدمیوں کے جنازے لائے جاتے تو پہلے آپ دریافت فرماتے تھے کہ ”کیا اس نے قرضہ کی ادائیگی کیلئے کچھ چھوڑا ہے؟“ اگر بتایا جاتا کہ اس نے اپنا مال چھوڑا ہے تو اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ورنہ فرمادیتے کہ ”جاؤ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔“ پھر جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کے دروازے کھول دیئے تو آپ نے فرمایا کہ ”میں مومنوں کو ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ لہذا اب جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر قرضہ کا بار ہو تو اس قرضہ کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ”جو آدمی مر گیا اور اس نے اتنا ترکہ پیچھے نہیں

چھوڑا جو قرضہ کی ادائیگی کیلئے کافی ہو۔“

لغوی تشریح: ﴿اَنَا اُولٰٓئِی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ میں ان کے اپنے نفسوں کی بہ نسبت زیادہ حق رکھتا ہوں اور زیادہ قریب ہوں اور میرا حکم ان کے بارے میں ایسے جاری و نافذ ہوگا جیسا کہ خود ان کا اپنا حکم ان پر نافذ و جاری ہوتا ہے۔ بعینہ ان کے ذمہ قرض کی رقم کی ادائیگی میں زیادہ ذمہ دار اور ضامن ہوں جبکہ وہ اسے ادا نہ کر سکتے ہوں۔ تنگ دست ہوں۔ یہ اس لئے کہ بیت المال میں سب مومنوں کا حق مساوی ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ مسکین ہو اس وقت تو زیادہ ہی استحقاق رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے حتیٰ کہ اگر اس کا کوئی مسلمان شہری مقروض حالت میں فوت ہو گیا اور قرض کی ادائیگی کیلئے کوئی ترکہ نہ چھوڑ گیا ہو اور کوئی عزیز رشتہ دار اور دوست بھی ادائیگی قرض کی ضمانت نہ دے تو اس صورت میں اس کا قرض اسلامی ریاست کے بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔

اس حدیث سے نبی کریم ﷺ کی اپنی امت کے معذوروں، مجبوروں اور قرض داروں کے ساتھ محبت و شفقت کا پتہ چلتا ہے کہ آپؐ ان کے حق میں کتنے مہربان، ہمدرد اور غم خوار تھے۔ سربراہان مملکت کو اپنی رعایا کے ساتھ ایسا ہی شفیق و مہربان ہونا چاہئے۔

(۷۴۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا غَفَالَهٖ فِي حَدٍّ». نَسِیْنَ۔ (اسے یہی بتی نے کزور سند سے روایت کیا ہے۔)

شراکت اور وکالت کا بیان

۹ - بَابُ الشَّرَکَةِ وَالْوَكَالَةِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے کہ دو شراکت کرنے والوں میں، میں تیسرا ہوتا ہوں تاوقتیکہ کوئی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے جو نبی ان میں سے کوئی ایک خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو میں ان کے درمیان میں سے نکل جاتا ہوں۔“

(ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور نام نے اسے نسخ کیا

ہے)

(۷۴۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «قَالَ اللَّهُ تَعَالٰی: اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکِیْنِ مَا لَمْ یَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَاِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنَهُمَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاکِمُ

لعوی تشریح: ﴿باب الشَّرْكَهٖ ۝ الخ﴾ شرکہ کے شین کے نیچے کسرہ اور ”راء“ ساکن اور شین پر فتح اور ”راء“ کے نیچے کسرہ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ﴿وڪَالِهٖ﴾ میں واؤ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ وکالت کے معنی ہیں تقویض کرنا، سپرد کرنا۔ یعنی اپنے اختیارات کسی دوسرے کو دیکر اپنا قائم مقام بنانا۔ ﴿انا ثالث الشریکین﴾ یعنی میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں حفاظت کرنے، نگرانی کرنے، نزول برکت کرنے اور مال میں مدد کرنے کی صورت میں۔ ﴿خرجت﴾ میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں بایں صورت کہ میری حفاظت اور نگرانی اٹھ جاتی ہے۔

(۷۴۳) وَعَنِ السَّائِبِ الْمَخْزُومِيِّ حضرت سائب مخزومیؓ سے مروی ہے کہ وہ آپ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ كَانَ شَرِيكَ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ الْبُعْثَةِ، فَجَاءَ پھر وہ فتح مکہ کے موقع پر آیا تو آپؐ نے فرمایا يَوْمَ الْفَتْحِ، فَقَالَ: «مَرْحَبًا بِأَخِي» مبارک ہو میرے بھائی اور میرے شریک۔ (اسے وَشَرِيكِي»۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ أَحْمَدَ ابوداؤد اور ابن ماجہ تینوں نے روایت کیا ہے)

ماخِذُ

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے بھی کاروبار میں شراکت کا رواج تھا۔ اسلام نے بھی اسے جاری رکھا البتہ جو نقائص دور جاہلیت میں تھے ان سے شراکت کو پاک اور صاف کر دیا۔ آپؐ نے بعثت سے قبل شریک تجارت کی کس قدر حوصلہ افزائی اور عزت افزائی فرمائی۔ اس لئے پرانے اور دیرینہ دوستوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ جب ملاقات ہو تو خندہ پیشانی، کشادہ ظہن سے ملاقات کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سائب بن ابی سائب مخزومیؓ﴾ علامہ ابن جوزیؒ نے اپنی ”تلقیح“ میں کہا ہے کہ ابوالسائب کا نام صبی بن عائد مخزومی تھا اور صوری نے بھی عائد ہی بتایا ہے مگر ہمارے شیخ ابن ناصر نے عابد کو درست قرار دیا ہے اور علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ مؤلفہ القلوب لوگوں میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے جن کا اسلام بہت عمدہ ہے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے لمبی عمریں پائیں۔ امیر معاویہؓ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔

(۷۴۴) وَعَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: أَشْرَكَتُ أَنَا وَعَمَّارٌ وَسَعْدٌ فِيمَا نَصِيبُ يَوْمَ بَدْرٍ، أَلْحَدِيثِ، وَتَمَامُهُ: «فَجَاءَ سَعْدٌ بِأَسِيرَيْنِ، وَلَمْ أَجِئْ أَنَا وَعَمَّارٌ بِشَيْءٍ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ

عمارؓ کوئی بھی چیز نہ لائے۔ (اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے پر عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ، اَلْحَدِيثُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ تحصیل دار مقرر فرمایا۔ (الحديث) (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کو یہاں وکالت کے اثبات میں نقل کیا گیا ہے۔ مکمل حدیث کا مضمون اس طرح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ابن جمیل رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ آپ نے فرمایا ”ابن جمیل غریب و مفلس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مالدار اور غنی کر دیا۔ اب وہ اللہ سے اسی بنا پر انتقام لیتا ہے، یہ منافق تھا۔ اس نے بعد میں توبہ کی اور سچا مسلمان بن گیا اور رہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زکوٰۃ تو وہ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کر دوں گا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا حال تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس نے اپنا ورثہ اور مال و متاع اللہ کیلئے وقف کر رکھا ہے تو اس سے زکوٰۃ کا تقاضا کیسا؟“ اس سے معلوم ہوا کہ سربراہ مملکت زکوٰۃ وصول کرنے کی ذمہ داری کسی مناسب شخص پر ڈال سکتا ہے۔ اور اسی لئے یہ روایت یہاں ذکر کی ہے۔

(۷۴۸) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَحَرَ ثَلَاثًا تَرِيحًا اُونٹ خود نحر کئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا وَسَيِّئٌ وَأَمَرَ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ کہ باقی وہ ذبح کریں۔ (الحديث) (مسلم)

عَنْهُ أَنْ يَذْبَحَ الْبَاقِي، اَلْحَدِيثُ. رَوَاهُ

مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے میں بھی وکیل بنانا جائز ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے حجة الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنایا اور انہوں نے ۳۷ اُونٹ نحر کئے۔

(۷۴۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ تَعَالَى عَنْهُ، فِي قِصَّةِ الْعَسِيفِ، قَالَ ﷺ نے مزدور کے قصہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ النَّبِيُّ ﷺ: «وَاعْذُ يَا أُنَيْسُ عَلَى "اے انیس! اس عورت کے پاس جاؤ اگر وہ تسلیم کر امرًا هَذَا، فَإِنْ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمُوهَا"، لے تو اسے سنگسار کر دو۔“ (الحديث) (بخاری و مسلم)

اَلْحَدِيثُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لفظی تشریح: ﴿العسيف﴾ مزدور۔ اجیر کے معنی میں جو عسيف کے وزن پر ہے۔ اس کا مفصل واقعہ و قصہ تو کتب الحدود میں آگے آ رہا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کے ہاں مزدور تھا، وہ اس کی بیوی سے زنا کر بیٹھا پھر مزدور کے باپ اور اس عورت کے خاوند نے آپس میں اس طرح مصالحت کر لی کہ مزدور ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی عورت کے شوہر کو دے کر فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد ان دونوں کو شرعی سزا یعنی حد کی خبر دی گئی تو دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ آپ کے روبرو بیان کیا۔ آپ نے سارا واقعہ سن کر زانی مرد کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا دی اور عورت

584 خرید و فروخت کے مسائل

کے بارے میں فرمایا کہ، اگر وہ جرم زنا کا اعتراف کر لے تو اس کو رجم کر دو ﴿واغد﴾ جاؤ۔ غدا یغدوا غدوا سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی صبح سویرے جانا۔ بکثرت استعمال سے مطلق جانے پر بولا جانے لگا۔ ﴿یا انیس﴾ انس کی تصغیر ہے اور صحیح قول کے مطابق یہ انیس بن ضحاک اسلمی تھے۔ ﴿فارجمها﴾ رجم سے امر کا صیغہ ہے۔ رجم پتھر مار مار کر جان سے مار دینے کو رجم کہتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے حدود میں بھی وکالت جائز ہے۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس مقام پر ذکر کیا ہے۔

اقرار کا بیان

۱۰ - بَابُ الْإِقْرَارِ

(۷۵۰) عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "مَنْ كَذَبَ فِي حُدُودِ اللَّهِ كَذَبَ فِي حُدُودِ اللَّهِ وَلَوْ كَانَ مُرًّا". نَهْ هُوَ. (اسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ ایک لمبی حدیث وَصَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ فِي حَدِيثِهِ طَوِيلًا. میں)

لغوی تشریح: ﴿قل الحق﴾ سچ کو۔ خواہ تیری اپنی ذات کے خلاف پڑے یا دوسرے کے خلاف۔ پہلی تعبیر کے اعتبار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنف نے باب الاقرار میں اسے بیان کیا ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث میں حق گوئی کا حکم ہے کہ خواہ کتنے ہی ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑے مگر حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔

ادھار لی ہوئی چیز کا بیان

۱۱ - بَابُ الْعَارِيَةِ

(۷۵۱) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "مَنْ قَبِلَ عَارِيَةً مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ فَهُوَ كَالْمَالِ الْمَخْرُوجِ مِنْ بَيْتِهِ". (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے وَالْأَزْنَعَةُ، وَصَّحَهُ الْحَاكِمُ. صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب العارۃ﴾ عار پر تشدید اور تخفیف دونوں جائز ہیں دوسرے کسی کو کوئی چیز دینا کہ وہ فائدہ اٹھا کر واپس کر دے۔ ﴿على اليد ما اخذت﴾ ہاتھ نے جو کچھ لیا ہے اسے ادا کرنا بھی اس پر واجب ہے یعنی جس کسی نے دوسرے کا کوئی مال غصب کیا ہو یا عاریتاً لیا ہو یا ودیعت کے طور پر کسی نے اس کے پاس رکھا ہو اس کا واپس لوٹانا لازم ہے۔ ﴿حتى توديہ﴾ تا وقتیکہ اس کے مالک کو واپس نہ دے دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو چیز کسی سے عاریتاً لی ہو جب تک اسے اسی طرح واپس نہ

خرید و فروخت کے مسائل 585

کرے وہ اس کے ذمہ واجب الادا رہتی ہے۔ ادھار لی ہوئی چیز کی ضمانت کس کی ہے؟ آیا اس کی ضمانت عاریتاً لینے والے پر ہے یا نہیں۔ اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول تو یہ ہے کہ ہر صورت اس کی ضمانت اس کے ذمہ ہے خواہ ضمانت کی شرط کی ہو یا نہ کی ہو۔ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما، زید بن علی رضی اللہ عنہ، عطاء رضی اللہ عنہ، احمد رضی اللہ عنہ، اسحق رضی اللہ عنہ اور امام شافعی رضی اللہ عنہ کی یہی رائے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر شرط ضمان نہ کی ہوگی تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔ جیسا کہ آئندہ حضرت یعلیٰ کی روایت میں آرہا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ شرط کے باوجود بھی ضمان نہیں بشرطیکہ خیانت نہ کرے۔

(۷۵۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَذَّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنْ ائْتَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَسْتَنْكَرَهُ ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابو حاتم رازی نے اسے منکر سمجھا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اد تادیبہ﴾ سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ائتمنک﴾ جس نے تجھے امین بنایا ہے۔ ﴿ولا تخن من خانک﴾ جس نے تیرے ساتھ خیانت کی ہے اس کے مال پر قابو پانے کے باوجود تو اس سے خیانت نہ کر۔ اسے استحب پر محمول کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وجزاء سیئۃ سیئۃ - مثلها (۴۰:۴۲) برائی کی جزاء برائی کے مثل ہے۔ وان عاقبتهم فعاقبوا بمثل ما عوقبتهم به (۱۶: ۱۶) دونوں آیات اپنے حق کے حصول و وصول پر دلالت کر رہی ہیں۔ ابن حزم کا قول ہے کہ جس نے خیانت کی ہے اس کے مال پر قابو پانے کی صورت میں اسے اپنا حق لے لینا واجب ہے اور یہ عمل خیانت میں شمار نہیں ہے بلکہ خیانت تو اس صورت میں ہوگی کہ لینے والا اپنے حق سے زیادہ وصول کرے۔ دلائل ابن حزم کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ حق بھی انہی کا قول ہے۔ ﴿الرازی﴾ رے کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے رازی کہلائے۔ رے فارس کے شہروں میں ایک مشہور و معروف شہر ہے۔

(۷۵۳) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَتَيْتَكَ رُسُلِي فَأَعْطِهِمْ ثَلَاثِينَ دِرْهَمًا»، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! دے دینا۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اَعَارِيَّةٌ مَضْمُونَةٌ، أَوْ عَارِيَّةٌ مُؤَدَّاءَةٌ؟ (مشہور!) کیا عاریتاً جس میں ضمانت ہوگی یا اس ادھار

نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

(۷۵۴) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَعَارَ مِنْهُ دُرُوعًا يَوْمَ حُنَيْنٍ، فَقَالَ: أَغْضَبَا يَا مُحَمَّدٌ ﷺ! قَالَ: «بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَخْرَجَ لَهُ شَاهِدًا ضَعِيفًا عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا.

بطور شہادت ہے)

نفوی تشریح: ﴿اغصب﴾ دراصل یہ اھو غصب ہے یعنی کیا یہ زبردستی ہے اور ایک نسخہ میں ”غصباً“ منصوب بھی ہے، اس صورت میں معنی ہوگا کیا آپؐ یہ زہریں زبردستی چھین رہے ہیں ﴿بل عاریۃ مضمونہ﴾ جس کسی نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ عاریۃ مضمونہ ہے اس نے لفظ مضمونہ سے عاریۃ کی حقیقت کو کھول کر رکھ دیا ہے یعنی عاریۃ لی گئی چیز کی شان یہ ہے کہ اس کی ضمانت ہے اگر تلف ہو جائے گی تو ادا کی جائے گی اور جس نے کہا ہے کہ عاریۃ لی ہوئی چیز کی کوئی ضمانت نہیں اس نے لفظ مضمونہ کو اس کی مخصوص صفت قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں تم سے یہ چیز عاریۃ اس طرح لے رہا ہوں کہ اس کی واپسی کی ضمانت ہے ایسا نہیں کہ عاریۃ بغیر کسی ضمانت کے لے رہا ہوں۔ (نیل الاوطار)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم سے بھی عاریتاً کوئی چیز لینے جائز ہے اور ضمانت پر مستعار لی ہوئی چیز کو واپس کرنا بھی ضروری ہے اگر کسی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور اگر عاریتاً لینے والا عمداً اسے تلف و ضائع کر دے تو اس صورت میں سب کے نزدیک اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

راوی حدیث: ﴿صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ﴾ اس سے صفوان بن امیہ بن خلف بن وہب قرشی مراد ہیں جو مکہ کے باشندے اور قبیلہ جمحی سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلفہ القلوب صحابہؓ میں سے تھے اور اشراف قریش میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے روز فرار ہو گئے تھے۔ ان کیلئے امان طلب کی گئی تو وہ واپس لوٹ آئے اور بعد میں حنین میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے اس وقت یہ حالت کفر میں تھے بعد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور بہترین اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلوایوں نے شہید کیا انہیں ایام میں یہ فوت ہوئے۔

غضب کا بیان

۱۲ - بَابُ الْغَضَبِ

(۷۵۵) عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ افْتَتَعَ شَيْئاً مِنَ الْأَرْضِ ظُلْماً، طَوَّقَهُ اللَّهُ إِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے ایک باشت بھر زمین کسی سے چھین لی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اتنا ظلماً، طوقہ اللہ ایسے ہی کہ اس کے گلے میں سب سے ساتوں زمینوں سے اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دے گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الغضب﴾ ”غین“ پر فتح اور ”صاد“ ساکن۔ ناحق کسی چیز کا حاصل کرنا، زبردستی کوئی چیز چھین لینا۔ ضرب یضرب باب سے ہے۔ مختار الصحاح میں ہے کہ اس کا استعمال غصبہ منہ اور غصبہ علیہ ہے چنانچہ اس کے معنی ہیں اس سے چھیننا اور غصبہ علیہ کا مطلب ہے کسی پر زبردستی کرنا یا مجبور کرنا اور ”اعتصاب“ بھی اسی معنی میں ہے اور وانشئ غصب و مغبوب کا مطلب ہے چھیننا ہوا مال۔ ﴿افتتَعَ﴾ زبردستی چھین لے۔ ﴿شبرا﴾ شین کے نیچے کمرہ اور ”پا“ ساکن۔ انگوٹھے کے سرے اور چھگل کے سرے کے درمیان کا فاصلہ۔ یعنی باشت بھر۔ ﴿طوقہ﴾ اللہ تعالیٰ اس کا طوق بنا کر گلے میں ڈال دے گا اور یہ بھی معنی کیا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو ساتوں زمینوں تک دھنسا کر سزا دے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے اس زمین میں گڑھا کھودنے اور اس کی مٹی کو محشر کی طرف منتقل کرنے کی سزا دی جائے گی۔

(۷۵۶) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهِ، فَأَرْسَلَتْ، إِحْدَى أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ مَعَ خَادِمٍ لَهَا بَقْضَةً فِيهَا طَعَامٌ، فَضَرَبَتْ يَدَهَا فَكَسَرَتِ الْقَضْعَةَ، فَضَمَّهَا، وَجَعَلَ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں تشریف فرما تھے۔ کسی دوسری ام المؤمنینؓ نے اپنے خادم کے ذریعہ ایک پیالہ بھیجا جس میں کچھ کھانا تھا تو اس بیوی نے اپنا ہاتھ مارا کہ وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔ آپؐ نے اس پیالہ کو جوڑ کر اس میں کھانا ڈال دیا اور فرمایا کہ

فِيهَا الطَّعَامَ وَقَالَ: كُلُوا، وَدَفَعَ ثَوْبًا هُوَ ابْنُ أَبِي بَرْزَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لِرَسُولِهِ، وَحَبَسَ الْمَكْسُورَةَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَسَمِعْتُ الصَّارِبَةَ عَائِشَةَ، وَزَادَ: «فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «طَعَامٌ بِطَعَامٍ وَإِنَاءٌ بِإِنَاءٍ». وَصَحَّحَهُ.

”کھاؤ اور لانے والے کے ہاتھ سالم پیالہ بھیج دیا اور ٹوٹا ہوا اپنے پاس رکھ لیا۔“ (بخاری و ترمذی) ہاتھ مار کر پیالہ توڑنے والی کا نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لیا گیا ہے اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”کھانے کے بدلہ میں کھانا اور برتن کے بدلہ میں

برتن“ (اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لعنوی تشرح: ﴿احدى امهات المومنين﴾ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں جیسا کہ ابن حزم نے محلّی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے جو انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا تھا جیسا کہ نسائی نے اسے روایت کیا ہے۔ ﴿بقصعة صحفة﴾ کے وزن پر پیالہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿وحبس المكسورة﴾ یعنی ٹوٹے ہوئے پیالہ کو توڑنے والی کے ہاں رکھ دیا۔ ﴿سمى الصاربه عائشه﴾ یہ الفاظ ترمذی نے نقل کئے ہیں۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو کوئی کسی دوسرے کی کوئی چیز ہلاک کرے گا تو اسی طرح کی ادا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ غلہ اور دانے وغیرہ میں اس کی مثل پر سب کا اتفاق ہے۔ یعنی جیسا نقصان کیا ہے اسی طرح واپس دینا لازم ہے۔ البتہ قیمت والی چیز میں اختلاف ہے اور ﴿طعام بطعام وإناء بإناء﴾ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ قیمت والی چیز بھی اسی جیسی واپس دینا اس کی ذمہ داری ہے۔ جب اس جیسی چیز دستیاب نہ ہو تو اس صورت میں اس کی قیمت ادا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ اور علمائے کوفہ کا یہی مذہب ہے اور امام مالک رضی اللہ عنہ کی رائے ہے کہ قیمت والی چیز کے بدلہ قیمت والی چیز دینا مطلقاً ہے مگر مالکیہ کے ہاں مشور ہے جو چیز مالی اور تولی جاسکتی ہے اس کی قیمت ہے ورنہ اس کی مثل واپس دینا ہو گا اور امام مالک رضی اللہ عنہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے۔

(۷۵۷) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنْ حَضْرَةِ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ زَرَعَ فِي أَرْضٍ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ، فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ، وَلَهُ نَفَقَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْنَؤَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيَّ، وَيُقَالُ: إِنَّ الْبُخَارِيَّ ضَعَّفَهُ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر زراعت کی تو اسے اس زراعت میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اسے صرف وہ اخراجات ملیں گے جو اس نے خرچ کئے ہیں۔“ (اسے احمد اور نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿فلیس له من الزرع﴾ کھیتی باڑی سے جو کچھ حاصل ہو۔ وہ زمین کے مالک کا ہوگا۔ بیج بونے والے کیلئے بجز اس بیج کے کچھ نہیں جو اس نے زمین میں بویا ہے یا جو زمین میں ڈالا ہے۔ ﴿ولہ نفقۃ﴾ یعنی جو اخراجات زمین کو سیراب کرنے میں صرف ہوئے اسے وہی ملیں گے۔ امام احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور مدینہ کے اکثر علماء کا یہی مسلک ہے اور یہی راجح مذہب ہے مگر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ کھیتی تو غاصب کی ہے اور اس پر زمین کا کرایہ ہے۔ مگر اس قول پر کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس حدیث کے مقابلہ میں پیش ہو سکے۔ ﴿ویقال ان البخاری ضعفہ﴾ یہ قول علامہ خطابی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان سے اس کے خلاف یہ نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا یہ حدیث حسن ہے۔

(۷۵۸) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: إِنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي أَرْضٍ غَرَسَ أَحَدُهُمَا فِيهَا نَخْلًا وَالْأُخْرَى لِلْآخَرِ، فَقَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْأَرْضِ لِصَاحِبِهَا، وَأَمَرَ صَاحِبَ النَّخْلِ أَنْ يُخْرِجَ نَخْلَهُ: وَقَالَ: لَيْسَ لِعِمْرَقٍ ظَالِمٌ حَقٌّ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ. وَآخِرُهُ: عِنْدَ أَصْحَابِ السُّنَنِ مِنْ رِوَايَةِ عُرْوَةَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ، وَاخْتَلَفَ فِي وَضْعِهِ وَإِسْنَالِهِ، وَفِيهِ اخْتِلَافٌ.

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ دو آدمی نبی ﷺ کے پاس ایک زمین کا جھگڑا لے کر آئے۔ زمین ایک کی تھی اور کھجور کے درخت دوسرے نے لگا دیئے تھے تو آپ نے فیصلہ فرمایا کہ ”زمین مالک کی ہے اور کھجور کے درخت لگانے والا اپنے درخت اکھاڑ لے“ اور فرمایا کہ ”ظالم کی رگ کا کوئی حق نہیں۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اس حدیث کا آخری جزء اصحاب السنن نے عروہ عن سعید بن زید کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ اس روایت کے مرسل اور موصول ہونے اور اس کے صحابی کے تعین میں بن زید، واختلف فی وضعہ وإسنالہ، وفیہ اختلاف ہے)۔

لعنوی تشریح: ﴿لیس لعرق ظالم حق﴾ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کی صورت اس طرح کہ ایک آدمی دوسرے کی زمین میں پودے لگاتا ہے اور مالک زمین سے اجازت نہیں حاصل کرتا یا دوسرے کی زمین پر مالک زمین کی اجازت کے بغیر گھر تعمیر کر لیتا ہے تو مکان تعمیر کرنے والے کو مکان کے گرانے اور پودے لگانے والے کو پودے اکھاڑنے کا حکم دیا جائے الا یہ کہ مالک زمین اس کے چھوڑنے پر رضامند ہو جائے۔ اسی حدیث سے جمہور نے یہ استدلال کیا ہے کہ غاصب جب زمین پر زراعت یا پودے لگا لے تو وہ اس کھیتی باڑی اور پودوں کا مالک ہو جائے گا اور مالک زمین صرف اس زمین کا کرایہ وصول کرنے کا مستحق

590 ————— خرید و فروخت کے مسائل

ہے۔ لیکن یہ حدیث اس بارے میں صریح اور واضح نہیں ہے بلکہ یہ حدیث سابقہ حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر دلالت کرتی ہے۔ غاصب کو اختیار دیا جاتا ہے کہ جو کچھ پودے وغیرہ اس نے زمین میں گاڑے ہیں وہ اکھاڑ لے یا جو اس پر مصارف اٹھے ہیں وہ لے لے۔ جمہور علماء نے جو موقف اختیار کیا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رگ ظالم کا حق ہے باوجودیکہ حدیث اس استحقاق کی نفی کر رہی ہے۔

راوی حدیث: (عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ) ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ عروہ بن زبیر بن عوام بن خلیلہ اسدی مدنی۔ کبار تابعین میں ان کا شمار ہے۔ مدینہ منورہ کے سات فقہاء میں سے ایک ہیں اور مشہور فقیہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں پیدا ہوئے اور ایک قول کے مطابق ۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور صحیح روایت کے مطابق ۹۴ھ میں وفات پائی۔

(۷۵۹) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنَى: «إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. اور تمہارے اس مینے میں واقع ہوا ہے۔“

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو اگر باب الغصب کے شروع میں بیان کرتے تو بہت خوب ہوتا۔ بہر حال اس مقام پر اسے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان کا مال غصب کرنا حرام ہے اور اس کی حرمت پر سب متفق ہیں۔

شفعہ کا بیان

۱۳ - بَابُ الشُّفْعَةِ

(۷۶۰) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَا لَمْ يُقَسِّمْ، فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِّقَتِ الطَّرِيقُ فَلَا شُفْعَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَفِي رِوَايَةٍ مُسْلِمٍ: الشُّفْعَةُ فِي كُلِّ شَيْءٍ، فِي أَرْضٍ، أَوْ رُبْعٍ، أَوْ حَاطِطٍ، لَا يَصْلُحُ أَنْ يَبْنَعَ حَتَّى يَعْزِضَ عَلَى

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو مگر جب حدود بندی ہو جائے اور راستے الگ ہو جائیں تو پھر شفعہ نہیں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ شفعہ ہر مشترک چیز میں ہے (مثلاً زمین میں، مکان میں، باغ میں۔ اپنے حصہ دار (شریک) کے روبرو پیش کئے بغیر کسی کیلئے چیز فروخت کرنا درست نہیں اور طحاوی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر چیز

شَرَبِكِهِ. وَفِي رَوَايَةِ الطَّحَاوِيِّ: مِثْلُ شَفْعَةٍ كَأَنَّ رَكْعَةً. اس کے راوی ثقہ ہیں۔
 «قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشَّفْعَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ». وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

لغوی تشریح: ﴿باب الشفعة﴾ کے شین پر ضمہ اور ”فاء“ ساکن ہے اور جس ”فاء“ کو متحرک سمجھا ہے اس نے غلطی کی ہے۔ لغت میں یہ ”اشفع“ سے ماخوذ ہے اس کے معنی جوڑا کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”الزيادة“ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”اعانة“ سے ہے اور شرعاً شفعہ کا معنی ہے کہ شریک کے حصہ کو شریک کی طرف منتقل کرنا مقرر معاوضہ کے بدلہ میں اجنبی کی طرف منتقل ہو جانا۔ (فتح الباری)

﴿فاذا وقعت الحدود﴾ مالک خریدار کو تقسیم کر کے دے دے اور رکاوٹیں واقع ہو جائیں اور آخری حدود متعین ہو جائیں۔ اور تقسیم کے ذریعہ ہر ایک کا حصہ نمایاں و ظاہر ہو جائے۔ ﴿و صرفت الطرق﴾ صرفت صیغہ مجہول۔ ”را“ مخفف اور مشدد دونوں طرح ہے۔ یعنی راستے اس طرح بنائے جائیں کہ ہر ایک کا حصہ اسے حاصل ہو جائے۔ ﴿فلا شفعة﴾ تو شفعہ نہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ شفعہ اس جائیداد میں ہو سکتا ہے جو مشترک ملکیت میں ہو محض ہمسایہ ہونا شفعہ دائر کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی رائے یہی ہے اور جمہور علماء کا بھی یہی مذہب ہے اور اقرب الی الصواب بھی یہی ہے۔ حنفیہ نے ان کی مخالفت کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ شفعہ جس طرح مشترک جائیداد میں جائز ہے اسی طرح ہمسائیگی کی بنیاد پر بھی شفعہ جائز ہے۔ ان کی دلیل آگے آرہی ہے۔ ﴿فی کل شرک﴾ شین کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن۔ یعنی ہر وہ چیز جس میں کئی آدمی شریک ہوں۔ ﴿ربعہ﴾ ”را“ پر فتح اور ”با“ ساکن۔ گھر، مسکن، رہائش گاہ اور بسا اوقات زمین پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿حائط﴾ باغ۔ خطاب نے کہا ہے کہ شفعہ زمین، گھر، یلو سامان، ان کے علاوہ دیگر ساز و سامان و متاع اور حیوان وغیرہ میں ہی واجب و لازم ہے۔ یہ رائے اکثر اہل علم کی ہے جیسا کہ ترمذی نے نقل کیا ہے ﴿لا یصلح﴾ ایک روایت میں ﴿لا یحل﴾ بھی مروی ہے۔ ﴿ان ینبع﴾ حلال نہیں یا درست نہیں حصہ دار و شریک کیلئے کہ اپنے حصہ کو اسے اطلاع دیے بغیر فروخت کر دے۔ سیاق اس پر دلالت کرتا ہے ﴿حتی یعرض علی شریک﴾ اس سے معلوم ہوا کہ شریک کے روبرو اپنا عندیہ و مدعا پیش کر دیا جائے تو پھر فروخت کرنے کی صورت میں شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ سبل السلام میں ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جب شریک کو مطلع کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے علاوہ دوسرے سے سودا کر لے تو کیا شریک کیلئے شفعہ کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ ایک قول تو یہ ہے اسے اس کا حق ہے۔ پہلے اطلاع دینا اس کی صحت کے مانع نہیں ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے مگر سفیان ثوری رحمہ اللہ اور حکم اور ابو عبیدہ اور اہل حدیث کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ اطلاع دینے کے بعد شفعہ کا استحقاق ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حدیث کے الفاظ کے زیادہ موافق ہے۔ رہی طحاوی کی روایت تو وہ ہر چیز خواہ منقولہ ہو

(۷۶۱) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْبَارُ أَحَقُّ بِصَفِيهِ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَفِيهِ بَقْعَةٌ.

لغوی تشریح: ﴿بِسْقَبَةٍ﴾ اس میں ”با“ سببیہ ہے اور سقب کے سین اور قاف پر فتح، ان دونوں کے بعد ”با“ اور سقب کو سین کی بجائے کبھی صاد سے (مقب) بھی پڑھا گیا ہے اور قاف پر فتح اور اسے ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ قرب اور مجاورت کے معنی ہیں۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ ہمسایہ قرب و مجاورت کی بدولت عام مسلمانوں سے خیر خواہی، بھلائی اور معاونت کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ جب یہ ہمسایہ شریک لوگوں میں سے نہ ہو تو شفعہ میں اس کے مستحق ہونے کی اس حدیث میں کوئی صراحت و وضاحت نہیں ہے۔ ﴿وفیہ قصۃ﴾ قصہ یہ ہے کہ ابورافع رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میرے جو مکان تیری حویلی کے اندر ہیں تو انہیں خرید لے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم! میں تو ان کو نہیں خریدوں گا۔ مسور جو اس وقت ان کے پاس موجود تھے نے سعد سے کہا اللہ کی قسم! تمہیں وہ ضرور خریدنے ہوں گے۔ سعد بولا اچھا تو میں بھی اللہ کی قسم کھا کر کتا ہوں کہ چار ہزار سے زیادہ پر نہیں خریدوں گا وہ اس کی مرضی ہے یکشت لے یا قسط وار۔ اس پر ابورافع بولا میں نے پانچ صد دینار میں دیئے۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے نہ سنا ہوتا کہ ہمسایہ قرب و مجاورت کی وجہ سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے تو میں تمہیں یہ چار ہزار میں بھی نہ دیتا۔ اب میں نے صرف پانچ صد دینار میں دیئے۔ یہ کہہ کر اسے دے دیئے۔ بخاری نے اس حدیث کو باب عرض الشفعة علی صاحبہا قبل البیع میں روایت کیا ہے۔ جس کسی نے ایسے ہمسایہ کیلئے جو شریک نہیں ہے کیلئے اثبات شفعہ پر استدلال کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ ابورافع سعد کے شریک نہیں تھے بلکہ صرف ہمسایہ تھے اس لئے کہ سعد کے سارے مکانوں میں اس کے دو مکان تھے۔ سعد کے مکان کے ساتھ اسے حق شفعہ کا کوئی استحقاق نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ استدلال دو وجہ سے درست نہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث سے اٹھایا ہوا ٹکڑا شفعہ کے بارے میں صریح اور واضح ہی نہیں ہے۔ لہذا اس کا احتمال ہے اس سے مراد یہ ہو کہ وہ ہمسایہ بھلائی، اعانت و مدد، خیر خواہی اور ایثار و ترجیح کا زیادہ ہتھار ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جار کا اطلاق جس طرح ایسے پڑوسی اور قریبی پر ہوتا ہے جو شریک نہ ہو اسی طرح اس کا اطلاق شریک پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی آئندہ حدیث

خرید و فروخت کے مسائل 593

میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ جہاد سے شریک ہی مراد ہو بلکہ وہ تو اس کے اور دوسری احادیث کے درمیان تطبیق متعین کرتا ہے۔ ابورافع نے جو فعل انجام دیا ہے وہ اس کی دلیل نہیں بنتا کہ یہ شریک کے سامنے شفعہ پیش کرنے کے قبیل سے ہے۔ بلکہ اس کا امکان ہے کہ اس سے مراد ہمسایہ کے ساتھ صرف بھلائی اور ایثار ہو۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ یہ شفعہ پیش کرنے کے قبیل سے ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ابورافع نے یہ الجہاد احق بسبقہ کے جملہ سے سمجھا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ ہر وہ چیز جو صحابی سمجھے وہ حجت نہیں بن سکتی بالخصوص جبکہ صحابی کا قول صحیح و صریح حدیث سے معارض ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے جدا جدا ہو جائیں تو پھر شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ یہ ہمسایہ کیلئے شفعہ کے حق کی نفی میں صریح نص ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ یہ نص ہمسایہ کے اصل حق شفعہ کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔ نہ منطوق پر اور نہ ہی اس کے مفہوم پر۔ پس گویا اس نے منطوق اور مفہوم کا معنی ہی نہیں سمجھا۔ جب زمین اس کے مالکوں میں تقسیم کی جائے گی تو ان میں سے دونوں کم از کم ایک دوسرے کا ہمسایہ ہوگا اور یہ حدیث اس پر نص ہے کہ تقسیم کے بعد شفعہ نہیں۔ تو پھر یہ حدیث ہمسایہ کے حق میں شفعہ کی نفی کیوں نہیں کرتی ہے۔

(۷۶۲) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فرمایا ”مکان کا ہمسایہ اس مکان رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «جَارُ الدَّارِ أَحَقُّ» کا زیادہ حق رکھتا ہے۔“ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے بِاللَّارِ. رَوَاهُ الثَّانِبِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَان، اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے لیکن اس میں علت ہے وَهِيَ عِلَّةٌ۔

لغوی تشریح: (جار الدار احق بالدار) اس حدیث سے ہمسایہ کیلئے حق شفعہ کے قائلین نے ثبوت شفعہ پر استدلال کیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس جگہ ہمسایہ سے شریک ہمسایہ ہی مراد ہے کیونکہ دونوں احادیث میں تطبیق کا یہی تقاضا ہے ”ولہ علہ“ علت یہ ہے کہ اس روایت کو دو سندوں سے روایت کیا گیا ہے۔ ایک ان میں سے حسن عن سمرہ کے طریق سے ہے اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ حسن نے سمرہ سے صرف عقیقہ والی حدیث کے سوا اور کوئی حدیث نہیں سنی اور دوسرا طریق قنادۃ عن انس سے ہے اور قنادۃ کے بارے میں معروف و مشہور ہے کہ وہ تدلیس کرتا ہے۔

(۷۶۳) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہمسایہ اپنے ہمسایہ کا شفعہ میں زیادہ حقدار ہے۔ اس کا انتظار بسبب شفعہ کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ غائب ہو جب کہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ اس کے

راوی ثقہ ہیں)

وَرَجَاهُ ثِقَاتٌ۔

خرید و فروخت کے مسائل 595

حاصل کلام: اس حدیث میں شفعہ کو اونٹ کے بند کھولنے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا جب زانو بند کھول دیا جائے تو وہ بلا تاخیر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اسی طرح جس وقت کوئی چیز فروخت ہو یا شفعہ کرنے والے کو اس چیز کے فروخت کئے جانے کا علم ہو اسی وقت بلا تاخیر شفعہ کر دے ورنہ تاخیر کی صورت میں اس کا شفعہ قابل قبول نہیں ہوگا اور شفعہ کا جو استحقاق اسے حاصل تھا وہ باطل ہو کر رہ جائے گا۔ یہ رائے احناف کی ہے۔ محدثین کے نزدیک تاخیر سے حق شفعہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ شفعہ کی احادیث مطلق ہیں اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ نیز جب شفعہ کرنے والا کم سن ہو یا وہ اس وقت وہاں موجود نہ ہو تو بھی ان کو حق شفعہ کا استحقاق رہتا ہے جیسا کہ اوپر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ اگر ہمسایہ اس موقع پر موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے۔ ظاہر ہے اگر اس کا حق شفعہ باطل ہوتا تو پھر اس کا انتظار کرنے کے کیا معنی؟

مضاربت کا بیان

۱۴ - باب القراض

(۷۶۵) عَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «ثَلَاثٌ فِيهِنَّ الْبَرْكََةُ الْبَيْعُ إِلَى أَجَلٍ، وَالْمُقَارَضَةُ، وَحَلْطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ، لَا لِلْبَيْعِ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تین کام بڑے بابرکت ہیں۔ ایک مدت مقررہ تک بیچنا اور مضاربت کرنا اور گندم میں آجلہ، والمقارضة، وحلط البر بالشعير للبيت، لا للبيع“۔ ابن ماجہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔

لعفی تشریح: ﴿باب القراض﴾ میں قاف کے نیچے کسرہ اور اہل حجاز لغت میں مقارضة بولتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سرمایہ ایک آدمی کا ہو اور وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے آدمی کو تجارت کرنے کے لئے دے اس شرط پر کہ دونوں میں طے شدہ شرائط کے مطابق منافع تقسیم ہو گا۔ حاصل کلام: اس کی سند اس لئے ضعیف ہے کہ اس میں تین راوی مجہول ہیں۔ ایک نصر بن قاسم، دوسرا عبدالرحیم بن داؤد اور تیسرا صالح بن صہیب۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

راوی حدیث ﴿صہیب رضی اللہ عنہ﴾ ابویحییٰ صہیب بن سنان رومی۔ اصل میں عرب ہیں نمر بن قاسط بن وائل قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ رومیوں نے انہیں بچپن میں قید کر لیا تھا۔ انہی میں نشوونما پائی اس وجہ سے رومی کہلائے۔ ایک قول کے مطابق جب یہ بڑے ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو ان کے ہاں سے بھاگ کر مکہ میں پہنچ گئے اور عبداللہ بن جدعان کے حلیف بن گئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بنو کلب نے ان کو رومیوں سے خرید لیا اور اسے مکہ میں لے آئے اور وہاں عبداللہ بن جدعان مشہور صحابی نے جو قدیم الاسلام تھے ان کو خرید لیا۔ اللہ کی راہ میں ان کو بڑی سزا دی گئی۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور

مدینہ منورہ ہی میں ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(۷۶۶) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، اَنَّهُ كَانَ جب کسی شخص کو مضاربت پر اپنا سرمایہ دیتے تھے تو يَشْتَرِطُ عَلَى الرَّجُلِ، اِذَا اَعْطَاهُ اس سے یہ شرط کر لیا کرتے تھے کہ میرے مال سے مَالًا مُّقَارَضَةً، اَنْ لَا تَجْعَلَ مَالِي حيوان کی تجارت نہ کرو گے اور سمندر میں لے کر فِي كَيْدِ رَطْبَةٍ، وَلَا تَحْمِلُهُ فِي بَحْرِ، بھی نہیں جاؤ گے اور سیلاب کی جگہوں میں لے کر وَلَا تَنْزِلَ بِهِ فِي بَطْنٍ مَسِيْلٍ، فَإِنْ اسے نہیں جاؤ گے۔ ان میں سے کوئی کام بھی اگر تم فَعَلْتَ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ، فَقَدْ ضَمِنْتَ نے کیا تو میرے مال کے تم خود ضامن و ذمہ دار ہو مَالِي. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ. (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی کبد رطبہ﴾ اس سے مراد حیوان ہے۔ یعنی ذی روح نفس۔ ﴿بطن مسیل﴾ پانی کے بننے کی جگہ یعنی وادی۔ ﴿ضمنت مالی﴾ میرے مال کا تو ذمہ دار و ضامن ہوگا، اگر وہ ضائع ہو گیا۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ مالک سرمایہ مضاربت کرنے والے کو جس چیز سے چاہے روک سکتا ہے۔

وَقَالَ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّأِ عَنْ امام مالک رضی اللہ عنہ نے مؤطا میں علاء بن عبد الرحمن بن العلاء بن عبد الرحمن بن یعقوب باپ اور اس کے دادا کے واسطے سے بیان کیا يَعْقُوبَ، عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ: اَنَّهُ ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مال میں عَمِلَ فِي مَالِ لُعْثَمَانَ، عَلَى اَنَّ تجارت اس شرط پر کی تھی کہ منافع دونوں کے الرِّبْحَ بَيْنَهُمَا. وَهُوَ مَوْقُوفٌ صَحِيحٌ. درمیان تقسیم ہوگا۔ (یہ حدیث موقوف صحیح ہے)

راوی حدیث: ﴿علاء﴾ ان کی کنیت ابو شبل ہے اور سلسلہ نسب یوں ہے۔ علاء بن عبد الرحمن بن یعقوب جعفی۔ قبیلہ حرقہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حرقہ کے ”حا“ پر ضمہ اور ”را“ پر فتح ہے۔ مدینہ کے باشندے تھے۔ صفار تابعین کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ صدوق تھے کبھی وہم بھی ہو جایا کرتا تھا۔ امام احمد رضی اللہ عنہ دوسرے محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ واقدی نے کہا ہے کہ خلیفہ منصور عباس کے دور میں وفات پائی۔

﴿عبد الرحمن بن یعقوب﴾ عبد الرحمن بن یعقوب جعفی قبیلہ سے ہونے کی بنا پر جعفی کہلائے اور مدینہ میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے مدنی کہلائے۔ اوسط تابعین کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے۔

۱۵ - بَابُ الْمُسَافِقَةِ وَالْإِجَارَةِ آبپاشی اور زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا

بیان

وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُمَا: فَسَأَلُوا أَنْ يُفَرِّقَهُمْ بَيْنَهُمَا، عَلَى أَنْ يَكْفُوا عَمَلَهُمَا، وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «نُقِرُّكُمْ بَيْنَهُمَا عَلَى ذَلِكَ مَا شِئْنَا»، فَقَرُّوا بَيْنَهُمَا، حَتَّى أَجْلَاهُمْ عُمُرُ.

اور ان دونوں کی ایک روایت میں ہے کہ اہل خیر (یہود) نے خود آپؐ سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کو یہاں ٹھہرنے دیں یعنی زمینوں پر قابض رہنے دیں۔ وہ کھیتی باڑی کریں گے اور اس کی پیداوار میں سے مسلمانوں کو آدھا حصہ دیا کریں گے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا ”اس شرط پر کہ ہم تمہیں جب تک چاہیں گے

وَلِمُسْلِمٍ: أَنْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَفَعَ إِلَى يَهُودِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْرَ وَأَرْضَهَا، عَلَى أَنْ يَغْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَلَهُمْ شَطْرُ ثَمَرِهَا.

نفوی تشریح: ﴿باب المسافة والاجارة﴾ مساقاة کہتے ہیں کہ کجھور کے درختوں کا مالک اپنے درخت ایک آدمی کو دے کہ وہ اس میں کام کرے تاکہ وہ درختوں کی نگرانی کرے اور پھل صحیح طور پر پک جائے۔ تو پھل پکنے پر آدھا مالک کا اور آدھا کام کرنے والے کا ہو گا۔ پس دو حصوں میں سے ایک حصہ تو فی نفسہ درختوں کا ہے اور دوسرا عمل کا ہے جیسا مزارعت میں ہوتا ہے اور مشہور قول کے مطابق

خرید و فروخت کے مسائل 598

اجارہ میں حمزہ کے نیچے کسرہ ہے اور یہ لغت میں اجرت کا نام ہے اور شرعاً یہ ایسا عقد ہے جس سے معلوم منافع مقصود ہو خرچ کرنے کے قابل ہو اور معلوم معاوضہ کے بدلہ مباح ہو جیسا کہ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ﴿بشطر ما یخرج﴾ شطر کا معنی نصف۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنے حصہ پر اتفاق ہو وہ معلوم ہونا چاہئے بجزول نہیں۔ ﴿یقرہم بها﴾ ان کو خیر پر برقرار رکھا۔ ﴿یکفوا﴾ کفایت سے ماخوذ ہے۔ ﴿فقدوا﴾ ”را“ پر تشدید قرار سے ماخوذ ہے۔ باب سمع اور ضرب دونوں سے آتا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ آنجناب ﷺ نے ان کو برقرار رکھا۔ ﴿اجلاہم﴾ ان کو جلا وطن کر دیا نکال کر۔ یتاء اور اریحاء کی طرف بھیج دیا۔ ﴿یعتملوها﴾ ان زمینوں کی آباد کاری اور درستی کیلئے جدوجہد اور مساعی کریں اور ان کو درست و ٹھیک کرنے کیلئے آلات تمام کے تمام مثلاً کھڑائی، کدال اور دار نقی وغیرہ اپنے استعمال کریں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نصف، نصف کی پٹائی پر زمین دینا ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوا باقی ائمہ ثلاثہ اور علماء سلف و خلف مزارعت کے قائل ہیں۔

خیبر کے یہود کو آپؐ نے زمین جس شرط پر دی تھی اس کی رو سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے جتنے کام بھی ہوتے ہیں سب ان کے ذمہ تھے۔ جیسے زمین سیراب کرنا، نہروں کی صفائی و کھدائی، گھاس پھونس سے فصل کو محفوظ رکھنا وغیرہ۔ احناف نے خیبر کے معاملہ کی جو تاویل کی ہے کہ یہ لوگ آپؐ کے غلام تھے صحیح نہیں ہے کیونکہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ نفرکم ما افرکم اللہ ہم تمہیں صرف اس وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک تمہیں اللہ تعالیٰ برقرار رکھے گا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے غلام نہیں تھے۔ تو پھر احناف کی یہ تاویل بھی باطل اور مردود ہے کہ وہ آپؐ کے غلام تھے۔

(۷۶۸) وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ، حضرت حنظلہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں قَالَ: سَأَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيجٍ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ إِكْرَاءِ الْأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، فَقَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ، إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُونَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْمَادِيَانَاتِ، وَأَقْبَالِ الْجَدَاوِلِ، وَأَشْيَاءَ مِنَ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هَذَا وَيَسْلُمُ هَذَا، وَيَسْلُمُ هَذَا، وَيَسْلُمُ هَذَا وَيَهْلِكُ هَذَا، وَلَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلَّا هَذَا، فَلِذَلِكَ زَجَرَ عَنْهُ، فَأَمَّا شَيْءٌ

نے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ سونے اور چاندی کے عوض زمین ٹھیکے پر دینا کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں لوگ اپنی زمین اس شرط پر دیا کرتے تھے کہ جو کچھ پانی کی نالیوں اور پانی کے بہاؤ میں پیدا ہوگا اور کچھ حصہ باقی بھیتی کا وہ تو میں لوں گا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا یہ حصہ تباہ و برباد ہو جاتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ اس حصہ میں کچھ پیداوار ہی نہ ہوتی اور لوگوں کو ٹھیکہ اسی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس

مَعْلُومٌ مَّضْمُونٌ، فَلَا بَأْسَ بِهِ. رَوَاهُ سے منع فرمایا تھا۔ پس اگر کوئی چیز مقرر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

وَفِيهِ بَيَانٌ لِّمَا أُجْمِلَ فِي الْمُتَّفَقِ اور اس میں اس کا بھی بیان ہے جسے بخاری و مسلم عَلَيْهِ مِنْ إِطْلَاقِ التَّهْمَةِ عَنْ كِرَاءٍ نے مجمل بیان کیا ہے کہ ”زمین ٹھیکے پر نہ دیا کرو۔“ الْأَرْضِ.

لعنوی تشریح: ﴿ماذیبات﴾ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں ذال کے نیچے کسرہ ہے اور قاضی عیاض نے بعض راویوں سے صحیح مسلم کے علاوہ ذال کے فتح سے بھی بیان کیا ہے۔ یعنی پانی بننے کی جگہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ پگڈنڈیوں کے دونوں جانب کناروں پر اگنے والی چیزیں اور ایک قول یہ بھی ہے جو کچھ چھوٹی چھوٹی ندیوں کے ارد گرد آگتا ہے۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معرب ہے یعنی عجمی لوگ اسے اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ اہل عرب نے بھی اسے عربی شکل دے کر عربی میں استعمال کرنا شروع کر دیا ﴿اقبال الجداول﴾ اقبال میں حمزہ پر فتح قبل کی جمع اور ”جداول“ چھوٹی ندی نالے یعنی ندیوں کے سروں اور ان کے شروع میں پیدا ہونے والی پیداوار۔ یہ حدیث مساقات و مزارعت کی جس صورت کو ممنوع قرار دے رہی ہے، وہ ہے نامعلوم پیداوار اور اس کی مقدار۔ یہ لوگ فاسد شرطیں طے کرتے تھے، ان سے منع کیا گیا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ندیوں، نالوں اور پگڈنڈیوں کے گرد پیداوار کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے جو سالم رہ جاتی تھی اور باقی فصل ساری برباد ہو جاتی تھی یعنی جو مشترک کھیتی باڑی ہوتی وہ برباد ہو جاتی کہ کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس صورت میں دھوکہ و فریب اور کھلا کھلا خطرہ پایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿حفظہ اللہ﴾ بن قیس بن عمرو زرقی انصاری۔ اہل مدینہ کے ثقہ تابعی ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کو مشرف روایت نبویؐ حص حاصل ہے۔

(۷۶۹) وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ حَضْرَتِ ثَابِتِ بْنِ ضَحَّاكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَنْهَ عَنِ الْمَزَارَعَةِ، وَأَمَرَ تَحِيكَةً بِالدَّيْنِ فِي إِجَازَتِ مَرَحَتِ فَرَمَائِي. (مسلم)

بِالْمُؤَاجَرَةِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ أَيْضًا. لعنوی تشریح: ﴿بالمواجرة﴾ سونے یا چاندی کے عوض زمین ٹھیکے پر دینا۔ یہ حدیث مزارعت کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور بظاہر ان احادیث کے معارض و مخالف ہے جن میں اس کی اجازت دی گئی ہے مگر ابوداؤد میں حضرت عروہ کی روایت سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رافع بن خدیج رحمہ اللہ کو معاف فرمائے، میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس حدیث کا مجھے ان سے زیادہ علم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو انصاری آدمی آئے۔ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اگر تمہاری یہ حالت ہے

لغوی تشریح: ﴿کسب الحجام خبیث﴾ گھٹیا اور رذیل پیشہ ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حرام پیشہ ہے۔ لفظ غبیث مطلق طور پر بول کر اس سے رذیل اور گھٹیا مراد لیتے ہیں۔ جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ولا تیمموا مخبیث منه تنفقون (۲: ۲۷۷) لہذا ردی مال اور گھٹیا چیز کو غبیث کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں ورنہ وہ حرام نہیں ہے۔ جمہور علماء پیشہ حجام کو مباح سمجھتے ہیں۔ دلیل کے اعتبار سے یہی رائے قوی اور مضبوط ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(۷۷۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ عَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكْلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿اعطی بی﴾ یعنی اس نے میرا نام لے کر قسم کھائی، حلف لیا اور میرے نام سے معاہدہ کیا یا میرے نام پر کسی کو امان دی اور جو میں نے اپنے دین میں مقرر کیا ہے۔ (سبل السلام) ﴿استوفی منہ﴾ یعنی اس سے کام تو پورا اور مکمل لیا۔

(۷۷۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْنُمُ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تعلیم، کتابت و طباعت وغیرہ کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ و مالک رحمہ اللہ اور امام اسحق رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تعلیم قرآن کی تنخواہ لینا ناجائز ہے۔ البتہ اگر کوئی آدمی کسی سے طے کئے بغیر تعلیم حاصل کرتا ہے اور از خود اپنی مرضی سے استاذ کی مالی امداد کرتا ہے تو اسے کسی نے ناجائز نہیں کہا۔

(۷۷۴) وَعَنْ ابْنِ عَمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: "مُزَوَّرٌ كُوِ اسَ كِي مُزَوَّرِي اسَ كَا پِئِنَهٗ" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مُزَوَّرٌ كُوِ اسَ كِي مُزَوَّرِي اسَ كَا پِئِنَهٗ"

وَفِي الْبَابِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ عَنْهُ عِنْدَ أَبِي يَعْلَى وَابْنِ مَرْزُوقٍ،
وَجَابِرٍ عِنْدَ الطَّبْرَانِيِّ، وَكُلُّهَا

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی

(۷۷۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: «مَنْ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَلْيُنِّمْ لَهُ أَجْرَتَهُ»، رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ، وَوَصَلَهُ السَّيِّدُ مِنْ طَرَفِ أَبِي حَنِيفَةَ.

نفوی تشریح: ﴿فلیستم اجرته﴾ مزدور کی اجرت و معاوضہ بغیر کسی کمی کے پورا دینا چاہیے اور سب السلام مطبوعہ مطبع مصطفیٰ محمد صاحب کتب تجارتیہ مصر ۱۳۵۳ھ کے ایک نسخہ میں ”فلیستم“ ہے جو تسمیہ سے ماخوذ ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ مزدور کو کام پر لگانے سے پہلے مزدوری کا تعین ہونا چاہئے تاکہ عدم تعین کی وجہ سے معاملہ باہمی نزاع اور جھگڑے کی صورت اختیار نہ کر جائے۔

۱۶ - بَابُ إِخْيَاءِ الْمَوَاتِ بے آباد و بنجر زمین کو آباد کرنے کا بیان

(۷۷۶) وَعَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ عَمَرَ أَرْضًا لَيْسَتْ لِأَحَدٍ فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا»، رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. قَالَ عُرْوَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: وَقَصَى بِهِ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهِ.

حضرت عروۃ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے غیر آباد زمین کو آباد کیا۔ وہ اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔“ عروہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسی پر فیصلہ فرمایا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿باب احیاء الموات﴾ ”موات“ کے میم پر فتح اور واؤ مخفف۔ ایسی زمین جو بے کار و بے آباد ہو جس کا کوئی مالک نہ ہو اور نہ کوئی کھیتی باڑی، یا بغلانی یا تعمیرات کے ذریعہ اس سے فائدہ حاصل کرتا ہو۔ اور اسے آباد کرنے سے مراد اس میں کھیتی باڑی یا بغلانی یا کوئی تعمیراتی کام کرنا یا کنواں کھودنا اور اسے پختہ کر کے اس کی طرف پانی جاری کرنا۔ ﴿عمر﴾ میم پر تشدید اور تخفیف یعنی آباد کیا، تعمیر کیا۔ ﴿فہو احق بہا﴾ یہ زمین اسی کی ملکیت ہوگی خواہ وہ زمین آباد کاری کے قریب ہو یا بعد (حکمران و سربراہ)

نے اس کی اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ یہ جمہور کا قول ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مطلقاً امام کے اذن و اجازت کی شرط لگائی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف وہ زمین جو اہل قریہ کے قریب ہو اس کے بارے میں امام کی اجازت ضروری ہے اور قریب کا ضابطہ یہ ہے کہ آباد ہونے والوں کیلئے اپنے جانوروں کو چرانا اور ان کی حفاظت وغیرہ جس میں آسان ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بے آباد و بنجر زمین کو جو آباد کر لے وہ اسی کی ملکیت میں آجاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی مسلمان یا ذی کی ملکیت میں نہ ہو۔ اس میں بادشاہ وقت کی اجازت کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے البتہ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام و بادشاہ سے اس وقت اجازت لی جائے گی جبکہ وہ زمین آبادی کے قریب واقع ہوگی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تو ہر صورت میں بادشاہ سے اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ حکم بھی صرف مسلمان کے لئے ہے کافر کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے

(۷۷۷) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ أَحْبَبَ أَرْضًا مَيْتَةً، فَهِيَ لَهُ». رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَحَسَنُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: رَوَاهُ مُرْسَلًا، وَمَوْحَاً قَالَ، وَاخْتَلَفَ فِيهِ صَحَابِيُّهُ، فَقِيلَ: جَابِزٌ، وَقِيلَ: عَائِشَةُ، وَقِيلَ: اخْتَلَفَ فِيهِ. قَالَ: رَوَاهُ ابْنُ عُثْمَانَ، وَالرَّاجِعُ الْأَوَّلُ.

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”جس کسی نے بے آباد و بے کار پڑی زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ملکیت ہے۔“ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن کہا ہے اور یہ بھی روایت کیا ہے کہ اسے مرسل بھی روایت کیا گیا ہے اور وہ اسی طرح ہے جس طرح کہا ہے۔ اس حدیث کے صحابی میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں اور

کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ مگر راجح قول پہلا ہی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارضاً میتہ میتہ میں ”یا“ مخفف بھی ہے اور اس پر تشدید بھی۔ یہ وہ زمین ہے جسے ابھی تک آباد نہ کیا گیا ہو۔ اسے آباد کرنے کو زندہ کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور بیکار چھوڑے رکھنے کو اس کی موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حاصل کلام: ان دونوں احادیث میں زمین کو آباد کرنے اور اس میں فصل بونے، باغ لگانے، پانی محفوظ کرنے کیلئے کنواں وغیرہ کھودنے کی اجازت ہے کہ جو کوئی بے آباد زمین آباد کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔ گویا اسلام میں بیکار زمین پڑھی رہنے کا قصور نہیں۔ اسے بہر نوع آباد ہونا چاہئے کسی ملک کے استحکام کا بھی یہی تقاضا ہے اور اس سے انفرادی ملکیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

(۷۷۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ أَحْبَبَ أَرْضًا مَيْتَةً، فَهِيَ لَهُ». رَوَاهُ ابْنُ عُثْمَانَ، وَالرَّاجِعُ الْأَوَّلُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ معب اللہ تعالیٰ عَنْهُمَا، أَنَّ الصَّعْبَ بْنَ بَشَامَةَ لَيْثِيٍّ رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

جَنَامَةُ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فرمایا کہ ”اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کیلئے اَحْبَرُهُ، اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا جَائِزَ نَمِيسٍ كَمَا وَهَ اِپَنے لئے چرگاہ مخصوص کر لے۔“ حِمَى إِلَّا لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لاحمی﴾ حمی میں ”حا“ کے نیچے کسرہ اور میم پر فتح خفیفہ۔ ﴿محمی﴾ یعنی چرگاہ۔ ایسی جگہ جہاں لوگوں اور جانوروں کا داخلہ ممنوع ہو تاکہ اس میں گھاس بکثرت پیدا ہو ﴿اللا للہ ورسولہ﴾ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ سربراہ مملکت زمین کا کچھ حصہ مخصوص کر لیتا ہے تاکہ صدقہ کے اونٹ اور جہاد کیلئے رکھے ہوئے تیار گھوڑوں اور اپنی سواری کے اونٹوں کو جنہیں راہ خدا میں کام لانے کیلئے رکھا گیا ہو وہاں چرنے کیلئے رکھا جائے اور سربراہ مملکت کے علاوہ دوسرا کوئی ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔ ”نہایہ“ میں ہے کہ دور جاہلیت میں رئیس لوگ جب چاہتے اونچی جگہ پر کتا لے جاتے اور وہ بھونکتا، جہاں اس کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی وہ ساری زمین اپنے لئے مخصوص قرار دے لیتے کہ ان کے علاوہ دوسرا کوئی اپنا جانور چرانے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور وہ خود اس ساری زمین میں عوام کے ساتھ اپنے کو شریک سمجھتا، جہاں ان کے جانور چرتے تھے۔ نبی ﷺ نے اس قسم کی ذاتی تخصیص کو ممنوع قرار دے دیا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ بے آباد زمین کو آباد کر کے اسے ملکیت میں لینا اللہ اور اس کے رسول کے چرگاہ کو مخصوص کرنے کے منافی نہیں ہے۔ سب اہل اسلام کیلئے کوئی منفعت نہیں رہتی تھی اور دوسری صورت ایسی تھی جس کی منفعت سب کیلئے یکساں تھی۔ سب لوگ اس میں شامل ہوتے اور اس کی لوگوں کو ضرورت بھی تھی۔ لہذا اب ناسین و جانشین خلفاء جہاد کے گھوڑوں اور اونٹوں کو چرانے کیلئے کچھ زمین مخصوص کر سکتے ہیں۔ اپنی ذات کیلئے ایسا کرنا کسی کیلئے بھی جائز نہیں ہے۔

(۷۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى انْهِ (حضرت ابن عباسؓ) سے روایت ہے کہ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”اپنے بھائی کو ایسا ضرر «لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةٍ، وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ مَثَلُهُ، وَهُوَ فِي الْفَوْظِ مُرْسَلٌ. پھینکانا کہ اس کے حق میں کمی واقع ہو جائے اور پھینکائی گئی اذیت و ضرر سے زیادہ ضرر و نقصان پھینکانا جائز نہیں۔“ (اسے احمد، ابن ماجہ دونوں نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ میں ابوسعید کے حوالہ سے اسی طرح کی حدیث منقول ہے اور وہی حدیث مؤطا میں مرسل ہے)

لغوی تشریح: ﴿لاضرر﴾ ضرر میں ”ضاد“ اور ”را“ دونوں پر فتح۔ ضرر، نفع کی ضد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو ایسی تکلیف و اذیت نہ دے جس سے اس کے حق میں کمی واقع ہو جائے ﴿ولا ضرار﴾ ضرر میں ضاد کے نیچے کسرہ ہے جس کے معنی تکلیف دینا، دکھ پھینکانا۔ وہ اس طرح کہ جتنا کسی نے اسے ضرر و نقصان پھینچا اس سے زیادہ تکلیف نہ دے۔ اس حدیث کو اس باب میں داخل کرنے سے

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک زیر اصول بیان ہوا وہ یہ کہ نہ کسی کو ضرر پہنچاؤ اور نہ ضرر کا خود شکار بنو۔ گویا کسی کو بلاوجہ ضرر و اذیت میں مبتلا کرنا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔ جب کسی کو خود تکلیف دے گا تو ظاہر ہے مخالف بھی اسے اذیت دینے کی کوشش کرے گا تو اس نے گویا از خود اپنے آپ کو اذیت اور ضرر رسائی کا نشانہ و هدف بنایا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ حدود الیہ کا نفاذ و اجراء اس حدیث کے ضمن میں نہیں آتا اس لئے کہ وہ امر الہی کی تعمیل ہے نہ کہ اپنے وہم و گمان کی پیروی۔

(۷۸۰) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حَضَرْتُ سَمْرَةَ بْنَ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَحَاطَ حَائِطًا عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی انفرادی ملکیت نیز زمین کے ارد گرد دیوار بنانا ثابت ہوتا ہے۔

(۷۸۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُغْفَلٍ. حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَفَرَ بَرًّا فَلَهُ أَرْبَعُونَ ذِرَاعًا، عَطَا لِمَا شِئْتَهُ». رواه ابن ماجه. وہاں مال مویشی باندھنے کیلئے چالیس ہاتھ زمین اس کی ہے۔ (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من حفريش﴾ بے آباد و بخر زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو، اس میں کنواں کھودا ﴿فلہ اربعون ذراعا﴾ وہ شخص کنوئیں کے ارد گرد چالیس ہاتھ زمین کا مالک ہوگا اس لئے کہ اس جگہ کنواں کھود کر اس نے زمین کو آباد کیا اور سرسبز و شاداب کیا ہے۔ ﴿عظنا﴾ عین اور طاء دونوں پر فتح۔ جہاں اونٹ بیٹھتے ہیں اس جگہ کو کہتے ہیں نیز بکریوں کے باڑے کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں بکریاں بیٹھتی ہیں۔

(۷۸۲) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ
أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ
ﷺ أَقْطَعَهُ أَرْضًا بِحَضْرَمَوْتٍ. رَوَاهُ

حضرت علقمہ بن وائل نے اپنے باپ وائل رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو حضر موت میں زمین بطور جاگیر عطا فرمائی۔ (اسے ابوداؤد اور

النَّاسُ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ: فِي الْكَلَالِ سَبْ حَصَّةٍ دَارِ هَيْسٍ، بَانِيٍّ أَوْ آكٍ۔“ (احمد و
وَالْمَاءِ وَالنَّارِ۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، ابوداؤد اس کے راوی ثقہ ہیں)
وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ۔

لغوی تشریح: ﴿النار﴾ یہاں آگ سے مراد وہ ایندھن جسے لوگ حصول آگ کیلئے جلاتے ہیں اور ایک
قول یہ بھی ہے اس سے مراد وہ پتھر ہیں جن سے آگ جلائی جاتی ہے جب کہ وہ کوئلہ کی صورت میں
ہوتے ہیں اور بعض نے اس سے چراغ مراد لیا ہے کہ اس کے روشن ہونے سے روشنی حاصل کی جاتی
ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کسی کو کسی بھی انسان نے مخصوص
نہیں کیا مگر گزشتہ احادیث کی بنا پر امام و سربراہ کی مقرر کی ہوئی چراگاہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے۔

۱۷ - بَابُ الْوَقْفِ - وقف کا بیان

(۷۸۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ، إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، جن کا اجر و ثواب اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا
أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ۔ علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہو،
يَدْعُو لَهُ»۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔
صلح اولاد جو مرنے والے کیلئے دعا کرے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الوقف﴾ لغوی معنی روکنا، محسوس رکھنا اور شرعی طور پر وقف کے یہ معنی ہیں
کہ کسی چیز کی اصل محفوظ رکھتے ہوئے مباح جگہ پر خرچ کرنا اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے
فائدہ اٹھانا، اسے فروخت یا ہبہ وغیرہ نہ کرنا۔ اللہ کی راہ میں دے دینا جس سے عوام فائدہ اٹھائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کو بعض اعمال کا ثواب
پہنچتا ہے۔ اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ صدقہ جاریہ، ایسا صدقہ جس کو عوام کی بھلائی کیلئے وقف
کر دیا جائے مثلاً سرائے تعمیر کرنا، کنواں، نل وغیرہ لگوانا، مساجد کی تعمیر کروانا، کوئی ہسپتال تعمیر کروانا، پل،
سڑک بنوانا ان میں سے جو کام بھی وہ اپنی زندگی میں کر جائے یا اس کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وہ سب
صدقہ جاریہ شمار ہوں گے علم میں لوگوں کو دینی تعلیم دینا، دلوانا، طلباء کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا۔
تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ قائم کر جانا، مدارس کی تعمیر، دینی کتب کی طباعت و نشر و
اشاعت کا بندوبست کرنا وغیرہ۔ صلح اولاد میں بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ کے علاوہ روحانی اولاد
بھی شامل ہو سکتی ہے جسے علم دین سے آراستہ کیا ہو۔ ان کو راہ راست اور صراط مستقیم کی روشنی دکھائی
اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچالیا۔ صلح اولاد مرنے والے کو اپنے نیک و صلح

عمل کے ذریعہ اور نمازوں میں دعاؤں میں یاد رکھتی ہے اس کیلئے گناہوں کی معافی اور بلندی درجات کی دعا کرتی ہے۔ یہ دراصل مرنے والے کے اپنے عمل کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو اسے مرنے کے بعد بھی ملتا ہے۔

(۷۸۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: أَصَابَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ تَعَالَى عَنْهُ أَرْضاً بِحَيْرٍ، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ يَسْتَأْذِنُ فِيهَا، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي أَصَبْتُ أَرْضاً بِحَيْرٍ، لَمْ أَصِبْ مَالاً قَطُّ هُوَ أَنْفَسُ عِنْدِي مِنْهُ، قَالَ: إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَضْلَهَا، وَتَصَدَّقْتَ بِهَا، قَالَ: فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ لَا يُبَاعُ أَضْلَهَا، وَلَا يُورَثُ، وَلَا يُوهَبُ، فَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ، وَفِي الْقُرْبَى، وَفِي الرِّقَابِ، وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَابْنِ السَّبِيلِ، وَالضَّيْفِ، لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلَّيَهَا أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ، وَيُطْعِمَ صَدِيقاً، غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ مَالاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (میرے باپ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کے علاقہ میں زمین ملی تھی۔ (میرے باپ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں مشورہ طلب کرنے کیلئے حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! مجھے خیبر میں کچھ زمین حاصل ہوئی ہے ایسی نفیس و قیمتی کہ اس سے پہلے کبھی بھی ایسی زمین مجھے نہیں ملی۔ میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ”اگر چاہو تو اصل کو اپنے پاس روک لو اور اس کی پیداوار صدقہ کر دو۔“ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو فقیروں، قربات داروں، غلاموں کو آزاد کرنے میں اور راہ خدا میں، راہ چلتے مسافروں اور مہمانوں کی مہمان نوازی کیلئے وقف کر دیا اور وصیت بھی کر دی کہ اس کا منتظم و نگہبان معروف طریقہ کے مطابق خود بھی کھا سکتا ہے اور احباب و رفقاء کو بھی کھلا سکتا ہے۔ مگر مال کو ذخیرہ بنا کر نہ رکھے۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اس کے اصل کو صدقہ کر دیا یعنی وقف کر دیا جو نہ فروخت کیا جائے گا اور نہ ہب کیا جائے گا لیکن اس کی پیداوار، راہ خدا میں خرچ کی جائے گی۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: تَصَدَّقَ بِأَضْلَهَا: لَا يُبَاعُ، وَلَا يُوهَبُ، وَلَكِنْ يُنْفَقُ ثَمَرُهُ.

لغوی تشریح: ﴿اصاب عمر﴾ مال غنیمت کے حصہ میں سے پایا ﴿ارضاً بحیر﴾ یعنی خیبر کی زمین سے، اس زمین کا نام ثغ تھا۔ ﴿یستامرہ﴾ آپ سے مشورہ طلب فرمایا ﴿انفس﴾ نہایت عمدہ اور بہت ہی نفیس و قیمتی، گراں قدر ﴿حبست﴾ میں ”با“ پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح، روک لے۔ ﴿وتصدق بها﴾ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ یعنی پھل وغیرہ، صدقہ کر دے ﴿فی القربی﴾ اس سے مراد قریبی رشتہ دار ﴿وفی الرقاب﴾ رقاب میں ”را“ کے نیچے کمرہ اور رقبہ کی جمع ہے مراد وہ

خرید و فروخت کے مسائل 609

غلام ہیں جنہوں نے پروانہ آزادی کیلئے مالک سے رقم طے کر کے مکاتبت کر لی ہو کہ اتنی رقم ادا کر کے وہ آزاد ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے یہ بھی مراد ہو کہ غلاموں کو خرید کر آزادی کی نعمت سے سرفراز کر دے۔ ﴿لا جناح علی من ولیہا﴾ یعنی جو شخص ان کی نگرانی و تمکبانی اور حفاظت کا ذمہ دار بنے اس کیلئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ﴿ان یاکل منہا بالمعروف﴾ کہ معروف عادت و رواج کے مطابق اس سے اپنے کھانے کیلئے اور اپنی ضرورت کی حد تک لباس کیلئے لے سکتا ہے ﴿غیر متمول مالا﴾ یعنی مال جمع کرنے والا نہ ہو۔ گرانہ میں یہ ولیہا کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں وقف کرنے اور پھر اسے آگے فروخت کرنے اور بہہ کرنے سے منع فرمایا۔ یعنی جو چیز وقف کر دی جائے اسے پھر فروخت نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے بہہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ حدیث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وقف کے فروخت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو یہ حدیث پہنچ جاتی تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔

(۷۸۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ، أَلْحَدِيثَ، مَقْرَرًا كَرِهِيحًا. (الحدیث) اور اس میں ہے کہ ”رہا وَفِيهِ «فَأَمَّا خَالِدٌ، فَقَدْ اخْتَبَسَ خَالِدٌ (رحمہ اللہ) تو اس نے اپنی تمام زرہیں اللہ کے راستے أَذْرَاعُهُ وَأَغْنَاهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. مُتَّفَقٌ میں وقف کر دی ہیں۔“ (بخاری و مسلم) غلّیہ۔

لعنوی تشریح: ﴿الحدیث﴾ مکمل حدیث یوں ہے کہ ابن جمیل، خالد بن ولید اور عباس بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے چچا نے زکوٰۃ نہ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ابن جمیل تو اس چیز کا بدلہ لیتا ہے کہ وہ فقیر و محتاج تھا اللہ تعالیٰ نے اسے مالدار کر دیا اور خالد کا معاملہ تو یہ ہے کہ تم لوگ خالد سے ناانصافی کر رہے ہو اس نے تو اپنی ساری زرہیں راہ خدا میں وقف کر دی ہیں اور عباس کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ میرے ذمہ ہے۔ میں فرض زکوٰۃ بھی دوں گا اور اتنی ہی مزید بھی۔“ ﴿اداع﴾ دین کی جمع ہے یعنی زرہ۔ ﴿واعناد﴾ اعتد کی جمع ہے عین اور تا دونوں پر فتح ہے۔ اس کے معنی ہیں جہاد فی سبیل اللہ کیلئے از قلم اسلحہ و سامان جنگ اور جانور کو تیار رکھنا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ کے مال میں سے وقف کرنا بھی صحیح ہے۔ بایں طور کہ اس رقم سے آلات حرب و ضرب جہاد فی سبیل اللہ کیلئے حاصل کئے جائیں اور یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ساز و سامان اور حیوان کو بھی وقف کرنا درست ہے۔ اس لئے کہ ”اعتاد“ کی تفسیر جہاد کیلئے گھوڑا تیار رکھنا گئی ہے اور یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ زکوٰۃ کو آٹھ مصارف زکوٰۃ میں سے صرف

ایک پر خرچ کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿خالد بن ولید﴾ ابو سلیمان ان کی کنیت ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے: خالد بن ولید بن مغیرہ مخزومی قرشی۔ ان کی والدہ کا نام عصماء تھا اور انہی کو لبابہ صغریٰ بھی کہا گیا ہے۔ یہ حارث کی بیٹی تھی اور لبابہ یعنی ام فضل زوجہ عباسؓ کی چھوٹی بہن تھی۔ حضرت خالدؓ نے فتح مکہ سے پہلے ۸ھ میں اسلام قبول کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے ۵ھ یا ۶ھ میں اسلام قبول کیا۔ فتح مکہ، غزوہ حنین اور تبوک میں حاضر رہے اور غزوہ موتہ کے روز ان کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔ نبی ﷺ نے ان کو سیف اللہ کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فتنہ ارتداد کے موقع پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ اس کے بعد اہل فارس سے نبرد آزما ہوئے۔ پھر ان کو شام کی طرف بھیجا انہوں نے شام کا اکثر علاقہ فتح کیا۔ حضرت عمرؓ کے معزول کرنے تک وہ فوج کے قائد رہے۔ معزولی کے بعد حمص جاگزیں ہو گئے۔ تادم آخریں یہیں قیام پذیر رہے۔ ۲۱ھ میں وفات پائی اور حمص سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ایک بستی میں ان کو دفن کیا گیا۔

۱۸ - بَابُ الْهَبَةِ وَالْغَمَرِ وَالزُّقْبَىٰ هَبْ، عَمْرُؤُاُ اور رُقْبَىٰ کا بیان

(۷۸۸) عَنْ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَبَاهُ أَتَى بِهِ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: إِنِّي نَحَلْتُ أَبْنِي هَذَا غَلَامًا كَانَ لِي، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحْلَتَهُ مِثْلَ هَذَا؟» فَقَالَ: لَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: فَأَرْجِعْهُ. وَفِي لَفْظٍ: فَأَنْطَلَقَ أَبِي النَّبِيِّ ﷺ لِيُشْهِدَهُ عَلَى صَدَقَتِي، فَقَالَ: أَفَعَلْتُ هَذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: «اتَّقُوا اللَّهَ، وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ»، فَرَجَعَ أَبِي فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ ان کے والد ان کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے اپنا ذاتی غلام اپنے اس بیٹے کو ہبہ کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا ”کیا تو نے اپنی ساری اولاد کو اس طرح (غلام) ہبہ کیا ہے؟“ اس نے کہا نہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تو پھر اسے واپس کر لو“ اور ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ میرے والد صاحب نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ میرے ہبہ پر آپؐ کو گواہ بنائیں۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا ”کیا تو نے ایسا اپنی ساری اولاد کے ساتھ کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ”اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کرو۔“ چنانچہ میرے والد نے وہ ہبہ واپس کر لیا۔ (بخاری و مسلم)

خرید و فروخت کے مسائل 611

وَفِي رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: قَالَ: فَأَشْهَدُ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ عَلٰی هَذَا غَيْرِي، ثُمَّ قَالَ: «أَيْسُرُكَ» نے فرمایا تو پھر میرے سوا اس پر کسی اور کو گواہ اَنْ يَكُونُوا لَكَ فِي الْبَرِّ سَوَاءً» قَالَ: بنی لو پھر آں حضور ﷺ نے فرمایا ”کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تیری ساری اولاد تیرے ساتھ یکساں بلی. قال: «فَلَا إِذْنٌ». بھلائی کا سلوک کرے؟“ وہ بولا کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا ”پھر تو ایسا مت کر۔“

لعنوی تشریح: ﴿باب الهبة الخ﴾ جب اس عطیہ و تحفہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی عوضانہ کے دیا جائے اور عمری عین کے ضمہ اور میم ساکن ہبلی کے وزن پر ہے عمر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ایک آدمی اپنا مکان دوسرے کو دینا اور یوں کہتا کہ میں نے یہ مکان تاحیات تجھے دیا تاحیات اسی عطیہ کو عمری کہا جاتا ہے اور رقبی بھی ہبلی کے وزن اور وہ اس طرح کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ یہ مکان تیرا ہے۔ اس شرط پر اگر میں مر جاؤں تو یہ مکان تیرا اور اگر تو مر گیا تو میں مکان واپس لے لوں گا۔ گویا ہر ایک ان میں سے دوسرے کی موت کے انتظار میں رہتا اس لئے اسے رقبی کہتے ہیں۔ ﴿نحلت﴾ اعطیت اور وصیت کے معنی میں ہے یعنی تو نے عطیہ دیا اور تو نے جب کیا ہے۔ ﴿فارجعه﴾ اپنا جبہ کیا ہوا غلام واپس لوٹا لے۔ ﴿لشہد﴾ تاکہ اس جبہ و عطیہ پر آپ کو گواہ بنائے۔ یہ اشعاد سے ماخوذ ہے یعنی ایسا اس نے اس غرض کیلئے کیا کہ وہ آپ کو شاهد و گواہ بنائے ﴿فأشهد علی هذا غیری﴾ اشہد امر کا صیغہ ہے آپ نے یہ بھی اس لئے فرمایا کہ یہ فعل آپ کی نظر میں غیر پسندیدہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں ظلم و بے انصافی پر گواہ نہیں بنتا۔ ﴿فلا إذن﴾ تو اپنی اولاد کے درمیان عطیہ دینے میں تفریق نہ کر اور نہ ہی ایک کو دوسرے پر برتری و فضیلت دے جبکہ تیری خواہش ہے کہ تیرے ساتھ تیری اولاد کا نیکی و بھلائی میں یکساں سلوک ہو۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اولاد کو عطیہ دینے میں مساویانہ سلوک کرنا چاہئے۔ جب برابری اور مساوی طور پر نہ ہو تو یہ باطل ہے مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ مساوی سلوک مندوب ہے۔ عطیہ وہبہ میں کسی کو زیادہ دینے سے جبہ باطل نہیں ہوتا۔ مگر افسوس کہ کیا ترک ندب کا نام جور و ظلم رکھا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آپؐ نے برابری نہ کرنے کو جور و ظلم قرار دیا ہے جبکہ انہوں نے عطیہ میں برابری کو مندوب کہا ہے واجب قرار نہیں دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد میں عطیات کی مساویانہ تقسیم واجب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ، ثوری رحمہ اللہ اور اسحق رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے کہ جب برابری نہ ہو تو وہبہ باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا بشیر کو یہ فرمانا کہ غلام کو واپس لے لو اسی کی تائید کرتا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لڑکا اور لڑکی سب کو برابر برابر دینا چاہئے مگر جمہور علماء کے نزدیک برابری مستحب ہے، واجب نہیں۔

612 خرید و فروخت کے مسائل

(۷۸۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «الْعَانِدُ فِي هَبْتِهِ كَالْكَلْبِ يَقْبِئُ ثُمَّ يَعُودُ فِي قَيْئِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. لِيَتَأَمَّلَ. " (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہبہ کر کے اسے واپس لینے والا اس کے کالکلب کی طرح ہے جو خود قے کرتا ہے اور پھر اسے کھا لیتا ہے۔" (بخاری و مسلم) میں ہے کہ "ہمارے لئے اس سے بری مثال اور السوء، الَّذِي يَعُودُ فِي هَبْتِهِ كَالْكَلْبِ يَقْبِئُ ثُمَّ يَرْجِعُ فِي قَيْئِهِ". ہے وہ اس کتے کی مانند ہے جو خود ہی قے کرتا ہے اور پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔"

لغوی تشریح: یہ حدیث ہبہ کردہ چیز کو واپس لینے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے البتہ والد اس سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ اس سے آئندہ حدیث میں ہے۔ والد نے جو ہبہ اپنی اولاد کو کیا اسے مستثنیٰ قرار دیتی ہے۔ مگر حنفیہ کا مذہب ہے کہ ہبہ کردہ چیز کو واپس لینا حلال ہے اور بعض نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ آنحضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا لفظ ﴿كَالْكَلْبِ﴾ اس کی عدم حرمت پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ کتا تو غیر مکلف ہے اور اس کی اپنی قے اس کیلئے حرام نہیں ہے۔ حالانکہ جب کتا غیر مکلف ہے تو یہ کتنا صحیح نہیں ہے کہ اس کی قے اس کیلئے حلال ہے یا حرام۔ کیونکہ تحلیل و تحریم ان فروع میں سے ہے جس کا کسی کو مکلف بنایا گیا ہو۔ جیسا کہ شجر و حجر (درخت اور پتھر) کے بارے میں یہ کتنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اندھا اور بیٹا ہے اس لئے کہ وہ اندھے پن اور بصارت کا محل ہی نہیں۔ لہذا اس حدیث میں تشبیہ، تحلیل یا تحریم کے اعتبار سے ہی نہیں اور جب ان دونوں وجوہ میں سے کسی وجہ سے تشبیہ کا امکان نہیں تو پھر اصل میں تحلیل یا تحریم پر دلالت باقی ہی نہیں رہتی۔ تحریم تو نص صریح سے ثابت ہوتی ہے اور اس کا مرجع بھی متعین ہوتا ہے اور جہاں تک تشبیہ کا تعلق ہے اس سے حرام کو بہت قبیح صورت میں پیش کرنا اور اسے قابل نفرت بنانا اور اس کے نہایت برے منظر کو دکھانا مقصود ہے۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ انسان کیسے راضی ہو جاتا ہے کہ وہ کتے کے درجہ میں گر جائے۔ پھر اس درجہ میں اتر جائے کہ پہلے قے کرے اور پھر اپنی قے چاٹ لے۔

(۷۹۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ مُسْلِمٍ أَنْ يُعْطِيَ الْوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي بَنِيهِ». (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "کسی مسلم مرد کیلئے حلال نہیں ہے کہ عطیہ دے کر واپس لے۔" بجز والد کے کہ وہ اپنی اولاد کو دیئے گئے عطیہ کو واپس لے سکتا ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور

وَلَدَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ تَرْمِذِيُّ ابْنِ حَبَانَ وَابْنُ جَبَّانٍ وَالْحَاكِمِيُّ.

حاصل کلام: عطیات دینا اسلامی معاشرے میں محبت و مودت کی علامت ہے۔ تحفہ تحائف آپس میں دینے چاہئیں۔ دے کر واپس لینا صرف والد کے سوا باقی کسی کیلئے جائز نہیں۔ جمہور کا مذہب تو یہی ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذوی الارحام کے سوا باقی سے واپس لینا جائز ہے مگر یہ اور سابقہ حدیث ان کے موقف کے صراحتاً مخالف ہے۔

(۷۹۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سَے روایت ہے کہ رسول اللہ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَهْدِيهِ وَتَحْفَهُ قَبُولَ فَرَأَيْتُهُ تَحْتَهُ أَوْ اس کے بدلہ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ، وَيُنِيبُ عَلَيْهَا. رَوَاهُ میں کچھ عنایت بھی فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿یُنِيبُ عَلَيْهَا﴾ اس کے بدلہ و عوض میں کچھ عنایت فرماتے تھے۔ یہاں ثواب سے مراد ہے اس کے بدلہ میں دینا۔

حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کر رہی ہے کہ تحفہ قبول کرنا اور اس کا بدلہ دینا سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ آپ ہدیہ و تحفہ کا بدلہ بہتر صورت میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ اگر کسی کے پاس حدیہ دینے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم اس کیلئے جزاک اللہ خیراً کی دعا کا تحفہ ضرور دینا چاہئے۔ اگر کسی نے دوسرے کو تحفہ اس نیت و خیال سے دیا کہ وہ بھی ضرور تحفہ دے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ باطل ہے اور دوسرے کہتے ہیں کہ جائز ہے۔

(۷۹۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: وَهَبَ رَجُلٌ لِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ نَاقَةً، فَأَثَابَهُ عَلَيْهَا، فَقَالَ: رَضِيتُ؟ قَالَ: لَا، فَرَاَدَهُ، فَقَالَ: رَضِيتُ؟ قَالَ: لَا، فَرَاَدَهُ، فَقَالَ: رَضِيتُ؟ فَقَالَ: نَعَمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانٍ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اونٹنی بہہ کی۔ آپ نے اس آدمی کو کچھ ہدیہ عنایت فرمایا اور دریافت فرمایا کہ ”کیا تو راضی ہے؟“ اس نے جواب دیا، نہیں! پھر مزید کچھ مرحمت فرما کر پوچھا کہ ”اب تو خوش ہے؟“ اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے اسے مزید برآں دے کر دریافت فرمایا کہ ”اب تو راضی ہے؟“ بولا، ہاں۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تحفہ و ہدیہ قبول کرنا اور اس کے عوض میں کوئی چیز دینا جائز

614 ————— خرید و فروخت کے مسائل

ہے۔

(۷۹۳) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَعْدِ بْنِ جَابِرٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «الْعُمَرَى لِمَنْ وَهَبَتْ لَهُ». مُتَّفَقٌ (بخاری و مسلم) عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: أُمِسِّكُوا عَلَيْكُمْ أَمْوَالَكُمْ، وَلَا تُفْسِدُوهَا، فَإِنَّهُ مَنْ أَغْمَرَ عُمَرَى، فَهِيَ لِلَّذِي أَغْمَرَهَا، حَيًّا وَمَيِّتًا، وَلِعَقِبِهِ.

وَفِي لَفْظٍ: إِنَّمَا الْعُمَرَى الَّتِي أَجَارَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَقُولَ: هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ، فَأَمَّا إِذَا قَالَ: هِيَ لَكَ مَا عَشْتُ، فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا.

وَلَا بِنِ دَاوُدَ وَالسَّائِي: لَا تُرْفِقُوا، وَلَا تُغْمِرُوا، فَمَنْ أَرْقَبَ شَيْئًا، أَوْ

أَغْمَرَ شَيْئًا، فَهُوَ لَوَرَثَتِهِ.

ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ”تم نہ رقبی کرو اور نہ عمری۔ پس جس شخص نے کوئی چیز رقبی کی یا عمری میں دی تو وہ اس کے ورثاء کیلئے ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿العمری لمن وهبت له﴾ وہب لہ کا فعل صیغہ مجہول ہے، مطلب یہ ہے کہ چیز کو لینے والا اپنے قبضہ میں پوری طرح لے گا اور پہلے کی طرف واپس نہیں کی جائے گی۔ ﴿فہی للذی اعمرھا﴾ پس یہ چیز اس کی ملکیت ہوگی جس کیلئے عمری کی گئی۔ اگر اس جگہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی جس کیلئے عمری کیا گیا اسی کی ملکیت ہوگی۔ ﴿حیا ومیتا﴾ جب تک زندہ رہے گا اس پر اس کا قبضہ ہوگا اور مرنے کے بعد اس کے وارث اس کے مالک ہوں گے یعنی اولاد وغیرہ اور دینے والے کی جانب کسی صورت بھی واپس نہیں ہوگی۔ ﴿ولعقبہ﴾ عین پر فتح اور قاف کے نیچے کسرہ اور اسے ساکن پڑھنا بھی جائز ہے۔ انسان کی نسلی اولاد۔ یعنی اس کی وفات کے بعد وہ اس چیز کی وارث ہوگی ﴿انما العمری النسی اجازھا﴾ وہ عمری جسے رسول اللہ ﷺ نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عمری حاصل کرنے والا اس کا

(۷۹۴) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِيهِ سَيْلٌ لِلَّهِ، فَأُضَاعَهُ صَاحِبُهُ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ بَائِعُهُ بِرُحْصٍ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: «لَا تَبْتِعُهُ، وَإِنْ أَعْطَاكَ بِدْرَهُمْ»
الْحَدِيثُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک گھوڑا اللہ کے راستہ میں ایک آدمی کو سواری کیلئے دیا۔ اس نے اسے ناکارہ کر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ اسے سستے داموں بیچنے والا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں اسے خرید سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا ”تمہیں اگر یہ گھوڑا ایک درہم کے عوض بھی دے تب بھی نہ خریدو۔“
(الحديث) (بخاری و مسلم)

خرید و فروخت کے مسائل 616

لغوی تشریح: ﴿حملت الخ﴾ میں نے گھوڑا دیا تاکہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اس پر سوار ہو۔ ﴿فاضاعہ﴾ یعنی اس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں بے پروائی و عدم توجہی کی وجہ سے وہ کمزور اور دبلا پتلا ہو گیا۔ ﴿برخص﴾ ”را“ پر ضمہ اور ”خا“ ساکن، غلاء کا متضاد۔ غلاء کے معنی گراں، مرگا اور رخص کے معنی کم قیمت اور سستا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خیرات و صدقہ میں دی ہوئی چیز قیثاً بھی واپس نہیں لینی چاہئے۔ بعض علماء نے اسے خریدنا حرام ٹھہرایا ہے لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ بھی تزییہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو حضور ﷺ نے ان کا خیرات کردہ گھوڑا خریدنے سے منع فرمایا کہ ایسی خاص صورتوں میں فروخت کرنے والا خریدار سے تسامح اور چشم پوشی کر جاتا ہے جس سے فروخت کنندہ کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح جتنی کمی اس چیز کی قیمت میں واقع ہوگی وہ گویا اپنی خیرات کو واپس لینے کے مترادف ہوگی جو جائز نہیں۔

(۷۹۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «تَهَادُوا تَحَابُّوا». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمُفْرَدِ، وَأَبُو يَعْلَى بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔“ (اسے بخاری نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے اور ابو یعلیٰ نے حسن سند سے نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تہادوا﴾ دال پر فتح۔ تہادی سے امر کا صیغہ ہے یعنی باہمی طور پر ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو ﴿تحابوا﴾ ”با“ پر تشدید اور امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے یعنی تمہارے درمیان محبت پیدا ہوگی۔
حاصل کلام: ایک دوسرے کو تحفہ دینا آپس میں محبت کا باعث ہے۔ اسلام محبت و مؤدت کا علمبردار ہے، عداوت و دشمنی کا اس میں کوئی تصور نہیں۔

(۷۹۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَهَادُوا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَسْلُ يَهْدِيهِ بَغْضٍ وَكِينَةٌ تَنْكَالُ دِيْنًا هَبْ». (اسے بزار نے السخيمہ) . رَوَاهُ الْبُزَارِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھے تحائف کا باہمی تبادلہ کیا کرو کیونکہ یہ ہدیہ بغض و کینہ کو نکال دیتا ہے۔“ (اسے بزار نے السخيمہ) . رَوَاهُ الْبُزَارِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿تسل السخيمہ﴾ تسل باب نصرینصر سے ہے اور سخيمہ سین پر فتح اور ”خا“ کے نیچے کسرو۔ یعنی کبر و نخوت اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سین پر ضمہ اور ”خا“ پر فتح یعنی کینہ پوشیدہ دشمنی یعنی وہ دشمنی جو دل میں بیٹھ جائے۔ معنی یہ ہوئے کہ ہدیہ کے ذریعہ بغض و کینہ اور مخفی دشمنی کو نکال دیتا ہے۔

خرید و فروخت کے مسائل 618

عَنْهُ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِتَمْرَةٍ فِي الْطَّرِيقِ، فَقَالَ: «لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ دِكِّهِ كَرَفَمَا: "اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ شاید أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لِأَكْلَتِهَا". نَتَّقُ يَهْ صَدَقَ كِي هُو، تُو مِیں اَسَ ضَرُور كَهَالِيتَا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب اللقطة﴾ لفظ کے لام پر ضمہ اور قاف پر فتح اور کما گیا کہ اس کے ماسوا جائز نہیں۔ مگر خلیل نحوی نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا ہے کہ ”قاف“ ساکن ہے اور ز منحشری کے قول کے مطابق عام لوگوں کی رائے یہی ہے حالانکہ اہل عرب سے ہی سنا گیا ہے کہ اہل لغت اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ قاف پر فتح ہے اور اس کے علاوہ کوئی اعراب نہیں ہے اور لفظ زمین پر گری ہوئی چیز پکڑنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ راستے میں گری پڑی چیز اگر معمولی سی ہو تو اس سے انتفاع جائز ہے اور اسے اٹھانے والے کیلئے اس کا اعلان کرتے رہنا بھی ضروری نہیں۔ بے دھیان اور غفلت میں گری ہوئی چیز کی تین اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز بالکل معمولی سی ہو اور کھانے کے کام آنے والی ہو۔ اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے اٹھا کر صاف کر کے بسم اللہ پڑھ کر نوش کر لیا جائے۔ دوسری یہ کہ وہ چیز ہو تو معمولی نوعیت کی مگر کھانے کے کام آنے والی نہ ہو اس کو تین روز تک لوگوں کے اجتماع میں اعلان کرتا رہے مثلاً معمولی چاقو، چھری، چھری قسم کی چیز یا چابک وغیرہ۔ تیسری یہ کہ وہ چیز قیمتی ہو اس کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ اس کا سال بھر اعلان کرائے۔ فی زمانہ اخبارات، ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ اور مساجد کے باہر بڑے بڑے جلسوں میں اعلان کرایا جاسکتا ہے اگر اشتہار کی صورت میں اسے کچھ مصارف کرنے پڑیں تو مالک لفظ سے وصول کئے جاسکتے ہیں اگر وہ آجائے ورنہ اپنی جیب خاص سے۔ سال بھر اعلان کے بعد بھی اگر اس کا اصل مالک نہ ملے تو اسے استعمال میں لایا جاسکتا ہے پھر بھی اس کی علامات اور نشانیاں ذہن نشین کر لے یا نوٹ کر لے بعد میں بھی اگر اصل مالک آجائے تو اتنی قیمت ادا کرے یا مالک اسے خود چھوڑ دے۔

(۸۰۰) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ حَضَرْتُ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ جَنِي رَسُولَهُ مِنْ مَرُوى هِے كِه اِيك اَدَمِي نَبِي ﷺ كِي خِدْمَت ميں آيا اور اس نے جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَسَأَلَهُ عَنْ اللَّقْطَةِ، فَقَالَ: أَعْرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَاءَهَا، ثُمَّ عَرَفْتُهَا سَنَةً، فَإِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا، وَإِلَّا فَسَأَلْتُكَ بِهَا، قَالَ: آجَائِے تُو اَس كَے سِرْد كر دو ورنہ جو چاہو كرو۔“ پھر فَصَالَةُ الْعَنَمِ؟ قَالَ: هِيَ لَكَ، أَوْ اس نے گم شدہ بکریوں کے بارے میں سوال کیا۔

گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعرف﴾ معرفت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿عفاصھا﴾ عین پر کسرہ۔ وہ برتن وغیرہ جس میں لفظ ملے چڑے کا ہو یا کپڑے وغیرہ کا۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عفاص دراصل اس چڑے کو کہتے ہیں جو بوتل کے منہ پر اسے بند کرنے کیلئے چڑھایا جاتا ہے۔ ﴿وکاءھا﴾ وکاء میں ”واؤ“ کے نیچے کسرہ ہے یعنی وہ دھاکہ، رسی یا تسمہ جس سے تھیلے وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿نم عرفھا﴾ ”را“ پر تشدید۔ یہ تعریف سے امر کا صیغہ ہے یعنی لوگوں کے اجتماع گاہوں اور جمعوں میں اس کا اعلان کرے۔ کہ جس کسی کی فلاں چیز گم ہوگئی ہو وہ مجھ سے طلب کرے۔ ﴿فان جاء صاحبھا﴾ یہ شرط ہے اس کی جزا محذوف ہے کہ وہ اطلاع دے کہ اس کی تعداد کتنی ہے، اس کا بندھن کیا ہے، اس کا تھیلا کس طرح کا ہے؟ اگر وہ ساری نشانیاں صحیح بتا دے تو وہ گری ہوئی چیز اس کے سپرد کر دے۔ جیسا کہ دوسری روایات میں اس کی صراحت آئی ہے۔ ﴿والا﴾ یعنی اگر اس کا اصل مالک سال بھر کے اعلان تک نہ آئے۔ ﴿فشانک بھا﴾ شانک منصوب ہے۔ یعنی پھر اسے اپنے قبضہ میں لے لے اور اگر ”شانک“ کو رفعی حالت میں پڑھیں تو یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی یعنی اس کا استعمال کرنا جائز ہے، مباح ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سال بھر کے اعلان کے اختتام پر اس سے اشتقاق کا اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اسے اپنے مصرف میں لائے اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ پھر اسے خرچ کر لے اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ پھر اسے کھا لے اور ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ اسے اپنے مال میں شامل کر کے اپنے قبضہ میں کر لے اور جب ”فشانک“ کی جگہ گری ہوئی چیز پانے والا اعلان کے بعد اسے خرچ کر چکے اور بعد میں اس کا مالک بھی آجائے اور اس کی علامات وغیرہ بتا دے تو کیا ایسی صورت میں وہ لفظ کو واپس کرنے کا پابند ہے یا نہیں؟ روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے واپس کرنا واجب ہے چنانچہ ترمذی کی روایت میں ہے کہ سال بھر اس کا اعلان و اشتہار دے پھر اس کا بندھن اور تھیلا اور اس کا سرہند وغیرہ ذہن نشین کر لے پھر اسے خرچ کر لے۔ اب اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اسے لوٹا دے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے اگر اسے پہچان لیا جائے تو اسے واپس کر دے ورنہ پھر اس کا سرہند، تھیلا اور تعداد یاد رکھ اور اسے استعمال کر لے۔ اس کے بعد اگر اس کا مالک

خرید و فروخت کے مسائل 620

آجائے تو پھر بھی اسے واپس لوٹا دے۔ ابو داؤد میں بھی یہ روایت بعض لفظی اختلاف کے ساتھ مروی ہے اور یہ تمام الفاظ اس کے متقاضی ہیں کہ سال گزرنے کے بعد بھی اصل مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے اور جس نے وہ لفظ اٹھایا ہو ضمانت و ذمہ داری کے بغیر اسے کھانا جائز نہیں ہے۔ ﴿فَضَالَةُ الْغَنَمِ﴾ یعنی گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے؟ ضالۃ گم کردہ راہ۔ راستہ بھکی ہوئی۔ وہ حیوان جو آبادی سے دور ویران جگہ میں رہ گیا ہو ﴿ہی لکھ الخ﴾ وہ تیرے لئے اور ترمذی کی روایت میں ہے اسے پکڑ لو۔ وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سال بھر اعلان کے بعد اسے کھا سکتے ہو ﴿اولا حیکہ﴾ یعنی اگر تو نے اسے چھوڑ دیا تو تیرے جیسا تیرا کوئی دوسرا بھائی اسے پکڑ لے گا۔ پھر تو اسے کیوں چھوڑتا ہے حالانکہ تو اس کے پاس پہلے پہنچا ہے۔ ﴿اول للذنب﴾ یعنی اگر تو نے اور تیرے جیسے دوسرے تیرے بھائی نے اسے چھوڑ دیا تو اسے بھیڑا کھا جائے گا اور بھیڑیے کے لئے اسے چھوڑنا اسے ضائع کرنا ہے۔ اس میں لفظ کو لینے کی ترغیب ہے۔ ﴿مالک ولہا﴾ یعنی تجھے اس سے کیا سروکار؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تیرے لئے نہیں ہے تو پھر اسے نہ پکڑ۔ ﴿سقاءھا﴾ سین کے نیچے کسرہ مشکیزہ تھیلا۔ اس سے اس کا اندر کا خالی حصہ مراد ہے جہاں کوئی چیز رکھی یا ڈالی جاتی ہے یعنی جب یہ اونٹ پانی کے گھٹ پر وارد ہوگا تو اتنا پانی پی لے گا کہ دوسرے روز آنے تک یہ پانی کٹنی رہے گا۔ اس کے باوجود اس کے پیٹ اور اس کی اوجھ میں اتنی رطوبت ہوتی ہے جو اس کیلئے چند ایام تک پانی سے بے نیاز رکھتی ہے ﴿حذاءھا﴾ ”حا“ کے نیچے کسرہ۔ جوتی مراد ہے یعنی اس کے پاؤں موجود ہیں جو اسے چلنے میں قوت دیتے ہیں اور دور دراز کے علاقوں کو طے کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور دور دراز واقع پانی پر پہنچنے میں تقویت کا باعث ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹ پانے والے کو اس کا تعرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پانی کے گھٹ پر وارد ہو جاتا ہے، درختوں کے پتے کھا لیتا ہے اور بغیر کسی گمران و محافظ کے زغہ رہ سکتا ہے اور اکثر درندوں سے اپنا دفاع بھی بخوبی کر لیتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے کہ اس کا مالک آئے اور اسے پکڑ کر لے جائے۔

راوی حدیث: ﴿زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبد الرحمن یا ابو طلحہ تھی۔ مدینہ میں رہنے کی وجہ سے مدنی کہلائے۔ اکابر صحابہ میں شمار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع بنو عیینہ کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔ کوفہ چلے آئے اور وہیں پر ۶۸ھ ۷۷ھ کو ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۸۰۱) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ آوَى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نِيْلًا» فرمایا ”جس کسی نے گم شدہ چیز کو اپنے ہاں پناہ دی اور اس کا اعلان نہ کیا تو وہ خود لَمْ يُعْرِفْهَا“۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔

گم راہ ہے۔“ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿من آوی ضالۃ﴾ یعنی جو اس لفظ کو اپنے ذاتی مال میں شامل کر لے۔ ﴿فہو ضال﴾

(۸۰۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ
عُثْمَانَ النَّبِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ،
أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ لُقْطَةِ الْحَاجِّ.
رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالرحمن بن عثمان تیمیؓ سے مروی ہے
کہ نبی ﷺ نے حجاج کی گری پڑی چیز کو اٹھانے سے
منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن عثمان رضی اللہ عنہ﴾ عبدالرحمن بن عثمان بن عبید اللہ تمیمی قرشی۔ یہ طلحہ بن عبید اللہ کے بھائی کے بیٹے ہیں۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ تو پایا مگر شرف رویت حاصل نہیں۔ حدیبیہ کے روز اسلام قبول کیا اور ایک قول کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ۳۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا۔

(۸۰۴) وَعَنْ الْمُقَدَّامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَلَا لَا يَحِلُّ ذُو نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ، وَلَا الْحِمَارُ الْأَمْلِيُّ، وَلَا اللَّقْظَةُ مِنْ مَالٍ مُعَاهِدٍ، إِلَّا أَنْ يَسْتَفْعِيَ عَنْهَا».

حضرت مقدم بن معدیکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا "سن لو! درندوں میں سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کچیلوں والا جانور حلال نہیں اور نہ ہی گھریلو گدھا اور ذی کمر کی شدہ گری پڑی چیز اٹھانا بھی حلال نہیں ہے۔ البتہ کہ مالک کے نزدیک اس کی خاص اہمیت و ضرورت نہ ہو۔" (ابوداؤد)

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لفوی تشریح: ﴿ذوناب﴾ ناب وہ دانت جو رباعیہ کے پیچھے ہوتا ہے۔ ناب کی جمع انیاب۔ کچلیوں والے درندہ سے مراد وہ جانور ہے جو چیرہ بھاڑ کر کھاتا ہو اور شکار کرنے اور اسے کاٹنے کیلئے اپنی کچلیوں سے مدد لیتا ہو۔ ﴿السباع﴾ سین کے نیچے کسرو۔ سبع کی جمع ہے۔ سبع کی سین پر فتح اور ”با“ پر ضم اور فتح دونوں طرح جائز ہے۔ چیرے بھاڑنے والا درندہ۔ ﴿من مال معاهد﴾ معاہد وہ ہے جس کا مسلمان حکام

خرید و فروخت کے مسائل 623

سے معاہدہ ہو کہ وہ اسے امان دیتے ہیں، وہ ذی ہی ہے اس کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اسے زیادہ اہمیت دینا مقصود ہے۔

حاصل کلام: معاہدہ چونکہ اسلامی سلطنت میں باقاعدہ اجازت لے کر آتا ہے اور پر امن رہتا ہے، اسی لئے اس کے مال و جان کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے مال اور مسلمان کے لفظ میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ البتہ اگر عرف عام میں کوئی معمولی چیز ہو تو اس کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿مقدم بنحو﴾ مقدم کے میم کے نیچے کسرہ۔ مقدم بن معدیکرب۔ کرب کے کاف پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ اور ”با“ اضافت کی وجہ سے اس کے نیچے کسرہ مع توین جائز ہے اور مبنی ہونے کی بنا پر اس پر فتح بھی جائز ہے۔ بن عمرو الکندی۔ ان کی کنیت ابو کریہ تھی یا ابویحییٰ۔ مشہور صحابی ہیں۔ شام میں فروکش ہوئے۔ ان کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے۔ صحیح قول کے مطابق ۴ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۱ برس تھی۔

۲۰ - باب الفرائض (وراثت) کا بیان

(۸۰۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا، كَمَا بَقِيَ فَهَوَ لِأَوَّلَى رَجُلٍ ذَكَرَ». دو۔ ”(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الفرائض﴾ فرائض فریضہ کی جمع ہے اس سے مراد وہ مقرر حصہ وراثت ہے جو مرنے والے کی میراث سے کتاب و سنت کی رو سے وارثوں کو ملتا ہے، وہ حصہ آدھا، چوتھا، آٹھواں اور دو تہائی اور چھٹا حصہ ہے۔ یہ فرض سے ماخوذ ہے جس کے معنی قطعی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں کے لئے فرض کر دیا گیا، یہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کے لئے مال میں سے کوئی حصہ قطعی طور پر مقرر کر دیا گیا۔ ﴿الحقوا﴾ حمزہ پر فتح اور ”حا“ کے نیچے کسرہ۔ پنچا دو، ادا کر دو۔ ﴿باہلہا﴾ جن کے حصے مقرر ہیں۔ ان کو ان کے حصے دے دو اور ”اہل فرائض“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے حصے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں بیان ہوئے ہیں۔ ﴿فما بقی﴾ حصہ داروں کے حصے ادا کر چکنے کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے۔ ﴿فہو لأولی رجل﴾ نسب کے اعتبار سے جو شخص مرنے والے کے زیادہ قریب ہو۔ ﴿ذکر﴾ ذکر یعنی مذکر کی قید لگانے سے تاکید مقصود ہے یا پھر اس سے منث کو اس زمرے سے خارج کرنا مطلوب ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اس باقی ماندہ مال میراث کا استحقاق اسے صرف بحیثیت مرد کے ہے۔ مرنے والے کے سب سے زیادہ قریب مطلقاً تو اس کے بیٹے ہیں۔ پھر پوتے، پڑپوتے وغیرہ پھر باپ پھر

خرید و فروخت کے مسائل 624

دادا وغیرہ پھر بھائی، پھر بھتیجے، پھر چچا اور ان کی اولاد یہ تمام نسبی عصبہ ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ اہل فرائض سے جو کچھ باقی بچے وہ عصبہ کیلئے ہے۔ اقرب فالاقرب کے ضابطہ کے تحت۔ جب قریبی رشتہ دار موجود ہو تو پھر اس کی موجودگی میں دور کا عصبی رشتہ دار وراثت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

(۸۰۶) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ، وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (مسلم)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ عنہما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا کہ ”مسلمان، کافر کا وارث نہیں ہوگا قَالَ: «لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ، وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان اپنے مرنے والے کسی کافر عزیز کا وارث نہیں ہو سکتا اور اسی طرح کوئی کافر اپنے مسلمان رشتہ دار کا وارث قرار نہیں پاسکتا۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے لیکن بعض کی رائے یہ ہے کہ مسلمان تو کافر کا وارث ہو سکتا ہے مگر کافر مسلمان کا کسی صورت بھی وارث نہیں ہو سکتا۔ یہ رائے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ، ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ اور اسحق رضی اللہ عنہ وغیرہ کی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس کیلئے حدیث الاسلام یعلو ولا یعلیٰ کہ ”اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا“ سے استدلال کیا ہے نیز اس سے بھی استدلال کیا گیا ہے یزید ولا ینقص کہ ”اسلام میں بڑھنے کی اہلیت و صلاحیت ہے اس لئے اسلام بڑھتا ہے گھٹتا نہیں ہے۔“ مگر اس عمومی حکم سے میراث کا واضح اور صاف حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے جمہور کی رائے درست اور رائج ہے۔

(۸۰۷) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ عَنْهُ، وَبْنَتِ اللَّهِ ﷺ فِي بَنَتٍ، وَأُخْتٍ، فَقَضَى النَّبِيُّ ﷺ «لِلْبَنَةِ النِّصْفُ، وَلِلْأُخْتِ النِّصْفُ، وَمَا بَقِيَ بِنِ الْبَنَةِ الْبَنَاتُ، وَمَا بَقِيَ بِنِ الْبَنَةِ الْبَنَاتُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، وَبْنَتِ اللَّهِ ﷺ نے بیٹی، پوتی اور بہن کی موجودگی میں فیصلہ ابنہ، وَأُخْتٍ، فَقَضَى النَّبِيُّ ﷺ فرمایا کہ دو تہائی پورا کرنے کیلئے بیٹی کو آدھا ترکہ «لِلْبَنَةِ النِّصْفُ، وَلِلْأُخْتِ النِّصْفُ، وَمَا بَقِيَ بِنِ الْبَنَةِ الْبَنَاتُ، وَمَا بَقِيَ بِنِ الْبَنَةِ الْبَنَاتُ» اور پوتی کیلئے چھٹا حصہ ہو گا پھر جو کچھ باقی بچے وہ السُّدُسُ، تَكْمِلَةُ الثَّلَاثِينَ، وَمَا بَقِيَ بِنِ الْبَنَةِ الْبَنَاتُ» (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿تكملة الثلاثين﴾ اس لئے کہ پوتی بمنزلہ بیٹی ہوتی ہے۔ لہذا ایک بیٹی کی موجودگی میں یہ بمنزلہ دو بیٹیوں کے ہو گئیں اور دو بیٹیاں اگر ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ترکہ ملتا ہے اور جب تنها ایک بیٹی ہو تو وہ آدھا ترکہ کی مستحق ہوتی ہے اب دو تہائی پورا کرنے کیلئے چھٹا حصہ کی ضرورت ہے اور یہ اسے پوتی نے دے دیا۔ اس طرح دونوں کو جمع کر کے مجموعہ دو تہائی پورا ہو گیا جس کی دونوں

خرید و فروخت کے مسائل 625

مستحق ہیں۔ ﴿وَمَا بَقِيَ لِلْأَحْتِ﴾ باقی جو بچے اس کی مستحق بہن ہے اس لئے کہ پوتی بیٹی کے ساتھ مل کر عصب بن گئی اور ذوالقرائن سے جو ترکہ بچ گیا اسے اس نے حاصل کر لیا۔

(۸۰۸) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "دو مختلف دین کے پیروکار رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ بِلَفْظِ أَهْلَ مِلَّةٍ، وَزَوَّيَ النَّسَائِيُّ اسے ان الفاظ سے نقل کیا ہے جو اسامہ کی حدیث کے ہیں اور نسائی نے اسامہ کی حدیث کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے حَدِيثُ أَهْلَ مِلَّةٍ بِهَذَا اللَّفْظِ.

(یعنی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿اہل ملتین﴾ دو ملتوں سے مراد دو مختلف کافرانہ ملتیں ہیں یا کفر و اسلام مراد ہے۔ جسور اہل علم کے نزدیک اس سے مراد کفر اور اسلام ہے اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ صرف امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی عمومیت کی بنا پر تمام ملتوں کو اسی میں شامل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہودی عیسائی کا اور عیسائی یہودی کا بھی وارث نہیں بن سکتا۔ علامہ الیامانی نے السبل میں کہا ہے حدیث کا ظاہری مفہوم انہی کامؤید ہے۔ واللہ اعلم۔

(۸۰۹) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ حَضْرَتِ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَاءَ أَحَدُ آدَمِيِّ نَبِيِّ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ ابْنَ عَرَضٍ كِي كَمِيرَا بَوَاتُوفَاتٍ پَآگِيَا هِي۔ اس کے ترکہ انبني، مَاتَ، فَمَا لِي مِنْ مِيرَاثِهِ؟ ميراث میں ميراث حصہ کتنا ہے؟ آپ نے فرمایا "تجھے فَقَالَ: لَكَ السُّدُسُ، فَلَمَّا وَلَّى چھٹا حصہ ملے گا۔" پھر جب وہ جانے لگا تو اسے آپ دَعَا، فَقَالَ: لَكَ سُدُسٌ آخَرُ، فَلَمَّا وَلَّى دُعا، فَقَالَ: إِنَّ السُّدُسَ الْآخَرَ طَعْمَةً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، وَصَحَّحَهُ "آخری چھٹا حصہ تیرے لئے رزق ہے۔" (اسے احمد

التِّرْمِذِيُّ، وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ عَنْ اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح کہا ہے عِمْرَانَ، وَقِيلَ: إِنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُ. اور یہ روایت حسن بصری نے بھی عمران رضی اللہ عنہ سے روایت

کی ہے مگر یہ کہا گیا ہے کہ حسن بصری کا عمران بن حصین

رضی اللہ عنہ سے سماع ہی ثابت نہیں)

لغوی تشریح: ﴿لک السدس﴾ مقرر و طے شدہ حصہ میں سے چھٹا حصہ تجھے ملے گا۔ ﴿لک السدس

خرید و فروخت کے مسائل 627

وَارِثٌ مِّنْ لَّا وَارِثَ لَهُ. وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ تَخْرِجَ أَحْمَدٍ اور چاروں نے بیان کیا ہے سوائے ترمذی کے۔
وَالْأَزْنَةُ، سَيِّئُ التَّرْمِذِيِّ، وَحَسَنَةُ أَبُو ذُرْعَةَ ابوزرعہ رازی نے اسے حسن کہا، حاکم اور ابن حبان نے
الْأَزْنَةُ وَصَحَّحَهُ الْحَاجِمُ وَابْنُ جِبَّانَ. اسے صحیح قرار دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿الخال وارث الخ﴾ یہ حدیث دلیل ہے کہ ذوالارحام بھی وراثت پاتے ہیں۔ اکثر صحابہ کرامؓ کی یہی رائے ہے۔ زید بن ثابتؓ کا ایک قول ہے کہ یہ وراثت نہیں پاتے اور شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے عموم سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے۔ ”والولوالارحام بعضہم اولی بعض“ اور قرابت والے ایک دوسرے کے وارث ہونے میں زیادہ ہتھ دار ہیں۔ نیز ارشاد ربانی ہے۔ للرجل نصیب مما ترک الوالدان والا قریبون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون کہ جو کچھ ماں باپ اور قریبی چھوڑ گئے اس میں مردوں کا حصہ ہے اسی طرح عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور قریبی چھوڑ گئے ہیں۔ رجال، نساء اور اقربین کے الفاظ سب قریبی رشتہ داروں کو شامل ہیں اور یہ تخصیص کرنے والے کے دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے اگر ذوالفروض اور عصبہ وارثوں میں سے کوئی زندہ نہ ہو تو پھر ماموں وارث ہوگا۔ ذوالارحام کو وارث قرار دینے میں علماء میراث میں اختلاف ہے۔ ایک بڑی جماعت تو ان کو وارث قرار دیتی ہے اور خالہ کی حیثیت بھی وہی ہے جو ماموں کی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر ترکہ بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔ جو لوگ ذوالارحام کی وارثت کے قائل نہیں ان کے نزدیک تو عصبات کی عدم موجودگی میں ترکہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا مگر جمہور کی رائے ہی رائج ہے۔

(۸۱۲) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلٍ حضرت ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قَالَ: كَتَبَ مَعِيَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرے ذریعہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تَعَالَى عَنْهُ إِلَى أَبِي عُبَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اللہ اور اس کا تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: رسول ہر اس کا مولیٰ ہے جس کا کوئی مولیٰ نہ ہو اور «اللَّهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَىٰ مَنْ لَّا مَوْلَىٰ لَهُ، جس کا کوئی وارث نہ ہو ماموں اس کا وارث ہے۔“ وَالْخَالُ وَارِثٌ مِّنْ لَّا وَارِثَ لَهُ. (احمد اور چاروں نے سوائے ابوداؤد کے روایت کیا ہے اور زَوَاهُ أَخَذَهُ وَالْأَزْنَةُ، سَيِّئُ أَبِي ذَاوَدَ، وَحَسَنَةُ ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا التَّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ. ہے)

لغوی تشریح: ﴿مولى من لا مولى له﴾ یعنی جس کا کوئی ولی و سرپرست نہ ہو، جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اور ابوداؤد میں مقدم سے مروی ہے کہ جس کا کوئی مولیٰ و سرپرست نہیں اس کا ولی و سرپرست میں ہوں۔ میں اس کی وراثت لوں گا اور قرض سے اسے آزاد کراؤں گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ

خرید و فروخت کے مسائل 628

اس کا مال بیت المال میں چلا جائے گا۔ یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی مؤید ہے جس سے ثابت ہوا کہ اولی الارحام وارث بن سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابو امامہ بن سہل﴾ ان کا نام اسعد اور ایک قول کے مطابق سعد تھا مگر یہ اپنی کنیت سے ہی مشہور و معروف تھے۔ سلسلہ نسب یوں ہے: ابو امامہ بن سہل بن حنیف بن واہب انصاری، اوسی مدنی۔ یعنی مدینہ کے انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ نبی ﷺ کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے مگر کچھ سماعت نہیں کر سکے۔ ۱۰۰ھ میں ۹۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ﴾ ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح بن ہلال قرشی فہری۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں۔ دوسری ہجرت حبشہ میں شریک تھے۔ تمام غزوات بدر و احد تا تبوک میں شریک رہے۔ جنگ احد کے روز نبی ﷺ کے رخسار مبارک میں خود کے دو جوہلے داخل ہو گئے تھے ان کو اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالتے وقت ان کے سامنے کے دونوں دانت گر گئے تھے۔ شام کی فتوحات میں لشکر اسلامی کی قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۸ھ میں طاعون عمواس کے موقع پر وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔

(۸۱۳) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”جب نومولود بچہ آواز نکالے تو وہ وارث قرار دے گا۔“ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے) إِذَا اسْتَهْلَّ الْمَوْلُودُ وَرِثٌ. رَوَاهُ أَبُو (اسے صحیح کہا ہے) دَاوُدُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

لغوی تشریح: ﴿اذا استهل﴾ جب آواز بلند کرے۔ وہ چیخنے کی صورت میں ہو یا رونے کی صورت میں۔ ”ورث“ صیغہ مجہول۔ توریث سے ماخوذ ہے۔ یعنی یہ آواز اسے وارث بناتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب بچہ زندہ پیدا ہو پھر بعد میں فوت ہو جائے تو وہ وارث شمار ہوگا۔ پیدائش کے وقت اونچی آواز نکالنا وارث بننے کیلئے ضروری نہیں ہے۔ ”استہلال“ کا بالخصوص اس جگہ ذکر تو محض اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر بچہ پیدا ہونے کے بعد آواز نکالتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہوتی ہے کہ بچہ زندہ ہے۔ لہذا اگر اس کے علاوہ دوسری کسی علامت سے اس کے زندہ ہونے کا علم ہو جائے تو مثلاً چھینک مارنا، زور سے سانس لینا یا ایسی کوئی حرکت کرنا جو اس کے زندہ ہونے پر دال ہو اس کے وارث قرار پائے جانے کیلئے بس کافی ہے۔

(۸۱۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حَضْرَتُ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ اپنے والد سے اور وہ اپنے عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى دَاوُدَ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: فرمایا ”قاتل کو متوئل کی میراث میں سے کچھ بھی لیس لِقَاتِلٍ مِنَ الْمِيرَاثِ شَيْءٌ“. (اسے نسائی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے)

زَوَّاهُ النِّسَاءِ وَالذَّارِقُطْنِي، وَقَوَّاهُ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ، اور ابن عبدالبر نے اسے قوی قرار دیا ہے۔ مگر نسائی نے وَأَعْلَهُ النِّسَاءِ، وَالصُّنَّابُ وَقَفُّهُ عَلَى غَيْرِهِ۔ اسے معلول کہا ہے۔ دراصل یہ روایت موقوف ہے یعنی عمرو پر موقوف ہونا صحیح کہا گیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے قاتل مقتول کی میراث میں سے کچھ بھی وصول کرنے کا مستحق نہیں۔ اکثر اہل علم کی رائے یہی ہے کہ قاتل کو نہ اصل مال میں سے کچھ ملے گا اور نہ دیت میں سے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قاتل کو دیت میں سے تو کچھ نہیں ملے گا البتہ دوسرے مال میں سے میراث لے گا۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کی جلالت القدر کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ان کے پاس اپنی رائے کے حق میں کوئی مضبوط و قوی دلیل نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمر رحمہ اللہ، حضرت علی رحمہ اللہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کی رائے کے خلاف فیصلہ دیتے رہے ہیں۔

(۸۱۵) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ حضرت عمر بن خطاب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَا أَحْرَزَ» اولاد جو کچھ جمع کر کے اپنے گھر میں لائے تو وہ اس الْوَالِدِ أَوْ الْوَلَدِ فَهُوَ لِعَصْبَتِهِ مَنْ کے عصبہ کیلئے ہے خواہ عصبہ کوئی بھی ہو۔“ (اسے تَحَانَ۔ زَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنِّسَاءِ وَأَبْنُ مَاجَةَ ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مدینی وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِينَةِ وَأَبْنُ عَبْدِ الْبَرِّ۔ اور ابن عبدالبر نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مَا أَحْرَزَ الْوَالِدُ الْخ﴾ جو کچھ والد یا اولاد نے جمع کیا اور حاصل کیا یا یہ معنی کہ اموال اور حقوق میں جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے۔ ﴿فَهُوَ﴾ جمع کردہ مال یا جس حق کا وہ مستحق ہے۔ ﴿لِعَصْبَتِهِ﴾ اس شخص کے عصبہ مراد ہیں جس نے مال کو جمع کیا، حاصل کیا۔ ﴿مَنْ كَانَ﴾ اس سے مراد وہی عصبہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ والد اور اولاد کے احراز سے مراد یہ ہے کہ حقوق میں جن کا یہ استحقاق رکھتا ہے وہ حقوق وغیرہ اس کے بعد اس کے عصبہ کے ہوں گے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ولاء کو وراثت میں تقسیم نہیں کیا جائے گا مگر یہ حدیث اپنی دلالت میں واضح اور صریح نہیں ہے بلکہ ماحرز کے تحت جو جزئیات آتی ہیں وہ بسا اوقات اس استدلال کے خلاف ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ دراصل اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے کہ ایک خاتون فوت ہو گئی۔ اس کے بیٹے اس کے وارث ہوئے پھر بیٹے بھی فوت ہو گئے اور عمرو بن عاص رحمہ اللہ ان لڑکوں کا عصبہ ہونے کی حیثیت سے ان کے وارث بنے۔ پھر اس عورت کا آزاد کردہ غلام بھی فوت ہو گیا تو عمرو بن عاص نے اس غلام کا ورثہ بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس عورت کے بھائی نے عورت کے آزاد کردہ غلام کی میراث کا دعویٰ کر دیا۔ اس موقع پر حضرت عمر رحمہ اللہ نے یہ حدیث بیان فرمائی اور اس آزاد کردہ غلام کی میراث اس خاتون کے بھائی کو دلا دی۔ واضح رہے کہ ولاء (آزاد کردہ غلام کا ترکہ)

ذوالفروض میں ورثہ کی طرح تقسیم نہیں ہوتی بلکہ سب سے قریبی عصبہ کا حصہ ہے۔ اگرچہ بعض نے اس میں اختلاف بھی کیا ہے تاہم صحیح یہی ہے کہ میراث میں تقسیم نہیں ہوتا۔

(۸۱۶) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «الْوَلَاءُ لِحِمَّةٍ تَعْلُقُ كِطْمَانًا» جیسے نہ فروخت کیا جاسکتا ہے اور كَلْحِمَةِ النَّسَبِ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوَهَّبُ. رَوَاهُ الْحَاكِمُ مِنْ طَرِيقِ الشَّافِعِيِّ، بن حسن سے اور انہوں نے ابویوسف سے روایت کیا ہے۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي يُونُسَ، ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے وَصَحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَأَعْلَلَهُ الْبَيْهَقِيُّ. معلول کہا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿الولاء﴾ ”واو“ پر فتح اور ”لا“ پر مد۔ یعنی آزادی کی ولاء اور وہ آزاد کرنے والے کی میراث کا آزاد کردہ سے زیادہ حق رکھتا ہے۔ ﴿لحمۃ﴾ لام پر ضمہ اور ”حا“ ساکن معنی اس کے قربت اور تعلق کے ہیں۔ عرب لوگ ولاء کو فروخت بھی کرتے تھے اور مہ بھی کر دیتے تھے جس سے منع فرما دیا گیا اور واضح کیا کہ ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے۔ یہ زائل کرنے سے بھی زائل نہیں ہوتا۔ حاصل کلام: اس حدیث میں ولاء کو نسب کے تعلق سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مہ اور نذر کی جاسکتی ہے۔ عرب معاشرے میں لوگ اسے فروخت بھی کر دیتے تھے اور مہ اور نذر بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔

راوی حدیث: ﴿محمد بن حسن﴾ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ محمد بن حسن بن فرقہ شیبانی۔ احناف کے ایک مشہور و معروف امام ہیں۔ ۱۳۲ھ واسط میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں نشوونما پا کر پروان چڑھے۔ طلب علم کیلئے نکلے۔ بڑے بڑے اعلام سے ملاقات کی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کئی سال تک رہے پھر ابویوسف پر فقہ کا درس لیا۔ بہت سی نادر کتب تصنیف کیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم کو خوب پھیلایا۔ یہ احناف کے تین علمی ستونوں کے درمیان ایک ستون ہیں۔ تین سال تک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میں نے محمد بن حسن کی طرح موٹا آدمی کوئی نہیں دیکھا جو پھر تپتا اور مہربان اور اچھی صحبت والا ہو اور نہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو خیر خواہ پایا۔ حافظہ کے اعتبار سے ان کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ۱۸۹ھ میں رے کی ”برنبویہ“ نامی بستی میں وفات پائی۔

﴿ابویوسف﴾ ان کا نام امام یعقوب بن ابراہیم انصاری ہے۔ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد ہیں اور اہل عراق کے مستند فقیہ ہیں۔ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ ان کی نشوونما کوفہ میں ہوئی اور طلب علم میں زندگی بھر گزاری۔ ان کے والد ایک غریب آدمی تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی ابویوسف کو وقتاً فوقتاً

خرید و فروخت کے مسائل 631

سو، سو درہم دے کر ان کی اعانت کیا کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ اصحاب الرائی میں امام ابو یوسف سب سے زیادہ احادیث کا علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ فن میں پختہ تھے اور یحییٰ بن یحییٰ تمیمی کا قول ہے کہ میں نے ابو یوسف کو ان کی موت کے وقت یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے تمام ان فتوؤں سے رجوع کیا جو کتاب و سنت سے موافقت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو قرآن کے موافق ہیں اور جس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ ان کے علاوہ میں اپنے تمام فتوؤں سے رجوع کرتا ہوں۔ ربیع الآخر ۱۸۲ھ میں انتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۸۱۷) وَعَنْ أَبِي قَلَابَةَ، عَنْ أَنَسٍ، حَضْرَتُ ابُو قَلَابَةَ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ هُوَ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سب سے رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «أَفْرَضُكُمْ زَيْدُ بْنُ زَيْدٍ» زیادہ میراث کو جاننے والا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہے۔“ ثَابِتٌ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، سَوَى أَبِي (اس حدیث کو احمد اور چاروں نے ماسوا ابوداؤد کے روایت داؤد، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جَبَّارٍ وَالْحَاكِمُ. کیا ہے۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا وَأَعْلَى بِالْأَزْهَرِيِّ. ہے لیکن اسے مرسل ہونے کی بنا معلول قرار دیا گیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿اعل بالارسال﴾ صیغہ مجہول۔ معلول اسے اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ ابوقلابہ نے اگرچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بہت سی احادیث سنی ہیں مگر ان سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس وجہ سے یہ حدیث مرسل یعنی منقطع ہے۔

حاصل کلام: یہ دراصل ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ مکمل روایت یوں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”میری امت میں سب سے زیادہ رحم دل اور شفیق انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور دین کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت عمر رضی اللہ عنہ اور سب سے زیادہ حیا دار عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حلال و حرام کا سب سے بڑا عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سب سے عمدہ اور اچھا قاری ابی بن کعب اور فرائض کا سب سے بڑا عالم زید بن ثابت ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے میراث کے اختلافی مسائل میں عموماً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رائے قابل ترجیح قرار دی۔

راوی حدیث: ﴿ابوقلابہ﴾ قلابہ میں ”قاف“ کے نیچے کسرہ اور لام مخفف۔ ان کا نام عبداللہ بن زید بن عمرو یا عامر جری بصری ہے۔ جلیل القدر تابعی، ثقہ ہیں، فاضل آدمی ہیں۔ کتب ستہ کے راویوں میں ارسال کا ارتکاب بہت کرتے ہیں۔ منصب قضاء کو چھوڑ کر شام میں چلے گئے۔ ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

وصیتوں کا بیان

۲۱ - بَابُ الْوَصَايَا

(۸۱۸) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَا حَقَّ امْرِئٌ مُسْلِمٌ لَهُ شَيْءٌ يُرِيدُ أَنْ يُوصِيَ فِيهِ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

کسی مسلمان کو یہ لائق نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کو وصیت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو مگر دو راتیں بھی اسی حالت میں گزار دے کہ اس کے پاس وصیت تحریری شکل میں موجود نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الوصایا﴾ وصایا، وصیت کی جمع ہے۔ جیسا کہ ہدایا ہدیہ کی جمع ہے وصیت شرعی طور پر خاص اس عہد کو کہتے ہیں جس کا تعلق مرنے کے بعد سے ہو۔ ﴿ما حق امری مسلم﴾ اس جملہ میں ”ما“ نافیہ ہے۔ یعنی مسلمان کیلئے یہ حزم و احتیاط کا تقاضا نہیں ہے اور اس کیلئے لائق و مناسب نہیں ہے۔ ﴿لہ شئی﴾ یہ ”لامری“ کی صفت ہے۔ یعنی اس کے پاس مال ہے یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے یا اور کوئی حق ہے یا کسی کی امانت ہے۔ ﴿یرید﴾ یہ شئی کی صفت ہے۔ یعنی یہ شخص اس چیز میں کوئی وصیت کرنا چاہتا ہے ﴿بیت لیلین﴾ یہ ماکہ خبر ہے مصدر کی تاویل کی صورت میں یعنی یہ کہ وہ دو راتیں بسر کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صفت ہو تو اس صورت میں اس کے بعد والا اشتناء خبر ہو۔ ”واو“ یہاں حالیہ بھی ہو سکتی ہے اور زائدہ بھی اور ایک دوسری روایت میں لیلۃ اولیلسین کے الفاظ بھی منقول ہیں اور ایک روایت میں ”ثلاث لیل“ بھی مروی ہے۔ الفاظ کا اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ وصیت میں جلدی کی جائے تاخیر نہ کی جائے۔ یعنی اس شخص کے لائق نہیں کہ اس پر ایک وقت گزرے خواہ وہ تھوڑا سا کیوں نہ ہو مگر اس کے پاس وصیت تحریری ہونی چاہئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ موت کب آئے گی؟ (عون المعبود) اور ﴿یرید ان یوصی الخ﴾ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وصیت کرنا مستحب ہے۔ واجب نہیں اور جمور اہل علم کی یہی رائے ہے۔ ہاں فرض کی ادائیگی کی وصیت اور امانتوں کے واپس کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وصیت ہر وقت تحریری شکل میں موجود رہنی چاہئے۔ آیت میراث کے نزول سے پہلے وصیت کرنا ہر ایک کیلئے ضروری اور لازمی تھا۔ مگر جب میراث کی آیت نازل ہوئی تو یہ وصیت ختم ہو گئی۔ یعنی جو حصے قرآن میں متعین و مقرر کر دیئے گئے ہیں ان کیلئے وصیت ختم، البتہ میراث کے علاوہ اگر کوئی وصیت کرنا چاہے تو آج بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث ختم ہے مگر اس کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اور دیکھ بھال کیلئے تہائی مال وصیت کر سکتا ہے۔

(۸۱۹) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي حَضْرَتِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں مالدار قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَنَا ذُو مَالٍ، آدمی ہوں اور میری وارث صرف میری ایک ہی بیٹی وَلَا يَرِثُنِي إِلَّا ابْنَتِي لِي وَاحِدَةٌ، ہے۔ تو کیا میں دو تہائی مال کو صدقہ و خیرات کر دوں؟

خرید و فروخت کے مسائل 633

أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِي مَالِي؟ قَالَ: لَا،
فُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِشَطْرِهِ؟ قَالَ: لَا،
فُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهِ؟ قَالَ:
الْثُلُثُ، وَالْثُلُثُ كَثِيرٌ، إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ
وَرَثَتَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَهُمْ
عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا ”نہیں۔“ میں نے دوبارہ عرض کیا، کیا میں اپنے مال کا نصف حصہ خیرات کر دوں؟ فرمایا ”نہیں۔“ میں نے تیسری مرتبہ عرض کیا، تو کیا میں تہائی مال صدقہ و خیرات کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں! مگر ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تو ان کو محتاج چھوڑے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔“ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿بشطرہ﴾ اپنا آدھا مال۔ ﴿قال الثلث﴾ الثلث پر نصب اور رفع دونوں جائز ہیں یعنی تہائی حصہ دے دو یا یوں فرمایا کہ تہائی حصہ تیرے لئے خیرات کرنا کافی ہے۔ ﴿والثلث کثیر﴾ ثلث بہت ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ اس سے کم کرو یا یہ کہ یہ تھوڑا نہیں بہت ہے۔ پس اس میں مزید اضافہ نہ کرو۔ ﴿ان تذّر﴾ یعنی چھوڑنا اور کلمہ ”ان“ یا تو حمزہ پر فتح کی صورت میں ہے اس صورت میں وہ نائبہ ہوگا اور فعل منصوب ہوگا اور یا حمزہ کے نیچے کسرہ ہو تو اس صورت میں ان شرطیہ ہوگا اور فعل مجزوم ہوگا اور اس کی جزاء ”خیر“ کا لفظ ہوگا اس صورت میں کہ خیر کو مقدر تسلیم کیا جائے۔ ﴿من ان تذروهم عالة﴾ یعنی ان کو محتاج و فقیر چھوڑ جاؤ گے۔ عالة عائل کی جمع ہے۔ ﴿یتکفّفون الناس﴾ یعنی وہ لوگوں سے فقیروں کی طرح اپنے ہاتھ پھیلا کر سوال کرتے پھریں گے۔ حضرت سعد کو یہ خیال مکہ مکرمہ میں حجة الوداع کے موقع پر آیا جبکہ ان کو گمان ہوا کہ وہ بیماری کی وجہ سے اب مر جائے گا۔ مگر اس کے بعد وہ صحت یاب ہو گئے اور زندہ رہے اور ان کے ہاں چار بیٹے ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دس سے بھی زیادہ لڑکے اور تیرہ لڑکیاں عطا فرمائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صاحب مال زیادہ سے زیادہ اپنے تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ الّا یہ کہ ورثاء خود بخود اس سے زائد کی اجازت دے دیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ورثاء کو محروم رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ان کا غنی رہنا اور دست سوال دراز کرنے سے بچنا بہر نوع بہتر ہے۔

(۸۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أُمِّي أَقْتَلَتْ نَفْسَهَا، وَلَمْ تُؤْصِرْ، وَأَطْنَتْهَا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میری والدہ اچانک وفات پا گئی ہیں اور اس نے کوئی وصیت نہیں کی۔ میرا اس کے

خرید و فروخت کے مسائل 634

لَوْ تَكَلَّمْتَ تَصَدَّقْتُ، أَفَلَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ. مُتَّقٍ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

بارے میں خیال ہے کہ اگر وہ کوئی گفتگو کرتی تو صدقہ (ضرور) کرتی۔ کیا اسے ثواب ملے گا اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کر دوں؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں!“ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ان رجلاً﴾ سے مراد حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿افلتت نفسها﴾ صیغہ مجہول۔ اچانک بیمار ہو گئیں اور فوراً ہی وفات پا گئیں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی وصیت کے بغیر بھی اولاد کی جانب سے صدقہ کا ثواب والدین کو پہنچتا ہے اور بغیر وصیت صدقہ کرنا بھی جائز ہے۔

(۸۲۱) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ. فَلَا وَصِيَّةَ لَوَارِثٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْنَؤَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَحَسَنَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ، وَرَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَزَادَ فِي آخِرِهِ: «إِلَّا أَنْ يَشَاءَ الْوَرِثَةُ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا فرمایا ہے لہذا اب کسی وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں۔“ (اسے احمد اور چاروں نے سوائے نسائی کے روایت کیا ہے۔ احمد اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے، ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اسے قوی قرار دیا ہے) اور دارقطنی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ بھی کیا ہے۔ ”الا یہ کہ اس کے وارث چاہیں“ (اور ان کی اسناد حسن ہیں)

لغوی تشریح: ﴿الا ان يشاء الورثة﴾ جمہور علماء نے اس اضافہ سے قابل استدلال ہونے کی بنا پر استثناء کیا ہے کہ اگر ورثاء از خود چاہیں تو کسی ایک کیلئے وصیت ہو سکتی ہے۔ مگر اہل ظواہر کہتے ہیں یہ جائز نہیں۔ جیسے قاتل کے حق میں وصیت جائز نہیں خواہ ورثاء اس کی اجازت دے بھی دیں لیکن اس روایت کی بنا پر رائج ترین مسلک جمہور کا ہے۔

(۸۲۲) وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى مَالٌ كَصَدَقَ عَلَيْكُمْ بِثُلْثِ أَمْوَالِكُمْ عِنْدَ وَفَاتِكُمْ، زِيَادَةً فِي حَسَنَاتِكُمْ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَأَخْرَجَهُ جَائِسٌ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے تم کو موت کے وقت تماری مال کا صدقہ دینے کی اجازت دے کر تم پر بثلث اموالکم عند وفاتکم، زیادۃً فی حسناتکم“ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور احمد اور

خرید و فروخت کے مسائل 635

أَحْمَدُ وَالْبَزَّازُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي الدُّدَّاءِ، وَابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ، وَكُلُّهَا ضَعِيفَةٌ، لَكِنْ سَارَى كِي سَارَى رَوَاتِي ضَعِيفٌ هِيَ اس كے باوجود بعضُ قَدْ بَقِيَ بَعْضُهَا يَنْفَعُ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔
بعض کیلئے باعث تقویت ہیں) واللہ اعلم

لغوی تشریح: ﴿تصدق علیکم﴾ یعنی تمام مال کو وراثت قرار نہیں دیا بلکہ اس میں سے تہائی مال صدقہ کرنے کی اجازت دے کر تم پر احسان کیا ہے کہ اگر تم چاہو تو اتنا مال فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنے لئے صدقہ جاریہ بنا سکتے ہو۔

۲۲ - بَابُ الْوَدِيعَةِ ودیعت (امانت) کا بیان

(۸۲۳) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَوْدَعَ وَدِيعَةً فَلَيْسَ عَلَيْهِ ضَمَانٌ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ۔
حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ”نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس پر ضمان (ذمہ داری) نہیں ہے۔“ (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿من اودع﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿ودیعة﴾ اس چیز کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک یا اس کا نائب وقائم مقام کسی دوسرے کے پاس حفاظت کیلئے کچھ عرصہ تک بطور امانت رکھے۔
حاصل کلام: یہ حدیث اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ثنی بن صباح ایسا راوی ہے جسے امام احمد رضی اللہ عنہ اور نسائی نے ضعیف کہا ہے لیکن ابن معین کا قول ہے کہ ثنی صالح آدمی ہے اس کی حدیث لکھی جائے اسے ترک نہ کیا جائے۔ اس حدیث کے مطابق اجماع ہے کہ امانت کی حفاظت کرنے والے پر کوئی ضمان نہیں ہے البتہ حسن بھری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر امانت رکھنے والے نے اس پر ضمان کی شرط لگائی تو پھر جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ ضامن ہو گا۔

وَبَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ تَقَدَّمَ فِيْهِ صَدَقَاتُ كِي تَقْسِيمِ كَابَابِ الْزَّكَاةِ كَالْآخِرِ الْزَّكَاةِ، وَبَابُ قِسْمِ الْفَيءِ كَالْمَالِ فِيْهِ اُور مَالِ غَنِيْمَتِ كِي تَقْسِيمِ كَالْغَنِيْمَةِ يَأْتِي عَقِبَ الْجِهَادِ اِنْ شَاءَ بَابِ كِتَابِ الْجِهَادِ كَالْآخِرِ اُور اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔



۸۔ کِتَابُ النِّكَاحِ

نکاح کے مسائل کا بیان

(۸۲۴) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنْ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنْهُ أَغْضُ لِلْبَصَرِ، وَأَخْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وَجَاءٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا ”اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جسے نکاح کرنے کی استطاعت ہو اسے نکاح کرنا چاہئے کیونکہ نکاح نگاہ کو بچانے والا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھنے والا ہے اور جسے اس کی استطاعت نہ ہو۔ اس کیلئے روزے کا اہتمام و التزام ضروری ہے اس لئے کہ روزہ اس کیلئے ڈھال ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب النکاح﴾ نکاح کے لغوی معنی ضم کرنا، ملانا، گانٹھنا، ایک دوسرے میں داخل ہونے کے ہیں اور شرعی معنی میاں بیوی کے مابین عقد جس سے وطی کرنا حلال ہوتا ہے نکاح درحقیقت تو عقد کا نام ہے اور حجازی طور پر وطی کے لئے مستعمل ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ ﴿الشباب﴾ شہین پر فتر، شباب کی جمع۔ نوجوان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان کو مخاطب ہونے سے مقصود یہ تھا کہ یہ نوجوان ہی ہیں جو عورتوں کی جانب شہوت نفسانی کا خیال رکھتے ہیں۔ ﴿الباءة﴾ عمرہ اور تاء تانیث معروہ لغت میں اس کے اصلی معنی تو جماع کے ہیں اور یہ مباءہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی منزل کے ہیں اس لئے کہ جو آدمی کسی خاتون سے نکاح کرتا ہے تو وہ اس خاتون کو اپنی جائے قیام بنا لیتا ہے، اپنی منزل قرار دے لیتا ہے۔ اس مقام پر یا تو یہ جماع کے معنی میں ہے بایں صورت عبارت یوں ہوگی: من استطاع منکم الجماع فقد رتہ علی موتہ النکاح یعنی کہ تم میں سے جو کوئی نکاح کے مصارف و اخراجات کی استطاعت کی صورت میں جماع کی طاقت رکھتا ہو یا اس سے نکاح کے مصارف و اخراجات کی ہمت رکھنا مراد ہوگا اس صورت میں اس کے لوازمات کا نام نکاح رکھ دیا گیا ہے۔ ﴿اغض﴾ جھکانے والا

نکاح کے مسائل کا بیان 637

بچانے والا اور شادی کرنے والے کی نگاہوں کو غیر عورت کی جانب اٹھنے سے روکنے والا۔ ﴿احصن﴾ زیادہ محفوظ رکھنے والا، حفاظت کرنے والا ﴿وجاء﴾ ”واؤ“ کے نیچے کسر۔ شہوت و ہوس نفسانی کو کچلنے والا، بند کرنے والا اور دراصل تو اس کا استعمال جانور کے خبیثے کو دبا کر ناکارہ و بیکار کرنا اور خوب کچل دینا تاکہ نہ نر کی قوت باہ ختم ہو جائے۔ معنی یہ ہوئے کہ روزہ سفلی جذبہ کو قطع کر دیتا ہے اور منی کے شر کو دور کر دیتا ہے۔ بس یوں سمجھئے جیسا کہ کسی جانور کو خسی کر دیا۔

(۸۲۵) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَمَدَ اللَّهَ، وَأَتْنَى عَلَيْهِ، وَقَالَ: «لَكِنِّي أَنَا أَصْلِي، وَأَنَا مُمْ، وَأَفْطِرُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَن سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنائیاں کی اور فرمایا ”لیکن میں نماز بھی ادا کرتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہذا جس کسی نے میری سنت سے منہ پھیرا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لکنی﴾ اس سے پہلے جو کچھ بیان ہوا اس سے پیدا شدہ وہم کو دور کیا جا رہا ہے۔ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اسے حذف کر دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین صحابیوں میں سے ایک نے یہ عزم ظاہر کیا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا اور دوسرے نے کہا کہ وہ رات بھر قیام کیا کرے گا اور تیسرے نے کہا کہ وہ کبھی نکاح نہیں کرے گا۔ پس جب اس عزم کی خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”تم ہی تھے جنہوں نے اس طرح کہا تھا؟ سن لو اللہ کی قسم! میں تمہارے مقابلہ میں اللہ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہوں۔ اس کے باوجود میں روزے رکھتا بھی ہوں اور ترک بھی کر دیتا ہوں۔ رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا اسوۂ ہے اب اگر کوئی از خود اپنے اوپر پابندیاں لازم کرتا ہے اور میرے اسوۂ سے روگردانی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

(۸۲۶) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَأْمُرُ بِالْبَاءَةِ، وَيَنْهَى عَنِ التَّبْتُلِ. نَهَبًا شَدِيدًا، وَيَقُولُ: «تَزَوَّجُوا الْوُدُودَ الْوُلُودَ، فَإِنِّي مُكَافِّرٌ بِكُمْ الْأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ ابْنِ دَاوُدَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ نکاح کرنے کا حکم ارشاد فرماتے اور تجرد کی زندگی سے سختی سے منع فرماتے اور فرماتے تھے کہ ”بہت محبت کرنے والی اور چاہنے والی، بہت بچے جننے والی خواتین سے نکاح کرو۔ اس لئے کہ میں تمہاری کثرت کی بدولت قیامت کے روز دوسرے انبیاء پر

الوداؤد، نسائی اور ابن حبان میں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے

(مروی ہے)

نغوی تشریح: ﴿التبطل﴾ عورتوں سے الگ تھلگ رہنے، نکاح نہ کرنے، ازدواجی تعلق سے کنارہ کش رہنے کو "تبطل" کہتے ہیں۔ ﴿الودود﴾ میں "واؤ" پر فتح ہے۔ ایسی عورت جو اپنے شوہر سے بے پناہ پیار و محبت کرتی ہے یا اس کا معنی ہے وہ محبوب و پسندیدہ عورت جو اپنے عمدہ اور بہترین اوصاف و خصائل، عادات و اطوار، حسن خلق کی مالک اور اپنے شوہر سے پیار کرنے والی ہو۔ ﴿الولود﴾ "واؤ" پر فتح۔ ایسی عورت جو بچے زیادہ جننے والی ہو۔ یہ چیز کنواری میں اس کے خاندان کی حالت سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ ﴿مکائر﴾ میں اپنے متبعین کی کثرت تعداد کی وجہ سے انبیاء پر فخر کرنے والا ہوں۔

(۸۲۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «تُنْكِحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَافْظَرْ بِذَاتِ الدِّينِ، تَرِبَتْ يَدَاكَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مَعَ بَقِيَّةِ السَّنَةِ.

(بخاری و مسلم نیز باقی ساتوں نے بھی اسے روایت کیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿لحسبھا﴾ ”حا“ اور سین دونوں پر فتح۔ وہ شرف و بزرگی جو قریبی رشتہ داروں کی وجہ سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ ﴿فاظفر بذات الدین﴾ یعنی ایسی خاتون سے نکاح کرنے میں کامیابی حاصل کرو۔ ﴿تربت یداک﴾ تیرے ہاتھ خاک آلودہ ہوں۔ کہا جاتا ہے ”ترب الرجل“ آدمی فقیر و محتاج ہو گیا۔ یہاں دعا مراد نہیں ہے بلکہ اس جگہ جدوجہد اور سعی و کوشش کیلئے ابھارنا اور براہِ نگینہ کرنا مقصود ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی کیلئے ہر نوع دین دار عورت کا انتخاب کرنا چاہئے، کسی کے مال و دولت، کسی کے حسن و جمال پر فریفتہ نہیں ہو جانا چاہئے کیونکہ عورت محض بیوی نہیں ہوگی۔ بچوں کی ماں بھی ہوگی ظاہر ہے۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت بھی اسی وقت کر سکے گی جب خود نیک اور دین سے وابستہ ہوگی۔

(۸۲۸) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا حَضَرَتِ ابُو هَرِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ مَرُوءِيَّ يَقُولُ مَا قَالَ نَبِيُّ اللَّهِ ﷺ

رَقًا إِنْسَانًا، إِذَا تَزَوَّجَ، قَالَ: «بَارَكَ اللَّهُ لَكَ، وَبَارَكَ عَلَيْكَ، وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ.

جب کسی شخص کو دیکھتے کہ اس نے شادی کی ہے تو فرماتے ”اللہ تعالیٰ برکت عطاء فرمائے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے اور تم دونوں کو بھلائی و خیر پر جمع رکھے۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔

ترمذی، ابن خزمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿رفا﴾ ”فا“ پر تشدید اور ممرہ اور کبھی بغیر ممرہ کے بھی آجاتا ہے یعنی اسے مبارک باد دی اور اس کے حق میں دعا فرمائی اور دور جاہلیت میں دعا دینے کا یہی طریقہ مروج تھا کہ کہتے ﴿بالرفاء والبنین﴾ کہ مبارک ہو اللہ اولاد سے خوش نصیب کرے۔ آپؐ نے اسے منع فرمایا دیا اور رفاء انفاق، برکت اور بڑھوتری بھی معنی میں آتا ہے۔

(۸۲۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ تَشْدِيدَ سَكَّاهَا كَمَا «سَبَّ تَعْرِيفِ اللَّهِ هِيَ كَيْلَةٌ هِيَ» بِمِ اس کی حمد کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طلب گار ہیں اور اسی سے مغفرت و بخشش مانگتے ہیں اور اپنے نفسوں کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت سے نوازے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ ہی گمراہ کرے اسے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے آیات۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ، وَحَسَنَةُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حاجت و ضرورت میں یہ تشدید سکھایا کہ ”سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طلب گار ہیں اور اسی سے مغفرت و بخشش مانگتے ہیں اور اپنے نفسوں کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت سے نوازے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ ہی گمراہ کرے اسے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے آیات۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔

ترمذی اور حاکم نے اسے حسن کہا ہے)

لعوی تشریح: ﴿التشهد في الحاجة﴾ بل السلام میں ہے کہ ابن کثیر نے الارشاد میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپؐ نے یہ خطبہ حاجت و ضرورت اور نکاح وغیرہ ہر کام کیلئے سکھایا ہے۔ ﴿ان الحمد﴾ میں ”ان“ تخفیف سے پڑھا جائے تو ”الحمد“ پر رفع ہوگا اور ”ان“ پر تشدید بھی جائز ہے۔ بایں صورت ”الحمد“ پر فتح ہوگی اعرابی صورت میں اور اس پر رفع حکایت کے طور پر ہے۔

حاصل کلام: یہ خطبہ صرف خطبہ نکاح نہیں بلکہ یہ خطبہ رسول اللہ ﷺ نے ہر حاجت و ضرورت کیلئے

نکاح کے مسائل کا بیان 640

سکھایا ہے۔ علامہ الیمانی نے تو فرمایا ہے کہ نکاح کرنے والے کو خود یہ خطبہ پڑھنا چاہئے۔ مگر یہ سنت متروک ہو چکی ہے۔ جن تین آیات کا ذکر ہے، وہ یہ ہیں۔ سورہ نساء کی پہلی آیت رقیبا تک اور سورہ آل عمران کے گیارہوں رکوع کی پہلی آیت مسلمانوں تک اور سورہ احزاب کے آخری رکوع کی آیت عظیمیا تک۔ اہل ظواہر اس خطبہ کو واجب قرار دیتے ہیں اور شوافع میں سے ابو عوانہ نے بھی اسے واجب کہا ہے مگر باقی علماء امت کے نزدیک منون ہے۔ (سبل)

(۸۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمْ الْمَرْأَةَ فَإِنْ اسْتَطَاعَ أَنْ يَنْظُرَ مِنْهَا إِلَى مَا يَدْعُوهُ إِلَى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ وَالشَّافِعِيِّ عَنِ الْمُؤَيَّرَةِ، وَعِنْدَ ابْنِ مَاجَةَ وَابْنِ جَبَانَ مِنْ حَدِيثِ مُحَمَّدٍ بْنِ مُسْلَمَةَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے اگر ممکن ہو تو اس کو کچھ دیکھ لے جو اس کیلئے نکاح کا باعث ہو۔“ (اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور حاکم نے اسے داؤد، ورجالہ ثقات، و صححہ الحاکم، و لہ شاهد عند الترمذی و الشافعی عن المؤیرة، و عند ابن ماجہ و ابن جبان من حدیث محمد بن مسلمہ کی روایت شاہد ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مرد کو چاہئے کہ جس عورت سے نکاح کا ارادہ رکھتا ہو اسے خود ایک مرتبہ دیکھ لے۔ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا مستحب ہے لازمی اور ضروری نہیں۔ اگر کسی قاتل اعتماد اپنی رشتہ دار خاتون کو بھیج کر عورت کے چہرے کے رنگ و روپ، عادات و خصائل کا پتہ کرا لے تب بھی یہ ٹھیک ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلیم کو بھیج کر ایک خاتون کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ راوی حدیث: ﴿محمد بن مسلمہ﴾ محمد بن مسلمہ کا شمار فضلاء صحابہ کرامؓ میں تھا۔ انصار کے قبیلہ حارث سے تھے اس لئے انصاری حارثی کہلاتے تھے۔ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ مدینہ منورہ میں حضرت معب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ۴۳ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۸۳۱) وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً: أَنْظُرْتَ إِلَيْهَا؟ قَالَ لَا، قَالَ: أَذْهَبَ فَاَنْظُرْ نِهَا. نِهَا.

مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص سے جو شادی کرنا چاہتا تھا فرمایا کہ ”کیا تو نے اسے دیکھ لیا ہے؟“ اس نے کہا: ”نہیں، آپ نے فرمایا ”جاؤ اور اسے دیکھ لو۔“

(۸۳۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَخْطُبُ أَحَدُكُمْ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ، حَتَّى يَتْرُكَ الْحَاطِبُ قَبْلَهُ، أَوْ يَأْذَنَ لَهُ الْحَاطِبُ». مَنَّكَ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبَخَّارِيِّ.

(۸۳۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَاءَتْ أَمْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! جِئْتُ أَحَبُّ لَكَ نَفْسِي، فَتَنْظُرْ إِلَيْهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَصَعَّدَ النَّظَرَ فِيهَا وَصَوَّبَهُ، ثُمَّ طَاطَأَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَأْسَهُ، فَلَمَّا رَأَتْ الْمَرْأَةُ أَنَّهُ لَمْ يَقْضَ فِيهَا شَيْئًا جَلَسَتْ، فَقَامَ رَجُلٌ مِّنْ أَصْحَابِهِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ لَمْ تَكُنْ لَكَ بِهَا حَاجَةٌ فَزَوِّجْنِيهَا، قَالَ: فَهَلْ يَسْتَكْفِرُ مِنْ شَيْءٍ؟ فَقَالَ: لَا، وَاللَّهِ يَا

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں اپنے آپ کو آپ کیلئے بہہ کرنے آئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک نظر دیکھا پھر نظر اوپر نیچے کر کے ذرا غور سے دیکھا اور اپنا سر نیچا کر لیا۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا تو وہ نیچے بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک صحابیؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! اگر اس عورت کی آپ کو ضرورت نہیں تو اس سے میرا نکاح کر دیں۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ”تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟“ اس

نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اللہ کی قسم کچھ بھی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”اپنے گھر جاؤ اور تلاش کرو آیا کوئی چیز تجھے ملتی ہے؟“ وہ چلا گیا اور پھر واپس آکر کہنے لگا، اللہ کی قسم مجھے کوئی چیز نہیں ملی۔ رسول اللہ (ﷺ) نے پھر فرمایا ”تلاش کرو خواہ لوہے کی انگشتری ہی ہو۔“ وہ آدمی پھر گیا اور واپس آکر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ کی قسم لوہے کی انگوٹھی تک بھی میسر نہیں۔ لیکن میرا یہ ایک تہ بند ہے۔ (سل بنہ) نے کہا کہ اس کے اوپر کی چادر نہ تھی۔) آدھا حصہ میں اسے دے دوں گا۔ رسول اللہ (ﷺ) نے اس پیشکش کو نامنظور کرتے ہوئے فرمایا ”وہ خاتون تیرے اس تہ بند کو کیا کرے گی۔ اگر تو اسے زیب تن کرے گا تو اس کیلئے کیا بچے گا اور اگر وہ اسے پہنے گی تو پھر تیرے لئے اس میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ یہ سن کر وہ آدمی نیچے بیٹھ گیا اور کافی دیر تک بیٹھا رہا بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بیٹھ پھر کر جاتے ہوئے اسے رسول اللہ (ﷺ) نے دیکھ لیا۔ آپؐ نے اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ جب وہ واپس آگیا تو آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا ”تجھے کتنا قرآن یاد ہے؟“ اس نے اسے گن کر بتایا کہ فلاں فلاں سورت یاد ہے۔ آپؐ نے پوچھا ”تم ان کو زبانی پڑھ سکتے ہو؟“ وہ بولا جی ہاں! آپؐ نے فرمایا ”جائیں نے تجھے اس کا مالک بنا دیا۔ اس قرآن کے بدلہ جو تجھے یاد ہے۔“ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں ہے ”جائیں نے اسے تیری زوجیت میں دے دیا۔ پس تو اسے کچھ قرآن سکھا دو“ اور بخاری

رَسُولَ اللَّهِ! فَقَالَ: أَذْهَبَ إِلَى أَهْلِكَ، فَاتَنْظُرْ هَلْ تَجِدُ شَيْئًا؟ فَذَهَبَ، ثُمَّ رَجَعَ، فَقَالَ: لَا وَاللَّهِ، مَا وَجَدْتُ شَيْئًا. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَنْظِرْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ، فَذَهَبَ ثُمَّ رَجَعَ، فَقَالَ: لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَلَا خَاتَمًا مِنْ حَدِيدٍ، وَلَكِنْ هَذَا إِزَارِي (- قَالَ سَهْلٌ: - مَالَهُ رِدَاءٌ -) فَلَهَا نِصْفُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَا تَضَعُ بِإِزَارِكَ؟ إِنْ لَبِستَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهَا مِنْهُ شَيْءٌ، وَإِنْ لَبِستَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ مِنْهُ شَيْءٌ، فَجَلَسَ الرَّجُلُ، حَتَّى إِذَا طَالَ مَجْلِسُهُ قَامَ، فَرَأَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مُوَلِّيًا فَأَمَرَ بِهِ فَدَعِيَ بِهِ، فَلَمَّا جَاءَ، قَالَ: مَاذَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: مَعِيَ سُورَةُ كَذَا، وَسُورَةُ كَذَا، عَدَدُهَا، فَقَالَ: تَقْرَأُوهُنَّ عَنْ ظَهْرِ قَلْبِكَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: أَذْهَبَ فَقَدْ مَلَكْتُكُمَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ. نَتَقَى عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «أَنْطَلِقُ فَقَدْ زَوَّجْتُكُمَا فَعَلْنَاهَا مِنَ الْقُرْآنِ». وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «أَمْلَكْنَاكُمَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ».

نکاح کے مسائل کا بیان 643

میں ہے کہ ”ہم نے تجھے اس کا مالک بنا دیا اس قرآن کے عوض جو تجھے یاد ہے“

وَلَا يَنْبِي دَاوُدَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا تَحْفَظُ؟ کہ آپؐ نے دریافت فرمایا ”کتنا کچھ قرآن حفظ قَالَ: سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَالَّتِي تَلِيْهَا، ہے؟ وہ بولاسورۃ البقرہ اور اس کے ساتھ والی سورۃ قَالَ: فَقُمْ، فَعَلِمْنَاهَا عَشْرِينَ آيَةً. (آل عمران) آپؐ نے فرمایا ”اٹھو اور اسے بیس آیات سکھا دو۔“

لغوی تشریح: ﴿فصعد النظر فيها و صوبہ﴾ دونوں باب تفعیل کے صیغے ہیں یعنی اوپر نیچے سے اس عورت پر نظر دوڑائی اور پھر تھوڑا سا تامل کیا۔ ”طاطا“ سر نیچے جھکایا ﴿قال سهل ماله داء﴾ یہ جملہ مقررہ ہے۔ ﴿ان لبسته﴾ پہلے میں یہ خطاب کا صیغہ ہے یعنی اگر تو اسے پہنے گا اور دوسرے میں غائب کا صیغہ ہے یعنی اگر وہ عورت پہنے گی۔ ﴿مولیا﴾ تولیہ سے اسم فاعل ہے۔ پیٹھ پھیر کر واپس جانے لگا ﴿عن ظهر قلبك﴾ زبانی یاد ہے ﴿ملکتها﴾ میں نے اس عورت کا تجھے مالک بنایا اس کی عصمت کا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا۔ معلوم ہوا کہ تملیک کا لفظ بھی نکاح کیلئے صحیح ہے۔ ﴿بما معك﴾ ”پا“ یہاں بدل اور مقابلہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ تعلیم قرآنی بھی مہر ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مہر نہ ہوتا تو آپؐ کا اس سے دریافت فرمانا کہ تمہیں کتنا قرآن حفظ ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ اس مرد کو چیزوں کے تلاش کا حکم دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اشیاء مہربن سکتی ہیں۔ یہ اس پر دال ہے کہ معمولی چیز بھی مہربن سکتی ہے کیونکہ لوہے کی انگوٹھی نہایت ہی کم قیمت چیز شمار ہوتی ہے۔ اسی سے یہ مسئلہ اخذ کیا گیا ہے کہ نفع بخش چیز کا مہر مقرر کرنا درست ہے اور ﴿ولو خاتما من حديد﴾ کا جملہ اس کی دلیل ہے کہ کم سے کم چیز بھی مہربن جائز ہے۔ ﴿والتي تليها﴾ یعنی اس سے متصل سورۃ اور وہ ہے سورۃ آل عمران۔ اس حدیث سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ غور و خوض اور مائل کرنے والے سے یہ مسائل پوشیدہ نہیں۔ یہ مقام تفصیل میں جانے اور شرح و بسط سے بیان کرنے کا نہیں۔

(۸۳۴) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَعْلِنُوا النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (اے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح علی الاعلان کیا جانا چاہئے خفیہ اور چھپے طور پر نہیں۔ اس لئے کہ یوں میاں بیوی کے تعلقات پر کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہیں ملتا۔

(۸۳۵) وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّي». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْنَؤَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَانَ، وَأَعْلَى بِالْإِسْنَادِ. وَرَوَى الْإِمَامُ أَحْمَدُ، عَنْ

حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ولی و سرپرست کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن مدینی، ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور مرسل ہونے کی وجہ سے اسے معلول قرار دیا گیا ہے)

الحَسَنَ، عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حسن سے اور انہوں نے عمران مَرْفُوعاً: لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيِّ بن حصین رحمۃ اللہ علیہ سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ”نکاح ولی و سرپرست اور دو گواہوں کے بغیر منعقد و شاہدین۔“
نہیں ہوتا۔“

نفعی تشریح: ﴿اعل بالارسال﴾ یعنی اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا گیا ہے مگر یہ تعلیل درست نہیں کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں یہ ثابت کیا ہے کہ موصول روایت اقویٰ ہے اور راجح ہے۔ لہذا یہ ارسال حدیث کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ اس کے قابل احتجاج ہونے میں رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو تمیں کے قریب صحابہؓ نے روایت کیا ہے اور اس کے بعض طرق صحیح ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ جمہور علماء کی بھی رائے یہی ہے کہ ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ولی سے مراد باپ ہے۔ باپ کی غیر موجودگی میں دادا پھر بھائی پھر چچا ہے اگر کسی کے دو ولی ہوں اور نکاح کے موقع پر اختلاف واقع ہو جائے تو ترجیح قریبی ولی کو ہوگی، اگر کوئی بھی ولی نہ ہو تو حدیث میں ہے کہ سربراہ مملکت اس کا ولی ہے اور اگر دونوں ولی برابر حیثیت کے ہوں اور ان میں اختلاف ہو جائے تو ایسی صورت میں حاکم ولی ہوگا۔

(۸۳۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحْتُ بِغَيْرِ إِذْنٍ وَلَيْهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَإِنْ دَخَلَ بِهَا

فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا، عورت کیلئے حق مہر ہے، اس کی شرم گاہ کو حلال فَاِنْ اسْتَجَرُوا فَالْسلْطَانُ وَلِيٌّ مِّنْ لَا وَلِيَّ لَهُ. اَخْرَجَهُ الْأَزْهَرِيُّ إِلَّا الشَّائِبِيَّ، جائے تو پھر جس کا کوئی ولی نہیں اس کا ولی حاکم وقت وَصَّحَهُ أَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ جَبَّانٍ وَالْحَاكِمُ. ہے۔“ (نسائی کے علاوہ اسے چاروں نایور اسے ابو عوانہ،

ابن حبان اور حاکم تینوں نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ایما امراة﴾ کلمہ ﴿ایما﴾ ان الفاظ میں سے ہے جن میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر عورتوں سے ولایت مطلقاً بغیر کسی تخصیص کے سلب ہو جاتی ہے (یعنی کوئی عورت کسی صورت میں ولی نہیں بن سکتی) اس میں مالکیہ کی اس رائے کا رد ہے کہ شریف و معزز عورت تو ولی بننے کا حق رکھتی ہے اور نچلے درجہ اور مرتبہ کی عورت اس کا استحقاق نہیں رکھتی۔ ﴿نکحت﴾ خود اپنا نکاح کرے اور ولی سے مراد جمہور کے نزدیک وہ شخص ہے جو عصبہ میں سے نسبی طور پر سب سے زیادہ قریب ہو۔ اس کے بعد سبھی رشتہ دار پھر اس کے عصبی رشتہ دار۔ جن لوگوں کے حصہ مقرر ہیں وہ اور ذوالارحام اولیاء نہیں بن سکتے۔ ﴿بما استحل﴾ اس میں ماصدری معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی فرج عورت کو تمتع کیلئے حلال کرنے کی وجہ سے ﴿استجروا﴾ اولیاء میں تنازع اور شدید اختلاف پیدا ہو جائے جو عورت کے نکاح میں مانع بن جائے تو پھر ایسی صورت میں ان اولیاء کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہو گئی اور کالعدم ہو جائیں گے اور ان کا حق ولایت ساقط ہو جائے گا اور یہ استحقاق حاکم وقت کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ پس جب عقد میں اولیاء کا اختلاف و تنازع واقع ہو اور مرتبہ میں سب اولیاء مساوی ہوں تو اس کا عقد معتبر اور قابل تسلیم ہو گا جس نے پہلے عقد کرایا۔ یہ حدیث ولایت کو شرط قرار دینے کی دلیل ہے کہ عورت خود اپنا نکاح کسی صورت میں نہیں کر سکتی۔ جمہور کا یہی موقف ہے اور ان کی تائید اس باب کی احادیث سے ہوتی ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ حاکم نے کہا کہ اس بارے میں ازواج مطہرات کی نبی ﷺ سے روایت صحیح ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے اور کہا کہ اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے تین صحابہ کرامؓ کا نام لیا ہے۔ مگر حنفیہ تو ولی کی شرط کے سرے سے قائل ہی نہیں جب کہ وہ عورت اپنے کفو سے شادی کرے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو بیع پر قیاس کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے مگر یہ کہ معلوم نہیں کہ قیاس کی نص کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔ ان احادیث میں سے بعض پر انہوں (احناف) نے ایسی بے جا گفتگو اور کلام کیا ہے۔ بعض حضرات نے جنہیں دراصل فن میں کوئی بصیرت حاصل نہیں ان احادیث پر بے بنیاد اعتراضات کئے ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۸۳۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ”يُوهُ عَوْرَتُكَ نَكَاحُكَ“ فرمایا: ”یوہ عورت کا نکاح اس سے مشورہ

«لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمَ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلَا لِمَنْ بَغِيرُهُ كَمَا جَاءَ» اور کنواری کا نکاح اس سے تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ، قَالُوا: اجازت لئے بغیر نہ کیا جائے۔ انہوں نے عرض کیا يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَكَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: يَارَسُولَ اللَّهِ (ﷺ)! اس کی اجازت کیسے ہے؟ فرمایا «أَنْ تَسْكُتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

”اس کا خاموش رہنا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا تنکح﴾ صیغہ مجہول۔ یہ مبالغہ کی نفی ہے یا پھر نفی۔ ﴿الایم﴾ ممرہ پر فتح اور ”یاء“ پر تشدید اور کسرہ۔ وزن اور معنی دونوں کے اعتبار سے ثیب کے ہم معنی ہے یعنی ثیب مراد ہے اور ثیب شوہر دیدہ عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند وفات پا گیا ہو یا اسے طلاق ہو گئی ہو۔ ایسی عورت کو ”ایم“ بھی کہتے ہیں اور ثیب بھی۔ ﴿حتی تستامر﴾ جب تک کہ اس سے مشورہ نہ کر لیا جائے۔ یعنی بالمرحت اس سے معلوم کیا جائے اور یہ اجازت و اذن لفظاً ہونی چاہئے اس میں خاموشی ناکافی رہے گی۔ ﴿البکر﴾ ”باء“ کے نیچے کسرہ اور کاف ساکن۔ باکرہ کنواری جس نے ابھی تک شادی نہ کی ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ شریعت کی نظر میں مرد و عورت کی بہت اہمیت ہے اور عورت جسے معاشرہ میں کوئی خاص مقام نہیں دیا جاتا تھا اسے پستی سے اٹھا کر بلند مقام پر پہنچایا ہے، اس کی اہمیت کو دوبلا کیا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں اس سے مشورہ لینا تو کجا اسے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی اجازت تک نہ تھی۔ سربراہ ولی اپنی مرضی سے جس سے چاہتے تھے نکاح کر دیتے تھے، اسے زبان پر لانے کی ہمت نہ تھی۔ نبی ﷺ نے عورت کو اس کا صحیح معاشرتی مقام و منصب دیا اور سرپرستوں کو حکم دیا کہ شوہر دیدہ سے مشورہ ضرور کیا جائے اور کنواری سے اس کی اجازت حاصل کی جائے۔

شوہر دیدہ کا اس کی رضا و مشورہ کے بغیر نکاح کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بغیر ولی کے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

(۸۳۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الْثَّيْبُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، وَالْبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ، وَإِذْنُهَا سَكُوتُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”شوہر دیدہ عورت اپنے دوبارہ نکاح کے بارے میں اپنے ولی کی بہ نسبت خود زیادہ استحقاق رکھتی ہے اور کنواری سے اجازت لی جائے گی اور اس کا اذن اس کی خاموشی ہے۔“ (مسلم)

وَفِي لَفِظٍ: «لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيْبِ أَمْرٌ وَالْيَتِيمَةُ تُسْتَأْمَرُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

اور ایک روایت میں ہے کہ ”شوہر دیدہ عورت کے بارے میں ولی کا کوئی اختیار نہیں اور یتیم بچیوں سے بھی مشورہ لیا جائے۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

انغوی تشریح: ﴿الشَّيْبُ احِقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا﴾ اس سے حنفیہ نے اپنے مذہب کی تائید میں استدلال کیا ہے کہ شوہر دیدہ کیلئے ولایت کی شرط نہیں ہے حالانکہ یہ استدلال قاسد ہے کیونکہ "احق" کا کلمہ صیغہ تفضیل ہے اور تفضیل باہمی شرکت کا متقاضی ہے تو دوسرے کا بھی اسی طرح استحقاق ہے جس طرح خود اس کا حق ہے البتہ اس کا حق زیادہ مؤکد ہے اور رائج ہے پھر اس سے ان کے مذہب کی پوری تائید نہیں ہوتی کیونکہ یہ حضرات تو ولی کے حق کو مکمل طور پر ساقط کر دیتے ہیں۔ بجز اس کے کہ وہ عورت غیر کفو میں اپنی مرضی سے نکاح کرے۔ ﴿لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الشَّيْبِ امْرٌ﴾ یعنی ولی مجبور نہیں کر سکتا اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتا۔

حاصل کلام: جمہور کے مذہب کی روشنی میں حدیث کا معنی واضح ہے کہ اگر ولی اس کے نکاح کا ارادہ کرتا ہے اور وہ عورت وہاں نہیں کرنا چاہتی تو اسے مجبور نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ عورت کہیں نکاح کرنا چاہتی ہے اور ولی اسے روکتا ہے تو ولی کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کے فیصلہ کا احترام کرے۔ پھر اگر اولیاء عقد روکنے پر اصرار کریں تو ولی کا حق ولایت ساقط ہو جائے گا اور قاضی اس کا نکاح کر دے گا۔ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ عورت کا حق نہایت ہی مؤکد اور قائل ترجیح ہے۔

(۸۳۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَزُوجُ الْمَرْأَةَ الْمَرْأَةَ، وَلَا بَنُ كَرَّا نِكَاحَ كَرَّةٍ» اور نہ خود اپنا نکاح کرے۔ (اسے تَزُوجُ الْمَرْأَةَ نَفْسَهَا۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ ابْنُ دَارِ قُطَيْبٍ نے روایت کیا ہے۔ اس کے تمام وَالدَّارُ قُطَيْبِيُّ، وَرِجَالُهُ يَفَاحٌ۔ راوی ثقہ ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت نہ دوسری کسی عورت کی ولی بن سکتی ہے اور نہ خود اپنی ولی بن کر اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہی ہے مگر احتلاف کہتے ہیں کہ ایک عاقل بالغ خاتون اپنا بھی اور اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح بھی کر سکتی ہے اور دوسرے کی وکیل نکاح بھی بن سکتی ہے لیکن اگر کہیں غیر کفو میں نکاح کر لے تو ولی کو تنسیخ کا اختیار بھی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صرف کمین عورت کیلئے جائز ہے مگر اس بارے میں جمہور علماء کی رائے مضبوط ہے۔ (السل)

(۸۴۰) وَعَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ حَضَرْتُمْ نَافِعٌ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَزُوجُ الْمَرْأَةَ الْمَرْأَةَ، وَلَا بَنُ كَرَّا نِكَاحَ كَرَّةٍ» اور نہ خود اپنی ولی بن کر اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہی ہے مگر احتلاف کہتے ہیں کہ ایک عاقل بالغ خاتون اپنا بھی اور اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح بھی کر سکتی ہے اور دوسرے کی وکیل نکاح بھی بن سکتی ہے لیکن اگر کہیں غیر کفو میں نکاح کر لے تو ولی کو تنسیخ کا اختیار بھی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صرف کمین عورت کیلئے جائز ہے مگر اس بارے میں جمہور علماء کی رائے مضبوط ہے۔ (السل)

صَدَاقٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاتَّفَقَا مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَلَى (مسلم) اور بخاری و مسلم دونوں اس پر متفق ہیں کہ اَنَّ تَفْسِيرَ الشَّغَارِ مِنْ كَلَامِهِ نَافِعٌ. شغار کی یہ تعریف نافع کی بیان کردہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿الشغار﴾ شین کے نیچے کسرہ۔ اصل میں تو اس پر رفع ہے۔ کہا جاتا ہے ”شغر الکلب“ جب کتا پیشاب کرنے کیلئے اپنا پاؤں اوپر اٹھاتا ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ایک عورت کا عورت کے بدلہ میں نکاح جبکہ دونوں میں مقرر نہ کیا جائے جیسا کہ حدیث میں اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ یہ دور جاہلیت کے نکاحوں میں سے ایک نکاح تھا جسے شارع نے ممنوع قرار دے دیا ہے۔ تین ائمہ کرام یعنی امام مالک رحمہ اللہ، شافعی رحمہ اللہ اور احمد رحمہ اللہ اس کے باطل ہونے کے قائل ہیں اور ایک گروہ نے کہا ہے مرسل سے یہ نکاح صحیح ہے حالانکہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے۔

(۸۴۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا أَنَّ جَارِيَةً بِكْرًا كُنُوزِي لَوْكِي نَبِيِّ ﷺ فِي خِدْمَتِهِ حَاضِرَةٌ هُوَتْ أَوَّلُ النَّبِيِّ ﷺ، فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا اس نے بتایا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا زَوْجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ، فَخَبَّرَهَا رَسُولُ ﷺ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَةَ. (اسے احمد اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو مرسل ہونے کی بنا پر معلول کہا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿واعل بالازدسال﴾ مگر ارسال کی یہ علت درست نہیں کیونکہ یہ موصول بھی مروی ہے اور خود مصنف رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اس حدیث میں کسی قسم کا طعن بے معنی ہے اس لئے کہ اس حدیث کے ایسے طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ ولی ہے۔ بغیر مشورہ لئے وہ نکاح تو کر سکتا ہے مگر ایسے نکاح میں اس لڑکی کو شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ اگر اس نکاح سے ناخوش ہو تو فسخ کرنے کی مجاز ہے۔

(۸۴۲) وَعَنْ الْحَسَنِ، عَنْ حضرت حسن رحمہ اللہ، حضرت سمہ رحمہ اللہ سے نبی ﷺ کا سَمْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ ”جس عورت کا نکاح دو امراًو زَوْجَهَا وَلَيَّانِ فَهِيَ لِلأَوَّلِ وَلِي کر دیں تو یہ خاتون پہلے خاوند کی ہے۔“ (اسے احمد مِنْهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْمَعِيُّ، وَحَسَنُ اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا الترمذی ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک خاتون کے دو ولی جب دو مختلف آدمیوں میں سے مختلف اوقات میں نکاح کر دیں تو وہ عورت اس آدمی کی بیوی قرار پائے گی جس سے پہلے نکاح کیا گیا ہو اور

نکاح کے مسائل کا بیان 649

دوسرا نکاح از خود باطل قرار پائے گا کیونکہ شریعت نے نکاح پر نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے اور اگر دونوں نکاح بیک وقت کئے جائیں تو دونوں باطل قرار پائیں گے کوئی بھی صحیح نہیں ہوگا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۸۴۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «جَسَ غُلَامٌ لَمْ يَكُنْ لِي فِيهِ نِكَاحٌ وَلَا نِكَاحٌ لِي فِيهِ» (اے اُمّایا عُبَیْدُ تَزَوَّجْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوْلَانِهِ اہل کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ زانی ہے۔) (اے اہلِ اہلِیہ فَهُوَ عَاهِرٌ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ احمد، ابو داؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَكَذَلِكَ ابْنُ نے اسے صحیح کہا ہے اور اسی طرح ابن حبان نے اسے صحیح جِہَانُ. قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿عاهر﴾ زانی اور زنا باطل ہے لہذا یہ نکاح کے بطلان پر دلالت کرتی ہے خواہ مالک عقد کے بعد اجازت دے دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ دونوں کی یہی رائے ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور مالک رحمہ اللہ دونوں کا قول ہے کہ اگر مالک عقد کے بعد اسے اجازت دے دے تو نکاح صحیح ہو جائے گا مگر پہلا قول راجح ہے۔

(۸۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (حضرت ابو ہریرہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ایک مرد کے نکاح میں بھوپھی اور بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو جمع نہ کیا جائے۔“ (بخاری و مسلم)

(۸۴۵) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلَا يُنْكَحُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَلَا يَنْكِحُ مَنْ لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلَا يُنْكَحُ». رَوَاهُ ابْنُ جِبَانَ وَلَا يُخْطَبُ عَلَيْهِ. (حضرت عثمان رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”احرام والا آدمی نہ خود اپنا نکاح کرے اور نہ کسی دوسرے کا نکاح کرے۔“ (مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے ”اور نہ وہ پیغام نکاح دے“ اور ابن حبان نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے

اور ”نہ ہی اس کے پیغام نکاح پر پیغام دیا جائے۔“

لعنوی تشریح: ﴿لا ینکح﴾ ینکح میں ”یا“ پر فتح یعنی خود نکاح نہ کرے کسی عورت کے ساتھ ﴿المحرم﴾ احرام بند خواہ حج کا احرام ہو یا عمرہ کا یا دونوں (حج اور عمرہ) کا۔ ﴿ولا ینکح﴾ یہاں ”یا“ پر ضمہ ہے یعنی نہ وہ شخص ولی یا وکیل بن کر دوسرے کا نکاح کرے ﴿ولا ینخطب﴾ نہ اپنے لئے اور نہ کسی دوسرے کیلئے ﴿ولا ینخطب علیہ﴾ صیغہ مجہول یعنی نہ اس کا کوئی ولی اسے پیغام نکاح دے اور

نہ ہی اس کی قریبی عزیز خاتون اس سے نکاح کا تقاضا و مطالبہ کرے۔ جمہور علماء کی رائے اس حدیث کے مطابق ہے مگر حنفیہ نے اختلاف کیا ہے۔

(۸۴۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَزَوَّجَ النَّبِيُّ ﷺ (بُئِیِّنَا) سے نکاح کیا تو اس وقت ﷺ مَیْمُونَةٌ وَهُوَ مُحْرَمٌ مَنَعَهُ عَلَيْهِ. آپؐ حالت احرام میں تھے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم و لمسلم عَنْ مَیْمُونَةَ نَفْسِهَا: أَنَّ میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا اپنا بیان ہے کہ نبی ﷺ النَّبِيُّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ. نے ان سے نکاح کیا تو اس وقت آپؐ حلال تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے احناف نے استدلال کیا ہے کہ محرم کا نکاح کرنا جائز ہے حالانکہ اس حدیث میں ان کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ اکثر صحابہ کرامؓ کی روایت کے مخالف ہے۔ فرد واحد کی جانب وہم جماعت کی طرف وہم سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ایک آدمی کو وہم ہو جانا جماعت کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے اور خود صاحبہ قصہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور ابو رافع رضی اللہ عنہ جو اس رشتہ کرانے میں سفیر کے فرائض دیتے رہے ہیں، ان سے بھی منقول ہے کہ بلاشبہ نبی ﷺ اس وقت حلال تھے۔ خود صاحبہ قصہ اور سفارت کے فرائض انجام دینے والا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خبر رکھتا ہے اور صورت واقعہ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ لہذا دونوں سے مروی روایت دوسروں کی روایت سے زیادہ لائق اعتبار ہے۔ پھر ان دونوں ابن عباس رضی اللہ عنہما نو دس برس کے بچے ہی تھے۔ پس ان دونوں کے مقابلہ میں ان کا واقعاتی صورت کو محفوظ نہ رکھنا زیادہ قرین قیاس اور لائق ہے اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حضور ﷺ کو محرم کہنے کا مطلب یہ ہو کہ وہ حدود حرم میں تھے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی ﷺ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے تو پھر اسے ان کی خصوصیت پر محمول کیا جائے گا۔ الشیخ عبدالرحمن محدث مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج: ۲، ص: ۸۹) میں اس مسئلہ میں لمبی گفتگو کی ہے اور قائل ترجیح بہر حال جمہور کا قول ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں قانون کلی کا بیان ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول روایت میں نبی ﷺ کے فعل کی حکایت ہے۔ جس میں بہت سے احتمالات ایسے ہیں جو صحیح صورت حال کے قریبی راستہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

(۸۴۷) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ "وَهُ شَرَطُ پورا کئے جانے کا زیادہ اللہ ﷻ: «إِنَّ أَحَقَّ الشَّرُوطِ أَنْ يُوقَىٰ حق رکھتی ہے جس کے ذریعہ تم نے عورتوں کی شرم پہ، مَا اسْتَخْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ». مَنَعَهُ گاہوں کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔" (بخاری و مسلم) عَنِیْہِ۔

حاصل کلام: اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرائط سب سے زیادہ پوری کرنے کی مستحق ہیں وہ شروط

(۸۴۸) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَنْكُوَعِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَخَّصَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَامَ أُوْطَاسٍ فِي الْمُتَعَةِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ نَهَى عَنْهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿عام اوطاس﴾ یہ عام حنین کا دوسرا نام ہے اور یہ فتح مکہ کے سال کا ہی واقعہ ہے جو ۸ھ میں ہوا۔ ”اوطاس“ حنین کے قریب ایک وادی کا نام ہے۔ جب مسلمانوں پر وادی حنین میں قبائل ہوازن و ثقیف ٹوٹ پڑے تھے۔ اس وقت انہوں نے مال، مویشی اور آلِ اولاد سب کچھ اس مقام پر اکٹھا کر لیا تھا۔ جب شکست و ہزیمت سے پالا پڑا تو سب کچھ یہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے تو مسلمانوں نے سب کچھ اپنے قبضہ میں لے لیا اور اسے مالِ غنیمت بنا لیا۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام ”عام حنین“ یا ”عام اوطاس“ پڑ گیا۔ ﴿فی المتعۃ﴾ متعہ کہتے ہیں کسی عورت سے ایک مقرر وقت تک کیلئے نکاح کرنے کو۔ جب مقرر وقت پورا ہو جاتا ہے تو ان کے درمیان خود بخود جدائی ہو جاتی ہے۔ یہ معلوم رہے کہ متعہ دو مرتبہ حرام ہوا اور دوسری مرتبہ مباح و جائز ہوا۔ چنانچہ یہ غزوہ خیبر سے پہلے حلال تھا پھر اسے غزوہ خیبر کے موقع پر حرام کیا گیا جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اسے فتح مکہ کے موقع پر مباح کیا گیا اور ”عام اوطاس“ بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام کر دیا گیا۔ جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ متعہ غزوہ خیبر کے موقع پر حرام نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تحریم فتح مکہ کے سال ہوئی اور یہی رائے درست ہے اور اہل علم کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ متعہ خیبر کے موقع پر حرام ہوا ہے اور انہوں نے صحیحین میں مروی حضرت علی بن ابی طالب رحمہ اللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو آگے آ رہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ متعہ حرام قرار دیا گیا پھر حلال کیا گیا پھر حرام کیا گیا یعنی دو دفعہ منسوخ ہوا ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے متعہ کے علاوہ اور کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جسے حرام کیا گیا ہو پھر حلال کیا گیا ہو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہو۔ مگر دوسرے لوگوں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف فتح مکہ کے سال ہی حرام کیا گیا ہے اور

اس سے پہلے مباح و جائز تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے متعہ کی حرمت اور گھریلو پالتو گدھے کی حرمت کو جمع کر دیا کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ان دونوں کو مباح و حلال سمجھتے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے ان دونوں کی تحریم ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تردید میں بیان کی ہے اور پالتو گدھے کی تحریم یوم خیبر میں ہوئی تھی اور اسکی تحریم کیلئے خیبر کے دن کو بطور ظرف ذکر کیا ہے اور تحریم متعہ کو مطلق بیان کیا ہے کسی وقت و زمانہ سے مقید نہیں کیا۔ جیسا کہ مسند احمد میں صحیح سند سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن گھریلو گدھے کو حرام قرار دیا نیز عورتوں کے متعہ کو بھی حرام کیا اور ایک روایت میں ”حرم متعة النساء و حرم لحوم الحمير الاھلية يوم خیبر“ کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی یوم خیبر میں عورتوں سے متعہ اور گھریلو گدھے کا گوشت کھانا حرام کر دیا۔ جیسا کہ امام سفیان بن عیینہ سے یہ مفصل روایت مروی ہے جس سے بعض راویوں نے سمجھا کہ ان دونوں کو خیبر کے روز ہی حرام کیا گیا ہے تو انہوں نے دونوں کو خیبر کے روز سے مقید کر دیا۔ پھر بعض راویوں نے دونوں میں سے ایک کی تحریم پر اقتصار کیا اور وہ ہے گدھے کی تحریم اور اسی سے اس کو مقید کر دیا بس یہیں سے وہم نے نشوونما پائی اور رہا قصہ خیبر تو اس روز صحابہ کرامؓ یہودی عورتوں سے تو متعہ نہیں کرتے رہے اور نہ ہی انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور نہ ہی کسی نے کبھی اس غزوہ میں اس کو نقل کیا ہے اور نہ ہی اس متعہ کے فعل یا اس کی تحریم کا حتمی ذکر ہے بخلاف فتح مکہ کے۔ فتح مکہ کے موقع پر متعہ کے فعل اور اس کی تحریم کا ذکر مشہور ہے اور اس کی روایت صحیح ترین روایت ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد ج ۲ ص ۱۴۲-۱۴۳) اور علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متعہ کی حرمت مسلمانوں میں اجماعی ہے۔ بجز بعض روافض کے امت مسلمہ میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جو اس کے خلاف ہے۔

(۸۴۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي خَيْبَرَ الْمَتْعَةَ عَامَ خَيْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (مسلم)

(۸۵۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ، وَعَنْ أَكْلِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ يَوْمَ خَيْبَرَ. أَخْرَجَهُ التَّيْمِيُّ إِلَّا أَبَا دَاوُدَ.

(۸۵۱) وَعَنْ رَبِيعِ بْنِ سَبْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنِّي كُنْتُ أَذْنُتُ لَكُمْ فِي الْأَسْتِنَاعِ مِنَ النِّسَاءِ، وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ حَرَّمَ ذَلِكَ إِلَيَّ تَحْيِي. اب اللہ تعالیٰ نے اسے تا روز قیامت حرام

غوی تشریح: ﴿فی الاستمتاع من النساء﴾ عورتوں سے متعہ کے بارے میں ﴿مما اتیموهن﴾ جو کچھ تم نے مرد و معاوضہ دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ربیع بن سبرہ﴾ ربیع بن سبرہ بن معبد جھنی مدنی۔ ان کو نسائی اور عجل دونوں نے ثقہ قرار دیا ہے۔

(۸۵۲) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ الْمُحَلَّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ
وَالْتَّائِبِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَفِي الْبَابِ عَنْ
عَلِيٍّ، أَخْرَجَهُ الْأَرْنَؤَةُ إِلَّا التَّائِبِيَّ.

ہے جسے نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿المحلل﴾ تحلیل سے یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ محلل وہ شخص ہے جو طلاق دینے کی نیت سے مطلقہ ثلاثہ سے نکاح و مباشرت کرے تاکہ وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائے۔ ﴿والمحلل لہ﴾ یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے اس سے وہ پہلا شوہر مراد ہے جس نے تین طلاقیں دیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نکاح برائے تحلیل حرام ہے کیونکہ لعنت حرام فعل پر ہی کی جاتی ہے۔ حنفیہ کے ماسوا جمہور اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اس باب میں انہوں نے حبیشہ عمل اور برے فعل کا ارتکاب کیا کہ نیک و ابرار مسلمان تو درکنار عام فاجر و کفار تک اسے معیوب سمجھتے ہیں۔

(۸۵۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَنْكِحُ الزَّانِي الْمَجْلُودَ إِلَّا مِثْلَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَرَجَّاهُ بَيْهَقٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”زانی جس پر حد زنا کے کوڑے برس چکے ہوں اپنے جیسی حد لگی ہوئی عورت کے سوا کسی دوسری سے نکلح نہ کرے۔“ (اسے احمد اور ابوداؤد نے

روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

نغوی تشریح: ﴿المجلود﴾ مجلود اس شخص کو کہتے ہیں جسے سزائے زنا میں کوڑے لگ چکے ہوں۔

نکاح کے مسائل کا بیان 654

سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کیلئے حرام ہے کہ وہ اس شخص سے نکاح کرے جو زانی ہو اور زانی کیلئے مجلود کی صفت بطور اغلب ہے، اسی طرح مرد کیلئے بھی حرام ہے کہ وہ ایسی عورت سے شادی کرے جو زانیہ ہو اور یہ حدیث ارشاد باری کے موافق ہے و حرم ذلك علی المؤمنین اور یہ مومنوں پر حرام کر دی گئی (۳: ۲۳) اس کے بعد علامہ الیمانی نے اس باب میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے اور بالآخر زانیہ سے نکاح کی حرمت کی تائید کی ہے۔

(۸۵۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: طَلَّقَ رَجُلٌ امْرَأَتَهُ ابْنِي يَؤُوبَ كُتَيْبًا طَلَقَيْنِ دَعَى دِينَ. بَهِرَاسِ عَوْرَتِ ثَلَاثًا، فَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ، ثُمَّ طَلَّقَهَا مِنْ دُوسَرِ آدَمِي نَكَاحَ كَرِيْلَا اُورِ اس سَ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا. فَأَرَادَ زَوْجُهَا هَم بَسْتَرِي كَيْ بَغِيرِي اسَ طَلَاقِ بَهِی دَی. تُو پِیْلَ الْاَوَّلُ أَنْ يَتَزَوَّجَهَا، فَسَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: لَا حَتَّى سَ اس كَی مَتَلَقِ اسْتِفْصَارَ كَیَا تُو اُپْ نَی فَرَمَا یَذُوقُ الْاٰخَرَ مِنْ عُسْلَيْتِهَا مَا ذَاقَ ”نہیں جب تہك دوسرا خاوند اس سے اسی طرہ الْاَوَّلُ. مُتَقَقٌ عَلَیْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

لطف اندوز نہ ہو لے جس طرہ پہلا خاوند ہوا تھا۔“
(بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لعوی تشریح: ﴿عُسْلَيْتِهَا﴾ عسل کی تغیر ہے اور ﴿ذوق العسيلة﴾ جماع سے کنایہ ہے اور جماع کو شد سے تشبیہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح شد کے استعمال سے لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے جماع سے بھی لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے۔ جہور کا قول ہے کہ جماع جس سے حد واجب ہوتی ہے اور مرد و عورت واجب ٹھہرتا ہے وہ ہے جس میں مرد کا حشفہ عورت کی اندام نمائی میں غائب ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مطلقہ ثلاثہ عورت دوسرے سے نکاح کر لے اور دونوں میں تعلق زن و شو بھی قائم ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اپنی آزاد مرضی سے اسے طلاق دے یا یہ دوسرا خاوند وفات پا جائے تو پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح عدت کے بعد ہو سکتا ہے۔ اگر دوسرے مرد سے نکاح تو ہوا مگر مباشرت و ہم بستری نہ ہوئی یا وہ مرد ہی مباشرت و مجامعت نہ کر سکا اور اس نے طلاق دے دی تو اس صورت میں پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح درست نہیں ہوگا اور اگر دوسرا نکاح صرف حلالہ کی نیت سے کیا تو دوسرے خاوند سے نکاح ہی منعقد نہیں ہوگا۔ اس صورت میں محلل اور محللہ تو لعنتی قرار پاتے ہی ہیں ساتھ ہی پہلے مرد سے دوبارہ نکاح بھی حرام ہے۔

کفو (مثل، نظیر اور ہمسری) اور

۱ - بَابُ الْكُفَاةِ وَالْخِيَارِ

اختیار کا بیان

(۸۵۵) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْعَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، وَالْمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، إِلَّا حَائِكًا أَوْ حَجَّامًا». رَوَاهُ الْحَاكِمُ، وَفِي إِسْنَادِهِ زَائِدٌ لَمْ يُسَمَّ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ الْبَزَّازِ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ يَسْتَدِ مُنْقَطِعٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”عرب ایک دوسرے کیلئے کفو ہیں اور موالی بھی ایک دوسرے کیلئے کفو ہیں۔ بجز جولاہے اور حجام کے۔“ (اس روایت کو حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایسا راوی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا اور ابو حاتم نے اسے منکر قرار دیا ہے اور اس کا ایک شاہد بزار میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر اس کی سند بھی منقطع ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الکفاءة﴾ کفاءة کے قاف پر فتح اور مدنی مساوات، مماثلت، ہمسری اور یہ دین اور اخلاق میں معتبر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفو کا اعتبار چار چیزوں میں کیا گیا ہے۔ دین، نسب، آزادی اور پیشہ و صنعت کاری۔ اور ان میں پہلا قول راجح اور اس کے قابل ترجیح ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ ﴿اکفاء﴾ کفو کی جمع ہے کفو کے کاف پر ضمہ اور ”فاء“ ساکن اور اس کے بعد حمزہ ہے، اس کے معنی ہیں مثل اور نظیر ﴿الموالی﴾ مولیٰ کی جمع ہے۔ جو عرب نہ ہو اسے مولیٰ شمار کیا گیا ہے۔ ﴿الاحائک﴾ جولاہا جو کپڑا بننے کا پیشہ ور ہو۔ یہ حدیث باطل ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ یہ جھوٹ کا پلندہ ہے اس کی کوئی اصل نہیں اور دوسرے مقام پر کہا ہے یہ باطل ہے اور علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے اور موضوع و تصنیف کردہ ہے۔ اس کے بہت سے طرق ہیں سب کے سب واپسی ہیں۔ ان سب کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب التخصیص الجیر میں کیا ہے۔

(۸۵۶) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «أَنْكِحِي أُسَامَةَ». رَوَاهُ (مُسْلِمٌ).

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو مشورہ دیا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیں۔

حاصل کلام: شامہ مصنف نے اس حدیث کو یہاں اس لئے بیان کیا ہے کہ مسئلہ کفائت میں دین کے سوا اور کسی چیز کا اعتبار نہیں کیونکہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا قریش کی شاخ فہر کی معزز خاتون تھیں اور اسامہ خود بھی غلام تھے اور ان کا باپ بھی غلام تھا۔

راوی حدیث: ﴿فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا﴾ فاطمہ بنت قیس بن خالد فہریہ۔ مشہور صحابی حضرت

نکاح کے مسائل کا بیان 656

ضحاکؓ کی مشہور صحابیہ بہن ہیں۔ سب سے پہلی ہجرت کرنے والی خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ ان سے ایک پورے گروہ نے روایت کیا ہے۔ بڑی حسین و جمیل، عقلمند و دانا اور کمال ہنر کی مالکہ تھیں۔ پہلے یہ ابو عمرو بن حفصؓ کے نکاح میں تھیں، انہوں نے ان کو طلاق دے دی۔ تو نبی ﷺ نے ان کا نکاح اسامہ بن زیدؓ سے کر دیا (جو رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ زید کے بیٹے تھے) اور اس نکاح میں اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر پیدا فرمائی۔ ان (فاطمہ بنت قیسؓ) کا اپنا قول ہے کہ لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے۔

(۸۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «يَا بَنِي بَيَاضَةَ أَنْكِحُوا أَبَا هِنْدٍ وَأَنْكِحُوا» کی لڑکیوں سے نکاح کرو۔ اور یہ یاد رہے کہ ابوہند اِلَيْهِ، وَكَانَ حَجَّامًا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ حجام تھے۔ (اسے ابو داؤد، حاکم دونوں نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے) وَالْحَاكِمُ بِسَنَدٍ حَسَنٍ.

لغوی تشریح: ﴿انکحوا اباهند﴾ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے اپنی لڑکیاں اس کے ہاں بیاہ دو۔ ﴿وانکحوا الیہ﴾ باب فتح سے امر کا صیغہ۔ اس کا معنی ہے کہ اس کی لڑکیوں کو تم اپنے لئے پیغام نکاح دو۔ اسے محض اس وجہ سے خارج نہ کرو کہ وہ حجام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ابوہند کا جو ذکر ہے ان کا نام یسار تھا۔ یہ بنو بیاضہ جو قبائل عرب میں ایک قبیلہ تھا ان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ نبی ﷺ بنو بیاضہ کو فرما رہے ہیں کہ ابوہند کا نکاح اپنے قبیلہ کی کسی عورت سے کر دو۔ اس طرح حضور ﷺ نے نسب کے بت کو پاش پاش کر دیا۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جلیل القدر غنی صحابی جن کا تعلق عرب کے سب سے معزز قبیلہ قریش سے تھا نے اپنی ہمیشہ ہالہ کو بلال حبشی کے عقد نکاح میں دے کر نسب کے فخر کو توڑا اور خلیفہ مانی حضرت عمرؓ نے اپنی لخت جگر حضرت حفصہؓ کو حضور ﷺ کے حرم میں داخلہ سے پہلے حضرت سلمانؓ پر پیش کیا تھا۔ ان مثالوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ حسب و نسب اور حسن و جمال اپنی جگہ بڑے اہمیت کے حامل ہیں مگر دینداری کے مقابلہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوہندؓ﴾ ان کا نام یسار تھا اور ایک قول کے مطابق ان کا نام سالم بن ابی سالم اور ایک قول کے مطابق عبداللہ بن ہند تھا۔ یہ وہ خوش نصیب صحابی ہیں جنہوں نے نبی ﷺ کو سنگی لگائی تھی اور بنو بیاضہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرات ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، جابرؓ اور خالدؓ نے ان سے روایت کیا ہے۔

(۸۵۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: خُبِرْتُ بِرَبِيرَةَ عَلَى زَوْجِهَا حِينَ عَقَّتْ. مَتَّقَ عَلَيْهِ فِي بارے میں اختیار دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ لمبی حدیث کا حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت بریرہؓ نے کہا: خُبِرْتُ بِرَبِيرَةَ عَلَى زَوْجِهَا حِينَ عَقَّتْ. مَتَّقَ عَلَيْهِ فِي

ٹکڑا ہے)

حَدِيث طَوِيلٌ .

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهَا: «أَنَّ زَوْجَهَا كَانَ عَبْدًا»، وَفِي رِوَايَةٍ عَنْهَا: «كَانَ حُرًّا»، وَالْأَوَّلُ أَثْبَتٌ، وَصَحَّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا عِنْدَ الْبُخَارِيِّ: «أَنَّهُ كَانَ عَبْدًا».

اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ بریرہؓ کا خاوند غلام تھا اور ان ہی سے ایک روایت میں ہے کہ وہ آزاد تھا۔ پہلی روایت زیادہ پختہ ہے۔ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح قول یہ ہے کہ وہ غلام تھا۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ آزاد ہونے کے بعد عورت جبکہ اس کا خاوند نہ ہو غلام ہو۔ شوہر کے بارے میں خود مختار ہے۔ چاہے اس کی زوجیت میں رہے چاہے نہ رہے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ وہ آزاد ہو۔ ایک قول کے مطابق عورت کیلئے کوئی اختیار نہیں، اسے اسی خاوند کی زوجیت میں رہنا ہوگا۔ یہ رائے جمہور کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ آزاد ہے تو اختیار کا ثبوت اس کیلئے ہے۔ اسے ابن قیم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ معلوم رہے کہ یہ حدیث بڑی عظیم الشان ہے۔ اپنی کتابوں میں علماء نے کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے اور خود مصنف رحمہ اللہ نے اس سے بہت سے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ جن کی تعداد ایک سو بائیس تک پہنچتی ہے۔ (سبل السلام)

(۸۵۹) وَعَنْ الصَّحَابِ بْنِ قَيُّوَزٍ
الدِّلْمِيِّ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى
عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ!
إِنِّي أَسْلَمْتُ، وَتَخَنِي أُخْتَانِ، فَقَالَ
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اطْلُقْ أَيْتَهُمَا
شِئْتَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَعِيُّ إِلَّا النَّسَائِيَّ،
وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالذَّارِقُطْنِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ، وَأَعْلَاهُ
الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: یہ حدیث کفار کے زمانہ کفر کے نکاح کے قابل اعتبار کی دلیل ہے۔ اگرچہ وہ نکاح، اسلامی نکاح کے مخالف ہو۔ اسلام میں نکاح کی حیثیت تو یہ ہے کہ عورت کو خاوند جب تک طلاق نہ دے وہ اس کی زوجیت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی اور یہ کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تجدید نکاح کے بغیر ہی نکاح باقی رہتا ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور داؤد رحمہ اللہ کا ہے۔ (سبل السلام) فیروز دیلی سے ترمذی میں منقول الفاظ ہیں کہ ”ان دونوں میں سے جس کا چاہو، انتخاب کر لو“ آنے والی حدیث کے موافق ہیں اس اعتبار سے کہ جب اس نے اپنی بیویوں میں سے بعض کا انتخاب کر لیا

نکاح کے مسائل کا بیان 658

کہ میں نے نکاح کیلئے فلاں فلاں عورت کو منتخب کر لیا ہے تو ان کا نکاح ثابت ہو گیا اور باقی ماندہ بیویوں کو بغیر طلاق دیئے جدائی حاصل ہو جائے گی۔ نیز یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جدائی کے وقت ترتیب نکاح غیر مؤثر ہے۔ پس مرد کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ پہلی بیوی کو روک رکھے اور نہ یہ ضروری ہے کہ بیویوں میں سے پہلی چار کو روک رکھے بلکہ اسے اختیار ہے جسے چاہے روک لے اور جسے چاہے جدا کر دے۔ یہ دونوں احادیث حنفیہ کے خلاف حجت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿الضحاک﴾ ”حاء“ پر تشدید۔ بن فیروز۔ ”فاء“ پر فتح ”یاء“ ساکن اور ”راء“ پر ضم۔ عجم اور علیت دونوں سیبوں کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ الدیلی۔ ”دال“ پر فتح دلیلم فارس کے مشہور پہاڑ کی طرف منسوب اور ضحاک مشہور تابعی ہیں۔ ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث بصریوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔

﴿عن ابیہ﴾ فیروز دلیلی رحمہ اللہ ابو عبد اللہ فیروز دلیلی رحمہ اللہ۔ انیس حمیری بھی کہا جاتا تھا حمیر میں فروکش ہونے کی وجہ سے۔ حمیر اہل فارس سے تھے اور صنعاء کے رہنے والے تھے اور یہ ان لوگوں کے وفد میں شامل تھے جو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور یہ یمن کے مدعی نبوت کذاب عسی کے قاتل ہیں۔ انہوں نے عسی کو نبی ﷺ کے آخری ایام مرض الموت میں قتل کیا تھا اور حضور ﷺ کو یہ خبر اس مرض کے دوران موصول ہوئی تھی جس میں آپؐ نے وفات پائی۔ ان کی وفات حضرت عثمان رحمہ اللہ کے دور خلافت میں ہوئی۔

(۸۶۰) وَعَنْ سَالِمٍ، عَنْ أَبِيهِ، حَضْرَتِ سَالِمٍ نے اپنے باپ سے بیان کیا کہ غیلان
أَنَّ غَيْلَانَ بْنَ سَلَمَةَ أَسْلَمَ، وَلَهُ دس بیویاں تھیں۔ ان سب نے غیلان کے ساتھ
عَشْرَ نِسْوَةٍ، فَأَسْلَمْنَ مَعَهُ، فَأَمَرَهُ اسے اسلام قبول کر لیا۔ پس نبی ﷺ نے غیلان رحمہ اللہ سے
النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَتَخَيَّرَ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا. رَوَاهُ فرمایا کہ ”ان میں سے چار کا انتخاب کر لو۔“ (اسے
أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانٍ وَالْحَاجِمُ، احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے
وَأَعْلَاهُ الْبَحَارِيُّ وَأَبُو زُرْعَةَ وَأَبُو حَاتِمٍ۔ اسے صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری، ابوزرعہ اور ابوحاتم نے اسے

مطلوب کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی بنا پر ایک مسلمان کیلئے چار سے زائد بیویاں ایک ہی وقت میں رکھنا حرام ہے اور یہ حکم متعدد روایات میں منقول ہے۔ نبی کریم ﷺ کے حرم میں نو بیویاں تھیں تو یہ حضور ﷺ کیلئے خاص رعایت تھی۔ جس میں دینی اور سیاسی مصلحتیں تھیں اور یہ رعایت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دی تھی۔ اس لئے اس پر اعتراض کرنا سراسر حماقت ہے۔

راوی حدیث: ﴿غیلان بن سلمہ ثقفی رحمہ اللہ﴾ عین پر فتح ”یا“ ساکن۔ ثقیف کے سرداروں میں

نکاح کے مسائل کا بیان 659

سے تھے۔ فتح طائف کے بعد اسلام قبول کیا، ہجرت نہیں کی۔ خوش الحان شاعر تھے۔ خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں وفات پائی۔

(۸۶۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَدَّ النَّبِيُّ ﷺ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ بَعْدَ سِتِّ سِنِينَ بِالنِّكَاحِ الْأَوَّلِ، وَلَمْ يُحْدِثْ نِكَاحًا. زَوَّاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْوَاجُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ (۱) وَالْحَاجِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو ابو العاص کی طرف چھ سال بعد پہلے نکاح کے ساتھ واپس فرما دیا تھا۔ نیا نکاح نہیں کیا تھا۔ (اسے احمد اور چاروں نے سوائے نسائی کے روایت کیا ہے اور احمد اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

نفی تشریح: ﴿ولم یحدث نکاحا﴾ یحدث، احداث سے ماخوذ ہے۔ یعنی نیا اور جدید نکاح نہیں کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بیٹی کو دو سال بعد واپس فرمایا اور ایک روایت میں تین سال اور چھ سال کی مدت سے مراد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت سے لے کر ابو العاص کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے تک کا عرصہ ہے اور دو سال یا تین سال سے مراد وہ عرصہ ہے جب ﴿لاهن حل لهن﴾ کی آیت نازل ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ابو العاص کا مسلمان ہو کر واپس آنے تک کا وقفہ اور یہ عرصہ دو سال اور کچھ مہینے ہیں۔ لیکن اس کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے دوسرے سن ہجری میں ہجرت کی یا تین ہجری کے آغاز میں اور ان کی وفات ۸ھ کے شروع میں ہوئی۔ ملاحظہ ہو (سبل السلام، ج: ۲، ص: ۱۵۳) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت اور ان کی وفات کے درمیان پانچ برس اور چند ماہ کا وقفہ ہے۔ لہذا ابو العاص کا قبول اسلام اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ان کو واپسی اسی مدت کے دوران عمل میں آئی۔ ابن حشام نے بیان کیا ہے کہ ابو العاص نے فتح مکہ سے تھوڑا پہلے اسلام قبول کیا نیز یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابو العاص تاجروں کے اموال تجارت لے کر شام سے واپس آرہے تھے۔ ان اموال میں مشرکین مکہ کی امانتیں بھی تھیں جن کو مسلمانوں کے سر یہ نے چھین لیا تھا۔ ابو العاص مدینہ میں رات کے وقت داخل ہوئے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو پناہ دی۔ مسلمانوں نے چھینے ہوئے مال ابو العاص کو واپس کر دیئے اور وہ مکہ واپس چلے گئے اور جن جن کی امانتیں تھیں ان کو واپس کر کے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ قصہ تو اس کا مقتضی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہو نہ کہ فتح مکہ سے پہلے کا۔ اگر یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا تسلیم کیا جائے پھر تو یہ میثاق حدیبیہ کو توڑتا ہے۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے معاہدہ حدیبیہ کو نہیں توڑا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات ۸ھ

کے اوائل میں ہوئی اور یہ معلوم شدہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ ۸ھ کے آخر میں ہوئی ہے اگر ابو العاص کے قبول اسلام کا وقت فتح مکہ کے قریب تسلیم کیا جائے تو پھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ابو العاص کے ہاں واپسی کیسے ممکن ہوگی جبکہ وہ اسی سال کے اوائل میں وفات پا چکی تھیں۔ پس صحیح وہی ہے جسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ابو العاص نے حدیبیہ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو الہدیٰ، ج: ۴، ص: ۱۳) جب یہ ثابت ہوا کہ ابو العاص نے حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا ہے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی واپسی نکاح جدید سے نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مشرکین پر مسلمان خواتین کو حرام قرار دینے کا معاہدہ حدیبیہ کے مکمل ہونے کے بعد نازل ہونے والی آیت میں کیا گیا ہے۔ لہذا اس مدت کے دوران نکاح فسخ نہیں ہوا کیونکہ اس بارے میں کوئی شرعی حکم ہی نہیں تھا۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح ترین روایت یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی واپسی تین سال بعد ہوئی تھی یعنی تین سال مکمل اور چند ماہ اس کے علاوہ۔ اس تحقیق کے بعد بہت سے اشکالات از خود رفع ہو جاتے ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث معنی اور متن کے اعتبار سے اسی طرح صحیح ہے جس طرح یہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور عمرو بن شعیب کی آنے والی روایت معنی اور متن کے اعتبار سے اسی طرح ضعیف ہے جس طرح یہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اور یہ حدیث اہل علم کے اس خیال و رائے کی تردید نہیں کرتی اور نہ اس کے معارض ہے کہ جب عورت اسلام قبول کر لے پھر اسی عدت کے دوران اس کا شوہر بھی اسلام میں داخل ہو جائے تو وہی اپنی بیوی کا زیادہ مستحق ہے۔ لیکن جب عورت اسلام قبول کر لے اور اس کا شوہر عدت کے دوران اسلام قبول نہ کرے اور عدت کی مدت بھی ختم ہو جائے تو دونوں میں جدائی واقع ہو جائے گی۔ اب اسے جدید نکاح کے ماسوا کسی صورت میں واپس نہیں کیا جائے گا۔ ہاں تو ہم یہاں ایک نہایت لطیف بحث ذکر کرتے ہیں جسے ابن قیم نے اپنی الہدیٰ، ج: ۴، ص: ۱۳، ۱۵ میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ احادیث میں تو کہیں عدت کا اعتبار مذکور نہیں اور نہ نبی ﷺ ہی نے کسی خاتون سے دریافت فرمایا کہ کیا اس کی عدت ختم ہوئی ہے یا نہیں اور اس میں کوئی شک و ریب نہیں کہ مجرد اسلام ہی فرقت و جدائی کا باعث ہو تو پھر یہ علیحدگی رجعی نہیں بلکہ بائنہ ہو۔ تو پھر نکاح کے باقی رکھنے میں عدت کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس کا اثر تو پھر دوسرے سے نکاح کرنے کی صورت میں واقع ہوتا ہے۔ اگر اسلام ان دونوں کے درمیان جدائی کو پورا کرنے والا ہو تو پھر شوہر عدت کے درمیان زیادہ استحقاق نہیں رکھتا۔ لیکن جس پر نبی ﷺ کا حکم دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح موقوف ہے۔ اگر شوہر نے اس کی عدت کے اختتام سے پہلے اسلام قبول کر لیا پھر یہ اس کی بیوی رہے گی اور اگر عدت ختم ہو گئی تو پھر عورت خود مختار ہے چاہے تو نکاح کر لے اور اگر اسے انتظار کرنا پسند ہو تو انتظار کر لے۔ پھر اگر اس مرد نے اسلام قبول کر لیا تو بغیر تجدید نکاح وہ اس کی بیوی رہے گی۔ ہمارے علم میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں جس نے اسلام لانے کی وجہ سے لانا تجدید نکاح کیا ہو بلکہ دونوں معاملوں میں سے ایک کا واقع ہونا ضروری ہے یا تو دونوں میں جدائی و علیحدگی ہوگی اور اس خاتون کا دوسرے سے نکاح ہوگا۔ یا پھر دونوں کا

نکاح کے مسائل کا بیان 661

نکاح برقرار رہے گا خواہ عورت پہلے اسلام لائی ہو یا مرد اور رہا جدائی و علیحدگی کی تکمیل اور عدت کا لحاظ تو ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے فیصلہ فرمایا ہو جبکہ آپ کے عہد مبارک میں پاکثرت مرد اور ان کی بیویوں نے اسلام قبول کیا۔ میان بیوی میں سے کسی کا قبول اسلام ایک سے قریب بھی تھا اور بعید بھی۔ انتہی۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلام و گفتگو متانت و حسن کی انتہا تک پہنچی ہوئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿زینب بنت رسول اللہ ﷺ﴾۔ یہ حضور ﷺ کی بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی والدہ ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ بنت خویلد تھیں۔ ان سے ان کے ماموں زاد ابوالعاص بن ربیع نے نکاح کیا اور ایک بیٹا علی پیدا ہوا۔ وہ جب بلوغت کے قریب پہنچا تو فوت ہو گیا۔ فتح مکہ میں وہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی پر سوار تھا۔ پھر ان سے امامہ بنت ہاشم پیدا ہوئیں۔ حضرت زینبؓ نے بدر کے بعد ہجرت کی۔ ۸ھ کو فوت ہوئیں۔ آپؐ نے خود ان کو قبر میں اتارا۔

﴿ابوالعاص بن ربیعؓ﴾ ان کا نام معمم (میم کے نیچے کسرہ ”قاف“ ساکن) تھا۔ پورا نسب یوں بنتا ہے معمم بن ربیع بن عبد العزیٰ۔ ایک قول ہے کہ ان کا نام لقیط تھا۔ وہ نبی ﷺ کے داماد تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان کے نکاح میں تھیں۔ یوم بدر میں حالت کفر میں یہ قیدی بنا۔ اسے فدیہ لئے بغیر رہا کر دیا گیا اور اسے کہا گیا کہ زینب بنت رسول کو بھی ساتھ لے جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد مدینہ ہجرت کی۔ آپؐ نبی ﷺ کے عزیز اور محبوب تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

(۸۶۲) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیبؓ نے اپنے والد سے، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ اَبْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي الْعَاصِ بْنِكَاحِ جَدِيدٍ. قَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ أَجْوَدُ إِسْنَادًا، وَالْعَمَلُ عَلَى حَدِيثِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ. (مروئی حدیث سے مروی حدیث پر ہے)

(۸۶۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَسْلَمَتِ عَمْرَةُ فِي رَجَاءٍ، فَجَاءَ زَوْجُهَا: فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي كُنْتُ أَسْلَمْتُ، وَعَلِمْتُ بِإِسْلَامِي، فَأَنْتَزَعَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ زَوْجِهَا (دوسرے شوہر) سے چھین کر پہلے خاوند کی طرف

الْآخَرِ، وَرَدَّهَا إِلَى زَوْجِهَا الْأَوَّلِ. اسے لوٹا دیا۔ (اسے احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت رواہ أحمد وأبو داود وابن ماجه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ كَيْسٍ، ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے) جَبَّانَ وَالْحَاكِمِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اختلاف دین کی وجہ سے جب میاں بیوی کے درمیان جدائی و علیحدگی واقع ہو جائے اور عورت کے ایام عدت میں مرد بھی مسلمان ہو جائے اور عورت پہلے ہی مسلمان ہو چکی ہو اور اس عورت کو مرد کے قبول اسلام کا علم بھی ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں وہ دوسری جگہ نکاح کرنے کی قطعاً مجاز نہیں ہے۔ اگر کرے گی تو نکاح باطل قرار دیا جائے گا۔

(۸۶۴) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ كَعْبٍ بْنِ عَجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ نَامِي خَاتُونٍ سَمِعَتْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي بَيْتِهَا إِذْ تَزَوَّجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْعَالِيَةَ مِنْ بَنِي غِفَارٍ، فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ، وَوَضَعَتْ ثِيَابَهَا، رَأَى بِكَشْحِهَا بَيَاضاً، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَلَبَسِي ثِيَابَكَ، وَالْحَقِّي بِأَهْلِكَ، وَأَمَرُ لَهَا بِالصَّدَاقِ. رواه الحاكم، وفي إسناده جميلٌ بنٌ يَزِيدَ، وَهُوَ مَجْهُولٌ، وَخُلِيفٌ عَلَيْهِ فِي شَيْخِهِ اخْتِلَافاً كَثِيراً.

حضرت زید بن کعب بن عجرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو غفار کی عالیہ نامی خاتون سے نکاح کیا۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس خلوت میں داخل ہوئی اور اس نے اپنا لباس اتارا تو آپ نے اس کے پہلو میں پھلہری (برص) کے داغ دیکھے۔ تو نبی ﷺ نے اسے فرمایا ”اپنے کپڑے پہن لے اور اپنے میکے چلی جا“ اور آپ نے اس کیلئے حکم ارشاد فرمایا کہ مردے دیا جائے۔ (اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں جمیل بن زید ایسا راوی ہے جو مجہول ہے اس کے استاد میں بہت اختلاف کیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿غفار﴾ عین کے نیچے کسرہ۔ مشہور و معروف قبیلہ۔ ﴿بکشحها﴾ کاف پر فتح اور شین ساکن۔ وہ حصہ جسم جو پہلو اور پیلی کے درمیان واقع ہے ﴿بیاضاً﴾ سفیدی۔ برص کی سفیدی۔ ﴿الحقی﴾ اللہ کو حق سے امر کا صیغہ ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ برص کے عیب کی وجہ سے نکاح منہج ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلاق بالکناہیہ بھی معتبر ہے۔ آپ نے عالیہ کو الحقی باہلک کے الفاظ سے طلاق بالکناہیہ دی۔ گویا طلاق بالکناہیہ شریعت میں قابل اعتبار ہے۔ نیز یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ برص وہ عیب ہے جس سے نکاح منہج ہو سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چار عیوب ایسے ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کو رد کیا جاسکتا ہے۔ جنون، جذام، برص، اندام نہانی کی بیماری یا آتشک و سوزاک وغیرہ۔ لیکن یہ حدیث منقطع ہے۔ جمہور علماء باعث نفرت بیماری کی بنا پر منہج نکاح کے قائل ہیں مگر داؤد ظاہری اور ابن حزم وغیرہ تو کسی عیب کی وجہ سے منہج کے سرے سے قائل ہی

نہیں۔

راوی حدیث: ﴿زید بن کعب بن عجرہ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا تعلق بنو سالم بن عوف سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنو سالم بن ملی، خزرج کے حلیف سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی طرف نسبت ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے متدرک کی تلخیص میں ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے حالانکہ امام ابن معین رحمہ اللہ کا قول جمیل بن زید کے بارے میں ہے۔

﴿عالیہ بنی غفار﴾ من بنی غفار کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بنی بکر بن کلاب سے تھیں اور وہ عالیہ بنت ظبیان ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کلابیہ اور ہے اور عالیہ اور ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی ﷺ عالیہ کے پاس کئی عرصہ ٹھہرے پھر اسے طلاق دے دی۔

﴿جمیل بن زید﴾ قبیلہ طے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے طائی کہلائے۔ ابن معین اور نسائی دونوں نے کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کی حدیث صحیح نہیں۔ نیزائمہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

(۸۶۵) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ ،
أَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ
أَمْرَأَةً، فَدَخَلَ بِهَا، فَوَجَدَهَا بَرْصًا،
أَوْ مَجْنُونَةً، أَوْ مَجْذُومَةً، فَلَهَا
الصَّدَاقُ بِمَسِيئِهِ إِيَّاهَا، وَهُوَ لَهُ
عَلَى مَنْ عَرَّهَ مِنْهَا. أَخْرَجَهُ سَعِيدُ ابْنُ
مَنْصُورٍ وَمَالِكٌ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَرَجَّاهُ بَقَاتٌ.

وَرَوَى سَعِيدٌ أَيْضًا عَنْ عَلِيٍّ

نَحْوَهُ، وَرَأَدَ: «وَبِهَا قَرْنٌ، فَرَوَّجَهَا
بِالْخِيَارِ، فَإِنْ مَسَّهَا فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا
اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا».

اگر مرد نے اس عورت سے مباشرت کی ہو تو عورت
کی شرم گاہ کو حلال کرنے کے بدلہ میں مردینا ہوگا۔

انغوی تشریح: ﴿برصا﴾ مرض برص میں مبتلا عورت۔ ﴿مجذومہ﴾ مرض جذام میں مبتلا عورت۔ یہ
خبیث مرض فساد خون کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ سے اعضاء بدن بالخصوص ہاتھوں اور پاؤں کے

نکاح کے مسائل کا بیان 664

اطراف سے گوشت جھڑ جاتا ہے۔ ﴿فلها الصداق﴾ صداق کے صادر فتح اور کسرہ دونوں طرح جائز ہے۔ یعنی اس کے لئے ہے۔ ﴿بمسیسہ ایہاھا﴾ عورت کے ساتھ مرد کی مباشرت و جماعت ﴿وهولہ﴾ یعنی مہر خاوند کیلئے۔ ﴿علی من غره﴾ غره جس نے اسے دھوکہ دیا۔ ﴿منہا﴾ عورت کے اس معاملہ میں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خاوند اس آدمی سے مہر کی رقم وصول کرے گا جس نے اس عورت کے معاملہ میں نکاح کی ترغیب دلا کر دھوکہ دیا اور اس کا عیب مخفی رکھا اور اسے بیان نہیں کیا ﴿قرن﴾ قاف پر فتح اور ”را“ ساکن۔ ”عفلہ“ کو کہتے ہیں۔ لیث نے کہا ہے کہ عفلہ اس چیز کو کہتے ہیں جو عورتوں کی اندام نہانی اور اونٹنی کی شرم گاہ میں نکل آتی ہے۔ یہ چیز مردوں کے خصلوں میں پیدا ہونے والی آما میں خضیہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ ابن الاعرابی کا قول ہے کہ العفل کے معنی گوشت کی پیدائش یعنی ایسا گوشت جو عورت کی اندام نہانی میں ابھر آتا ہے اس کو قرن کہتے ہیں اور ابن درید نے کہا ہے العفل مردوں کی دہر میں سخت گوشت کا ابھار اور عورتوں کے رحم میں رسولی قسم کی چیز اور ابو عمرو شیبانی نے کہا ہے کہ العفل ایک گول چیز ہے جو عورت کی شرم گاہ پر نکل آتی ہے اور کہا گیا ہے یہ گول چیز یا کرہ عورتوں میں نہیں ہوتی یہ عورتوں میں پیدائش کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو (لسان العرب)

حاصل کلام: اس اثر سے معلوم ہوا کہ اگر عورت کا ولی و سرپرست دھوکہ سے کسی ایسے مرد کے ساتھ اس کا نکاح کر دے جو عورت دائمی مریضہ ہو، دیوانی ہو یا جذام کو کڑھ کے موذی مرض میں مبتلا ہو یا اسے پھلہری ہو تو دھوکہ سے کرایا ہوا ایسا نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نکاح کسی ایسے مرد سے کر دیا جائے جو کسی موذی مرض کا شکار ہو یا کوئی دوسرا خطرناک عیب ہو تو عورت اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وجوب مہر کیلئے صرف خلوت صحیح کافی ہے۔ تعلق زن و شولازی نہیں۔ احناف کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد اگر ایسی عیب دار دھوکہ دہی کے ذریعہ سے نکاح میں دی گئی عورت نہ رکھنا چاہے تو اس پر ادائیگی، مہر، نائق بوجھ ہے اور اگر عورت کو نہ ملے تو اس کی حق تلفی ہے۔ اسی بنا پر حق مہر کی ادائیگی کا بوجھ عورت کے اولیاء پر ڈالا گیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے دیدہ دانستہ دھوکہ دیا ہے۔

(۸۶۶) وَمِنْ طَرِيقِ سَعِيدِ بْنِ اَوْرِ سَعِيدِ بْنِ مَسِيْبِ بْنِ اَسْلَمَةَ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَضَىٰ بِهِ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِي الْعَيْنِ اَنْ كَيَا۔ (اس روایت کے راوی ثقہ ہیں)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کیلئے اختیار کا فیصلہ کیا۔ ﴿فبی العین﴾ عین کے عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید سکین کے وزن پر۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو قوت مردی نہ ہونے کی وجہ سے عورت کے پاس جانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور مباشرت و جماعت بھی نہ

نکاح کے مسائل کا بیان 665

کر سکتا ہو۔ ﴿یوجل﴾ تاجیل سے ماخوذ ہے، صیغہ مجہول ہے۔ ڈھیل دینا، تاخیر کرنا، مؤخر کرنا۔ یہ آثار اور زید بن کعب بن عجرہ کی حدیث تمام اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ہر وہ عیب و نقص جو میاں بیوی کے درمیان نفرت کا موجب ہو اور نکاح کا مقصد بھی حاصل نہ ہو یعنی آپس میں مؤدت و رحمت پیدا نہ ہو یا وہ عیب و نقص و طیفہ زوجیت میں دخل انداز ہو، اختیار کو واجب قرار دے دیتا ہے اور فسخ نکاح کا سبب ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب زاد المعاد میں اسی کو اختیار کیا ہے اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔

عورتوں (بیویوں) کے ساتھ رہن

۲ - باب عشرة النساء

سن و میل جول کا بیان

(۸۶۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَلْعُونٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِي دُبْرِهَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، لَكِنْ أَعْلَى بِالْإِزْسَالِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص عورت سے اس کی دبر میں جماع کرے وہ لعنتی ہے۔“ (اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مگر اس حدیث کو مرسل ہونے کی وجہ سے معطل قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب عشرة النساء﴾ ”عین“ کے نیچے کسرہ اور ”شین“ ساکن۔ یعنی رہن سن، میل جول اور باہمی مؤدت والفت کو کہتے ہیں اور اسی سے ”معاشرہ“ ہے یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ ﴿لكن اعل بالارسال﴾ یہ معطل ہے ارسال سے، مگر یہ علت اس اعتبار سے دور ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور اس کا مفہوم شریعت کے اصول و فروع کا مؤید ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بنا پر عورت کی دبر میں قوم لوط کا فعل کرنا حرام ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے ائمہ کی جانب اس قبیح کام کو مباح قرار دینے کو منسوب کیا ہے اس نے ائمہ پر بدگمانی، غلط گوئی اور افترا پردازی کی ہے۔ انہوں نے تو دبر سے قبل میں جماع کی اجازت دی ہے نہ کہ خود دبر میں، سننے والے کو غلط فہمی ہوئی ہے اس نے بجا نب کو دبر میں سمجھ لیا ہے۔

(۸۶۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى رَجُلٍ نَظَرَ رَحْمَتٍ سِوَا مَنْظَرٍ»

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف اللہ ﷻ: «لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى رَجُلٍ نَظَرَ رَحْمَتٍ سِوَا مَنْظَرٍ»

نکاح کے مسائل کا بیان 666

أَتَى رَجُلًا، أَوْ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا». عورت سے قوم لوط کا فعل کیا ہو۔ (اسے ترمذی، نسائی رواہ الترمذی والنسائی وابن حبان، وأعلیٰ اور ابن حبان نے روایت کیا ہے اور اسے موقوف ہونے کی وجہ سے معطل قرار دیا گیا ہے) بالوقف۔

لعنوی تشریح: ﴿اتى رجلاً﴾ یعنی قوم لوط کا عمل کیا۔ ﴿اعل بالوقف﴾ موقوف ہونے کی بنا پر معطل کہا گیا ہے مگر سبل السلام میں ہے کہ اس مسئلہ میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے یہ اثر حکماً مرفوع ہے جبکہ اس میں وعید کا ذکر ہے اور وعید کا علم اجتہاد پر موقوف نہیں ہے۔

(۸۶۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ، وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضَلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ دَهَبَتْ تَقِيمُهُ كَسَرَتْهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ وَلِلْمُسْلِمِ: «إِنَّ اسْتَنْتَفَتْ بِهَا اسْتَنْتَفَتْ بِهَا وَبِهَا عَوَجٌ، وَإِنْ دَهَبَتْ تَقِيمُهَا كَسَرْتَهَا، وَكَسَرْتُهَا طَلَّقَهَا».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسایہ کو اذیت نہ پہنچائے اور عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت قبول کرو“ بے شک ان کو پہلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پہلی کا زیادہ ٹیڑھا حصہ اس کا اوپر والا ہوتا ہے۔ لہذا اگر کوئی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے توڑ بیٹھے گا اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دے گا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے حق میں ہمیشہ بھلائی کی وصیت قبول کرو۔“ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ”اگر تو اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ٹیڑھ پن کے باوجود اس سے فائدہ اٹھا سکے گا اور اگر تو نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو اسے توڑ بیٹھے گا اور اس کا توڑنا اسے طلاق دیتا ہے۔“

لعنوی تشریح: ﴿استوصوا﴾ ان عورتوں کے حق میں میری بھلائی کی وصیت قبول کرو۔ ﴿ضلع﴾ ضاد کے نیچے کمرہ اور لام پر فتح بھی جائز ہے اور اسے ساکن رکھنا بھی درست ہے۔ اس صورت میں یہ عیب اور جذع کے وزن پر ہوگا۔ پہلو میں واقع ہڈی یعنی پہلی کو کہتے ہیں جو خمدار و ٹیڑھی ہوتی ہے۔ ﴿اعوج﴾ ششی ﴿زیادہ خمدار اور ٹیڑھا حصہ﴾ ﴿اعلاه﴾ اس کا بالائی حصہ جو پہلی سے متصل ہوتا ہے۔ اگر وہ گول ہو تو نصف دائرہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ عورتوں کی تخلیق میں دراصل بہت ہی ٹیڑھ ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کی اصل تو حضرت حواء ہیں جن کو مشہور قول کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام

نکاح کے مسائل کا بیان 667

کی پہلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی سرشت و جبلت میں ٹیڑھ ہے۔ لہذا کوئی بھی ان کی فطری و جبلی عادت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ ﴿تقصیمہ﴾ تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا۔ اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت و حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم ہے اور ان کی چھوٹی موٹی خامیوں اور کوتاہیوں پر چشم پوشی اور درگزر کرنے کی تلقین ہے اور ان کی کمزوریوں اور ناروا حرکتوں کو برداشت کرنے کی تاکید ہے۔

(۸۷۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزَاةٍ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ، ذَهَبْنَا لِنَدْخُلَ، فَقَالَ ﷺ: «أَمْهَلُوا حَتَّى تَدْخُلُوا لَيْلًا، يَغْنِي عِشَاءً، لِكِنِّي تَمْتَشِطُ الشَّعْنَةَ، وَتَسْتَحِدُّ الْمُغِيبَةَ». وَتَمَّتْ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غزوہ میں ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب ہم مدینہ واپس پہنچ کر اپنے اپنے گھروں میں جانے لگے تو آپؐ نے فرمایا ”ذرا ٹھہر جاؤ۔ رات کے وقت گھروں میں داخل ہونا۔ رات سے آجانب ﷺ کی مراد عشاء کا وقت تھا۔ تاکہ پرانندہ بالوں والی اپنے بالوں میں کنگھی وغیرہ کر لے اور جس کا خاوند گھر سے باہر غائب تھا وہ اپنے جسم کے زائد بالوں کی صفائی کر لے۔“ (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ”تم میں سے کوئی جب لمبی مدت کے بعد واپس آئے تو اچانک رات کے وقت گھر میں داخل نہ ہو۔“

لغوی تشریح: ﴿امهلوا﴾ ٹھہرو ﴿تمتشط﴾ سر کے بالوں میں کنگھی وغیرہ کر کے ان کو درست کر لے۔ ان کو سنوار لے۔ امتشاط کے معنی کنگھی استعمال کر کے بالوں کی اصلاح و درستگی کرنا اور ”مشط“ بالوں کو درست اور ٹھیک کرنے کا آلہ جس کے دندانے ہوتے ہیں جسے کنگھی یا کنگھا کہتے ہیں۔ ﴿الشعنة﴾ پہلے شین پر فتح اور عین کے نیچے کسر۔ ایسی عورت جس کے سر کے بال پرانندہ اور بکھرے ہوئے ہوں اور ان میں کنگھی وغیرہ نہ کی گئی ہو۔ ﴿تستحد﴾ استحداد سے ماخوذ ہے۔ لوہے کے آلہ کو استعمال کر لے۔ جسے استرا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زیر ناف زائد بال صاف کر لے۔ ﴿المغيبه﴾ جس عورت کا شوہر گھر سے باہر غائب ہو۔ سفر پر ہو۔ ﴿فلا بطرق﴾ طروق سے نفی کا صیغہ ہے باب نصر

بنصر سے۔ سفر وغیرہ سے رات کے اوقات میں واپس آنے والا جبکہ اہل خانہ کو اس کی آمد کی اطلاع ہی نہ ہو اور اس حدیث میں اس شخص کو جو مدت دیر کے بعد گھر واپس لوٹا ہو حکم ہے کہ وہ گھر آنے سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع اہل خانہ کو کرے تاکہ ان کی آمد کا پتہ چل جائے اور بیوی اپنی زینب و آرائش کر لے اور یہ اچانک آنے کی صورت میں ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جن عورتوں کے شوہر باہر ہوتے ہیں وہ

عموماً پر آگندہ اور ناپسندیدہ حالت میں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ شوہر جب ایسی پر آگندہ حالت میں اسے دیکھے گا تو اس سے نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔ دور جدید میں تو ڈاک اور ٹیلیفون کے ذریعہ پیشگی اطلاع دی جاسکتی ہے۔ یہ اطلاع مقصد پورا کر دیتی ہے لہذا گھر کے قریب پہنچ کر ٹھہرنے کی اب ضرورت نہیں۔

(۸۷۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَمْ يَأْتِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةُ يَوْمِ الْقِيَامَةِ الرَّجُلُ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ، وَتُفْضِي إِلَيْهِ. ثُمَّ يَنْشُرُ بَهْدٍ ظَاهِرٍ كَرِهَ» (مسلم) سِرَّهَا». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿یفضی الی امراتہ﴾ یعنی اپنی بیوی سے جماع کرے۔ ﴿ثم ینشر سرھا﴾ رات کی تنہائی کی باتیں اور واقعات لوگوں میں بیان کرتا پھرے۔ وہ بات چیت کی صورت میں ہوئی ہو یا عملی طور پر واقع ہوئی ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے تنہائی کے لمحات میں ہونے والی باہمی گفتگو اور تعلقات زن و شو کے عملی واقعات دوستوں اور احباب کو بیان کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

(۸۷۲) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ، حَضْرَتِ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! كَيْفَ تَكُونُ أَمْرًا بَيْنَ رَجُلٍ وَرَجُلٍ أَوْ بَيْنَ رَجُلٍ وَرَجُلٍ؟ قَالَ: «تُطْعِمُهَا إِذَا أَكَلْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا ائْتَمَرْتَ، وَلَا تُضْرِبُ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحُ، وَلَا تَهْجُرُ إِلَّا فِي الْبَيْتِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ، وَعَلَّقَ الْبُخَارِيُّ بَعْضَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَانَ وَالْحَاكِمُ. روایت کیا ہے اور بخاری نے اس روایت کا بعض حصہ تعلیقاً بیان کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿زوج احدنا﴾ زوج بغیر تاکہ۔ مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے مستعمل ہے اور تاکہ کے ساتھ عورت کیلئے مخصوص ہے۔ ﴿تکسوها﴾ پہننے کیلئے لباس دے۔ ﴿ولا تضرب الوجه﴾ اور چہرے پر نہ مار کیونکہ چہرہ اعضاء انسانی میں سب سے معزز اور قابل تکریم و تشریف ہے اور لطیف اجزاء پر مشتمل ہے

﴿وَلَا تَقْبَحْ﴾ تفبیح سے بھی کا صیغہ ہے۔ یعنی بیوی کو نہ تو برا بول بولے اور نہ اسے گالی گلوچ کرے اور نہ اسے قبحک اللہ وغیرہ کہے۔ ﴿لَا تَهْجُرْ﴾ باب نصر ینصرے۔ معنی یہ ہے کہ نہ اسے چھوڑ اور نہ اس سے دور ہو ﴿الافی البیت﴾ یعنی اپنے گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں نہ جائے یعنی جب عورت سے اظہار ناراضگی کرنا ہو تو اس کیلئے نہ خود گھر سے نکل کر دوسرے کسی مکان میں منتقل ہو اور نہ عورت ہی کو گھر سے نکالے بلکہ گھر ہی گھر میں اس سے قطع تعلق اور قطع کلام کر لے اور زن و شو کا تعلق بھی منقطع کر لے اور عورت کی طرف پشت کر کے سوئے۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ طریقہ ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کیلئے نہایت ہی اثر انگیز ہے اور درستگی اور اصلاح کیلئے بڑا زود اثر ہے اور نبی ﷺ کے واقعہ ایلاء سے استدلال کیا گیا ہے کہ بیویوں کو ان کے گھروں میں چھوڑ کر دوسرے مکان میں رہنا جائز ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں باہمی منافرت نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا موقعہ و محل ہے جو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(۸۷۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حَضْرَت جَابِرؓ سے روایت ہے کہ یہود کہتے تھے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَتْ الْيَهُودُ تَقُولُ إِذَا أَتَى الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ مَجَامَعَتٍ وَمُبَاشَرَتٍ كَرْتَا هُوَ تَوْبَجَّهِيْنَا بِهِيْنَا هُوَ تَا هُوَ مِّنْ دُبُرِهَا فِي قُبُلِهَا كَانَ الْوَلَدُ أَحْوَلُ، فَتَزَلَّتْ ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ عورتیں تمہاری کھیتی ہیں لہذا اپنی کھیتی میں جس فَاَتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ﴾ الْآيَةُ. مُتَّفَقٌ طرَح چاہو، آؤ۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں) عَلَيَّ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

لغوی تشریح: ﴿من دبرھا فی قبلھا﴾ خاوند مجامعت کرے بیوی کے پیچھے سے اس کی شرم گاہ میں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عورت کی دبر میں جماع کرے۔ یہ تو قطعی طور پر حرام ہے۔ ﴿احول﴾ بھینگا ایک آنکھ یا دونوں کے ڈیلوں سے اصل مقام نگاہ سے ہٹ کر دائیں بائیں دیکھنا بھینگانا کہلاتا ہے۔ ﴿انسی شستمانی﴾ کیف کے معنی میں مستعمل ہے یعنی اپنی بیوی سے جماع ہر حالت و صورت میں کر سکتا ہے کھڑے کھڑے، بیٹھ کر، لیٹ کر، آگے سے، پیچھے سے۔ خواہ کوئی ہیئت ہو ہر ہیئت میں جماع کرنا مباح و جائز ہے۔ تمہارے اختیار و تمیز پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے تمہارے لئے کسی قسم کا نقصان اور ضرر مرتب نہیں ہوتا۔ لیکن مقام کھیتی کے علاوہ دوسرے مقام سے بچنا اور پرہیز کرنا لازمی ہے۔ لہذا عورتوں کی دبر میں جماع کسی صورت میں حلال نہیں ہے کیونکہ کھیتی تو قبل ہے دبر نہیں اور یہ اس لئے بھی کہ کھیتی سے مطلوب تو کھیتی کی پیدائش ہے اور یہ مطلوب عورتوں سے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ اس کے اولاد پیدا ہو اور اولاد کی پیدائش کا محل قبل ہے، دبر نہیں۔

(۸۷۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ حَضْرَت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول

نکاح کے مسائل کا بیان 670

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللَّهِ، اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْنَا، فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذَلِكَ، لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ أَبَدًا». مُنْفَقٌ عَلَيْهِ.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جاتے وقت یہ دعا پڑھے کہ اللہ کے نام کے ساتھ، الٰہی ہمیں شیطان سے کنارہ کش رکھ اور شیطان کو بھی اس سے دور رکھ جو تو ہمیں اولاد عطا فرمائے۔ تحقیق شان یہ ہے کہ اگر اس مجامعت سے ان کے مقدر و قسمت میں اولاد ہوگی تو شیطان اسے کبھی ضرر نہ پہنچا سکے گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لوان احدکم﴾ لو، یہ کلمہ تمنیٰ کیلئے آتا ہے اور مختار مذہب کے مطابق یہ جواب کا محتاج نہیں ہوتا۔ ابن صانع اور ابن حشام کی یہی رائے ہے اور اسے شرطیہ قرار دینا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا جواب محذوف تسلیم کیا جائے گا جو اس طرح ہوگا لسلم من الشیطان وہ شیطان سے صحیح و سالم رہے گا۔ ﴿جنبنا﴾ ہمیں محفوظ رکھ اور دور رکھ۔ ﴿ما رزقنا﴾ اس وقت جو اولاد تو عطا فرمائے۔ ﴿ان یقدر﴾ صیغہ مجہول تقدیر سے ماخوذ ہے۔ ﴿لم یضره الشیطان﴾ اس پر شیطانی تسلط نہیں ہو سکے گا اور نہ دین کے بارے میں فتنہ میں مبتلا کر کے کفر کی جانب کھینچ لے جائے گا۔ اس سے ہر قسم کے ضرر و نقصان کی نفی نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں زن شوقی کے وقت انسان کے ازلی وابدی دشمن سے بچنے اور محفوظ رہنے کی دعا کا ذکر ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان صرف ذکر الٰہی سے انسان سے جدا اور الگ ہوتا ہے بصورت دیگر وہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے اور کسی حالت میں بھی آدمی سے جدا اور الگ نہیں ہوتا۔

(۸۷۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ، فَأَبَتْ أَنْ تَحِيَّ، فَبَاتَ غَضْبَانَ، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ». مُنْفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَلِمُسْلِمٍ: «كَانَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ سَاحِطًا عَلَيْهَا، حَتَّى يَرْضَى عَنْهَا».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب مرد اپنی بیوی کو جنسی خواہش کیلئے اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے اور خاوند ناراض ہو کر رات گزارے تو فرشتے صبح تک اس عورت پر لعنت و پھنکار بھیجتے رہتے ہیں۔“ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم میں ہے کہ ”جو آسمان میں ہے وہ اس پر ناراض رہتا ہے جب تک کہ خاوند بیوی سے خوش و راضی نہ ہو جائے۔“

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خاوند کی جنسی خواہش پوری کرنے سے بیوی کا (بلاوجہ) انکار کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ یہ مرد کا عورت پر ایسا حق ہے جس کو پورا کرنا عورت پر لازمی ہے۔ لیکن مرد کو بھی عورت کی صحت اور طبیعت کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۸۷۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ
الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ، وَالْوَاشِمَةَ
وَالْمُسْتَوْشِمَةَ. مَقْفُ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”نبی ﷺ
نے سر میں بال جوڑنے اور جڑوانے والی اور جسم پر
گود کر نشان بنانے والی اور اس کی خواہش کرنے
والی پر لعنت فرمائی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

نفعی تشریح: ﴿الواصلہ﴾ بالوں کے ساتھ دوسروں کے بال جوڑنے والی۔ خواہ اپنے لئے ایسا کرے یا کسی دوسرے کیلئے ﴿والمستوصلہ﴾ وہ خاتون جو دوسرے کے بالوں کو اپنے سر کے بالوں میں جڑوانے اور لگانے کی خواہش مند ہو۔ ﴿الواشمة﴾ وشم سے فاعل کا صیغہ ہے۔ وشم کہتے ہیں جسم کے کسی حصہ میں سوئی سے گودے اور پھران سوراخوں میں سرمہ یا چونے کا پتھریا نیل بھر کر اس جگہ کو رنگ دے تاکہ اس مقام پر نشانات اور ککیریں اور خطوط نمایاں ہو جائیں۔ ﴿المستوشمة﴾ جو عورت اس طرح کا کام اپنے جسم پر کروانے کی خواہش مند ہو۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ یہ امور حرام ہیں۔ رہا یہ کہ عورت اپنے بالوں کے ساتھ حیوانی بالوں کے علاوہ چٹیا بنانے کیلئے اون، دھاگہ اور کپڑے کے ٹکڑے باندھ سکتی ہے یا نہیں تو محققین نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے بشرطیکہ ان چیزوں کا رنگ بالوں کے رنگ سے ملتا نہ ہو۔

(۸۷۷) وَعَنْ جُدَامَةَ بِنْتِ وَهْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: حَضَرْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فِي أُنَاسٍ، وَهُوَ يَقُولُ: «لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَتَاهُ عَنِ الْغَيْلَةِ، فَنَظَرْتُ فِي الرُّومِ وَفَارِسَ، فَإِذَا هُمْ يُغَيِّلُونَ أَوْلَادَهُمْ، فَلَا يَضُرُّ ذَلِكَ أَوْلَادَهُمْ شَيْئًا» ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنِ الْعَزْلِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ

﴿ذَلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ﴾. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زندہ درگور کرنے کا خفیہ طریقہ ہے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ہممت﴾ میں نے ارادہ کیا۔ ﴿الغيلة﴾ غین کے نیچے کسرہ۔ خاوند کا بیوی سے ایسی حالت میں مباشرت و مجامعت کرنا جبکہ وہ گود کے بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ اہل عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ غیلہ بچہ کیلئے ضرر کا سبب ہے اور اس کے اعصاب کیلئے ضرر رساں ہے اور یہ ضرر انسان کے ساتھ زندگی بھر رہتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بسا اوقات انسان گھوڑے سے نیچے گر پڑتا ہے اور گھوڑے کی پشت پر ثابت نہیں رہ سکتا۔ اس لئے غیلہ کے بعد عورت کا دودھ پتلا ہو جاتا ہے اور اس میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں اہل فارس و روم کے تجربات کی روشنی میں عرب کے اسی عقیدہ کا ابطال ہے۔ ﴿العزل﴾ عین پر فتح اور ”زا“ ساکن۔ عزل یہ ہے کہ مرد عورت سے جماع کرتا ہے جب انزال کے قریب پہنچتا ہے تو عضو مخصوص کو عورت کی شرم گاہ سے باہر نکال لیتا ہے اور فرج سے باہر انزال کرتا ہے۔ ﴿ذلک الواد الخفی﴾ اس میں حمزہ ساکن ہے۔ لڑکی کو زندہ درگور کرنا۔ یعنی عزل حقیقی تو درگور کرنا نہیں لیکن اس کے مشابہ ہے کیونکہ اس میں بھی حمل کو روکنے اور ضائع کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اس نطفہ کو تلف کرنے کی سعی ہوتی ہے جس کے جاندار نفس بننے کا امکان موجود تھا۔ لیکن یہ چونکہ حقیقی زندہ کو قطع کرنا نہیں اس لئے یہ حقیقی زندگی درگور کرنا نہیں۔ پس حدیث اس کی حرمت پر دلالت نہیں کرتی۔

راوی حدیث: ﴿جدامہ رضی اللہ عنہ﴾ جمیم پر ضمہ۔ جمیم کے بعد دال ہے۔ تقریب میں ہے کہ جدامہ بنت وہب کے بارے میں یہ بھی قول ہے کہ وہ جدامہ بنت جندل ہے۔ اسد قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے اسدیہ کہلائی۔ عکاشہ بن محسن کی ماں جانی بن تھی۔ مشہور صحابیہ ہے۔ سابقین میں سے ہے۔ ہجرت کے شرف سے بھی مشرف ہوئی ہیں۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ جس نے اسے ذال کے ساتھ پڑھا ہے اس نے غلطی کی ہے۔ مکہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں۔ اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ انیس بن قنادہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔

(۸۷۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا قَال: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ لِيْ جَارِيَةً، وَأَنَا أَعْزَلُ عَنْهَا، وَأَنَا أَكْرَهُ أَنْ تَحْمِلَ، وَأَنَا أُرِيدُ مَا يُرِيدُ الرَّجَالُ، وَإِنَّ الْيَهُودَ تَحَدَّثُ أَنَّ الْعَزْلَ أَلْمَوْذَةُ الصُّغْرَى، قَالَ: «كَذَبَتْ الْيَهُودُ، لَوْ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَخْلُقَهُ مَا اسْتَطَعَتْ أَنْ تَصْرِفَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میری ایک لونڈی ہے۔ میں اس سے عزل کرتا ہوں اور اس کا حاملہ ہونا مجھے پسند نہیں اور میں وہی چاہتا ہوں جو مرد چاہتے ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزل تو چھوٹا زندہ درگور کرنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”یہود نے جھوٹ بولا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پیدا کرنا چاہے تو اسے تو پھیر نہیں سکتا۔“ (اسے احمد، ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور نسائی اور طحاوی نے

دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالنَّسَائِيُّ وَالطَّحَاوِيُّ، وَرَجَّاهُ بھی اسے روایت کیا ہے او اس کے راوی ثقہ ہیں) ثِقَاتٌ.

لعنوی تشریح: ﴿الموءودة الصغری﴾ چھوٹا زندہ درگور کرنا، اس لئے کہ ایک جان کو ضائع کرنا اور اسے تلف کرنا ہے اگرچہ ابھی وہ وجود سے بہت دور ہے۔ ﴿کذبت الیہود﴾ یہود نے جھوٹ کہا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے جس چیز میں نبی ﷺ نے یہود کو جھوٹا قرار دیا ہے وہ ان کا یہ خیال ہے کہ عزل کی صورت میں حمل کا تصور ہی نہیں اور انہوں نے اسے زندہ درگور کرنے کو قطع نسل کے مقام پر رکھا ہے۔ مگر میں ان کے اس نظریے اور خیال کی تکذیب کرتا ہوں اور خبر دیتا ہوں کہ عزل حمل کو ہرگز نہیں روک سکتا جب کہ اللہ تعالیٰ اسے پیدا کرنا چاہے اور اس کا ارادہ ہی تخلیق کا نہ ہو تو پھر حقیقت میں تو وہ زندہ درگور کرنا نہیں۔ حدیث جدامہ میں بھی اسے خفیہ زندہ درگور کرنے کا نام اس لئے دیا گیا ہے۔ مرد حمل سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے عزل کرتا ہے۔ اسی بنا پر اس کے ارادے اور قصد کو زندہ درگور کی جگہ نافذ کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہے کہ زندہ درگور تو براہ راست ایک ظاہر عمل ہے اور اس میں قصد اور فعل دونوں جمع ہوتے ہیں مگر عزل کا تعلق صرف قصد و ارادے سے ہے اسی وجہ سے اسے اود خفی کہا گیا ہے۔ اس سے دونوں احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یوں کہ جدامہ کی حدیث عزل کی تحریم پر دلالت نہیں کرتی اس میں صرف کراہت و ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اس میں عزل کرنے والا تقدیر کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دور جدید کے جو ڈاکٹر رگ کاٹ کر قوت تولید کو قطع کر دیتے ہیں تاکہ نسل کو محدود کر دیا جائے گو قوت جماع باقی رہنے دیتے ہیں۔ تو اس کو عزل پر قطعاً قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان میں عظیم فرق ہے۔ عزل تو وقتی اور ظنی سبب ہے نہ کہ منع حمل کیلئے حقیقی سبب۔ اس کے باوجود عازل خود مختار ہے اگر چاہے تو یہ فعل کرے اور چاہے اسے ترک کرے اور جہاں تک رگ تولید کے کاٹ دینے کا تعلق ہے تو وہ ایسا سبب ہے جو قطعی ہے۔ نیز اس میں اللہ کی تخلیق کو بدل دینا اور جسمانی نظام کا تبدیل ہونا اور بعض قوی کے مطابق عمل کو باطل کرنا اور تباہ کن بیماری کی جانب پہنچا دینا ہے۔ جیسے سرطان کا مرض ہے جو کئی ہوئی رگ کی جگہ، دل اور پھیپھڑے وغیرہ تک سرایت کر جاتا ہے۔ ہر باخبر آدمی پر اس کے برے نتائج اور آثار مخفی اور پوشیدہ نہیں۔

(۸۷۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَعْرِضُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ، وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ يُنْهَى عَنْهُ، لَنَهَانَا عَنْهُ الْقُرْآنُ. مَنْقُذٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ: فَبَلَغَ ذَلِكَ نَبِيَّ اللَّهِ ﷺ اور مسلم کی روایت میں ہے۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچ گئی مگر آپ نے ہمیں اس سے منع نہیں فرمایا۔

نکاح کے مسائل کا بیان 674
فَلَمْ يَنْهِنَا عَنْهُ.

حاصل کلام: اس روایت کی رو سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ و امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل کوفہ اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

(۸۸۰) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ نبی رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ ﷺ ایک ہی غسل سے ساری بیویوں کے پاس چلے يَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ بِغُسْلٍ وَاحِدٍ. جایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) أَخْرَجَاهُ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مباشرت کے بعد غسل جنابت ضروری اور واجب نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کیلئے آپ کی بیویوں میں باری کی تقسیم واجب نہ تھی اگر واجب ہوتی تو آپ ایک ہی رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس نہ جاتے۔ جمہور اسے واجب قرار دیتے ہیں اور اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ کام آپ نے اجازت لے کر کیا تھا۔ (سبل)

حق مہر کا بیان

۲ - بَابُ الصَّدَاقِ

(۸۸۱) عَنْ أَنَسِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت انس رحمہ اللہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ أُعْتِقَ کہ آپ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا اور اس کی صَفِيَّةَ، وَجَعَلَ عِتْقَهَا صَدَاقَهَا. مُنْفَقَ آزادی کو اس کا مہر قرار دیا۔ (بخاری و مسلم) عَلَيْنِ.

لغوی تشریح: ﴿باب الصداق﴾ (صدا پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں) عورت کے مہر کو کہتے ہیں یعنی مرد نکاح کے وقت جو مال عورت کو دیتا ہے۔ یہ "صدق" سے ماخوذ ہے۔ یہ احساس و شعور دلانے کے لئے کہ مرد کو اپنی بیوی سے سچی محبت و رغبت ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث آزادی کو مہر مقرر کرنے کی صحت کے بارے میں بالکل واضح ہے۔ جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے۔ مگر انہوں نے اپنے موقف پر کوئی قابل اطمینان دلیل پیش نہیں کی۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی منفعت بخش چیز کو مہر مقرر کرنا درست ہے کیونکہ آزادی بھی منفعت ہے اور اس کی تائید میں وہ واقعہ بھی ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے تعلیم قرآن کو مہر مقرر کیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مالیت کے علاوہ دوسری چیزیں بھی حق مہر مقرر کی جاسکتی ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ، امام اسحق رحمہ اللہ وغیرہا کا یہی موقف ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا﴾ ام المؤمنین حضرت صفیہ جی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ ان کا رشتہ نسب حضرت ہارون علیہ السلام برادر موسیٰ علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ یہ خاتون اسی خانوادہ رسالت

نکاح کے مسائل کا بیان 675

سے تھیں۔ ابن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں۔ جو غزوہ خیبر میں قتل ہو گیا تھا اور حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قیدی بن کر مدینہ آئیں تو انہیں رسالت مآب ﷺ نے اپنے حرم کیلئے پسند فرمایا، آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا اور اسی آزادی کو مہر مقرر کر کے نکاح کیا۔

(۸۸۲) وَعَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ عَنْ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ قَالَتْ: كَانَ صَدَاقُهُ لِأَزْوَاجِهِ ثِنْتِي عَشْرَةَ أُوقِيَةً، وَنَشًا، قَالَتْ: أَتَدْرِي مَا النَّش؟ قَالَ: قُلْتُ: لَا، قَالَتْ: يَصْفُ أُوقِيَةً، فِتْلَكَ خَمْسُمِائَةٍ دِرْهَمٍ، فَهَذَا صَدَاقُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لِأَزْوَاجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسلمہ بن عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ (کی بیویوں) کا مہر کتنا تھا؟ فرمایا آپ کی ازواج مطہرات کا مہر بارہ اوقیہ اور ایک نش، پھر انہوں نے فرمایا، کیا تو جانتا ہے کہ نش کتنا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، انہوں نے فرمایا آدھا اوقیہ۔ اس طرح یہ پانچ سو درہم ہوئے۔ بس یہ تھا رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کا حق مہر۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اوقیہ﴾ مہرہ پر ضمہ اور ”یا“ پر تشدید۔ چاندی کے سکہ کے چالیس درہم۔ وہ آج کل کے ایک سو سینتالیس گرام کے برابر ہے۔ ﴿النش﴾ نون پر فتح اور شین پر تشدید۔ نصف اوقیہ یعنی بیس درہم۔

راوی حدیث: ﴿ابوسلمہ بن عبد الرحمن﴾ یہ تھے ابوسلمہ بن عبد الرحمن بن عوف زہری قرشی۔ ایک قول کے مطابق یہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء تابعین میں سے ایک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام تھا۔ کثیر الحدیث اور وسیع روایت کرنے والوں میں سے تھے۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت سے حدیث رسول ﷺ کا سماع کیا اور ان سے بھی ایک بہت بڑی جماعت نے علم اخذ کیا۔ ۷۴ھ اور ایک قول کے مطابق ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ برس تھی۔

(۸۸۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تَزَوَّجَ عَلِيٌّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَعْطِهَا شَيْئًا» قَالَ: مَا عِنْدِي شَيْءٌ، قَالَ: «آپ نے فرمایا ”وہ تمہاری حطی زرہ کہاں ہے؟“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے

وَالنِّسَاءُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لما تزوج علی فاطمہ﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کے دوسرے سال ماہ رمضان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور رخصتی ذوالحجہ کے مہینے میں ہوئی۔ (تلیق المفہوم، ص: ۱۵) ﴿الحطمیۃ﴾ ”حاء“ پر ضمہ اور ”طاء“ پر فتح۔ حطمہ بن محارب کی جانب منسوب ہے۔ یہ عبد القیس قبیلہ کی شاخ تھی۔ یہ لوگ زرہیں بناتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حطمہ کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تلواریں کو توڑ کر کلڑے کلڑے کر دیتی تھی۔ (ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وہ زرہ دے دی تھی پھر تعلق زن و شو قائم کیا تھا۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ اور منذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسئلہ مہر کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضور ﷺ کو علم ماکان وما یكون حاصل نہیں تھا، اسی لئے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرما رہے تھے کہ تمہاری حطمی زرہ کہاں ہے؟ ورنہ یوں فرماتے کہ تمہاری حطمی زرہ جو فلاں مقام پر تم نے رکھی ہوئی ہے وہ لا کر دے دو۔ نیز معلوم ہوا کہ سر حق مہر کا مطالبہ کر سکتا ہے البتہ اس سے وہی چیز طلب کی جائے جو اس کے پاس ہو ایسی چیز کا تقاضا و مطالبہ نہ کیا جائے جو اس کے بس میں نہ ہو۔

(۸۸۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے، انہوں عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ: نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَيْمًا امْرَأَةً نِكَحْتَ مَثَلِیْمٌ نے فرمایا ”جو عورت مہر عطیہ یا نکاح سے پہلے عَلَى صَدَاقٍ أَوْ حَبَاءٍ أَوْ عِدَّةٍ قَبْلَ کسی وعدہ کی بنا پر نکاح کرے تو یہ اس عورت کا حق عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهَوَ لَهَا، وَمَا كَانَ ہے اور جو عطیہ نکاح کے بعد دیا جائے تو وہ اسی کا بَعْدَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهَوَ لِمَنْ ہے جسے دیا جائے اور وہ چیز جس کی وجہ سے مرد أُعْطِيَ، وَأَحَقُّ مَا أُخْرِجَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ زیادہ مکرم کا مستحق ہے اس کی بیٹی یا اس کی بہن ابْنَتُهُ أَوْ أُخْتُهِ۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَئِمَّةُ إِلَّا ہے۔“ (اسے احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت الترمذی کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حباء﴾ ”حاء“ کے نیچے کسرہ اور ”باء“ تخفیف مد کے ساتھ۔ اصل میں عطیہ کو کہتے ہیں اور یہاں مراد وہ چیز ہے جو مرد مہر کے علاوہ عورت کو دیتا ہے۔ ﴿عِدَّة﴾ عین کے نیچے کسرہ اور ”وال“ مخفف ہے۔ جس چیز کا خاوند نے وعدہ کیا ہو اور ابن ماجہ میں عدۃ کی جگہ حبہ ہے۔ ﴿عِصْمَةِ النِّكَاحِ﴾ یعنی عقد نکاح سے پہلے ﴿فہولہا﴾ پس وہ اسی عورت کا ہے یعنی وہ بالخصوص عورت کا ہے۔ اس میں کسی کا کچھ نہیں نہ عورت کے والد کا اور نہ دوسرے کسی ولی و سرپرست کا کوئی حق ہے۔ ہاں اگر عورت اپنی خوشی و رضامندی سے دینا چاہے تو ایسا کرنا جائز ہے اور ولی کا لینا بھی جائز

نکاح کے مسائل کا بیان 677

ہے۔ ﴿فَهُوَ لِمَنِ اعْطٰیہ﴾ پس وہ اس کا حق ہے جسے دیا گیا ہو یعنی عورت کے والد یا اس کے بھائی کا یا ان دونوں کے علاوہ کسی دوسرے ولی کا ﴿اِحَقَّ مَا اٰکَرَمَ﴾ فعل صیغہ مجہول ہے۔ ﴿عَلِیْہِ﴾ لاجلہ کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ (یعنی اس کی اس حیثیت کی بنا پر) ﴿اِبْنَتِہِ اَوَاخِشَہِ﴾ یہ خبر ہے اور اس موصول کا بیان ہے جو اِحَقَّ مَا اٰکَرَمَ کے قول میں ہے اور اس میں ترغیب ہے کہ عورت کے ولی کی عزت افزائی کیلئے اسے کچھ مال دینا چاہئے اور یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر مرد عورت کے ولی کو کچھ مال دے یا اس سے کوئی وعدہ کرے اگر تو یہ نکاح سے پہلے ہو پھر ولی اس مال کا مستحق نہیں ہے اور خواہ ولی نے اس مال کی اپنے لئے شرط لگائی ہو۔ پھر بھی عورت ہی اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ البتہ جب نکاح کے بعد اگر کوئی چیز دی گئی ہے تو وہ اسی کا حق ہے جسے وہ دی گئی ہے خواہ وہ اس کا ولی ہو یا کوئی اور رشتہ دار یا خود وہ عورت ہی ہو اور یہ گفتگو اس کے متعلق ہے جو مہر کے علاوہ ہے۔ رہا مہر کا معاملہ تو وہ قطعی طور پر عورت ہی کا حق ہے۔

(۸۸۵) وَعَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً، وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا صَدَاقًا، وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا، حَتَّى مَاتَ، فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: لَهَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَائِهَا، لَا وَكَسَ، وَلَا شَطَطَ، وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ، وَلَهَا الْيَمِراتُ، فَقَامَ مَعْقِلُ بْنُ سِنَانٍ الْأَشْجَعِيُّ، فَقَالَ: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي بَرُوعِ بِنْتِ وَاشِقٍ امْرَأَةً مِنَّا مِثْلَ مَا قَضَيْتَ، فَفَرِحَ بِهَا ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ جَمَاعَةٌ.

حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کے متعلق مسئلہ پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کیلئے مہر مقرر نہیں کیا تھا اس سے دخول بھی نہیں کیا اور وہ فوت ہو گیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس عورت کو مہر اس کے خاندان کی عورتوں کے برابر ملے گا۔ اس میں نہ کمی ہوگی اور نہ زیادتی۔ اس پر عدت گزارنا بھی لازمی ہے اور اس کیلئے میراث بھی ہے۔ یہ سن کر معقل بن سنان رضی اللہ عنہ اٹھے اور فرمایا کہ ہماری ایک عورت بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا سے براءے میں حضور ﷺ نے ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا جیسا آپ نے کیا ہے۔ اس پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور ایک جماعت نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لم يفرض﴾ ”یا“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسہ۔ مقرر اور طے نہیں کیا۔ ﴿ولم يدخل بها﴾ اس سے جماع نہیں کیا اور نہ اس سے خلوت صحیح ہوئی۔ ﴿مثل صداق نساءها﴾ اس کی قوم و برادری کی عورتوں کے طے شدہ مہر کی مثل ﴿لاوکس﴾ ”واو“ پر فتح اور کاف ہاکن، یعنی نہ

نکاح کے مسائل کا بیان 678

کم ہوگا۔ ﴿وَلَا شَطَطَ﴾ شین اور ”طا“ پر فتح یعنی اور نہ زیادہ۔ ﴿وَعَلَيْهَا الْعِدَّةُ﴾ اس پر عدت ہے۔ وفات کی صورت میں عدت چار ماہ دس دن ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ وفات کی صورت میں عورت مکمل مہر کی حقدار ہے خواہ اس کا تعین شوہر نے نہ کیا ہو اور نہ شوہر نے اس سے مجامعت کی ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ و امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

راوی حدیث: ﴿عَلَقْمَه﴾ یہ علقمہ بن قیس ابی ثبل بن مالک ہیں۔ بنو بکر بن نخع میں سے تھے۔ حضرت عمر رحمہ اللہ اور ابن مسعود رحمہ اللہ سے انہوں نے روایت کیا ہے۔ جلیل القدر تابعی ہیں۔ ابن مسعود کی حدیث اور ان کے تلمذ کی وجہ سے مشہور ہوئے اور اسود نخعی کے چچا تھے۔ ۶۱ھ میں فوت ہوئے۔ ﴿مَعْقِلُ بْنُ سَنَانٍ اشْجَعِي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ ان کی کنیت ابو محمد ہے۔ معقل کی میم پر فتح اور قاف کے نیچے کسرہ۔ بن سنان۔ سین کے نیچے کسرہ۔ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ میں شریک تھے۔ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ ان کی حدیث کوفیوں میں مشہور ہے۔ حرہ کی لڑائی کے روز ان کو باندھ کر قتل کیا گیا۔

﴿بُرُوعُ بْنُ وَاشِقٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ﴾ برورع میں ”با“ کے نیچے کسرہ۔ محدثین کے نزدیک اور اہل لغت کے نزدیک ”با“ کے فتح سے۔ بنت واشق۔ واشق کے شین پر کسرہ۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ان کے خاوند کانام ہلال بن مرہ رحمہ اللہ تھا۔ جو اس سے مجامعت سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

(۸۸۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَعْطَى فِي صَدَاقٍ كَهْجُورِينَ دَعَى دِينَ اس نَظَرَ حَلَالٍ لَهَا». (اسے امْرَأَةً سَوِيْقًا أَوْ تَمْرًا فَقَدْ اسْتَحْلَ). ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے موقوف ہونے کی أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَشَارَ إِلَى تَرْجِيحِ وَفْقِهِ. طرف اشارہ کیا ہے اور ترجیح بھی اسی کو دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿سویقا﴾ گندم کا آٹا جو بھونا ہوا ہو یا مکئی یا جو کا آٹا۔ ابوداؤد کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں ”ملاکفہ سویقا“ ہے جس کے معنی ہیں ایک مٹھی بھر۔ ﴿فقد استحل﴾ اس نے حلال کر لیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ جب نکاح کرنے والے مرد و عورت کسی مقدار مہر پر راضی ہو جائیں خواہ وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر، اس کی قیمت ہو تو یہ جائز ہے اور جو مہر کی مقدار پر کم از کم دس درہم قرار دیتا ہے وہ اس حدیث کو دخول سے پہلے جو کچھ دیا جائے اس پر محمول کیا گیا ہے۔ مگر یہ باطل ہے اس کی تردید فقد استحل کے جملہ سے ہوتی ہے۔ نیز عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کیلئے دخول سے پہلے کچھ مال ادا کرنا شرط نہیں ہے۔

(۸۸۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَجَارَ نِكَاحَ امْرَأَةٍ عَلَى نَعْلَيْنِ»: ایک عورت کے نکاح کو برقرار رکھنے کی اجازت دی۔

نکاح کے مسائل کا بیان 680

(۸۹۰) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بہترین حق مہر وہ ہے جس کا ادا کرنا نہایت آسان و سہل ہو۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿خیر الصداق ایسرہ﴾ آدمی پر اس کا ادا کرنا آسان و سہل ہو۔ یعنی وہ انسان کے مناسب حال ہو اور یہ دلیل ہے کہ مہر کی کم مقدار مستحب ہے اور جس کا ادا کرنا آسان و سہل نہ ہو وہ غیر مستحسن و غیر مستحب ہے۔

(۸۹۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ عَمْرَةَ بِنْتَ الْجَوْنِ تَعَوَّذَتْ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، حِينَ أُذْخِلَتْ عَلَيْهِ، تَغْنِي لِمَا تَرَوَّجَهَا، فَقَالَ: «لَقَدْ غُذِتْ بِمَعَاذٍ، فَطَلَّقَهَا وَأَمَرَ أَسَامَةَ فَمَتَّعَهَا بِثَلَاثَةِ أَنْوَابٍ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَفِي إِسْنَادِهِ رَاوٍ مَتْرُوكٌ، وَأَضَلَّ الْقِصَّةَ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أُسَيْدٍ السَّاعِدِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عمرہ بنت الجون نے رسول اللہ ﷺ سے اس وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جب وہ آپ کی غلوت گاہ میں آئی یعنی جب آپ سے نکاح کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تو نے ٹھیک پناہ دینے والے کی پناہ طلب کی ہے۔“ پھر آپ نے اسے طلاق دے دی اور اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس کو فائدے کے طور پر تین کپڑے دے دو۔ (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں متروک راوی ہے۔ اس کا اصل قصہ صحیح بخاری میں ابواسید ساعدی سے مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿تعوذت﴾ اس نے پناہ لی۔ صحیح بخاری میں ابواسید سے مروی ہے کہ جوئیہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ جب اسے حضور ﷺ کی غلوت گاہ میں داخل کیا گیا تو آپ نے اسے فرمایا کہ ”اپنے آپ کو مجھے بہہ کر دے“ تو وہ بولی ملکہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کے ایک مرد کے سپرد کیسے کر سکتی ہے؟ آپ نے اپنا دست مبارک اس کی طرف بڑھایا کہ اس کا جوش ٹھنڈا ہو جائے تو وہ بولی میں تجھ سے اللہ کی پناہ پکڑتی ہوں۔ گفتگو کا یہ سیاق اس کا تقاضا کر رہا ہے کہ اس نے یہ بات یا تو اس لئے کہی کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ سے اعلیٰ و ارفع تصور کرتی تھی اور آپ کو اپنا ہم پلہ اور کفو نہ سمجھتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو پہچاننا ہی نہ ہو اور نہ آپ کے ارادے کو پہچان سکی کہ آپ نے اس کی جانب ہاتھ کس لئے بڑھایا۔ (بخاری کتاب الاشرہ، باب: ۳۰) میں ہے لوگوں نے اس سے پوچھا تجھے معلوم ہے کہ یہ کون تھے؟ وہ بولی مجھے تو معلوم نہیں۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ تھے تیرے پاس تشریف لائے تھے کہ پیغام نکاح دیں۔ وہ بولی پھر تو میں اس وجہ سے بدبخت و

نکاح کے مسائل کا بیان 681

بدقسمت ہوں۔ (الحديث) ﴿لقد عزت﴾ صیغہ مونث مخاطب۔ ﴿بمعاذ﴾ میم پر فتح کی صورت میں جس سے پناہ طلب کی جائے۔ یعنی تو نے اس سے پناہ طلب کی ہے جو اس پناہ دینے کا اہل ہے کہ اس سے پناہ مانگی جائے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی۔ ﴿فتمتعها﴾ تمتیع سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسے تین کپڑے بطور فائدہ کے عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل میں۔ لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم یمسوهن او تفرضوا لهن فربضہ ومتعوهن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ متاعا بالمعروف حقا علی المحسنین (۲۳۶:۲) کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لئے مہر اور ان کو کچھ خرچ دو۔ صاحب مقدرت پر اس کے موافق اور تنگی والے پر اس کے موافق جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق ہے۔ لازم ہے نیکی کرنے والے پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس عورت کو دخول سے پہلے ہی طلاق ہو جائے ایسی مطلقہ قبل الدخول کو جس کا مہر بھی معین نہ ہوا ہو اسے کچھ مال دینا منسوں و مشروع ہے۔ علماء کی اکثریت اسے واجب کہتی ہے۔ آیت کا ظاہر بھی اسی کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمرة بنت الجون﴾ عمرہ میں عین پر فتح اور میم ساکن، جون میں جیم پر فتح اور واؤ ساکن۔ اس جونیہ کے بارے میں اختلاف ہے اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس روایت میں واقعی عمرہ ہی کا ذکر ہے۔ ابن جوزی اپنی کتاب ”التلخیص“ (ص: ۱۳) میں کہتے ہیں کہ یہ اسماء بنت نعمان بن ابی الجون بن حارث کنذیہ ہیں۔ میں ابواسید کی حدیث کے بعض طرق اس بات پر کرتے ہیں کہ یہ اممہ بنت نعمان بن شریبل ہے۔ امام زہری کے نزدیک یہ فاطمہ بنت ضحاک ہے۔ (التلخیص، ص: ۱۲) اور ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سبھی ایک ہی عورت ہے۔ اور یہ اختلاف راویوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے بڑے اور مختلف استعمال کی وجہ سے ہے۔ اور درست بات یہ ہے کہ اس کا نام اممہ ہے۔

﴿ابواسید رضی اللہ عنہ﴾ اسد کی تصغیر۔ یہ صاحب مالک بن ربیعہ بن بدن ہیں۔ (با اور دال دونوں پر فتح) جو نام کی بجائے اپنی کنیت سے زیادہ مشہور تھے۔ غزوہ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۳۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق اس کے بعد وفات پائی۔ یہاں تک کہ مدائنی کے قول کے مطابق ۶۰ھ میں وفات پائی اور بدری صحابہ میں سے وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

ولیمہ کا بیان

۴ - باب الولیمۃ

(۸۹۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى عَلَى عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ أَثَرَ زَرْدٍ رَنُكَ لَگا ہوا دیکھا۔ آپ نے فرمایا ”یہ کیا ہے؟“ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کپڑوں پر

صُفْرَةً، فقال: «ما هذا؟» قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي تَزَوَّجْتُ أَمْرَأَةً عَلَى وَزْنِ نَوَاقِ مَنُ ذَهَبٍ، قَالَ: «فَبَارِكْ مَسَاوِي سَوَا دَعِ كَر نَكَاحَ كَيَا هـ۔ اَپْ نَ فرمایا اللّٰهُ لَكَ، أَوْلِمَ وَلَوْ بِشَاةٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، ”اللہ تعالیٰ تجھے برکت دے، ولیمہ ضرور کرو خواہ ایک بکری ہی ہو۔“ (بخاری و مسلم، اور الفاظ مسلم کے

ہیں)

لغوی تشریح: ﴿باب الولیمة﴾ شادی بیاہ کے موقع رجو کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ ﴿الولم﴾ سے مشتق ہے۔ ”ولم“ میں ”واو“ پر فتح اور ”لام“ ساکن۔ اس کے معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہونے کے ہیں، میاں بیوی چونکہ اکٹھے ہوتے ہیں اس لئے اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ ولیمہ سنت ہے اور بعض نے اسے واجب بھی کہا ہے، اور ولیمہ کا صحیح وقت خلوت صحیح کے بعد ہے۔ ﴿الرصفرة﴾ زرد رنگ کا اثر و نشان۔ یہ زرد رنگ زعفران سے تھا جو ان کی بیوی پر بطور خوشبو لگا ہوا تھا۔ ایسا نہیں کہ انہوں نے دیدہ دانستہ و عمدہ زعفران کا رنگ لگایا تھا کیونکہ مردوں کیلئے زعفرانی رنگ اور اس کی خوشبو کا استعمال شرعاً ویسے ہی ممنوع ہے بلکہ یہ عورتوں کا (مخصوص) شعار ہے اور مردوں کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ ﴿علی وزن نواہ من ذهب﴾ ایک قول یہ ہے نواہ سونے کا معروف و مشہور وزن جو پانچ درہم کے برابر ہوتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے کھجور کی گٹھلی مراد ہے یعنی کھجور کی گٹھلی کے برابر وزن۔ پہلا قول صحیح ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے نواہ کا وزن تین درہم کے برابر ہوتا ہے اور نواہ لغت میں تو کھجور کے بیج یعنی گٹھلی وغیرہ کو کہتے ہیں ﴿اولم ولو بشاة﴾ ”لو“ تقلیل کیلئے مستعمل ہے یعنی کم از کم بکری ذبح کرو۔ لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعض ازواج کا ایک بکری سے کم کا ولیمہ بھی کیا ہے لہذا مستحب یہ ہے کہ شوہر کی مالی حیثیت و حال کے حسب حال ہو۔ یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی مالی حالت کے پیش نظر ایک بکری کا ولیمہ کرنا قلیل تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلقاً ایک بکری کم ہے۔

(۸۹۳) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ إِلَى الْوَلِيمَةِ فَلْيَأْتِهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِئْسَ لِمَنْ إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيَجِبْ، غَرَسًا كَانَ أَوْ نَخْوَةً.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ پر مدعو کیا جائے تو اسے وہاں پہنچنا چاہئے۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی روایت میں ہے ”جب تم میں سے کسی کو اس کا بھائی مدعو کرے تو اسے اس کی دعوت کو قبول کرنا چاہئے خواہ وہ شادی ہو یا اسی طرح کی

کوئی اور دعوت۔“

حاصل کلام: یہ حدیث شادی کے موقع پر کی جانے والی دعوت ولیمہ کو منظور و قبول کرنے کو واجب قرار دیتی ہے اور جمور کی رائے یہی ہے۔ انہوں نے یہ شرط ضرور لگائی ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ مثلاً کھانا ہی مشتبہ نہ ہو یا مالداروں کو بالخصوص مدعو کیا گیا ہو یا باطل کام کیلئے تعاون و استعانت کیلئے اسے دعوت دی گئی ہو یا وہاں ایسا کام ہو جو غیر پسندیدہ اور شرعاً منکر کی تعریف میں آتا ہو۔

(۸۹۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ وَالْوَليْمَةُ (مستحقین) کو روکتا ہو اور جو آنے سے انکاری یُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيهَا، وَيُدْعَى إِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. کی نافرمانی کی۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یمنعها﴾ صیغہ مجہول۔ معنی ہیں کہ اس سے روکتا ہو۔ ﴿من یاتہا﴾ جو برضا و رغبت شمولیت کرنا چاہتا ہو اور وہ ہیں فقراء لوگ۔ ﴿من یاباہا﴾ یعنی جو اس میں شامل ہونے سے انکاری ہو اس سے مراد مالدار ہیں۔ یہ ہے کہ جس دعوت طعام میں فقراء اور اغنیاء دونوں کو مدعو کیا ہو۔ اس میں شر نہیں۔

(۸۹۵) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِمًا فَلْيَصِلْ، وَإِنْ كَانَ مُفْطَرًا فَلْيَطْعَمْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ أَيْضًا. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ پر مدعو کیا جائے تو اسے منظور کرنا چاہئے۔ اگر وہ روزے سے ہو تو دعا کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو پھر اسے کھانا کھانا چاہئے۔“ (مسلم)

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے اور اس میں آپ کا ارشاد ہے کہ ”اگر وہ چاہے تو کھانا کھالے اور اگر وہ چاہے تو چھوڑ دے یعنی نہ کھائے۔“

لغوی تشریح: ﴿فان کان صائماً فلیصل﴾ اگر روزے سے ہو تو پھر اسے چاہئے کہ مہمان نوازون کیلئے مغفرت و برکت کی دعا کرے اور یہ جمور کا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز میں مشغول ہو

نکاح کے مسائل کا بیان 684

جائے تاکہ اس نماز کی برکت میں اہل خانہ اور دیگر حاضرین سب ہی شامل ہو جائیں۔

(۸۹۶) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «طَعَامُ الْوَلِيمَةِ أَوَّلُ يَوْمٍ حَقٍّ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِي سُنَّةٌ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ، وَمَنْ سَمِعَ سَمِعَ اللَّهَ بِهِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَفْرَغَهُ، وَرِجَالُهُ رِجَالُ الضَّحِيحِ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنْ أَنَسٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَةَ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ولیمہ کا کھانا پہلے روز حق ہے اور دوسرے روز سنت ہے اور تیسرے روز کھانا تو محض نمود و نمائش اور شہرت و ریاکاری ہے۔ جو شخص ریاکاری کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس ریاکاری کی سزا دے گا۔“ (اس روایت کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے غریب بھی قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس حدیث کے راوی صحیح کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی صورت میں اس کا ایک شاہد بھی موجود ہے)

لغوی تشریح: ﴿حق﴾ کا معنی ثابت شدہ یا واجب۔ ﴿طعام يوم الثانی سنۃ﴾ اس فقرہ میں سنۃ کا معنی مروج طریقہ، لوگوں میں معروف و مشہور رواج جو منکر و ناپسندیدہ نہ ہو۔ ﴿سمعة﴾ سین پر ضمہ اور میم ساکن رباء و دکھاوا کے معنی۔ تاکہ لوگوں دکھائے اور ان سے ریاکاری کرے۔ ﴿ومن سمع سمع اللہ بہ﴾ سمع میں میم پر تشدید (دونوں جگہ) یعنی جو شخص سخاوت وغیرہ کے ذریعے اپنی شہرت اور ریاکاری یا تکبر کا اظہار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز محشر کے کھلے میدان میں اسے اس عنوان سے مشہور کرے گا کہ یہ جھوٹا اور شہرت پسند ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولیمہ دو دن تک تو درست ہے مگر تیسرے دن بھی اس کا اہتمام نمود و نمائش اور ریاکاری کا باعث ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ تیسرے دن کی ممانعت تب ہے جب کھانے والے وہی لوگ ہوں لیکن اگر ہر روز نئے لوگ مدعو ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ تو سات دن تک بھی ولیمہ کے قائل ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اس کے راوی اصحیح کے راوی ہیں یہ بات محل نظر ہے بلکہ اس باب کی دوسری احادیث بھی کلام سے خالی نہیں۔ (سبل)

(۸۹۷) وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ: أَوْلَمَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى بَعْضِ نِسَائِهِ بِمُدْنٍ مِنْ شَعِيرٍ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کا ولیمہ دو مد جو سے کیا۔ (بخاری)

نکاح کے مسائل کا بیان 685

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختلف شادیوں کی صورت میں ضروری نہیں کہ ولیمہ ایک ہی جیسا ہو۔ حسب حال ولیمہ کرنا چاہئے۔ آپؐ نے ولیمہ میں بکری بھی ذبح کی اور ستو اور کھجور بھی ولیمہ میں کھلائے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں صرف دودھ جو پراکتفا فرمایا۔

راوی حدیث: ﴿صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا﴾ صفیہ بنت شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ الحنفی بنو عبد الدار میں سے تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے اور ایک قول کے مطابق ان کی روایت ثابت نہیں ہے۔ ابن سعد نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ تابعیہ تھیں۔

(۸۹۸) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: أَقَامَ حَضْرَتُ اَنْسِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ سَمْعَةَ مَرْوًیْ هَے كَه نَبِی كَرِیْم ﷺ النَّبِیُّ ﷺ بَيْنَ خَيْبَرَ وَالْمَدِينَةِ ثَلَاثَ لَيَالٍ، يُبْنَى عَلَيْهِ بِصَفِيَّةٍ، فَدَعَوْتُ الْمُسْلِمِينَ إِلَى وَلِيمَتِهِ، فَمَا كَانَ فِيهَا مِنْ خُبْزٍ وَلَا لَحْمٍ، وَمَا كَانَ فِيهَا إِلَّا أَنْ أَمَرَ بِالْأَنْطَاعِ فَبُسِطَتْ، فَأُلْقِيَ عَلَيْهَا التَّمْرُ وَالْأَقِطُ وَالسَّمْنُ. مَقْفُ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خیبر اور مدینہ کے درمیان تین روز تک قیام کیا۔ صفیہ رضی اللہ عنہا سے اسی مقام پر شب بashi کی تو میں نے مسلمانوں کو حضور ﷺ کے ولیمہ کی دعوت دی۔ بس اس دعوت میں نہ روٹی تھی اور نہ گوشت۔ اس تقریب میں بس یہی تھا کہ آپؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق چٹائیاں بچھائی گئیں اور ان پر کھجوریں، پنیر اور مکھن چن دیا گیا۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿بنی علیہ بصفیہ﴾ فعل صیغہ مجہول۔ یہ کنایہ ہے بیوی سے شب بashi و ہم بستری کا۔ ﴿بالانطاع﴾ نطع کی جمع ہے۔ حمزہ کے نیچے کسرہ اور ”طا“ پر فتح اور دوسری صورت میں ”ممرزہ“ اور ”طاء“ دونوں پر فتح اور ”طاء“ ساکن بھی منقول ہے۔ چٹائی یا پھر چرمی چادر۔ ﴿الاقط﴾ حمزہ پر فتح اور قاف پر کسرہ یا دونوں یعنی حمزہ اور قاف دونوں کے نیچے کسرہ اور اس میں ایک اور لغت بھی ہے اور اس کا معنی سخت جما ہوا دودھ جسے پنیر کہتے ہیں اور کھجور اور پنیر اور مکھن کے مجموعے کو جسے کہتے ہیں اور ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ کے ولیمہ میں ستو اور کھجور تھے۔ اس میں ستو ملا لئے۔ اس طرح وہ حبس نامی چیز سے اسے خارج نہیں کر دیتی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران سفر شادی کرنا جائز ہے تو سب رشتہ داروں کا شامل کرنا بھی لازمی اور ضروری نہ رہا۔ نیز ثابت ہوا کہ ولیمہ میں ایک سے زائد کھانے کی اشیاء بھی جائز ہیں۔ البتہ اس میں اسراف سے بہر نوح اجتناب ضروری ہے۔

نکاح کے مسائل کا بیان 686

(۸۹۹) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: إِذَا اجْتَمَعَ دَاعِيَانِ طَعَامٍ دِي هُوَ تَوْجَسْ كَدَرَوَاهِ مُتَصِلٌ وَ قَرِيبٌ هُوَ اس كِي دَعْوَتِ قَبُولِ كَرُو اور ان ميں سے جو پہلے دَعْوَتِ دے اس كِي دَعْوَتِ قَبُولِ كَرُو۔“ (اسے ابو داؤد نے دَاوُد، وَ سَنَدُهُ ضَعِيفٌ۔

روایت کیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے)

(۹۰۰) وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا أَكُلُ مُتَكِنًا»۔ رَوَاهُ (بخاری)

الْبُخَارِيُّ۔

لغوی تشریح: ﴿مُتَكِنًا﴾ متکنا کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چو کڑی مار کر ٹیک لگا کر ہموار زمین پر بیٹھنا اور ایک قول یہ ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ سے زمین پر ٹیک لگانا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنے کسی ایک پہلو کے بل بھک جانا اور ایک قول یہ ہے کہ کسی طرح مضبوطی سے جم کر بیٹھ جانا۔ خطابی کا قول یہ ہے کہ عوام تو متکنا اسے سمجھتے ہیں کہ کھانے والا اپنے کسی ایک پہلو کے بل بیٹھ جائے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد ہموار زمین پر مضبوطی سے ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے اور کراحت و ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ ٹیک لگا کر چو کڑی مار کر کھانا دنیا کے متکبرین اور مختلف اقسام کے کھانے کثرت سے کھانے والوں کی عادت ہے۔

(۹۰۱) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ حَضْرَتِ عُمَرُ بْنُ ابِي سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا أَكُلُ مُتَكِنًا»۔ رَوَاهُ (بخاری و مسلم)

مُتَقْنٌ عَلَيْهِ۔

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ کھانا ہمیشہ بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھانا چاہئے البتہ اگر کھانے کی اشیاء مختلف ہیں تو دل پسند چیز جہاں ہو لے سکتا ہے جیسا کہ دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ﴾ عمر بن ابی سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسد بن ہلال مخزومی۔ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے تحت جگر تھے اور نبی ﷺ نے ان کی تربیت و پرورش فرمائی تھی۔

نکاح کے مسائل کا بیان 687

حبشہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ کے درمیانی عرصہ میں ہوئی تھی۔ ۸۳ھ میں وفات پائی۔

(۹۰۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بِقِصْعَةٍ مِّنْ ثُرَيْدٍ، فَقَالَ: «كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا، وَلَا تَأْكُلُوا مِنْ وَسْطِهَا، فَإِنَّ الْبَرَكَهَ تَنْزِلُ فِي وَسْطِهَا». رَوَاهُ الْأَزْهَعِيُّ، وَهَذَا لَفْظُ الثَّانِي، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ثرید سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ نے ہدایت فرمائی کہ ”پیالے کے کناروں سے کھاؤ، درمیان سے نہ کھاؤ۔ اس لئے کہ برکت کا نزول درمیان میں ہوتا ہے۔“ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ نسائی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿بقصعة من ثريد﴾ قصعة بڑے پیالہ کو کہتے ہیں اور ثرید کہتے ہیں چورا کی ہوئی روٹی پر گوشت اور اس کا شوربا ڈال کر یکجا کر لینے کو۔

(۹۰۲/۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا عَبَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ، كَانَ إِذَا اشْتَهَى شَيْئًا أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا۔ جب کسی چیز کی خواہش ہوتی تو تناول فرما لیتے اور اگر ناپسند فرماتے تو چھوڑ دیتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے۔ اگر طبیعت مائل ہو تو کھالیا جائے اور اگر طبع کے موافق نہ ہو تو چھوڑ دے۔ عیب نکالنے سے کھانا تیار کرنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور مہمان نواز پر اچھا اثر نہیں پڑتا نیز پکی ہوئی نعمت کی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے۔

(۹۰۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا تَأْكُلُوا بِالشَّمَالِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِالشَّمَالِ». رَوَاهُ ترمذی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا ”بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ اس لئے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔“ (مسلم)

(۹۰۴) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَنْفَسْ فِي الْإِنَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ وَرَأَى: «أَوْ يَنْفُخَ فِيهِ» وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ. حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے جب کوئی مشروب پی رہا ہو تو برتن میں سانس نہ لے۔“ (بخاری و مسلم) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح کی روایت ابو داؤد میں بھی ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ”اس میں پھونک

نہ مارے۔“ (اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلا ینفس﴾ مبنی للمعلوم۔ سانس لینے سے ممانعت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ سانس برتن میں لینے سے اندیشہ ہے کہ مشروب میں سانس کے ذریعہ سانس لینے والے کا تھوک یا رال ٹپک جائے اور یہ دوسرے آدمی کی طبیعت پر ناگوار گزرے اور اس لئے بھی کہ سانس کے ذریعہ پھپھڑے میں سے ہوا ایسی چیز خارج کر کے مشروب میں ڈال دے جو تندرست آدمی کی صحت کیلئے مضر ہو۔ یعنی جراثیم مشروب میں داخل ہو کر اسے خراب کر دیں اور مفید کے ساتھ غیر مفید شامل ہو کر یہ آمیزش شدہ مخلوط مواد صحت کی خرابی کا باعث بن جائے۔

ہ - باب القسم بیویوں میں باری کی تقسیم کا بیان

(۹۰۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقْسِمُ لِبَنَاتِهِ، فَيَعْدِلُ، وَيَقُولُ: «اللَّهُمَّ هَذَا قَسَمِي فِيمَا أَمْلِكُ، فَلَا تَلْمَنِي فِيمَا تَمْلِكُ، وَلَا أَمْلِكُ». رواه الأربعة، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالْحَاكِمُ، لَكِنْ رَجَّحَ التِّرْمِذِيُّ إِسْنَانَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے درمیان باری تقسیم کرتے تھے اور عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرتے تھے۔ ”اے الٰہی جو میرے بس میں ہے اس کے مطابق میں نے یہ تقسیم کی ہے اور جو میرے بس میں نہیں تیرے اختیار میں ہے، اس میں مجھے ملامت نہ کرنا۔“ (اسے

چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے لیکن ترمذی نے اس روایت کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب القسم﴾ ”قاف“ پر فتح اور ”سین“ ساکن۔ بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنا اور وہ اس طرح کہ خاوند اپنی بیویوں کے ہاں ایک ایک دن جانے کو مقرر کر دے۔ ﴿فیعادل﴾ عدل سے ماخوذ ہے جو جور کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ﴿هذا قسمی فیما املک﴾ بیویوں کے ہاں رہنے میں حتی المقدور یہ میری تقسیم ہے۔ ﴿فلا تلمنی﴾ مجھے ملامت نہ کر اور نہ میرا مؤاخذہ فرمایا جس میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ﴿فیما تملک ولا املک﴾ یعنی قلبی میلان اور محبت کے بارے میں جو ایک دوسری کیلئے کم و بیش ہوتی ہے جو انسان کی قدرت میں نہیں اس میں میرا مؤاخذہ اور جواب طلبی نہ فرمانا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی بیویوں کے درمیان عدل و انصاف پر قائم رہنا چاہئے۔ البتہ دلی میلان اگر کسی کی طرف ہو تو اس میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عورتیں سیرت و کردار

نکاح کے مسائل کا بیان 689

اخلاق اور حسن و جمال اور عادات و خصائل کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں جس عورت میں حسن و جمال اور اخلاق و اوصاف اور شوہر کی فرمانبرداری زیادہ ہوگی، شوہر کا میلان قدرتی طور پر اس کی جانب زیادہ ہوگا۔

(۹۰۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «جَسْ شَخْصٍ كِي دُو يَوِيَا هُوں اور «مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ إِلَى خَاوْنِد كَا مِيلَانِ اِيكِي كِي طَرْف رِهَا تُو قِيَا مَت كِي رُو ز اِخْذَاهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ وَهُ اِيْسِي حَالَت مِيں آئِي كَا كِي اِيكِي پِهْلُو جِهْ كَا مَانِلٌ». رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالْاَزْمَعَةُ، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے)

لعنوی تشریح: ﴿شقہ﴾ اس کا ایک پہلو۔ ﴿مائل﴾ یعنی مفلوج، ترمذی میں ﴿ساقط﴾ کا لفظ ہے یعنی گرا ہوا۔ تحفۃ الاحوذی کے مطابق بعض روایات میں ہے کہ ایسا شوہر قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ وہ اپنے ایک مفلوج لٹکے ہوئے پہلو کے ساتھ آئے گا۔ دونوں بیویوں میں سے ایک کی طرف میلان و رجحان سے مراد باری کی تقسیم اور اخراجات و مصارف میں ناانصافی کرنا ہے جن میں وہ برابری کا اختیار رکھتا ہے۔

(۹۰۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مِنْ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبُكَرَ عَلَى الثَّيِّبِ، تَوَّجَ عِنْدَهَا سَبْعًا، ثُمَّ قَسَمَ، وَإِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ، أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَسَمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب مرد شوہر دیدہ پر کنواری بیاہ کر لائے تو اس نئی دلہن کے پاس پہلے سات روز قیام کرے پھر باری تقسیم کرے اور جب شوہر دیدہ سے نکاح کرے تو اس کے پاس تین روز قیام کرے پھر باری تقسیم کرے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿اذا تزوج الرجل البكر على الثيب﴾ یعنی جب آدمی کے پاس پہلے سے بیوی موجود ہو پھر کنواری سے شادی کرے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نئی بیوی سے شب عروسی اس کا حق ہے اور دوسریوں پر اسے ترجیح دی جائے گی۔ یہ مدت ختم ہونے کے بعد پھر جدیدہ و قدیمہ نئی و پرانی بیویاں باریوں کی تقسیم میں مساوی استحقاق رکھتی ہیں۔

(۹۰۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا تَزَوَّجَهَا، أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلَاثًا، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَيْسَ بِكَ عَلَى أَهْلِكَ هَوَانٌ، إِنْ جَسْ شَخْصٍ كِي دُو يَوِيَا هُوں اور جب ان سے نکاح کیا تو ان کے پاس تین روز قیام کیا اور فرمایا کہ ”اپنے اہل کے نزدیک تو ذلیل نہیں ہے۔ اگر چاہے تو میں تیرے لئے سات روز مقرر کر

نکاح کے مسائل کا بیان 690

سَبَّغْتُ لَكَ، وَإِنْ سَبَّغْتُ لَكَ کے قیام کرتا ہوں۔ پھر میں اپنی باقی سب عورتوں کے سَبَّغْتُ لِنِسَائِي۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ ہاں بھی سات سات روز قیام کروں گا۔“ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿لِیس بک علی اہلکد ہوان﴾ میں ”باء“ سببیہ ہے اور اہل سے مراد اس عورت کا اپنا قبیلہ مراد ہے اور ہوان سے مراد حقیر و ذلیل۔ معنی یہ ہوا کہ تیرے سبب یا تیری وجہ سے تیرا قبیلہ ذلیل نہیں ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس اہل سے مراد خود نبی ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوا کہ میں نے تین روز کا عرصہ اس لئے مختصر نہیں رکھا کہ تیری ذات میری نظر میں ذلیل و حقیر ہے اور تیری ذات میں میری دلچسپی اور رغبت کم ہے بلکہ اس لئے کہ دراصل حکم یہی ہے۔ آپؐ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ اس لئے فرمایا کہ جب حضور ﷺ ان کے ہاں سے نکل کر تشریف لے جانے لگے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کا دامن پکڑ لیا۔ ﴿سَبَّغْتُ لَكَ﴾ تسبیح سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ میں تیرے ہاں سات روز تک قیام کر سکتا ہوں اور دار قطنی کی روایت میں ہے اگر تیری منشا ہو تو یہ تین دن صرف تیرے ہاں قیام کر سکتا ہوں اور اگر تو چاہے تو سات روز مقرر کر کے قیام کروں اور اس کے آخر میں ہے میں نے عرض کیا تین روز میرے پاس خالصتاً قیام فرمائیں۔ اس حدیث میں دلیل ہے اس امر کی کہ اگر مدت مقررہ میں مزید اضافہ عورت کی طلب پر ہو تو اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ ساری بیویوں کا اس طرح استحقاق ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی کے پاس پہلے بیوی موجود ہو اور اب نئی دامن لانا چاہتا ہو تو اگر اس نے ایسی عورت سے شادی کی جو شوہر دیدہ ہے تو اس کے ہاں تین روز قیام کرنا ہوگا اور اگر کنواری ہے تو اس کے پاس سات روز قیام کرنا ہوگا۔ اس کے بعد دونوں کے ہاں باری باری سے قیام کرنا ہوگا۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ابی حنیفہ کا مسلک ہے۔ کنواری کیلئے سات روز اس لئے مقرر فرمائے کہ اس کا دل لگ جائے اور اس کی اجنبیت دور ہو جائے جبکہ شوہر دیدہ جلدی مانوس ہو جاتی ہے اور ماحول میں گھل مل جاتی ہے۔ اس لئے اس کیلئے تین روز مدت مقرر کر رکھی ہے۔ اس باب میں اور بھی صحیح احادیث منقول ہیں مگر احناف نے ان احادیث کی مخالفت کی ہے۔ قرآن مجید کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اور کون جانتا اور سمجھتا ہے۔ احناف نے ”فان خفتم ان لاتعدلوا“ کی آیت سے دلیل لی ہے۔ حالانکہ یہ عدل کے منافی نہیں ہے۔ اس باب کی احادیث مشہور ہیں اور متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ لہذا کتاب اللہ کا تخصص ان سے جائز ہے۔

(۹۰۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ سَوْدَةَ بِنْتَ زَمْعَةَ وَهَبَتْ يَوْمَهَا لِعَائِشَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَفْسِمُ لِعَائِشَةَ يَوْمَهَا وَيَوْمَ سَوْدَةَ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا اور نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیلئے ان کا اپنا دن بھی اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا دن بھی تقسیم کرتے

تھے۔ (بخاری و مسلم)

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی بیوی اپنی باری دوسری بیوی کو دے سکتی ہے یہ بخشش ناقابل رجوع اور ناقابل واپسی ہوگی۔ بشرطیکہ مقرر ایام کی تعیین نہ کی گئی ہو۔

(۹۱۰) وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ: قَالَتْ حَضْرَتُ عُرْوَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا: يَا ابْنَ أُخْتِي كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا يُفْضَلُ بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْقِسْمِ، مِنْ مَكْنِيهِ عِنْدَنَا وَكَانَ قَلَّ يَوْمٌ إِلَّا وَهُوَ يَطُوفُ عَلَيْنَا جَمِيعًا، اعْتَبَارًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ، فَيَدْنُو مِنْ كُلِّ امْرَأَةٍ، مِنْ غَيْرِ مَسِيْسٍ، حَتَّى يَبْلُغَ النَّحْيَ هُوَ يَوْمُهَا، فَيَبْسُطُ عِنْدَهَا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے میری بہن کے تحت جگر! (بھانجے) رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کی باری کی تقسیم میں کسی کو کسی پر فوقیت و فضیلت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے پاس آپ کے قیام کے اعتبار سے آپ کا معمول تھا اور کم ہی ایسا کوئی دن ہوگا جس میں آپ ہمارے پاس گھومتے پھرتے نہ ہوں اور ہر بیوی کے پاس جاتے ضرور مگر کسی کو چھوتے تک نہ تھے۔ گھومتے گھومتے اس بیوی کے پاس پہنچ جاتے جس کی باری ہوتی تو رات اس کے پاس بسر فرماتے۔ (احمد و ابوداؤد اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں، حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا صَلَّى الْعَصْرَ دَارَ عَلَى نِسَائِهِ، ثُمَّ يَدْنُو مِنْهُنَّ. الْحَدِيثُ.

اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر ادا فرما کر اپنی ساری بیویوں کے ہاں تشریف لے جاتے پھر ان سے قرب بھی حاصل کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿یا ابن اختی﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عروہ کو یوں مخاطب کرنا اس بنا پر تھا کہ عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر کے فرزند تھے۔ ﴿لا یفضل﴾ تفضیل سے ماخوذ ہے ﴿فیدنو﴾ پھر قرب حاصل کرتے یعنی ان سے محبت کا اظہار کرتے۔ ﴿مسیس﴾ جماع ﴿دار﴾ گھومے، طواف کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہر روز اپنی ازواج مطہرات کی قیام گاہوں میں حالات معلوم کرنے کی غرض سے چکر ضرور لگاتے اور باہمی محبت و پیار کا اظہار کرتے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بیوی کی قیام گاہ الگ الگ ہونی چاہئے۔ اس سے پردہ داری بھی رہتی ہے۔ کم عمر بچوں کو پیار سے بلانا بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے کو یا ابن اختی کہہ کر

بلایا جس سے محبت اور پیار جھلکتا نظر آتا ہے۔

(۹۱۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَسْأَلُ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ: "أَيْنَ أَنَا عَدَا؟ يُرِيدُ يَوْمَ عَائِشَةَ، فَأَذِنَ لَهُ أَرْوَاجُهُ، يَكُونُ حَيْثُ شَاءَ، فَكَانَ فِي بَيْتِ عَائِشَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس مرض میں وفات پائی اس میں دریافت فرماتے تھے کہ "کل میری باری کس کے ہاں ہے؟" ان کے پیش نظر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دن ہوتا تھا۔ آپ کی ازواج مطہرات نے اس کی اجازت دے دی کہ جہاں چاہیں رہیں۔ پس بعد میں آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ہی رہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: ایک روایت میں ہے کہ آنحضور ﷺ کے مرض الموت کا آغاز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے شروع ہوا تھا۔ آخر بیماری نے اتنا کمزور اور ضعیف کر دیا کہ سب بیویوں کے گھر میں جانا دشوار ہو گیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سب ازواج مطہرات سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں مستقل قیام کی اجازت لے لی۔ انہوں نے برضا و رغبت آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ یہ اجازت اس لئے طلب کی گئی کہ کسی کے ذہن میں کوئی نامناسب خیال پیدا نہ ہو جائے۔

(۹۱۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ سَفَرًا أَفْرَعَ بَيْنَ نِسَائِهِ، فَأَيَّتَهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا، خَرَجَ بِهَا مَعَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کرتے۔ پس جس بیوی کے نام کا قرعہ نکلتا وہ آپ کی ہم سفر ہوتی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی مبہم معاملہ کے تصفیہ کیلئے قرعہ اندازی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۹۱۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَمْعَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زَمْعَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: "قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَجْلِدُ الْعَبْدُ» رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ.

حضرت عبد اللہ بن زعمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح نہ مارے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لَا يَجْلِدُ الْعَبْدُ﴾ کوڑے نہ مارے۔ ﴿جلد﴾ باب ضرب بضر ہے۔ "جلد" کہتے ہیں کوڑے سے مارنے کو۔ "جلد العبد" جس طرح غلام کو مارا پیٹا جاتا ہے کوڑوں سے۔ مصدر منصوب تشبیہ کیلئے لایا گیا ہے اس حدیث کے آخر میں یہ بھی ہے۔ ثم یجاء معہا کہ پھر اس سے جماع کرے۔ یہ مارنے کے فعل سے نفرت پیدا کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ ہر عقلمند اس جیسے سلوک کو پسند نہیں کرتا کہ

نکاح کے مسائل کا بیان 693

بیوی کو مارے پیٹے بھی اور اس سے شب باشی بھی کرے۔ البتہ اس حدیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہلکی و خفیف مار جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ﴾ عبد اللہ بن زمعہ بن اسود بن عبد المطلب بن اسد بن عبد العزیٰ الاسدی حضرت سودہ بنت زمعہ کا بھائی۔ یہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ یوم الدار میں شہید ہوئے۔

۷ - باب الخلع خلع کا بیان

(۹۱۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ امْرَأَةً ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ أَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ مَا أُعِيبَ عَلَيْهِ فِي خُلُقِهِ وَلَا دِينِهِ، وَلَكِنِّي أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيثَهُ؟» فَقَالَتْ: نَعَمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اقْبَلِ الْحَدِيثَ وَطَلِّقِيهَا تَطْلِيقَةً». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَأَمْرَهُ بِطَلَّاقِهَا».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے اخلاق اور دین میں کوئی عیب نہیں لگاتی۔ لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا ”کیا تو اس کا باغ واپس کر دے گی؟“ وہ بولی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”(اے ثابت!) اپنا باغ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔“ (بخاری)

ولأبي داود والترمذي - وحسنه - : أَنَّ امْرَأَةً ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ اخْتَلَعَتْ مِنْهُ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ عِدَّتَهَا حَيْضَةً. وَفِي رِوَايَةٍ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ. عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ. عِنْدَ ابْنِ مَاجَهَ: أَنَّ ثَابِتَ بْنَ قَيْسٍ كَانَ دَمِيمًا، وَأَنَّ امْرَأَتَهُ قَالَتْ: لَوْلَا مَخَافَةُ اللَّهِ إِذَا دَخَلَ عَلَيَّ لَبْصَقْتُ فِيهِ

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے خلع کیا اور نبی ﷺ نے اس کیلئے عدت خلع ایک حیض مقرر فرمائی اور ابن ماجہ میں عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت بیان کی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ بد صورت کالے رنگ کا آدمی تھا اور اس کی بیوی نے کہا اگر مجھے خدا کا خوف و ڈر نہ ہوتا تو جس وقت وہ میرے پاس آیا تھا میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔

وَلَا حَمْدَ مِنْ حَدِيثِ سَهْلِ بْنِ
أَبِي حَنَمَةَ: «وَكَانَ ذَلِكَ أَوَّلَ خُلْعِ
أور مسند احمد میں سہل بن ابی حنمہ سے مروی ہے۔
کہ اسلام میں یہ پہلا خلع تھا۔
فی الإسلام»۔

لعنوی تشریح: ﴿باب الخلع﴾ خلع کے ”خاء“ پر ضمہ اور ”لام“ ساکن۔ عورت کا مہر میں دیا ہوا معاوضہ واپس دیکر شوہر سے جدا اور الگ ہونا خلع کہلاتا ہے۔ یہ ”خلع الثوب“ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں لباس اتارنا۔ کپڑا اتارنا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے لباس ہے اور اس کا مصدر ”خاء“ کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے جس کا معنی اجسام اور معانی میں جدائی اور علیحدگی کے ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ”خلع الثوب“ خلعاً سے ہے اور خلع امراتہ“ خلعاً وخلعاً یعنی ”خاء“ پر ضمہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ ﴿ان امرأۃ ثابت بن قیس﴾ ثابت بن قیس کی بیوی۔ اکثر روایات میں اس کا نام حبیبہ بنت سہل ہے اور بعض نے صحیح نام جمیلہ قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صحیح نام مریم تھا۔ مگر پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس کا احتمال بھی ہے کہ خلع کے واقعات متعدد ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعض راویوں کو وہم ہوا ہو۔ ﴿ما اعیب﴾ عیب سے ماخوذ ہے اس صورت میں ”یاء“ کے ساتھ ہوگا اور یہ بھی مروی ہے کہ ”یاء“ کی بجائے ”تاء“ ہے اور اعیب کی بجائے اعتب ہے۔ ﴿خلق﴾ میں ”خاء“ اور ”لام“ دونوں پر ضمہ اور لام ساکن بھی منقول ہے یعنی خلق اور خلق جس کے معنی عادت اور طبیعت کے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میں یہ نہیں کہتی کہ ثابت بن قیس اور دین کے اعتبار سے برا ہے ﴿ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام﴾ یعنی مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ خاوند سے بغض اور بے رخی کے سبب میں حدود کو قائم نہ رکھ سکوں گی جو کہ سراسر اخلاق اسلام اور اس کے اوامر کے منافی ہیں اور یوں میں خاوند کی ناشکری کا ارتکاب کر بیٹھوں گی۔ اس نے یہ گفتگو اور خوف و اندیشہ کا اظہار اس لئے کیا کہ وہ دین کے ساتھ شدید پختہ عمل کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت تھی جبکہ ثابت بن قیس پست قامت اور نہایت کالے رنگ کے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ طبیعتاً سخت تھے اور عورتوں کو بہت مارنے والے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی اسی بیوی کو اتا مارا بیٹھا کہ اس کا ہاتھ توڑ دیا۔ اسی وجہ سے اس کے دل میں اپنے خاوند کے بارے میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ ﴿حدیقتہ﴾ ثابت بن قیس کا باغ، یہ باغ ثابت نے حبیبہ کو حق مہر میں دیا تھا۔ ﴿وطلقہا﴾ تطلیقہ سے۔ ایک طلاق دے دو۔ ”طلقہا“ میں امر کا صیغہ ہے۔ ﴿الدمیم﴾ بد صورت۔ قبیح چہرے والا۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ عورت سے فدیہ قبول کرنے کے بعد طلاق دینے سے خلع واقع ہوگا اور ایک روایت میں ہے ﴿خذھما﴾ دونوں لے لو۔ یعنی دونوں باغ جو حق مہر میں دیئے تھے واپس لے لو اور اسے جدا کر دو اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک باغ اس عورت سے واپس لے لیا اور وہ اپنے میکے جا بیٹھی اور یہ

دلیل ہے کہ جب خاوند علیحدگی کیلئے اپنا دیا ہوا حق مہر واپس لے لے تو جدائی واقع ہو جائے گی اور بغیر طلاق دیئے نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اسی سے اختلاف واقع ہو گیا کہ خلع طلاق ہے یا فسخ۔ ظاہر بلکہ بالکل نمایاں ہے کہ یہ فسخ ہے اس لئے کہ نبی ﷺ نے خلع کرنے والی کو صرف بطور عادت ایک حیض کا حکم فرمایا ہے اور طلاق کی عادت ایک حیض تو قطعاً نہیں ہے بلکہ اس کی عادت تین حیض ہے اور رہا طلاق کا حکم فرمانا، تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جس عورت سے وطی کی گئی ہو طلاق کی وجہ سے مہر کی واپسی ایسی طلاق کو خلع بنا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ طلاق لفظاً تو طلاق ہے مگر حقیقتاً فسخ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر بیوی کو معقول عذر ہو تو وہ حق مہر خاوند کو واپس دے کر خلع کرا سکتی ہے۔ ائمہ میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ و امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک خلع طلاق ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک خلع فسخ ہے۔ حق مہر سے زیادہ مال لینے میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ بلکہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ جب نفرت کا اظہار عورت کی جانب سے ہو تو مرد کیلئے زیادہ لینا جائز ہے۔ مگر امام احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ وغیرہ زیادہ لینے کے قائل نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے انصاری خزرجی کہلائے۔ اکابر صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے تھے۔ انصار اور رسول اللہ ﷺ کے خطیب تھے۔ احد اور بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے اور نبی ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی۔ ۱۳ھ میں یمامہ کی معرکہ آرائی میں شہید کئے گئے اور مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

طلاق کا بیان

۷ - بَابُ الطَّلَاقِ

(۹۱۵) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَبْغَضُ الْحَلَائِلِ إِلَى اللَّهِ نَزْدِيكَ سَبَّ سَبِّ زِيَادَةٍ بَرِيءٌ طَلَقٌ هِيَ»۔ (اسے الطَّلَاقُ)۔ زَوَّاهُ أَبُو ذَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاجِمُ، وَرَوَّجَهُ أَبُو حَاتِمٍ إِسْنَادَهُ۔ صحیح قرار دیا ہے اور ابو حاتم نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الطلاق﴾ طلاق کے ”طاء“ پر فتح۔ لغت میں طلاق کے معنی بندھن کو کھولنا اطلاق سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ارسال یعنی چھوڑ دینے اور ترک کر دینے کے بعد شرعاً نکاح کی گرہ (تعلق) کھول دینے کو کہتے ہیں۔ امام الحرمین کا قول ہے کہ جاہلیت میں بھی اس کو طلاق کہا جاتا تھا اور شرع نے بھی اسی کو برقرار رکھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تمام اشیاء عند اللہ پسندیدہ نہیں۔ بعض باوجود حلال

نکاح کے مسائل کا بیان 696

کے بھی ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ انہی میں سے ایک طلاق ہے۔ طلاق حلال ہے مگر اس لئے کہ بسا اوقات انسان مجبور ہوتا ہے اور مصلحت اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ طلاق واقع ہو جائے اور بری اور ناپسندیدہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی وجہ سے باہمی دشمنی اور بسا اوقات دیرینہ رقابت پیدا ہو جاتی ہے جو شیطان کی خوشی اور مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے نہ ثواب ملتا ہے اور نہ ہی قرب الہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے حتی الوسع اس سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔ احوال و ظروف کی بنا پر اس کی مختلف قسمیں ہیں اور مستحب و جائز بھی اور مکروہ و حرام بھی۔ جس کی تفصیل شروح احادیث اور کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(۹۱۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، وَهِيَ حَائِضٌ، فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَسَأَلَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: «مُرْهُ، فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لِيُمْسِكْهَا حَتَّى تَظْهَرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَظْهَرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أُمْسِكَ بَعْدَ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللَّهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو عہد نبوی ﷺ میں طلاق دے دی جبکہ وہ حالت حیض میں تھی۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، آپ نے فرمایا کہ ”اسے کہو کہ رجوع کر لے اور اسے اس وقت تک روک لے کہ طہر شروع ہو جائے۔ پھر ایام آئیں پھر طہر شروع ہو پھر اگر چاہے تو اس کے بعد روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے۔ صحبت و مجامعت کرنے سے پہلے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جائے۔“ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اسے کہو ”کہ اس سے رجوع کر لے پھر اسے چاہئے کہ طلاق ایسی حالت میں دے کہ وہ پاک ہو یا حاملہ ہو“

اور بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ”یہ ایک طلاق شمار ہوگی“

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا اگر تو نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا کہ اس سے رجوع کر لوں۔ پھر اسے دوسرے حیض تک

حِيْضَةً أُخْرَى، ثُمَّ أَمْهَلَهَا حَتَّى تَظْهَرَ، ثُمَّ أَطْلَقَهَا قَبْلَ أَنْ أَمْسَهَا، وَأَمَّا أَنْتَ طَلَقْتَهَا ثَلَاثًا، فَقَدْ عَصَيْتَ رَبَّكَ فِيمَا أَمَرَكَ بِهِ مِنْ طَلَاقِ أَمْرَاتِكَ۔

اپنے پاس رکھوں اور پھر اسے طہر تک مہلت دوں تب میں اسے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دوں اور اگر تو نے اسے تین طلاقیں دے ڈالیں تو تو نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے معاملہ میں اپنے اللہ کی نافرمانی کی۔

وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ: فَرَدَّهَا عَلَيَّ، وَلَمْ يَرَهَا شَيْئًا، وَقَالَ: إِذَا ظَهَرَتْ فَلْيُطْلَقْ، أَوْ لِيُْمْسِكَ۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عورت کو مجھے واپس کر دیا گیا اور اس طلاق کو کچھ بھی نہ سمجھا گیا اور فرمایا گیا کہ جب عورت ایام سے پاک ہو جائے تو (ابن عمر رضی اللہ عنہما) طلاق دے یا روک لے۔

نفوی تشریح: ﴿طلق امراتہ﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ جس خاتون کو طلاق دی اس کا نام آمنہ بنت غفار ہے یا آمنہ بنت عمار تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام نوار تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا نام آمنہ ہو اور نوار اس کا لقب ہو۔ ﴿مرہ فلیراجعہا﴾ اسے کہو کہ اپنی بیوی سے رجوع کر لے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رجوع کو واجب قرار دیا ہے جبکہ اس نے طلاق حیض کے ایام میں دی ہو۔ جمہور کے نزدیک یہ رجوع مستحب ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سخت ناراض ہوئے اور یہ ناراضگی ایام حیض میں طلاق دینے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿ثم ليمسكها حتى تطهر﴾ پھر اسے چاہئے کہ عورت کو روکے رکھے کہ ایام حیض سے پاک ہو جائے یعنی اس حیض سے پاک ہو جائے جس میں طلاق دی ہے۔ ﴿ثم تحيض﴾ پھر دوسرا حیض آئے اور ﴿ثم تطهر﴾ دوسرے حیض سے پاک ہو جائے۔ اس کے بعد چاہے تو اسے روک لے یعنی طہر کے بعد دوسرے حیض سے پاک ہونے کے بعد۔ ﴿وان شاء طلق﴾ اگر چاہے تو جماع کرنے سے پہلے دوسرے طہر میں طلاق دے۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ پہلے طہر میں نہیں دوسرے طہر میں طلاق دے گا۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ پہلے طہر میں طلاق سے حرام ہو جائے گی اور ایک گروہ کا قول ہے کہ دوسرے طہر تک مؤخر کرنا مندوب ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ﴿ثم ليطلقها طاهرا او حاملا﴾ سے استدلال کیا۔ پس اس میں اول اور ثانی کی قید کے بغیر مطلقاً حالت طہر میں طلاق کا جواز ہے۔ اس لئے کہ طلاق کی ممانعت تو حیض کی وجہ سے ہے۔ لہذا جب عورت نے طہارت جنابت حاصل کر لی تو تحریم کا سبب زائل ہو گیا تو اسی طہر میں طلاق دینا جائز ہوا۔ ﴿فذلك العدة التي امر الله ان تطلق لها النساء﴾ یہ وہ عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ اس کیلئے عورتوں کو طلاق دی جائے۔ اس کا ذکر ارشاد باری تعالیٰ ﴿فطلقوهن لعدتهن﴾ میں

نکاح کے مسائل کا بیان 698

ہے۔ عدۃ کے ایک معنی یہ کئے گئے ہیں کہ اس سے مراد مدت، وقت ہے۔ آپ کے فرمان میں ﴿لہا﴾ فی کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ طہر جس میں مباشرت اور جماع نہ کیا گیا ہو۔ یہ وقت ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس وقت میں عورتوں کو طلاق دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عدت سے معروف عدت ہی مراد ہے اور لام اس میں ابتدائیہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عورتوں کو طلاق دو ان کی عدت کے اوقات کے آغاز و ابتداء میں۔ ﴿وحسبت علیہ تطلیقہ﴾ فعل صیغہ مجہول ہے اور حاسب سے مراد نبی ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ ایام حیض میں دی گئی طلاق واقع ہوگی۔ ممنوع قرار دی جانے کے باوجود وہ شمار کی جائے۔ لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہما کا آخر میں مذکور قول اس کے معارض ہے ﴿فردھا علی ولم یرھا شیئا﴾ یہ قول حیض میں طلاق کے واقع نہ ہونے پر صریح و واضح دلیل ہے۔ اسی بنا پر اس طلاق کے حکم کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ اکثر علما کا مذہب یہ ہے کہ یہ طلاق واقع ہوگئی اور انہوں نے کہا ہے کہ ﴿لم یرھا شیئا﴾ کا قول منکر ہے کیونکہ اسے ابو الزبیر کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کیا اور اس حکم میں دوسرے راویوں نے اس کے مخالف کہا ہے لہذا جب دوسرے راوی اس سے زیادہ ثقہ ہوں تو ابو الزبیر کا قول دلیل کیسے بنے گا۔ جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ نافع رحمہ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے میں ابو الزبیر کے مقابلہ میں زیادہ پختہ ہے اور دونوں احادیث میں جو زیادہ پختہ ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور ابو داؤد کا قول ہے کہ تمام حدیثیں ابو الزبیر کے قول کے خلاف ہیں اور خطابی نے کہا ہے کہ اہل حدیث کا قول ہے کہ ابو زبیر نے اس حدیث سے منکر حدیث اور کوئی روایت نہیں کی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے کوئی مستقیم چیز نہیں سمجھا جو سنت میں جائز ہو اور حکم کے اختیار کرنے میں لازمی ہو۔ اگرچہ علی سہیل کراحت اس کیلئے لازمی ہے مگر ابن حزم رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ جو کوئی ان دونوں کے دلائل سے واقفیت بہم پہنچانا چاہے اسے المحلی لابن حزم اور زاد المعاد لابن القیم کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

(۹۱۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَسَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ، طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرِ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أُنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ اور دور خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک تین طلاقیں، ایک طلاق ہی شمار ہوتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ایسے معاملہ میں جلدی کی جس میں ان کیلئے سہولت دی گئی تھی پس چاہئے کہ ہم اس کو نافذ کر دیں۔ لہذا آپ نے اس

عَلَيْهِمْ. فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. کو ان پر جاری کر دیا۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿انصاف﴾ ڈھیل، سہولت۔ یعنی مراجعت کے انتظار کیلئے باقی ماندہ سہولت سے فائدہ اٹھانا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں کیلئے گنجائش تھی کہ وہ یکے بعد دیگرے حالت طہر یعنی تین طہروں میں طلاق دیں مگر انہوں نے جلدی چٹائی اور دفعتاً و یکدم تین طلاقیں دینا شروع کر دیں۔ ﴿فلو امضيناه عليهم﴾ اگر ہم ان کے جلدی کرنے کی بنا پر اس کو نافذ کر دیں اور لازم قرار دے دیں تو پے درپے تین طلاقیں دینے کے مقابلہ میں یہ ان کیلئے سودمند اور نفع بخش رہے گا۔ یہ روایت دلیل ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تمہارائے تھی جبکہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی جائیں تو ایک ہی واقع ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے چار اقوال ہیں۔ جمہور جس میں ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین بھی شامل ہیں، کی رائے یہ ہے کہ اکٹھی دی گئی تین طلاقیں، تین ہی واقع ہوں گی اور خاوند کیلئے رجوع کا موقع اب باقی نہیں رہے گا اور ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ایک ہی وقت و مجلس میں اکٹھی دی گئی تین طلاقیں ایک واقع ہوں گی اور یہ عہد نبوی ﷺ میں خلافت صدیقی میں نافذ و جاری رہی ہے تا آنکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر اجتہاد کر کے لوگوں کو سزا دینے کیلئے تین کو تین ہی نافذ کر دیا۔ یہی فتویٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عکرمہ رضی اللہ عنہ، طاؤس رضی اللہ عنہ وغیرہم سے بھی منقول ہے اور اس کے مطابق بعض مالکی علماء نے اور کچھ حنفی علماء اور کچھ حنبلی اصحاب نے فتویٰ دیا ہے اور یہی مذہب صاحب مغازی محمد بن اسحاق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ مشائخ قرطبہ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے جیسے محمد بن قتی، بن مخلد اور محمد بن عبدالسلام الحنفی۔ فقہاء طلیطلہ کی ایک جماعت سے بھی یہی حکایت کیا گیا ہے اور اسی جماعت کی مدد و نصرت علامہ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے پھر ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور صحیح بھی یہی ہے اس پر ہی یہ حدیث دلالت کرتی ہے اور عنقریب آنے والی رکائے کی حدیث بھی اس کی دلیل ہے۔ اس دور میں کثیر تعداد میں اسلامی ممالک اسی پر عمل پیرا ہیں۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ مطلقہ سے اگر دخول ہو چکا ہو تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اس سے اگر دخول نہ ہوا ہو تو تین طلاقیں ایک ہی واقع ہوں گی۔ یہ ایسا مسلک ہے جس کے حق میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی طرف نظراتفاق کی جاسکے اور چوتھا مذہب یہ ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں اصلاً تو واقع نہیں ہوں گی اس لئے کہ یہ بدعت ہے لہذا اس کے ساتھ حکم شرعی لٹکا ہوا نہیں ہے یہ تو تمام مذاہب سے کمزور ترین مذہب ہے اور بطور استدلال سب سے ردی اور بے کار ہے۔

(۹۱۸) وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ لَبِيدٍ حَضْرَتِ مُحَمَّدِ بْنِ لَبِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَخْبَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا، فَقَامَ غَضْبَانًا هُوَ كَرَاثُھُ كَهْرُے ہوئے اور فرمایا ”کیا اللہ کی

حاصل کلام: یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ دفعۃً تین طلاق دینا حرام ہے۔ اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے اس کو رجوع کی اجازت دی یا نہیں؟ اس حدیث سے طلاق کے بارے میں مختلف مذاہب میں سے کسی کی تائید نہیں ہوتی۔

راوی حدیث: ﴿محمود بن لبید رضی اللہ عنہ﴾ محمود بن لبید بن ابی رافع انصاری اشعری۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ وہ صحابیؓ تھے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ ہم اس کی صحابیت کو نہیں جانتے تھے۔ امام مسلم نے تابعین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا شمار بڑے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ ۹۶ھ کو وفات پائی۔

(۹۱۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: طَلَّقَ أَبُو
رُكَّانَةَ، أُمَّ رُكَّانَةَ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ
اللَّهِ ﷺ: رَاجِعْ امْرَأَتَكَ. فَقَالَ:
إِنِّي طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا، قَالَ: «قَدْ
عَلِمْتُ، رَاجِعُهَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

وَفِي لَفْظِ لَأَحْمَدَ: طَلَّقَ أَبُو رُكَّانَةَ
أَمْرَأَتَهُ فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ ثَلَاثًا،
فَحَزَنَ عَلَيْهَا، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «فَإِنَّهَا وَاحِدَةٌ». وَفِي سَنَدِهِمَا ابْنُ
إِسْحَاقَ. وَفِيهِ مَقَالٌ.

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ ابو رکنہ
رضی اللہ عنہ نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی تھیں۔
پھر اس پر پشیمان ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو رکنہ
رضی اللہ عنہ سے فرمایا ”وہ تینوں طلاقیں ایک ہی ہیں۔“ (ان
دونوں روایتوں میں ابن اسحاق سے جس کے متعلق کلام ہے)

وَقَدْ رَوَى أَبُو دَاوُدَ مِنْ وَجْهِ آخَرَ،
حَسَنَ مِنْهُ، أَنَّ أَبَا رُكَّانَةَ طَلَّقَ
مَرْأَتَهُ سُهَيْمَةَ ابْنَتَهُ، فَقَالَ: وَاللَّهِ مَا
رَدْتُ بِهَا إِلَّا وَاحِدَةً، فَرَدَّهَا إِلَيْهِ
النَّبِيُّ ﷺ.

اور ابو داؤد نے ایک دوسرے طریق سے اسے
روایت کیا ہے جو اس سے بہتر ہے وہ یہ کہ ابو رکانہ
رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی مسماة سہیمہ کو بالکل طلاق
دے دی اور پھر کہا کہ بخدا میں نے ایک طلاق کی
نیت کی تھی تو نبی ﷺ نے ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو واپس

لوٹا دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ابورکاتہ﴾ رائج بلکہ صحیح یہ ہے کہ صاحب قصہ آدمی کا نام رکنا تھا ابورکاتہ نہیں اور اس کے باپ کا نام عبد یزید تھا۔ مسند احمد میں بھی ”رکناہ ہے نہ کہ ابو رکناہ“ البتہ ابوداؤد میں یہ قصہ ابورکاتہ کی طرف منسوب ہے۔ یہ وہم ہے جو مصنف کو نقل میں ہو گیا ہے۔ ﴿طلاق البتہ﴾ یہ ہے کہ طلاق دینے والا ﴿انت طالق البتہ﴾ کہے اور البتہ، البت سے ماخوذ ہے جس کا معنی قطع کرنے اور کاٹنے کے ہیں۔ گویا وہ اس طرح کہتا ہے کہ میں نے تجھے ایسی طلاق دی جس نے نکاح کو قطع کر دیا ہے، کاٹ کے رکھ دیا ہے، اب اس نے رجوع کا موقع نہیں چھوڑا۔ یہ لفظ بول کر طلاق دینے والا تین طلاقیں مراد لیتا ہے اور مراد دراصل ایک طلاق بائن ہوتی ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اگر طلاق دینے والے کی نیت میں ایک ہی طلاق تھی تو ایک رجعی طلاق واقع ہوگی اور قسم لینے کا مقصد تو یہ تھا کہ اگر اس نے تین کی نیت کی ہوگی تو تین بھی واقع ہو جائیں گی۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اور ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اضطراب بھی پایا جاتا ہے۔ نیز مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دو احادیث کے معارض بھی ہے۔ لہذا اس سے استدلال قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قصہ رکناہ والی حدیث کئی طرق سے منقول ہے اور مصنف نے وہ سارے طرق بیان کر دیئے ہیں جیسا کہ اوپر ان کا ذکر ہوا جنہیں ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ یہ دونوں ہی ضعیف ہیں پہلی اس بنا پر کہ اسے ابن جریج کے واسطے سے روایت کیا گیا ہے اس نے قال اخبرنی بعض بنی رافع عن عکرمہ سے روایت کیا ہے اور بنو رافع کے بعض مجہول اور نامعلوم ہیں۔ لہذا یہ حدیث ضعیف ہے اور تیسرے نمبر والی وہ ہے جس میں طلاق البتہ کا ذکر ہے اسے جریر بن حازم عن الزبیر بن سعید، عن عبد اللہ بن علی بن زید بن رکناہ عن ابیہ عن جدہ اور اسی طرح یہ نافع بن عیجر عن رکناہ ابن عبد یزید الخ کی سند سے بھی مروی ہے، اس میں زبیر بن سعید ضعیف ہے۔ میزان الاعتدال میں ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ ﴿لیس بشئی﴾ اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے اور التقریب میں ہے یہ لین الحدیث ہے اور عبد اللہ بن علی بن زید بھی ضعیف ہے۔ التقریب میں کہا ہے کہ وہ لین الحدیث اور میزان میں ہے کہ عقیلی نے کہا کہ اس کی سند میں اضطراب ہے۔ اس کی حدیث کا کوئی متابع نہیں ہے۔ رہا اس کا باپ علی بن زید تو ”الخلاصہ“ میں ہے کہ ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی حدیث صحیح نہیں اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے ذکر کیا کہ اس میں اضطراب ہے اور نافع بن عیجر بھی ضعیف ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الحدیث میں کہا ہے کہ نافع بن عیجر مجہول ہے۔ اس کے حالات کا قطعی علم کسی کو نہیں اور نہیں علم کہ وہ کون تھا اور کیا تھا؟ اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ ۳۳ / ۱۵ پر کہا ہے علل حدیث کے ماہر علماء اور ائمہ فقہ مثلاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہما اور ابو عبیدہ، ابو محمد بن حزم وغیرہ نے حدیث البتہ کو قطعی ضعیف قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے

نکاح کے مسائل کا بیان 702

راوی ایسے لوگ ہیں جن کی نہ عدالت معلوم ہے اور نہ ضبط۔ جب اس طریق کا یہ حال ہے تو پھر وہ ضعیف ہی ہے اس کے ضعف میں کیا شک و ریب باقی رہ گیا ہے۔ رہا دوسرا طریق جسے ابو داؤد نے بیان بھی نہیں کیا۔ صرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے بیان کیا ہے تو اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ قابل حجت ہیں۔ ہاں محمد بن اسحق رحمہ اللہ کے متعلق ضرور کلام ہے اور یہ معلوم ہی ہے کہ محمد بن اسحق رحمہ اللہ میں تدلیس کے ماسوا اور کوئی قابل ذکر کمزوری نہیں ہے۔ اس سند میں اس نے سماع کی صراحت کر دی ہے۔ پس تدلیس کا شبہ بھی ختم ہو گیا۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے عمدہ اور صحیح ترین طریق وہی ہے جسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے لیکن ابو داؤد نے جب یہ طریق روایت نہیں کیا تو اس نے دونوں اول اور ثالث طرق کو ملا دیا اور ثالث کو اول پر ترجیح دی اور فرمایا کہ یہ ابن جریج کے طریق سے زیادہ صحیح ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں کیونکہ یہ اس کے گھر والے ہیں اور اہل خانہ کو زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے نزدیک یہ صحیح ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں ضعیف احادیث میں قابل ترجیح ہے اور اس میں ضعف کم ہے اور نافع بن عیجر کی روایت کا مسند احمد کی روایت سے امام ابو داؤد رحمہ اللہ کے ہاں راجح ہونا امام ابو داؤد کے کلام سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ امام ابو داؤد نے اسے ذکر ہی نہیں کیا۔ اس ضروری وضاحت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں مصنف کی گفتگو دو وجہ سے مخدوش ہے۔ پہلی یہ کہ پہلے اور دوسرے طریق کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان دونوں احادیث کی سند میں محمد بن اسحق راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے باوجودیکہ محمد بن اسحق پہلے طریق میں سرے سے موجود ہی نہیں وہ تو صرف دوسرے طریق میں ہے اور دوسری وجہ یہ کہ اس نے تیسرے طریق کو ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابو داؤد نے ایک اور طریق سے بیان کیا ہے جو اس سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہو گا کہ یہ طریق ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے بلا اطلاق بہتر ہے یا دوسرے طریق سے بہترین ہے۔ جسے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اس لئے کہ ذکر کے اعتبار سے دونوں طریقوں سے زیادہ قریب ہے مگر آپ یہ معلوم کر آئے ہیں کہ صحیح اور قوی ترین طریق دوسرا ہی ہے۔ اگر مؤلف کی مراد یہ ہے کہ ابو داؤد کے نزدیک یہ ہے مگر آپ دیکھ آئے ہیں کہ ابو داؤد کے کلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ احسن ہے تو سابقہ تفصیل کی روشنی میں یہ بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو دکانہ رضی اللہ عنہ﴾ رکانہ میں راء پر ضمہ ہے۔ یہ ابو رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف مطلبی فتح مکہ میں شامل تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی کی تھی۔ اور یہی کشتی ہی اس کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ مدینہ چلے آئے۔ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع میں فوت ہوئے۔ بعض کے نزدیک ۴۱ھ میں فوت ہوئے، اور ان کی بیوی سہیمہ بنت عوف مرزنیہ ہے۔ ﴿محمد بن اسحاق﴾ اس کی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ پورا نام محمد بن اسحاق بن یسار مطلبی ہے۔ قیس بن مخزوم مدنی کے غلام تھے۔ جہاد و سیر کے امام تھے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی۔

نکاح کے مسائل کا بیان 703

(۹۲۰) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَالطَّلَاقُ، وَالرَّجْعَةُ». رَوَاهُ الْأَزْهَرِيُّ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. وَفِي رِوَايَةٍ لِابْنِ أَبِي عَدِيٍّ، مِنْ وَجْهِ آخَرَ ضَعِيفٍ: «الطَّلَاقُ، وَالْعِتَاقُ، وَالنِّكَاحُ».

وَلِلْحَارِثِ بْنِ أَبِي أُسَامَةَ، مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الصَّامِتِ، رَفَعَهُ: «لَا يَجُوزُ اللَّعْبُ فِي ثَلَاثٍ: الطَّلَاقِ، وَالنِّكَاحِ، وَالْعِتَاقِ، فَمَنْ قَالَهُنَّ فَقَدْ وَجَبْنَ». وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تین امور ایسے ہیں کہ ان کا قصد کرنا بھی قصد ہے اور ہنسی مذاق سے ان کا کہنا بھی قصد ہے۔ نکاح، طلاق اور رجوع کرنا۔“ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے بجز نسائی کے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے) اور ابن عدی کی ایک دوسری ضعیف روایت میں ہے ”طلاق، آزادی اور نکاح۔“ اور حارث بن ابی اسامہ کی روایت جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوع مروی ہے، میں ہے کہ ”تین چیزوں میں مذاق کرنا جائز نہیں طلاق، نکاح اور آزادی۔ جو آدمی ان امور کو مذاق سے بھی کہے گا تو یہ واجب ہو جائیں گے۔“ (اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿الہزل﴾ کھیل مذاق اور ہنسی کے طور پر کچھ کہنا یا کرنا۔ جس سے حقیقت مراد نہیں ہوتی۔ ﴿الجد﴾ جیم کے نیچے کسر۔ ہزل کی ضد یعنی سنجیدگی۔ ﴿والرجعة﴾ ”را“ کے کسر اور فتح کے ساتھ۔ اپنی مطلقہ بیوی سے بغیر کسی شرط وغیرہ کے رجوع کرنا۔

(۹۲۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسَهَا، مَا لَمْ تَعْمَلْ، أَوْ تَكَلَّمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل کے وسوسہ (پر گرفت و مؤاخذہ) سے درگزر فرما دیا ہے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کوئی زبان سے نہ کہے اور عمل نہ کرے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تجاوز﴾ معاف و درگزر کیا۔ ﴿ماحدثت به أنفسها﴾ جو وسوسے اور خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور گزرنے والے وسوسے قابل مؤاخذہ نہیں۔ مثلاً کسی کے دل میں عورت کو طلاق دینے کا خیال آیا یا لڑکی سے نکاح کا ارادہ کرے تو محض خیالات اور ارادے سے یہ باتیں واقع نہیں ہو جاتیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ زبردستی مار پیٹ کر کسی سے طلاق لے لی جائے جسے طلاق مکروہ کہتے ہیں یا اسی طرح زبردستی نکاح کرا لیا جائے تو نہ طلاق واقع ہوگی

نکاح کے مسائل کا بیان 704

اور نہ نکاح ہی منعقد ہوگا۔ البتہ احناف طلاق مکروہ کے قائل ہیں اور اس حدیث سے ان کے مسلک کی تردید ہے۔ اس طرح بھول اور غلطی کی طلاق بھی نہیں ہوتی۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔

(۹۲۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى وَضَعَ عَنْ أَمْنِيْ چوک اور جس پر اسے مجبور کیا گیا ہو معاف فرما دیا الْخَطَأَ، وَالسَّيَانَ، وَمَا اسْتَكْرَهُوا ہے۔» (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے عَلَيْهِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ. وَالحَاكِمُ. وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ: لَا يَبُثُّ.

لغوی تشریح: ﴿وضع﴾ ساقط کر دیا۔ ﴿استکروہوا﴾ صیغہ مجہول۔ استکراہ سے ماخوذ ہے یعنی کسی کام کے انجام دینے پر جبر و قہر کیا گیا ہو۔ یہ دونوں احادیث اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ بتلایا جائے کہ ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

(۹۲۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: إِذَا حَرَّمَ أَمْرَاتِهِ، لَيْسَ بِشَيْءٍ وَقَالَ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (بخاری)

اور مسلم میں ہے کہ جب مرد نے اپنی بیوی کو حرام رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِمُسْلِمٍ: إِذَا حَرَّمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ قرار دے لیا تو وہ قسم شمار ہوگی۔ اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

لغوی تشریح: ﴿لیس بشیء﴾ یعنی حرام قرار دینے سے بیوی اس پر حرام نہیں ہو جاتی اور نہ یہ تحریم طلاق ہوتی ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اس تحریم کا کوئی اصل حکم نہیں کیونکہ اس پر انہوں نے قرآن سے استدلال کیا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۲۱:۳۳) اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے مگر تمام اقوال میں سے عمدہ ترین قول وہی ہے جو بیان کیا گیا ہے اور اس کی تائید مسلم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مرد کا اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کو ”کچھ بھی نہیں“ سے ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہ رجعی طلاق ہے اور نہ بائن اور نہ ظہار ہی۔ بلکہ یہ قسم ہے جس کا کفارہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے۔ بخاری میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مرد پر قسم کا کفارہ ہوگا۔ اس مسئلہ کے بارے میں اہل علم کے تیرہ اقوال منقول ہیں۔ راجع قول یہی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو کفارہ نہیں بلکہ وہ اسے لغو قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے قسم قرار دیتے ہیں اور قسم کا کفارہ اس پر ضروری ہے۔

(۹۲۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ ابْنَةَ الْجَوْنِ لَمَّا أُذْخِلَتْ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَدَنَا مِنْهَا: قَالَتْ: أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْكَ، فَقَالَ: «لَقَدْ عُدَّتْ بِعَظِيمٍ، الْحَقِيقُ بِأَهْلِكَ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جون کی بیٹی جب نکاح کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خلوت گاہ میں داخل کی گئی اور آپ اس کے قریب ہوئے تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ پکڑتی ہوں۔ آپ نے فرمایا ”تو نے بڑی عظیم الشان ذات کی پناہ طلب کی ہے۔ تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جا مل۔“

(بخاری)

لغوی تشریح: اس حدیث کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ”الحقیقی باہلک“ کہہ کر اگر طلاق مراد رکھی ہو تو طلاق شمار ہوگی۔ یہی حدیث پہلے حق مر کے باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں تصریح موجود ہے کہ آپ نے اسے طلاق دی ہے لیکن اس میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ طلاق کس طرح دی ہے مگر اس حدیث میں اس ابہام کو دور کر دیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے بصراحت طلاق نہیں دی بلکہ کنایہ سے طلاق دی اور کنایہ میں صراحت نہیں ہوتی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلاق کنایہ بھی ہوتی ہے ایک تو طلاق صریح ہوتی ہے کہ طلاق دینے والا صریح الفاظ میں طلاق کہے کہ میں نے طلاق دی۔ یہ طلاق واقع ہو جائے گی خواہ طلاق دینے والے کی نیت طلاق کی نہ ہو کیونکہ اس میں لفظ طلاق بالکل واضح ہے اور طلاق بالکنایہ یہ ہے کہ طلاق دینے والا ایسے الفاظ کہے جن کا معنی و مفہوم طلاق بھی ہو سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے مثلاً شوہر نے کہہ دیا کہ تو آزاد ہے یا اس طرح کہے کہ جا اپنے میکے چلی جا وغیرہ ایسی صورت میں اس طرح کے الفاظ کہنے والے کی نیت پر منحصر ہوگا اگر اس کا ارادہ و نیت طلاق ہوگا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر ایسے الفاظ بول کر اس کا ارادہ طلاق نہ ہوگا تو پھر طلاق واقع نہیں ہوگی اگر مرد کی نیت طلاق کی ہوگی تو اس صورت میں طلاق ایک ہی واقع ہوگی اس میں کسی کا اختلاف نہیں سب اس پر متفق ہیں۔

(۹۲۵) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا طَلَاقَ إِلَّا بَعْدَ نِكَاحٍ، وَلَا عَتَقَ إِلَّا بَعْدَ مِلْكٍ». رَوَاهُ أَبُو يَعْلَى وَصَحَّحَهُ الْحَاجِمُ، وَهُوَ مَعْلُومٌ، وَأُخْرِجَ ابْنُ مَاجَةَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نہیں طلاق“ مگر نکاح کے بعد اور اسی طرح آزادی نہیں مگر ملکیت کے بعد۔“ (اسے ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے حالانکہ یہ معلوم ہے اور ابن ماجہ نے حضرت مسور بن مخزوم کے

نکاح کے مسائل کا بیان 706

عَنْ الْبُسْوَرِيِّ بْنِ مَخْرَمَةَ بْنِ مَخْرَمَةَ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ، وَاسْطُهُ سِ اسى جىسى اىك حدىث روىت كى هى كه جس كى لُجْنَةُ مَعْلُولُونَ أَيْضًا. اسناد تو اچھى ھى لىكن وه بهى معلول هے۔

حاصل كلام: يه حدىث اس كى دلىل هے كه آدمى نهى جب طلاق اور علق كو معلق كىا مثلاً يوں كها كه وه عورت جس سه مىن نكاح كرون اسه طلاق هے يا يوں كه كه هروه غلام جس مىن خرىدون تو وه آزاد هے۔ ان دونوں صورتوں مىن وقوع كه بعد ان ٱر عمل نهى هوگا لىنى نكاح كه بعد عورت ٱر طلاق واقع نهى هوگى اور خرىدارى كه بعد غلام بهى آزاد نهى هوگا بلكه اس كا قول لغو اور ضائع هو جائے گا۔ اس مسله كى بے شمار صورتى ھى يه حدىث تمام اقسام ٱر مطلقاً مشتمل هے۔ اسه عام ركها جائے گا اور اىك حال سه دوسره حال كه درمىان كوئى فرق روا نهى ركها جائے گا اور يه مسله ان اخلاقى مسائل مىن سه هے جو مشهور و معروف ھى۔ جسور تو كهته ھى مطلقاً يه طلاق واقع نهى هوگى اور خفىه كهته ھى بهر نوع يه واقع هو جائے گى اور يه بهى كها گىا هے كه كهول كرىان كر دىا جانا اور اىك حال سه دوسره حال مىن فرق واضح كر دىنه كى صورت مىن واقع هو جائے گى۔ ٱس اكر كسى عورت كا نام لىا گىا هو يا كسى گروه كى عورت يا قبيله كى نشان زدگى يا مكان و زمان كى قىد هو تو طلاق اور علق لازم هو جائىں گى۔ اكر يه صورت نهى هو تو پهر نهىں۔ ٱس ظاهرى هے جىسا كه هم نهى ٱله بىان كىا هے كه طلاق مطلقاً واقع نهى هوگى۔

(۹۲۶) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سه اور وه اپنے عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ: دادا سه روىت كرتے ھى كه رسول اللہ ﷺ نهى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا نَذَرَ لَابْنِ آدَمَ فرمایا ”اس نذر كى كوئى حشيت نهى جس كا انسان فِيمَا لَا يَمْلِكُ، وَلَا عِثْقَ لَهُ فِيمَا لَا مالك نهى اور نهى اىسه غلام كا آزاد كرنا كوئى حشيت يَمْلِكُ، وَلَا طَلَاقَ لَهُ فِيمَا لَا ركها هے جس كا انسان مالك هى نهى اور نهى طلاق يَمْلِكُ»۔ أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، واقع هوگى جو اس كه دىنه والے كه اختيار مىن نهى وَصَحَّحَهُ، وَنَقَلَ عَنْ الْبُخَارِيِّ أَنَّهُ أَصَحُّ مَا وَرَدَ هو۔“ (اسه ابو داؤد اور ترمذى نهى روىت كىا هے اور ترمذى نهى اسه صحى قرار دىا هے اور امام بخارى رضىه كا يه فیه۔

قول نقل كىا هے۔ اس سلسله مىن جو كچه وارد هے، يه اس مىن صحى ترىن هے)

لغوى تشرىح: ﴿لَا نَذَرَ لَابْنِ آدَمَ﴾ آدم زاده كى نذر صحى نهىں۔ مثلاً نبى ﷺ نهى فرمایا ”اكر كوئى يوں كه كه اس غلام كا آزاد كرنا مجھ ٱر لازم هے حالانكه جب اس نهى نذر مانى تھى وه غلام اس كى ملكيت مىن نهىں تها۔ اكر اس كا مالك بن بهى جائے تب بهى اسه آزاد نهىں كر سكتا۔“

حاصل كلام: اس حدىث سه يه بهى معلوم هو رها هے كه انسان جس چىز كا مالك هى نهىں اس مىن مالكانه اختىارات استعمال كرنا كوئى معنى نهىں ركها۔ ان اختىارات كا استعمال ناقابل تسليم هے۔ يه حدىث دلىل هے

کہ اجنبی عورت پر طلاق واقع نہیں ہوتی مثلاً ایک آدمی کسی دوسری منکوحہ یا غیر منکوحہ خاتون سے کہتا ہے کہ تو مطلقہ ہے اور وہی شخص بعد ازاں کسی وقت اسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ وہ عورت مطلقہ تصور نہیں ہوگی لیکن کسی عورت کو اس طرح کہے کہ اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق۔ اس صورت میں علماء و فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور داؤد ظاہری رحمہ اللہ اور چند دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت مطلقہ نہیں ہوگی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بانئیں صحابہ کرامؓ سے یہ قول نقل کیا ہے اور دلیل میں یہی حدیث بیان کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ایسی عورت مطلقہ ہو جائے گی اور تیسرا قول امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے کہ اگر کسی خاص قبیلہ یا شہر کی عورت سے کہے یا کسی دن یا مہینے کے ساتھ مخصوص کرے تو اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر عمومی طور پر کہے تو واقع نہیں ہوگی۔ غلام کے آزاد کرنے اور نذر کا حکم بھی اسی طرح ہے۔ ان اقوال میں سے اقرب الی الصواب پہلا قول ہی ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

(۹۲۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ: عَنْ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنْ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبَرَ، وَعَنْ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَفْقِلَ، أَوْ يُفِيْقَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ سونے والا جب تک بیدار نہ ہو، بچہ جب تک بالغ نہ ہو، دیوانہ جب تک صحیح العقل نہ ہو۔“ (بروایت امام احمد اور ابوداؤد، ابن ماجہ و نسائی۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابن حبان نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿اوبسفیق﴾ الحاقہ سے ماخوذ ہے۔ مرض جنون سے افاقہ اور صحت یابی ہو جائے۔ پس صورت کہ اس کی عقل ٹھکانے پر آجائے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ ان حضرات کی دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

۸ - باب الزجعة (طلاق سے) رجوع کرنے کا بیان

(۹۲۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُطْلَقُ. ثُمَّ يَرْاجِعُ، وَلَا يُشْهَدُ، فَقَالَ: أَشْهَدُ عَلَى طَلَاقِهَا، وَعَلَى رَجْعَتِهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ هَكَذَا مُؤَوَّفًا، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ وَأَخْرَجَهُ التِّهْمِيُّ بِلَفْظٍ: (أَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ سُئِلَ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا کہ جو طلاق دیتا ہے پھر رجوع کر لیتا ہے اور اس پر گواہ نہیں بناتا۔ آپؓ نے فرمایا ”کہ عورت کو طلاق دیتے اور اس سے رجوع کرتے وقت گواہ مقرر کر۔“ (اسے ابوداؤد نے اسی طرح موقوف روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے امام بیہقی نے اس روایت کو ان الفاظ سے

عَمَّن رَاجَعَ امْرَأَتَهُ وَلَمْ يُنْهَهِ، فَقَالَ فِي غَيْرِ سُوءٍ؟ ذَكَرَ كَيْسٌ: ”عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جو اپنی بیوی سے رجوع کرے مگر فَلْيُشْهِدِ الْآنَ) وَزَادَ الْقَلْبَرَانِيُّ فِي رِوَايَةِ (وَيُسْتَغْفِرُ گواہ نہ بنائے؟ تو انہوں نے فرمایا: ”غیر مسنون ہے اللہ۔

اور اسے چاہیے کہ اب گواہ بنا لے۔“ طبرانی نے ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ: اسے اللہ سے معافی بھی مانگنی چاہیے۔)

لعنوی تشریح: ﴿باب الرجعة﴾ رجعت کی ”را“ کے نیچے کسرہ اور اوپر فتح و رجعت اور رجوع سارے معنی میں مستعمل ہے یعنی مرد کا طلاق دینے کے بعد دوران عدت بغیر نکاح کے اپنی اہلیہ کی طرف رجوع کرنا۔ ﴿اشهد على طلاقها وعلى رجعتها﴾ طلاق دیتے اور رجوع کرتے وقت گواہ بنانا۔ اس امر میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ مندوب و مستحب ہے۔

(۹۲۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّهُ لَمَّا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، انہوں نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی تو نبی ﷺ نے قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِعُمَرَ: «مُرْهُ، فَليَرِ اجْمَعَهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”اسے کہو: ”اپنی اہلیہ سے رجوع کر لے۔“ (بخاری و مسلم)

۹ - بَابُ الْإِبْلَاءِ وَالظَّهَارِ وَالْكَفَّارَةِ اِيلَاءٌ ظَهَرَ اور كفاره کا بیان

(۹۳۰) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے ایلاء کیا اور (ان کے پاس تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ نِسَائِهِ، وَحَرَّمَ، فَجَعَلَ الْحَلَالَ حَرَامًا، وَجَعَلَ لِلْيَمِينِ كَفَّارَةً. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَزَوَّاهُ ثِقَاتٌ. کیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

لعنوی تشریح: ﴿باب الایلاء﴾ ایلاء الیہ سے مشتق ہے۔ الیہ میں ”یا“ پر تشدید ہے فعیل کے وزن پر۔ اس کے معنی قسم کھانے کے ہیں اور اس کی جمع ”الایاء“ آتی ہے اور شرعاً ایلاء یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ اپنی اہلیہ سے چار ماہ یا اس سے زیادہ مدت تک وطنی نہیں کرے گا اس پر ائمہ ”اربعہ“ سب متفق ہیں کہ اگر خاوند نے قسم کھائی کہ وہ اپنی اہلیہ سے چار ماہ سے کم مدت تک تعلق زن و شو نہیں کرے گا تو اسے ایلاء کرنے والا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ﴿الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نساہ﴾ رسول اللہ ﷺ نے قسم کھائی کہ وہ ایک مہینہ بھر اپنی بیویوں کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ اس کیلئے بہت سے اسباب تھے اور وہ یہ کہ کسی اہلیہ نے آپ کی راز کی بات کو فاش کر دیا جسے آپ

نے راز رکھنے کی ہدایت فرمائی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر آپؐ کو متنبہ فرمایا اور نان و نفقہ کے مطالبہ و تقاضا کیلئے سب بیویاں متفق ہو گئیں اور آپؐ سے اس کا مطالبہ کیا بلکہ اظہار ناراضی سے صبح سے شام تک آپؐ سے بات چیت منقطع کر لیتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بعض ازواج کو اپنے ساتھ ملایا اسی کے نتیجہ میں تحریم شد کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی۔ ﴿ان تصوبا الی اللہ﴾ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرتی ہو مزید یہ کہ ان ہی ایام میں آپؐ گھوڑے سے نیچے گر گئے اور آپؐ کے دائیں پہلو میں خراشیں اور چوٹیں آئیں۔ جب یہ تمام اسباب جمع ہو گئے اور آپؐ ان کی طرف سے کبیدہ خاطر ہو گئے تو آپؐ نے قسم کھائی کہ ایک مہینہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ اپنے بلاخانہ میں الگ ہو کر بیٹھ گئے مگر جب انیس دن پورے ہوئے تو آیت خیر نازل ہوئی۔ آپؐ نیچے ازواج مطہرات کی طرف تشریف لے آئے اور سب کو ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا اختیار دے دیا۔ مگر سب ازواج مطہرات نے آپؐ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ یہ اختیار دیا جانا کسی قسم کی طلاق شمار نہیں کیا گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ایلاء چار ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ کا نہیں تھا تو ایسے ایلاء کو شرعی ایلاء نہیں کہا گیا اور اس پر کفارہ بھی واجب نہیں کیا۔ ﴿وجعل الحلال حراما﴾ اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیوی زینب بنت جحش کے ہاں شہد نوش فرماتے تھے اور کافی دیر اس کے ہاں ٹھہرتے۔ پس میں نے اور حفصہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس آپؐ تشریف لائیں تو ہمیں آپؐ سے کہنا چاہئے کہ کیا آپؐ نے مغافیر کھایا ہے؟ میں آپؐ سے مغافیر کی بساند (بو) محسوس کر رہی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”نہیں میں نے مغافیر نہیں کھایا میں نے تو زینب کے ہاں شہد پیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں آئندہ اس کا اعادہ نہیں کروں گا اور میں نے قسم کھالی ہے۔ کسی کو اس کی خبر نہ دینا۔ (بخاری) اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا اشارہ اس آیت میں کیا ہے۔ یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (۲:۶۶) پس اللہ تعالیٰ نے اس تحریم کو قسم قرار دے دیا اور اس میں کفارہ کی ادائیگی فرض کر دی۔

(۹۳۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: إِذَا مَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ وَقَفَ الْمُؤَلَّى، حَتَّى يَطْلُقَ، وَلَا يَقْعُ عَلَيْهِ الطَّلَاقُ حَتَّى يَطْلُقَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب چار ماہ گزر جائیں تو ایلاء کرنے والے کو حاکم وقت کے پاس لا کھڑا کیا جائے اور اس وقت تک اسے چھوڑا نہ جائے جب تک وہ عدالت کے روبرو طلاق نہ دے اور طلاق دیئے بغیر اس پر طلاق واقع نہ ہوگی۔

(بخاری)

لغوی تشریح: ﴿وقف المولی﴾ صیغہ مجهول۔ اس سے مطالبہ و تقاضا کیا جائے گا کہ یا تو وہ بیوی سے تعلق زن و شو استوار کر لے یا پھر طلاق دے۔

نغوی تشریح: ﴿بضعۃ عشر﴾ بضعۃ باء کے کسرہ کے ساتھ۔ تین سے لے کر نو تک کی تعداد بضعۃ کہلاتی ہے۔ اس اثر اور اس سے پہلی والی حدیث کی طرف عام صحابہ کرام اور جمہور ائمہ ثلاثہ میں امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہم گئے ہیں کہ صرف چار ماہ کی مدت گزرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی تاوقتیکہ ایلاء کرنے والا خود طلاق نہ دے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ مجرد مدت ایلاء گزرنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ آیت ایلاء کے ظاہر سے تو وہی معلوم ہو رہا ہے جس طرف جمہور کا رجحان ہے۔

(۹۳۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ إِيلَاءُ
الْجَاهِلِيَّةِ السَّنَةِ وَالسَّنَتَيْنِ، فَوَقَّتَ
اللَّهُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ، فَإِنْ كَانَ أَقَلُّ مِنْ
أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَلَيْسَ بِإِيلَاءٍ. أَخْرَجَهُ
الْبَيْهَقِيُّ.

لغوی تشریح: ”فوق اللہ“ توقیت سے ماخوذ ہے۔ وقت مقرر کیا۔

(۹۳۴) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا ظَاهَرَ مِنْ أَمْرَاتِهِ، ثُمَّ وَقَعَ عَلَيْهَا، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: إِنِّي وَقَعْتُ عَلَيْهَا قَبْلَ أَنْ أَكْفَرُ، قَالَ: «فَلَا تَقْرَبَهَا، حَتَّى تَفْعَلَ مَا أَمَرَكَ اللَّهُ». رَوَاهُ الْأَيْمَنُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرَوَّجَهُ النَّسَائِيُّ إِزْسَالَهُ، وَرَوَّاهُ الْبَيْهَقِيُّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ عَبْدِ عُبَّاسٍ، وَزَادَ فِيهِ: «عَفْوٌ وَلَا تَعَذُّرٌ».

ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس

غلوٰی تشریح: ﴿قبل ان اکفر﴾ تکفیر سے ماخوذ ہے یعنی ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے۔ ﴿فلا تقربھا﴾ اس سے جماع نہ کر۔ ﴿کفر ولا تعد﴾ تکفیر سے کفر امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ کفارہ ادا کر اور کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس سے مباشرت نہ کر۔ اکثر اہل علم اس حدیث کے ظاہر کی طرف گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایک ہی کفارہ ادا کرنا ہوگا اور بعض حضرات کا قول ہے کہ ایسی صورت میں دو کفارے ہیں۔ یہ قول اس حدیث کے برعکس ہے۔

(۹۳۵) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَمَضَانَ، فَخَفْتُ أَنْ أُصِيبَ أَمْرًا نِي، فَظَاهَرْتُ مِنْهَا، فَأَنْكَشَفَ لِي شَيْءٌ مِنْهَا لَيْلَةً، فَوَقَعْتُ عَلَيْهَا فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «حَرِّزْ رَقَبَةً». فَقُلْتُ: مَا أَمْلِكُ إِلَّا رَقَبَتِي. قَالَ: «فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَابَعَيْنِ»، قُلْتُ: وَهَلْ أَصَبْتُ الَّذِي أَصَبْتُ إِلَّا مِنَ الصِّيَامِ، قَالَ: «أَطْعِمَ عَرَقًا مِنْ تَمَرٍ سِتِينَ مُسْكِينًا». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَرْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُرَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ.

فرمایا ”اچھا تو پھر کھجوروں کا ایک ٹوکرا ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو۔“ (اسے احمد اور چاروں نے ماسوا سنائی کے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اسے صحیح کہا

(4)

غلوٰی تشریح: ﴿حذر رقبة﴾ تحریر سے امر کا صیغہ ہے۔ غلام آزاد کر۔ خواہ غلام ہو یا لونڈی۔ ﴿اعطم عرقا من تمر﴾ عرق عین اور را دونوں پر فتح اور ”را“ کا سکون بھی جائز ہے۔ بڑا ٹوکرا جس میں پندرہ صاع اناج کے آنے کی گنجائش ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسکین کیلئے ایک مد ہونا چاہئے اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ ظہار کا کفارہ بالترتیب ہے۔ اس کفارہ سے دوسرے کی جانب عدول جائز نہیں

تا وقتیکہ پہلا کفارہ ادا نہ کر سکتا ہو۔

راوی حدیث: ﴿سلمہ بن صخرؓ﴾ سلمہ بن صخر بن سلیمان بن مہدیہ۔ بیاضی میں ”با“ پر فتح بنی بیاضہ کی جانب منسوب ہے جو خزرج قبیلہ کی شاخ تھی۔ یہ صاحب ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو بہت روئے والے تھے۔

لعان کا بیان

۱۰۔ بَابُ اللَّعَانِ۔

(۹۳۶) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَأَلَ فُلَانٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَرَأَيْتَ أَنْ لَوْ وَجَدَ أَحَدُنَا امْرَأَتَهُ عَلَى فَاحِشَةٍ كَيْفَ يَصْنَعُ؟ إِنْ تَكَلَّمَ تَكَلَّمَ بِأَمْرِ عَظِيمٍ، وَإِنْ سَكَتَ سَكَتَ عَلَى مِثْلِ ذَلِكَ. فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ أَنَا، فَقَالَ: «إِنَّ الَّذِي سَأَلْتُكَ عَنْهُ قَدْ ابْتُلِيَ بِهِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ الْآيَاتِ فِي سُورَةِ النُّورِ، فَتَلَاهُنَّ عَلَيْهِ وَوَعَّظَهُ، وَذَكَرَهُ، وَأَخْبَرَهُ أَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ»، قَالَ: لَا، وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، مَا كَذَبْتُ عَلَيْهَا، ثُمَّ دَعَاهَا فَوَعَّظَهَا كَذَلِكَ، قَالَتْ: لَا، وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، إِنَّهُ لَكَاذِبٌ، فَبَدَأَ بِالرَّجُلِ، فَشَهِدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ، ثُمَّ ثَنَى بِالْمَرْأَةِ، ثُمَّ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ فلاں صاحب نے سوال کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بتائیے اگر ہم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کو فاحشہ فعل میں مبتلا پائے تو وہ کیا کرے؟ اگر وہ اسے دوسروں سے بیان کرتا ہے تو یہ نہایت قبیح فعل ہے اور اگر خاموش رہتا ہے تو یہ بھی نہایت مشکل کام ہے۔ آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بعد میں جب وہ آیا تو اس نے کہا کہ تحقیق جو کچھ میں نے آپؐ سے پوچھا ہے، میں خود ہی اس میں مبتلا ہوا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور کی آیات نازل فرمائیں۔ آپؐ نے وہ آیات اس کے سامنے پڑھیں اور اسے نصیحت فرمائی اور اللہ کی سزا یاد کرائی اور فرمایا کہ ”دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہلکا ہے۔ وہ بولا نہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں نے اس پر جھوٹا الزام نہیں لگایا ہے۔“ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو بلوایا اور اسے بھی اسی طرح نصیحت فرمائی۔ وہ بھی بولی نہیں اس خدا کی قسم! جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے یقیناً وہ مرد جھوٹا ہے۔ پھر آپؐ نے اس مرد سے آغاز فرمایا۔ اس مرد نے چار قسمیں کھائیں پھر آپؐ نے عورت سے بھی

قسمیں لیں اور دونوں کے درمیان تفریق فرما دی۔
(مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿باب اللعان﴾ لام کے کسرہ کے ساتھ لاعن، یلاعن، ملاعنہ سے مصدر ہے۔ لعان کی صورت اس طرح ہوتی ہے کہ شوہر بیوی پر زنا کی تمہت لگاتا ہے اور بیوی اس سے انکار کرتی ہے شوہر کے پاس نہ تو گواہ ہوتے ہیں اور نہ کوئی ثبوت۔ بس اب شوہر چار مرتبہ اپنی بیوی کے خلاف اللہ کی قسم اٹھا کر شہادت دیتا ہے کہ اس نے جو الزام لگایا ہے اس میں وہ بالکل سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہتا ہے کہ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر خدا کی لعنت اور عورت کے لئے یہ صورت کہ وہ مرد کی شہادتوں کی تردید کرے اپنی طرف سے شہادتیں دے کر یعنی وہ بھی چار مرتبہ اللہ کے نام کی قسم کھا کر شہادت دے کہ وہ یقیناً جھوٹا آدمی ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ مجھ پر الزام لگانے میں سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹے پس اگر عورت نے یہ شہادتیں دے دیں تو اس پر زنا ثابت نہیں ہو گا اور اس کے شوہر پر حد قذف نہیں ہوگی اور ان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدائی واقع ہو جائے گی اور اگر عورت ان قسموں سے انکار کرے تو مرد کو سچا قرار دے کر عورت پر حد رجم جاری کی جائے گی اور اس کا نام لعان اس لئے رکھا گیا ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے آپ پر لعنت کرتے ہیں۔ خواہ دوسرا سچا ہی ہو لفظ غضب عورت کی جانب سے اختیار کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فعل لعنت کو مستلزم ہے۔ پس عورت کی طرف جو گناہ منسوب ہے۔ وہ زنا ہے اس دوران مرد کا گناہ قذف (تمہت زنا) ہے۔ ﴿سال فلان﴾ اکثر روایات میں اس کی صراحت ہے کہ فلاں سے مراد عوبمر عجلانی ہے اور سیاق کلام بھی اس کا مقتضی ہے کہ یہ آیات اسی کے حق میں نازل ہوئی ہیں لیکن بہت سی روایات میں ہے کہ یہ آیات ہلال بن امیہ ضمری کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لعان کیا۔ پس ﴿انزل فیکد﴾ کے قول کی یہ تاویل کی جائے گی کہ ایسے مسئلہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا تیرا مسئلہ ہے۔ ﴿واخبرہ ان عذاب الدنیا﴾ عذاب دنیا سے مراد حد قذف ہے۔ جس میں اسی کوڑے سزا ہے۔ ﴿اھون﴾ آسان و سھل ترین ﴿ثم نسی بالمرأۃ﴾ تنبیہ سے ماخوذ و مشتق ہے۔ ایک فعل و کام کے بعد دوبارہ اسی کو کرنا۔ یعنی پہلے مرد نے قسمیں کھائیں پھر عورت نے اس کے بعد ﴿ثم فرق بینھما﴾ پھر دونوں میں تفریق کرا دی۔ بہت سے علماء نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ لعان کرنے والے میاں بیوی کے درمیان تفریق حاکم وقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس جمہور علماء اسلام مثلاً امام مالک رحمہ اللہ و شافعی رحمہ اللہ اور احمد رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علماء و متبعین نے کہا ہے کہ فقط لعان سے تفریق واقع ہو جائے گی اور فرق بینھما کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس تفریق کو نمایاں اور ظاہر فرمایا اور حکم شرع بیان فرمایا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نئے سرے سے فرقت و جدائی ڈالی۔ دلیل کے اعتبار سے جمہور کا قول ہی بہتر ہے۔

(۹۳۷) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ

تکاح کے مسائل کا بیان 714

عَنْهُمْ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لِلْمُتَلَاَعِنِينَ: «حَسَابُكُمَا عَلَى اللَّهِ، أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ، لَا سَبِيلَ لَكَ عَلَيْهَا»، قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا لِي؟ «إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا، فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا، وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا، فَذَاكَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

میں نے لعان کرنے والے زوجین سے فرمایا ”تم دونوں کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ دونوں میں سے ایک تو جھوٹا ہے، اب تیرا اس عورت پر کوئی حق نہیں۔“ اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! ”اگر میں نے فرمایا کہ میں نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو پھر یہ مال اس لذت صحبت کا معاوضہ ہے جو حلال کر کے تو نے اس سے حاصل کی ہے اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی دور ہو گیا۔“ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿لا سبیل لک علیہا﴾ یعنی اب تیرے لئے اس کے ساتھ ہونا حلال ہی نہیں بلکہ وہ تو تیرے لئے ہمیشہ کیلئے حرام ہو گئی ہے۔ اس سے جسور نے استدلال کیا ہے کہ صرف لعان ہی فی نفسہ فرقت کا باعث ہے۔ تفریق کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ﴿مالی﴾ میرا مال سے مراد وہ مال ہے جو مر میں دیا تھا۔

(۹۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَبْصِرُوهَا، فَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَبْيَضُ، سَبْطًا، فَهُوَ لِرِزْوَجِهَا، وَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَكْحَلُ، جَعْدًا، فَهُوَ لِلَّذِي رَمَاهَا بِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”عورت پر نظر رکھو اگر اس نے سفید رنگ کا سیدھے بالوں والا بچہ جنم دیا تو وہ اس کے شوہر کا ہے اور اگر اس نے ایسا بچہ جنم دیا جس کی آنکھیں سرگیں اور بال گھٹکھریالے ہوں تو پھر وہ بچہ اس کا ہو گا جس کے متعلق شوہر نے اس پر تہمت لگائی۔“ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿فان جاءت به﴾ بہ میں ضمیر مجرور اس بچہ کی جانب راجع ہے جو لعان کے موقع پر عورت کے رحم میں پرورش پا رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر اس عورت نے بچے کو جنم دیا تو اس پر نظر رکھنا۔ ﴿ابيض سبطا﴾ سفید رنگ والا۔ ﴿سبطا﴾ سین پر فتح اور ”با“ کے نیچے کسرہ اور ساکن بھی جائز ہے۔ ایسا آدمی جس کے بال سیدھے ہوں خمدار یا گھٹکھریالے نہ ہوں۔ ﴿فهو لزوجها﴾ کیونکہ اس کا خاوند اسی وصف والا تھا۔ ﴿اکحل﴾ سرگیں چشم۔ ایسا شخص جس کی آنکھیں سرمہ لگائے بغیر ہی سرگیں نظر آئیں۔ ﴿جعدا﴾ جیم پر فتح عین ساکن۔ ایسا شخص جس کی بال گھٹکھریالے ہوں۔ ﴿فهو

(۹۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَ رَجُلًا أَنْ يَضَعَ يَدَهُ عِنْدَ الْخَامِسَةِ عَلَى فِيهِ، وَقَالَ: «إِنَّهَا مُوجِبَةٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَرَجَّاهُ ثِقَاتٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ ”وہ پانچویں قسم کے وقت قسم کھانے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دے“ اور آپؐ نے فرمایا ”یہ پانچویں قسم ہلاکت و بربادی کی موجب ہے۔“ (ابوداؤد و نسائی اس کے راوی ثقہ ہیں)

(۹۴۰) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْمُتَلَاعِنِينَ - قَالَ: فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ تَلَاُعِنِهِمَا، قَالَ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أَمْسَكْتُهَا، فَطَلَّقَهَا ثَلَاثًا قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. مَقْفَرٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے لعان کرنے والوں کے قصہ میں مروی ہے کہ جب دونوں لعان سے فارغ ہو گئے تو مرد بولا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اور اگر میں اب اسے روک لوں گویا میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے پھر اس نے اس سے پہلے کہ رسول اللہ ﷺ اسے حکم ارشاد فرماتے، تین طلاقیں دے دیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس مرد نے اپنی لعان شدہ بیوی کو تین طلاقیں اس لئے دیں کہ اسے علم نہیں تھا کہ لعان بذات خود ہمیشہ کی جدائی کا موجب ہے۔ پس اس نے بیوی کو بذریعہ طلاق ہی حرام کرنا چاہا۔ لہذا طلاق لغو ہوئی۔ کیونکہ طلاق اپنے مقام پر واقع ہی نہیں ہوئی۔ اگر ہم کہیں کہ جدائی صرف لعان سے ہو جاتی ہے تو یہ ظاہرات ہے اور اگر کہیں کہ تفریق حاکم و عدالت کے ذریعہ واقع ہوتی ہے تو پھر یہ معلوم شدہ ہے کہ لعان کے بعد نکاح کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں اور نہ اس کے ہمیشہ رہنے کی کوئی سبیل بلکہ لعان نکاح کے تعلق کو منقطع کر دیتا ہے اور عورت ہمیشہ کیلئے حرام ہو جاتی ہے، اس لئے تین طلاقیں

نکاح کے مسائل کا بیان 716

مقصد لعان کو مؤکد کرنے کیلئے ہیں۔ اس قسم کے نکاح میں طلاق کا نافذ ہونا لازم نہیں کرتا کہ اس کا نفوذ اس نکاح میں بھی ہو جس نکاح کا قائم رکھنا ہمیشہ کیلئے ہو۔ لہذا اس شخص کا استدلال باطل ہوا جس نے اس حدیث سے طلاق ثلاثہ کے جواز پر اور ان کے یکبارگی وقوع پر استدلال کیا ہے اور جب یہ طلاق غیرت و حمیت کی بنا پر دی گئی اور ایسے مقام پر اس کا اظہار مطلوب بھی ہے اور قابل ستائش و تعریف بھی ہے اس لئے دراصل نبی ﷺ نے مجرور کو یہ خبر دے کر یہ طلاق لغو ہے اس ارشاد سے مدد لی کہ لا سبیل لکھ علیہا یعنی اب تجھے اس عورت پر کوئی اختیار نہیں تیری طلاق واقع نہیں ہوگی بلکہ وہ لغو ہو جائے گی۔ آپ اس پر ناراض و غضبناک نہیں ہوئے جس طرح اس شخص پر ہوئے تھے جس کا قصہ محمود بن لبید نے بیان کیا ہے جو کہ طلاق کے باب میں بیان ہوا ہے۔

(۹۴۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّ امْرَأَتِي لَا تَرُدُّ يَدَ لَامِسٍ، قَالَ: «غَرَبَهَا»، قَالَ: أَخَافُ أَنْ تَتَّبَعَهَا نَفْسِي، قَالَ: «فَاسْتَمْنِعْ بِهَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَرْجَانُهُ بِقَاتٍ. وَأَخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، يُلَظِّظُ: «قَالَ: «طَلَّقَهَا» رَوَى ثَقَفُ (ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے نسائی نے دوسرے طریق سے اسے روایت کیا ہے اس کے الفاظ ہیں کہ ”اسے طلاق دے دو۔“ وہ مرد بولا میں تو اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ”پھر اسے روک رکھو۔“

لغوی تشریح: ﴿لا ترد يد لامس﴾ اس کا ایک معنی تو یہ کیا گیا کہ یہ زنا سے کنایہ ہے اور دوسرا یہ معنی کیا گیا ہے کہ تنذیر مراد ہے اور یہ دوسرا معنی تو انتہائی بعید قول ہے۔ مؤلف موصوف نے تلخیص میں کہا ہے بظاہر لا ترد يد لامس کا یہ معنی ہے کہ وہ جو اس سے چھیڑ چھاڑ سے تلمذ حاصل کرنا چاہتا وہ خاتون کسی کا ہاتھ نہیں روکتی تھی۔ اگر اس سے جماع مراد لیا جائے تو اسے قاذف شمار کیا جائے گا پھر اس خاتون کے شوہر نے اس کے حال سے یہ سمجھ لیا کہ جو اس سے زنا کا ارادہ رکھتا ہو یہ اسے منع نہیں کرتی۔ یوں نہیں کہ کوئی اجنبی مرد اس سے جرم کا مرتکب ہو جاتا تھا۔ ﴿غربھا﴾ تغریب سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اسے اپنے سے دور کر دے اس سے آپؐ کی مراد یہ تھی کہ اسے طلاق دے کر فارغ کر دے۔ ﴿أخاف أن تتبعها نفسي﴾ مجھے خوف ہے کہ میرا نفس اس کا اشتیاق رکھے گا اور میں صبر نہ

(۹۴۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ
يَقُولُ حِينَ نَزَلَتْ آيَةُ الْمُتَلَاعِنِينَ:
«إِذَا امْرَأَةٌ أَدْخَلَتْ عَلَى قَوْمٍ مِّنْ
لِّسَانٍ مِنْهُمْ فَلْيَسْتَ مِنْ اللَّهِ فِي
شَيْءٍ»، وَلَنْ يَدْخُلَهَا اللَّهُ جَنَّتُهُ،
وَأَيُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَكَدُهُ، وَهُوَ يَنْظُرُ
إِلَيْهِ، اخْتَجَبَ اللَّهُ عَنْهُ، وَفَضَّحَهُ
عَلَى رُؤُوسِ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ». .
أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَابْنُ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ
ابْنُ جِبَانَ.

نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

نفوی تشریح: ﴿ایما امرأۃ ادخلت الخ﴾ جو عورت زنا سے حاملہ ہو جائے اور شوہر کو اس کا شعور ہی نہ ہو اور وہ یہ سمجھتا رہے کہ بچہ اس کے نطفہ سے ہے۔ یہ حرمت زنا کی غلاظت پر دلیل ہے کیونکہ یہ سبب ہے بچے کو ایسی قوم میں لگاھانے کا جو دراصل اس قوم کا نہیں ہے۔ ﴿فلیست من اللہ﴾ اس کا اللہ کی رحمت اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ﴿جحد ولده﴾ اپنے بچہ کا خود انکار کرے اور اس کی نفی کرے۔ ﴿وهو یبظر الیہ﴾ جبکہ وہ بچہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو یعنی اسے اس کا علم ہو کہ وہ اسی کا بچہ ہے یا یہ معنی کہ وہ بچہ اس مرد کی جانب دیکھ رہا ہو۔ یہ کنایہ ہے قلت شفقت اور قساوت قلبی سے۔ ﴿احتجب اللہ عنہ﴾ اللہ تعالیٰ اس سے حجاب فرمائے گا اور اسے اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔ وفضحہ اور اسے رسوا و ذلیل و خوار کرے گا۔

(۹۴۳) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: مَنْ أَفَرَّ بِوَلَدِهِ
طَرَفَةَ عَيْنٍ فَلَيْسَ لَهُ أَنْ يَنْفِيَهُ. أَخْرَجَهُ
التَّيْهَنِيُّ، وَهُوَ حَسَنٌ مُؤَوَّفٌ.

حضرت عمر رضی اللہ سے روایت ہے کہ جس شخص نے
ایک لمحہ بھراپنے بچہ کا اقرار کیا پھر اسے اس کی نفی
کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت
کیا ہے اور یہ روایت حسن موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿طرفہ عین﴾ ”طا“ پر فتح، را ساکن۔ پلوں کو بند کر کے کھولنے تک کا وقت۔ یعنی

نکاح کے مسائل کا بیان 718

بس اتنی مقدار کے مساوی۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی لمحہ بھر کیلئے کسی بچے کو اپنا بچہ تسلیم کر لے اور اقرار کر لے کہ یہ بچہ واقعتاً اسی کا ہے تو پھر وہ واقعتاً ساری عمر کے لئے اسی کا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مصمم بن قناده صحابی بعض شبہات کی بنا پر اپنے بچہ کا انکار کرنا چاہتا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے انکار نہیں کرنے دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

(۹۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ أَمْرَاتَيْنِ وَلَدَتَا غُلَامًا أَسْوَدَ، قَالَ: «هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَمَا أَلَوْنَهُمَا؟» قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: «هَلْ فِيهَا مِنْ أَوْرَقٍ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَأَنَّى ذَلِكَ؟» قَالَ: لَعَلَّهُ نَزَعَهُ عِرْقٌ، قَالَ: «فَلَعَلَّ ابْنَكَ هَذَا نَزَعَهُ عِرْقٌ». مَثَّقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «وَهُوَ يُعَرِّضُ بِأَن يَنْفِيَهُ» وَقَالَ فِي آخِرِهِ: «وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُ فِي الْأَنْفَاءِ مِنْهُ». اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ آپ نے اسے نفی کی رخصت و اجازت نہ دی۔

لعوی تشریح: ﴿حمر﴾ ”حما“ پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع۔ اس کے معنی سرخ۔ ﴿اورق﴾ جس میں سیاہی مائل سفیدی ہو یا جس میں سیاہی تو ہو مگر سخت سیاہی نہ ہو اس طرح کہ مائل بہ خاکستر ہو۔ ﴿لعلہ نزعہ﴾ ممکن ہے اس نے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ ﴿عرق﴾ عین کے نیچے کسرہ اور را ساکن۔ اصل کے معنی میں۔ یعنی یہ اپنے اصلی رنگ پر پیدا ہوا ہے یعنی اس کی دور کی جز اور اصل کا رنگ یہی تھا۔ ﴿يعرض بان ينفيه﴾ لعريض سے ماخوذ ہے یعنی وہ بچہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ یہ اس کا بچہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک مغالطہ کی تصحیح کی گئی ہے کہ کالے رنگ نے صحابی کو مغالطہ اور اشتباہ میں مبتلا کر دیا کہ ہم میاں بیوی تو سیاہ رنگ نہیں پھر یہ بچہ اس رنگ کا کہاں سے پیدا ہو گیا۔ رسول اللہ

ﷺ کے پاس جب اس نے عندیہ اور مانی الضمیر ظاہر کیا تو آپؐ نے اسے ڈانٹ پلائی اور نہ اس کی بیوی کی صریح الفاظ میں صفائی پیش فرمائی۔ بلکہ عربوں کی ذہنی سطح پر اتر کر آپؐ نے سمجھانے کی کوشش فرمائی اور کامیاب رہے کہ سفید رنگ کے زوجین کے ہاں سیاہ رنگ بچے کی پیدائش بچے کی ماں کی بدکاری و بدچلتی پر دلالت نہیں کرتی، یہ خاندانی اثرات ہوتے ہیں جو کبھی بہت دور نسل میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جس سے بچے کے نسب پر درحقیقت کوئی عیب اور نقص واقع نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسائل کو جواب حکمت سے دینا چاہئے اور اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر دینا چاہئے۔ فلسفیانہ جواب کی بجائے عام روزمرہ کی مثالوں سے دینا تفہیم مدعا کیلئے زیادہ مفید اور کارگر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس چیز کی حقیقت کا علم نہ ہو اسے صاحب علم سے دریافت کر لینا بہت بڑے فتنے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

۱۱ - بَابُ الْعِدَّةِ وَالْإِحْدَادِ وَالِاسْتِبْرَاءِ وَغَيْرِ ذَلِكَ

حضرت مسور بن مخرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ سبیحہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کی وفات کے چند روز بعد بچہ جنا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نکاح کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اسے نکاح کی اجازت دے دی اور اس نے نکاح کر لیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اپنے شوہر کی وفات کے چالیس روز بعد بچے کو جنم دیا۔

اور مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں کہ زہری نے کہا میں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ حالت نفاس میں ہی نکاح کر لے مگر اس کا شوہر اس کے قریب اس وقت تک نہ جائے جب تک کہ وہ نفاس سے غسل کر کے پاک و صاف نہ ہو جائے۔

لعنوی تشریح: ﴿باب العدة﴾ عِدَّة کے عین کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید ہے۔ یہ عدت اس مدت انتظار کو کہتے ہیں جو عورت اپنے شوہر کی جدائی کے بعد طلاق کی وجہ سے یا فسخ نکاح یا خاوند کی وفات کی وجہ سے گزارتی ہے اور سوگ منانے کا نام ہے اور احواد مصدر ہے ”احدت المرأة علی زوجہا تاجد فہی محدة“ یعنی عورت اپنے شوہر کا سوگ مناتی ہے وہ سوگ منانے والی ہوتی ہے جب وہ خاوند کی

وفات کی وجہ سے غمزہ اور غمگین ہوتی ہے اور حزن و ملال والا لباس پہنتی ہے اور جسمانی، بدنی زیب و زینت اور آرائش ترک کر دیتی ہے۔ یہ حدت تحد فہی حادثہ سے بھی ماخوذ ہے۔ حد کے معنی دراصل تو منع کرنے اور روکنے کے ہیں اور جامع معنی یہ ہیں کہ جس خاتون کا شوہر وفات پا جائے وہ اپنے آپ کو زیب و آرائش سے روک لیتی ہے اور خوشبوؤں کا استعمال ترک کر دیتی ہے۔ ﴿نفساً صیغہ مجہول۔ یعنی اس نے وضع حمل کیا اور نفاس والی بن گئی۔﴾ وہی فی دمہا ﴿دمہا سے مراد ہے کہ وہ ہنوز نفاس کی حالت میں تھی۔﴾ لایقربہا زوجہا ﴿اس کا شوہر اس کے قریب بھی نہ پھٹکے سے مراد ہے کہ اس حالت میں اس سے لطف اندوز نہ ہو۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے لمبی اور طویل ہو یا مختصر اور تھوڑی۔ عام اہل علم کی یہی رائے ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حاملہ کی عدت کی مدت جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو، ثابت ہو رہی ہے کہ وضع حمل ہے۔ اس حدیث میں جس خاتون کا ذکر ہے وہ سبیحہ رضی اللہ عنہا نامی مشہور صحابیہ ہیں۔ اس کا پہلا شوہر سعد ابن خولہ رضی اللہ عنہ حجة الوداع سے چند روز بعد مکہ مکرمہ میں وفات پا گیا تھا سبیحہ رضی اللہ عنہا نے سعد رضی اللہ عنہ کی وفات کے چالیس یا پچاس روز بعد یا اس سے بھی پہلے بچہ کو جنم دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ جس کا شوہر وفات پا گیا ہو اس کی عدت بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے خواہ وہ مدت چار ماہ دس دن سے کم ہو یا زیادہ۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن اس آیت میں جس طرح حاملہ مطلقہ کی مدت عدت بیان ہوئی ہے اسی طرح بیوہ حاملہ عورت کی عدت بھی بیان ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے صراحت فرمائی ہے جسے امام عبد اللہ بن احمد نے زوائد مسند میں اور ضیاء نے الحقاہ میں بیان کیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿سبیحہ رضی اللہ عنہا﴾ (تغییر کے ساتھ) بنت حارث اسلمیہ۔ بنو اسلم کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اسلمیہ کہلاتی ہیں۔ مشہور و معروف صحابیہ ہیں۔ ابن سعد کے بقول یہ مہاجرات میں سے ہیں۔ یہ خاتون سعد بن خولہ کے عقد نکاح میں تھیں۔ حجة الوداع کے موقع پر مکہ میں اس کا چچا وفات پا گیا پھر اس نے اپنی قوم کے ایک نوجوان سے نکاح کر لیا۔ جس کا نام ابوالنائل تھا۔

﴿الزہری﴾ محمد بن مسلم بن عبد اللہ بن عبد اللہ بن شہاب القرشی الزہری۔ بہت بڑے عالم و فاضل۔ حجاز و شام دونوں کے مشترک عالم تھے۔ چوتھے طبقہ کے سرکردہ علماء کرام میں سے تھے۔ ان کی جلالت شان اور اتقان پر سب متفق ہیں۔ لیث کا قول ہے میں نے ابن شہاب ایسا جامع الصفات عالم کبھی نہیں دیکھا اور امام مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ابن شہاب بہت سخی انسان تھے۔ انسانوں میں ان کی نظیر و مثال نہیں ملتی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

(۹۴۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: أُمِرْتُ بِرَبْرَةٍ أَنْ دِيَاغِيَا كَمَا وَه تَمِينَ حَيْضُ عَدَّتْ كَزَارِي۔ (اسے ابن ماجہ

نکاح کے مسائل کا بیان 722

طَهَّرَتْ، نُبَذَةً مِنْ قُسْطٍ أَوْ أَظْفَارٍ». مگر جب ایام حیض سے پاک ہو تو تھوڑی سی عود مُتَقَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظٌ مُسْلِمٌ، وَلَا يَهْنِي دَاوُدُ وَالنَّسَائِيُّ مِنَ الزَّيَادَةِ: «وَلَا تَخْتَضِبُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَلَا تَمْتَشِيطُ»۔
ہندی (ایک خوشبو دار لکڑی) یا اظفار (مشک) استعمال کر سکتی ہے۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ابو داؤد اور نسائی میں اتنا اضافہ ہے کہ ہندی و خضاب نہ لگائے اور نسائی میں ہے کنگھی بھی نہ کرے۔

لغوی تشریح: ﴿ثوب عصب﴾ فتح اور سکون کے ساتھ۔ یہ ترکیب اضافی ہے۔ یعنی یمنی چادریں۔ جن کا سوت بننے سے پہلے ہی اکٹھا یا جمع کر دیا جاتا ہے اور کئی جگہوں میں مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے تو اس طرح بعض مقام سے سفید ہوتا ہے اور بعض جگہ سے رنگ دار۔ پھر ان چادروں کو ان دھواگوں کے ساتھ بنا جاتا ہے تو یہ دھاری دار تیار ہو جاتا ہے۔ ﴿نُبَذَةً﴾ نون پر ضمہ اور ”با“ ساکن۔ کسی چیز کا ٹکڑا، یہ معمولی چیز کیلئے بولا جانے لگا۔ ﴿قُسْطٍ﴾ قاف پر ضمہ اور سین ساکن۔ خوشبو دار لکڑی جس سے دھونی دی جاتی ہے۔ ہندوستان سے عرب میں لے جائی جاتی ہے۔ ﴿اظفار﴾ حمزہ پر فتح۔ خوشبو کی ایک قسم۔ اس کا واحد نہیں آتا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا واحد ظفر آتا ہے۔ وہ عطر کی کالی رنگ کی چیز اس کا ٹکڑا ناخن کے مشابہ ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس خوشبو کی رخصت ایام حیض سے غسل کرنے والی کیلئے ہے تاکہ کمروہ بو کا ازالہ کیا جاسکے۔ اس کا استعمال خوشبو کیلئے نہیں۔

(۹۴۹) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: جَعَلْتُ عَلَى عَيْنَيْ صَبْرًا، بَعْدَ أَنْ تُوفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّهُ يَشُبُّ الْوَجْهَ، فَلَا تَجْعَلِيهِ إِلَّا بِاللَّيْلِ، وَانْزِعِيهِ بِالنَّهَارِ، وَلَا تَمْتَشِطِي بِالطَّبِيبِ، وَلَا بِالْحَنَاءِ فَإِنَّهُ خَضَابٌ»، قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ أَمْتَشِطُ؟ قَالَ: «بِالسَّدْرِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ۔
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابو سلمہ کی وفات کے بعد میں نے اپنی آنکھوں پر مصبر (ایک قسم کی دوائی) کا لپک کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مصبر چہرے کو صاف کرتا اور چمکاتا ہے۔ اسے صرف رات کے اوقات میں استعمال کر اور دن کو منہ سے اتار دیا کر۔ خوشبو اور ہندی والی کنگھی نہ کر۔ ہندی تو ایک قسم کا خضاب ہے۔“ میں نے عرض کیا۔ تو پھر کس چیز کے ساتھ کنگھی کروں؟ فرمایا ”بھیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اس کے ساتھ۔“ (اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند

حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿صبرا﴾ صاد کے فتح اور با کے نیچے کمرہ اور کبھی ساکن بھی ہوتی ہے۔ ایک درخت کا

نکاح کے مسائل کا بیان 723

سوت ہے جو انتہائی کڑوا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی کڑواہٹ زہر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بطور دوا دونوں آنکھوں کے اطراف پر اس کا لپ کیا جاتا ہے۔ اگر آنکھوں کے اندر لگایا جائے تو نظر ضائع ہو جاتی ہے۔ ﴿انہ یثب الوجه﴾ یثب باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ رنگت کو نکھارتا ہے، صاف کرتا ہے، رنگ میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے پر رونق، جمال و خوبصورتی اس طرح نمایاں کر دیتا ہے جس طرح نوجوان کا چہرہ خور و مزین ہوتا ہے اور سوگ کے ایام گزارنے والی عورت کیلئے یہ چیزیں مستحسن نہیں اور نہ اسے زیب ہی دیتی ہیں۔

(۹۵۰) وَعَنْهَا أَنْ أَمْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنْ ابْتَنَيْ مَاتَ عَنْهَا رَوْجُهَا، وَقَدْ اشْتَكَتْ عَيْنَهَا، أَفَنُكْحِلُهَا؟ قَالَ: لَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میری بیٹی کا شوہر وفات پا گیا ہے اور بیٹی آشوب چشم میں مبتلا ہو گئی ہے کیا میں اس کی آنکھوں میں سرمہ لگا سکتی ہوں؟ فرمایا ”نہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وقد شكت عينها﴾ عينها پر فاعل ہونے کی بنا پر رفع ہے اور نصب اس کے مفعول ہونے کی وجہ سے۔ دوسری صورت میں فاعل کی ضمیر بنت (بیٹی) کی جانب راجع ہے۔ ﴿افنكحلها﴾ باب نصر اور فتح دونوں سے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ سوگ منانے والی عورت کیلئے سرمہ کا استعمال حرام ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک عورت نے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے کہا رات کے وقت لگا لو اور دن کے وقت اسے دھو ڈالو۔ جیسا کہ موطا وغیرہ میں ہے اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں۔ پس تو رات کو سرمہ لگالے اور دن میں اسے دھو ڈال۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات میں سرمہ لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو۔ تاہم اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے۔ سرمہ کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ یہ خوبصورتی کا موجب ہے لہذا اگر سرمہ سفید ہو جس میں زینت بھی نہ ہو تو اس کا دن کے اوقات میں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(۹۵۱) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: طُلِقْتُ خَالَتِي، فَأَرَادَتْ أَنْ تَجِدَ نَخْلَهَا، فَرَجَرَهَا رَجُلٌ أَنْ تَخْرُجَ، فَأَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «بَلْ جُدِّي نَخْلِكَ، فَإِنَّكَ عَسَى أَنْ تَصَدَّقِي، أَوْ تَفْعَلِي مَعْرُوفًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری خالہ کو طلاق دی گئی اور اس نے دوران عدت اپنی کھجور کا پھل اتارنے کے ارادہ سے باہر جانا چاہا تو ایک آدمی نے ان کو ڈانٹا۔ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا ”ہاں تم اپنے درختوں کا پھل توڑ سکتی ہو۔ عین ممکن ہے کہ تم صدقہ کرو یا اس ذریعہ سے کوئی دوسرا عمل خیر تمہارے ہاتھ سے

انجام پا جائے۔“ (مسلم)

نفوی تشریح: ﴿ان تجد نخلها﴾ یہ کہ تم اپنے پھل توڑ لو۔ تجد کا فعل جیم اور دال کے ساتھ باب نصرینصر سے ہے اور اس امر کا میثغ و مخاطب جدی آتا ہے۔ جدی کے جیم پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو عورت ایام عدت میں ہو وہ ضرورت کیلئے گھر سے باہر جاسکتی ہے اور کام کاج کر کے واپس گھر آجائے تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۹۵۲) وَعَنْ فُرَيْعَةَ بِنْتِ مَالِكٍ، أَنَّ زَوْجَهَا خَرَجَ فِي طَلَبِ أَعْبُدٍ لَهُ، فَقَتَلُوهُ، قَالَتْ: فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَنْ أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي، فَإِنَّ زَوْجِي لَمْ يَتْرُكْ لِي مَسْكناً يَمْلِكُهُ، وَلَا نَفَقَةً، فَقَالَ: نَعَمْ، فَلَمَّا كُنْتُ فِي الْحُجْرَةِ نَادَانِي، فَقَالَ: أَمَكُنِّي فِي بَيْتِكَ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ، قَالَتْ: فَأَعْتَدْتُ فِيهِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً، قَالَتْ: فَقَضَى بِهِ بَعْدَ ذَلِكَ عُثْمَانُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَعِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالذَّهَلِيُّ وَابْنُ جَبَّانٍ وَالْحَاكِمُ وَغَيْرُهُمْ.

حضرت فریعیہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اس کا شوہر اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کی تلاش میں نکلا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ فریعیہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے میکے لوٹ جانے کے متعلق دریافت کیا کیونکہ میرے شوہر نے اپنی ملکیت میں کوئی گھر نہیں چھوڑا اور نہ ہی نفقہ۔ آپ نے فرمایا ”ہاں! (تم اپنے میکے جاسکتی ہو)“ جب میں حجرے میں پہنچی تو آپ نے مجھے آواز دی اور فرمایا ”تم اپنے پہلے مکان ہی میں اس وقت تک رہو جب تک کہ تمہاری عدت پوری نہ ہو جائے۔“ فریعیہ کا بیان ہے کہ میں نے پھر عدت کی مدت چار ماہ دس دن اسی سابقہ مکان میں پوری کی۔ فرماتی ہیں کہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے بعد اسی کے مطابق فیصلہ دیا۔ (اسے احمد اور چاروں نے بیان کیا ہے۔ ترمذی، ذہلی، ابن حبان اور حاکم وغیرہم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ جس خاتون کا شوہر وفات پا جائے تو وہ عورت اسی مکان میں عدت وفات پوری کرے گی جس میں وہ خاوند کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور جہاں اسے خاوند کی وفات کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ مدت عدت کے اتمام و اختتام تک اسی مکان میں رہے گی۔ محققین علماء کا یہی مذہب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسری جگہ منتقل ہونا بھی اس کیلئے جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿فریعیہ بنت مالک بن سنان خدریہ رضی اللہ عنہا﴾ مشہور صحابی رسول حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ بیعت رضوان میں حاضر تھیں۔

(۹۵۳) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! زَوْجِي طَلَّقَنِي ثَلَاثًا، وَأَخَافُ أَنْ میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دی ہیں اور يُقْتَحِمَ عَلَيَّ، قَالَ: فَأَمَرَهَا مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کوئی میرے پاس بے جا فَتَحَوْلَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. طور پر گھس نہ آئے اور ظلم کرے۔ تو آنحضور ﷺ نے اسے اجازت مرحمت فرما دی اور وہ وہاں سے

منتقل ہو گئی۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿ان یقتحم علی﴾ صیغہ مجہول۔ زبردستی بعض اجنبی شریر لوگ گھس آئیں اور اس سے کوئی حادثہ یا فتنہ برپا ہو جائے ﴿فتحولت﴾ منتقل ہو گئی۔ یعنی اپنے شوہر کے مکان سے اپنے چچا زاد بھائی عمرو بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی خطرے اور اندیشے کے پیش نظر عورت دوسرے قریبی رشتہ دار کے ہاں عدت گزارنے کیلئے منتقل ہو سکتی ہے مثلاً مکان غیر محفوظ ہو۔ مکان کے گر جانے کا خوف ہو، ہمسایوں سے اذیت رسانی کا اندیشہ ہو۔ تنہائی سے ڈرتی اور خوف کھاتی ہو وغیرہ۔

(۹۵۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَا ہمارے نبی ﷺ کی سنت ہم پر خلط ملط نہ کرو کہ تَلْبِسُوا عَلَيْنَا: سُنَّةَ نَبِيِّنَا، عِدَّةُ أُمِّ جب ام ولد کا سردار وفات پا جائے تو اس کی عدت الْوَلَدِ، إِذَا تَوَفَّيَ عَنْهَا سَيِّدُهَا، أَرْبَعَةُ چار ماہ اور دس دن ہے۔ (اس روایت کو احمد، ابوداؤد اور أَشْهُرُ وَعَشْرٌ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا مَاجَهٌ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَعْلَاهُ الدَّارَقُطَنِيُّ ہے اور دارقطنی نے اسے انقطاع سے معلول کیا ہے)

بالانقطاع۔

حاصل کلام: اس روایت میں ام الولد کی عدت کا بیان ہے مگر یہ روایت منقطع ہے کیونکہ اس قبضہ بن ذویب، عمرو بن عاص سے روایت کرتے ہیں مگر ان کا سامع عمرو سے ثابت نہیں۔ امام اوزاعی اور طاہریہ ام الولد کی عدت چار ماہ دس دن کے قائل ہیں مگر امام شافعی رضی اللہ عنہ، امام احمد رضی اللہ عنہ اور مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی عدت ایک حیض ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک عدت تین حیض۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ وغیرہم کہتے ہیں کہ اس کی عدت صرف ایک ماہواری اس لئے ہے کہ نہ تو وہ زوجہ ہے اور نہ مطلقہ۔ اسے تو صرف استبراء رحم کی ضرورت ہے اور وہ محض ایک ہی حیض سے ہو جاتا ہے۔ امام احمد رضی اللہ عنہ تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا چار ماہ دس دن کا قول سن کر تعجب کرتے اور فرماتے تھے کہ آنحضور ﷺ کی کون سی سنت ہے؟ اور فرماتے تھے کہ چار ماہ دس روز تو سنت نبوی ﷺ کے مطابق آزاد عورت کی عدت ہے۔ ام ولد تو لونڈی

(۹۵۵) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ
طهری مراد ہیں۔ (اسے مالک، احمد اور نسائی نے ایک قصہ
میں سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے)

(۹۵۶) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: طَلَّاقُ الْأَمَةِ تَطْلِيقَتَانِ، وَعَدَّتْهَا حَيْضَتَانِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَهُ مَرْفُوعًا، وَضَعَفَهُ وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ، وَضَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَخَالَفُوهُ، فَاتَّفَقُوا عَلَى ضَعْفِهِ.

(۹۵۷) عَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِمَرِيءٍ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ، وَحَسَنَهُ الْبَرَاءُ.

حضرت رُوَیْفِع بن ثابت سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ غیر کی کھیتی کو اپنے پانی سے سیراب کرے۔“ (اس کی تخریج ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بزار نے اسے حسن کہا ہے)

غوی تشریح: ﴿ان یسقی ماء﴾ یسقی السقی سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا نطفہ رحم

نکاح کے مسائل کا بیان 727

میں داخل کرے۔ ﴿زوع غبرہ﴾ غیر کی کھیتی میں اور زرع سے مراد حمل لیا ہے اور بچہ جب رحم کے ساتھ معلق ہوتا ہے تو اسے کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے کھیتی اگتی ہے اور زمین میں پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ یعنی جب عورت دوسرے مرد کے نطفہ سے حاملہ ہو چکی ہو تو ایسی عورت سے وطی و جماع کرنا حلال نہیں اور اس کی مثال اس لونڈی کی سی ہے جسے ایک آدمی نے خریدا تو اس وقت وہ دوسرے مالک سے حاملہ تھی یا یوں سمجھیں کہ اسیر ہونے سے پہلے وہ حاملہ تھی اب ایسی لونڈی کے خریدار یا مالک و آقا کیلئے اس کے ساتھ وطی و جماع کرنا حلال نہیں ہے۔ جب تک کہ اس کا حمل وضع نہ ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿رویف بن ثابت رضی اللہ عنہ﴾ رویف تغیر ہے رافع سے۔ انصار کے قبیلہ بنو مالک بن نجار سے تھے۔ ان کا شمار مصریوں میں ہوتا ہے۔ ۴۶ھ کو وفات پائی۔

(۹۵۸) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ نے گم شدہ، مفقود الخبر مرد کی عورت تَعَالَى عَنْهُ، فِي امْرَأَةٍ الْمَفْقُودِ، کیلئے فرمایا، اس کیلئے چار سال انتظار کرنا ہے۔ اس تَرَبُّصُ أَرْبَعِ سِنِينَ، ثُمَّ تَعْتَدُ أَرْبَعَةَ کے بعد چار ماہ دس دن عدت گزارے۔ (مالک و شافعی أَشْهُرٍ وَعَشْرًا. أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَ الشَّافِعِيُّ. نے نکالا ہے)

لعوی تشریح: ﴿المفقود﴾ غائب ایسا کہ جس کے متعلق کچھ معلومات نہ ہوں کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں؟ اس اثر کے مطابق امام مالک و شافعی رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء و محدثین کا فیصلہ ہے اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق رحمہ اللہ وغیرہم بھی اسی طرف گئے ہیں۔ مگر حنفیہ اور شیعہ میں سے ہادیہ فرقہ کے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ایسی عورت اس مرد کی زوجیت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس کی موت کی خبر کی صحت یا اس کی طلاق کا ثبوت یا اس کے مرتد ہونے کا ثبوت نہ مل جائے اور موت سے ان کے نزدیک موت طبعی کی مقدار مراد ہے۔ اس میں پھر ان میں اختلاف واقع ہوا ہے ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد ساٹھ سال ہے اور ایک قول ہے کہ ستر سال اور ایک قول کے مطابق نوے برس اور ایک قول ۱۲۰ برس کا ہے اور ۱۵۰ برس سے دو سو برس تک کا قول بھی ہے اور ایک تیسری رائے بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر غائب آدمی نے بیوی کیلئے نان و نفقہ اور دیگر حاجات و ضروریات کا سامان چھوڑا ہے تو اسے حاضری سمجھا جائے گا۔ ورنہ حاکم و عدالت اس کا نکاح جب عورت عدم نان و نفقہ کی صورت میں فسخ نکاح کا مطالبہ کرے گی، فسخ کرائے گی۔ یہ بہترین و عمدہ قول ہے اور قابل توجہ ہے۔ مگر پہلا قول محققین کے نزدیک رائج ہے۔

(۹۵۹) وَعَنْ الْمُعِينَةِ بْنِ شُعْبَةَ حَضْرَتِ مَعِينِ بْنِ شُعْبَةَ سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷻ نے فرمایا ”مفقود الخبر مرد کی بیوی“ اس کی رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ بیوی ہے جب تک کہ گم شدہ کے متعلق واضح طور امْرَأَتُهُ حَتَّى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ». أَخْرَجَهُ پر اطلاع موصول نہ ہو جائے۔“ (دارقطنی نے اسے

نکاح کے مسائل کا بیان 728

الدَّارُ قُطْنِيٌّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ۔
ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حتیٰ یاتیہا البیان﴾ یعنی جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا فوت ہو گیا ہے۔ ابھی مسلمان ہے یا مرتد ہو گیا ہے۔ یہ حدیث سخت ضعیف ہے اسی بنا پر محققین نے اس کے مطابق فتویٰ نہیں دیا۔ اس کی سند میں صالح بن مالک اور محمد بن فضل دونوں مجہول الحال ہیں۔ نیز سوار بن معب مٹروک اور محمد بن شرحبیل بھی مٹروک ہے۔ یہ صاحب مغیرہ بن شعبہ سے مناکیر اور ابابیل روایتیں بیان کرتا ہے۔

(۹۶۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا يَبْتَئِنَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَأَةٍ، إِلَّا أَنْ يَكُونَ نَاصِحًا، أَوْ ذَا مَحْرَمٍ». (مسلم)
أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کسی اجنبی عورت کے پاس خلوت و تنہائی میں رہنا حرام ہے۔ محرم کے پاس رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ محرم اسے کہتے ہیں جس سے کسی صورت میں کسی وقت نکاح درست اور جائز نہ ہو۔

(۹۶۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا يَخْلُونُ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”کوئی شخص بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی و خلوت اختیار نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا محرم نہ ہو۔“ (بخاری)

(۹۶۲) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي سَبَايَا أَوْطَاسٍ: «لَا تَوَطُّأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعْ، وَلَا عَيْرٌ ذَاتِ حَمْلٍ، حَتَّى تَحْبِضَ حَبْضَةً». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي الدَّارِ قُطْنِيٍّ۔
حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اوطاس کے قیدیوں کے متعلق فرمایا ”حاملہ عورت جب تک وضع حمل نہ کر لے، اس سے جماع نہ کیا جائے نیز غیر حاملہ سے بھی اس وقت تک وطی نہ کی جائے جب تک اسے ایک ماہواری نہ آجائے۔“ (اس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دارقطنی میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اس کا شاہد مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿سبایا اوطاس﴾ سبایا سببی اور سبیہ کی جمع ہے۔ سبیہ اس عورت کو کہتے

729 نکاح کے مسائل کا بیان

ہیں جو جنگ میں اسیر ہو جائے اور اوطاس حنین کے قریب ایک وادی کا نام ہے۔ یہاں قبائل ثقیف و ہوازن کی عورتیں غزوہ حنین کے موقع پر قید ہوئی تھیں۔

(۹۶۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْوَلَدُ لِلْفَرَّاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»۔
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کیلئے پتھر۔“ (بخاری و مسلم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ایک قصہ کے متعلق بھی اسی طرح روایت ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نسائی نے اور عثمان رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد نے یہی روایت بیان کی ہے۔)

لغوی تشریح: «الولد للفراش» فراش ایسی خاتون ہے جس سے شوہر مجامعت و مباشرت کر چکا ہو خواہ وہ بیوی ہو یا لونڈی لیکن فراش سے یہاں اس کا صاحب و مالک مراد ہے۔ بخاری میں ہے الولد لصاحب الفراش یہاں صاحب الفراش سے مراد خاوند اور مولیٰ ہے کیونکہ یہ دونوں عورت کو بستر پر لٹاتے ہیں اور اس کے ساتھ سوتے ہیں۔ «وللعاهر الحجر» العاهر زانی اور العهر زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی زانی کیلئے ناکامی و نامرادی ہے۔ بچے میں اس کا کوئی حق نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زانی کیلئے پتھر اور اس کے منہ میں مٹی۔ یعنی اس کیلئے سوائے ناکامی و نامرادی اور ذلت و رسوائی کے اور کچھ نہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ الحجر سے مراد یہ ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے گا۔ مگر یہ قول کمزور و ضعیف ہے کیونکہ سنگسار تو صرف شادی شدہ کو کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام: حدیث کا معنی یہ ہے کہ عورت جب بچے کو جنم دے گی وہ کسی کی بیوی یا لونڈی ہوگی، اس بچے کا نسب اس آدمی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور وہ اس کا بچہ شمار کیا جائے گا۔ میراث اور ولادت کے دیگر احکام ان کے درمیان جاری ہوں گے خواہ کوئی دوسرا اس عورت کے ساتھ ارتکاب زنا کا دعویٰ کرے اور یہ دعویٰ بھی کرے کہ یہ بچہ اس کے زنا سے پیدا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس بچے کی مشابہت بھی اس کے ساتھ ہو اور صاحب فراش کے ساتھ نہ ہو۔ اس ساری صورت حال کے باوجود بچہ کو صاحب فراش کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ اس میں زانی کا کوئی حق نہیں ہوگا اور یہ اس صورت میں ہے جب صاحب فراش اس کی نفی نہ کرے۔ اگر مرد نے انکار کر دیا تو پھر بچہ ماں کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا اور اس بچہ کا نسب ماں کے ساتھ ہوگا، زانی کے ساتھ نہیں۔ جمہور نے کہا ہے کہ عورت تو صرف نکاح ہی سے فراش بن جاتی ہے۔ پھر جب چھ ماہ یا اس سے زیادہ مدت کے بعد بچے کو جنم دیتی ہے اس امکان کے ساتھ کہ خاوند نے اس کے ساتھ وطی و جماع کیا ہوگا جب فراش کا ثبوت مل جائے گا تو بچہ خاوند کے ساتھ ملحق کر دیا جائے اور اگر وطی کا امکان نہ ہو تو پھر بچہ کو اس کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا۔ حنفیہ کہتے ہیں مجرد عقد کے بعد ہی ملا دیا جائے گا خواہ وطی کی ہو یا نہ کی ہو۔ پھر اگر مغرب کے رہنے والے نے مشرق

میں رہنے والی خاتون سے نکاح کیا اور دونوں میں سے کسی نے بھی اپنا وطن مالوف نہ چھوڑا یا عقد نکاح کے بعد طلاق دے دی پھر چھ ماہ بعد اس عورت نے بچہ کو جنم دیا تو اس صورت میں بچہ اسی مرد کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ یہ قول ایسا ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ عورت سے دخول محقق کی معرفت ضروری اور لابدی ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ اور صاحب المنار نے ان کی تائید کی ہے اور یہ بات لفظ فراش سے لغوی، عربی اور عقلی طور پر سمجھی جاسکتی ہے۔

دودھ پلانے کا بیان

۱۲ - بَابُ الرِّضَاعِ

(۹۶۴) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”ایک دو دفعہ دودھ چوسنے سے
﴿لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلَا حُرْمَتُ ثَابِتٍ نَهِيَتْ﴾“ (مسلم)
الْمَصَّانِ۔“ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ”باب الرضاع“ رضاع اور رضاعت کی ”را“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہے عورت کے پستان سے بچے کا مخصوص وقت میں دودھ چوس کر پینا اور وہی سبب ہے، دودھ پینے اور پلانے والی کی حرمت کے ثبوت کا اور وہ بچہ اس کا بچہ قرار پاتا ہے۔ اب اس عورت سے ہمیشہ کے لئے اس کا نکاح حرام ہے۔ پھر یہ حرمت دودھ پینے اور پلانے والی کی اولاد میں اور دودھ پینے اور پلانے والی کی اولاد اور اس کے شوہر کی اولاد یا اس کے آقا کی اولاد جس نے اس سے وطی کی ہوگی، پر مشتمل گی۔ ﴿لَا تُحَرِّمُ﴾ تحریم سے ماخوذ ہے۔ ﴿الْمَصَّةُ﴾ مص سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی چوسنے کے ہیں۔ ایک دو مرتبہ چوسنا۔ یعنی تھوڑا سا پینا اور ایک روایت میں ہے ایک دفعہ پینے یا دو مرتبہ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ سبل السلام میں ہے۔ رضعة کی حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ ماں کے پستان منہ میں لے کر چوستا ہے پھر بغیر عارضہ کے اپنی خوشی و مرضی سے پستان کو چھوڑ دیتا ہے اسے رضعة کہتے ہیں۔ پستان چھوڑنا کسی عارض کی بنا پر جیسے سانس لینے کیلئے یا معمولی سا آرام حاصل کرنے کیلئے یا کسی اور چیز کیلئے جو اسے دوسری طرف مشغول کر دے پھر جلد ہی دوبارہ پینا یا چوسنا شروع کر دے، یہ دورانیہ ایک مرتبہ پینے کے عرصہ سے خارج نہیں ہوگا۔ ایک مرتبہ پینے کے ثبوت میں امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ مذہب ہے اور یہ لغت کے موافق ہے۔

حاصل کلام: رضاعت کا حکم کتنا دودھ پینے سے ثابت ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ یہ حکم دودھ تھوڑا پیا ہو یا زیادہ، ثابت ہو جاتا ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ایک قول میں امام احمد، امام اسحاق، ابو عبیدہ وغیرہم نے اس حدیث کے مفہوم کے مطابق کہا ہے کہ رضاعت کا حکم تین مرتبہ پینے سے ثابت ہوتا ہے دو دفعہ پینے سے نہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پانچ مرتبہ پینے سے رضاعت ثابت

ہوتی ہے اور انہوں نے آئندہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے اور ظاہر ہے کہ منطوق مفہوم سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ عرف عام میں لوگوں میں مروج ہے کہ جب وہ یہ بولتے ہیں کہ یہ ایک یا دو سے ثابت نہیں ہوتا تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ تین مرتبہ سے ثابت ہو جائے گا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مطلق تعداد و کثرت کا مقتضی ہے۔ رہا جمہور کا مذہب کہ حکم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ثابت ہو جاتا ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَامْهَاتِكُمُ اللَّائِي اَرْضَعْنَكُمْ (۴: ۲۳) سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس میں ان کیلئے کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ ماں کا لفظ اس کا تقاضا کر رہا ہے کہ دودھ پلانے والی کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب اس نے تین مقدار میں دودھ پلایا ہو جس سے وہ ماں کہلانے کی مستحق بن جائے۔ اس وصف سے متصف وہی ہو سکتی ہے جس نے بچہ کو جنم دیا ہو یا جو اس کے بدن کا جز بن گیا ہو اور وہ دودھ ہے جو کہ بدن کا جز بنتا ہے اور یہ صرف مجرد رضاعت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے ثبوت کیلئے کافی مقدار ناگزیر ہے۔ پھر کس قدر دودھ بچے کا جزو بدن بنتا ہے، اس کی مقدار معلوم نہیں۔ اس لئے شارع نے جو مقدار مقرر کی ہے اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور جب میں نے گہری اور عمیق نظر سے غور کیا تو دیکھا کہ رضاعت کے سلسلہ کی تمام احادیث اسی علت و سبب کے گرد گردش کرتی ہیں اور اس کیلئے بھوک کی شرط اور آنٹوں کو کھولنے کی شرط اور ہڈیوں کی نشوونما اور موٹا کرنے کی شرط اور گوشت اگانے اور پیدا کرنے کی شرط اور اس رضاعت کا دو سال کے دوران ہونا اور بڑے آدمی کی رضاعت کا کوئی اعتبار نہ کیا جانا یہ تمام اسی علت و سبب کی وجہ سے ہیں۔ پس واضح ہو گیا کہ آیت قرآنیہ جمہور کے مذہب کی تائید نہیں کرتی بلکہ اس مسلک کی تائید کرتی ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور یہاں حدیث اور آیت قرآن میں باہم تعارض نہیں ہے بلکہ دونوں میں کلی توافق اور ہم آہنگی اور موافقت ہے۔ اگر مطلق رضاعت ہی مراد ہوتی تو پھر اس طرح کہنا چاہئے تھا النساء اللاتی ارضعنکم وہ عورتیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا۔

(۹۶۵) وَعَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «انْظُرْنَ مَنْ إِخْوَانُكُمْ، فَإِنَّمَا الرِّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ». مَقْنُونٌ جب دودھ بھوک کے وقت پیا جائے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿انظرن من اخوانک﴾ انظرن امر کا صیغہ ہے مطلب ہے رضاعت کے معاملہ میں پوری تحقیق، پوری احتیاط اور بالغ نظری سے کام لیا جانا چاہئے اور اس کی علت و وجہ ”فانما الرضاعة من المجاعة“ سے بیان کر دی۔ یعنی وہ رضاعت جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے وہ ہے جو بچپن میں

نکاح کے مسائل کا بیان 732

ہو اور دودھ اس بچے کی بھوک ختم کر دے اور اس کے ذریعہ گوشت پیدا ہو تو پھر اس عورت کی اولاد کے ساتھ حرمت میں شریک ہو جائے گا۔ پس آنے والی دونوں احادیث ہم معنی ہیں۔ "لارضاع الا ما انشز العظم وانبت اللحم" رضاعت ہڈیوں کو مضبوط بنانے اور گوشت جسم پر پیدا کرنے کا نام ہے۔ رضاعت سے حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جبکہ وہ رضاعت انترویوں کو کھول دے۔ جیسا کہ امام ابو عبید نے کہا ہے۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت میرے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بات آپ کی طبع مبارک پر گراں گزری اور میں نے چہرہ انور پر ناراضگی کے آثار ملاحظہ کئے تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو میرا رضاعی بھائی ہے۔ یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا غور سے دیکھ لیا کرو کہ تمہارے بھائی کون ہیں؟

(۹۶۶) وَعَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ سَهْلَةَ بِنْتُ سَهْلٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ سَالِمًا مَوْلَى أَبِي حَذِيفَةَ مَعَنَا، فِي بَيْتِنَا، وَقَدْ بَلَغَ مَا يَبْلُغُ الرِّجَالُ، فَقَالَ: «أَرْضِعِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سہلہ بنت سہلہ بِنْتُ سَهْلٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ سَالِمًا مَوْلَى أَبِي حَذِيفَةَ مَعَنَا، فِي بَيْتِنَا، وَقَدْ بَلَغَ مَا يَبْلُغُ الرِّجَالُ، فَقَالَ: «أَرْضِعِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اس پر حرام ہو جائے گی۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿ارضعہ﴾ قاضی عیاض نے کہا ہے ممکن ہے سہلہ نے اپنا دودھ نکال کر پلایا ہو اور پستان کو چھونے کی نوبت ہی نہ آئی ہو اور نہ دونوں کے جسم باہم ملے ہوں۔ جیسا کہ نووی رحمہ اللہ نے ان سے یہ ذکر کیا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ سہلہ نے پانچ بار دودھ پلایا پس وہ اس کے بچے کی جگہ ہو گیا۔ یہ حدیث امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ اس میں پانچ بار دودھ پلانے کا بیان ہے یہ پانچ بار پلایا جانا پچھانا اور ثابت شدہ ہے۔ یہ حدیث بڑی عمر کے آدمی کے دودھ پینے پر حرمت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے اور یہی رائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور داؤد ظاہری کی ہے۔ لیکن یہ پہلی حدیث کے معارض ہے نیز ام سلمہ رضی اللہ عنہا، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی احادیث اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور یہ احادیث اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ رضاعت دو سال کے دوران کی حرمت ثابت کرتی ہے اس کے بعد کی رضاعت نہیں۔ جمہور نے اس قصہ کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ان کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس کے سوا دوسروں کی طرف اس کا حکم متعدی نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ رضاعت کے معاملہ میں بچپن کا اعتبار کیا جائے گا الا یہ کہ جب کوئی حاجت و ضرورت اس کی داعی ہو۔ جیسا کہ بڑی عمر کے آدمی کی رضاعت کا مسئلہ جسے عورت کے پاس جانا ناگزیر ہے اور عورت کا اس سے

نکاح کے مسائل کا بیان 733

(پردہ) کرنا بھی دشوار ہے۔ جیسا کہ سالم کا ابو حذیفہ کی بیوی کے ساتھ مسئلہ تھا اس طرح کے بڑی عمر کے آدمی کو جب ضرورت و حاجت کیلئے عورت نے دودھ پلایا تو اس مرد کا دودھ پینا موثر ہوگا اور ایسی صورت کے علاوہ دودھ پینے کی مدت بچپن کی عمر ہے۔ (سبل السلام)

راوی حدیث: ﴿سہلہ بنت سہیل بن عمرو القرشیہ بنو عامر بن لوی میں سے تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں۔ اپنے شوہر ابو حذیفہ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور ان کے ہاں محمد بن ابی حذیفہ پیدا ہوئے۔

﴿سالم بن معقل﴾ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام۔ ان کو ایک انصاری خاتون نے خریدا تھا۔ ان کا نام لیلیٰ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام ثبیبہ تھا۔ ان سے پھر ابو حذیفہ نے نکاح کر لیا تھا اور سالم ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ابو حذیفہ نے اسے اپنا لے پالک بنالیا تھا اور اسے اپنا حلیف قرار دے لیا تھا۔ سالم معرکہ بدر میں حاضر تھے۔ نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کو جن چار صحابہ سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا تھا سالم مولیٰ ابو حذیفہ ان چاروں میں سے ایک تھے۔ نبی ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے قبائیں یہی ماجرین کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے حالانکہ اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی ان ماجرین میں شامل تھے۔

﴿ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا نام مہشم تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہاشم بن عتبہ بن عبد شمس تھا۔ یہ بڑے فضلاء صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ غزوات بدر و احد اور ان کے بعد والے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ کے روز قتل ہو کر مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے، اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی۔

(۹۶۷) وَغَنَهَا أَنْ أَفْلَحَ أَخَا أَبِي
الْقُعَيْسِ جَاءَ يَسْتَأْذِنُ عَلَيْهَا بَعْدَ
الْحِجَابِ، قَالَتْ: فَأَيُّتُ أَنْ أَدْنَ
لَهُ، فَلَمَّا جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:
أَخْبَرْتُهُ الَّذِي صَنَعْتُهُ، فَأَمَرَنِي أَنْ أَدْنَ
لَهُ عَلَيَّ، وَقَالَ: إِنَّهُ عَمَلٌكَ. مَنَّكَ
غَنِيَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ابو القعیس کا بھائی افلح حجاب کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آنے کیلئے اجازت طلب کرتا رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا بیان ہے کہ میں نے انہیں اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے سارا واقعہ آپؐ کو سنایا جو میں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ ”میں ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دیا کروں اور فرمایا کہ وہ تمہارا چچا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس عورت کا دودھ پی لیا جائے اس کا شوہر اس کا باپ ہوگا۔ اب جو رشتے ماں باپ کی جانب سے حرام ہوتے ہیں وہ دودھ سے بھی حرام ہو جائیں گے۔ افلح حضرت

نکاح کے مسائل کا بیان 734

عائشہ رضی اللہ عنہا کا رضاعی چچا اس لئے ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابوالقیس کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ دودھ کی پیدائش میں مرد و عورت دونوں کے نطفہ کا دخل ہوتا ہے، اس لئے رضاعت بھی دونوں کی جانب سے ہوئی۔ اس لئے حرمت بھی ثابت ہو گئی۔

راوی حدیث: ﴿الفلح﴾ ابوالجحد ان کی کنیت اور نام الفلح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کا بھائی ابوالقیس تھا۔ ایک قول ہے کہ ان کا نام جعد تھا اور ایک قول یہ ہے کہ واسل بن الفلح اشعری ان کا نام تھا اور ان کے بھائی کا نام الفلح تھا۔ اس طرح اس کا نام اس کے باپ کا ہم نام ہوا۔ معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا دودھ پلے والی کا ایک تو نبی ﷺ کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا، دوسرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دودھ پلانے والی کا دیور، جیٹھ تھا۔ ان کا نام الفلح تھا۔ ابوالقیس کا بھائی اور ابوالقیس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رضاعی باپ تھا۔

(۹۶۸) وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ فِيمَا أَنْزَلَ الْقُرْآنَ عَشْرَ رَضَعَاتٍ مَّغْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخَ بِخَمْسٍ مَّغْلُومَاتٍ، فَتَوَفَّي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن میں یہ حکم نازل کیا گیا تھا کہ دس بار دودھ پینا جبکہ اس کے پینے کا یقین ہو جائے نکاح کو حرام کرتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ پانچ بار (یعنی دودھ پینے کے حکم) سے پھر رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی، اس وقت پانچ کی تعداد قرآن میں پڑھی جاتی تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿معلومات﴾ محقق و ثابت شدہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب رضاعت مشکوک ہو تو حرمت کا فائدہ نہیں دیتی۔ ﴿وہی فیما یقرأ من القرآن﴾ یقرا صیغہ مجہول ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ کی تعداد کا نسخ اتنی تاخیر سے ہوا کہ نبی ﷺ کی وفات کا واقعہ پیش آ گیا اور بعض لوگ پھر بھی ان پانچ کی تعداد کو قرآن سمجھ کر تلاوت کرتے رہے کیونکہ آپ کی وفات کے بالکل ساتھ ہی ان کا منسوخ ہونا نازل ہوا تھا اور لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد جب ان کو نسخ کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا اور سب متفق ہو گئے کہ اب اس کی تلاوت نہیں کی جائے گی۔ پھر اس کا ذکر کیا کہ نسخ کی تین انواع ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ جس کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوں جیسے دس مرتبہ دودھ پینے والی آیت، دوسری یہ کہ جس کی تلاوت تو منسوخ ہو مگر اس کا حکم باقی رہے۔ جیسے پانچ مرتبہ دودھ پینے کی آیت اور آیت رجم اور تیسری یہ کہ جس کا حکم تو منسوخ ہو چکا ہو مگر تلاوت اس کی باقی ہو اور ایسا تو اکثر ہے، جیسے آیت وصیت ہے۔

(۹۶۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُرِيدَ عَلَى ابْنَةِ حَمْزَةَ، فَقَالَ: «إِنَّهَا سَلَّمَ» حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو آمادہ کیا گیا کہ آپ اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی اُرید علی ابنتہ حمزہ، فقال: «إنها سلم» سے نکاح کر لیں۔ تو آپ نے فرمایا ”وہ میرے لئے“

نکاح کے مسائل کا بیان 735

لَا نَحِلُّ لِي، إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنْ حَلَالٍ نَحِلُّ اس لئے کہ وہ میرے رضائی بھائی کی بیٹی الرِّضَاعَةِ وَيَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا هِيَ۔ جو عورت رشتہ و نسب سے حرام ہے وہی يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ رضاعت سے بھی حرام ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ارید علی ابنہ حمزہ﴾ ارید فعل، صیغہ مجہول۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان سے کہا گیا کہ اس لڑکی سے نکاح کر لیں۔ نیل الاوطار میں ہے کہ وہ شخص جس نے اس لڑکی کا نبی ﷺ سے نکاح کے ارادہ کا اظہار کیا ہے وہ علی بن ابی طالب تھے اور حمزہ کی اس صاحبزادی کے نام میں کئی اقوال ہیں۔ مثلاً امامہ، سلمیٰ، فاطمہ، عائشہ، امہ، اللہ، عمارہ اور یعلیٰ۔ یہ لڑکی نبی ﷺ کے رضاعی بھائی کی بیٹی اس طرح بنتی تھی کہ نبی ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما نے اپنا دودھ پلایا تھا اس طرح حضور ﷺ اور حمزہ رضی اللہ عنہما چچا بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ رضاعی بھائی بھی تھے اور ثویبہ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔

(۹۷۰) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ إِلَّا مَا فَتَقَ الْأُمْعَاءُ، وَكَانَ قَبْلَ الْفِطَامِ»۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دودھ پینے کو کوئی تقسیم حرام نہیں کرتی مگر وہ قسم جو انتڑیوں کو کھول دے اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا رواہ الترمذی، وَصَحَّحَهُ هُوَ وَالْحَاكِمُ۔)

(ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿لا یحرم﴾ لا یحرم میں ”را“ پر تشدید مکسورہ۔ ﴿الاماعتق الامعاء﴾ اس جملہ میں ما موصولہ مرفوع ہے کیونکہ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے اور امعاء مفعولیت کی وجہ سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رضاعت یا دودھ جو بچے کی آنتوں کو کھول دے اس کے علاوہ اور کوئی غذا حرمت ثابت نہیں کرتی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ بچے کی آنتوں میں رواں ہوتا ہے اور غذا کی جگہ واقع ہوتا ہے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ دودھ ان اوقات میں پلایا جائے جو اس کی غذا بننے کے اوقات ہوں اور ”امعاء“ معی کی جمع ہے۔ (معی کے میم کے نیچے کسرہ عین پر فتح اور ”یا“ ساکن) پیٹ میں خوراک کی جگہ ﴿الْفِطَامِ﴾ ”قا“ کے نیچے کسرہ۔ بچے کو دودھ چھڑانا۔

(۹۷۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: لَا رِضَاعَ إِلَّا فِي الْحَوْلَيْنِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ عَدِيٍّ مَرْفُوعاً وَمَوْقُوفاً، وَرَجَّحَا الْمَوْقُوفَ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کوئی رضاعت معتبر نہیں سوائے اس رضاعت کے جو دو سال کے دوران میں ہو۔ (اسے دارقطنی اور ابن عدی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے مگر ترجیح دونوں نے موقوف کو دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما انشز العظم﴾ جو ہڈی کو مضبوط و قوی کرے۔ پختہ کرے اور اس کا حجم بڑھائے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے جو دو سال کی عمر میں پنی گئی ہو۔ اس لئے کہ بچہ اسی سے نشوونما پاتا ہے۔ اس کی ہڈیاں مضبوط اور قوی ہوتی ہیں اور گوشت بنتا ہے۔

اس خاتون نے دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا۔

(بخاری)

نفوی تشریح: ﴿کیف؟ وقد قیل﴾ مطلب یہ ہے کہ اب تو اس سے لطف صحبت کیسے اٹھا سکتا ہے اور اس کے قریب کیونکر جا سکتا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کی گئی ہے اور ایک روایت میں ہے نبی ﷺ نے عقبہ کو اس عورت سے ممانعت کر دی۔ اس حدیث کی رو سے سلف کی ایک جماعت جس میں امام احمد بن حنبلؒ بھی ہیں کہتے ہیں کہ رضاعت کے مسئلہ میں صرف ایک عورت کی شہادت قبول کی جائے گی مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ ان میں بعض نے کہا ہے کہ دودھ پلانے والی کی گواہی مزید تین عورتوں کی شہادت کے ساتھ قبول کی جائے گی بشرطیکہ معاوضہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو۔ علامہ شوکانیؒ نے کہا ہے کہ یہ تو مخفی نہیں ہے کہ نہی حقیقت حرمت پر دلالت کرتی ہے اور اسے حقیقی معنی سے اسی وقت خارج کیا جائے گا جبکہ کوئی قرینہ صارفہ ہوگا اور دودھ پلانے والی عورت کی شہادت کو قبول نہ کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لی گئی ہے: **وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ اِجْمَالِكُمْ (۲)** لیکن یہ دلیل مفید نہیں کیونکہ عام کی بنا خاص پر واجب ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس حدیث نے قرآن پاک کے عام حکم کو خاص کر دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ ابو سروع، سروع کے سین کے نیچے کسرہ۔ ”را“ ساکن اور ”واؤ“ پر فتح۔ عقبہ بن حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف کی۔ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں۔ اس کے بعد وہ پچاس برس تک زندہ رہے۔

﴿ام یحییٰ﴾ ان کا نام غنیہ ہے۔ غین پر فتح، نون کے نیچے کسرہ اور ”یاء“ پر تشدید۔ غنیہ بنت ابی اہاب بن عویر تمیمی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام زینب تھا۔

(۹۷۴) وَعَنْ زِيَادِ السَّهْمِيِّ قَالَ: حضرت زیاد سہمی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ تُسْتَرْضَعَ عقل و کم عقل عورتوں کا دودھ پلانے سے الْحَقْمَى. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَهُوَ مُرْسَلٌ، منع فرمایا ہے۔ (اسے ابو داؤد نے نکالا ہے اور یہ مرسل وَلَيْسَتْ لِزِيَادٍ صُحْبَةٌ. ہے کیونکہ زیاد کو صحابی ہونے کا شرف حاصل نہیں)

لعوی تشریح: ﴿تسترضع الحمقى﴾ صیغہ مجہول۔ اس سے دودھ پلانے کا مطالبہ و تقاضا کرنا اور حققی احق سے فعلی کے وزن پر زیادہ بیوقوف۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غبی، کم عقل اور بیوقوف عورتوں سے دودھ نہ پلویا جائے۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دودھ میں طبیعت اور مزاج کا اثر ہوتا ہے۔ لڑکایا لڑکی بھی اسی وجہ سے اگر کم عقل اور احق بن جائے تو اس سے بڑی آفت اور مصیبت کیا ہوگی۔ یہ تو دین و دنیا دونوں کیلئے مضر اور نقصان دہ ہے۔ علماء اسلام میں سے امام غزالی رضی اللہ عنہ وغیرہ نے توبہ کار اور بے دین عورت کے دودھ پلانے سے بھی منع کیا ہے اور اس سے تو انکار مشکل ہے کہ دودھ کے اپنے طبعی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر مرضہ صحت مند، تومند، سیرت و کردار اور اخلاق حسنہ کی حامل ہوگی تو اس کے اثرات دودھ پینے والے بچوں پر لازماً پڑیں گے۔ اس لئے اس پہلو سے یہ بھی ارشاد گرامی بڑا قابل قدر ہے۔

راوی حدیث: ﴿زیاد سہمی﴾ تقریب میں ہے کہ یہ تیسرے طبقہ کا آدمی ہے۔ مرسل حدیث بیان کرتا ہے اور یہ کما گیا ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام ہے۔ صاحب اسد الغابہ اور صاحب استیعاب نے اس کا ذکر صحابہ میں نہیں کیا۔

نفقات کا بیان

۱۳ - بَابُ النِّفَقَاتِ

(۹۷۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہند بنت عتبہ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلْتُ هِنْدُ بِنْتُ ابوسفیان کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عُثْبَةَ، أَمْرَأَةً أَبِي سُفْيَانَ، عَلَى حاضر ہوئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ! رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہے۔ مجھے وہ اتنا خرچ اللہ! إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ، لَا نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کیلئے کافی ہو مگر

نکاح کے مسائل کا بیان 738

يُعْطِيَنِي مِنَ الْنَّفَقَةِ مَا يَكْفِيَنِي، یہ کہ میں پوشیدہ طور پر کچھ لے لوں تو ایسا کرنے وَيَكْفِي بَنِيَّ، إِلَّا مَا أَخَذْتُ مِنْ مَالِهِ میں مجھ پر کوئی گناہ ہو گا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا بغير علمه، فَهَلْ عَلَيَّ فِي ذَلِكَ مِنْ جُنَاحٍ؟ فَقَالَ: «خُذِي مِنْ مَالِهِ اور تمہارے بچوں کیلئے کافی ہو۔» (بخاری و مسلم) بِالْمَعْرُوفِ مَا يَكْفِيكَ، وَيَكْفِي بَنِيكَ». مَثَقَّ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿باب النفقات﴾ نفقہ کی جمع ہے ”نون“ فا اور قاف“ تینوں پر فتح‘ اتفاق سے اسم ہے نفقہ کہتے ہیں انسان کا نقدی خورد و نوش اور پینے کی اشیاء پر جو خرچ کرنا ہے۔ ﴿شحيح﴾ شح سے ماخوذ ہے۔ وہ لالچ و حرص جس کے ساتھ بخل بھی شامل ہو اور ﴿معروف﴾ سے مراد اپنی وسعت و طاقت کے مطابق خرچ کا جو اندازہ لوگوں میں متعارف ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند اگر استطاعت کے باوجود اخراجات پورے ادا نہ کرے تو بیوی اس کو بتائے بغیر اتنا خرچہ اس کے مال سے لے سکتی ہے جو معروف کے درجہ میں آتا ہو۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنا جائز حق جس طرح وصول ہو سکتا ہو، کیا جاسکتا ہے۔ ناانصافی کے ازالے کی غرض سے شکوہ و شکایت غیبت کے زمرہ میں نہیں آتی۔ خواہ وہ نقص و برائی متعلقہ شخص میں پائی جاتی ہو۔ بیوی عدالت میں اپنے شوہر کی شکایت لے جانے کی مجاز ہے۔ یہ شکایت بھی غیبت میں شمار نہیں اگر یہ غیبت کی تعریف میں آتا تو رسول اللہ ﷺ ہند کو منع فرما دیتے۔ نیز معلوم ہوا کہ عورت عدالت کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس رضی اللہ عنہا﴾ اس نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے شوہر ابوسفیان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا۔ اس کا والد عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید غزوہ بدر کے روز قتل ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ اس کی طبیعت پر بڑا شاق گزرا۔ پس جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے تو اس نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال کر چلیا مگر نگل نہ سکی اور باہر پھینک دیا۔ ۱۳ھ کو محرم میں وفات پائی اور اس کے علاوہ بھی مختلف سنوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿ابوسفیان رضی اللہ عنہ﴾ صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس۔ نبی ﷺ کے ساتھ معرکہ آرائی میں کفار کے علمبردار، قائد اور سپہ سالار فوج تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام اس وقت قبول کیا جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنی پناہ و حفاظت میں ان کو نبی ﷺ کی خدمت میں لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دخول مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قبول اسلام کو بہت عمدہ اور اچھا ثابت کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۹۷۶) وَعَنْ طَارِقِ الْمُحَارِبِيِّ، حضرت طارق محاربی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم مدینہ میں قَالَ: قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ، فَإِذَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ آتَىٰ تو رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے لوگوں سے

نکاح کے مسائل کا بیان 739

ﷺ قَاتِمٌ عَلَى الْمِنْبَرِ، يَخْطُبُ النَّاسَ، وَيَقُولُ: «يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، وَأَبْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ، أُمُّكَ، كَفَالَتْ فِيهِ. ان میں تیری ماں، تیرا باپ، تیری وَاَبَاكَ، وَأَخْتُكَ، وَأَخَاكَ، ثُمَّ أَذْنَاكَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ. سب سے زیادہ قریبی کو دے۔» (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿وَابْدَأُ بِمَنْ تَعُولُ﴾ یعنی خرچ کا آغاز ان سے کرو جن کا خرچہ تم پر واجب ہے۔ جب وہ خورد و نوش اور لباس وغیرہ کے محتاج ہوں۔ ﴿اُمُّكَ وَاَبَاكَ﴾ منصوب فعل مقدر کی وجہ سے یعنی ان کا نان و نفقہ ضرور مہیا کر اور اپنے مال میں سے ان کو دے۔ ﴿اَدْنَاكَ فَاَدْنَاكَ﴾ درجہ بدرجہ قربت کے اعتبار سے۔

راوی حدیث: ﴿طارق بن عبد اللہ محاسبی رضی اللہ عنہ﴾ صحابی ہیں۔ محارب بن خصفہ جو بنو غطفان کا قبیلہ ہے کی طرف نسبت کی وجہ سے محارب بنی کہلائے۔ ان سے چند احادیث مروی ہیں۔ انہوں نے ذوالحجاز میں ہجرت سے پہلے نبی ﷺ کو دیکھا تھا۔

(۹۷۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ، وَلَا يُكَلِّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيقُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «غلام کا کھانا پینا اور لباس مہیا کرنا مالک پر واجب ہے اور طاقت سے بڑھ کر کام کی تکلیف نہ دی جائے۔» (مسلم)

(۹۷۸) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْقُشَيْرِيِّ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا حَقُّ زَوْجَةٍ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: «أَنْ تُظْعِمَهَا إِذَا طَعِمَتْ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَتْ، وَلَا تَضْرِبَ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحَ». - الْحَدِيثُ - وَتَقَدَّمَ فِي عَشْرَةِ نِسَاءٍ.

حضرت حکیم بن معاویہ قشیری کی اپنے باپ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم میں سے ہر ایک پر اس کی اہلیہ کا کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا: «جب خود کھاؤ تو اس کو بھی کھاؤ۔ جب خود پہناؤ تو اس کو بھی پہناؤ اور اس کے منہ پر نہ مارو اور اسے قبیح نہ کہو۔» (ابی حدیث ہے جو عشرۃ النساء کے باب میں پہلے گزر چکی ہے۔)

(۹۷۹) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حج کے بارے میں لمبی

(۹۸۰) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ؛ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْمًا أَنْ يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوتُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ بِلَفْظٍ «أَنْ يَحْبِسَ عَمَّنْ يَمْلِكُ قُوَّتَهُ».

لغوی تشریح: ﴿کفی بالمرء اثماً﴾ اس کے گنہگار و خطا کار ہونے کیلئے کافی ہے یا یہ معنی کہ اس کیلئے ہی گناہ کافی ہے۔ ﴿ان یضیع﴾ ”تضییع“ سے ماخوذ ہے۔ اسے چھوڑ دے۔ ایسی حالت میں کہ اسے ہلاک و ضائع کرنے والا ہو۔ ﴿من یقوت﴾ جس کی عیال داری کا ذمہ دار ہے، نئے روزی دیتا ہے، کھانے پینے کا بندوبست و انتظام کرتا ہے اس میں من موصولہ یضیع کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔

(۹۸۱) وَعَنْ جَابِرٍ، يَرْفَعُهُ، فِي الْحَامِلِ الْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا، قَالَ: لَا نَفَقَةَ لَهَا. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَرَجَّاهُ يَنَاقُ، لَكِنْ قَالَ: الْمَحْفُوظُ وَفَّقَهُ، وَتَبَتَ نَفْيُ النَّفَقَةِ فِي حَدِيثِ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ، كَمَا تَقَدَّمَ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

(۷)

حاصل کلام: اس حدیث میں دلیل ہے کہ جس حاملہ خاتون کا شوہر فوت ہو گیا ہو اس کیلئے نفقہ نہیں، تو جو غیر حاملہ ہو بالاولیٰ اس کیلئے نفقہ نہیں اور مطلقہ ثلاثہ غیر حاملہ کیلئے نہ نفقہ ہے اور نہ رہائش اور مطلقہ ثلاثہ حاملہ کیلئے نفقہ ہے رہائش نہیں۔ بیوہ غیر حاملہ کیلئے نفقہ نہیں رہائش ہے اور بیوہ حاملہ کیلئے رہائش ہے مگر نفقہ میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے نفقہ نہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ نفقہ و رہائش کی بحث اس وقت تک ہے جب کہ عورت عدت میں ہو۔ عدت گزرنے کے بعد تو وہ کسی چیز کا استحقاق نہیں رکھتی۔

(۹۸۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْبَدُّ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَيَبْدَأُ أَحَدُكُمْ بِمَنْ يَعُولُ، تَقُولُ الْمَرْأَةُ: أَطْعَمَنِي أَوْ ظَلَفَنِي»۔
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ تم میں ہر کوئی اس سے آغاز و ابتدا کرے جس کی وہ عیال داری کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو بیوی کہنے لگے کہ نان و نفقہ دو یا طلاق دو۔“ (اس کو دارقطنی نے حسن سند سے روایت کیا ہے)۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند اگر بیوی کا نفقہ دیدہ و دانستہ پورا نہ کرے یا مالی حالت کی کمزوری کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تو بیوی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی۔

(۹۸۳) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيْبِ، فِي الرَّجُلِ لَا يَجِدُ مَا يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ، قَالَ: يُفَرِّقُ بَيْنَهُمَا. أَخْرَجَهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ، عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ أَبِي الزُّنَادِ، عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ لِسَعِيدٍ: سُنَّةٌ؟ فَقَالَ: سُنَّةٌ. وَهَذَا مُرْسَلٌ قَوِيٌّ۔
 اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے ایسے آدمی کے متعلق مروی ہے جو اپنی بیوی کو نان و نفقہ نہ دے سکے کہ ان کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی۔ اس روایت کو سعید بن منصور نے سفیان سے اور انہوں نے الزناد سے روایت کیا ہے کہ میں نے سعید بن مسیب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں سنت ہے۔ (یہ روایت مرسل قوی ہے۔)

حاصل کلام: اس روایت کی رو سے شوہر نان و نفقہ نہ دے تو میاں بیوی کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت اور فقہاء ائمہ میں سے امام مالک رضی اللہ عنہ، امام شافعی رضی اللہ عنہ وغیرہ فسخ نکاح کا اختیار عورت کو دیتے ہیں۔ ظاہریہ کا بھی یہی قول ہے لا ضرر ولا ضرار والی حدیث کو بھی اس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ احناف کا قول ہے کہ نفقہ نہ ہونے کی صورت میں فسخ نکاح کا اختیار عورت کو نہیں۔ انہوں نے دلیل میں قرآن حمید کی آیت وعن قدر علیہ رزقہ پیش کی ہے۔ مگر علامہ حافظ ابن قیم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب عورت نے مرد سے نکاح کیا اس وقت مرد تندرست تھا اور مرد کی تنگ دستی کا عورت کو علم بھی تھا یا نکاح کے وقت مرد کی مالی حالت تسلی بخش تھی مگر بعد میں کسی وجہ سے تنگ دستی کا شکار ہو گیا تو ایسی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں۔ کیونکہ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آج تنگ دستی ہے تو کل فراخ دستی بھی ہو سکتی۔ بصورت دیگر عورت کو حق ہوگا کہ وہ فسخ نکاح کا اختیار رکھے اور اسے استعمال کرنا چاہے تو استعمال بھی کرے۔ جن علماء و فقہاء نے عورت کو فسخ نکاح کا اختیار دیا ہے ان میں سے امام مالک رضی اللہ عنہ خاوند کو ایک ماہ کا وقت دیتے ہیں اور امام

نکاح کے مسائل کا بیان 742

شافعی رحمہ اللہ صرف تین دن اور حماد نے ایک سال کی معاد دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿سفیان﴾ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری۔ ابو عبد اللہ کوئی۔ بڑے ائمہ کرام میں سے ایک ہیں۔ ان کے امام ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اتفاق، ضبط حفظ، معرفت اور زہد و ورع کے اوصاف سے متصف تھے۔ ۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں ۱۶۱ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ابوالزناد﴾ عبد اللہ بن ذکوان اموی۔ ان کے مولیٰ مدنی تھے۔ بڑے ائمہ میں شمار ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے ثقہ ہیں۔ امیر المومنین ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ہریرہ صحیح ترین سند ہے۔ ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

(۹۸۴) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَتَبَ إِلَى أَمْرَاءِ الْأَجْنَادِ، فِي رَجَالٍ غَابُوا عَنْ نِسَائِهِمْ: أَنْ يَأْخُذُوهُمْ بِأَنْ يُنْفِقُوا، أَوْ يُطْلَقُوا، فَإِنْ طَلَّقُوا بَعَثُوا بِنَفَقَةٍ مَا حَبَسُوا. أَخْرَجَهُ الشَّافِعِيُّ ثُمَّ التَّبَهَّقِي شافعی رحمہ اللہ اور تبہقی نے عمدہ سند سے روایت کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿امراء الاجناد﴾ قائدین لشکر۔ اجناد جند کی جمع ہے لشکر کو کہتے ہیں۔ یہ روایت اور پہلی دونوں احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ شوہر پر بیوی کا خرچہ واجب ہے۔ پھر اگر تنگ دست ہو یا ٹال مٹول سے کام لے تو عورت کو اختیار ہے اس سے علیحدگی اور فرقت کا۔ جمہور اہل علم امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور اہل نواہر اسی کے قائل ہیں۔ یہ جدائی اور علیحدگی فسخ ہوگی یا طلاق۔ اس میں دو قول ہیں۔ جس نے اسے طلاق ہی قرار دیا ہے اس نے کہا کہ یہ مقدمہ حاکم کے پاس لے جایا جائے گا تاکہ وہ شوہر پر لازم کرے کہ وہ نفقہ دے یا طلاق۔ پھر اگر وہ انکار کرے تو حاکم اسے طلاق رجعی دے دے۔ پھر اگر اس نے بیوی سے رجوع کر لیا تو عدالت دوسری طلاق دے دے گی۔ اب پھر اگر اس نے رجوع کر لیا تو عدالت تیسری طلاق دے گی اور جس نے اسے فسخ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں بھی مقدمہ حاکم وقت کی عدالت میں لے جانا ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنی تنگ دستی کا ثبوت پیش کر سکے اس کے ثبوت پیش کرنے کے بعد نکاح فسخ کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مقدمہ حاکم کی عدالت میں لے جایا جائے گا تاکہ حاکم شوہر کو طلاق پر مجبور کرے یا نکاح فسخ کرے یا فسخ کی اس سے اجازت لے پھر اگر اس نے نکاح فسخ کیا یا فسخ کی اجازت دی تو اسے فسخ قرار دیا جائے گا طلاق نہیں۔ اس صورت میں رجوع کا حق نہیں ہوگا۔ یہ بحث الہدیٰ اور سبل السلام سے ماخوذ ہے۔ اس مقام پر اور بھی بہت سے اقوال ہیں مگر اس تفصیل کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

نکاح کے مسائل کا بیان 743

حاصل کلام: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس تحریری فرمان کا پس منظر یہ ہے کہ ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت پر تھے۔ ایک ایسے خیمہ پر سے آپ کا گزر ہوا جس میں ایک خاتون شوہر کی جدائی کی طوالت پر دردناک شعر پڑھ رہی تھی۔ وہ اشعار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سن لئے۔ اس کا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ ایک عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ تک گزار سکتی ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ چار ماہ تک۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکر کے سپہ سالاروں کو حکم تحریر فرمایا کہ فوجیوں کو حکم دو کہ وہ چار ماہ بعد ضرور گھر آیا کریں ورنہ اپنی بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور ساتھ ہی ان کا سابقہ نان و نفقہ بھی بھیج دیں۔

(۹۸۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! عِنْدِي دَيْنَارٌ؟ قَالَ: «أَنْفَقَهُ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِي؟ آخَرُ؟ قَالَ: «أَنْفَقَهُ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ؟ قَالَ: «أَنْفَقَهُ عَلَى أَهْلِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ؟ قَالَ: «أَنْفَقَهُ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ؟ قَالَ: «أَنْتَ أَعْلَمُ». أَخْرَجَهُ الشَّافِعِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالْحَاجِمُ بِتَقْدِيمِ الرَّوْجَةِ عَلَى الْوَلَدِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپ نے فرمایا ”اپنے آپ پر خرچ کرو۔“ اس نے عرض کیا میرے پاس ایک اور ہے؟ فرمایا ”اپنی اولاد پر خرچ کرو“ وہ پھر بولا میرے پاس ایک اور ہے۔ فرمایا ”اپنی بیوی پر خرچ کرو۔“ اس نے عرض کیا میرے پاس اور ہے۔ فرمایا ”اپنے خادم پر خرچ کرو۔“ وہ بولا میرے پاس اور ہے۔ فرمایا ”مجھے خوب علم ہے کہ تو اسے کہاں خرچ کرے۔“ (اس کی شافعی اور ابوداؤد نے تخریج کی ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور نسائی اور حاکم نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ اس میں

ولد سے پہلے زوجہ کا ذکر ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی رحمت خاص سے نوازے اور اس کے پاس خرچ کرنے کی گنجائش ہو تو اس کے مصارف کی ترتیب کیا ہونی چاہئے۔ چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلا حق انسان پر اس کی اپنی جان کا ہے۔ اس کے بعد اسی ترتیب کے مطابق خرچ کرے۔ جیسے اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں جو یہ فرمایا کہ انت اعلم اور ایک دوسری روایت میں انت البصرہ بھی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ تو اس کے خرچ کرنے کی جگہ کا زیادہ علم رکھتا ہے کہ کہاں اور کس کو کتنا دینا چاہئے۔

(۹۸۶) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ حضرت بھز بن حکیم رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے واسطے

نکاح کے مسائل کا بیان 744

أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَنْ أَبْرُ؟ قَالَ: «أُمُّكَ»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «أُمُّكَ»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «أُمُّكَ»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «أَبَاكَ، ثُمَّ الْأَقْرَبَ فَلَا اقْرَبَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ.

سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں حسن سلوک اور بھلائی کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا ”اپنی والدہ کے ساتھ۔“ میں نے پھر عرض کیا۔ پھر کس سے؟ آپؐ نے پھر فرمایا ”اپنی والدہ سے“ میں نے پھر عرض کیا پھر کس سے؟ فرمایا ”اپنی والدہ سے“ میں نے پھر عرض کیا۔ پھر کس سے؟ فرمایا ”اپنے والد“ سے۔“ (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے تخریج کیا اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

نفوی تشریح: ﴿ابر﴾ بر سے ماخوذ ہے۔ شکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی احسان اور نیکی و بھلائی کے ہیں۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں کا درجہ والد سے زیادہ ہے۔ ماں بچے کی وجہ سے جو تکلیفیں اور دکھ برداشت کرتی ہے اس وجہ سے ماں کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے۔ عورت کمزور اور صنف نازک ہے۔ بچے بڑے ہو کر ماں کے قابو اور کنٹرول میں بہت کم رہتے ہیں۔ ماں کی بے قدری کی جاتی ہے۔ شریعت نے ماں کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی شدت سے تاکید کی ہے اور اولاد کو احساس دلایا ہے کہ ماں کو ہر ممکن طریقہ سے زیادہ سے زیادہ آرام اور راحت پہنچانی چاہئے۔ اس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا اور تسلیم کرنا چاہئے۔ بشرطیکہ خلاف شرع حکم نہ دے۔

۱۴ - بَابُ الْحِضَانَةِ پرورش و تربیت کا بیان

(۹۸۷) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَمْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ ابْنِي هَذَا، كَانَ بَطْنِي لَهُ وَعَاءٌ، وَنَذِيْنِي لَهُ سِقَاءٌ، وَحِجْرِي لَهُ حِوَاءٌ، وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِي، وَأَرَادَ أَنْ يَنْزِعَهُ مِنِّي، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ، مَا لَمْ تَنْكِحِي». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ،

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! یہ جو میرا لخت جگر ہے میرا پیٹ اس کیلئے برتن تھا۔ میری چھاتی (پستان) اس کیلئے مشکیزہ اور میری آغوش اس کیلئے ٹھکانہ تھی۔ اس کے والد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب وہ مجھ سے اس بچہ کو بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”جب تک تو دوسرا

نکاح کے مسائل کا بیان 745

نکاح نہیں کرتی اس وقت تک تو ہی اس کی زیادہ وَصَحَهُ الْحَايِمُ۔

حقدار ہے۔“ (اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے

اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿باب الحضاۃ﴾ ”حضاۃ“ کی حاک کے نیچے کسرہ حضاۃ کہتے ہیں بچے کی گھبانی اور تربیت و پرورش کو اور مملک و مضر چیزوں اور حالات سے بچانے اور ان سے محفوظ رکھنے کو اور یہ ماخوذ ہے۔ حضن الصبی بحضنه سے۔ یہ باب نصرینصر سے ہے معنی یہ ہے کہ جب بچے کو اپنے سینے سے لگایا اور اسے گود میں لیا اور اس کی تربیت کا انتظام و اہتمام کیا اور حضن ”حساء“ کے نیچے کسرہ اور ”ضاد“ ساکن کی صورت میں بغل سے نیچے پسلی تک کے حصے کو کہتے ہیں۔ (جسے کوکھ کہتے ہیں) یا پھر سینے اور بازوؤں کے مابین حصہ کو کہتے ہیں۔ ﴿وعاء﴾ واؤ کے نیچے کسرہ اور مد۔ برتن اس حال میں کہ اس نے پیٹ میں بچے کو اٹھائے رکھا۔ ﴿سقاء﴾ سین کے نیچے کسرہ اور مد چمڑے سے ساختہ برتن یعنی مشکیزہ جس میں پانی اور دودھ محفوظ رکھتے ہیں یعنی دودھ پلانے کی وجہ سے اس نے اسے مشکیزہ کا نام دیا۔ ﴿حجرى﴾ آغوش انسان، انسانی گود۔ ﴿حواء﴾ حواء کی ”حا“ کے نیچے کسرہ اور مد ہر اس چیز کا نام ہے جو دوسری چیز کو اپنی لپیٹ میں لے یا گود میں لے اور اسے اپنے ساتھ ملا لے یا جمع کر لے۔ یہ تین اوصاف وہ ہیں جو صرف ماں کے ساتھ مخصوص ہیں باپ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تاکہ ان اوصاف و کمیزات کے توسل سے ماں کا بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے استحقاق اور اس کی برتری و اولیت کا اثبات ہو۔ نبی ﷺ نے اس خاتون کیلئے اس بچے کو برقرار رکھا اور اس پر حکم مرتب فرمایا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”الہدی“ میں کہا ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ احکام میں معافی اور علل کا اعتبار کیا جاتا ہے اور ان احکام کو ان معافی و علل کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے۔ یہ چیز فطرت سلیمہ میں جاگزیں ہوتی ہے حتیٰ کہ نسوانی فطرت و جبلت میں بھی پائی جاتی ہے اور نیل الاوطار میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ والدہ باپ کی نسبت بچے کی زیادہ مستحق ہے۔ اس وقت تک کہ کوئی مانع کی طرف سے حاصل نہ ہو جیسے نکاح۔ ابن منذر نے اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ (تلخیص) ابن حزم کے نزدیک نکاح سے تربیت و پرورش ساقط نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس کا سقوط ہی قرین صواب ہے اور جمہور کی یہی رائے ہے۔

(۹۸۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ زَوْجِي يُرِيدُ أَنْ يَذْهَبَ بِابْنِي، وَقَدْ نَفَعْنِي، وَسَقَانِي مِنْ بَثْرِ أَبِي عِبْنَةَ، فَجَاءَ زَوْجُهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «يَا غُلَامُ! هَذَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت آئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرا شوہر مجھ سے میرا بچہ چھیننا چاہتا ہے اور یہ بچہ میرے کام کاج میں مددگار ہے اور میرے لئے ابوعنبہ کے کنوئیں سے پانی لا کر دیتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کا شوہر بھی آگیا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا ”اے لڑکے! یہ

نکاح کے مسائل کا بیان 746

أَبُوكَ، وَهَذِهِ أُمُّكَ، فَخَذَ بِيَدِ أَيْهَمَا تیرا باپ ہے اور یہ تیری والدہ۔ ان دونوں میں سے شِئْتَ، فَأَخَذَ بِيَدِ أُمِّهِ، فَأَنْطَلَقْتُ جس کا چاہے ہاتھ پکڑ لے۔ ”اس بچہ نے ماں کا ہاتھ بہ“۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ۔ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلتی بنی۔ (اسے احمد اور

چاروں نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے) لغوی تشریح: ﴿بشرابی عنبہ عنبہ کے عین کے نیچے کسرہ اور نون پر فتح۔ ماں نے اپنی حاجت و ضرورت کو بچہ کی طرف ظاہر کیا اور ماں اس بارے میں بچہ ہی سے زیادہ حق رکھتی تھی اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اس بچہ پر دونوں قرعہ ڈالو“ خاند بولا میرے بچہ کے بارے میں مجھ سے کوئی نہیں جھگڑ سکتا۔ تو نبی ﷺ نے بچے کو مخاطب کر کے فرمایا ”یہ تیرا باپ ہے الخ۔“ اس حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث سے حاصل ہوا کہ بچہ جب صغریٰ میں ہو تو ماں اس کی زیادہ حقدار ہے اور جب سن شعور کو پہنچ جائے اور تربیت و پرورش کی اسے چنداں ضرورت نہ رہے تو اس صورت میں والدین کے درمیان اس بچے کو اختیار دیا جائے گا (جس کے ساتھ چاہے چلا جائے) امام شافعی رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ اور عام ابجدیث اسی طرف گئے ہیں اور انہوں نے استغناء کی عمر سات یا آٹھ سال مقرر کی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ اور اہل الرائے اختیار دینے کی طرف نہیں گئے۔ بلکہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ماں بچیوں کی زیادہ حقدار ہے تاوقتیکہ ان کا نکاح ہو جائے اور باپ لڑکوں کا زیادہ حق رکھتا ہے تاوقتیکہ وہ جوان و بالغ ہو جائیں اور اہل الرائے کا قول ہے کہ جب بچہ مستغنی ہو جائے تو باپ اس کا زیادہ حق رکھتا ہے مگر یہ حدیث اختیار کو واجب قرار دے رہی ہے جو ان کے خلاف حجت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بچے کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس کے پاس رہنا پسند کرے اس کے پاس رہے اور اس سے پہلی حدیث میں والدہ کو زیادہ حق دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں جس بچہ کا ذکر ہے وہ بڑا ہوگا اور سمجھدار ہوگا۔ اسی وجہ سے اسے اختیار دیا گیا کہ خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بچہ بڑی عمر کا ہو اور اپنی حفاظت میں والدین کا محتاج نہ ہو تو اسے شریعت نے اختیار دیا ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے جس کے پاس چاہے رہے۔ یہ اختیار کتنی عمر کے بچے کو دیا جائے گا۔ فقہاء نے سات یا آٹھ سال مقرر کی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس امر میں بچے کی مصلحت اور خیر خواہی ہو اسے اختیار کرنا چاہئے۔ اگر ماں باپ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح تربیت و پرورش اور حفاظت کرنے والی ہو اور نہایت غیرت مند خاتون ہو تو ماں کو باپ پر مقدم کیا جائے گا۔ اس موقع پر قرعہ اندازی یا اختیار میں سے کسی کا لحاظ نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچہ تو نادان، کم عقل، ناعاقت اندیش ہوتا ہے۔ ماں باپ میں سے جو بچہ کا زیادہ خیال رکھنے والا ہو، بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اگر باپ میں یہ اوصاف ماں کی بہ نسبت زیادہ ہوں تو بچہ باپ کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ وہی اس کی پرورش و تربیت کا ذمہ دار ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں ماں کے پاس رہیں گے اور احناف نے کہا کہ

لغوی تشریح: ﴿فَانِ الْخَالَةَ وَالِدَةً﴾ یعنی خالہ بمنزلہ ماں۔ اس بچی کی خالہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا اور مذکورہ بچی کا نام عمارہ تھا اور امامہ بھی کہا گیا ہے۔ ان کی کنیت ام الفضل تھی۔ یہ فیصلہ آپؐ نے اس موقع پر فرمایا تھا جب حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور زیدؓ کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ کا دعویٰ تھا کہ اس کا زیادہ استحقاق میں رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور حضرت جعفرؓ کا دعویٰ تھا کہ یہ میری چچا زاد بہن بھی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے اور حضرت زیدؓ کا دعویٰ تھا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ ساری روایات و قصہ سماعت فرما کر آپؐ نے اس بچی کا فیصلہ خالہ کے حق میں دے دیا۔ مشکل یہ پیش آئی کہ یہ خالہ شادی شدہ تھیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ نکاح کے بعد حق حضانت نہیں رہتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق حضانت نکاح کی صورت میں اس وقت ساقط ہوتا ہے جبکہ والدین کے مابین جھگڑا پیدا ہو کہ بچہ کس کے پاس رہے کیونکہ مطلقہ کا بغض و ناراضگی پہلے شوہر کے بارے میں زیادہ سخت و شدید ہوتا ہے پھر اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دوسرے شوہر سے عورت کی محبت و دلچسپی اور شوہر کی بچے کے متعلق سختی بچے کی طرف توجہ کو کم کر دیتی ہے جس سے بچہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہو جاتی ہے۔

(۹۹۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَمَى أَحَدُكُمْ خَادِمَهُ بِطَعَامِهِ فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ مَعَهُ فَلْيَتَاوَلْهُ لُقْمَةً أَوْ لُقْمَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا پیش کرے تو اگر وہ اس خادم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا نہ کھائے تو پھر ایک یا دو لقمے اسے دے۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

(۹۹۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «عَذَبَتْ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ، فَدَخَلَتِ النَّارَ فِيهَا، لَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا، وَسَقَمَتْهَا، إِذْ هِيَ حَبَسَتْهَا، وَلَا هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشٍ الْأَرْضِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”ایک عورت کو بلی کے قید کرنے میں عذاب دیا گیا جس نے بلی کو اتنی دیر تک باندھے رکھا کہ وہ مر گئی۔ اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا گیا کہ نہ تو اس عورت نے بلی کو کچھ کھلایا اور نہ پلایا بلکہ باندھ رکھا اور نہ اسے آزاد چھوڑا کہ وہ زمین کے جانور کھا لیتی۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عَذَبَتْ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ﴾ اس جملہ میں ”فی“ سببیہ ہے یعنی بلی کی وجہ سے۔ ﴿سَجَنَتْهَا﴾ روکے رکھا اسے اور باندھے رکھا۔ ﴿فَدَخَلَتِ النَّارَ فِيهَا﴾ اس کو باندھے رکھنے کی وجہ سے اسے آگ میں داخل کیا گیا۔ ﴿خَشَاشٍ﴾ ”خاک“ کے نیچے کمرہ کے ساتھ اور فتح بھی جائز ہے اور ضمہ بھی۔ حشرات الارض۔ زمین کے جانور، چڑیا وغیرہ۔

749 نکاح کے مسائل کا بیان

حاصل کلام: سیاق تقاضا کرتا ہے کہ اس عورت کو عذاب بلی کے کھانے پینے سے روکے رکھنے کی وجہ سے دیا گیا اور اسے بھوکا پیاسا مارنے کی وجہ سے۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کہ بلی کو قتل کرنا حرام ہے اور نہ اس کے جواز پر اس میں بحث ہے بلکہ اس مسئلہ میں تو سکوت ہے۔ بہترین قول یہ ہے کہ جب بلی دشمنی پر اتر آئے تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو اور اس سے پہلی حدیث کو اس باب میں اس لئے لائے ہیں تاکہ مشکفل اور ضامن کو ان کی ذمہ داری کی عظمت اور گراں باری پر متنبہ کریں اور اس پر خبردار کریں کہ جس کی کفالت کی ذمہ داری اس پر ہے، اس کی ضروریات زندگی کا خیال و لحاظ اور اس سے ملاطفت اور حسن سلوک کفیل کے واجبات اور اس کے آداب میں ہے۔ اس کو اہمیت نہ دینا، معمولی سمجھنا اور اسے ضائع کرنا اللہ کے ہاں کبیرہ گناہ ہے۔ جس کا اس کے ہاں مؤاخذہ ہو گا اور اس وجہ سے سزا و عذاب دیا جائے گا۔



جنايات (جرائم) کے مسائل

(۹۹۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا يَحِلُّ قَتْلُ مُسْلِمٍ إِلَّا فِي

751 جنایات (جرائم) کے مسائل

إِخْدَى ثَلَاثَ خِصَالٍ: زَانٍ مُحْصَنٌ شَدْ زَانِي، پَسِ اَسَ سَكْسَارِ كِيَا جَايَ اَوْر وَهْ آدَمِي جُو فَيَرْجَمُ، وَرَجُلٌ يَقْتُلُ مُسْلِمًا مُتَعَمِّدًا وِدِيهْ وَدَانَسْتَهْ كَسِي مُسْلِمَانِ بَهَائِي كُو قَتْلِ كَرِي پَسِ اَسَ فَيُقْتَلُ، وَرَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ الْإِسْلَامِ، قَتْلِ كِيَا جَايَ گَا اَوْر اِيك وَهْ آدَمِي جُو دَاوَرَهٗ اِسْلَامِ سَ فَيَحَارِبُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، فَيُقْتَلُ، أَوْ خَارِجِ هُو جَايَ اَوْر اللّٰه اَوْر اِس كَ رَسُوْل سَ يَضْلَبُ، أَوْ يُنْفَى مِنَ الْأَرْضِ. رَوَاهُ (لِزَائِي) شُرُوْع كَر دِي۔ پَسِ اَسَ قَتْلِ كِيَا جَايَ گَا أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔ سُوْلِي دِي جَايَ گِي يَا اَسَ جَلَا وَطَنِ كِيَا جَايَ گَا۔“

(اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے

اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فَيُقْتَلُ﴾ تینوں افعال صیغہ مجہول ہیں اور نفی من الارض سے مراد جلاوطنی ہے۔ یہ سزا ہر ایک مرتد کیلئے نہیں ہے بلکہ اس مرتد کیلئے ہے جو مرتد ہونے کے بعد عملاً لڑائی شروع کر دے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الارض فسادا ان يقتلوا او يصلبوا او تقطع ايديهم وارجلهم من خلاف او ينفوا من الارض (۵: ۳۳) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ (لڑائی) کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی سعی و کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں یا جلا وطن کئے جائیں۔ رہا وہ مرتد جو ارتداد کے بعد محاربہ نہیں کرتا اسے صرف سزائے قتل ہی دی جائے گی۔

(۹۹۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ، يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فِي الدِّمَاءِ. جَايَ گَا وَهْ خُونِ كَ مَقْدَمَاتِ هُوں گے۔“ (بخاری و مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فِي الدِّمَاءِ﴾ دم کی جمع ہے اور جار (حرف جر) ان کی خبر ہے۔ یہ حدیث آپ کے ارشاد اول ﴿مَا يَحْسَبُ بِهِ الْعَبْدُ صَلَاتَهُ﴾ کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ ہو گا کے معارض نہیں ہے اس لئے کہ یہ اللہ کا حق ہے اور پہلا اس سے متعلق ہے جو بندوں کے درمیان ہے کیونکہ یہ محاسبہ کے متعلق ہے۔ پہلے کا تعلق حکم اور قضا سے ہے اور محاسبہ تو حکم سے پہلے ہوتا ہے پس پہلا درحقیقت نماز ہے۔

(۹۹۶) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت سمہہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

752 جنایات (جرائم) کے مسائل

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس مالک نے اپنے غلام کو قتل کیا
 ۱۱ مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلَنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ. ۱۲ رَوَاهُ أَحْمَدُ
 وَالْأَزْبَعِيُّ، وَحُسَيْنُ التِّرْمِذِيُّ، وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا
 الْحَسَنَ الْبَصْرِيُّ عَنْ سَمُرَةَ، وَقَدْ اخْتَلَفَ فِيهِ ہے۔ یہ سمرہ سے حسن بصری کی روایت ہے اور سمرہ سے
 حَسَنُ بَصْرِيٍّ مِّنْهُ۔ حسن بصری کے سماع میں اختلاف ہے) اور ابوداؤد اور نسائی
 وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: کی روایت میں ہے کہ ”جس مالک نے اپنے غلام کو
 ۱۱ وَمَنْ حَصَصَى عَبْدَهُ حَصَصْنَاهُ. ۱۲ وَصَحَّحَ خُصِي کیا ہم اسے خُصی کر دیں گے۔“ (اس اضافہ کو حاکم
 الْحَاكِمُ هَذِهِ الزِّيَادَةُ۔ نے صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿جدع عبده﴾ جس مالک نے اپنے غلام کے کان، ناک، ہونٹ وغیرہ کاٹے۔ جَدَعَ
 وراصل ناک کاٹنے سے مخصوص ہے۔ ﴿خصی عبده﴾ جس مالک نے اپنے غلام کے خُصی کھینچ کر نکال
 دیئے اور کاٹ دیئے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ مالک و آقا سے غلام کے جسم اور اعضاء کا قصاص لیا جائے
 گا۔ البتہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، ایک قول تو یہ ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں مطلقاً قتل کیا
 جائے۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کہ غلام اس کا اپنا ہو یا دوسرے کا۔ یہ اس حدیث پر عمل کرنے
 کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اس صورت میں قتل کیا جائے گا جبکہ غلام دوسرے کا ہو، جب
 اپنا غلام ہو تو اس صورت میں قتل نہیں کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اسے مطلقاً قتل نہیں کیا جائے
 گا۔ یہ آخری قول امام احمد رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہم کا ہے۔ ان کا
 استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے۔ کتب علیکم القصاص فی القتل فی الحرب بالحر
 والعبد بالعبد (۱۷۸: ۲) انہوں نے کہا ہے۔ حدیث میں حسن بصری اور سمرہ سے انقطاع کے باوجود
 تاویل کی جائے گی بایں معنی کہ آپ کے ارشاد قتلناہ کا معنی اسی طرح کی سزا ہم اسے دیں گے اور
 جس برے طریقہ سے اس نے کیا اسی طرح ہم اس سے بدلہ لیں گے۔ اس میں لفظ قتل بطور مشاکلت
 استعمال ہوا ہے جیسا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔ جزاء سیئة سیئة مثلها (۴۲: ۴۰) اس جگہ
 سیئت کا دوبارہ لانا بطور مشاکلت ہے۔ اسی طرح کلام رسول ﷺ میں بھی لفظ قتل بطور مشاکلت ہے۔
 اس طرح عبارت بیان کرنے کا فائدہ زجر و توبخ اور ڈرانا دھمکانا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ آزاد مرد کے عضو
 غلام کے عضو کاٹنے کے بدلہ میں کاٹا جائے تو عام اہل علم کی رائے تو یہی ہے کہ آزاد کا عضو غلام کے عضو
 کے بدلہ میں نہ کاٹا جائے۔ ان کے قول کا مقتضی یہ ہے کہ اس حدیث کو انہوں نے زجر و توبخ پر محمول کیا
 ہے۔

(۹۹۷) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول

753 جنایات (جرائم) کے مسائل

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ اللَّهَ ﷺ سَنَاكَ "باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا يُقَادُ لِيَا جَائِئًا» (اے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت۔
الْوَالِدِ بِالْوَلَدِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ وَالتَّبِیْهِيُّ، وَقَالَ تَرْمِذِي نَعَمْ كَمَا هُوَ فِي اس حدیث میں اضطراب ہے۔
التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ مُضْطَرَبٌ.

لغوی تشریح: ﴿لَا يُقَادُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ﴾ یقاد قود سے ماخوذ ہے جس کے معنی قصاص کے ہیں اور قصاص کہتے ہیں مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنا۔ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی نے جب اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو اس کے بدلہ میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اکثر سلف کی یہی رائے ہے کہ قصاص سے بدلہ میں باپ سے دیت وصول کی جائے گی۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ باپ کو قتل نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ باپ بیٹے کے وجود کا سبب ہے اور بیٹا باپ کے وجود کا سبب نہیں، اس لئے بیٹا باپ کو معدوم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ نیز عموماً باپ کی طبیعت سے یہ بعید ہے کہ اپنے لخت جگر کو جان بوجھ کر قتل کرے۔ اگر اس سے اس گناہ و جرم کا ارتکاب ہو گا تو نادانستگی اور خطا کے طور پر ہو گا اور خطا کی صورت میں قتل میں قصاص نہیں ہوتا، دیت ہوتی ہے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر باپ بیٹے کو لٹا کر جانور کی طرح ذبح کرے تو اس صورت میں باپ سے قصاص لیا جائے گا۔ غالباً امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی صورت میں خطا کا احتمال نہیں رہتا۔

ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مضطرب کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثمی بن صباح ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث کے تمام طرق میں انقطاع ہے۔ مگر علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تلخیص میں تصریح کی ہے کہ یہ حدیث کی روایت کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔ لہذا یہ روایت صحیح ہے۔

(۹۹۸) وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے قُلْتُ لِعَلِيِّ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ مِّنَ الْوَحْيِ، غَيْرَ الْقُرْآنِ؟ قَالَ: لَا، وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ، وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِلَّا فَهُمْ يُعْطِيهِ اللَّهُ تَعَالَى رَجُلًا فِي الْقُرْآنِ، وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ، قُلْتُ: وَمَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ؟ قَالَ: أَلْعَقْلُ، وَفَكَأُكَ الْأَسِيرِ، وَأَنْ لَا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا آپ لوگوں کے پاس قرآن کے علاوہ وحی کے ذریعہ نازل شدہ کوئی اور چیز بھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ اس ذات کی قسم! جس نے دانا و غلہ اگایا اور جان کو پیدا فرمایا سوائے اس فہم کے جسے اللہ تعالیٰ کسی انسان کو قرآن کے بارے میں عطا فرماتا ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں تحریر ہے (میرے پاس کچھ نہیں) میں نے سوال

وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ عَلِيٍّ، دیت کے احکام، قیدی کو آزاد کرنے کا حکم اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (بخاری) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو احمد، ابوداؤد اور نسائی نے ایک دوسری سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے کہ ”سب مومنوں کے خون برابر ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کی ذمہ داری کی حیثیت بڑے آدمی کے برابر ہے اور اپنے سوا وہ غیر مسلمانوں کے مقابلہ میں سب ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں اور کوئی مومن کسی کافر کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی معاہدہ (ذمی) کو اس کے زمانہ عہد میں قتل کیا جاسکتا ہے۔“ (اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿هل عندكم شئى الخ﴾ اس جملہ میں ﴿کم﴾ کی ضمیر جمع تعظیم کے طور پر لائی گئی ہے یا پھر یہ مراد ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد سارے اہل بیت ہوں جن کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سردار تھے۔ حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ شیعہ کی ایک جماعت کا یہ خیال تھا کہ اہل بیت کے پاس بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہوئی ایسی اشیاء ہیں جن کو نبی ﷺ نے اہل بیت کیلئے مخصوص قرار دیا ہے ان کے ماسوا دوسرے کسی کو ان کا علم نہیں ہے جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کہا ہے۔ ﴿والذى﴾ اس میں ”واؤ“ قسم کیلئے ہے۔ ﴿فلق الحبة﴾ جس سے پھانٹ کر دانا نکالا اور اس میں سے بنا پودا اور اس کی شاخیں نکلیں۔ ﴿وبرا النسمة﴾ نسمة نون اور سین دونوں پر فتح۔ جس نے جان کو پیدا فرمایا۔ ہر چوپایہ جو جاندار ہے وہ نسمة میں داخل ہے۔ ﴿الافهم﴾ لفظ شئی سے یہ اشتاء ہے اور ”لا“ کے قول میں مقدر ہے کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں بجز فہم کے جو اس نے ہمیں قرآن کے متعلق عطا فرمایا ہے۔ یہ بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ﴿وما فى هذه الصحيفة﴾ اس میں ماموصلہ ہے اور فہم پر عطف ہے اور صحیفہ کے معنی تحریر شدہ ورق۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم دین کے سلسلہ میں لوگوں کو نظر انداز کر کے کوئی خاص چیز نہیں دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے درمیان اتنا بڑا علمی تفاوت و فرق جو وقوع پذیر ہوا ہے وہ صرف اس فہم و تدبر فی القرآن کی وجہ سے ہوا جو ان کو عطا ہوا

755 جنایات (جرائم) کے مسائل

ہے۔ نیز اس وجہ سے کہ استنباط کے مواہب و عطایا مختلف ہیں۔ صحیفہ کو مستثنیٰ احتیاط کے طور پر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی کے خیال میں آئے کہ اس میں ایسی کوئی چیز ہے جو دوسرے لوگوں کے علم میں نہیں یا پھر اس لئے اس کا استثناء کیا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز بالخصوص ہوتی تو اس صحیفہ میں ہوتی مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو لوگوں کے پاس نہ ہو اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہو۔ یہ تخصیص کا بلیغ ترین انداز بیان ہے۔ ﴿العقل﴾ دیت۔ مطلب یہ ہے کہ اس صحیفہ میں دیت کے احکام اور ان کی تفصیلات ہیں ﴿وفساکہ الاسیر﴾ ”فا“ پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ اس صحیفہ میں غلام کو آزاد کرنے کا حکم ہے اور آزاد کرنے کی ترغیب ہے۔ ﴿وان لی یقتل مسلم بکافر﴾ کافر خواہ حربی ہو یا ذمی۔ اس کے بدلے میں مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا۔ اکثر اہل علم کی رائے یہی ہے جس میں امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہم شامل ہیں مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ کافر اگر ذمی ہو گا تو قتل کیا جائے گا مگر اس دعویٰ پر کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ پہلا مذہب ہی درست ہے۔ ﴿تسکافا دماوہم﴾ دیت اور قصاص کے سلسلہ میں ان کے خون مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریف سے کہیں کا قصاص و دیت لی جائے گی۔ بڑے سے چھوٹے کی، عالم سے جاہل کی اور عورت کی مرد سے اور اس کے برعکس تمام اصناف میں۔ یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان دونوں کے خون برابر و مساوی نہیں ہیں۔ ﴿ویسعی بذمتہم ادناہم﴾ ذمہ کے معنی امان ہے۔ اس عبارت کا معنی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جب کوئی مسلمان کسی کافر کو امان دے دے تو اس کافر کا خون بھانا تمام مسلمانوں پر حرام ہے۔ خواہ پناہ دینے والا آدمی مسلمانوں میں سے حقیر ترین آدمی ہی کیونہ نہ ہو۔ مثلاً غلام ہو، ملازم ہو یا عورت ہو۔ ﴿وہم یدعلیٰ من سواہم﴾ وہ مسلمان اپنے غیر کے مقابلہ میں سب اکٹھے ہیں یعنی اپنے دشمن کے مقابلہ میں مجتمع ہیں۔ لہذا مسلمانوں کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رسوا کریں اور نظر انداز کریں اور اسے اپنے دشمن کے سپرد کر دیں اور اسے دشمن کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ ان پر ایک دوسرے کی ضمانت دینا واجب ہے۔ ایک دوسرے سے باہمی تعاون کرنا، دنیا کی تمام اقوام و ملل اور ادیان کے مقابلہ میں جہاں کہیں وہ ہوں سیدہ پلائی دیوار ہوں، اس سے اسلامی ممالک و ولایات میں کفار کی کسی عہدے میں سرداری ناجائز قرار پاتی ہے کیونکہ سربراہ کا ہاتھ اپنی رعایا پر ہوتا ہے۔ ﴿ولا ذوعہد فی عہدہ﴾ ذی جب تک اپنے عہد پر قائم رہے اور اسے نہ توڑے اس کا قتل حلال نہیں۔

(۹۹۹) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ جَارِيَةً وَجَدَ لُونْدَى اِیسی حالت میں پائی گئی کہ اس کا سر دو پتھروں رَأْسُهَا قَدْ رُضَّ بَيْنَ حَجْرَيْنِ، کے درمیان رکھ کر کچل دیا گیا تھا۔ صحابہؓ نے اس فَسَّأَلُوهَا، مَنْ صَنَعَ بِكَ هَذَا؟ فُلَانٌ؟ سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ ایسا کس نے کیا

756 جنایات (جرائم) کے مسائل

فَلَان؟ حَتَّى ذَكُرُوا يَهُودِيًّا فَأَوْمَأَتْ بِرَأْسِهَا، فَأَخَذَ الْيَهُودِيُّ، فَأَقَرَّ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُرَضَّ رَأْسُهُ بَيْنَ حَجَرَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ہے؟ پھر خود ہی کہا کہ فلاں نے فلاں نے، اس طرح نام لیتے ہوئے ایک یہودی کے نام پر پہنچے تو اس نے سر کے اشارہ سے کہا۔ ہاں! یہودی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اس جرم کا اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ”اس کا سر بھی دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا جائے۔“ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم میں

(ہیں)

لغوی تشریح: ﴿رض﴾ صیغہ مجہول اور یہ رض سے ماخوذ ہے اور ﴿رض﴾ کہتے ہیں کچلنے اور توڑنے کو۔ ﴿فاومات﴾ اشارہ کیا اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ مقتول کا قصاص بھاری چیزوں پتھروں وغیرہ سے لینا درست ہے۔ صرف لوہے کی چیزوں کے ساتھ قصاص لینا مخصوص نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوا باقی ائمہ متبوعین کا یہی مذہب ہے اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور یہ کہ قاتل کو اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح مقتول کو قتل کیا گیا۔

(۱۰۰۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ غُلَامًا لَأَنَاسٍ فُقِرَاءَ قَطَعَ أُذُنَ غُلَامٍ لَأَنَاسٍ أَغْنِيَاءَ، فَأَتَوْا النَّبِيَّ ﷺ فَلَمْ يَجْعَلْ لَهُمْ شَيْئًا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ

حضرت عمران بن حصین رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فقراء لوگوں کے ایک غلام نے امراء لوگوں کے غلام کا کان کاٹ لیا تو یہ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے ان کیلئے کوئی چیز مقرر نہ فرمائی۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے)

بإسناد صحيح.

لغوی تشریح: اس حدیث کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے ﴿سقوط القودبیین الممالیک﴾ فیما دون النفس کا عنوان قائم کیا ہے کہ غلام کے مابین قتل کے علاوہ کسی جرم میں بدلہ نہیں اور خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جرم کا مرتکب لڑکا آزاد تھا اور اس کا جرم خطا تھا اور اس کے عاقلہ فقراء تھے اور عاقلہ کی خیر خواہی ان کی طاقت و وسعت کے اعتبار سے ہے۔ ان میں سے کسی فقیر و محتاج پر کوئی چیز نہیں اور رہا غلام یعنی مملوک لڑکا تو جب وہ جرم کا ارتکاب کرے گا تو عام اہل علم کے قول کے مطابق اس کے جرم کی سزا اسی کی گردن پر ہے۔ المستمسکی میں امام ابن تیمیہؒ کے دوا نے کہا کہ عاقلہ فقیر ہوں تو ان پر ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور اس صورت میں قاتل سے بھی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

(۱۰۰۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور انہوں نے

شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ رَجُلًا طَعَنَ رَجُلًا بِقُرْنٍ، فِي رُكْبَتِهِ، فَجَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: أَقْدَنِي، فَقَالَ: حَتَّى تَبْرَأَ، ثُمَّ جَاءَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: أَقْدَنِي، فَأَقَادَهُ، ثُمَّ جَاءَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! عَرَجْتُ، فَقَالَ: قَدْ نَهَيْتُكَ فَعَصَيْتَنِي، فَأَبْعَدَكَ اللَّهُ، وَيَبْطَلُ عَرَجُكَ، ثُمَّ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُقْتَصَّ مِنْ جُرْحِهِ حَتَّى يَبْرَأَ صَاحِبُهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْذَاقُفِيُّ، وَأَعْلَى بِالْإِسْمَاعِيلِيِّ.

اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کے گھٹنے میں سینگ چبھو دیا تو وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا مجھے اس سے قصاص لے کر دیں۔ آپ نے فرمایا ”زخم مندمل ہونے کے بعد آنا۔“ وہ پھر آپ کے پاس آیا اور بولا مجھے قصاص دلوائیے۔ آپ نے اسے قصاص دلوا دیا۔ اس کے بعد پھر آیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول ﷺ میں لنگڑا ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا ”میں نے تجھے منع کیا تھا لیکن تو نے میری بات نہ مانی۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے دور کر دیا اور تیرے لنگڑے پن کو باطل کر دیا۔“ پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”زخموں کا قصاص اس وقت تک لینا ممنوع ہے کہ جب تک زخمی آدمی صحت مند و تندرست نہ ہو جائے۔“ (اس روایت کو احمد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿طعن﴾ ماضی کا صیغہ ہے اور طعن جس کے معنی نیزہ وغیرہ سے مارنا کے ہیں۔ ﴿اقدنی﴾ اقادة سے امر کا صیغہ ہے یعنی مجھے قصاص دلوائیے یا حصول قصاص میں میرے لئے آسانی کریں۔ ﴿حنی تبرا﴾ یہاں تک کہ تو اس بیماری سے صحت یاب ہو جائے۔ ﴿عرجت﴾ ”را“ پر فتح۔ لنگڑا ہو گیا ہوں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ قصاص لینے میں زخموں کے مندمل ہونے تک تاخیر کرنی چاہئے۔ حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے زخموں کی دیت اس وقت لی جانی چاہئے جب زخم مندمل ہو جائیں اور زخمی صحت یاب ہو جائے۔ ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ انتظار کرنا واجب ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ اسے مستحب کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عین ممکن ہے زخم خراب صورت اختیار کر لے اور اسی بنا پر وہ عضو ضائع ہو جائے اور ان دونوں صورتوں میں دیت الگ الگ ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ میں اس آدمی نے بے صبری اور عجلت سے کام لیا اور حضور ﷺ کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو اسے صرف پانچ اونٹ ملے۔ مگر جب وہ خرابی زخم کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا تو اس وقت اسے پچاس اونٹ ملے۔ بے صبری اور عجلت پسندی اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر عدم توجہ کے نتیجے میں صرف پانچ اونٹوں پر اکتفا کرنا پڑا۔

(۱۰۰۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَفْتَنَّتْ أَمْرَأَتَانِ مِنْ هَذِيلٍ، فَرَمَتْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى بِحَجَرٍ، فَقَتَلَتْهَا وَمَا فِي بَطْنِهَا، فَأَخْتَصَمُوا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ دِيَّةَ جَنِينِهَا غُرَّةٌ عَبْدٌ أَوْ وَلِيدَةٌ، وَقَضَى بِدِيَةِ الْمَرْأَةِ عَلَى عَاقِلَيْهَا، وَوَرَّثَهَا وَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ، فَقَالَ حَمْلُ بِنِ النَّابِغَةِ الْهَذِيلِي: يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَيْفَ نَعْرُضُ مَنْ لَا شَرَبَ وَلَا أَكْلَ؟ وَلَا نَطْقُ وَلَا اسْتَهْلُ؟ فَمِثْلُ ذَلِكَ يُطْلُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا هَذَا مِنْ إِخْوَانِ الْكُفَّانِ، مِنْ أَجْلِ سَجْعِهِ الَّذِي سَجَعَ». مَقْفَرٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہذیل قبیلہ کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں اور ایک نے دوسری پر پتھر دے مارا۔ اس پتھر سے وہ عورت اور اس کے پیٹ کا بچہ مر گیا تو اس کے وارث مقدمہ نبی ﷺ کی عدالت میں لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ ”جنین کے بدلہ ایک لونڈی یا غلام ہے اور عورت کے بدلہ قاتل کے وارثوں پر دیت عائد فرمادی اور اس خون بہا کا وارث اس کی اولاد کو بنایا اور ان وارثوں کو بھی جو ان کے ساتھ تھے۔“ حمل بن نابغہ ہذلی نے کہا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم ایسے بچہ کا بدلہ کیسے دیں جس نے نہ پیا نہ کھایا نہ بولا اور نہ چیخا۔ اس طرح کا حکم تو قاتل اعتبار نہیں۔ آپ نے فرمایا ”یہ تو کافروں کا بھائی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے تو کافروں کی سی قافیہ بندی کی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، سَأَلَ مَنْ شَهِدَ قَضَاءَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي الْجَنِينِ، قَالَ: فَقَامَ حَمْلُ بِنِ النَّابِغَةِ، فَقَالَ: كُنْتُ بَيْنَ أَمْرَأَتَيْنِ، فَضَرَبَتْ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى، فَذَكَرَهُ مُحْتَضِرًا وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَّانٍ وَالْحَاكِمُ.

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کون شخص جنین کے بارے میں نبی ﷺ کے فیصلہ کے موقع پر حاضر تھا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حمل بن نابغہ کھڑا ہوا اور بیان کیا کہ میں اس وقت ان دو عورتوں کے درمیان تھا، جب ایک نے دوسری کو پتھر دے مارا تھا، پھر مختصر حدیث کا ذکر کیا۔ (ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿امرأتان من هذيل﴾ یہ دونوں عورتیں سوکنیں تھیں اور دونوں حمل بن مالک بن نابغہ ہذلی کے نکاح میں تھیں اور ﴿جنین﴾ عورت کا وہ حمل جو اس کے رحم میں ہو۔ ﴿غرّة﴾ غنیمت پر

(۱۰۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الرُّبَيْعَ بِنْتَ النَّضْرِ - عَمَّتُهُ - كَسَرَتْ نَيْنَةَ جَارِيَةٍ، فَطَلَبُوا إِلَيْهَا الْعَفْوَ، فَأَبَوْا، فَعَرَضُوا الْأَرْضَ، فَأَبَوْا، فَأَتَوْا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَأَبَوْا، إِلَّا الْقِصَاصَ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِالْقِصَاصِ، فَقَالَ

جنایات (جرائم) کے مسائل

760

اَنَسُ بْنُ النَّضْرِ: يَا رَسُولَ اللَّهِ: لینے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے قصاص کا فیصلہ فرما دیا۔ یہ سن کر حضرت انس بن نضر نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کیا رنج کا دانت توڑا جائے گا؟ نہیں، اس ذات اقدس کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے انس! اللہ کا نوشتہ تو قصاص ہی ہے۔“ اتنے میں وہ لوگ اس پر رضامند ہو گئے اور پھر معافی دے دی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔“

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

(بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿عمته﴾ یہ بدل یا بیان ہے یعنی انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی بھوپھی اور انس بن نضر کی بہن کی۔ ﴿ثیبة جارية﴾ ثیبة فعیلہ کے وزن پر ہے۔ اس کی جمع ثیایا آتی ہے یہ منہ کے اگلے دانتوں کو کہتے ہیں۔ دو دانت اوپر والے اور دو دانت نیچے والے۔ ﴿الادش﴾ کے معنی دیت۔ ﴿لا نکسر نبتھا﴾ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ یہ بات انس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تردید کیلئے نہیں کسی اور نہ آپ کے فرمان سے اعراض کے پیش نظر۔ یہ تو انہوں نے محض توقع اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی امید پر کہے کہ مخالف فریق کو اللہ تعالیٰ اس پر راضی فرما دے گا اور اس کے دل میں معافی کا جذبہ و داعیہ پیدا فرما دے گا اور وہ دیت لے کر قصاص کے حق سے دست بردار ہو جائے گا۔ ﴿کتاب اللہ القصاص﴾ کتاب اللہ مبتداء اور القصاص اس کی خبر ہے۔ یعنی کتاب اللہ میں اس قسم کے مقدمات میں قصاص کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”السن بالسن والجروح قصاص“ اس اصول کی بنیاد پر کہ سابقہ شرائع اس وقت تک ہماری شرائع ہیں تا وقتیکہ اس کے نسخ کا حکم وارد ہو یا اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق وان عاقبتہم فعاقبوا بمثل ما عوقبتہم بہ (۱۶: ۱۲۶) ﴿لا برہ﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے قسم کے جواب میں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کی قسم توڑے بغیر پوری فرما دے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حضرت انس بن نضر کی فضیلت معلوم ہوئی کہ انہوں نے جو قسم کھائی اللہ نے اسے پورا فرما دیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بھرپور اعتماد اور مکمل بھروسے کی بنا پر قسم کھائی تھی جسے اللہ نے پورا کر دیا۔ نبی ﷺ کے ارشاد کی تردید اور اعراض مقصود نہ تھا۔ ایسا ہوتا تو ایک صحابی ارشاد نبوی کا نافرمان شمار ہوتا جو ایک صحابی کی شان کے کسی صورت لائق نہیں۔ نبی ﷺ کا ان کی تعریف فرمانا اس بات

761 جَنایات (جرائم) کے مسائل

کا کھلا ثبوت ہے ورنہ آپؐ نافرمان صحابی کی تعریف کیسے فرماتے۔

براوی حدیث: ﴿ربیع بنت نضرؓ﴾ ”را“ پر ضمہ با پر فتح اور ”یا“ پر کسرہ اور تشدید۔ یہ نضر بن معنم بن زید بن حرام کی بیٹی حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص کی پھوپھی اور حارث بن سراقہ جو غزوہ بدر میں جام شہادت نوش فرما کر غلہ بریں کے مکین بن گئے تھے کی والدہ تھیں۔

﴿انس بن نضرؓ﴾ یہ حضرت ربیع کے بھائی اور انس بن مالک رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص کے چچا تھے۔ یہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس کا ان کو بڑا افسوس تھا۔ جنگ احد کے روز مشرکین کی صف کی جانب بڑھے، یہ معذرت اللہ کے حضور پیش کرتے ہوئے بڑھتے کہ مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے وہ ٹھیک نہیں اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ میں تو احد کے ورے جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد خوب لڑے اور شہید ہو گئے۔

(۱۰۰۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ قُتِلَ فِي عِمِّيَا، أَوْ فِي رَمِيًا بِحَجَرٍ أَوْ سَوْطٍ أَوْ عَصَا، فَمَقَلَهُ عَقْلُ الْخَطَا، وَمَنْ قُتِلَ عَمْدًا، فَهُوَ قَوْدٌ، وَمَنْ حَالَ ذُونُهُ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ.

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص اندھا دھند لڑائی میں قتل ہو جائے یا پتھر پھینکنے سے قتل ہو جائے یا کوڑے اور لاٹھی سے مر جائے تو اس کی دیت، خطا کی دیت ہوگی۔ جو شخص عداً قتل کیا جائے گا تو اس کا قصاص ہے اور جو شخص قصاص لینے میں حائل ہوا تو ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہے۔“ (اس حدیث کو ابوداؤد اور

لغوی تشریح: ﴿عمیاء﴾ عین کے نیچے کسرہ اور میم مکسور مع التشدید اور پھر ”یا“ پر بھی تشدید۔ یعنی جو شخص ایسی صورت حال میں قتل کیا گیا جس کے قتل کا معاملہ صاف اور واضح نہ ہو اور اس کے قاتل کی نشان دہی بھی نہ ہو سکے ﴿اور میا﴾ رمی سے ماخوذ ہے۔ عمیاء کے وزن پر ہے اور ترامی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسی پوزیشن میں اس کا قتل ہوا جب لوگ تیر اندازی میں مشغول تھے اور ایک دوسرے کو مار بیٹھ رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں قاتل کی نشان دہی اور قاتل کا حال بھی معلوم نہ ہو تو ایسا قتل، قتل خطا کے زمرہ میں آتا ہے اور ابوداؤد میں الفاظ اس طرح ہیں ”من قتل فی عمیاء فی رمی“ اس جملہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دوسرا پہلے کی تفسیر ہے۔ ﴿عصا﴾ اور بعض نسخوں میں ”عصی“ عین اور صاد دونوں پر کسرہ اور ”یا“ پر تشدید۔ اس صورت میں یہ عصا کی جمع ہوگی۔ ﴿عقل الخطا﴾ یعنی قتل خطا کی دیت اور وہ سو اونٹ ہے۔ ﴿قود﴾ قاف اور دال دونوں پر فتح۔ قصاص۔ ﴿ومن حال ذونہ﴾ جو شخص قصاص لینے میں حائل ہوا اور مانع بن کر کھڑا ہوا۔

(۱۰۰۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی کو دو آدمی اس طرح قتل کریں کہ ایک نے پکڑ لیا اور دوسرے نے پکڑے ہوئے کو قتل کر دیا تو اس صورت میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کی سزا دی جائے گی اور یہ سزا عمر قید کی ہوگی یا عدالت کی صوابدید پر ہوگی۔ احناف اور شوافع کا یہی مسلک ہے مگر امام مالک رحمہ اللہ، نفعی رحمہ اللہ اور ابن ابی لیلیٰ کا قول یہی ہے کہ دونوں کو قتل کیا جائے کیونکہ دونوں اس کے قتل میں شریک ہیں اگر پکڑنے والا اسے نہ پکڑتا تو ممکن ہے وہ قاتل کے وار سے بچ کر بھاگ جاتا اور قتل نہ ہوتا چونکہ اس کے قتل میں دونوں برابر کے شریک ہیں سزا بھی دونوں کی برابر ہونی چاہئے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔

(۱۰۰۶) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ
الْبَيْلَمَانِيِّ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَتَلَ مُسْلِمًا
بِمُعَاهِدٍ، وَقَالَ: «أَنَا أَوْلَىٰ مَنْ وَفَىٰ
بِذِمَّتِهِ». أَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ هَكَذَا مُرْسَلًا.
وَوَصَلَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِذِكْرِ ابْنِ عَمَرَ فِيهِ، وَإِسْنَادُ
الْمَوْصُولِ وَاقٍ.

حاصل کلام: اس حدیث کی شدت ضعف اور حدیث "لا یقتل مسلم بکافر" کے معارض ہونے کی وجہ سے جمہور نے اس حدیث کو قابل استدلال قرار نہیں دیا۔ البتہ حنفیہ اسی طرف گئے ہیں مگر احناف اکثر اوقات صحیح حدیث پر ضعیف کو ترجیح دے دیتے ہیں۔ لہذا اس مقام پر جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس پر کوئی تعجب نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن بيلماني﴾ عبدالرحمن بن ابی زید مولیٰ عمر۔ مدنی۔ حران میں جا کر فروکش ہوئے۔ ابوجاتم کا قول ہے کہ یہ کمزور راوی ہے اور ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور

(۱۰۰۷) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قُتِلَ غُلَامٌ فَرِيبٌ دِهِيٍّ مِنْ بَنِي عُمَرَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، وَكَانَ مِنْ أَهْلِ صَنْعَاءَ لَقَتَلْتُهُمْ بِهِ. أَخْرَجَهُ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دھوکہ اور فریب دہی سے ایک غلام کو قتل کر دیا گیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اگر اس کے قتل میں سارے اہل صنعاء شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر ڈالتا۔

(بخاری)

(۱۰۰۸) وَعَنْ أَبِي شُرَيْحٍ
الْخَزَاعِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ:
«مَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ، بَعْدَ مَقَاتِلِي
هَذِهِ، فَأَمْلَهُ بَيْنَ خَيْرَتَيْنِ، إِمَّا أَنْ
يَأْخُذُوا الْعَقْلَ، أَوْ يَقْتُلُوا». أَخْرَجَهُ أَبُو
دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ

حضرت ابو شریح خزاعی سے روایت ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا ”کہ میرے اس خطبہ کے بعد اگر
کسی کا کوئی آدمی مارا جائے تو موتی کے ورثاء کو دو
اختیار ہیں یا تو دیت لے لیں یا قاتل کو مقتول کے
بدلہ میں قتل کر دیں۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے
روایت کیا ہے اور اس روایت کا اصل اس کے ہم معنی

حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ بِمَعْنَاهُ.

لغوی تشریح: یہ حدیث فتح مکہ کے موقع پر خطاب کا ایک ٹکڑا ہے۔ دوران گفتگو جب آپؐ نے جاہلیت کے خون کو باطل قرار دیا، فرمایا پھر تم نے اے گروہ خرافہ! ہذیل کا یہ آدمی قتل کیا ہے میں اس کی دیت لے کر چھوڑوں گا۔ الحدیث ﴿بِیْنِ خَیْرِ بَیْنٍ﴾ خیر بین کی "خا" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر فتح یعنی دیت لینے اور قصاص دونوں میں اسے اعتبار ہے جو چاہے انتخاب کرے۔

راوی حدیث: ﴿ابو شریح خزاعی﴾ عمرو بن فویلد اور بعض کے نزدیک فویلد بن عمرو کھنسی عدوی خزاعی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ مدینہ میں ۶۸ھ کو وفات پائی۔

١ - بَابُ الدِّيَّاتِ

(۱۰۰۹) عَنْ أَبِي بَكْرٍ بْنِ مُحَمَّدٍ
بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ، عَنْ أَبِيهِ،
عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلَى
أَهْلِ الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ. وَفِيهِ
أَنَّ مَنْ اعْتَبَطَ مُؤْمِنًا قَتَلًا عَنْ بَيْتِهِ،
فَإِنَّهُ قَوْدٌ، إِلَّا أَنْ يَرْضَى أَوْلِيَاءُ
الْمَقْتُولِ. وَإِنْ فِي النَّفْسِ الدِّيَّةُ:
مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ، وَفِي الْأَنْفِ إِذَا
أُوعِبَ جَذْعُهُ الدِّيَّةُ، وَفِي الْعَيْنَيْنِ
الدِّيَّةُ، وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَّةُ، وَفِي
الشَّفَتَيْنِ الدِّيَّةُ، وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَّةُ،
وَفِي الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَّةُ، وَفِي الصُّلْبِ
الدِّيَّةُ، وَفِي الرَّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ
الدِّيَّةِ، وَفِي الْمَأْمُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَّةِ،
وَفِي الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَّةِ، وَفِي
الْمُتَقَلِّةِ خَمْسَ عَشْرَةَ مِنَ الْإِبِلِ،
وَفِي كُلِّ إِصْبَعٍ، مِنْ أَصَابِعِ الْيَدِ
وَالرَّجْلِ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ، وَفِي

765 جنایات (جرائم) کے مسائل

السَّنَّ خَمْسٌ مِّنَ الْإِبِلِ، وَفِي عورت کے بدلہ قتل کیا جائے گا اور جن کے پاس الموضحة خمس من الإبل، وَإِنْ اونٹ نہ ہوں اور سونا ہو تو ان سے ایک ہزار دینار الرَّجُلُ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ، وَعَلَى أَهْلِ وصول کئے جائیں گے۔“ (ابوداؤد نے اسے اپنی مراسیل أَلْذَّهَبِ أَلْفُ دِينَارٍ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي میں لکھا ہے اور نسائی، ابن خزیمہ، ابن جبارود، ابن حبان اور المَرَايِسِلِ، وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ احمد نے روایت کیا ہے اور اس کی صحت میں انہوں نے وَابْنُ جَبَّانٍ وَأَحْمَدُ، وَاخْتَلَفُوا فِي صِحَّتِهِ. اختلاف کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الدیات﴾ دیات۔ دیت کی جمع ہے دونوں جگہ ”یاء“ مخفف ہے۔ اس کا اصل ودی ہے۔ واؤ کو حذف کر کے اس کے عوض تالگادی گئی ہے۔ جس طرح عدۃ میں تالگادی گئی ہے دیت اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض دیا جاتا ہے۔ یا اعضائے بدن کے زخموں کے بدلے دی جاتی ہے۔ ﴿اعسط﴾ بغیر کسی وجہ و سبب کے قتل کرنا۔ یہ ”عبط الابل واعتبطه“ سے ماخوذ ہے۔ جب اونٹ کو بغیر کسی مرض اور وجہ سے ذبح کر دیا جائے۔ ﴿قتلا﴾ یہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿عن بسنة﴾ گواہ قاتل پر قائم و ثابت ہو جائیں یا خود قاتل اقرار کر لے۔ ﴿فانه قود﴾ قود قاف اور واؤ دونوں پر فتح ہے۔ تو پھر اس کا حکم قصاص ہے۔ قاتل کو مقتول کے بدلہ قتل کیا جائے گا۔ ﴿الا ان یرضی اولیاء المقتول﴾ الا یہ کہ مقتول کے اولیاء و ورثاء راضی ہو جائیں کہ دیت لے لیں گے۔ یہ دلیل ہے کہ دیت قبول کرنے کا اختیار مقتول کے اولیاء کو ہے نہ کہ قاتل کو۔ جسور علماء کی رائے تو یہی ہے البتہ خفیہ کہتے ہیں کہ مقتول کے اولیاء کو دیت لینے کا اختیار اس وقت تک نہیں ہے جب تک قاتل راضی نہ ہو جائے اور وہ اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ﴿مانہ من الابل﴾ یہ دیت کا بیان ہے اور بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا پھر مرفوع ہے تو اس صورت میں مبتداء محذوف ہے ﴿اوعب جدعه﴾ فعل صیغہ مجہول ہے۔ معنی ہے کہ پورا ناک جڑ سے کاٹ دیا۔ ﴿الدیة﴾ یعنی پوری دیت ہے۔ ﴿وفی اللسان الدیة﴾ پوری دیت اس صورت میں جبکہ زبان کو جڑ سے کاٹ دیا گیا ہو یا اتنی زبان کاٹ دی گئی ہو کہ بات چیت اور گفتگو نہ کر سکے۔ ﴿البیضتین﴾ ”خصتین“ المامومہ﴾ ایسا زخم جو دماغ کی جڑ تک پہنچ جائے اور ﴿ام الدماغ﴾ دماغ کے اوپر چڑے کو کہتے ہیں۔ ﴿الجائفہ﴾ نیزے وغیرہ کا وہ زخم جو پیٹ یا سر کے اندر تک پہنچ جائے۔ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے اگر زخم ایک جانب سے دوسری جانب نفوذ کر کے نکل جائے تو اس صورت میں دو تہائی دیت ہے اس لئے کہ اس طرح یہ دو زخم شمار ہوں گے۔ ﴿المنقلہ﴾ قاف پر تشدید اور کسر۔ ایسا زخم جو ہڈی کو توڑ دے اور اسے اپنی جگہ سے نکال باہر کرے۔ ﴿الموضحة﴾ ایضاح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ایسا زخم جو ہڈی کو گوشت سے نگا کر کے اسے نمایاں اور واضح کر دے۔ ﴿وعلى اهل الذهب الف دينار﴾ یعنی دیت میں ہزار دینار سواونٹوں کے بدلے۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا

راوی حدیث: ﴿ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری﴾ بخاری مدنی، قاضی۔ ان کا نام اور کنیت ایک ہی ہے اور ایک قول ہے کہ ان کی کنیت ابو محمد ہے، ثقہ ہیں۔ عبادت گزار ہیں۔ کتب ستہ کے راوی ہیں اور پانچویں طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ عرصہ چالیس سال سے رات کو بستر پر کمر نہیں رکھی۔ ابن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا۔ ابن سعد کے قول کے مطابق ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۰۱۰) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «دِيَةُ الْخَطَاِ أَحْمَاسًا، عَشْرُونَ حِقَّةً، وَعَشْرُونَ جَذَعَةً، وَعَشْرُونَ بَنَاتٍ مَخَاضٍ، وَعَشْرُونَ بَنَاتٍ لَبُونٍ، وَعَشْرُونَ بَنَاتٍ لَبُونٍ» أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَأَخْرَجَهُ الْأَرْبَعَةُ بِإِسْنَادٍ: «وَعَشْرُونَ بَنَاتٍ مَخَاضٍ» بِذَلِكَ «بَنَاتٍ لَبُونٍ»، وَإِسْنَادُ الْأَوَّلِ أَقْوَى، وَأَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ مِنْ وَجْهِ آخَرٍ مُؤَوَّفًا، وَهُوَ أَصَحُّ مِنَ الْمَرْفُوعِ.

وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ مِنْ طَرِيقِ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، رَفَعَهُ: الدِّيَةُ ثَلَاثُونَ حِقَّةً، وَثَلَاثُونَ جَذَعَةً، وَأَرْبَعُونَ خَلْفَةً، فِي بَطْنِهَا أَوْلَادُهَا .

ابن ابی شیبہ نے ایک اور طریق سے موقوفہ روایت کیا ہے اور اس کی سند اس مرفوع سے زیادہ صحیح ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے عمرو بن شعیب عن امیہ عن جدہ کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ”دیت میں تیس تین سالہ اور تیس چار سالہ اور چالیس سالہ اونٹیاں وصول کی جائیں گی“

نغوی تشریح: ﴿دبہ الخطا حماسا﴾ دیت کی ادائیگی بایں صورت واجب ہے یا یہ معنی کہ اس

767 جنایات (جرائم) کے مسائل

طریقہ سے وصول کی جائے گی۔ قتل خطا کی دیت پانچ طرح سے لی جائے گی۔ اغناس نفس کی جمع ہے۔ نفس کی ”خا“ اور میم دونوں پر ضمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دیت کی وصولی کو پانچ اجزاء پر منقسم کر دیا گیا ہے ہر جزو ایک خاص نوعیت کے اونٹوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا بیان اس قول سے شروع ہوتا ہے۔ ﴿عشرون حقة﴾ حقه ”خا“ کے نیچے کسرہ اور قاف مشدد وہ اونٹ جو اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور ﴿جذعہ﴾ جیم اور ”زا“ دونوں پر فتح۔ ایسے اونٹ کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہو اور ﴿بنت مخاض﴾ ایسی اونٹنی جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔ اور ﴿بنت لبون﴾ جو اونٹنی تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو ﴿واسناد الاول﴾ سے مراد ہے۔ سنن دارقطنی کی سند ﴿اقوی﴾ قوی ترین ہے۔ اس سند سے جسے چاروں نے نقل کیا ہے کیونکہ ان کی بیان کردہ سند میں شعث بن مالک ایسا راوی ہے جو مجہول ہے نیز اس میں حجاب بن ارطاة مدلس ہے اور عمرو بن شعیب کی حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ﴿اربعون خلفه خلفه﴾ ”خا“ پر فتح اور لام پر کسرہ۔ حاملہ اونٹنی کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم رہے کہ ابن مسعود کی یہ حدیث دیت میں ادا کئے جانے والے اونٹوں کی عمر کے تعین میں اصل ہے اور ائمہ اربعہ نے اسی کو لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ قتل خطا کی دیت پانچ طرح سے وصول کی جائے گی۔ البتہ انہوں نے پانچویں کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بنو مخاض مراد ہیں اور دوسروں نے کہا ہے کہ اس سے مراد بنو لبون ہیں اور آپ نے معلوم کر لیا کہ دارقطنی کی سند قوی تر ہے اور اس میں بنو لبون ہے۔ لہذا وہی قابل ترجیح ہے۔ رہی عمرو بن شعیب کی وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ دیت کی وصولی تین طرح سے کی جائے گی تو وہ دراصل قتل عمد کی صورت میں مقتول کا ولی قصاص کی بجائے دیت وصول کرنے پر رضامند ہو جائے تو پھر۔ معلوم رہنا چاہئے کہ قتل کی تین انواع ہیں۔ قتل عمد، قتل خطا اور قتل شبہ عمد اور شبہ عمد سے مراد ہے ایسے آلہ سے قتل کیا جائے کہ جس سے عادتاً قتل کا امکان نہ ہو۔ جیسے لاشعی، کوڑا وغیرہ۔ باوجودیکہ وہ قتل کرنے کا قصد و ارادہ رکھتا تھا۔ پس قتل عمد اور قتل خطا میں یہی دیت ہوگی اور ابن مسعود کی حدیث میں شبہ عمد کی دیت ہے جسے دیت مغلظہ کہتے ہیں۔

(۱۰۱۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنْ أَعْتَى النَّاسَ عَلَى اللَّهِ ثَلَاثَةٌ: مَنْ قَتَلَ فِي حَرَمِ اللَّهِ، أَوْ قَتَلَ غَيْرَ قَاتِلِهِ. أَوْ قَتَلَ لِدُخْلٍ الْجَاهِلِيَّةِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ جَبَّانٍ فِي حَدِيثِهِ صَحَّحَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے لوگ تین قسم کے ہیں (ایک) جو اللہ کے حرم میں قتل کرے (دوسرا) جو اپنے غیر قاتل کو قتل کرے (تیسرا) وہ جو جاہلیت کی عداوت و دشمنی کی بنا پر قتل کرے۔“ (ابن حبان نے اس کی تخریج ایک حدیث کے ضمن میں کی ہے۔ جسے انہوں نے صحیح قرار دیا

768 جَنایات (جرائم) کے مسائل

ہے

لعنوی تشریح: ﴿اعْتَصَى النَّاسُ﴾ عتو سے اسم تفصیل کا صیغہ ہے جس کے معنی تکبر اور سرکشی کے ہیں تو اعْتَى النَّاسُ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ آدمی جو سب سے زیادہ سرکش اور سرکشی و تمرد میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور ﴿لِذَلِّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ جاہلیت کی وجہ سے انتقام لینا اور بدلے کا مطالبہ و تقاضا کرنا۔ یعنی دور جاہلیت میں کئے گئے جرم کا انتقام لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی سرکشی کرنے والے تین قسم کے آدمیوں کا ذکر ہے۔ ان میں ایک وہ بدنصیب ہے جو بدالامین یعنی مکہ میں قتل ناحق کرتا ہے۔ قتل کرنا ویسے ہی بہت بڑا جرم و گناہ ہے مگر حرم مکہ و مدینہ میں قتل کرنا سنگین ترین جرم ہے جس سے معلوم ہوا کہ مقام و جگہ میں جرم کی سنگینی میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے جو شخص حرم میں قتل خطا کا مرتکب ہو اس پر دیت سخت رکھی جائے اور دوسرا وہ ہے جو اصل قاتل کے علاوہ بدلے میں کسی اور کو قتل کرتا ہے۔ قاتل سے بدلہ لینا حکومت کی ذمہ داری ہے مگر جو شخص جوش انتقام میں قاتل کے رشتہ دار یا ہمشیر وغیرہ کو قتل کرتا ہے وہ دہرے جرم کا مرتکب بنتا ہے اور تیسرا وہ جو زمانہ جاہلیت کا بدلہ کسی مسلمان سے لیتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی سرکش ہے۔

(۱۰۱۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت بن العاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قتل خطا کی دیت اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «أَلَا إِنَّ دِيْنَةَ شَبِہِ عَمْدِ (کی دیت ہے) جو کوڑے اور لاٹھی سے (مارا اَلْحَطَّ وَشِبْہِ الْعَمْدِ، مَا كَانَ بِالسَّوْطِ گیا) ہو۔ اس کی دیت سواوٹ ہے۔ ان میں چالیس وَالْعَصَا، مِائَةٌ مِنَ الْإِبِلِ، مِنْهَا اونٹنیاں ایسی ہوں گی جن کے پیٹ میں بچے پرورش أَرْبَعُونَ فِي بُطُونِهَا أَوْلَادُهَا»۔ أَخْرَجَهُ پا رہے ہوں گے۔ (اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْمِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ نَكَلَاہِ اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے) جَبَّانٌ۔

لعنوی تشریح: ﴿مِنْهَا اربعون فی بطونہا اولادہا﴾ اور باقی ساٹھ میں سے تیس حقہ یعنی تیس تین سالہ اونٹنیاں اور تیس چار سالہ جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کو یہاں بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ عمرو بن شعیب والی حدیث کی تفسیر ہو جائے کہ اس میں جو تین طرح کی دیت بیان ہوئی ہے وہ قتل خطا کی دیت نہیں بلکہ قتل شبہ عمد کی ہے۔

(۱۰۱۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللہُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”یہ اور یہ یعنی چنگلی اور انگوٹھا برابر قَالَ: «هَذِهِ وَهَذِهِ سَوَاءٌ يَعْني ہیں۔“ (بخاری)

الْخِنْصَرَ وَالْإِبْهَامَ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

وَلَا يَبْنِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ: الْأَصَابِعُ اور ابو داؤد اور ترمذی کی روایت میں ہے۔ سب سَوَاءً وَالْأَسْنَانُ سَوَاءً، الثَّنِيَّةُ انگلیاں برابر اور سارے دانت برابر ثنّیۃ (سامنے والے) وَالضُّرْسُ سَوَاءً۔ اوپر نیچے کے دو دو دانت اور داڑھ برابر اور ابن ولابن جَبَان: دِيَّةُ أَصَابِعِ الْيَدَيْنِ۔ حبان کی روایت میں ہے ”ہاتھوں اور پاؤں کی وَالرَّجْلَيْنِ سَوَاءً، عَشْرُ مَنَ الْإِبِلِ انگلیوں کی دیت برابر ہے۔ ہر انگلی کے بدلہ دس لِكُلِّ إِبْصَعٍ۔ اونٹ دیت ہے۔“

لعنوی تشریح: ﴿ہذہ وھذہ سواء﴾ یہ اور یہ برابر۔ یعنی دیت میں چھوٹی بڑی سب انگلیاں برابر ہیں۔ ﴿الضرس﴾ ضرس کے ضاد کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن۔ اس کی جمع ”اضراس“ ہے۔ یہ پانچ یا چار داڑھیں ہوتی ہیں جو منہ کے دونوں اطراف میں منہ کے آخری حصہ میں ہوتی ہیں ان سے کھانا چبایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دیت نفع کی مقدار کے حساب سے نہیں ہوتی۔ انگوٹھا چھنگلی سے زیادہ سودمند اور نفع بخش ہوتا ہے بلکہ وہ تو تمام انگلیوں سے زیادہ منافع بخش ہوتا ہے اور اسی طرح داڑھیں دوسرے دانتوں کے مقابلہ میں زیادہ سودمند اور نفع بخش ہوتی ہیں اس کے باوجود دیت میں یہ سب برابر ہیں اور ہر ایک کی دیت دس اونٹ ہے۔

(۱۰۱۴) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، رَفَعَهُ، قَالَ: مَنْ تَطَبَّبَ، وَلَمْ يَكُنْ بِالطَّبِّ مَعْرُوفًا، فَأَصَابَ نَفْسًا فَمَا دُونَهَا، فَهُوَ ضَامِنٌ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَهُوَ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ وَغَيْرِهِمَا، إِلَّا أَنَّ مَنْ أَرْسَلَهُ أَقْوَى بِمَنْ وَصَلَهُ.

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ”جو شخص اپنے آپ طبیب بن کر کسی کو دوائی دیتا ہے حالانکہ اسے طبابت میں مہارت نہیں اور اس (کے غلط علاج) سے کوئی آدمی قتل ہو جائے یا کوئی نقصان کسی کو پہنچ جائے تو وہ اس کا ضامن ہے۔“ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابو داؤد اور نسائی وغیرہ کے ہاں بھی یہ روایت منقول ہے مگر جن راویوں نے اس روایت کو مرسل بیان کیا ہے وہ ان راویوں سے زیادہ قوی ہیں جنہوں نے اسے موصول بیان کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿من تطبب﴾ پیشہ طبابت اختیار کیا اور مریض کو دوا دی۔ ﴿فأصاب نفساً فما دونها﴾ غلط علاج سے مریض کی جان یا کوئی حصہ جسم ضائع ہو جائے۔ ﴿فہو ضامن﴾ تو وہ اس کا

770 جنایات (جرائم) کے مسائل

ضامن ہے اور اس پر دیت واجب ہے جو اس کے عاقلہ یعنی عصبہ پر واجب الادا ہوگی۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا اگر کوئی شخص صحیح معنوں میں طیب نہیں مگر وہ کسی کو دوائی دیتا ہے اور اس سے جانی نقصان ہو جاتا ہے یا اعضاء بدن میں سے کوئی عضو ناکارہ ہو جاتا ہے تو اس پر اس کی دیت واجب ہوگی اور ادائیگی دیت کا بار اس کے عصبہ پر بھی پڑے گا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے طیب حاذق کیلئے بیس باتوں کا خیال و لحاظ رکھنا ضروری قرار دیا ہے پھر ان کو ایک ایک کر کے زاد المعاد میں بیان کیا ہے۔ ایسے نا تجربہ کار اور اناڑی طیب سے نقصان کی صورت میں اس پر دیت کے واجب ہونے پر سب علماء کا اجماع ہے۔

(۱۰۱۵) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عمرو بن شعيب نے اپنے والد سے، انہوں نے اپنے
عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «فِي دادا سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جن
الْمَوَاضِعِ خَمْسٌ خَمْسٌ مَنْ زخموں سے ہڈی کھل جائے ان کی دیت پانچ اونٹ
الْإِبِلِ“. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ. وَزَادَ أَحْمَدُ: ہیں۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے) اور احمد
«وَالْأَصَابِعُ سَوَاءٌ كُلُّهُنَّ، عَشْرٌ عَشْرٌ مِنَ الْإِبِلِ، میں اتنا اضافہ ہے۔ ”تمام انگلیوں کی دیت برابر ہے
یعنی ہر انگلی کی دیت دس دس اونٹ ہے۔“ (اس روایت کو ابن خزیمہ اور ابن جارود نے صحیح قرار دیا
وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُرَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ۔ ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿المواضع﴾ میم پر فتح موصحہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی و تفسیر ابھی قریب ہی گزر چکی ہے۔ یعنی ایسا زخم جس سے ہڈی کھل جائے۔ مگر ٹوٹے نہیں۔
حاصل کلام: لڑائی کے دوران چوٹ اور زخم کی صورت میں ہڈی سے گوشت الگ ہو جائے اور ہڈی واضح طور پر کھل جائے مگر ٹوٹنے سے بچ جائے تو ایسی صورت میں شوافع، احناف اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی ہے۔ اس پر پانچ اونٹ دیت ادا کرنا لازمی ہوگا۔ ہر ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

(۱۰۱۶) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى یہ روایت بھی انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ
عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: نے فرمایا ”ذمیوں کی دیت مسلمانوں کی دیت کا
«عَقْلُ أَهْلِ الذِّمَّةِ نِصْفُ عَقْلِ نصف ہے۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے)
الْمُسْلِمِينَ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ. وَلَفْظُ أَبِي اور ابو داؤد کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ”ذمی کی
دَاوُدَ: «دِيَةُ الْمُعَاهِدِ نِصْفُ دِيَةِ دیت آزاد کے مقابلہ میں آدمی ہے“ اور نسائی کی
الْحَرِّ». وَلِلنِّسَائِيِّ: «عَقْلُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ روایت میں ہے کہ ”عورت کی دیت مرد کی دیت

فقہی تشریح: ﴿عقل المرأة الخ﴾ بل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کے زخموں کی دیت، مرد کے زخموں کی دیت کے برابر ہے تا آنکہ تہائی تک پہنچ جائے (یعنی عورت کی دیت مرد کی دیت کے ایک تہائی درجہ تک کے برابر ہے) اور اگر زخم اس سے زیادہ ہے تو عورت کا زخم مرد کے زخم کے مخالف ہو جائے گا اور اس صورت میں مرد کی دیت سے عورت کے زخم کی دیت نصف ہوگی اور یہ اس لئے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلہ میں آدمی ہے۔ اس میں سب متفق ہیں کسی اختلاف نہیں۔ مکمل دیت کے مقابلہ میں عورت کے زخم کی دیت کا مفہوم مخالف کے اصول پر قیاس کیا جائے گا۔ فقہاء میں جمہور اس طرف ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کی رائے بھی یہی ہے اور مدنی فقہاء کا قول بھی یہی ہے اور جمہور اہل مدینہ بھی اسی کے قائل ہیں اور امام مالک رضی اللہ عنہ و امام احمد رضی اللہ عنہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے معلوم ہوا کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہے۔ ذمی اس کافر کو کہتے ہیں جو اسلامی ریاست میں بطور رعایا سکونت پذیر ہو۔ البتہ عورت کی دیت زخموں میں مرد کی دیت کے مقابلہ میں آدھی ہے بشرطیکہ اس زخم کی دیت مرد کی پوری دیت کے ٹکٹ سے اوپر ہو۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک خاتون کی تین انگلیاں کٹ گئیں ان کی دیت دس اونٹ فی انگلی کے حساب سے تیس اونٹ ہوگی اور یہاں تک مرد کے برابر ہوگی اب اس خاتون کی چار انگلیاں کٹ جائیں اور مرد کی بھی چار کٹ جائیں تو مرد کی دیت چالیس اونٹ ہوں گے اور عورت کے بیس کیونکہ چالیس سو کے تہائی سے اوپر ہے اس لئے عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف رہ جائے گا۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے مگر اختلاف اور شوافع قتل اور زخموں کی صورت میں عورت کی آدھی دیت کے قائل ہیں۔

(۱۰۱۷) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «عَقْلُ شِبِّهِ الْعَمْدِ مُعَلَّظٌ، مِثْلُ عَقْلِ الْعَمْدِ، وَلَا يُقْتَلُ صَاحِبُهُ، وَذَلِكَ أَنْ يَنْزُو الشَّيْطَانُ فَيَكُونُ دَمًا بَيْنَ النَّاسِ فِي غَيْرِ ضَغِينَةٍ، وَلَا حَمْلٍ سِلَاحٍ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَعَّعَهُ.

اے ضعیف قرار دیا ہے)

نفعی تشریح: ﴿مغلط﴾ دیت مغلطہ یعنی پوری سو اونٹ دیت۔ ان میں سے چالیس اونٹیاں ایسی

772 جَنایات (جرائم) کے مسائل

جو حاملہ ہوں بچے ان کے پیٹوں میں پرورش پا رہے ہوں جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ ﴿یَنْزِرُ وَالشَّيْطَانُ﴾ نزو سے ماخوذ ہے اور یہ باب نصر ینصر ہے۔ یعنی لوگوں کے درمیان خواہ مخواہ کود پڑے گا اور ان کو باہمی لڑائی اور قتل و قتل پر آمادہ اور برا بھلا کرے گا۔ ﴿ضَغِينَةً﴾ کینہ، 'حق' عداوت۔ ﴿سِلَاحٍ﴾ یعنی ہتھیار سے قتل نہ ہو بلکہ پتھریا لاشمی وغیرہ سے ہو جس میں قصاص نہیں بلکہ دیت ہے، البتہ اس کی دیت، دیت مغلطہ ہے۔

(۱۰۱۸) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا، قَالَ: قَتَلَ رَجُلٌ اللّٰهَ تَعَالٰی عَنْهُمَا، قَتَلَ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، كَوَقْتُ لَدَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْتَهُ اَنْتَنِي عَشْرَ طے فرمائی۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے، نسائی اور أَلْفًا. رَوَاهُ الْأَزْبَعِيُّ، وَرَوَّعَ الشَّانِي وَأَبُو حَاتِمٍ ابوحاتم دونوں نے اس روایت کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔) إِسْنَانًا.

لغوی تشریح: ﴿اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا﴾ بارہ ہزار سے مراد، بارہ ہزار درہم ہے اور درہم چاندی کے سکے کو کہتے ہیں اور ان کا وزن چوالیس کلوگرام ہوتا ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دیت میں اصل تو اونٹ ہی ہیں اور یہ معلوم رہے کہ اونٹوں کے نرخ میں کمی بیشی کی وجہ سے سونے اور چاندی کے وزن میں بھی کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کے پاس اونٹ نہ ہوں تو دیت نقدی کی صورت میں بھی دی جاسکتی ہے۔ وہ مروج سکہ خواہ دینار ہو یا درہم یا کاغذی سکہ۔ اونٹ کی قیمت طے کر کے اتنی نقدی ادا کی جاسکتی ہے۔

(۱۰۱۹) وَعَنْ أَبِي رِمَّةَ قَالَ: حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ میرا بیٹا أَنَبْتُ النَّبِيَّ ﷺ، وَمَعِيَ ابْنِي، بھی تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا ”یہ کون ہے؟“ میں فَقَالَ: «مَنْ هَذَا؟» فَقُلْتُ: ابْنِي، نے عرض کیا۔ میرا بیٹا ہے لہذا آپؐ اس پر گواہ وَأَشْهَدُ بِهِ، فَقَالَ: «أَمَّا إِنَّهُ لَا يَجْنِي عَلَيْكَ. وَلَا تَجْنِي عَلَيْهِ». رَوَاهُ الشَّانِي وَابْنُ حَزِيمَةَ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَأَبُو دَاوُدَ. (اسے نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزيمة اور ابن جابر نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿وَأَشْهَدُ بِهِ﴾ (واشہد بہ) اشد میں اس کا احتمال ہے کہ یہ سیغہ طلب ہو اور معنی ہو کہ آپ گواہ

راوی حدیث: ﴿ابودرمہ رضی اللہ عنہ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا نام حبیب بن حیان اور ایک دوسرے قول کے مطابق رفاعہ بن یثرب یا عمارہ بن یثرب بلوی یا تہی تھا۔ بنو تیم الرباب سے ہونے کی وجہ سے اور ایک قول کے مطابق تہمی ہیں امری القیس بن زید مناة بن تمیم کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان کا شمار کوئی صحابہ میں ہوتا ہے اور رمثہ کا اعراب یہ ہے کہ ”را“ کے نیچے کسرہ اور میم ساکن ہے۔ نبی ﷺ سے ان کی ملاقات حجۃ الوداع کے موقع پر ہوئی۔

دعویٰ خون اور قسامت

٢ - بَابُ دَعْوَى الدَّمِ وَالْقِسَامَةِ

(قسموں کو تقسیم کرنے) کا بیان

(۱۰۲۰) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَتْمَةَ، عَنْ رَجَالٍ مِنْ كُتُبَاءِ قَوْمِهِ، أَنَّ عِنْدَ اللَّهِ بْنِ سَهْلٍ وَمُحِيصَةَ بْنِ

حضرت سہل بن ابی حتمہ نے اپنی قوم کے بڑے
بزرگوں سے روایت بیان کی ہے کہ عبد اللہ بن
سہل اور محیسہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اپنی تنگ دستی کی وجہ

774 جنایات (جرائم) کے مسائل

مَسْعُودٍ خَرَجَا إِلَى خَيْبَرَ، مِنْ جَهْدٍ أَصَابَهُمْ، فَأَتَى مُحَبِّصَهُ، فَأَخْبَرَ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ سَهْلٍ قَدْ قُتِلَ، وَطَرِحَ فِي عَيْنِهِ، فَأَتَى يَهُودَ، فَقَالَ: أَنْتُمْ وَاللَّهِ قَتَلْتُمُوهُ، قَالُوا: وَاللَّهِ مَا قَتَلْنَاهُ، فَأَقْبَلَ هُوَ، وَأَخُوهُ حُوَيْصَةُ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنِ سَهْلٍ، فَذَهَبَ مُحَبِّصُهُ لِيَتَكَلَّمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كَبُرَ كَبْرٌ»، يُرِيدُ السِّنَّ. فَتَكَلَّمَ حُوَيْصَةُ، ثُمَّ تَكَلَّمَ مُحَبِّصُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّمَا أَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ، وَإِنَّمَا أَنْ يَأْذَنُوا بِحَرْبٍ»، فَكَتَبَ إِلَيْهِمْ فِي ذَلِكَ كِتَابًا، فَكَتَبُوا: إِنَّا وَاللَّهِ مَا قَتَلْنَاهُ، فَقَالَ لِحُوَيْصَةَ، وَمُحَبِّصَةَ، وَعَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ سَهْلٍ: «أَتَحْلِفُونَ، وَتَسْتَحِقُّونَ دَمَ صَاحِبِكُمْ؟» قَالُوا: لَا، قَالَ: «فِيَحْلِفْ لَكُمْ يَهُودُ»، قَالُوا: لَيْسُوا مُسْلِمِينَ، فَوَدَّاهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهِ، فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ مِائَةَ نَاقَةٍ، قَالَ سَهْلٌ: فَلَقَدْ رَكَّضْتَنِي مِنْهَا نَاقَةٌ حَمْرَاءُ. مَقْمَقٌ عَلَيْهِ.

سے خیر کی طرف نکلے۔ پس محیصہ نے آکر اطلاع دی کہ عبد اللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اسے ایک چشمہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ محیصہ رضی اللہ عنہ یہود کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کی قسم تم لوگوں نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ بولے اللہ کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ پھر محیصہ اور اس کا بھائی حویصہ اور عبد الرحمن بن سہل (رضی اللہ عنہم) تینوں رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پہنچے اور محیصہ نے گفتگو کرنی چاہی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بڑے کو بات کرنے دو بڑے کو۔“ آپ کی مراد تھی جو تم میں عمر میں بڑا ہے اسے بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ حویصہ رضی اللہ عنہ نے بیان دیا پھر محیصہ بولا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”وہ لوگ یا تو تمہارے صاحب و ساتھی کی دیت ادا کریں گے یا جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔“ پھر اس سلسلہ میں آپ نے ان کو خط تحریر فرمایا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اللہ کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ نے حویصہ، محیصہ اور عبد الرحمن بن سہل (رضی اللہ عنہم) سے فرمایا ”کیا تم لوگ قسم کھا کر اپنے صاحب کے خون کے حقدار بنو گے؟“ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ”تم کو یہودی قسم دیں؟“ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو مسلمان نہیں ہیں (اس لئے ان کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں) پس پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کی دیت اپنے پاس (بیت المال) سے دی اور ان کو سو اونٹنیاں بھیج دیں۔ سہل رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ان میں سے ایک سرخ رنگ کی اونٹنی نے

مجھے لات ماری۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب دعوی الدم والقسمہ﴾ قسمہ کے ”قاف“ پر فتح اور تخفیف السین اور ”اقسم“ کا مصدر ہے اور یہاں اس سے مراد قسم ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فقہاء کے نزدیک یہ ایمان کا اسم ہے اور اصل لغت کے نزدیک قسمیں اٹھانے والوں کے لئے نام ہے اور قسامت کی صورت یوں ہوتی ہے کہ کوئی مقتول آدمی کسی بستی یا شہر میں پایا جائے اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو اور اس کے قتل پر کوئی گواہ بھی کھڑا نہ ہو۔ لیکن مقتول کا ولی اس کے قتل کا الزام کسی آدمی یا جماعت پر لگائے اور ان کے خلاف کنزور ثبوت ہو۔ جو ظن پر غالب آ رہا ہو تو پھر مدعی سچا ہے۔ گویا مقتول ان کے محلہ میں پایا گیا اور مقتول اور ان کے مابین دشمنی تھی تو پھر مقتول کے اولیاء سے ان کے خلاف پچاس قسمیں کھانے کا حکم دیا جائے گا پس اگر ان لوگوں نے قسمیں کھالیں تو دیت کے مستحق قرار پائیں گے جبکہ قتل خطاء یا قتل شبہ عمد ہو گا اور اگر قتل عمد کیا گیا ہو تو امام مالک اور امام شافعی کا قدیم قول اور امام احمد اور اسحاق کے نزدیک وہ قصاص کے مستحق ہونگے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے صحیح ترین قول کے مطابق قتل عمد میں بھی وہ دیت لینے کے مستحق ہوں گے اور جب مقتول کے اولیاء اعراض کریں اور قسم اٹھانے سے گریز کریں اور پیچھے ہٹیں تو پھر جس پر انہوں نے دعویٰ دائر کیا ہے، ان کو قسم اٹھانے کا حکم دیا جائے کہ وہ اس بات کی قسم کھائیں کہ انہوں نے قتل نہیں کیا۔ اور نہ ان کو علم ہے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ پس اگر قسم کھالیں تو وہ بری قرار پائیں گے۔ ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی اور اگر انہوں نے قسم کھانے سے گریز کر لیا اور منہ پھیر لیا تو ان پر دیت لازم کر دی جائے گی۔ ﴿من جھد﴾ جھد کے جیم پر فتح اور ضمہ دونوں طرح۔ یعنی مشقت کی بنا پر اور تنگ دستی، گزران کی وجہ سے۔ ”فاتی محبصہ فاجبر“ اتی اور اخیر دونوں فعل صیغہ مجہول ہیں۔ ”قد قتل وطرح“ دونوں صیغہ مجہول۔ طرح کے معنی ڈال دیا پھینک دیا گیا۔ ”فاقبل“ یعنی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ﴿فذهب محبصہ لیتکلم﴾ محبصہ نے گفتگو کرنی چاہی۔ اس نے صرف جلدی سے گفتگو اس لئے کرنے کا ارادہ کیا کہ یہ اس واقعہ قتل میں حاضر تھا اور اپنے بھائی حویصہ سے عمر میں چھوٹا تھا ﴿کبر کبر﴾ تکبر سے صیغہ امر ہے۔ یعنی بڑے کو آگے بڑھاؤ اور بڑے کے حق میں بڑائی کا لحاظ رکھو تاکہ وہ تجھ سے پہلے بات کرے۔ ﴿یرید السن﴾ یہ دوران گفتگو اور اراج ہے اور کبر کی تفسیر ہے۔ اس کلام سے مراد یہ تھی جو عمر میں بڑا ہے اسے بات کرنی چاہئے ﴿اما ان یدوا صاحبکم﴾ یعنی تمہارے مقتول بھائی کی دیت دیں گے۔ فاعل کی ضمیر یہود کی جانب راجع ہے ﴿یدوا﴾ ”یا“ پر فتح اور دال پر ضمہ یہ ”ودی یدی دیہ“ باب ضرب یضرب سے مضارع کا صیغہ ہے۔ ﴿واما ان یاذنوا﴾ یا پھر وہ اعلان کر دیں گے ﴿بحرب﴾ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا۔ ﴿فکذب الیہم﴾ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف نوشتہ تحریر فرمایا ﴿فیحلف لکم یہود﴾ پس یہود اپنے خلاف تمہارے دعویٰ کو قسم کھا کر باطل کر دیں گے۔ ﴿لیسوا

776 جَنایات (جرائم) کے مسائل

المسلمین ﴿ وہ تو مسلمان ہی نہیں لہذا ہم ان کی قسموں پر راضی نہیں ہوں گے۔ ﴾ فوداہ ﴿ پس آپ نے خود اس کی دیت ادا فرمادی رکضتسی اونثی نے اپنی لات مجھے رسید کردی اور قسم مقتول کے اولیاء کے ذمہ پس اگر وہ گریز و اعراض کریں تو پھر جن پر دعویٰ دائر کیا گیا ہے اور وہ جب قسم کھالیں گے تو بری ہو جائیں گے اور ان پر کسی قسم کی کوئی چیز عائد نہیں ہوگی۔

حاصل کلام : اس حدیث سے قسامت کا ثبوت ملتا ہے اور قسامت یہ ہے کہ قاتل کا کسی طرح پتہ نہ چلنے کی وجہ سے مشتبہ اشخاص یا قوم سے قسم لی جائے کہ انہوں نے قتل نہیں کیا اور ان کو اس کے قاتل کا علم بھی نہیں۔ یہ رسم دور جاہلیت میں بھی تھی اسلام نے اسے جائز رکھا۔ اس میں پچاس آدمیوں کی قسمیہ شہادت ہوتی ہیں کہ ہم نے یا ہمارے قبیلہ نے یا ہمارے گاؤں نے اسے قتل نہیں کیا۔ معلوم رہے کہ یہ قسم صرف خون کے مقدمہ میں ہوتی ہے باقی حدود کے مقدمات میں قسامت ہوتی ہی نہیں۔ قسامت دونوں جانب سے ہو سکتی ہے اگر مقتول کے اولیاء و ورثاء ثبوت پیش کر دیں یا عدم ثبوت کی صورت میں قسم دے دیں کہ ہمارے مقتول کے قاتل یہی ہیں تو مدعا علیہ پر دیت لازم ہو جاتی ہے اور اگر مدعی ان دونوں باتوں سے قاصر ہوں تو مدعا علیہ یا مدعا محکم پچاس قسمیں دے دیں تو وہ بری ہو جاتے ہیں اور قسمیں ان حضرات کی تسلیم ہوں گی جن کو مدعی منتخب کرے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجتماعی معاملات پر عمر رسیدہ کو بات پہلے کرنی چاہئے۔

راوی حدیث : ﴿ عبد اللہ بن سہل رضی اللہ عنہ ﴾ عبد اللہ بن سہل بن زید بن کعب بن عامر انصاری حارثی۔ خیبر میں قتل کئے گئے اور ایک چشمہ میں پائے گئے کہ ان کی گردن توڑ دی گئی تھی۔ ﴿ محیصہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوسعید محیصہ بن مسعود بن کعب الحارثی انصاری مدنی۔ عبد اللہ بن سہل مقتول کے چچا زاد بھائی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ غزوات احد و خندق اور ان دونوں کے بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فدک کی طرف بھیجا تھا تاکہ ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔

﴿ حویصہ رضی اللہ عنہ ﴾ محیصہ کے بڑے بھائی ۳ھ میں اسلام قبول کیا۔ احد اور خندق بلکہ باقی تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک رہے۔

﴿ عبد الرحمن بن سہل رضی اللہ عنہ ﴾ یہ عبد اللہ بن سہل کے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام لیلیٰ بنت نافع بن عامر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بدر و احد اور باقی تمام غزوات و مشاہدات میں شریک رہے۔ یہ وہ صاحب تھے جن کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ عمارہ بن حزم نے نبی ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کو جھاڑ پھونک کی۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصحاب میں اس بارے میں تردد کا اظہار کیا ہے اور اسے بعید تصور کیا ہے۔

(۱۰۲۱) وَعَنْ رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ أَيْكَ انصاری صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے زمانہ جاہلیت کی قسامت کو برقرار رکھا اور

حاصل کلام: اس حدیث سے زمانہ جاہلیت کی رسم قسامت کا علم ہوتا ہے۔ پھر اسی قسامت کو آپؐ نے برقرار رکھا۔ قسامت کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک قریشی نے ایک ہاشمی کو قتل کر دیا جب معاملہ سنگین صورت حال اختیار کر گیا تو قاتل نے انکار کر دیا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ اس موقع پر ابو طالب نے کھڑے ہو کر تین باتیں ان کے سامنے رکھیں کہ تینوں میں سے کوئی ایک منتخب کر لویا تو ہمیں دیت ادا کر دیا یا پچاس آدمیوں کی قسمیں دے دیا ہم تجھے قتل کریں گے، ہمارا قاتل تو ہی ہے۔ اس روز سے قتل کے بارے میں قسامت کا رواج جاری ہوا اور آج تک جوں کا توں چلا آرہا ہے۔ اگر مدعا علیہم قسمیں دے دیں تو بلا اتفاق ان پر کوئی دیت نہیں۔ اس معاملہ میں شریعت نے کافر کی قسم کو بھی تسلیم کیا ہے۔ یہ معلوم رہے کہ صرف مدعی کے کہنے پر قسموں کا آغاز نہیں ہوگا تاوقتیکہ دیگر شہادت اس کی تائید نہ کریں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دور جاہلیت کی اچھی چیز کو اسلام نے برقرار رکھا۔

۳ - بَابُ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ۔
 باغی لوگوں سے جنگ و قتال کرنا

(۱۰۲۲) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السَّلَاحَ خِلَافَ تَهْطِيرِ أَهْلِنَا، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔» فَلَيْسَ مِنَّا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب القتال اہل البغی﴾ 'بغی کی با پر فتنہ اور غین ساکن۔ اس کے معنی ہیں ظلم اور حق و صداقت سے اعراض کرنا اور اس سے مراد مسلمان امراء اور ان کے خلفاء کے خلاف ان کی مسلمان رعایا کا خروج و بغاوت۔

حاصل کلام: اسلام مسلمانوں کو باہمی اخوت، محبت اور بھائی چارہ سے رہنے کا درس دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے خیر خواہی اور ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا سبق پڑھاتا ہے۔ اس حدیث میں مسلمان کا مسلمان کے خلاف اسلحہ کا استعمال کرنا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو آدمی ہم پر ہتھیار اٹھائے اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔“ مسلمان کا کام تو امداد باہمی ہے نا کہ لڑائی کرنا، یہ معاملہ مسلمانوں کی باغی جماعت سے ہے۔ جو لوگ معاشرے کا امن و امان غارت کرنے کی سعی کریں ان سے قرآن کی رو سے لڑائی کرنا چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنی

778 جنایات (جرائم) کے مسائل

باغیانہ روش سے باز آجائیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے ”فقاتلوا التي تبغى حتى تنفي الى امر الله“ باغی گروہ سے اس وقت تک لڑو کہ وہ اپنی باغیانہ روش سے امر الہی کی طرف پلٹ آئیں۔ بکثرت احادیث بھی اس کی تائید میں ہیں۔

(۱۰۲۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ، كَمَا أَوْرَأَ الْمُسْلِمُونَ فِي جَمَاعَةٍ مِنْ جَدَا أَلْغَ هُوَ كَمَا أَوْرَأَ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ، وَمَاتَ، فَمِيتَتُهُ مِيتَةُ أَسَى حَالَتِ فِيهِ اسْ بِرْمُوتٍ وَارِدَتْ هُوَ كُنَى تَوَاسِ كِي يَهْ جَاهِلِيَّةً». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. موت جاہلیت کی موت ہوگی۔“ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿من خرج عن الطاعة﴾ یعنی امیر وقت کی اطاعت یا اس خلیفہ وقت کی اطاعت سے جس کی خلافت پر سب کا اتفاق ہے۔ خواہ وہ کسی علاقہ یا کسی مملکت میں ہو۔ ﴿وفارق الجماعة﴾ اس جماعت کو خیر باد کہہ دیا جو مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس امیر کی اطاعت پر مجتمع و متفق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے آدمی مسلمانوں کی جماعت سے بعض اختلافات کی وجہ سے الگ ہو جائے۔ صرف علیحدگی ہی اختیار کی ہو، باغیانہ روش اختیار نہ کی تو اس کے اس طرز عمل کی بنا پر اس سے لڑائی نہیں کی جائے گی۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑے رکھا جائے تا وقتیکہ وہ باغیانہ طرز زندگی پر نکل کھڑا ہو۔ جب وہ ایسی روش پر چلے گا تو اس سے لڑائی کی جائے گی۔ یہ معلوم رہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ کسی صریح اور بالکل واضح حکم شریعت کے خلاف حکم نہ دے اور اس کی بیعت توڑنے کی اس وقت تک اجازت نہیں جب تک کہ صریح کفر و الحاد کے اختیار کرنے کا حکم نہ دے اور خود یہ کام نہ کرنے لگے۔ پابند شرح امیر و خلیفہ کی نافرمانی بغاوت ہے۔ لہذا جو ایسے امیر کی اطاعت سے نکل کر مسلمانوں سے الگ ہو جائے تو ایسے آدمی کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ ایسی موت کو گمراہی کی موت تو کہہ سکتے ہیں کفر کی موت نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باغی مسلمانوں سے لڑنا جائز ہے۔ مگر یہ لڑنا حکومت کا کام ہے۔ انفرادی طور پر لڑنا تو معاشرے کے امن و امان کو تہہ و بالا کرنا ہے۔ جس کی اسلامی حکومت اجازت نہیں دے سکتی۔

(۱۰۲۴) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَقْتُلُ عَمَارًا الْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ». (مسلم)

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لعنوی تشریح: ﴿عمارا﴾ ابن یاسر وہ ہیں۔ یاسر مشہور و معروف صحابی کائنات جگر ﴿الفنہ﴾ ”قا“ کے نیچے سرہ اور ہمزہ پر فتح۔ معنی اس کے ہیں جماعت گروہ۔

779 جَنایات (جرائم) کے مسائل

حاصل کلام: عام مؤرخین کا خیال ہے کہ عمار کو جنگ صفین کے روز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو آپس میں لڑانے والا وہی باغیوں کا گروہ تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں باغیوں کا وہ گروہ موجود تھا اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے۔ دوران جنگ اسی باغی گروہ نے جو مسلمانوں کو آپس میں الجھا کر ہی رکھنا چاہتا تھا، نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کر دیا اور حضور ﷺ کی پیشین گوئی بھی اسی گروہ کے بارے میں ہے۔ اسی حدیث کی آڑ میں روافض اور ان کے کئی ہمنوا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور اسی دروازے سے وہ صحابہؓ کو برا بھلا کہنے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔ اس معاملے میں بہت سنبھل کر بات کرنی چاہیے کیونکہ یہ صحابہ کرامؓ کا معاملہ ہے۔ جن کے اللہ نے سارے گناہ معاف کر رکھے ہیں۔

(۱۰۲۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «هَلْ تَذَرِي، يَا ابْنُ أُمِّ عَبْدِ اللَّهِ ﷺ؟» قَالَ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ. قَالَ: «لَا يُجْهَرُ عَلَى جَرِيحِهَا، وَلَا يُقْتَلُ أَسِيرُهَا، وَلَا يُطْلَبُ هَارِبُهَا، وَلَا يُقَسَّمُ فِيْئَتُهَا». رَوَاهُ النَّزَّارُ وَالْحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ، فَزَوَّجَهُمُ، لِأَنَّ فِي إِسْنَادِهِ كُؤُوزَ بَيْنَ حَكِيمِهِ، وَهُوَ مَثْرُوكٌ. وَصَحَّ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ طَرَفٍ نَحْوُهُ مَوْقُوفًا. أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے ام عبد کے بیٹے! کیا تجھے معلوم ہے کہ اس امت کے باغی کے متعلق اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کیا حکم ہے؟“ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”اس کے زخیوں کو ختم نہیں کیا جائے گا اور نہ جریحہا، وَلَا يُقْتَلُ أَسِيرُهَا، وَلَا يُطْلَبُ هَارِبُهَا، وَلَا يُقَسَّمُ فِيْئَتُهَا۔“ والے کا پیچھا و تعاقب کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے مال غنیمت کو تقسیم کیا جائے گا۔“ (اس روایت کو بزار اور حاکم دونوں نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر یہ حاکم کا وہم ہے اس لئے کہ اس کی سند میں کوثر بن حکیم متروک راوی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوف اس کی مانند کئی طرق سے مروی ہے جو صحیح ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ اور حاکم نے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿یا ابن ام عبد﴾ ابن ام عبد سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں کیونکہ وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ گویا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے یا نبی ﷺ کو حدیث بیان فرماتے سنا ہے۔ (بل) ﴿لا یجھز﴾ یہ اور اس کے بعد کے افعال صیغہ مجہول ہیں۔ یعنی زخمی پر سختی نہیں کی جائے گی اور نہ اسے قتل کیا جائے گا ﴿ولا یقسم فیئہا﴾ باغیوں کے اموال بطور مال غنیمت تقسیم نہیں کئے

780 جَنَایَات (جرائم) کے مسائل جائیں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں کوثر بن حکیم ایسا راوی ہے جس کے ضعیف ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ باغیوں سے نبرد آزما ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ بالاتفاق ان سے جنگ جائز ہے لیکن ان کے اموال، مویشی لوٹنے اور ان کے زخمیوں کو قتل کرنے اور مفرور کا تعاقب کرنے میں اختلاف ہے۔ تفصیل کیلئے سبل السلام ملاحظہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿کوثر بن حکیم﴾ عطاء اور مکحول سے یہ بات ثابت ہے کہ کوئی حلب میں رہتا تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ یہ کوئی شے نہیں۔ اور امام احمد کہتے ہیں کہ اس کی روایات باطل ہیں۔

(۱۰۲۶) وَعَنْ عُرْفَجَةَ بْنِ شُرَيْحٍ حَضْرَتِ عُرْفَجَةَ بْنِ شُرَيْحٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ أَتَاكُمْ، وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ، يُرِيدُ أَنْ يَفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ، فَاقْتُلُوهُ». أَخْرَجَهُ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب سب مسلمان ایک شخص کو اپنا خلیفہ و حاکم مقرر کر لیں پھر جو مسلمانوں کے مابین تفریق و تشتت کیلئے سرگرمی دکھائے اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کرے وہ واجب القتل ہے۔

راوی حدیث: ﴿عرفجہ بن شریح رضی اللہ عنہ﴾ عین پر فتح، فافتحہ اور راسکن۔ بعض نے ان کے باپ کا نام صریح یا طریح اور شریک و ذریح وغیرہ بھی ذکر کیا ہے۔ اشجع قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے انہی کو کھلائے۔ مشہور صحابی ہیں۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔

۴ - بَابُ قِتَالِ الْجَانِي وَ قَتْلِ الْمُرْتَدَّةِ
مجرم (بدنی نقصان پہنچانے والے) سے لڑنے اور مرتد کو قتل کرنے کا

بیان

(۱۰۲۷) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ قَتَلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ قَتَلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو وہ شہید ہے۔“ (اسے ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا

وَالْتَرْذِيذُ، وَصَحْحُهُ. (ہے۔)

لعنوی تشریح: ﴿باب قتال الجانی... الخ﴾ "جانی" - جنسیت سے ماخوذ ہے یعنی جرم اور "جانی" مجرم کو کہتے ہیں۔ ﴿المرتد﴾ - اور مرتد - اسلام سے پھر جانے والے کو کہتے ہیں۔ ﴿دون ماله﴾ دون مال کا مطلب ہے اپنے مال کی حفاظت اور اس کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے۔ اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جو آدمی دوسرے کا مال و متاع سلب کرنے اور چھیننے کا ارادہ رکھتا ہو اس سے لڑنا جائز ہے اور مال کا مالک اگر اس دفاعی لڑائی میں مارا جائے تو وہ شہید ہے اور اگر مال کے مالک سے حملہ آور قتل ہو جائے تو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت دینا پڑتی ہے اور نہ کسی قسم کا گناہ و جرم ہے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر مقاتلہ کی اجازت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا "بتائیے اگر کوئی آدمی میرا مال حاصل کرنے کے ارادہ سے آتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تم اسے مت دو۔ اس نے پھر پوچھا اگر وہ میرے ساتھ لڑائی کرے؟ تو آپ نے فرمایا "تم اس سے لڑو" اس نے پھر عرض کیا اگر وہ مجھے قتل کر دے؟ تو آپ نے فرمایا "تم شہید ہو" اس نے پوچھا اگر میں اسے قتل کر دوں؟ تو فرمایا "وہ آگ میں داخل ہوگا" یہ حکم مالی معاملات میں ہے۔ مالیات کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی احادیث وارد ہیں۔ ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے مال و متاع اور اپنی جان، اپنے خون اور اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

(۱۰۲۸) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ حَصِينٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَاتَلَ بَنَ امِيَّةٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا فِي بَعْضِ أَحَدُهُمَا نَعْلِي بْنُ أُمَيَّةَ رَجُلًا، فَعَصَّ أَحَدُهُمَا نَعْلِي بْنُ أُمَيَّةَ رَجُلًا، فَتَنَزَعَ يَدَهُ مِنْ فَمِهِ، فَتَنَزَعَ اس کے منہ سے کھینچ کر باہر نکالا تو اس کا سامنے کا ثِيْبَتُهُ، فَأَخْتَصَمَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «يَبْعُضُ أَحَدُكُمَ أَخَاهُ، كَمَا عَدَالَتِ فِي لِي كُنْتُ. تَوَأْبُ نِي فَرَمَا كِيَا تَم اِيك يَبْعُضُ الْفَحْلُ؟ لَا دِيَةَ لَهُ». مَنَقَى عَلَيْهِ، دوسرے کو اس طرح کاٹ کھاتے ہو جس طرح نر وَالْفَلَقُ لِيُسْلِمِهِ. اونٹ کاٹتا ہے۔ اس کیلئے کوئی دیت نہیں۔

(بخاری و مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿فعض﴾ عض بعض باب مع سے ہے۔ اس نے اپنے دانتوں سے اسے کاٹا۔ "فسنع" زور سے ہاتھ کھینچنے کی وجہ سے اس کے سامنے کا دانت جڑ سے اکڑ گیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے نقصان اور ضرر کو دور کرنے کیلئے اگر کوئی جرم ہو جائے تو وہ جرم قاتل مؤاخذہ نہیں۔ جمہور کا یہی مذہب ہے البتہ اس کیلئے دو

782 جَنَائِت (جرائم) کے مسائل

شرطیں ہیں ایک یہ کہ اس تکلیف سے جسم میں درد ہوتا ہو دوسری یہ کہ اس کے بغیر جان چھڑانے اور خلاصی پانے کی کوئی دوسری صورت نظر نہ آتی ہو گویا ان دونوں شرطوں میں سے اگر کوئی بھی نہ پائی جائے تو پھر اس صورت میں دیت ہوگی۔ (السیل)

(۱۰۲۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ أَبُو الْقَاسِمِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: «لَوْ أَنَّ أَمْرًا أُطْلِعَ عَلَيْكَ بِغَيْرِ إِذْنٍ، فَحَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ، لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ مُنْتَقًى عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ وَالتَّائِبِينَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ: «فَلَا دِيَّةَ لَهُ وَلَا قِصَاصَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو القاسم رحمہ اللہ نے فرمایا ”اگر کوئی مرد تیرے گھر بغیر اجازت کے جھانکے (نظر ڈالے) اور تو کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔“ (بخاری و صحیح مسلم) احمد اور نسائی کے الفاظ ہیں جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ ”نہ اس کی دیت ہے اور نہ والتائبین، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ: «فَلَا دِيَّةَ لَهُ وَلَا قِصَاصَ».

لعنوی تشریح: ﴿فحذفته بحصاة﴾ تو اسے کنکری مارے۔ ﴿ففقات عينه﴾ اس کی آنکھ پھوڑ کر اسے کاٹا بنا دے۔ اگر کوئی اس غلطی کا ارتکاب کرے اور مالک مکان کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ ہی دیت ہے۔ کیونکہ اس شخص نے دوسرے کی پردہ داری کو نقصان پہنچایا اور مالک مکان کی خلوت و تنہائی میں دخل اندازی کی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ اس کی دیت دینے کے قائل ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔

(۱۰۳۰) وَعَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّ حِفْظَ الْحَوَائِطِ بِالنَّهَارِ عَلَى أَهْلِهَا، وَأَنَّ حِفْظَ الْمَاشِيَةِ بِاللَّيْلِ عَلَى أَهْلِهَا، وَأَنَّ عَلَى أَهْلِ الْمَاشِيَةِ مَا أَصَابَتْ مَاشِيَتُهُمْ بِاللَّيْلِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَقِيُّ، إِلَّا التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَفِي إِسْنَادِهِ اخْتِلَافٌ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ ”دن کے اوقات میں باغوں کی حفاظت و نگرانی مالکان بلوغ کریں اور رات کے اوقات میں مویشیوں کی حفاظت و نگرانی مالکان مویشی کریں۔ رات کے اوقات میں جس قدر مویشی کسی کا نقصان کریں گے اس کا تاوان مویشیوں کے مالکان پر ہوگا۔“ (اس حدیث کو احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے تاہم اس کی سند میں اختلاف ہے)

لعنوی تشریح: ﴿الحوائط﴾ یعنی پانٹ۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جانور دن کے اوقات میں جو نقصان کریں اس کا کوئی تاوان نہیں۔ البتہ اگر ان جانور کے ساتھ سوار ہو یا

783 جنایات (جرائم) کے مسائل

ان جانوروں کے آگے پیچھے آدمی ہو تو اس صورت میں جمہور علماء بقدر نقصان تاوان کے قائل ہیں اور اگر نقصان رات کو کیا ہو تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مطابق بقدر نقصان تاوان و ضمان جانوروں کے مالک کو ادا کرنا ہوگا اور امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ ضمان و تاوان اس صورت میں ہوگا جب مویشیوں کے مالک نے ان کی حفاظت میں کوتاہی و کمی کی ہوگی۔ بصورت دیگر نہیں۔ دن اور رات کے تاوان میں اس لئے فرق کیا گیا ہے کہ بالعموم باغوں کے مالک دن کے اوقات میں خود حفاظت کرتے ہیں اور مویشیوں کے مالک ان کی حفاظت رات کے اوقات میں۔ پس جس نے اس عادت کی مخالفت کی تو وہ حفاظت کی راہ و رسم سے خارج ہوگا۔ سب السلام میں ہے کہ مالکیہ یہ قید لگاتے ہیں کہ جب مویشیوں کو ان کے چرنے کی مقررہ جگہوں میں چرنے کیلئے چھوڑا جائے تو ضمان نہیں۔ رہا اس وقت جبکہ وہ کاشت شدہ زمین میں چھوڑا جائے اور ان کے چرنے کی جگہ نہ ہو تو پھر ایسی صورت میں وہ دن اور رات میں ضامن ہوں گے۔

(۱۰۳۱) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي رَجُلٍ
أَسْلَمَ، ثُمَّ تَهَوَّدَ - : لَا أَجْلِسُ حَتَّى
يُقْتَلَ، فَضَاءَ اللَّهُ وَرَسُولِهِ، فَأَمَرَ بِهِ
فَقُتِلَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ:
«وَكَانَ قَدْ اسْتَيْبَ قَبْلَ ذَلِكَ».

حضرت معاذ بن جبل رحمہ اللہ سے ایسے شخص کے متعلق جو پہلے اسلام لایا پھر یہودی ہو گیا، تھا مروی ہے کہ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا تاوقتیکہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے قتل کا حکم دیا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم) ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اسے قتل سے پہلے توبہ کرنے کے لئے کہا گیا۔

لعوی تشریح: ﴿ثم تهود﴾ باب تفعّل سے ہے۔ یعنی اسلام سے مرتد ہو کر یہودی بن گیا۔ ﴿لا اجلس﴾ اس حدیث میں حضرت معاذ رحمہ اللہ کے نہ بیٹھنے کا قصہ بیان ہوا ہے جو یہ ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ رحمہ اللہ سے پہلے حضرت ابوموسیٰ اشعری رحمہ اللہ کو یمن پر عامل (گورنر) بنا کر بھیجا۔ ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رحمہ اللہ کو بھی بھیج دیا۔ جب حضرت معاذ رحمہ اللہ ابوموسیٰ اشعری کے پاس پہنچے تو انہوں نے معاذ رحمہ اللہ کو سواری سے نیچے اترنے کیلئے کہا اور ان کیلئے تکیہ لگایا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاس ایک آدمی بندھا ہوا ہے۔ حضرت معاذ رحمہ اللہ نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے یا یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ شخص پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہوا مگر اب پھر یہودی ہو گیا ہے اور گندے دین کی طرف پلٹ گیا ہے۔ حضرت معاذ رحمہ اللہ نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک اسے قتل نہ کر دیا جائے گا اور ابوداؤد میں ہے کہ میں اپنی سواری سے اس وقت تک نیچے نہیں اتروں گا جب تک اسے قتل نہیں کر دیا جائے گا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ یہ معنی اس صورت میں ہے جب ”فضاء اللہ ورسولہ“ کو مرفوع پڑھا جائے۔ اس صورت میں یہ خبر ہوگی، مبتداء

784 جنایات (جرائم) کے مسائل

محذوف ہوگا جو اس طرح ہوگا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ و فرمان ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ”من بدل دینہ فاقتلوه“ کی جانب اشارہ تھا اور نصب بھی جائز ہے اس صورت میں یہ مصدر ہوگا اور اس کا فعل محذوف ہوگا۔ ﴿استتیب﴾ صیغہ مجہول یعنی اس سے اسلام کی جانب رجوع کرنے، پلٹ آنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرتد کو سزائے ارتداد سے پہلے توبہ کا موقع دیا جائے گا اور اسے توبہ کیلئے باقاعدہ کہا جائے گا۔ جمہور علماء کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ مگر بعض دوسرے علماء اور ظاہرہ اسے واجب تسلیم نہیں کرتے۔ اس حدیث میں لفظ من عام ہے یعنی مرتد مرد ہو یا عورت دونوں کو پلٹ آنے کی دعوت دینے کے بعد ان کے انکار پر مصر رہنے کی صورت میں قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی عورت کو اس کے ارتداد کی سزا میں قتل کیا گیا۔ اس وقت کثیر صحابہ کرامؓ موجود تھے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ مرتد کے قتل پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ اس واقعہ سے درج ذیل مسائل بھی ثابت ہوتے ہیں:

(۱) عالموں (گورنروں) کا تقرر امیر ریاست کو کرنے کا حق حاصل ہے۔ (۲) ایک وقت میں دو عالموں کا تقرر بھی جائز ہے۔ (۳) گورنر کا فرض ہے کہ مرتد کو سزائے ارتداد دے اور شرعی حدود نافذ کرے۔ (۴) اپنی تقرری کی جگہ سواری پر جانا ثابت ہے۔ (۵) مرکز سے مقرر کردہ گورنر و وزیر کا احترام بھی کرنا چاہئے۔ (۶) شرعی سزا کے نفاذ میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے جبکہ تحقیق و تفتیش کی کارروائی مکمل ہو چکی ہو۔ (۷) مجرم کو جکڑنا جائز ہے۔ (۸) سزا کا اجرا و نفاذ لوگوں کی موجودگی میں کرنا چاہئے تاکہ عبرت حاصل ہو۔

(۱۰۳۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ”جَوْ هُفْصِ ابْنِ دِينَ بَدَلَ لِي أَسَ اللَّهُ ﷻ: ”مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ“۔ قتل کر دو۔“ (بخاری)

رَوَاهُ الشَّارِئُ.

حاصل کلام: یہ حدیث بھی صریح اور واضح دلیل ہے کہ مرتد کی سزا شرعاً قتل ہے۔ خواہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اب اگر کوئی علی الاعلان مرتد ہو جائے تو عدالت اس کے ثبوت کے بعد قتل کی سزا دے گی اور اسے قتل کر دیا جائے گا البتہ اگر وہ ظاہری نہیں بلکہ اندرونی طور پر مرتد ہے اس کے ارتداد کا علم نہیں تو اسے قتل کی سزا نہیں دی جائے گی اور اگر اس کو بزور اور جبراً کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو ایسی صورت میں بھی ایسا شخص مستوجب سزا نہیں۔

(۱۰۳۳) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ أَعْمَى كَانَتْ لَهُ أُمٌ وَلَدَتْ نَابِيَا هُفْصِ تَهَا اس کی ایک ام ولد لونڈی رسول اللہ ﷺ کو گالی دیتی اور برا بھلا کہتی تھی۔ وہ نابینا صحابیؓ نَسْتِمُ النَّبِيَّ ﷺ، وَنَقَعَ فِيهِ، فَيَنْهَاهَا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ ایک

785 جَنایات (جرائم) کے مسائل

فَلَا تَنْتَهِي، فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ لَيْلَةٍ أَخَذَ اسے منع کرتے مگر وہ باز نہ آئی۔ ایک رات انہوں
الْمِعْوَلُ، فَجَعَلَهُ فِي بَطْنِهَا، وَانْكَأَ نے کدال لے کر اس کے پیٹ پر رکھ کر اس پر اپنا
عَلَيْهَا، فَفَتَلَهَا، فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ بوجھ ڈال کر دبایا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ بات نبی
ﷺ، فَقَالَ: «أَلَا أَشْهَدُوكُمْ أَنَّ دَمَهَا عَلَيْكُمْ تَحْتَ يَدَيْكُمْ تَحْتَ يَدَيْكُمْ تَحْتَ يَدَيْكُمْ
هَدَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَرَوَاهُ يَحْيَى. خون رائیگاں اور بیکار گیا۔“

(ابوداؤد۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿وتقع فيه﴾ یہ لفظ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی پر عیب لگایا جائے اور اس کی
مذمت کی جائے ﴿المعول﴾ میم پر کسرہ اور عین ساکن اور واؤ پر فتح۔ کدال جس سے زمین کھودی جاتی
ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی تلوار ہوتی ہے جسے آدمی اپنے کپڑوں کے نیچے چھپا سکتا ہے اور
یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوہے کا دھاری دار کانٹے والا چوڑا ہتھیار ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسا
کوڑا ہوتا ہے جس کے اندر چھوٹی سی یعنی پتلی تلوار ہوتی ہے۔ حملہ آور اسے اپنی کمر کے ساتھ مضبوطی
سے باندھتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دھوکہ دے سکے۔ ﴿اتكأ عليها﴾ اس پر اپنا بوجھ ڈال
دیا۔ ﴿هدر﴾ باطل قرار پایا۔ نہ اس کی کوئی دیت اور نہ قصاص۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کی سزا قتل ہے بلکہ امام
ابن المنذر نے کہا ہے کہ اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والا واجب القتل
ہے۔ اسی طرح ذمی غیر مسلم بھی اگر یہ جرم کرے تو اس کی سزا بھی یہی ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ
ایسے شخص کو توبہ کی سہلت بھی نہیں دینی چاہئے۔



۱۰۔ کِتَابُ الْحُدُودِ

حدود کے مسائل

زانی کی حد کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق میرا فیصلہ فرمائیں اور دوسرا جو اس کے مقابل میں زیادہ سمجھدار اور دانا تھا، نے بھی کہا کہ ہمارے درمیان آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیں۔ آپ نے فرمایا ”بیان کرو۔“ وہ بولا، میرا بیٹا اس کے ہاں مزدوری پر کام کرتا تھا، اس کی اہلیہ سے زنا کا مرتکب ہو گیا اور مجھے خبر دی گئی کہ میرے بیٹے پر رجم کی سزا ہے تو میں نے اس کے فدیے میں (بدلے میں) ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس کی جان چھڑائی۔ اس کے بعد میں نے اہل علم حضرات سے دریافت کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اس عورت کو

۱ - بَابُ حَدِّ الزَّانِي

(۱۰۳۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْأَعْرَابِ أَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أُنْشِدُكَ بِاللَّهِ إِلَّا قَضَيْتَ لِي بِكِتَابِ اللَّهِ! فَقَالَ الْآخَرُ - وَهُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ -: نَعَمْ، فَأَفْضِرْ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ، وَأَذِّنْ لِي، فَقَالَ: قُلْ، قَالَ: إِنَّ ابْنِي كَانَ عَسِيفًا عَلَى هَذَا، فَزَنَى بِأَمْرَأَتِهِ، وَإِنِّي أُخْبِرْتُ أَنَّ عَلَى ابْنِي الرَّجْمَ، فَأَقْتَدَيْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَوَلِيدَةٍ، فَسَأَلْتُ أَهْلَ الْعِلْمِ، فَأَخْبَرُونِي أَنَّ عَلَى ابْنِي جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِيبَ عَامٍ، وَأَنَّ عَلَى أَمْرَأَةٍ هَذَا الرَّجْمَ. فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا أَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللَّهِ، الْوَلِيدَةُ وَالْعَنْمُ

رَدُّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدٌ مِائَةٌ سزائے رجم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قسم ہے وَتَغْرِيبُ عَامٍ، وَاعْذُ يَا أَتَيْسُ! إِلَى اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان امرأَةٌ هَذَا، فَإِنْ اغْتَرَفَتْ فَأَرْجُمُهَا“ ہے! میں تم دونوں کے درمیان کتاب اللہ کے عین مطابق ہی فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور بکریاں تمہیں مُتَقَقَّ عَلَيْهِ، وَهَذَا اللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ۔

واپس لوٹائی جائیں گی اور تیرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی ہے۔ اے انیس! تم اس آدمی کی اہلیہ کے پاس جاؤ (اور اس سے پوچھو) اگر وہ اس کا اعتراف کر لے تو اسے سنگسار کر دو۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿کتاب الحدود﴾ حدود۔ حد کی جمع ہے۔ حد کے معنی ہیں۔ دو چیزوں کے درمیان حائل چیز جو ایک کو دوسری کے ساتھ ملنے سے مانع ہو۔ اور یہ لفظ تقدیر اور کسی مسئلے کے اختتام اور انتہاء کے لئے بھی مستعمل ہے اور شرعاً اس کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جن میں کوئی چیز مقرر و متعین ہو اور معاصی اور عقوبات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ سزائیں جو معلوم گناہوں پر مقرر و متعین ہیں اور یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ ان سزاؤں کو حدود اس لئے کہا گیا ہے کہ جرم کا ارتکاب کرنے والے کو یہ سزائیں دوبارہ جرم کرنے سے روکنے کا سبب بنتی ہیں اور دوسرے شخص بھی اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور جرم کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ ﴿انشدک﴾ باب نصر بنصر سے صیغہ متکلم ہے۔ مؤلف نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ میں آپؐ سے اللہ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں اور انشدک میں دراصل نعمنا اذکرک کے معنی ہیں اور ”با“ کو حذف کر دیا گیا ہے معنی یہ ہوا کہ میں با آواز بلند آپؐ سے گزارش کرتا ہوں۔ پھر بعد میں ہر مطلوب مؤکد کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا ہے خواہ آواز بلند ہو یا نہ ہو۔ ﴿الاقضیت لی بکتاب اللہ﴾ اس میں استثناء کے بعد فعل کا استعمال مصدری معنی میں کیا گیا ہے اور اس عبارت میں کچھ مقدر ہے اور معنی یہ ہوئے کہ میرا سوال آپؐ سے صرف یہ ہے کہ آپ فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمادیں یا یہ معنی کہ میں اللہ کا نام لے کر آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ فیصلہ کے علاوہ اور کوئی کام نہ کریں اور کتاب اللہ سے اس کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اپنے بندوں کو کیا حکم فرض فرمایا ہے؟ ﴿واذن لی﴾ مجھے بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ ﴿عسیفا علی هذا﴾ اس کے ہاں مزدور تھا اس کا کام کرتا تھا اور گھریلو ضروریات و حوائج میں خدمت انجام دیتا تھا۔ ﴿فافتدیت منه﴾ یعنی میں نے اپنے بیٹے کا فدیہ دے دیا سزائے رجم کے بدلے۔ ﴿بمانہ شاء وولیدۃ﴾ یعنی اپنے بچے کی سزائے رجم کے عوض میں نے سو بکریاں اور لونڈی اس عورت کے شوہر کو دے دی ہیں۔ ﴿جلد مائۃ﴾ جلد کی جیم پر فتح

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور غیر شادی شدہ کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔ علمائے احناف جلا وطنی کے قائل نہیں۔ مگر یہ صریح اور صحیح حدیث ان کے خلاف ہے۔ زنا کے نتیجے میں رقم دے کر راضی نامہ کرنا بھی بہر نوع غلط ہے کہ عزت و مصلحت کا تحفظ روپے سے نہیں بلکہ حدود سے ہے۔

اس کی سزا سو کوڑے اور رجم۔" (مسلم)

واللاتي ياتين الفاحشه من نسائكم فاستشهدوا عليهن اربعة منكم فان شهدوا فامسكوهن في البيوت حتى يتوفاهن الموت او يجعل الله لهن سبيلا ١٥:٤

تمہاری جو عورتیں زنا کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں روکے رکھو تا وقتیکہ ان کو موت آجائے یا اللہ تعالیٰ ان کیلئے کوئی راستہ پیدا فرما دے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو انتظار کا حکم دیا ہے اسی بنا پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”مجھ سے حاصل کر لو۔“ ﴿البکر بالبکر﴾ یعنی جب کنوارہ کنواری سے زنا کرے تو ان میں سے ہر ایک کی سزا سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی النفی کے معنی جلا وطنی ہے۔ مطلب یہ کہ اس مرد کو شہر بدر کر دیا جائے اور اسی طرح ﴿الشب بالشب الخ﴾ کا معنی ہے کہ شادی شدہ لڑکا جب شوہر دیدہ عورت سے زنا کرے تو

(۱۰۳۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَتَى رَجُلٌ مِّنَ
الْمُسْلِمِينَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، وَهُوَ فِي
الْمَسْجِدِ، فَنَادَاهُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ
اللَّهِ! إِنِّي زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ، فَتَنَحَّى
تَلَقَّاءَ وَجْهِهِ، فَقَالَ يَا رَسُولَ
اللَّهِ! إِنِّي زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ، حَتَّى
ثَنَّى ذَلِكَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا
شَهِدَ عَلَى نَفْسِهِ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ دَعَاهُ
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: «أَبُكَ
جُنُونٌ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَهَلْ
أَحْصَنْتَ؟» قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ
ﷺ: «ادْهُبُوا بِهِ، فَارْجُمُوهُ». مَتَّفَقٌ
عَلَيْهِ.

لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فَنَحَىٰ نِلْقَاءَ وَجْهِهِ﴾ جس طرف وہ تھا اس سے پھر کر اس جانب ہو گیا جو آپؐ کے رخ انور کے سامنے تھا۔ یہ آدمی ماعز بن مالک اسلمی تھا۔ انہوں نے حزال اسلمی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کے قبیلہ کی ایک لڑکی سے انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تو حزال نے اسے نبی ﷺ کی خدمت میں اس امید پر بھیج دیا کہ آپؐ اس کیلئے اس گناہ سے نکلنے کا کوئی راستہ پائیں گے۔ ﴿حَتَّىٰ نَسِيَ الْخُبْرَ﴾ چار مرتبہ کیے بعد دیگرے آپؐ کے روبرو پیش ہوا اور یہ اقرار کرتا رہا کہ میں نے زنا کیا ہے۔ ﴿اِحْصَنْتُ﴾ یہاں معمرہ استفہام محذوف ہے یعنی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا تو شادی شدہ ہے؟ حاصل کلام: اس حدیث سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ جرم زنا کا اقرار چار مرتبہ ہے حالانکہ اس

حدیث میں تو صرف اتنا ہے کہ اس نے چار مرتبہ اقرار جرم کیا ہے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ چار مرتبہ خود اقرار جرم شرط ہے؟ بلکہ سیاق تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ نبی ﷺ نے تو اعراض صرف اس اقرار میں شبہ کی وجہ سے فرمایا تھا یا اس لئے فرمایا تھا کہ وہ اپنے قول سے رجوع کر لے اور جو معاملہ ابھی تک اللہ اور اس کے درمیان میں ہے، اس سے توبہ کر لے اور اسی لئے اس کے چار مرتبہ اقرار کو کافی نہیں سمجھا۔ بلکہ بعد ازاں اس کے سامنے چند سوالات بھی رکھے جن کا تعلق مختلف پہلوؤں سے تھا اور کئی شبہات نمایاں کئے اور اسے کئی کلمات کی تلقین کی جو اسے رجوع کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ یہ اقرار اس لئے تھا کہ اس کا معاملہ بالکل متحقق ہو جائے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ اس لئے اس حدیث سے اقرار جرم میں چار مرتبہ کو شرط قرار دینا محل نظر ہے۔

(۱۰۳۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا أَتَى مَالِكٌ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ جَبَّ نَبِيٌّ ﷺ فِي خِدْمَتِهِ حَاضِرًا هُوَ تَوَّ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «أَبُوءُ بِكَ مَا لَكَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ» قَالَ: «لَعَلَّكَ قَبْلْتُ، أَوْ غَمَزْتُ، أَوْ وَكَنْتَ» قَالَ: «لَا، يَا رَسُولَ اللَّهِ! اس نے کہا، نہیں اے رسول اللہ ﷺ! (بخاری) رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿قبلت﴾ تفہیل سے ہے۔ بوسہ لیا ہو گا تو نے ﴿او غمزت﴾ باب ضرب بضرب اور یہ آنکھ یا ابرو کے اشارہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چھونے اور ہاتھ کے روکنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور یہاں بھی ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ مراد ہے اور بعض روایات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک زانی صاف اور صریح الفاظ سے اقرار جرم اپنی آزادی و مرضی سے نہ کرے اور بیرونی و اندرونی کسی قسم کے دباؤ میں نہ ہو اس وقت تک اسے سنگسار کرنے کا حکم نہ دیا جائے۔

(۱۰۳۸) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ خَطَبَ، فَقَالَ: إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ، وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ فِيمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْهِ آيَةَ الرَّجْمِ، قَرَأْنَاهَا، وَوَعَيْنَاهَا، وَعَقَلْنَاهَا، فَرَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ، فَأَخْشَى إِنَّ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خطاب فرمایا اور کہا کہ محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حق و صداقت دے کر مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی۔ جو کچھ آپ پر نازل فرمایا اس میں رجم کی آیت بھی نازل فرمائی تھی۔ ہم نے خود اسے پڑھا ہے اور اسے یاد بھی رکھا ہے اور اسے خوب سمجھا اور دل و دماغ میں محفوظ بھی رکھا ہے۔ پھر رسول

طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ قَائِلٌ: اللَّهُ ﷻ نے رجم کیا اور آپؐ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کہنے والے کہیں گے کہ کتاب اللہ میں ہم رجم کی سزا کا ذکر نہیں پاتے۔ اس طرح وہ ایسے فرض کے تارک ہو کر جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا، گمراہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ رجم کی سزا کتاب میں حق ہے اس شخص کیلئے جس نے زنا کیا ہو۔ اس حالت میں جبکہ وہ شادی شدہ ہو، وہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں جبکہ دلیل قائم ہو جائے یا حمل ہو یا خود

اقرار کرے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ایہ الرجم﴾ آیہ کو مرفوع پڑھیں تو یہ کان کا اسم ہے اور اس کی خبر طرف ہے۔ وہ آیت یہ تھی۔

الشیخ والشیخۃ اذا رنبا فارجموهما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم ہم نے اسے حفظ کر لیا ﴿وعقلناھا﴾ ہم نے اسے خوب سمجھ لیا ﴿ورجمنا بعدہ﴾ رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی میں ہم نے بھی رجم کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے بعد اس پر اجماع ہوا ﴿احصن﴾ بالغ، عاقل کسی آزاد سے صحیح طور پر شادی کی ہو اور اپنی اہلیہ سے لذت صحبت حاصل کر چکا ہو ﴿اذا قامت البینۃ﴾ جب دلیل قائم ہو جائے یعنی چار شہادتیں مردوں کی ﴿الحبل﴾ یا حمل کا پایا جانا ﴿والاعتراف﴾ یا پھر مجرم کا خود اقرار زنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ زنا کا ثبوت تین طرح سے ہو سکتا ہے۔ چار شہادتیں ہوں تو جرم زنا ثابت ہو گا یا مجرم خود اقراری ہو کہ اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے یا عورت کا حاملہ ہونا اور اگر یہ صورت پیش آجائے کہ ایک عورت شادی شدہ بھی نہیں اور لونڈی بھی نہیں مگر حاملہ ہے تو اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ امام مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ اس پر حد زنا نافذ ہوگی۔ مگر امام شافعی رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک محض حمل سے حد جاری نہیں کی جائے گی۔ یہ حدیث مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سورۃ احزاب، سورۃ بقرہ کے برابر تھی جتنی اب موجود ہے اس کے علاوہ باقی منسوخ ہو گئی اور اس میں ہم پڑھتے رہے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کریں تو ان کو سنگسار کر دو۔ بعد میں اس آیت کی تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔

(۱۰۳۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے

جو ایک آزاد شریف زادی کیلئے ہیں البتہ بعض حضرات کی یہ رائے بھی ہے کہ اگر لونڈی کے ارتکاب کی شہادتیں اور اقرار نہ ہو اور مالک کو یقین و وثوق ہو کہ لونڈی نے جرم زنا کا ارتکاب کیا ہے تو مالک اپنے یقین و وثوق کی بنیاد پر بھی حد نافذ کر سکتا ہے۔

(۱۰۴۰) وعن علی رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اپنے قبضہ میں لونڈی غلام پر حدیں قائم کرو۔“ (اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور مسلم میں یہ روایت موقوف ہے)

(۱۰۴۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَمْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ أَتَتْ النَّبِيَّ ﷺ، وَهِيَ حُبْلَى مِنَ الزَّوْنِ، فَقَالَتْ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ! أَصَبْتُ حَدًّا، فَأَقِمْنِي عَلَى، فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَلَيْهَا، فَقَالَ: «أَحْسِنِ إِلَيْهَا، فَإِذَا وَضَعْتَ فَأَتِنِي بِهَا»، فَفَعَلَ، فَأَمَرَ بِهَا فَشَكَّتْ عَلَيْهَا ثِيَابُهَا، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَرُجِمَتْ، ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا، فَقَالَ عُمَرُ: أَتُصَلِّي عَلَيْهَا يَا نَبِيَّ اللَّهِ! وَقَدْ زَنَتْ؟ فَقَالَ: «لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً، لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ سَبْعِينَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ لَوَسِعَتْهُمْ، وَهَلْ وَجَدْتَ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلَّهِ تَعَالَى؟». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبنی قبیلہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور وہ اس وقت زنا (کے فعل حرام) سے حاملہ تھی۔ اس نے کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ)! میں حد کی مستحق ہوں لہذا آپ اس حد کو مجھ پر نافذ فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ولی و سرپرست کو بلوایا اور اسے تلقین فرمائی کہ ”اس کے ساتھ حسن سلوک کرو جب وہ وضع حمل سے فارغ ہو تو اسے میرے پاس لے آؤ۔“ اس نے آپ کے فرمان کے مطابق عمل کیا۔ پھر آپ نے اس کے بارے میں حکم دیا۔ چنانچہ اس کے کپڑے مضبوطی سے باندھ دیئے گئے۔ پھر آپ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے سنگسار کر دیا گیا پھر اس کی نماز جنازہ پڑھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بول اٹھے اے اللہ کے نبی (ﷺ)! آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ یہ تو زنا کی مرتکب ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا ”اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ اہل مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کر دی جائے تو وہ سب پر وسیع ہو جائے گی۔ کیا تو نے اس سے بہتر آدمی دیکھا یا پایا ہے جس نے اللہ کیلئے اپنی جان کو اللہ کے سپرد کر دیا ہو۔“ (مسلم)

حدود کے مسائل 794

لعوی تشریح: ﴿ان امراء من جھینہ﴾ یہ خاتون غامدیہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ جھینہ تصغیر ہے۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور ”غامد“ اس کی شاخ تھی۔ ﴿فشکت﴾ صیغہ مجہول۔ شدت کے وزن پر۔ مضبوطی سے اس کے جسم پر کپڑے باندھ دینا اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ پتھر جب اس پر پڑیں تو وہ برہنہ نہ ہو جائے یا جسم کا کوئی قابلِ ستر حصہ کھل نہ جائے۔ ﴿ثم صلی علیہا﴾ مبنی للمعلوم۔ یہ صریح نص ہے اس بارے میں کہ حضور ﷺ نے غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی ہے۔ یہ اس قول کی تائید ہے جو امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے اصحاب علم نے کہی ہے کہ جسے رجم کی سزا دی گئی ہو امام وقت اور دوسرے اصحاب فضیلت اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے امام وقت اور اہل علم و فضل کیلئے مرحوم کا جنازہ پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے البتہ عام مسلمانوں کو اس کا جنازہ پڑھنے کی اجازت ہے مگر یہ حدیث ان کے موقف کے خلاف ہے۔ ﴿جادت بنفسہا﴾ اس نے اپنی جان دے دی ہے اور جس طرح انسان اپنا مال دے دیتا ہے اور سخاوت کر دیتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ عورت پر زنا کی حد فوری طور پر نافذ نہیں کر دینی چاہئے۔ حمل تک بالاتفاق حد اس پر نافذ نہیں کرنی چاہئے۔ وضع حمل کے بعد بھی اگر نومولود کی پرورش کا کوئی ذمہ لے اور بچہ کو دودھ پلانے والی کا انتظام ہو تو پھر حد لگائی جائے گی۔ اگر ایسا بندوبست سردست نہ ہو سکے تو پھر دودھ چھڑانے تک نفاذ حد کا عمل مؤخر کیا جائے گا اور اگر کنواری عورت سے اس فعل کا ارتکاب ہوا ہو تب بھی وضع حمل تک حد نافذ نہیں کی جائے گی۔ اس عورت سے حسن سلوک سے پیش آنے کی تاکید ہے اس لئے کہ نادان رشتہ دار عورتیں اور یوقوف مرد اسے طعن و تشنیع سے جینا دو بھر کر دیتے ہیں۔ شرعی سزا کے علاوہ اس قسم کا ناروا رویہ اور بے جاسلوک تو اسے جیتے جی زندہ درگور کر دینے کے مترادف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو رجم کرتے ہوئے اس کے ستر کا لحاظ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ امت نے مرد کو کھڑے کھڑے اور عورت کو گڑھے میں بٹھا کر سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی سزا یافتہ عورت ہو یا مرد دونوں کی نماز جنازہ پڑھنا منہون ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک عوام و خواص سبھی نماز جنازہ میں شریک ہوں۔ جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔

(۱۰۴۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَجَمَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا مِّنْ أَهْلِ يَهُودٍ، وَرَجُلًا مِّنْ الْيَهُودِ، وَأَمْرًا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَنُصِّصَ رَجْمَ الْيَهُودِيِّينَ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُثْمَرَ.

حضرت جابر بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اہل یسوعیہ کے ایک آدمی کو رجم کیا اور ایک یسوعی مرد اور ایک عورت کو بھی۔ (مسلم۔ یسوعی مرد و عورت کی سزائے رجم کا واقعہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیحین میں منقول ہے)

لعوی تشریح: ﴿رجلا من اسلم﴾ اسلم قبیلہ کا ایک مرد اس سے مراد معز بن مالک اسلمی ہیں۔ ﴿

وَرَجُلًا مِنَ الْيَهُودِ وَامْرَأَةً ۝ ان میں سے یعنی یہود میں سے ہی ﴿وَقِصَّةَ الْيَهُودِينَ﴾ تشبیہ کا صیغہ ہے۔ ﴿فِي الصَّحِيحِينَ﴾ یعنی بخاری و مسلم میں ان کے علاوہ یہ واقعہ مسانید اور سنن کی کتابوں میں بھی منقول ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کو پیش کیا گیا جنہوں نے زنا کیا تھا۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ زانی کے متعلق تم لوگ تورات میں کیا حکم پاتے ہو؟ بولے ہم دونوں کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرتے ہیں اور دونوں کے منہ مخالف سمتوں میں کرتے ہیں اور دونوں کو گھماتے ہیں اور چکر لگواتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لاؤ اور اسے پڑھو۔“ چنانچہ وہ تورات لے آئے اور اسے پڑھنا شروع کیا تا آنکہ جب وہ رجم والی آیت پر پہنچے تو اس کی تلاوت کرنے والے نوجوان نے اس آیت پر اپنا ہاتھ رکھ لیا جس میں رجم کا ذکر تھا اور آگے پیچھے سے عبارت پڑھنے لگا۔ آپؐ کے ساتھ عبداللہ بن سلام تھے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اسے فرمائیں کہ اپنا ہاتھ ذرا اٹھاؤ، اس نے اپنا ہاتھ اس جگہ سے اٹھایا تو اس کے نیچے آیت رجم موجود تھی چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا فیصلہ فرمایا اور دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے امدئی میں کہا ہے کہ یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل ذمہ جب اپنا فیصلہ کروانے کیلئے ہماری عدالت میں آئیں گے تو ہم اسلام کے حکم کے عین مطابق فیصلہ کریں گے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل ذمہ کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت قبول کی جائے گی اور زنا میں صرف رجم کیا جائے گا۔ کوڑے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۱۰۴۳) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَتْ فِي أَبْيَاتِنَا رُؤَيْجُلٌ ضَعِيفٌ، فَخُبْتُ بِأَمَةٍ مِّنْ إِمَائِهِمْ فَذَكَرَ ذَلِكَ سَعْدٌ لِّرَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالَ: «اضْرِبُوهُ حَدَّهُ»، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّهُ أَوْضَعُ مِنْ ذَلِكَ، فَقَالَ: خُذُوا عَشْكَالًا فِيهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ، ثُمَّ اضْرِبُوهُ بِهِ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، فَفَعَلُوا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتَّيَّمِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ، لَكِنْ أَخْتَلَفَ فِي وَضْعِهِ وَإِرْسَالِهِ.

حضرت سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے گھروں میں ایک چھوٹا سا کمزور و نحیف آدمی رہتا تھا۔ وہ ہماری لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کے ساتھ جرم زنا میں ملوث ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا ”اسے حد لگاؤ۔“ تو سب لوگ بول اٹھے اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ تو نہایت ہی کمزور و لاغر ہے تو آپؐ نے فرمایا ”کھجور کے درخت کی ایک ایسی ٹہنی لو جس میں سو شاخیں ہوں۔ پھر اسے ایک ہی دفعہ اس مرد پر مار دو۔“ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ (اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے لیکن اس کے موصول اور مرسل

لفغوی تشریح: ﴿روسیجل﴾ رجل کی تصغیر ہے۔ ﴿فحسب﴾ باب کرم سے ہے جس کے معنی ہیں کہ اس نے زنا کیا اور گناہ کا مرتکب ہوا۔ ﴿عشکالا﴾ عین کے نیچے کسرہ ”ٹا“ ساکن یروزن قرطاس۔ خوشہ، شنی، ﴿شمرخ﴾ شین کے نیچے کسرہ میم ساکن۔ عشکال کے وزن پر تیلی سی شنی یا شاخ جو خوشے یا شنی کی جڑ میں سخت شنی کے اوپر اگتی ہے۔ سبل السلام میں کہا ہے کہ یہاں عشکال سے مراد بڑی لمبی شاخ ہے جس پر چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوں۔ یہ کھجور کی شاخ انگور کی بیل کی طرح ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک شاخ کو شمراخ کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر شادی شدہ زانی کسی شدید بیماری کی وجہ سے یا فطری و جبلی طور پر اتنا ناتواں و کمزور و نحیف ہو کہ کوڑوں کی پوری حد سے اس کے جاں بحق ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی خاص صورت میں حد میں نرمی کی جاسکتی ہے۔ البتہ تعداد میں کمی بیشی نہیں۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ سوشل سائنس کو اس طرح مارا جائے کہ ہر شاخ اس مجرم کو لگے اور بعض کہتے ہیں کہ سوشل سائنس کو ایک مرتبہ مارنا کافی ہے، ضروری نہیں کہ ہر شاخ مجرم کو لگے اس سے سزا کا نفاذ ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ شرعی سزائیں مجرم کو ان سے مار دینے کیلئے نہیں ہیں بلکہ اسے عبرت دینے اور معاشرے میں امن و امان قائم رکھنے کیلئے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿سعید بن سعد﴾ سعید بن سعد بن عبادہ انصاری ساعدی۔ مشہور صحابی تھے اور ایک قول کے مطابق تابعی تھے۔ ان سے تھوڑی سی احادیث مروی ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو یمن کا والی مقرر کیا تھا۔

(۱۰۴۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَجَدْتُمُوهُ يَعْمَلُ عَمَلٍ قَوْمٍ لُوطٍ، فَاقْتُلُوا الْقَاعِلَ وَالْمَفْعُولَ بِهِ، وَمَنْ وَجَدْتُمُوهُ وَقَعَ عَلَىٰ بَهِيمَةٍ فَاقْتُلُوهُ وَاقْتُلُوا الْبَهِيمَةَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، وَرِجَالُهُ مُؤْتَقُونَ، إِلَّا أَنَّ فِيهِ اخْتِلَافًا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص کو تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کے فعل کا مرتکب ہوا ہے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔ اور جس کسی کو پاؤ کہ وہ جانوروں کے ساتھ بد فعلی کا مرتکب ہوا تو اس مرد اور اس جانور دونوں کو مار ڈالو۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے)

لغوی تشریح: ﴿من وجد تموه﴾ تمہارے علم میں یہ بات آئے کہ فلاں شخص ﴿يعمل عمل قوم لوط﴾ قوم لوط کا فعل کرتا ہے یعنی دہر میں غیر فطری طور پر بد فعلی کرتا ہے۔ ﴿فاقتلوا الفاعل والمفعول به﴾ تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔ خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الہدیٰ میں بیان کیا ہے کہ ابن قسار اور ہمارے شیخ و استاد علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے

حدود کے مسائل 797

کہ صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے کہ ایسے شخص کو قتل کر دو البتہ قتل کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے ہے کہ اونچے پہاڑ سے پھینک دیا جائے اور حضرت علیؓ کی رائے میں اس پر دیوار گرا دی جائے اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے میں ان دونوں کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے پس سب کا اس کے قتل کرنے پر اتفاق ہے، اگرچہ قتل کرنے کی کیفیت مختلف ہے۔ امام شافعیؒ کا قدیم قول بھی یہی ہے۔ امام مالکؒ اور احمدؒ کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے کہ لوطی خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ دونوں صورتوں میں اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دو مذہب اس جگہ اور بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل کے مرتکب کی سزا تو زنا کی حد ہے یعنی اگر شادی شدہ ہو تو اسے رجم کیا جائے ورنہ سو کوڑے مارے جائیں گے۔ یہ امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے اور اس قول کی روشنی میں مفعول پر بقول امام شافعیؒ سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی مرد ہو یا عورت، شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ دو سرا مذہب یہ ہے کہ دونوں پر کوئی حد نہیں بس تعزیر پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابو حنیفہؒ کی ہے مگر پہلا قول حدیث کے موافق ہے اور اگرچہ اس حدیث میں بعض نے کلام کیا ہے لیکن یہ سند کے اعتبار سے قابل عمل ہے۔ ان تمام اقوال میں پہلا قول راجح ہے اگرچہ اس پر فتویٰ دینے والے کم تعداد میں ہیں۔ ﴿ومن وجد تموه وقع علی بھیمہ فافسلوه﴾ یعنی جو جانور سے بد فعلی کرے اسے قتل کر دو۔ حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث ان کے قول کے معارض ہے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا جس نے جانور سے بد فعلی کی اس پر کوئی حد نہیں۔ امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ موقوف قول ان کی مرفوع حدیث سے زیادہ صحیح ہے اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے اور یہی قول امام احمدؒ اور اسحقؒ کا ہے اور خطابیؒ نے کہا ہے کہ فقہاء کی اکثریت کا خیال ہے کہ اس پر تعزیر لگائی جائے گی۔ عطاء اور ابراہیم نخعی نے بھی یہی کہا ہے اور امام مالکؒ، ثوریؒ، امام احمدؒ اور اصحاب الراۓ اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اسی کے تائید میں ہے اور امام شافعیؒ کا دو سرا قول یہ ہے کہ ایسے مجرم کی حد، زنا کی حد ہے واقفولوا البھیمہ یعنی جانور کو قتل کر دو۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ جانور کو قتل کرنے کا کیا سبب ہے کیونکہ وہ تو غیر مکلف ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا لیکن میرا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا گوشت کھانا اور اس سے فائدہ اٹھانا مکروہ سمجھا ہے۔

(۱۰۴۵) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَنَى (زانی کو) مارا بھی اور جلا وطن بھی کیا اور ابوبکر صَرَبَ وَعَرَبَ، وَأَبُو بَكْرٍ صَرَبَ وَعَرَبَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرَجَّاهُ يَفَاقًا، إِلَّا أَنَّهُ اخْتَلَفَ فِي وَفْقِهِ وَرَفْعِهِ.

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے (زانی کو) مارا بھی اور جلا وطن بھی کیا۔ (اسے ترمذی نے صَرَبَ وَعَرَبَ، وَأَبُو بَكْرٍ صَرَبَ وَعَرَبَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرَجَّاهُ يَفَاقًا، إِلَّا أَنَّهُ اخْتَلَفَ فِي وَفْقِهِ وَرَفْعِهِ.

روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے موقوف اور مرفوع ہونے کے متعلق اختلاف ہے)

798 ————— حدود کے مسائل

لغوی تشریح: ﴿ضرب﴾ یعنی کنوارے زانی کی سزا سو کوڑے لگائی۔ ﴿وغرب﴾ تعزیر سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زانی کو اس کی جائے سکونت سے سال بھر کیلئے نکال باہر کیا (جلا وطن کیا) علامہ الیمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ حافظ ابن حجر نے یہ روایت اس قول کی تردید میں نقل کی ہے کہ جلا وطنی کی سزا منسوخ ہے۔ کیونکہ جب خلفائے راشدین کا اس پر عمل ہے تو یہ منسوخ کیسے اور کب ہوئی؟

(۱۰۴۶) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُخَنَّثِينَ مِنَ الرِّجَالِ، كَارُوبٍ دَهَارِيسٍ وَأُيُسَى عَوْرَتُونَ، لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الْمُخَنَّثِينَ مِنَ النِّسَاءِ، وَقَالَ: «أَخْرِجُوهُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ». رَوَاهُ نَكَالٌ دُوْ- (گھروں میں داخل نہ ہونے دو)۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿المخنثین﴾ نون کے نیچے کسرہ اور فتح بھی۔ ایسے مرد جو عورتوں سے عادات و اخلاق، حرکات و سکنات، طرز گفتگو اور فیشن وغیرہ میں اور ان امور میں جو عورتوں کیلئے مخصوص ہیں مشابہت پیدا کریں۔ پس اگر وہ عادات و خصلت پیدائشی و جبلی اور فطری ہوں تو اس میں کوئی ملامت نہیں اور ایسی عادت بتکلف بھی دور کرنے کی کوشش کرنا اس کیلئے ضروری اور لازمی ہے اور اگر اس نے قصداً و عمدہ اختیار کی ہے تو یہ مذموم حرکت ہے۔ ﴿المترجلات﴾ ایسی عورتیں جو مردوں کے ساتھ تشبیہ اختیار کریں۔ فیشن میں، ہیئت و صورت میں، چال ڈھال میں، انداز گفتگو وغیرہ میں۔ اس پر لعنت کا کیا جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ یہ مرض ہمارے زمانہ میں وباء کی طرح عام ہو گیا ہے نہ مشرق اس سے محفوظ ہے اور نہ مغرب اس سے بچا ہوا ہے یہاں تک کہ یہ مرض نوجوان مسلمانوں کی صفوں میں چھوٹی کی چال داخل ہو گیا ہے اور ان میں سرایت کر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایسے مرد و عورتوں کو گھروں سے نکالنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ یہ شریف گھرانوں میں فتنہ و فساد کا موجب نہ بن جائیں اور ان کی دیکھا دیکھی شریف گھرانوں میں بھی یہ مرض سرایت نہ کر جائے۔

(۱۰۴۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَذْفَعُوا الْحُدُودَ مَا وَجَدْتُمْ دَفْعَ كَرْنٍ فِي الْغَنَائِشِ بِأَوْ-» (اے ابن ماجہ نے نکالا ہے لَهَا مَذْفَعًا). أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَسَنَدُهُ أَوْ اس کی سند ضعیف ہے)

ضعیف۔ وَأَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ، مِنْ اور اس کو ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے

حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، بَلَفَظَ: أَدْرَأُوا الْحُدُودَ عَنْ الْمُسْلِمِينَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضًا. واسطہ سے بیان کیا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں۔ ”مسلمانوں سے جہاں تک حدود کو ہٹا سکتے ہو ہٹاؤ۔“ (یہ بھی ضعیف ہے) اور بیہقی نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

وَرَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ، عَنْ عَلِيٍّ، مِنْ قَوْلِهِ، بَلَفَظَ: أَدْرَأُوا الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ.

لعنوی تشریح: ﴿مدفعا﴾ یعنی دفع کرنے کی گنجائش و راستہ ادرؤا یعنی دفع کرو اور شبہات سے مراد جیسے کوئی عورت یہ دعویٰ کرے کہ زانی مرد نے اس پر جبر و اکراہ کیا ہے یا یہ بیان دے کہ مجھے سوتے میں اس نے آیا اور ایسی ہی دوسری مثالیں جن کا واقع ہونا ممکن ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب حدود کے ثبوت میں کسی قسم کا شبہ پیدا ہو جائے تو حد کو موقوف کر دینا چاہئے۔ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مجرموں کو حدیں لگایا ہی نہ کرو بلکہ مقصد یہ ہے کہ حدود کا نفاذ اس وقت کرنا چاہئے جب جرم پوری طرح ثابت ہو جائے۔

(۱۰۴۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَجْنَبُوا هَذِهِ الْقَادُورَاتِ الَّتِي نَهَى اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، فَمَنْ أَلَمَ بِهَا فَلْيَسْتَرْ بِسَرِّ اللَّهِ تَعَالَى، وَلْيَتُبْ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى، فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِ لَنَا صَفْحَتَهُ نَقِمَ عَلَيْهِ كِتَابُ اللَّهِ تَعَالَى». رواه الحاكم، وهو في الموطأ من مزائيل زيد بن أسلم. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ان گندے کاموں سے بچو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور جو شخص ان میں مبتلا ہو جائے تو اسے اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ میں چھپے رہنا چاہئے اور اسے چاہیے کہ اللہ کی جناب میں (پوشیدہ طور پر) توبہ کر لے کیونکہ جو شخص اپنی پیٹھ صَفْحَتَهُ نَقِمَ عَلَيْهِ كِتَابُ اللَّهِ تَعَالَى۔“ ہمارے سامنے ظاہر کرے گا ہم اس پر کتاب اللہ کو نافذ و قائم کر کے چھوڑیں گے۔“ (اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ موطا میں زید بن اسلم سے مرسلًا

مروی ہے)

لعنوی تشریح: ﴿القادورات﴾ قاذورۃ کی جمع ہے۔ قول و فعل کی فحش حرکتیں مثلاً زنا وغیرہ۔ ﴿الم بها﴾ اللہ سے ماخوذ ہے یعنی جس نے جرم کا ارتکاب کیا ﴿من یبدلنا﴾ مضارع مجزوم ابداء سے۔ یعنی جو کوئی اپنا پہلو اپنا چہرہ ہمارے سامنے ظاہر کرے گا۔ کہا جاتا ہے ﴿ابدی صفحہ﴾ یعنی اسی نے اپنا پہلو کھول دیا۔ یعنی جو شخص اپنے جرائم کا ہمارے سامنے انکشاف کرے گا تو ہم اس پر حد قائم کر کے

چھوڑیں گے، ہرگز اسے معاف نہیں کریں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بشری کمزوری کی بنا پر گناہ کا سرزد ہونا خلاف توقع نہیں۔ جب ایسا فعل سرزد ہو جائے تو انسان کو چاہئے کہ اپنا جرم اور فعل لوگوں کے سامنے بیان نہ کرتا پھرے بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہے تو اسے پردے میں ہی رہنے دے اور پوشیدہ طور پر اپنے مولیٰ و مالک کے حضور توبہ کرے اس سے معافی کا طلب گار ہو۔ لیکن اگر وہ اپنے گناہ کا برملا اظہار کرتا ہے اور اعتراف جرم کرتا ہے تو پھر وہ شرعی سزا سے کسی صورت بچ نہیں سکتا۔

راوی حدیث: ﴿زید بن اسلم رضی اللہ عنہ﴾ صحابی ”بلوی“ قبیلہ سے ہیں۔ جو بنو عجلان میں سے تھا۔ یہ بنی عمرو بن عوف انصاری کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے۔ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ ہشام کلبی نے کہا ہے ان کو ملیح بن خویلد اسدی نے ”بزاخہ“ کے روز اھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں قتل کیا تھا۔

۲ - بَابُ حَدِّ الْقَذْفِ - تممت زنا کی حد کا بیان

(۱۰۴۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: لَمَّا نَزَلَ عَذْرَى، قَامَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَذَكَرَ ذَلِكَ، وَتَلَا الْقُرْآنَ، تِلَاوَةً فَرَمَانِيَّةً. وَتَلَا الْقُرْآنَ، فَكَلَّمَ أَمْرًا بِرَجُلَيْنِ وَأَمْرًا فَضْرَبُوا الْحَدَّ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، وَأَشَارَ إِلَيْهِ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب قرآن مجید میں میری برأت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور اس کا ذکر فرمایا اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ جب منبر سے نیچے تشریف لائے تو دو مردوں اور ایک عورت کے متعلق حکم دیا کہ ان کو حد لگائی جائے۔ (اس کو احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب حد القذف﴾ قاف پر فتح اور ذال پر سکون۔ تممت زنا کو کہتے ہیں اور اس کی حد اسی کوڑے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ (والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شہداء فاجلدوہم ثمانین جلدۃ) (النور) ”جو لوگ پاک خواتین پر تممت زنا لگاتے ہیں۔ پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ۔“ ﴿لما نزل عذری﴾ عذر سے مراد وہ آیات ہیں جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کا بیان ہے اور وہ سورہ نور ۱۱ تا ۲۰ تک دس آیات ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کو عذر کا نام اس لئے دیا کہ یہ آیات ان پر جھوٹی تممت سے بریت کرتی ہیں۔ جس طرح عذر معذور کو اس کے جرم سے بری قرار دیتا ہے۔ اور ان کا واقعہ افک تو مشہور و معروف ہے کہ آپ ۵۵ یا ۶۰ھ میں غزوۃ المریض سے واپس آرہی تھیں کہ صبح کی تاریکی میں ایک جگہ اپنا ہار گم کر بیٹھیں، اسے تلاش کرنے میں مشغول ہو گئیں اور قافلہ نے کوچ کر لیا اور لوگوں نے ان کا کجاوہ اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا اور

وہ یہی سمجھتے رہے کہ آپ اس ہودج میں موجود ہیں۔ پھر جب آپ ہار کی تلاش کے بعد واپس اپنی جگہ پر تشریف لائیں تو اتنے میں صفوان بن معطل کا ادھر سے گزر ہوا جو قافلے کی گری پڑی چیزیں اٹھانے کیلئے پیچھے رکھے گئے تھے۔ انہوں نے آپ کو اپنے اونٹ پر سوار ہونے کو کہا اور خود اپنے اونٹ کی مہار پکڑ کر پیدل اونٹ کے آگے چل پڑے۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راستہ میں کوئی بات نہیں کی تا آنکہ ظہر کے وقت ان کو نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ پس رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے جب ان کو دیکھا تو فوراً ان پر تمہت لگا دی۔ اس منافق نے اور اس کے ہم مشرب منافق لوگوں نے اس کو خوب مشہور کیا اور اسے لوگوں میں پھیلایا۔ یہاں تک کہ اس جرم اشاعت میں تین مخلص مومن بھی حصہ دار بن گئے اور وہ تھے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور حنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ قریب تھا کہ ملک اضطرابات واقع ہو جاتے۔ ادھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بارے میں کچھ بھی خبر نہ ہوئی۔ اس پر ایک مہینہ گزر چکا تھا پھر کہیں جا کر ان کو خبر ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور اپنے والد کے گھر چلی گئیں اور وہاں جا کر اس خبر کی تحقیق کی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ لوگ ان کے بارے میں یہ کچھ کہہ رہے ہیں تو زار و قطار رونے لگیں اور روتے روتے دو راتیں گزر گئیں اور مسلسل روتی ہی رہیں۔ پھر نبی ﷺ ان کے ہاں تشریف لے گئے اور اس معاملہ میں ان سے گفتگو فرمائی جو اس سے پہلے نہیں فرمائی تھی۔ اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں آیات نازل ہوئیں۔ ﴿امر برجلین وامرأة﴾ دو مردوں اور ایک عورت کو حد قذف لگانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ یہ دو مرد حضرت حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ اور عورت حضرت حنہ بنت جحش تھیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ان لوگوں کے اس تمہت کے پھیلانے میں حصہ لینے کی وجہ سے قذف لگائی گئی۔ ﴿ففسدوا الحد﴾ فعل صیغہ مجہول یعنی پھر ان پر حد قذف لگائی گئی۔

(۱۰۵۰) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَوَّلُ إِسْلَامٍ فِي لِحَانٍ كَا بِلَا وَاقِعَهُ شَرِيكُ بْنُ سَمَاءٍ كَا تَهَا۔ لِعَانِهِ كَانَ فِي الْإِسْلَامِ أَنَّ شَرِيكَ بْنَ سَحْمَاءَ قَذَفَهُ هَلَاكُ بْنُ أُمَيَّةَ تَمْت لَكَئِي تَهِي تُو رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَے اِس سے فرمایا بِأَمْرَائِهِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: كَا ”گواہ لاؤ۔ ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد لگائی جائے“ (اس حدیث کی تخریج ابویعلیٰ نے کی ہے اور اس اَلْحَدِيثِ. أَخْرَجَهُ أَبُو يَعْلَى، وَبِحَالِهِ يَفَات، كَا رَاوِي ثَقَّة هِيں اور بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وَفِي الْبُخَارِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَاوَايَتُ بَهِي اِسِي طَرَحُ هِيں) رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا.

نفوی تشریح: ﴿البينة﴾ منصوب حالت میں ہے یعنی گواہ پیش کرو اور وہ چار گواہ ہیں۔ ﴿والا فحد

قَالَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. کہا ہے (یعنی وہ تمت بھی ہو)۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿يَقَامُ عَلَيْهِ الْحَدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اپنے غلام پر تمت لگاتا ہے تو دنیا میں اس مالک پر کوئی حد نہیں ہے۔ اسے سزا قیامت کے روز اللہ رب العالمین ہی دیں گے اور اگر تمت بھی ہوگی تو پھر مالک بری الذمہ ہے اور غلام کو جرم کی سزا دی جائے گی۔

چوری کی حد کا بیان

۳ - بَابُ حَدِّ السَّرِقَةِ

(۱۰۵۳) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَقْطَعُ يَدُ سَارِقٍ إِلَّا فِي چوتھائی دینار یا اس سے کچھ زائد چوری کرنے پر (کاٹا رُبْعُ دِينَارٍ فَصَاعِدًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ جَائِزٌ. (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور لُئْسَلِمَ. وَلَفْظُ الْبَخَارِيِّ: «تَقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ فِي بَخَارِي كَے الفاظ ہیں ”چور کا ہاتھ چوتھائی دینار اور رُبْعُ دِينَارٍ لُصَاعِدًا»۔ اس سے زائد پر کاٹا جائے گا۔“

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ: «أَقْطَعُوا فِي اور احمد کی روایت ہے ”چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹ رُبْعُ دِينَارٍ، وَلَا تَقْطَعُوا فِيمَا هُوَ دو اور اس سے کم قیمت کی چوری پر نہ کاٹو۔“ أَذْنَى مِنْ ذَلِكَ»۔

لغوی تشریح: ﴿بَابُ حَدِّ السَّرِقَةِ﴾ سرقة میں سین اور را پر فتح اور سرقة کہتے ہیں کسی محفوظ جگہ و مقام سے کسی ایسی چیز کو خفیہ طور سے لے لینا کہ اس کا لینا جائز و درست نہ ہو۔ ﴿فَصَاعِدًا﴾ یہ حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کا استعمال کبھی فاسے ہوتا ہے اور کبھی لفظ ثَم سے لیکن ”واو“ سے کبھی استعمال نہیں ہوتا اور اس کا معنی ہے خواہ اس سے زیادہ ہو۔ ﴿أَذْنَى مِنْ ذَلِكَ﴾ اس سے کم تر ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک نصاب سرقة مکمل نہ ہو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ یہی رائے جمہور علماء کرام کی ہے۔ مگر حسن بھری، ظاہریہ اور خوارج نے آیت کو مطلق دیکھ کر قلیل و کثیر ہر چوری پر قطع ید کی سزا کو واجب قرار دیا ہے جو صحیح نہیں۔ اس لئے کہ حدیث قرآن مجید کا بیان اور اس کی توضیح و تشریح ہے۔ حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل نصاب کی صورت ہی میں قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اس لئے جمہور کی رائے ہی صحیح ہے کہ نصاب سرقة پورا ہونے سے پہلے قطع ید کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ البتہ نصاب کے بارے میں مختلف اقوال ہیں جن میں زیادہ مشہور دو قول ہیں۔ پہلا یہ کہ سونے میں نصاب ایک دینار کا چوتھا حصہ اور چاندی میں تین درہم۔ یہ رائے فقہاء حجاز اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہم کی ہے اور دوسرا یہ کہ دس درہم نصاب ہے اس سے کم میں قطع ید کی سزا

نہیں دی جاسکتی۔ امام سفیان ثوری اور احناف کا یہی قول ہے۔ پہلے گروہ نے اسی متفق علیہ اور صحیح ترین حدیث کو لیا۔ ایک دینار کا وزن چار ماشہ سونا اور درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی۔ گویا چوتھائی دینار اور تین درہم ہم وزن ہیں۔ اس سے کم قیمت کی چوری پر قطع ید کی سزا نافذ نہیں ہوگی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک ڈھال جس کی قیمت دس درہم تھی پر چور کا ہاتھ کاٹا گیا۔ مگر یہ روایت صحیح بخاری و مسلم کے درجہ و مرتبہ کو نہیں۔ ڈھال کی قیمت اس کی حیثیت کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال کی چوری میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔ اس لئے امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ محدثین ہی کا موقف درست ہے کہ ربع دینار یا تین درہم چاندی کے برابر چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ جس کی قیمت تین درہم تھی۔ یہ ربع دینار والی پہلی روایت کے منافی نہیں ہے کیونکہ ان دونوں میں چوتھائی دینار تین درہم کے مساوی تھا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ جمہور کا مسلک اس حدیث اور سابقہ حدیث کے مطابق ہے۔ البتہ ان میں ان دونوں احادیث پر عمل کرنے میں معمولی اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ چور کا ہاتھ تھمبی کاٹا جائے گا جب چوتھائی دینار یا تین درہم چوری کرے۔ سونے یا چاندی کے علاوہ کسی چیز کی چوری کرے تو اس کا نصاب تین درہم کے حساب سے ہوگا۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصاب سونے کے دینار کا چوتھائی حصہ ہے یا جو ربع دینار کی قیمت ہو اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ”قطع ید کی سزا ربع دینار کی چوری میں ہے“ پھر فرمایا کہ ”اس سے کم قیمت کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا“ اور تین درہم چوتھائی دینار کے قائم مقام ہیں اصل نصاب سرقہ صرف چوتھائی دینار ہے۔

(۱۰۵۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمٍ. مُتَّفَقٌ. اس کی قیمت تین درہم تھی۔ (بخاری و مسلم)

(۱۰۵۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَعَنَ اللَّهُ السَّارِقَ، يَسْرِقُ ابْنًا أَوْ جُورِيَّ كَرَّكَ ابْنًا هَاتِهَ كَوَالِيَتَا بِي». نِزْرِيَّ جُورِيَّ الْبَيْضَةِ فَتَقَطُّعُ يَدُهُ، وَيَسْرِقُ الْحَبْلُ كَرَّتَا بِي وَأَبْنَا هَاتِهَ كَوَالِيَتَا بِي». (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ظاہر یہ ہے کہ قطع ید کی سزا قلیل و کثیر دونوں میں ہے کوئی متعین و مقرر نصاب پر نہیں۔ حالانکہ اس حدیث میں یہ دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ چوری کا عمل قاتل نفرت ہے۔ چور ان معمولی اشیاء کے عوض اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

805 حدود کے مسائل

اس میں یہ وضاحت تو نہیں کہ جب وہ رسی یا انڈہ چوری کرے گانہ کہ ان کی قیمت ربع دینار کی قیمت کو نہ پہنچے تب بھی ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ چور جب معمولی سی حقیر اشیاء اٹھانے لگے تو پھر چوری اس کی عادت بن جائے گی اور یہ عادت اس کو اتنی بڑی چیزیں اٹھانے کی بھی جرأت دلا دے گی جن کی قیمت اسی نصاب تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے۔

(۱۰۵۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللَّهِ تَعَالَى؟» ثُمَّ قَامَ، فَحَطَبَ، فَقَالَ: «أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مَنْ قَبْلَكُمْ أَنْتُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ». مَثَّقَ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِسُلَيْمٍ. وَلَهُ مِنْ وَجْهِ آخَرَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتْ أَمْرًا تَشْتَعِيرُ الْمَتَاعَ، وَتَنْجَعُهُ فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بَقَطْعِ يَدِهَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کیا تو اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟“ یہ فرماتے ہوئے آپ کھڑے ہوئے پھر خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا ”لوگو! اے اللہ کے لوگو! ہم تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک و تباہ ہوئے کہ جب ان سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے۔“ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم میں ایک اور سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہے کہ ایک عورت لوگوں سے (ادھار) چیزیں مانگا کرتی تھی اور پھر انکار کر دیتی تھی۔ پس اس عورت کے ہاتھ کاٹنے کا نبی ﷺ نے حکم صادر فرمایا۔

لغوی تشریح: ﴿ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال﴾ نبی ﷺ نے یہ ارشاد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے خطاب ہو کر فرمایا جب انہوں نے فاطمہ نامی مخدوم قبیلہ کی ایک چور عورت سے سزا کو ساقط کرانے کیلئے سفارش کی تھی۔ یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ حدود میں کسی کی سفارش کرنا جائز نہیں۔ ﴿كانت امرأه تستعير المتاع﴾ یعنی جو سامان ادھار لیتی تھی۔ اس سے امام احمد رحمہ اللہ، اسحق رحمہ اللہ اور ظاہریہ نے پھر استدلال کیا جو عاریتاً چیز لے کر انکار کرے اس کا قطع یہ واجب ہے۔ مگر جمہور کی رائے ہے کہ انکار پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مخدومیہ خاتون کا قصہ کئی سندوں سے مروی ہے۔ اکثر میں ہے کہ وہ چوری کرتی تھی اور بعض میں یہاں تک صراحت ہے کہ اس نے نبی ﷺ کے گھر سے چادر چوری کی تھی۔ پس قطع یہ تو صرف چوری کی وجہ سے ہے۔ رہا اس کے عاریتاً لے کر انکار کرنے والا واقعہ تو وہ اس کی عادت بن گیا اور اس سے وہ مشہور ہو گئی ایسے جیسے وہ قبیلہ مخدوم سے ہونے کی وجہ سے مخدومیہ مشہور ہو گئی۔ اس وجہ سے نہیں کہ قطع یہ کی سزا عاریتاً لی ہوئی چیز کے انکار کرنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔

(۱۰۵۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "أَبُيٌّ نَبِيٌّ ﷺ مِنْكُمْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَيْسَ عَلَى خَائِنَةٍ وَلَا مُخْتَلِسٍ وَلَا جَائِزٍ قَطْعُ مَتْنَبٍ قَطْعٌ»." رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿خائن﴾ خائن اسے کہتے ہیں جو خفیہ طور پر مال لے لے اور مالک کے روبرو خیر خواہی کا اظہار کرے اور مرقاة شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے کہ خائن وہ ہے جسے کوئی چیز بطور ادھار یا امانت سپرد کی جائے اور وہ اس پر قبضہ کر لے اور کہے کہ وہ چیز ضائع ہو گئی ہے۔ ﴿مختلس﴾ اچانک کسی سے چیز اچک کر لے جانے والا جو مال کو بڑی پھرتی اور سرعت سے چھین کر رنوف چکر ہو جائے۔ ﴿منتہب﴾ علی الاعلان جبراً اور بزدل کسی سے مال چھین لینے والا۔

(۱۰۵۸) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْثَدَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْثَدَةَ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا قَطْعَ فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ»." رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے) وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿کسر﴾ کاف اور ٹا دونوں پر فتح۔ درخت خرما کا گوند جو چربی کی طرح رنگت میں سفید اور ذائقہ و مزہ میں گری کی طرح کھجور کے تنے کے وسط میں پایا جاتا اور کھلایا جاتا ہے۔ اس حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو پھل ابھی درخت پر ہوں اور تر ہوں وہ محفوظ جگہ میں ہوں یا غیر محفوظ جگہ میں ان کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ پھر اسی پر قیامت کرنے کو کہا ہے کہ گوشت، دودھ، مشروبات، روٹیاں وغیرہ کھانے کی اشیاء میں بھی قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ مگر جمہور نے غیر محفوظ کی قید لگائی ہے۔ انہوں نے یہ قید اس حدیث اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی تین احادیث کے بعد آنے والی حدیث میں تطبیق پیدا کرنے کی غرض سے لگائی ہے اور انہوں نے کہا کہ اہل مدینہ کی غالب عادت تھی کہ اپنے باغات کو محفوظ و مامون جگہ سے خارج سمجھتے تھے۔

(۱۰۵۹) وَعَنْ أَبِي أُمَيَّةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْثَدَةَ عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا قَطْعَ فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ وَلَا فِي دَرْخَتِ خَرَامٍ»." رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے) وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

اَعْتَرَفَ اَعْتِرَافًا، وَلَمْ يُوجَدْ مَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”میں خیال نہیں کرتا کہ مَتَاعٌ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا تَوْنِ چوری کی ہوگی۔“ اس نے کہا۔ جی ہاں! میں اِخَالَاكَ سَرَفْتُ، قَالَ: بَلَى، فَأَعَادَ نے کی ہے۔ آپ نے دو یا تین مرتبہ اسی طرح عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، فَأَمَرَ بِهِ، دھرایا، اس نے اقرار کیا تو اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فَقَطَعَ، وَجِيءَ بِهِ، فَقَالَ: «أَسْتَغْفِرُ صادر فرمایا۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے اللہ، وَتُبَ إِلَيْهِ». فَقَالَ: أَسْتَغْفِرُ بعد اسے آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے اسے اللہ، وَأَتُوبُ إِلَيْهِ. فَقَالَ: «اللَّهُمَّ تلقین فرمائی کہ ”اللہ سے اپنے گناہ کی بخشش مانگ تُبْ عَلَيْهِ“ ثَلَاثًا. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ اور اس سے توبہ کر۔“ اس نے کہا میں اللہ سے بخشش و مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس کے حضور

توبہ کرتا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ اس کے حق میں اللہ سے دعا فرمائی کہ ”الہی اس کی توبہ قبول فرما۔“ (اس حدیث کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے۔ الفاظ بھی اسی کے ہیں نیز احمد اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔)

وَأَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ، مِنْ حَدِيثِ اور حاکم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تخریجَ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، کی ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ ”اسے لے جاؤ فَسَاقَهُ بِمَغْنَاهُ، وَقَالَ فِيهِ: أَذْهَبُوا بِهِ اور ہاتھ کاٹ دو پھر اسے داغ دینا۔“ اور اسی کے ہم فَاَقْطَعُوهُ، ثُمَّ اخْشَمُوهُ. وَأَخْرَجَهُ معنی ذکر ہیں۔ (اسے ہزار نے بھی روایت کیا ہے اور کہا الْبَزَارُ أَيْضًا، وَقَالَ: لَا بَأْسَ ہے کہ اس کی سند میں کوئی نقص نہیں ہے۔) بِإِسْنَادِهِ.

لعنوا تشریح: ﴿مَا اِخَالَاكَ﴾ حمزہ کے نیچے کسرہ اور مضارع کا صیغہ ہے۔ معنی ہے میرا گناہ و خیال نہیں ہے۔ اِحْشَمُو حِسْم سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے باب مضرب مضروب سے۔ مقام قطع کو آگ سے داغنا تاکہ خون بہنے کی جگہیں اور راستے بند ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس نے عدالت کے روبرو چوری کا ایک بار اعتراف کر لیا ہو گو اس سے مال و متاع برآمد نہ ہوا ہو تو اس کی سزا قطع ید ہے۔ قطع ید کے بعد گرم تیل میں ہاتھ رکھنا یا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ خون بہنا بند ہو جائے۔ اگر بروقت اس کا یہ مداوانہ کیا جائے جس کے نتیجے میں خون بہہ کر وہ جاں بحق ہو گیا تو اس کی دہمت بیت المال پر پڑ جائے گی۔ اکثر علماء تو چور

ایک ہی اقرار و اعتراف کو کافی سمجھتے ہیں مگر امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق کے نزدیک چور کے دو مرتبہ اعتراف پر چوری ثابت ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث سے پہلے گروہ کی تائید ہوتی ہے۔
راوی حدیث: ﴿ابو امیہ مخزومی رحمہ اللہ﴾ ان کا تعلق حجاز سے ہے۔ مشہور صحابی ہیں لیکن ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے۔ حماد بن مسلمہ نے کہا ہے کہ وہ مخزومی ہیں اور حماد بن یحییٰ نے کہا ہے کہ ان کا تعلق انصار سے تھا۔

(۱۰۶۰) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا يُعْرَمُ كَرْدِي جَائِعٌ تَوْ بَحْرَمَالِ كِي ضَمَاتِ اسْ بِرْ نَمِيسْ» السَّارِقُ إِذَا أُقِيمَ عَلَيْهِ الْحَدُّ. رَوَاهُ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور خود ہی واضح کر دیا کہ یہ السَّارِقُ، وَبَيَّنَّ أَنَّهُ مُنْقَطِعٌ، وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ: هُوَ مُنْقَطِعٌ هِيَ اور ابو حاتم نے اسے منکر کہا ہے) مُنْكَرٌ.

لغوی تشریح: ﴿لا یعرم﴾ تعزیم سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے۔ اس حدیث کے حکم میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اگر چور کے پاس چوری شدہ مال برآمد ہوا تو اس سے لے لیا جائے گا ورنہ اس پر حد نافذ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا اور اس پر کوئی ضمانت نہیں ہوگی اور سبیل السلام میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم کے مطابق اسے منافی قرار دیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”ہاتھ ضامن ہے اس چیز کا جسے اس نے لیا تاوقتیکہ اسے ادا نہ کر دے۔“ انہی عبد الرحمن کی یہ حدیث ضعف کی بنا پر قابل استدلال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے کہ آپس میں باطل طریقہ سے اپنے اموال نہ کھاؤ۔ (۱۸۸: ۲) اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ”کسی مسلم مرد کا مال حلال نہیں الا یہ کہ وہ اپنی طیب نفس سے کھانے کی اجازت دے۔“ نیز اس لئے بھی کہ اس میں دو حق جمع ہو گئے۔ ایک اللہ کا حق اور دوسرا آدمی کا حق۔ ہر ایک حق اپنے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ نیز اس پر اجماع ہے کہ جب اصل مال اپنی حالت میں موجود ہو تو وہ لے لیا جائے گا جب وہ مال اس کی ضمان میں نہ پایا جائے گا تو دوسرے اموال واجبہ پر اس کو قیاس کیا جائے گا۔ اس قول کی قوت کسی پر مخفی نہیں ہے۔

(۱۰۶۱) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عَاصِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الثَّمْرِ الْمُعْلَقِ، فَقَالَ: «مَنْ أَصَابَ بِفِيهِ، مِنْ ذِي حَاجَةٍ، غَيْرَ مُتَّخِذٍ حُبْنَةً، فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ، فَخَصَّ كَپُرَے مِیں نہ بھرے تو اس پر کوئی سزا نہیں اور جو فَخَصَّ كَپُرَے مِیں ڈال کر ٹکل جائے تو اس پر تاوان

وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ الْغَرَامَةُ بھی ہے اور سزا بھی اور جو شخص ایسی صورت حال میں وَالْعُقُوبَةُ، وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بَعْدَ کھجوریں لے جائے کہ مالک نے توڑ کے محفوظ جگہ أَنْ يُؤْوِيَهُ الْجَرِينُ، قَبْلَ أَنْ يَمْلَأَ ثَمَنَ میں ڈھیر کر لیا ہو اور ان کی قیمت ایک ڈھال کی الْمَجْنُ، فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ قیمت کے مساوی ہو تو اس پر قطع ید کی سزا نافذ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. ہوگی۔“ (اسے ابوداؤد اور نسائی نے تخریج کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿المنر﴾ ٹا اور میم دونوں پر فتح۔ یعنی پھل ﴿المعلق﴾ درختوں پر لگے ہوئے۔ ﴿بفيه﴾ منہ سے کھائے۔ ﴿خبنة﴾ کپڑے کا پلو، مطلب ہے کہ کپڑے میں باندھ کر نہ لے جائے۔ ﴿الغرامة﴾ اسی کی طرح کا تاوان و ضمان۔ ﴿والعقوبة﴾ بطور سزا اور عبرت چند کوڑے۔ یووبہ اکھا کرتا ہے، جمع کرتا ہے۔ ﴿الجرین﴾ جیم پر فتح اور را کے نیچے کسرہ۔ کھجوروں کے خشک کرنے کی جگہ و مقام۔ جیسے گندم کیلے کھلیان ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی مختلف صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً پھل درخت کے اوپر ہی ہیں ابھی تک توڑنے کی نوبت نہیں آئی ایک بھوکا مسافر پھل توڑ کر کھا کر اپنی بھوک دفع کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں ایسے آدمی پر بالاتفاق نہ کوئی جرمانہ و تاوان عائد ہوگا اور نہ ہی اسے چوری کی سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا لیکن اگر پھلوں کو پہلے درختوں سے اتارے، پھر شکم سیر بھی ہو جائے مزید برآں کپڑے میں ڈال کر ساتھ لے جانے کی بھی تیاری کرے تو ایسی صورت میں اس پر جرمانہ و تاوان بھی عائد ہوگا اور سزا بھی دی جائے گی۔ بمعنی میں روایت ہے کہ جرمانہ مسروقہ مال کی قیمت سے دوگنا ہوگا اور سزا زیادہ سے زیادہ دس کوڑے اور اگر مالک نے پھل درختوں سے اتار کر ڈھیر کر لئے ہوں اور اس ڈھیر کی نوعیت محفوظ سلمان کی ہو اور اس میں سے چوری کی صورت میں بشرطیکہ اس کی قیمت نصاب تک پہنچ جائے تو اس میں قطع ید کی سزا نافذ ہوگی۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مالی جرمانہ بھی جائز ہے۔ نیز جمہور اہل علم نے سزائے قطع ید میں مال کے محرز و محفوظ کی جو شرط لگائی ہے ان کا استدلال بھی اسی حدیث سے ہے۔

(۱۰۶۲) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ کے بارے میں سفارش کی جس نے چادر چرائی تھی قَالَ لَهُ - لَمَّا أَمَرَ بِقَطْعِ الَّذِي سَرَقَ اور اس کے قطع ید کا حکم آپؐ نے فرمایا تھا کہ رَدَّاهُ فَشَمَّعَ فِيهِ - : «هَلَّا كَانَ ذَلِكَ قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ؟» أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ ”میرے پاس لانے سے پہلے تمہیں اس پر رحم و ترس کیوں نہ آیا۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا وَالْأَزْهَعِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ وَالْحَاكِمُ.

ہے اور ابن جارود اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

حاصل کلام: یہ چوری کا واقعہ یوں ہے کہ صفوان بن امیہ مقام بطحاء یا مسجد حرام میں لیٹے ہوئے تھے ایک آدمی آیا اور صفوان کے سر کے نیچے سے اس کی چادر کھینچ لی۔ اسے گرفتار کر کے نبی ﷺ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تو صفوان بولا میں نے اسے معاف کیا اور درگزر کیا۔ آپؐ نے فرمایا ”یہ تو نے میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں کیا؟“ پھر آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس حدیث میں یہ مسئلہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت و حاکم کے پاس چلا جائے تو پھر معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۱۰۶۳) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: جِيءَ بِسَارِقٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «اقْتُلُوهُ»، فَقَالُوا: إِنَّمَا سَرَقَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: «اقْطَعُوهُ»، فَقُطِعَ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّانِيَةَ، فَقَالَ: «اقْتُلُوهُ»، فَذَكَرَ مِثْلَهُ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّالِثَةَ، فَذَكَرَ مِثْلَهُ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الرَّابِعَةَ كَذَلِكَ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الْخَامِسَةَ فَقَالَ: «اقْتُلُوهُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَّمِيُّ، وَاسْتَنْكَرَهُ، وَأَخْرَجَ مِنْ حَدِيثِ الْحَارِثِ بْنِ حَاطِبٍ نَحْوَهُ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ أَنَّ الْقَتْلَ فِي الْخَامِسَةِ مَنْسُوخٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک چور کو لایا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ”اسے قتل کر دو۔“ لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! اس نے چوری کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ”تو پھر اس کا ہاتھ کاٹ دو“ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ اسے پیش کیا گیا تو پھر آپؐ نے فرمایا ”اسے مار ڈالو۔“ پھر اسی طرح ذکر کیا گیا۔ پھر اس کو تیسری بار لایا گیا تو پھر اسی طرح ذکر کیا۔ پھر چوتھی مرتبہ گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو اسی طرح ذکر کیا۔ پھر پانچویں مرتبہ گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ ”اسے قتل کر دو۔“ (اس کو ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اسے منکر قرار دیا ہے اور نسائی نے حارث بن حاطب کی حدیث سے اسی طرح اور شافعی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ پانچویں مرتبہ مار ڈالنا منسوخ ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں جرم چوری میں قتل کی سزا بیان ہوئی ہے۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ امام ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ روایت منکر اور بے اصل ہے اور تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ قابل عمل نہیں۔

راوی حدیث: ﴿حارث بن حاطب جمحی قرشی﴾ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر کی طرف سے مکہ میں ۶۶ھ میں والی مقرر ہوئے اور چھ سال کام کیا مروان کی امارت مدینہ کے دوران ان کے

ساتھ بھی کافی تعاون کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔

۴ - باب حَدِّ الشَّارِبِ وَبَيَانِ شَرَابِ پینے والے کی حد اور نشہ آور

الْمُسْكِرِ

چیزوں کا بیان

(۱۰۶۴) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ، فَجَلَدَهُ بِجَرِيدَتَيْنِ نَحْوَ أَرْبَعِينَ. قَالَ: وَقَعَلَهُ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فَلَمَّا كَانَ عَمْرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، اسْتَسَارَ النَّاسَ، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ: أَخَفْتُ الْخُدُودَ ثَمَانُونَ، فَأَمَرَ بِهِ عَمْرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی رکھی تھی۔ پس اس شخص کو دو چھڑیوں سے چالیس کے لگ بھگ کوڑے لگائے گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سزا دی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو انہوں نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہلکی ترین سزا اسی کوڑے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کا حکم صادر فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي قِصَّةِ الْوَلِيدِ بْنِ عُقْبَةَ: جَلَدَ النَّبِيُّ ﷺ أَرْبَعِينَ، وَأَبُو بَكْرٍ أَرْبَعِينَ، وَعَمْرُ ثَمَانِينَ، وَكُلُّ سُنَّةٍ، وَهَذَا أَحَبُّ إِلَيَّ. وَفِي هَذَا الْحَدِيثِ أَنَّ رَجُلًا شَهِدَ عَلَيْهِ أَنَّهُ رَأَى يَتَقَيَّ الْخَمْرَ، فَقَالَ عُثْمَانُ إِنَّهُ لَمْ يَتَقَيَّهَا حَتَّى شَرِبَهَا.

اور مسلم میں ولید بن عقبہ کے قصہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے چالیس اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چالیس اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے سزا دی اور ہر ایک سنت ہے اور یہ مجھے زیادہ محبوب ہے اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے ولید کے خلاف شہادت دی کہ اس نے ولید کو شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی نہ ہوگی تو قے کیسے ہوگی۔

لغوی تشریح: ﴿باب حد الشارب﴾ یعنی شراب پینے والا، شراب پینے کی حد اسی کوڑے ہے۔ ﴿بجريدتين﴾ شاخ خرما۔ کھجور کی چھڑی۔ اس کو جریدہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سے پتے جھڑ چکے ہوتے ہیں اور صاف ہوتی ہے۔ ﴿نحو اربعين﴾ ایک قول تو اس کی تفسیر میں یہ ہے کہ ہر ایک چھڑی

سے بیس مرتبہ مارا گیا ہوگا اور دونوں کی مجموعی تعداد چالیس ہوگی اور ایک قول یہ ہے کہ دونوں چھڑیوں کو اکٹھا کر کے چالیس مرتبہ مارا ہوگا اس طرح یہ اسی کی تعداد ہوگی۔ بظاہر پہلا معنی ہی متعین معلوم ہوتا ہے بلکہ دوسری روایات بھی اسی کی موید ہیں۔ ﴿اخف الحدود ثمانون﴾ حدود میں ہلکی اور خفیف ترین سزا اسی کوڑے میں اور یہ قذف کی سزا ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ نبی ﷺ کے عہد سعادت میں شراب نوشی کی حد متعین نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور ایک مقررہ حد یعنی اسی کوڑے متعین کر دیئے کیونکہ بعض اطراف و نواحی میں لوگ شراب نوشی میں کچھ زیادہ منہمک ہو گئے تھے اور اس کی سزا کو بے وزن و حقیر سمجھتے تھے جیسا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تحریر سے ثابت ہے۔ فقہاء کے درمیان اس کی حد کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ وہ چالیس کوڑے ہیں یا اسی۔

مگر نبی ﷺ کے فعل کو اخذ کرنا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ ﴿فی قصۃ الولید بن عقبہ﴾ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ولید بن عقبہ پر شراب نوشی کا اہتمام لگا۔ حرام اور ایک دوسرے آدمی نے اس کے خلاف گواہی دی۔ ان میں سے ایک نے تو یہ گواہی دی کہ میں نے ان کو شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے یہ گواہی دی کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک شراب پی نہ ہو اس وقت تک قے کیسے کر سکتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس پر حد لگائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اس پر حد لگاؤ۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا جو اس کے گرم کا والی ہوا وہی اس کے سرد کا بھی والی بنے۔ یعنی جو آدمی خلافت کی نرمی اور لذت سے لطف اندوز ہوا ہے وہی اس کی شدت اور کڑوی صورت کو بھی اختیار کرے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے اعضاء و اقرباء میری نسبت زیادہ ولایت و اختصاص رکھتے ہیں تو پھر ان کو ہی خلافت کی بری بھلی اور گندی باتوں اور حالات سے پنپنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اسے حد لگاؤ۔ انہوں نے کوڑا پکڑا اور حد نافذ کر دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ شمار کرتے جاتے تھے جب چالیس پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بس تیرے لئے یہ کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے چالیس (کوڑے) ہی لگائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ﴾ قرشی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ماں کی جانب سے بھائی تھے۔ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے۔ قریش کے ظریف، حلیم، بہادر اور ادیب لوگوں میں سے تھے۔ طبع زاد شعراء میں سے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ شراب نوشی کے الزام پر ان کو اس منصب سے معزول کر دیا۔ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد فتنہ سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے۔ رتہ میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی اور بلج میں دفن ہوئے۔

(۱۰۶۵) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ
تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ قَالَ

فِي شَارِبِ الْخَمْرِ: «إِذَا شَرِبَ» پئے تو اسے کوڑے مارو۔ پھر دوبارہ شراب نوشی فَاَجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الثَّانِيَةَ کرے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ پھر جب تیسری مرتبہ فَاَجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الثَّالِثَةَ شراب پئے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ مگر جب چوتھی دفعہ فَاَجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الرَّابِعَةَ شراب نوشی کرے تو اس کی گردن اڑا دو۔“ (اسے فَاَضْرِبُوا عُقُقَهُ، أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَهَذَا لَفْظُهُ، احمد نے بیان کیا ہے اور یہ الفاظ اسی کے ہیں اور چاروں وَالْأُزْبَعَةَ، وَذَكَرَ التِّرْمِذِيُّ مَا يَذُلُّ عَلَى أَنَّهُ نے بھی روایت کیا ہے اور ترمذی نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ مَنسُوخٌ، وَأَخْرَجَ ذَلِكَ أَبُو دَاوُدَ صَرِيحًا عَنْ تَوْاسٍ پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا قتل کرنا منسوخ ہے اور الزُّهْرِيُّ۔ ابو داؤد نے بالمرحہ زہری سے اس کی تخریج کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شرابی کو قتل کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اہل خواہر اور علامہ ابن حزم کی یہی رائے ہے مگر جمہور نے قتل کو منسوخ کہا ہے اور اس کی ناسخ ابو داؤد میں امام زہری کی روایت ہے کہ آنجناب ﷺ نے چوتھی بار شراب نوشی پر قتل نہیں کیا تھا صرف کوڑوں کی سزا پر اکتفا فرمایا تھا بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع نقل کیا ہے کہ شراب پینے والے شخص کیلئے کسی صورت بھی موت کی سزا نہیں ہے۔

(۱۰۶۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَّقِ الْوَجْهَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی حد لگائے تو چہرے کو بچائے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سزا دیتے وقت چہرے پر مارنے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح بچوں اور زیر دستوں کو اگر کسی امر مجبوری کی وجہ سے مارنے کی نوبت آجائے تو چہرے پر مارنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ چہرہ شرف انسانی کا ترجمان ہے۔ شرابی کی سزا کے موقع پر سر میں مٹی ڈالنا اور زجر و توبیخ کرنا بھی جائز ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ ایک حد میں ﴿فوطدی اخصیتین﴾ پر مارنے سے بھی منع فرمایا ہے البتہ سر پر مارنے کو بعض نے جائز رکھا ہے۔

(۱۰۶۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تُقَامُ الْحُدُودُ فِي جَانِبَيْنِ»۔ (ترمذی مستدرک حاکم)

المَسَاجِدِ۔ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالْحَاكِمُ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسجدوں میں حدود نہ لگائی جائیں۔“ (ترمذی مستدرک حاکم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مساجد میں حدود قائم نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ مساجد صرف اللہ کی

(۱۰۶۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ أُنْزِلَ اللَّهُ شَرَابٌ كَوْنُ حُرَّاقٍ قَدِ انْقَطَعَتْ مِنْهُ الشُّبُهَاتُ، وَنُفِثَ فِيهِ الْوَيْسُ وَالْمُسْكُورُ، وَمَا بِالْمَدِينَةِ شَرَابٌ يُشْرَبُ إِلَّا مِنْ تَمْرِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے تو مدینہ میں اس وقت صرف کھجور سے تیار کردہ شراب پی جاتی تھی۔ (مسلم)

(۱۰۶۹) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَزَلَ تَحْرِيمُ الْخَمْرِ وَهِيَ مِنْ خَمْسَةٍ: مِنَ الْعِنَبِ، وَالتَّمْرِ، وَالْعَسَلِ، وَالْحِنْطَةِ، وَالشَّعِيرِ، وَالْخَمْرِ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ. (بخاری و مسلم)

(۱۰۷۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ
 قَالَ: «كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.
 کی ہے کہ ”ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز
 حرام ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے وہ عصیر کی شکل میں ہو یا بنیذ کی یا

کسی اور شکل و صورت میں ہو۔

(۱۰۷۱) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «جَسَازٌ كَثِيرٌ مَقْدَارُ نَشَةِ آوَرٍ هُوَ اس كِ قَلِيلٍ مَقْدَارُ بَهِی حَرَامٍ هِـ»۔ (اس كِ تَخْرِجِ اَحْمَد اور اُخْرَجَهُ اُحْمَدُ وَالْاَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جَبَّانَ۔ چاروں نے كِ هِ اور ابن حبان نے اسے صحیح كھا هِ)

حاصل كلام: اس حدیث سے ثابت هِا كِه جس كا كَثِرا استعمال نَشَة آوَر هِو اس كا قَلِیل استعمال بَهِی حَرَام هِے۔ مگر احناف اور كوفه و بصره كے علماء كا خیال هِے كِه اَنُور اور كُھُور كے سوا جو شراب نَشَة دینے كِ مقدار تِك نہ پَنچے وه حلال هِے لیكن یه حدیث صراحتاً ان حضرات كے اس قول كِ تردید كرتی هِے۔

(۱۰۷۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُبْدُ لَهُ الرَّبِيبُ فِي السَّاءِ، كِا جاتا تها۔ اُپُ اس كو اس روز بَهِی اور دوسرے اور تیسرے روز بَهِی نوش فرماتے تھے۔ جب تیسرے روز كِ شام هوتی تو اسے نوش فرماتے اور دوسرے وَسَفَاهُ، فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ أَهْرَاقَهُ۔ كوپلا دیتے اور باقی ماندہ كو گرا دیتے۔ (مسلم) اُخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ﴿بَسَدٌ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی منقٰی سے نبیذ تیار كِ جاتی اور ﴿زَبِيبٌ﴾ خنك كَشش كو اور ﴿سَفَا﴾ چُڑے كے مشكیزه كو كتے هِیں۔ ﴿فان فضل﴾ یعنی تیسرے روز شام كو پینے كے بعد بَهِی وه اگر بچ جاتی تو اسے گرا دیتے مبادا اس میں نَشَة نہ پیدا هِو جائے۔

حاصل كلام: اس حدیث سے ثابت هِوا كِه اُپُ نبیذ استعمال فرماتے تھے مگر جب اس میں نَشَة كِ كیفیت كا گمان اور اندیشہ محسوس هِوتا تو اسے گرا دیتے نہ خود استعمال فرماتے اور نہ هِی كسی دوسرے كو تحفہ دیتے۔ اس حدیث كا قطعاً یه مفہوم نَہِیں كِه نبیذ كا استعمال تین دن تِك بھر نوح جائز هِے بلكه مقصد یه هِے كِه نَشَة سے پہلے تو اس كا استعمال جائز هِے بعد میں نَہِیں۔ خواه وه موسم كے لحاظ سے دوسرے روز هِی پیدا هِو جائے۔

(۱۰۷۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»۔ اُخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَصَحَّحَهُ حضرت ام سلمه رَضِیَ اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے روایت بیان كِ هِے كِه اُپُ نے فرمایا: «اللہ عز وجل نے جو چیز تمہارے لئے حرام قرار دے دی هِے اس میں تمہارے لئے شفا نَہِیں ركھی۔» (اسے بیہقی نے تَخْرِجِ

ابنِ جَبَّانَ. کیا ہے اور ابنِ حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی نشہ آور چیز میں اللہ تعالیٰ نے حقیقی شفا نہیں رکھی۔ اس لئے ان کا برائے علاج استعمال بھی ناجائز ہے۔

(۱۰۷۴) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ الْحَضَرَمِيِّ، حضرت وائل بن حضرمی سے روایت ہے کہ طارق أَنَّنَّ طَارِقَ بْنَ سُؤَيْدٍ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے شراب کے بارے عَنِ الْحَمْرِ يَصْنَعُهَا لِلدَّوَاءِ، فَقَالَ: میں پوچھا کہ وہ اسے دوا کیلئے بناتے ہیں۔ آپ نے «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِدَوَاءٍ، وَلَكِنَّهَا دَاءٌ». فرمایا ”یہ دوا بالکل نہیں بلکہ یہ بیماری ہے۔“

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَغَيْرُهُمَا. (اسے مسلم اور ابو داؤد وغیرہما نے تخریج کیا ہے)

حاصل کلام: شراب کو بطور دوا استعمال کرنا حرام ہے۔ یہ بذات خود بیماری ہے شفا نہیں ہے۔ راوی حدیث: ﴿طارق بن سوید حضرمی رضی اللہ عنہ﴾ صحابی ہیں۔ سوید بن طارق بھی کہا جاتا ہے۔ بعضی بھی کہا جاتا تھا۔ ان سے یہی ایک حدیث مروی ہے۔ اہل کوفہ نے ان سے روایت کیا ہے۔

۵ - بَابُ التَّغْزِيرِ وَخَمِّ الصَّائِلِ. تعزیر اور حملہ آور (ڈاکو) کا حکم

(۱۰۷۵) عَنْ أَبِي بُرْدَةَ الْأَنْصَارِيِّ حضرت ابو بردہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا يُجْلَدُ”حدود اللہ میں سے کسی حد کے سوا دس کوڑوں سے فَوْقَ عَشْرَةِ أَسْوَاطٍ إِلَّا فِي حَدٍّ مِنْ زیادہ سزا نہ دی جائے۔“ (بخاری و مسلم) حُدُودِ اللَّهِ تَعَالَى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿باب التعزیر﴾ سزا کو کہتے ہیں۔ جو حد سے کم ہوتی ہے اور یہ حسبِ حال قول و فعل دونوں طرح سے دی جاتی ہے، یہ عذر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں منع کرنا اور روکنا اور اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ قبیح فعل کو دوبارہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ ﴿لا یجلد﴾ صیغہ نفی کی صورت میں مجہول اور صیغہ نفی کی صورت میں یہ مجزوم ہوگا۔ ﴿فوق عشرة اسواط﴾ ایک روایت میں ”فوق عشرة جلدات“ اور ایک دوسری روایت میں ”فوق عشر ضربات“ کے الفاظ ہیں اور تینوں کا مطلب ایک ہی ہے کہ دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔ یہ حدیث حنفی، مالکی اور شافعی حضرات کے مخالف ہے، اس لئے کہ ان حضرات نے دس کوڑوں سے زیادہ سزا دینا جائز رکھا ہے۔ اس مسئلہ میں لمبی تفصیل ہے جس کا اس مقام پر بیان کا موقع نہیں۔ رائج بات وہی ہے جس پر یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ دس کوڑوں سے زائد کی سزا جائز نہیں۔

817 ————— حدود کے مسائل

راوی حدیث: ﴿ابوسردہ رضی اللہ عنہ﴾ بلوی قبیلہ سے تھے۔ شرف صحابیت سے سرفراز تھے۔ ان کا نام ہانی بن نثار رضی اللہ عنہ تھا۔ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۴۱ھ یا ۴۲ھ یا ۴۵ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۰۷۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”صاحب عز و شرف لوگوں کو بجز حدود الہی، ان «أَقْبِلُوا ذَوِي الْهَيْئَاتِ عَشْرَتِهِمْ إِلَّا» کی لغزشیں درگزر کر دیا کرو۔“ (اسے احمد، ابوداؤد، الحدود)۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِّيُّ نسائی اور بیہقی نے روایت کیا ہے)

وَالْبَيْهَقِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿اَقْبِلُوا ذَوِي الْهَيْئَاتِ﴾ اَقْبِلُوا سے ماخوذ ہے۔ یعنی صاحب شرف و صلاح اور مروت والے حضرات کو ان کی لغزشیں معاف کر دیا کرو۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر گرفت نہ کرو اور ﴿عشرة﴾ کے معنی لغزش کے ہیں۔

(۱۰۷۷) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں کسی پر ایسی تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: مَا كُنْتُ لِأُفْنِمَ حد نافذ نہیں کروں گا کہ وہ اس سے مرجائے اور عَلَى أَحَدٍ حَدًّا فَيَمُوتَ، فَأَجِدَ فِيَّ میں اس کا غم اپنے دل میں محسوس کروں سوائے نَفْسِي، إِلَّا شَارِبَ الْخَمْرِ، فَإِنَّهُ لَوْ شرابی کے اگر وہ سزا میں جاں بحق ہو جائے تو میں مَاتَ وَدَيْنُهُ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ. اس کی دیت ادا کروں گا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لَا قِيمَ﴾ مضارع پر نصب ”ان“ کے مقدر ہونے کی وجہ سے اور یہ ”ان“ نائبہ لام مکسورہ کے بعد ہے۔ اس لام کو گرائمر میں لام محذوہ کہتے ہیں۔ ﴿فَيَمُوتَ﴾ اور وہ مرجائے سزا کی وجہ سے۔ مضارع منصوب ہے۔ ﴿فَأَجِدَ﴾ نفی کے جواب میں واقع ہونے کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے۔ معنی ہوگا مجھے افسوس اور تاسف ہوگا۔ ﴿وَدَيْنُهُ﴾ میں اس کی دیت ادا کروں گا۔

حاصل کلام: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرابی کی سزا میں مرجانے کی صورت میں دیت کا جو فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شرابی کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ اس لئے شرابی کا سزا سے مرجانا قتل خطا کے زمرے میں آجاتا ہے اور قتل خطا میں دیت دینا لازم ہے اور جمہور علماء کا بھی یہی خیال ہے کہ تعزیر کی صورت میں وہ شخص مرجائے تو سربراہ مملکت پر اس کی دیت ادا کرنا ضروری ہے۔

(۱۰۷۸) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ اللّٰهُ ﷻ نے فرمایا ”جو شخص اپنے مال و متاع کی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، وہ شہید ہے۔“ (اسے فَهُوَ شَهِيدٌ. رَوَاهُ الْأَيْتِيُّ، وَصَحَّحَهُ چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا

الترمذی.

(ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال لوٹنے والے کو ہر طرح اور ہر ممکن طریقہ سے دفع کرنا اور اس کا مقابلہ کرنا جائز ہے بلکہ بعض نے تو اپنا دفاع کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اس دفاعی کشمکش میں ڈاکو کو اگر مالک قتل کر دیتا ہے تو قاتل پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت۔ اس کا قتل رائیگاں گیا۔ اسی طرح جو کوئی اپنے دین و ایمان کا تحفظ اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں خود قتل ہو جائے تو مرتبہ شہادت اور اگر دوسرے کو قتل کر دیا تو قصاص و دیت معاف۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ اسلام نے جان، مال اور عزت کی حفاظت کو کتنی اہمیت دی ہے۔

(۱۰۷۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ خَبَّابٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «تَكُونُ فِتْنٌ، فَكُنْ» هِيَ كَمَا «مِيرے بعد فتنے رونما ہوں گے۔ اے اللہ فیہا عَبْدُ اللَّهِ الْمَقْتُولُ، وَلَا تَكُنْ كَمَا تَكُنْ» (اس کو ابن ابی عیشہ اور دارقطنی نے نکالا ہے اور احمد و أخرجه أحمد نحوه عن خالد ابن عرفة. نے اسی طرح خالد بن عرفطہ سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فتن﴾ فتنہ کی جمع ہے اور یہاں اس سے مراد قتل نفوس اور خوریزیاں ہیں اور اس حدیث میں ارشاد ہے کہ فتنوں کے دور میں الگ ہو کر بیٹھ جانا اور اس میں حصہ نہ لینا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہے کہ جب دو گروہ بغیر حق و استحقاق کے باہم لڑ پڑیں یا پھر یہ کہ اس لڑائی میں حق کی وجہ آدمی کو معلوم نہ ہو سکے جب اسے معلوم ہو جائے کہ حق فلاں کے ساتھ ہے تو پھر حق کی مدد اور باطل کے دفع کرنے میں تگ و دو اور دوڑ دھوپ اس پر واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فقاتلوا التي تبغى حتى تفي الى امر الله (۹:۳۹)

مگر جب اس پر کوئی ہجوم کر لے اور اسے قتل کرنا چاہے یا اس کا مال و متاع لوٹنا چاہے یا ایسی ہی کوئی دوسری صورت رونما ہو جائے تو اس حدیث کی رو سے اسے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا چاہئے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اس سے لڑنا چاہئے اور اس دفاعی و حفاظتی لڑائی میں اگر وہ مارا جائے گا تو مرتبہ شہادت پالے گا۔ بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں امور میں سے جو مصالح کے موافق ہو اسے اختیار کر لے۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن خباب﴾ مدنی ہیں۔ ثقہ تابعین میں شمار ہوتا ہے۔ ۲۷ھ کو نمرवान کے راستے پر حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کے بعد خارجیوں نے انہیں قتل کیا۔ اور ان کے قتل کے بعد وہ ان کے گھر گئے اور ان کی بیوی کا پیٹ پھاڑا اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہی واقعہ مشہور جنگ، جنگ

819 حدود کے مسائل

نہروان کا باعث بن گیا، جس میں حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں سارے خارجی قتل ہو گئے۔ صرف سات بچے جو بعد میں اٹھنے والے بڑے فتنے کے لیے جراثیم ثابت ہوئے۔

﴿خباب﴾ خباب میں باء پر تشدید۔ خباب بن ارت بن جندلہ تمیمی۔ اللہ کے راستے میں شادی نہ کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ بدری صحابی ہیں۔ جنگ صفین سے واپسی پر کوفہ میں ۳۷ھ کو ۷۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

﴿خالد بن عرفطہؓ﴾ قضاعی عذری ہیں۔ عذرہ قبیلہ سے تھے۔ شرف صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ کوفہ پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی جانب سے حاکم تھے۔ ۶۱ھ میں وفات پائی اور یہ کہا گیا ہے کہ مختار بن ابی عبید نے یزید کی موت کے بعد ان کو قتل کر دیا۔ یہ ۶۴ھ کی بات ہے۔



۱۱۔ کِتَابُ الْجِهَادِ

مسائل جہاد

(۱۰۸۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ مَاتَ، وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ يَفَاقِرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص ایسی حالت میں مر گیا کہ اس نے نہ کبھی جہاد میں حصہ لیا اور نہ کبھی اس کے دل میں یہ خیال آیا اور نہ اس کی خواہش و تمنا پیدا ہوئی تو اس کی موت نفاق کے شعبہ پر ہوئی۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجہاد﴾ جہاد لغت میں مشقت اور کوشش کو کہتے ہیں اور شرعاً دین اسلام کی حفاظت و حمایت اور کلمۃ اللہ کو بلند و بالا کرنے کی غرض سے قتال اور باغیوں سے لڑنے میں اپنی پوری جدوجہد کرنا اور سعی و کوشش صرف کرنا جہاد کہلاتا ہے۔ ﴿ولم یغز﴾ غزو سے ماخوذ ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ اس نے دشمنان دین سے کبھی لڑائی نہیں کی۔ ﴿ولم یحدث نفسه به﴾ اور نہ اس کے خیال میں یہ چیز وارد ہوئی اور نہ اس کے دل میں اس کی نیت تھی کہ وہ اس کا وقت آنے پر اور قتال کے ممکن ہونے پر ان سے لڑے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کم از کم جہاد فی سبیل اللہ کی پختہ نیت رکھنا واجب ہے۔ اگر جہاد فی سبیل اللہ میں عملاً شریک ہونے کا موقع میسر آجائے تو اس میں شریک ہونے سے گریز نہ کرے بلکہ ایسے موقع کو سعادت سمجھے اور اگر موقع میسر نہیں آتا تو پھر موقع کے انتظار میں رہے گویا کہ حسب موقع ہر وقت ایک مومن پر جہاد فی سبیل اللہ فرض ہے اور اسلامی زندگی اسی جذبہ قربانی سے وابستہ ہے۔ اگر ایک مومن اپنا نصب العین ہی فراموش کر دے تو پھر مومن اور کافر میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ مومن کا تو فرض منصبی ہی کلمۃ اللہ کی سربلندی ہے اگر وہ اپنے حقیقی فرض سے تغافل برتے گا تو اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

(۱۰۸۱) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ مَاتَ، وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ يَفَاقِرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: فرمایا ”مشرکین سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی
”جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ، زبانوں سے جہاد کرو۔“ (اسے احمد اور نسائی نے روایت
وَأَنْفُسِكُمْ، وَأَلْسِنَتِكُمْ۔ رَوَاهُ أَحْمَدُ کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا)
وَالشَّامِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ۔

لغوی تشریح: ﴿الجهاد باللسان﴾ جہاد باللسان زبان سے جہاد یہ ہے کہ کافروں پر جہت قائم
کردی جائے۔ ان کو توحید الہی کی جانب دعوت دی جائے اور ان کی جھوکی جائے اور اس طرح ان کو رسوا
اور ذلیل کیا جائے کہ ان کی ہمتیں بیٹھ جائیں اور لڑائی سے بزدلی دکھائیں اور میدان میں نہ آئیں۔
حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خدا کے باغیوں، سرکشوں، لہدوں اور بے دین لوگوں کے
خلاف جہاد فی سبیل اللہ کیلئے خود کو ہر لمحہ مستعد رکھے۔ اس سلسلہ میں مال خرچ کرے، زبان سے جہاد
کرے، کافروں پر توحید و رسالت اور آخرت کو تسلیم کرنے پر دلائل پیش کرے۔ آج کے دور میں میڈیا
ایسا موثر اور عالم گیر ہتھیار ہے کہ لڑنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی اذہان و خیالات اور نظریات کو یکسر
تبدیل کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ شعر و شاعری اور اچھے مضامین کے ذریعہ اس جہاد میں حصہ لینا اس دور کی
اہم ترین ضرورت ہے۔

(۱۰۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے
تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا خواتین پر
رَسُولَ اللَّهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ بھی جہاد ہے؟ فرمایا ”ہاں! جہاد ہے جس میں لڑائی
قَالَ: «نَعَمْ، جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيهِ، هُوَ نہیں۔ وہ ہے حج اور عمرہ۔“ (اسے ابن ماجہ نے روایت
الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ۔ رَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَأَضْلَعَهُ کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)
فِي الْبُخَارِيِّ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکور ہے کہ خواتین کا جہاد لڑنا، مارنا نہیں بلکہ ان کیلئے حج اور عمرہ جہاد
ہے۔ جہاد میں انسان کو سفری صعوبتیں، مشقتیں، تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ حج
و عمرہ میں بھی ان سب مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے خواتین کو حج و عمرہ کا ثواب جہاد کے برابر
ملا ہے۔ اسی بنا پر حج و عمرہ کو خواتین کیلئے جہاد قرار دیا گیا ہے گویا خواتین پر جہاد باسیف فرض نہیں۔ اس کا
ثواب اسے حج اور عمرہ ادا کرنے کی صورت میں مل جاتا ہے۔

(۱۰۸۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَاءَ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا
رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْتَأْذِنُهُ فِي اور وہ جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

الْجِهَادِ، فَقَالَ: «أَحْيِ وَالِدَاكَ؟» آپؐ نے فرمایا ”کیا تیرے والدین بقید حیات ہیں؟“
فَقَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَفِيهِمَا خِدْمَت) میں جد و جہد کرو۔“ (بخاری و مسلم) مسند احمد

اور ابو داؤد میں ابوسعید کی روایت بھی اسی طرح
وَلَا حَمْدَ وَأَبِي دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ نَحْوَهُ، وَزَادَ: «أَرْجِعْ،
فَأَسْتَأْذِنُهُمَا، فَإِنْ أَدِنَا لَكَ، وَإِلَّا فَبِرَّهُمَا»۔
منقول ہے۔ اس میں اضافہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا
”واپس چلے جاؤ“ ان سے اجازت طلب کرو۔ پھر اگر
وہ دونوں تجھے اجازت دے دیں تو درست ورنہ ان
کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرو۔“

لعوی تشریح: ﴿فبرہما﴾ امر ہے ”بر“ سے باب سمع ہے یعنی اچھا سلوک کرو۔
حاصل کلام: اس حدیث سے والدین کی اہمیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں جہاد جیسا
فریضہ بھی والدین کی رضامندی کے بغیر ادا نہیں کیا سکتا۔ آج کا نوجوان والدین کو خاطر میں لانے کیلئے تیار
ہی نہیں۔ اپنی من مانی کرتا ہے، اپنی رائے کا پابند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ والدین کی رضامندی کو اتنی
اہمیت اس لئے دی گئی ہے کہ جہاد سب پر تو فرض کفایہ ہے اور والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔ ظاہر
ہے کہ فرض عین کو فوقیت حاصل ہے۔

(۱۰۸۴) وَعَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مِنْ هَرِاسِ مُسْلِمٍ سَبِيحَةُ يَوْمٍ أَمَّا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ الْمُشْرِكِينَ»۔ رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَرَجَّحَ الْبُخَارِيُّ إِسْنَادَهُ۔
حضرت جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: «مِنْ هَرِاسِ مُسْلِمٍ سَبِيحَةُ يَوْمٍ أَمَّا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ الْمُشْرِكِينَ»۔
ہوں جو مشرکین میں قیام پذیر ہو۔“ (اسے تینوں نے
روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے مگر بخاری نے اس
کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسلمان کفار کے درمیان مقیم ہوں اور مجاہدین کے
ہاتھوں ان کا قتل ہو جائے تو مجاہدین پر اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اس فعل پر ان کو مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔
حالات کے تقاضا کے مطابق مشرکین کے گھروں اور علاقوں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

راوی حدیث: ﴿جریر بن عبد اللہؓ﴾ ان کی کنیت ابو عمرو ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ جریر بن عبد اللہ
بن جابر بن بکلی۔ بکلی قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے بکلی کہلائے۔ بکلی کے ”با“ پر فتح اور جیم ساکن۔ ۱۰ھ میں
دارۃ اسلام میں داخل ہوئے نبی ﷺ نے ان کے اعزاز کیلئے کپڑا بچھایا اور ان کو ذی الخلفہ بت کو منہدم
کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ انہوں نے اسے گرا دیا۔ آپ کے زمانہ میں ان کو یمن پر عامل مقرر کیا گیا۔ ان کا کتنا
تھا کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا اس روز سے آپ نے مجھ سے حجاب نہیں کیا اور مجھے ہمیشہ

مسائل جہاد 823

مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ان کی جوتی کا سائز ایک ہاتھ کے برابر تھا۔ مدائن کی فتح کے موقع پر حاضر تھے اور جنگ قادسیہ میں ان کو فوج کے میمنہ پر متعین کیا گیا ان کو اس امت کا یوسف کہا گیا ہے۔ ۵۲ھ میں یا ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۱۰۸۵) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، لَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں اللہ ﷻ: «لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، لَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ» لیکن جہاد اور نیت باقی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: «لا ہجرۃ بعد الفتح» فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں کا مطلب یہ ہے کہ مکہ سے بالخصوص مدینہ کی طرف ہجرت نہیں ہے اس لئے کہ جب مکہ دارالسلام بن گیا تو اب دارالسلام میں ایک شر سے دوسرے شر کی طرف ہجرت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مکہ سے خروج جائز نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اب مکہ سے ہجرت کرنا واجب نہیں اور نہ ہی اب اسے ہجرت کا ثواب ملے گا۔ (فتح الباری) البتہ دارالکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت قیامت تک باقی رہے گی جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے ﴿ولکن جہاد و نیت﴾ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بھلائی اور خیر جو ہجرت کے انقطاع پر منقطع ہو چکی ہے اس کا حصول جہاد اور صالح نیت کے ذریعہ ممکن ہے۔

(۱۰۸۶) وَعَنْ أَبِي مُوسَى حَضْرَتِ ابْنِ اشْعَرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ لَرَاكَ اللَّهُ كَاكَلَهُ بَلَدٌ هُوَ تَوَدَّ اللَّهُ كِي رَاهُ فِي لُزْنِ قَاتِلَ لَتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ وَاللَّهِ» (بخاری و مسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ الأشعري رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ لَرَاكَ اللَّهُ كَاكَلَهُ بَلَدٌ هُوَ تَوَدَّ اللَّهُ كِي رَاهُ فِي لُزْنِ قَاتِلَ لَتَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ وَاللَّهِ» (بخاری و مسلم)

(۱۰۸۷) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ السَّعْدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَنْقَطِعُ الْجَنَّةُ جَارِي رَهْ كِي هِجْرَتُ بَهِ كَارِي رَهْ كِي» (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.)

حضرت عبد اللہ بن سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ السَّعْدِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَنْقَطِعُ الْجَنَّةُ جَارِي رَهْ كِي هِجْرَتُ بَهِ كَارِي رَهْ كِي» (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.)

حاصل کلام: مندرجہ بالا تین احادیث کا مطلب یہ ہے کہ آغاز اسلام کے وقت چونکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور مرکز مدینہ منورہ کو مضبوط اور طاقتور کرنا تھا اس لئے یہ مقصد ہجرت کے بغیر حاصل ہونا نہایت ہی دشوار اور مشکل تھا۔ اس لئے ہجرت ایک مسلمان کیلئے فرض تھی۔ ابن جریر کی حدیث میں

اس کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مکہ فتح ہو گیا تو اس کے بعد مختلف قبائل پے درپے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور اسلامی ریاست کی توسیع ہو گئی۔ تو مدینہ میں ہجرت کر کے آنا فرض نہ رہا جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔ اب یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شخص دارالکفر میں اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہو تو اس کو دارالسلام کی جانب ہجرت کرنا اب بھی فرض ہے۔ ابن سعدی کی حدیث کا یہی مطلب و مفہوم ہے یعنی فتح مکہ کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور دارالسلام کی طرف ہجرت کا حکم اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

راوی حدیث: ﴿عبد اللہ بن سعدی رضی اللہ عنہ﴾ صحابی تھے۔ قرشی اور عامری تھے۔ واقدی نے کہا ہے کہ ان کی وفات ۷۵ھ میں ہوئی اور سعدی کا نام عمرو یا قدامہ یا عبد اللہ بن وقدان تھا۔

(۱۰۸۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ: أَغَارَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى بَنِي الْمُصْطَلِقِ، وَهُمْ غَارُونَ، فَقَتَلَ مَقَاتِلَهُمْ، وَسَبَى ذَرَارِيَهُمْ. حَدَّثَنِي بِذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ عُمَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مصطلق پر شب خون مارا تو اس وقت یہ لوگ بے خبر و غافل تھے۔ پس آپ نے ان کے لڑائی کرنے والوں کو قتل کیا اور ان کی اولاد کو قیدی بنا لیا۔ یہ مجھ سے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اغار علی بنی المصطلق﴾ بنی المصطلق پر ٹوٹ پڑے، شب خون مارا۔ یہ بڑا مشہور قبیلہ بنو خزاعہ کی شاخ تھی۔ ﴿غارون﴾ ”را“ پر تشدید اور بے خبر و غافل لوگ۔ ﴿مقاتلتہم﴾ یعنی جنگ کے قاتل لڑنے والے لوگ۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں شامل نہیں۔ ﴿وسبی ذراریہم﴾ ان کی اولاد اور عورتوں کو قیدی بنا لیا۔ یہ معرکہ ۶ھ شعبان میں واقع ہوا۔ جو غزوہ مریسج کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مریسج کے میم پر ضہ اور ”را“ پر فتح۔ یہ چشمہ تھا جو جدہ اور رابغ کے درمیان واقع تھا۔ قدید کے قریب بنی المصطلق اس مقام پر آباد تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع موصول ہوئی کہ یہ لوگ آپ سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے ان کو راتوں رات جالیا اور ایسا شب خون مارا کہ ان کے دس آدمی قتل کر دیئے اور باقی مردوں اور عورتوں کو قید کر لیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کا ایک آدمی بھی شہید نہ ہوا۔ اسی معرکہ میں حضرت جویریہؓ قید ہوئیں۔ یہ دراصل حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئی تھیں۔ ثابت نے ان سے مکاتبت کر لی، رسول اللہ ﷺ نے جویریہ کی مکاتبت خود ادا فرما کر ان سے شادی کر لی۔ جب لوگوں نے سنا کہ آپ نے جویریہ کو اپنے حرم میں داخل فرما لیا ہے تو لوگوں نے ان کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان کی شادی کی وجہ سے ان کے اہل خانہ کے سوا افراد آزاد ہوئے۔ پس حضرت جویریہؓ اپنی قوم کیلئے بہت بابرکت ثابت ہوئیں۔ یہی وہ غزوہ ہے جس میں واقعہ اُفک رونما ہوا۔ اس واقعہ

کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

(۱۰۸۹) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ،
عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ
إِذَا أَمَرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ،
أَوْصَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللَّهِ، وَبِمَنْ
مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا، ثُمَّ قَالَ:
«اغْزُوا بِسْمِ اللَّهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ،
فَاتْلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ، اغْزُوا، وَلَا
تَغْلُوا، وَلَا تَغْدِرُوا، وَلَا تُمَثِّلُوا،
وَلَا تَقْتُلُوا وَلِدَاءَ، وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَاذْغُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ
خِصَالٍ، فَأَيَّتَهُنَّ أَجَابُوكَ إِلَيْهَا فَاقْبَلْ
مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ: اذْغُهُمْ إِلَى
الْإِسْلَامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ،
ثُمَّ اذْغُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ
إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا
فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَغْرَابِ
الْمُسْلِمِينَ، وَلَا يَكُونُ لَهُمْ فِي
الْفَنِيْمَةِ وَالْفَنِيءِ شَيْءٌ إِلَّا أَنْ
يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنْ هُمْ
أَبَوْا، فَاسْأَلْهُمْ الْحِزْبَةَ، فَإِنْ هُمْ
أَجَابُوكَ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا
فَاسْتَعِزَّ بِاللَّهِ تَعَالَى وَقَاتِلْهُمْ، وَإِذَا
حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ، فَأَرَادُوكَ أَنْ
تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللَّهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ فَلَا
تَفْعَلْ، وَلَكِنْ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ،
فَإِنْكُمْ أَنْ تَخْفِرُوا ذِمَّتَكُمْ أَهْوَى مِنْ

أَنْ تَخْفِرُوا ذِمَّةَ اللَّهِ، وَإِذَا أَرَادُوكَ أَنْ تَنْزِلَهُمْ عَلَى حُكْمِ اللَّهِ فَلَا تَفْعَلْ، بَلْ عَلَى حُكْمِكَ، فَإِنَّكَ لَا تَذَرِي أَنْصَبُ فِيهِمْ حُكْمَ اللَّهِ أَمْ لَا». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

ذمہ ان کو دے دو۔ (اس کے خلاف نہ کرنا۔) اس لئے کہ اگر تم اپنے عہد و ذمہ کو توڑتے ہو تو یہ اللہ کی پناہ کو توڑنے سے بہت خفیف و ہلکا ہے اور جب یہ چاہیں کہ تو ان کو اللہ کے حکم و فیصلہ پر اتارے تو ایسا نہ کرنا بلکہ اپنے حکم و فیصلہ پر اتارنا کیونکہ تجھے علم نہیں کہ تو اللہ کے فیصلہ پر پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔“ (مسلم)

لعوی تشریح: ﴿امرا میرا﴾ امر فعل ماضی ہے۔ باب تفعیل سے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے امیر لشکر بنایا اور لشکر کی قیادت پر مقرر کیا۔ ﴿سریہ﴾ سین پر فتح، را کے نیچے کسرہ اور ”یا“ پر تشدید۔ لشکر کا حصہ، چھوٹا لشکر اور اہل مغازی کی اصطلاح میں سریہ اس مہم کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ بذات خود شریک نہ ہوئے ہوں۔ ﴿فی خاصتہ﴾ بالخصوص اپنے حق میں۔ ﴿ومن معہ﴾ خاصہ پر اس کا عطف ہے۔ معنی ہے کہ آپ قائد لشکر کو ان کے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی و بھلائی کی وصیت فرماتے تھے۔ ﴿ولا تغلوا﴾ باب نصر بنصر۔ غلول سے ماخوذ ہے یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو۔ ﴿ولا تغدروا﴾ غدر سے ماخوذ ہے یعنی عہد شکنی نہ کرو۔ ﴿ولا تمشلوا﴾ ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے یعنی مثلہ نہ کرو۔ مثلہ کہتے ہیں مقتول کے اعضاء بدن ناک، کان اور عضو مخصوص وغیرہ کو الگ الگ کاٹنا۔ ﴿ولیدا﴾ بچہ۔ مراد یہاں یہ ہے کہ وہ بچہ جو ابھی سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو اور وہ احکام شریعت کا مکلف نہ ہو۔ ﴿الی ثلاث خصال﴾ خصال خصلہ کی جمع ہے۔ تین امور میں سے کسی ایک کی طرف دعوت دو۔ ﴿وکف عنہم﴾ باب نصر، کف سے امر کا صیغہ ہے۔ ان سے لڑائی سے رک جاؤ۔ ﴿ثم ادعہم الی التحول﴾ پھر ان کو ہجرت کرنے اور منتقل ہونے کی دعوت دو اور یہ پہلی خصلت کی تکمیل ہے ﴿فان ہم ابوا فاجبرہم﴾ یعنی قبول اسلام کے بعد اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں۔ ﴿الغنیمة﴾ جہاد اور جنگ کے بعد کافروں کے وہ اموال جو مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ﴿الفسی﴾ وہ اموال جو بغیر جہاد اور لڑائی کے مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ﴿فان ہم ابوا فاسالہم الجزیہ﴾ یہ تینوں خصلتوں میں سے دوسری خصلت ہے۔ مطلب ہے کہ یہ قبول اسلام سے انکاری ہوں تو پھر ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ جزیہ کی جیم کے نیچے کسرہ اور ”زا“ ساکن ہے۔ اسلامی مملکت میں ذمیوں سے ان کی حفاظت ان کے خون کے تحفظ اور ان کے اموال و اعراض کی حفاظت کے عوض جو کچھ لیا جائے اسے جزیہ کہتے ہیں۔ ﴿فان ہم ابوا فاستعن باللہ﴾ یہ تیسری خصلت ہے یعنی اگر وہ جزیہ دینے سے انکار کریں تو پھر اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے ان سے لڑو۔ ﴿اہل حصن﴾ حصن کے معنی قلعہ کے ہیں۔ ﴿فادادوک﴾ پھر وہ اپنے آپ کو تیرے سپرد کرنا چاہیں بشرطیکہ تو ان کو اللہ کے ذمہ و ضمان اور اس کے عہد

وامان کی ذمہ داری دے۔ ﴿تخفروا ذمکم﴾ یہ باب ضرب اور نصر دونوں سے ہے۔ باب افعال سے بھی آتا ہے یہ کہ اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیں۔ ﴿ان تنزلہم﴾ باب افعال سے۔ جنگ کے دوران نزول سے مراد ہے اپنے آپ کو حوالہ کر دینا، سپرد کر دینا۔ یعنی جب وہ غیر مشروط طور پر بغیر کسی معین شرط اور پختہ عہد کے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کرنے پر تیار ہوں تو فیما۔ ورنہ مجرد اللہ کے حکم کے مطابق تم سے معاملہ کا مطالبہ کر لیں تو تو ایسا نہ کرنا کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ اللہ نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟

حاصل کلام: حدیث اصول جہاد کے بڑے معتبر اصول پر مشتمل ہے۔ جو معمولی سے غور و تامل سے واضح ہو جاتے ہیں۔ فقہاء کی رائے اکثر مسائل میں مختلف ہے۔ اس موقع پر تفصیل اور طویل بحث میں جانے کی چنداں ضرورت و حاجت نہیں بلکہ نصوص کو علی الاطلاق لینا بحث و مباحثہ کی طرف جھکاؤ سے کہیں بہتر اور اولیٰ ہے۔

(۱۰۹۰) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جب کسی غزوہ پر جانا چاہتے تو توریہ (غیر سے) كَانَ إِذَا أَرَادَ غَزْوَةً وَرَى بِغَيْرِهَا. (چھپانے) سے کام لیتے۔ (بخاری و مسلم) مَقْرَنٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿وری﴾ توریہ سے ہے، توریہ کے معنی یہ ہیں کہ اشارہ کسی اور طرف اور جانا کسی اور طرف۔ مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ جاسوس اور مخبر کو معلوم نہ ہو سکے کہ کدھر کا پروگرام ہے تاکہ دشمن پہلے ہی محتاط نہ ہو جائے۔ مثلاً جانا جنوب کی طرف ہوتا تھا اور دریافت احوال شمال یا مشرق یا مغرب کے کرتے تھے تاکہ دشمن کو بے خبری اور حالت غفلت میں جالیں اور جاسوس کو صحیح اطلاع کا حصول ممکن ہی نہ رہے۔ دشمن اسلام کے خلاف اس قسم کی حکمت عملی اصطلاحاً توریہ ہے، اسے دھوکہ نہیں کہا جاسکتا۔

(۱۰۹۱) وَعَنْ مَعْقِلٍ، أَنَّ الثُّعْمَانَ بْنَ مَقْرَنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا لَمْ يُقَاتِلْ أَوَّلَ النَّهَارِ آخَرَ الْقِتَالِ حَتَّى تَزُولَ الشَّمْسُ، وَتَهُبُّ الرِّيحُ وَيَنْزِلَ النَّضْرُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ، وَأَضْلَعَهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت معقل سے روایت ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ آپ جب دن کے آغاز میں لڑائی شروع نہ کرتے تو پھر زوال آفتاب کے بعد لڑائی شروع کرتے۔ موافق ہوائیں چلتی تھیں اور مدد کرتی تھیں۔ (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے مشرک سے جنگ میں تعاون لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ جنگ بدر کی طرف آپؐ تشریف لے جا رہے تھے۔ حرہ پر جب پہنچے تو ایک مشرک آپؐ کے ساتھ آلا۔ وہ جرأت و بہادری میں مشہور تھا مگر اس نے آتے ہی عرض کیا کہ میں آپؐ کے ساتھ مل کر غنیمت کے حصول کیلئے شامل ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”اللہ پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟“ اس نے کہا نہیں۔ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”میں کسی مشرک سے مدد کا طلبگار نہیں ہوں۔“ جب وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا تو اسے اجازت مرحمت فرمادی۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں۔ ایک جماعت کا خیال تو یہی ہے کہ امداد لینا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کی رائے ہے کہ بوقت ضرورت امداد لینا جائز ہے جیسا کہ آپؐ نے جنگ حنین کے موقع پر صفوان بن امیہ وغیرہ سے اسلحہ کی امداد لی تھی اور یقیناً کے یہودیوں سے بھی امداد لی تھی۔ بہر حال اسلحہ کی امداد اور افرادی امداد دونوں کی شدید ضرورت و حاجت کے موقع پر لینے کی گنجائش ہے۔

(۱۰۹۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ
 اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ
 رَأَى امْرَأَةً مَفْتُولَةً فِي بَعْضِ
 مَغَازِيهِ، فَأَنْكَرَ قَتْلَ النِّسَاءِ
 وَالصَّبِيَّانِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کسی غزوہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے تو اس کے بعد آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمادیا۔ (بخاری و مسلم)

نفعوی تشریح: ﴿مغازیہ﴾ مغازی سے مراد غزوات ہیں اور مغزی کی جمع ہے اور غزو کے معنی میں مستعمل ہے۔ جس کے معنی لڑائی و جنگ کے ہیں۔ عورت کے قتل کرنے کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے ہاں اگر وہ شریک جنگ ہو کر لڑے تو ایسی عورت کا قتل جائز ہے۔

(۱۰۹۵) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَفْتُلُوا شُبُوحَ الْمُشْرِكِينَ، وَاسْتَبْقُوا شَرَّحَهُمْ». زَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مشرکین کے تجربہ کار و ماہر عمر رسیدہ لوگوں کو قتل کر دو اور بلوغت کی عمر کو نہ پہنچنے والوں کو باقی رہنے دو۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

نفعی تشریح: ﴿شیخ﴾ طاقتور و جاندار، تجربہ کار و ماہر لوگ۔ اس سے وہ لوگ مراد نہیں ہوتے جو بہت بوڑھے ہوں جن میں لڑنے کی قوت و طاقت ہی نہ ہو اور نہ صاحب رائے ہوں۔ ﴿شرحہم﴾

شین پر فتح اور ”را“ ساکن۔ ایسے نو عمر جو ہنوز بالغ نہ ہوئے ہوں۔ پس بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دشمنان اسلام کے ان بوڑھوں کو قتل کرنا جائز ہے جو جنگی مہارت و تجربہ اور جسمانی و ذہنی قوت رکھتے ہوں اور نابالغ بچوں کو قتل کرنے سے اجتناب کیا جائے گا۔ ویسے بھی نوخیز نسل سے زیادہ امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دائرۃ اسلام میں جلد داخل ہو کر اسلام کے پھیلانے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے جبکہ معروہ عمر رسیدہ لوگوں سے اس کی امید کم ہی ہوتی ہے۔

(۱۰۹۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ انہوں نے بدر تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ تَبَارَزُوا يَوْمَ بَدْرٍ کے روز ان (کافروں) کو دعوت مبارزت دی۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ مُطَوَّلًا۔ (بخاری) اور ابو داؤد میں یہ حدیث طویل ہے)

لغوی تشریح: ﴿انہم﴾ سے خود حضرت علیؑ، حضرت حمزہؑ اور عبیدہ بن حارثؑ مراد ہیں۔ ﴿تبارزوا﴾ مبارزت کی صورت اس طرح ہوتی تھی کہ باقاعدہ لڑائی کے آغاز سے پہلے دونوں طرف سے دو یا زیادہ نوجوان فریق مخالف کے نوجوانوں کو دعوت لڑائی دیتے اور اس دوران اپنی جوانمردی و بہادری کا اظہار کرتے اور پھر انفرادی جنگ آزمائی ہوتی۔ اس جنگ آزمائی میں چاہے جس فریق کے بہادر کام آجاتے اس کے بعد تو پھر دونوں طرف سے باقاعدہ جنگ کیلئے صف بندی کی جاتی اور لشکر کے عام لوگوں میں جنگ شروع ہو جاتی۔ متذکرہ بالا مبارزت جو اس حدیث میں مذکور ہے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؑ نے ولید بن عتبہ کو قتل کر دیا اور حضرت حمزہؑ نے شیبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہ بن حارثؑ عتبہ اور عتبہ بن ربیعہ کے درمیان چوٹوں کا تبادلہ ہوا اور اسی اثناء میں حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؑ عتبہ پر پل پڑے اور دونوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور حضرت عبیدہؑ کو دونوں اٹھالائے مگر ان کی ران کا کاری زخم بہتا رہا کہ وادی صفراء میں مدینہ کی جانب واپسی کے موقع پر فوت ہو گئے۔ دونوں فریقوں کی محاذ آرائی میں احادیث مختلف ہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مبارزی جنگ میں جن صحابہ کرامؓ نے جوہر شجاعت دکھائے وہ مذکورہ بالا ہی تھے۔

(۱۰۹۷) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِنَّمَا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ فِينَا مَعَشَرَ الْأَنْصَارِ، يَغْنِي قَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ قَالَهُ رَدًّا عَلَى مَنْ أَنْكَرَ عَلَى مَنْ حَمَلَ عَلَى صَفِّ الرُّومِ حَتَّى دَخَلَ فِيهِمْ. رَوَاهُ الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ حَضْرَتِ ابُو الْيُؤُبِ النَّصَارِيُّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ یہ آیت ہمارے حق میں نازل ہوئی ”اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو“۔ یہ حضرت ابو ایوبؓ نے ان لوگوں سے بطور تردید فرمایا تھا جنہوں نے رومیوں کی صفوں پر حملہ کیا تھا اور ان کی صفوں میں جا گھسے تھے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿معشر الانصا﴾ یہ اختصا کی بنایر منصوب ہے۔

حاصل کلام: اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ اسلم بن ابوعمران بیان کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے کہ رومیوں کا ایک بڑا فوجی لشکر ان کے مقابلہ کیلئے سامنے آیا تو مسلمانوں میں سے ایک مجاہد نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان کی صفوں میں آگے گھس جاتا اور واپس آجاتا اس کی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دیکھ کر لوگوں نے بعد ابلند سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا کہ اپنے ہاتھوں آپ ہی ہلاکت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔ اس موقع پر حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو! تم اس آیت کی تاویل اس مرد کی کارکردگی میں کر رہے ہو حالانکہ یہ آیت ہمارے متعلق یعنی گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غلبہ بخشا اور اس کے مددگاروں کی تعداد کثیر ہو گئی تو ہم نے مخفی و پوشیدہ طور پر کہا کہ ہمارے اموال تو ضائع ہو گئے اگر ہم ان میں ٹھہرے رہتے اور ان کو دوست رکھتے تو ان میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوتا۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ پس اس ہلاکت سے مراد ہمارا اپنے ارادوں پر قائم رہنا تھا۔ (سبل السلام)

(۱۰۹۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَرَّقَ رَسُولُ
اللَّهِ ﷺ نَحْلَ بَنِي النَّضِيرِ، وَقَطَعَ.
حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
ﷺ نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت نذر آتش
کروادیے اور کٹوا دیے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حرق﴾ تحریق سے ماخوذ ہے۔ بنو نصیر یہود کا قبیلہ تھا۔ مدینہ منورہ کے جنوب مشرق میں رہائش پذیر تھے اور نبی ﷺ کے ساتھ ان کا معاہدہ بھی تھا مگر انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور آپؐ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ آپؐ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا اس کے بعد ان کو مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دیا۔ یہ واقعہ ۴ھ میں ربیع الاول کے مہینے میں پیش آیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ناگزیر جنگی ضرورت کی بنا پر پھلدار درختوں کو جلوانا یا کٹوانا جائز ہے۔ مگر عام حالات میں بلا ضرورت ان کو کاٹنے سے آپؐ نے منع فرمایا ہے۔

(۱۰۹۹) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَغْلُوا، فَإِنَّ الْغُلُولَ نَارٌ وَعَارٌ عَلَى أَصْحَابِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ». رَوَاهُ

أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خیانت دنیا و آخرت دونوں جہاں میں عار اور ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ ایک مسلمان مجاہد کو دیانت دار ہونا چاہئے۔ بددیانت اور خائن نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد مال و متاع کا حصول نہیں بلکہ اس کی رضا اللہ اور اعلائے کلمہ اللہ کا حصول ہو اور جب تک وہ اس اصول کو اپنائے رکھے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا ورنہ ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنے گی۔

(۱۱۰۰) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ حَضْرَتِ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ فِي صِلَةِ فِرْصَةٍ فَرَمَاكَ "سَازُ وَ سَامَانُ (عَازِي) قَاتِلُ قُضَى بِالسَّلْبِ لِلْقَاتِلِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، كَيْلَةً هِيَ." (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے) وَأَضْلَهُ عِنْدَ مُنْصَلِمٍ.

لغوی تشریح: ﴿السلب﴾ سین اور لام دونوں پر فتح۔ سب سے جمہور کے نزدیک لڑنے مرنے والے کافر کالباس اور سامان جنگ وغیرہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک سواری کا جانور اس سلب میں داخل نہیں ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سامان حرب ہی مراد ہے۔

(۱۱۰۱) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ - قَالَ: فَأَتَبَدَّرَاهُ بِسَيْفَيْهِمَا، حَتَّى قَتَلَاهُ، ثُمَّ أَنْصَرَفَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَأَخْبَرَاهُ، فَقَالَ: «أَيُّكُمَا قَتَلَهُ؟ هَلْ مَسَخْتُمَا سَيْفَيْكُمَا؟» قَالَ: لَا، قَالَ: فَنَظَرَ فِيهِمَا، فَقَالَ: «كِلَاكُمَا قَتَلَهُ» فَقَضَى ﷺ بِسَلْبِهِ لِمُعَاذِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْجُمُوحِ. مَتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ سے ابو جہل کے قتل کے قصہ میں مروی ہے کہ دونوں اپنی اپنی تلوار لے کر ابو جہل کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھرے اور آپ کو ابو جہل کے قتل کی خبر دی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ "تم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا؟" نیز دریافت فرمایا کہ "کیا تم نے تلواریں صاف کر لی ہیں؟" دونوں بولے نہیں۔ عبدالرحمن نے کہا کہ آپ نے ان دونوں کی تلواروں کو ملاحظہ کیا اور فرمایا "تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔" پس رسول اللہ ﷺ نے ابو جہل کا ساز و سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو دینے کا فیصلہ فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فابند راہ﴾ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس میں تشنہ کی ضمیر سے معاذ بن عمرو بن جموح اور معوذ بن عفرہ مراد ہیں۔ دونوں عبدالرحمن بن عوف رحمہ اللہ کے دائیں بائیں تھے۔ ﴿حتى قتلاه﴾ تا آنکہ انہوں نے ابو جہل کا کام تمام کر دیا۔ ان دونوں ہی سے پہلی ضرب معاذ بن عمرو

بن جوحؓ نے ماری۔ یہ ابو جہل کی تاک میں تھے جیسے ہی ان کو فرصت نے موقع دیا باز کی طرح جھپٹ کر ابو جہل پر حملہ آور ہوئے پھر اس نے ایسی ضرب ماری کہ اس کے قدم سمیت آدھی پنڈلی بھی کاٹ کر جدا کر دی تو ابو جہل مرگے والے شخص کی طرح لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا اور خون میں لت پت ہو گیا۔ اس کے بعد معوذ بن عفراءؓ کا دھڑ سے گزر ہوا تو اس نے نیزہ دے مارا جس سے وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ معرکہ کے اختتام پر نبی ﷺ نے اس معاملہ کی تحقیق کا حکم صادر فرمایا۔ لوگوں نے اس کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ابو جہل کو ایسی کشمکش کی حالت میں پایا کہ هنوز آثار زندگی باقی تھے تو وہ ابو جہل کے سینے پر اپنا پورا وزن ڈال کر جھکے اور اس کا سرتن سے جدا کر دیا اور اسے نبی ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ جب آنحضور ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا ”یہ (ابو جہل) اس امت کا فرعون ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ابو جہل کا لباس اور سامان جنگ معاذ بن عمرو بن جوحؓ کو دینے کا فیصلہ فرمایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دوسرے دوست و رفیق معوذ بن عفراء جو ابو جہل کے قتل میں ان کے شریک تھے وہ خود بعد میں اسی معرکہ کے دوران شہید ہو چکے تھے۔ لہذا معاذ بن عمروؓ کے سوا کوئی حق دار باقی نہیں رہا تھا۔ پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے تمام سامان انہیں نہیں دیا تھا بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ دیا تھا اور ابو جہل کی تلوار عبداللہ بن مسعودؓ کو دینے کا فیصلہ فرمایا تھا جیسا کہ ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿معاذ بن عمرو بن جوحؓ﴾ یہ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سلمی کہلاتے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ انہوں نے ہی ابو جہل کا پاؤں اور اس کا سرتن سے جدا کیا تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے ان کو چوٹ لگائی کہ ان کا ہاتھ کٹ کر لٹک گیا بالکل جدا نہیں ہوا تو انہوں نے پاؤں تلے دبا کر کھینچ کر اسے جدا کر دیا اور پھینک دیا اور باقی سارا وقت اکیلے ہاتھ سے لڑتے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجرؒ کے موقف سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب ابن عفراء کے علاوہ اور کوئی تھے کیونکہ ابن عفراء کا نسب تو اس طرح ہے۔ معاذ بن حارث بن رفاعہ نجاری۔

(۱۱۰۲) وَعَنْ مَكْحُولٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَصَبَ الْمُنَجِّبُونَ عَلَى أَهْلِ الطَّائِفِ . أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَايِلِ، وَرَجَّاهُ يَفَاتٍ، وَوَصَلَهُ الْمُقْبِلِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. حضرت مکحول سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اہل طائف پر منجیق نصب کی۔ (اسے ابو داؤد نے اپنی مراسیل میں تخریج کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر عقیل نے حضرت علیؓ سے ضعیف سند کے ساتھ موصول قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿منجیق﴾ میم پر فتح پھر ساکن پھر فتح پھر کسرہ پھر ساکن۔ جنگی آلہ و ہتھیار۔ جس کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر مضبوط قلعوں کی دیواروں کو گرانے اور بڑی اونچی اور پختہ عمارتوں کو منہدم کرنے

کسلے پھینکتے تھے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کو نیست و نابود کرنے یا ان کا زور توڑنے اور عسکری قوت کمزور کرنے کیلئے نئے نئے طریقہ ہائے جنگ اور جدید سامان حرب و ضرب استعمال کرنے چاہئیں اور مسلمانوں کو سامان حرب نئے سے نئے ایجاد کرنے چاہئیں۔ آج کے دور میں ایٹم بم اور دیگر تباہ کن اور ہبیت ناک ہتھیار بھی تیار کرنے چاہئیں کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم ہو اور آسانی سے ان پر جنگ مسلط نہ کی جاسکے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل طائف کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے خود حصہ لیا۔ نیز معلوم ہوا کہ دشمن اگر قلعہ بند ہو جائے تو گولہ باری سے بچے، عورتیں اور معذور لوگ بھی قتل ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

راوی حدیث: ﴿مکحول﴾ دمشق کے باشندے، شام کے فقیہ۔ بڑے صاحب علم۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ شام میں ان سے بڑا فقیہ میرے علم میں نہیں ہوا۔ ۱۱۳ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۱۱۰۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ فِيهِمْ رَأْسَهُ الْغَمْفَرُ، فَلَمَّا نَزَعَهُ جَاءَهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: ابْنُ خَطْلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ، فَقَالَ: «اقتُلوه». مُتَعَقِّ عَلَيْهِ.

نغوی تشریح: ﴿المغفر﴾ منبر کے وزن پر۔ لوہے سے بنی ہوئی ٹوپی جسے خود کہتے ہیں۔ ﴿ابن خطل﴾ خطل کے ”خا“ اور ”طا“ دونوں پر فتح۔ اس کا نام دور جاہلیت میں عبدالعزیٰ یا عبداللہ تھا۔ ﴿باستار الکعبہ﴾ استار ستر کی جمع ہے یعنی کعبہ کے پردے۔ ﴿اقتلوه﴾ اسے قتل کر دو۔ اس لئے کہا گیا کہ یہ پہلے مسلمان تھا اسے زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کیا گیا تو اس نے اپنے خادم مسلمان کو قتل کر دیا اور خود مشرک، مرتد ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی دو لونڈیاں تھیں جو نبی ﷺ کی بھوگاتی تھیں۔ ان میں سے ایک کو تو قتل کر دیا گیا اور دوسری کیلئے امان طلب کی گئی اور وہ مسلمان ہو گئی۔ ابن خطل کا شمار ان نو آدمیوں میں تھا جن کے قتل کا نبی ﷺ نے فتح مکہ کے روز حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر یہ لوگ خانہ کعبہ کے پردوں سے چنے ہوئے مل جائیں تو پھر بھی ان کو قتل کر دو۔ ان میں سے چار تو قتل ہوئے اور باقیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرتد اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں توہین آمیز رویہ رکھنے والے کو پناہ دینے والے کی سزا قتل ہے۔ اگرچہ وہ بیت اللہ کے پردہ میں ہی چھپا ہوا ہو۔

(۱۱۰۴) وَعَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ حَفَظَتْ سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ

(ہیں)

(۱۱۰۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ. حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے اسیران بدر کے متعلق فرمایا ”اگر مطعم
بَنِ عَدِي بَقِيد حَيَاتٍ ہوتا پھر وہ میرے پاس آکر ان
مرداروں کے متعلق بات چیت کرتا تو میں ان کو اس
فِي هَؤُلَاءِ السَّنَى، لَتَرَكْتُهُمْ لَهُ. رَوَاهُ
الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: حضور ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ احسان کا بدلہ دینا مسنون ہے۔ خواہ کافر کا احسان ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمان کے احسان کا بدلہ دینا تو بطریق اولیٰ ہے۔ اچھے کام میں کسی کیلئے سفارش کرنا بھی جائز ہے اور جائز کام کی سفارش کو قبول بھی کرنا مسنون ہے۔

(۱۱۰۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَبْنَا سَبَايَا يَوْمَ أُوطَاسٍ لَهُنَّ أَرْوَاجٌ، فَتَحَرَّجُوا، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى

سَهْمًا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. (ہیں) اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے پیدل مرد مجاہد کیلئے ایک حصہ اور گھڑ سوار کیلئے تین حصے۔ دو حصے اس کے گھوڑے کے اور ایک حصہ اس کا اپنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گھوڑ سوار کیلئے تین حصے اور پیدل کیلئے صرف ایک حصہ ہے۔ گھوڑے کا حصہ اس لئے زیادہ رکھا گیا کہ اس کی خوارک اور اس کی دیکھ بھال پر کافی خرچ اٹھ جاتا ہے۔

(۱۱۱۱) وَعَنْ مَعْنِ بْنِ يَزِيدَ حضرت معن بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كُوفَرَاتٍ سَنَاءً هِيَ "حصہ سے اضافی رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا نَقْلَ إِلَّا» طور پر جو کچھ دیا جائے گا وہ پانچواں حصہ نکال کر دیا بَعْدَ الْخُمْسِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، (اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور وَصَحَّتْهُ الظَّحَاوِيُّ. (طحاوی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہاں دو مسائل قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اضافی و زائد حصہ مال غنیمت میں سے دیا جائے گا یا خمس میں سے؟ اس حدیث میں ان دونوں باتوں پر دلالت کرنے والی چیز نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت کو پانچ حصوں میں نفلی حصہ دینے سے پہلے تقسیم کیا جائے گا۔ حالانکہ صحیح احادیث سے دو امر کا جواز ثابت ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا اضافی حصہ خمس سے پہلے دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی جواز نہیں لیکن دوسری حدیث جسے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ابھی بیان کیا گیا ہے وہ اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ ان کو نفلی حصہ خمس نکالنے سے پہلے دیا گیا۔ ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد مع شرح عون المعبود (ج ۳، ص: ۲۲)

راوی حدیث: (معص بن یزید) معص بن یزید بن اخنس سلمیٰ خود صحابی بھی ہیں اور باپ بھی صحابی ہے۔ فاتح دمشق ہیں۔ کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ جب مصر میں آئے تو پھر دمشق میں منتقل ہو گئے۔ مرج راحط کی جنگ میں ضحاک بن قیس کے ساتھ ۴۳ھ میں شامل ہوئے اور شہید ہو گئے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کی لڑائیوں میں شریک رہے۔

(۱۱۱۲) وَعَنْ حَبِيبِ بْنِ مَسْلَمَةَ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے سریہ میں پہلی مرتبہ جانے پر چوتھا حصہ زائد عطا فرمایا اور دوبارہ جانے پر تیسرا حصہ۔ (اسے ابو داؤد نے

ذَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْجَارُودِ وَابْنُ جَبَّانَ رَوَيْتَ كَيْفَ هُوَ اور ابن جبارود، ابن حبان اور حاکم نے صحیح وَالْحَاكِمُ۔

کما ہے

لغوی تشریح: ﴿نفل الربع﴾ یعنی خمس کے بعد غنیمت کے چوتھا حصہ بطور نفل عطا فرمایا۔ ﴿فی البداءہ﴾ بداءہ میں ”با“ پر فتح اور دال ساکن حمزہ پر فتح۔ سفر کے آغاز پر جب لشکر اسلامی دشمن کی جانب رواں دواں ہوا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب اس صورت حال میں سارے لشکر سے الگ دشمن پر حملہ آور ہونے کیلئے دستہ نکلے اور دشمن پر جا پڑے اور کامیاب و کامران غنائم لے کر واپس لوٹے تو اس دستہ کو اس کا چوتھا حصہ دیا جائے گا اور باقی غنائم کو سارے لشکر میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ﴿والثلث فی الرجعة﴾ یعنی تیسرا حصہ اس صورت میں دیا جائے گا کہ لشکر اسلامی فتح یاب ہو کر وطن واپس آ رہا ہے اور راستہ میں اس لشکر میں سے ایک دستہ دوبارہ دشمن پر حملہ کرنے کیلئے الگ ہو کر چلا جائے اس صورت میں دشمن پر حملہ آور ہونا پہلے حملے کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ حریف اب چوکنا ہو چکا ہوتا ہے اور اس صورت حال میں خطرات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ دشمن ہر طرح سے ہوشیار اور محتاط ہو جاتا ہے اور مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں رہتا۔

راوی حدیث: ﴿حبیب بن مسلمہ﴾ ابو عبد الرحمن حبیب بن مسلمہ فہری مکی۔ صحابی ہیں۔ حبیب روم کے نام سے جانے جاتے ہیں کیونکہ رومیوں کے لیے ان کی بہت سی خدمات ہیں۔ ارمنیہ کے والی بنے اور ۴۳ھ یا ۴۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۱۱۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُنْفِلُ بَعْضَ مَنْ يَبْعَثُ مِنْ السَّرَايَا لِأَنْفُسِهِمْ خَاصَّةً، سِوَى تَقْسِيمٍ فِي شَمَالٍ نَحْنُ لَا نَعْلَمُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض فوجی دستوں کو بالخصوص غنیمت کے حصہ کے علاوہ کچھ مزید دیا کرتے تھے۔ یہ عام فوجی کی تقسیم میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہر فوجی کو تو یہ نفلی حصہ عنایت نہیں فرمایا کرتے بلکہ صرف مخصوص فوجیوں کو کسی خاص مصلحت کی وجہ سے دینا مناسب خیال فرماتے پھر جن فوجی جوانوں کو یہ حصہ دیتے ان کو بھی مساوی طور پر نہ دیتے بلکہ خدمت اور مصلحت کے لحاظ سے کم و بیش دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آج بھی خاص خدمات انجام دینے والے فوجیوں کو سربراہ مملکت خصوصی انعامات دے سکتا ہے۔ مثلاً مختلف قدر و قیمت کے تحفے، نشانات، نقد انعام وغیرہ۔ اس سے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

(۱۱۱۴) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كُنَّا نُصِيبُ فِي مَعَازِينَا غَزَاوَاتٍ فِي شَمَالٍ، نَحْنُ لَا نَعْلَمُ بِهَا تَوْانَ كَوْنِهَا لِيَتَّ

الْعَسَلَ وَالْعِنَبَ فَتَأْكُلُهُ، وَلَا تَرْفَعُهُ. اٹھا کر نہیں لے جاتے تھے۔ (بخاری) اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ ان کھانے والے حضرات سے خمس وصول نہیں کیا جاتا تھا اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دوران جنگ مجاہدوں کے ہاتھ کھانے پینے کی اگر کچھ چیزیں آجائیں تو انکو وہیں کھانے پینے کی حد تک استعمال کر سکتے ہیں البتہ اٹھا کر کیس لے جانے کی ان کو اجازت نہیں۔ خورد و نوش کے علاوہ اگر دشمن کے جانور اور ہتھیار قبضہ میں آجائیں تو انکو جنگ کیلئے استعمال کر سکتے ہیں مگر جنگ کے اختتام پر مال غنیمت میں واپس جمع کرنا واجب ہے۔

(۱۱۱۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي خَبِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَبِرْتُ رُؤَيْفَ بْنَ أَبِي خَبِيرٍ، فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيءُ، فَيَأْخُذُ مِنْهُ مِقْدَارَ مَا يَكْفِيهِ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَاجَرِ وَالْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت ہے کہ خیبر کے روز ہمیں کھانے کی اشیاء ہاتھ آئیں تو ہر آدمی آتا اور اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق کھانے کیلئے حاصل کر لیتا تھا پھر واپس چلا جاتا۔ (اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے ابن جارد اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے بھی معلوم ہوا کہ خورد و نوش کی چیزیں کھانے پینے کی حد تک ہر سپاہی تقسیم پہلے لے سکتا ہے، اس پر اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔

(۱۱۱۶) وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَرْكَبُ ذَابَّةً مِنَ فَيْءِ الْمُسْلِمِينَ، حَتَّى إِذَا أَعْجَفَهَا رَدَّهَا فِيهِ، وَلَا يَلْبَسُ ثَوْبًا مِنْ فَيْءِ الْمُسْلِمِينَ، حَتَّى إِذَا أَخْلَقَهُ رَدَّهُ فِيهِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ وَرَجَّاهُ لَا بَأْسَ بِهِمْ.

حضرت روفیع بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی اللہ پر ایمان اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے تو وہ مسلمانوں کے مال غنیمت کے گھوڑے پر سوار نہ ہو مگر یہ کہ جب وہ کمزور ہو جائے تو اسے واپس کر دے اور مسلمانوں کے مال غنیمت سے کوئی کپڑا نہ پہنے حتیٰ کہ جب وہ بوسیدہ و پرانا ہو جائے تو اسے واپس بیت المال میں جمع کرا دے۔“ (اسے ابو داؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ایسے ہیں جن میں کوئی حرج نہیں)

لغوی تشریح: ﴿مَنْ لَى الْمُسْلِمِينَ﴾ یعنی مشترک مال غنیمت۔ ﴿اعْجَفَهَا﴾ کمزور دہلا کر دے۔

﴿اخلقه﴾ اسے بوسیدہ و پرانا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنیمت میں حاصل شدہ کپڑوں اور گھوڑوں کو میدان جنگ میں ضرورت کے وقت استعمال میں لایا جاسکتا ہے بعد میں ان کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔ بعض نے وقتی طور پر استعمال کرنے کیلئے بھی سپہ سالار کی اجازت کو شرط قرار دیا ہے کہ جب تک سالار لشکر کی اجازت نہ ہو اس وقت تک کسی طرح استعمال نہیں کر سکتا۔

(۱۱۱۷) وَعَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ الْجَرَّاحِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «يُجِيرُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ بَعْضُهُمْ». أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَأَحْمَدُ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ”مسلمانوں میں سے کوئی بھی پناہ دینے کا مجاز ہے۔“ (اس روایت کو ابن ابی شیبہ اور احمد نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔

وَلِلطَّيَالِسِيِّ مِنْ حَدِيثِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: يُجِيرُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ أَذْنَاهُمْ.

اور طیلانی میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”مسلمانوں کا ادنیٰ آدمی بھی پناہ و امان دے سکتا ہے“ اور صحیحین کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ ”تمام مسلمانوں کی پناہ ایک ہی ہے جس کیلئے ان کا ادنیٰ آدمی بھی سعی کر سکتا ہے۔“ ابن ماجہ نے ایک اور طریقے سے اتنا اضافہ نقل کیا ہے۔ ”ان کا بہت دور کا آدمی بھی پناہ دے سکتا ہے“ اور صحیحین میں ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہم نے بھی امان دی جسے تو نے امان دی۔“

لغوی تشریح: ﴿یجیر﴾ یہ اجارہ سے ماخوذ ہے۔ امان دینا۔ ﴿علی المسلمین﴾ یہاں علی نفوذ اور وجوب کیلئے ہے یعنی وہ اپنی امان کو ان پر نافذ کر سکتا ہے تو اس کی اس امان کی رعایت کرنا ان کیلئے واجب ہے۔ ﴿اذناہم﴾ ان کا ادنیٰ مرتبہ کا آدمی یا صرف وہی تھا آدمی۔ ان کا حقیر اور کم حیثیت کا مالک آدمی مثلاً غلام، مزدور اور عورت وغیرہ۔ ﴿ذمة المسلمین واحدة﴾ مسلمانوں کی دی ہوئی امان ایک جیسی ہے۔ لہذا کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی پناہ و امان کو کوئی توڑ دے خواہ کوئی ہو۔ ﴿یسعی بہا اذناہم﴾ یعنی اس کا عمل پناہ و امان دینا ثابت ہو اس کی پناہ سے۔ ﴿اقصاہم﴾ گھر کے دور ہونے کے اعتبار سے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان میدان کارزار سے بہت ہی دور

رہتا ہے اور وہ کافر کو امان دے تو دوسرے مسلمانوں پر اس کافر کی حفاظت و رعایت کرنا واجب ہے اور اس ذمہ کو توڑنا حلال نہیں ہے۔ ﴿قَدْ اجْرُنَا مِنْ اجْرَتِ﴾ مخاطب کے صیغہ کے ساتھ کہ جسے تو نے امان دی اسے ہم نے امان دی۔ یہ ارشاد آپؐ نے حضرت ام ہانیؓ کو اس موقع پر فرمایا، جب انہوں نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی کہ اس نے دو آدمیوں کو جو اس کے سسرالی رشتہ دار تھے، پناہ دی ہے۔ مگر ان کے بھائی علی بن ابی طالبؓ نے اپنی بہن کی امان کو جائز نہ رکھا اور ان دونوں کو قتل کرنا چاہا اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مروی نہیں عورت کی امان بھی جائز ہے۔ عام فقہاء کرام کا یہی موقف ہے۔ راوی حدیث: ﴿ام ہانیؓ﴾ یہ ابوطالب کی صاحبزادی، حضرت علیؓ کی ہمیشہ تھیں۔ ان کا نام فاختہ تھا اور ہند نام بھی بتایا گیا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئی تھیں۔

(۱۱۱۸) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ، لَا تَخْرُجَنَّ مِنَ الْجَزِيرَةِ الْعَرَبِ، حَتَّى لَا أَدْعَ إِلَّا مُسْلِمًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے سنا، رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ ”میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال کر دم لوں گا۔ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ، حَتَّى لَا أَدْعَ إِلَّا مُسْلِمًا“ کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لَا دَع﴾ میں نہیں چھوڑوں گا اور جزیرۃ العرب سے مراد بحر ہند، بحر شام، پھر جلد و فرات نے جتنے علاقے پر احاطہ کیا ہوا ہے یا طول کے لحاظ سے عدن ابنین کے درمیان سے لے کر اطراف شام تک کا علاقہ اور عرض کے اعتبار سے جدہ سے لے کر آبادی عراق کے اطراف تک۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی خواہش تھی کہ جزیرۃ العرب سے کافروں اور یہود و نصاریٰ کو باہر نکال دیں۔ اپنی زندگی میں اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جاسکا پھر حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کی خواہش اور آپؐ کے حکم کہ عرب میں دو دین نہ رہیں، پر عمل درآمد کیا اور اپنے دور خلافت میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ عرب سے جلا وطن کر دیا۔

(۱۱۱۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي النَّضِيرِ أَمْوَالٌ، ان اموال میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ، مِمَّا لَمْ يُوجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ بِخَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خَاصَّةً، خَالِصٌ نَبِيٌّ ﷺ كَيْلَةً تَحْتَهُ. آپؐ ان اموال میں سے فَكَانَ يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ نَفَقَةً سَنَةً، وَمَا بَقِيَ يَجْعَلُهُ فِي الْكُرَاعِ وَالسَّلَاحِ، رہتا اس سے گھوڑے اور اسلحہ برائے جہاد فی سبیل

عُدَّةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ. مَتَّقُوا اللَّهَ. اللہ کی تیاری کیلئے خرید فرماتے۔ (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿مما افاء الله﴾ یہ گرا نمر میں کانت کی خبر ہے۔ افاء کے معنی ہیں عطا فرمایا۔ ﴿مما لم يوجف﴾ نہیں دوڑائے اور نہ بھگائے۔ ”ایجاف“ سے ماخوذ ہے۔ تیز رفتاری کے معنی میں۔ ﴿رکاب﴾ راء کے نیچے کسرہ ﴿الابل﴾ یعنی اونٹ اور ﴿ایجاف الخیل والركاب﴾ یہ کنایہ ہے لڑائی سے۔ یعنی بغیر جنگ و جدال اور لڑائی کے بنو نضیر کے اموال حاصل ہوئے۔ ﴿فكانت للنبي صلى الله عليه وسلم خاصة﴾ یہ آپ کیلئے خاص تھا۔ مال غنیمت نہ تھا کہ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا۔ ﴿الکراع﴾ کاف پر ضم۔ بہت سے گھوڑوں کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی گھوڑوں کی جماعت۔ ﴿عُدَّة﴾ جنگ کی تیاری کیلئے۔ ان کے یہ اموال گھروں اور کھجور کے درختوں کی شکل میں تھے۔ ان اموال میں اکثر تو مہاجرین کو دے دیا گیا اور کچھ مال دو حاجت مند انصاری آدمیوں کو بھی دیا۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے کسی انصاری کو کچھ نہیں دیا گیا اور کچھ کھجور کے درخت آپ نے اپنے لئے بھی مخصوص فرمائے اور یہ وہی تھے جن میں سے آپ اپنے اہل و عیال پر خرچ فرماتے تھے۔

حاصل کلام: بنو نضیر۔ مدینہ منورہ میں آباد یہودیوں کا بہت بڑا قبیلہ تھا۔ ان کے ساتھ نبی ﷺ کا معاملہ تھا۔ انہوں نے بقول بعض غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد اور بقول ابن اسحق احد اور بڑے معونہ کے بعد عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔ تنبیہ اور یاد دہانی کے باوجود وہ باز نہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان پر چڑھائی کر دی اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر محاصرہ کی تاب نہ لا کر اپنے گھریاں اور مال چھوڑ کر جلا وطن ہو گئے اور بغیر کسی قسم کی لڑائی کے ان کے اموال آپ کے ہاتھ آ گئے اور یہ اموال نے قرار پائے اس لئے کہ لڑائی تو سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ اس لئے بحیثیت فوجی تو کسی کا کوئی حصہ بنتا ہی نہیں تھا۔ تاہم اس کا اکثر حصہ مہاجرین میں تقسیم کیا اور دو انصاری صحابہ کو بھی حسب ضرورت عطا فرمایا اور باقی مال نبی ﷺ اپنے اہل و عیال اور قربات داروں پر خرچ کرتے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے بھی اسی پر عمل کیا۔ آپ کے قربات داروں کا اور ازواج مطہرات کا روزینہ، یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے اخراجات وغیرہ پر صرف کرتے رہے۔ اگر کچھ بچ رہتا تو اس سے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کیلئے گھوڑے اور اسلحہ خریدتے۔

(۱۱۲۰) وَعَنْ مُعَاذِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: عَزَوْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي غَزَاةٍ خَيْبَرَ لَنَا فِيهَا غَنِمَةٌ كَثِيرَةٌ فَاصْبَنَّا فِيهَا غَنَمًا، كَچھ بکریاں غنیمت میں آئیں۔ ان میں سے کچھ ہم فقسَمَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ طَائِفَةً، میں تقسیم کر دیں اور باقی کو غنیمت کے اموال میں وَجَعَلَ بَقِيَّتُهَا فِي الْمَعْنَمِ. رَوَاهُ أَبُو شَالٍ فرمایا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس داؤد، وَجَعَلَهُ لَا بَأْسَ بِهِمْ۔ کے راوی ایسے ہیں جن میں کوئی حرج نہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس چیز کی دلیل ہے کہ خُس سے پہلے اصل مال غنیمت سے نفلی طور پر مال دیا جا

(۱۱۲۱) وَعَنْ أَبِي رَافِعٍ رَضِيَ
 اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
 ﷺ: «إِنِّي لَا أَخِيسُ بِالْعَهْدِ، وَلَا
 أَخِيسُ الرُّسُلَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ،
 وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبْرَانَ.
 حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
 ﷺ نے فرمایا ”بے شک میں نہ تو عہد شکنی کرتا
 ہوں اور نہ قاصدوں و سفیروں کو قید کرتا ہوں۔“
 (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان
 نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿لا اخیس﴾ میں معاہدہ شکنی اور غداری نہیں کرتا۔
حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عہد شکنی اور غداری کرنا اسلام کی رو سے درست نہیں ہے۔
دراصل قصہ یوں ہے کہ ابورافع اسلام قبول کرنے سے پہلے کافروں کی جانب سے آپؐ کے پاس سفیر کی حیثیت سے آئے۔ آپؐ کا روئے انور اور رخ منور دیکھتے ہی وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہو گئے۔ پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب میرا دل واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہے لہذا آپؐ مجھے یہیں روک لیں تو اس موقع پر آپؐ نے فرمایا ”لا اخیس“ میں عہد شکنی اور غداری نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفیروں کو بغیر و عافیت واپس بھیجنا حکومت کا ذمہ ہے۔ اگرچہ وہ خود رکھنے کی درخواست کرے، اسے بھی واپس کر دینا چاہئے کیونکہ سفیر و قاصد جس کے پاس آتا ہے گویا اس کی امان میں آتا ہے۔ اسلام نے سفیر کے احترام کا درس دیا ہے خواہ کافر ہو یا مسلمان۔

(۱۱۲۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «أَيُّمَا قَرْيَةٍ أَتَيْتُمُوهَا، فَأَقَمْتُمْ فِيهَا، فَسَهَّمْكُمْ فِيهَا، وَأَيُّمَا قَرْيَةٍ عَصَتْ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، فَإِنَّ خُمْسَهَا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ، ثُمَّ هِيَ لَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. (مسلم)

نغوی تشریح: ﴿ایما قریہۃ یتیموها﴾ جس بستی میں تم قیام کرو، بغیر کسی لڑائی و قتال کے۔ ﴿فسہمکم فیہا﴾ اس میں تمہارا حصہ بھی اسی طرح ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں سے ایک عام مسلمان کا حصہ ہے کیونکہ اس وقت وہ مال فنے ہے۔ مال غنیمت نہیں تا آنکہ وہ لشکر میں بالخصوص تقسیم نہ کر دیا جائے۔ ﴿وایما قریہۃ عصت اللہ ورسولہ﴾ جس بستی والے اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان ہوں اور تم اس بستی کو لڑ کر فتح کرو تو وہ غنیمت ہو جائے گی۔ ختم نکالنے کے بعد تمہارے درمیان تقسیم کر دی جائے گی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اموال فتنے میں سے خمس نہیں نکالا جاتا ہے جو لوگ اس کے

جزیہ اور صلح کا بیان

١ - بَابُ الْجِزْيَةِ وَالْهَدَنَةِ

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجوسی مشرکوں سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ جزیہ صرف اہل کتاب پر نہیں جیسا کہ بعض اہل علم کا خیال ہے بلکہ دیگر مشرکین سے بھی جزیہ وصول کیا جائے گا۔ مؤطا کی روایت میں انقطاع اس بنا پر ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے امام ابن شہاب زہری سے مرسلًا روایت کیا ہے۔

(۱۱۲۴) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَنَسٍ، وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي سُلَيْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيدِ إِلَى أَكْبَدِرِ دَوْمَةَ الْجَنْدَلِ فَأَخَذُوهُ، فَأَتَوْا بِهِ فَحَقَّنَ دَمَهُ وَصَالَحَهُ عَلَى الْجِزْيَةِ.

عاصم بن عمر رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومتہ الجندل کے حکمران اکیدر کے پاس بھیجا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اس کا خون نہ

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ۔ بہایا اور اس سے جزیہ پر مصالحت کر لی۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿وعن عثمان﴾ ان سے روایت کرنے والا بھی عاصم ہے۔ جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ ﴿بعث خالد بن الولید﴾ خالد بن ولید کو بھیجا۔ آپؐ نے انہیں غزوہ تبوک کے ایام میں بھیجا تھا۔ ﴿الی اکیدر﴾ یہ صاحب اکیدر بن عبد الملک کنڈی۔ جو دومۃ الجندل کے فرمانروا تھے اور اکیدر کے حمزہ پر ضمہ اور کاف پر فتح ”یا“ ساکن اور دال کے نیچے کسرہ اور دومۃ کے دال پر ضمہ اور ”واؤ“ ساکن اور جندل کے جیم پر فتح اور نون ساکن اور ﴿دومۃ الجندل﴾ غریبی نجد کے شمال میں وادی سرخان میں ایک شہر کا نام ہے۔ ﴿فحقن دمه﴾ اس کا خون نہیں بہایا بلکہ اس کی حفاظت کا عہد دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عرب اہل کتاب سے بھی جزیہ لینا جائز ہے۔ اکیدر عرب کا ایک عیسائی رئیس تھا اور غسانی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ (سبل) قاضی ابویوسف عربی سے جزیہ لینے کے قائل نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ عربی و عجمی مشرک سے جزیہ لینے کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿عاصم بن عمر﴾ ابو عمر عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان انصاری، تابعی تھے۔ کثیر الحدیث تھے۔ علم کے راوی۔ مغازی و سیر کے علم سے بہرہ ور تھے۔ ان کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۷، ۱۲۹ھ وغیرہ

﴿عثمان بن ابی سلیمان﴾ عثمان بن ابی سلیمان بن جبیر بن مطعم، مکہ کے قاضی تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ ابن معین رحمہ اللہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ عثمان تابعی ہیں اور عاصم نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے متصل اور عثمان سے مرسل بیان کی ہے۔

(۱۱۲۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ نَبِيٌّ مِّنْكُمْ نے یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ ”میں فَأَمَرَنِي أَنْ أَخَذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ ہر بالغ سے ایک دینار بطور جزیہ وصول کروں یا پھر دِينَارًا، أَوْ عِدْلَهُ مُعَافِرِيًّا۔ أَخْرَجَهُ اس کے برابر معافی کپڑا لوں۔“ (اس کی تخریج تینوں الثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانٍ وَالْحَاكِمُ۔ نے کی ہے، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حالم﴾ بالغ۔ ﴿عدله﴾ عین کے نیچے کسرہ اور فتح بھی ہے۔ معنی ہیں مثل، اس جیسا ﴿معافریا﴾ کپڑا جو معاف کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے معافری کہلایا اور معافرین کا ایک شہر ہے یا حمدان کا قبیلہ۔ یہ حدیث کتاب الزکاۃ کے تحت گزر چکی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جزیہ کی سالانہ مقدار ایک دینار یا اسی کے برابر کوئی اور چیز فی کس ہوگی۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دینار کم از کم جزیہ ہے۔ اس سے زیادہ بھی لیا جاسکتا ہے اور جزیہ صرف بالغ آزاد مرد سے ہی لیا جائے گا۔

(۱۱۲۶) وَعَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عائذ بن عمرو المزنی رحمہ اللہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”اسلام غالب رہتا النَّبِيُّ ﷺ قَالَ: «الْإِسْلَامُ يَغْلُو، وَلَا يَغْلَى» أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حاصل کلام: اس حدیث میں خبر و اطلاع بھی ہے اور پیشین گوئی بھی کہ اسلام ہمیشہ غالب بن کر رہنے کیلئے آیا ہے، مغلوب بن کر رہنے کیلئے نہیں۔ لہذا اہل اسلام کو چاہئے کہ نظریاتی اور عملی طور پر اسے غالب رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اسلام کی صحیح تبلیغ و اشاعت کریں۔ اس کے مطابق پہلے خود اپنی عملی زندگی ڈھالیں تاکہ ان کے عمل و کردار اور اخلاق و اطوار سے متاثر ہو کر غیر مسلم دائرۃ اسلام میں داخل ہوں۔ اس حدیث کو حدنہ کی تمہید اور ابتداء کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ باہمی مصالحت میں اگر بفرض محال کوئی شرط و دفعہ بظاہر اسلام کے ماننے والے کے مفاد کے خلاف بھی معلوم ہو تو پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ وہ اسے ہمیشہ سر بلند و بالاتر اور اعلیٰ و غالب رکھے گا۔ اس کے ماننے والے اگر اس کے مطابق عمل کریں گے تو سرخرو ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اسلام اور اہل اسلام کی نصرت و مدد فرمائے گا۔ اسلام کا دلائل و براہین کے اعتبار سے سب پر غالب رہنا تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائذ بن عمرو مزنی رحمہ اللہ﴾ ابو ان کی کنیت تھی۔ بصرہ میں فروکش ہو گئے تھے۔ صالح صحابہ میں سے تھے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ یزید ابن معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی۔

(۱۱۲۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَبْدَءُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلَامِ، وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُ إِلَى أَصْبَحِهِ». رَوَاهُ «مُسْلِمٌ»

لغوی تشریح: ﴿فاضطروه﴾ ان کو مجبور کر دو یا اس طور کہ ان کیلئے صدر راستہ نہ چھوڑو۔ اسے رسوا و ذلیل کرنے کیلئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسلمان کا یہود و نصاریٰ اور مجوس وغیرہ کو پہلے سلام کہنا حرام ہے۔ جمہور سلف کی رائے یہی ہے مگر کچھ لوگ جن میں حضرت ابن عباسؓ بھی شامل ہیں کہتے ہیں ذی اہل کتاب کو پہلے سلام کہنا جائز ہے لیکن یہ درست نہیں۔ نیز ان سے راستہ میں ملاقات ہو جائے تو ان کیلئے

راستہ بھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ اس سے ان کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ وہ چھوٹے لوگ ہیں اور چھوٹے ہی بن کر رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ نکالنا چاہئے کہ اسلام انسان، انسان کے مابین امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یہ تو اصول کی بات ہے کہ جو لوگ دین فطرت کو قبول کرنے سے انکاری ہیں ان کا مقام و مرتبہ بہر حال وہ نہیں ہو سکتا جو ماننے والوں کا ہے۔

(۱۱۲۸) وَعَنِ الْمُسَوِّرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْحُدَيْبِيَّةِ، فَذَكَرَ الْحَدِيثَ بِطَوْلِهِ، وَفِيهِ: «هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، سُهَيْلُ بْنُ عَمْرِو: عَلَى وَضْعِ الْحَرْبِ عَشْرَ سِنِينَ، وَيَأْمَنُ فِيهَا النَّاسُ، وَيَكْفُتُ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَضْلَعَهُ فِي الْبَخَارِيِّ.

حضرت مسور بن مخرمہ اور مروان رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ نبی ﷺ حدیبیہ کے سال نکلے۔ راوی نے لمبی حدیث بیان کی ہے اور اس میں یہ مذکور ہے کہ یہ وہ (دستاویز) ہے جس پر محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے سہیل بن عمرو سے صلح کی ہے کہ دس سال جنگ بند رہے گی۔ اس عرصہ میں لوگ امن سے رہیں گے اور ان میں سے ہر ایک (جنگ سے) اپنا ہاتھ روکے رکھے گا۔ (ابوداؤد اور اس کی اصل بخاری میں ہے) اور مسلم نے اس حدیث کا کچھ حصہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے کہ تم میں سے جو کوئی ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہیں کریں گے اور ہمارا کوئی آدمی تمہارے پاس آجائے تو تم اسے ہمارے پاس واپس لوٹا دو گے۔ انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا ہم یہ لکھ لیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ ”ہاں! جو شخص ہم میں سے ان کے پاس چلا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ نے دور کر دیا اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ضرور کشائش اور کوئی راستہ نکال دے گا۔“

وَأَخْرَجَ مُسْلِمٌ بَعْضَهُ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ، وَفِيهِ: أَنَّ مَنْ جَاءَنَا مِنْكُمْ لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكُمْ، وَمَنْ جَاءَكُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوهُ عَلَيْنَا، فَقَالُوا: أَنْكُتُبُ هَذَا؟ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: «نَعَمْ إِنَّهُ مَنْ ذَهَبَ مِنَّا إِلَيْهِمْ فَأَبْعَدَهُ اللَّهُ، وَمَنْ جَاءَنَا مِنْهُمْ فَسَيَجْعَلُ اللَّهُ لَهُ قَرَجًا وَمَخْرَجًا».

لغوی تشریح: ﴿عام الحدیبیہ﴾ یہ واقعہ ذوالقعدہ بروز پیر ۶ھ میں پیش آیا جب آپؐ عمرہ کرنا چاہتے تھے۔ حدیبیہ ”حا“ پر ضمہ اور وال پر فتح اور ”یا“ ساکن اور اس کے بعد ”یا“ مخففہ اور مشدودہ بھی کہا گیا ہے۔ جدہ کے راستہ میں مکہ کے قلب سے دس میل کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ حدیبیہ نام کا ایک کنواں تھا جس سے اس کا نام حدیبیہ پڑ گیا۔ ﴿فذکر الحدیث بطولہ﴾ اس حدیث میں حدیبیہ کی

جانب جانے کا قصہ ہے۔ اہل مکہ نے آپؐ کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا پھر چند شرائط پر مصالحت کر لی تھی۔ ان شروط میں سے وہ شرط بھی تھی جسے مؤلف نے بیان کیا ہے۔ ﴿سہیل بن عمرو﴾ یہ کفار کی جانب سے نمائندہ تھے۔ ﴿وضع الحرب﴾ لڑائی کو چھوڑ دیا۔ ﴿یکف﴾ روکتا ہے۔ ﴿من جاء منکم﴾ یہ شرط مسلمانوں کے خلاف پڑی تھی یعنی جو آدمی مسلمانوں کے کیمپ سے بھاگ کر کافروں کے کیمپ میں چلا جائے گا اسے کفار واپس نہیں کریں گے اور اہل مکہ میں سے جو کوئی مسلمانوں کے ہاں پناہ لے گا وہ اسے کافروں کی جانب لوٹا دیں گے۔ ﴿انکتب هذا؟﴾ کیا اسے قلمبند کر لیا جائے۔ اس میں استفہام انکاری ہے اور بظاہر رسوائی جو اس میں محسوس ہوتی ہے اس پر اظہار تعجب ہے۔ ”فرجا“ فاور رادونوں پر فتحہ۔ فراخی اور کشادگی، کشائش۔

راوی حدیث: ﴿سروان رضی اللہ عنہ﴾ اس سے مروان بن حکم اموی مراد ہے۔ ابو عبد الملک کنیت تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ یزید کی وفات کے بعد عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں دلچسپی لی اور اس کے بیٹے معاویہ کی معزولی کے بعد مصر اور شام پر والی بن گئے۔ ان کی وفات دمشق میں ۶۵ھ میں ہوئی۔

﴿سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ﴾ سہیل بن عمرو کا شمار قریش کے سرکردہ شرفاء و رؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کے عقلاء اور خطباء میں سے ایک تھے۔ بدر کے روز قید ہوئے اس وقت کافر تھے۔ فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا۔ فتنہ ارتداد کے موقع پر قریش ان کی وجہ سے اسلام پر ثابت قدم رہے۔ ۱۴ھ میں یرموک کے موقع پر قتل ہو کر مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے یا ان کی وفات مرج صفر میں یا طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں ہوئی۔

(۱۱۲۹) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ حَضْرَتِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ رَوَايَتُ كِي هِي كِه ”جس کسی نے عمدی کو قتل کیا ﷺ قَالَ: «مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرَحْ» وَه جَنَّتْ كِي خُشْبُو نِهِيں پائے گا اور جَنَّتْ كِي خُشْبُو رَائِحَةُ الْجَنَّةِ، وَإِنْ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ جَالِسِ بَرَس كِي مسافت سے پائی جاتی ہے۔“ (بخاری) مَسِيرَةُ أَرْبَعِينَ عَامًا. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿لم يرح﴾ یرح کے ”را“ پر فتحہ ہے۔ نہیں پاسکے گا۔ نہیں سونگھ سکے گا۔ ﴿رائحة الجنة﴾ جنت کی خوشبو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی ذمی اور معاہد کو بلاوجہ اور کسی شرعی حق کے بغیر قتل کرنا حرام ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مسلمان قاتل سے دنیا میں قصاص نہیں لیا جاتا، اس لئے اخروی سزایان کی۔ معاہد دراصل وہ آدمی ہے جو مسلم علاقہ کا باشندہ نہ ہو۔ غیر مسلم حکومت میں سکونت رکھتا ہو اور امان لے کر اسلامی حکومت کے علاقہ میں آیا ہو۔ اس کے قتل پر اس حدیث میں بڑی سخت وعید ہے کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا اور جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک پائی جاتی ہے۔

۲ - باب السَّبَقِ وَالرَّمْيِ - گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کا بیان

(۱۱۳۰) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَابَقَ النَّبِيُّ ﷺ بِالْحَيْلِ الَّتِي قَدْ أَضْمَرْتُ، مِنَ الْحَفِيَاءِ، وَكَانَ أَمَدُهَا ثِنْتَهُ الْوَدَاعِ، وَسَابَقَ بَيْنَ الْحَيْلِ الَّتِي لَمْ تُضْمَرْ، مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ فِيْمَنْ سَابَقَ مُتَّفَقًا عَلَيْهِ. هَـ كَ سَفِيَانُ بْنُ زَيْدٍ نَ بَيَان كِيَا كَ ”حَفِيَاءَ“ سَ ”زَادَ الْبُخَارِيُّ «قَالَ سَفِيَانُ: مِنَ الْحَفِيَاءِ إِلَى ثِنْتِهِ الْوَدَاعِ خَمْسَةُ أَمْيَالٍ، أَوْ سِتَّةً، وَمِنْ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ مُيْلٌ».

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تیار شدہ گھوڑوں کی ”حفیاء“ سے ”ثنیہ“ الوداع“ تک دوڑ کرائی اور جو گھوڑے تیار نہیں تھے ان کو ”ثنیہ“ سے لے کر ”بنی زریق“ کی مسجد تک دوڑایا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی مسابقت میں شریک تھے۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری میں اتنا اضافہ ہے کہ سفیان بن زید نے بیان کیا کہ ”حفیاء“ سے ”ثنیہ“ الوداع“ کا فاصلہ پانچ یا چھ میل ہے اور ”ثنیہ“ سے ”مسجد بنی زریق“ تک کا فاصلہ ایک میل ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب السبق﴾ سبق کے سین پر فتح اور ”با“ ساکن مصدر بمعنی مسابقة الخیل یعنی گھڑ دوڑ، اسے ”رہان“ بھی کہتے ہیں اور ”رمی“ یعنی تیر اندازی کا مقابلہ، نشانہ بازی کا مقابلہ۔ ﴿اضمرت﴾ صیغہ مجہول اور اضمار اور تضمیر یہ کہ پہلے گھوڑے کو خوب بکھرت چارہ کھلا کر مونا تازہ کرتے ہیں اور خوب توانا اور قوی کرتے ہیں پھر اس کی خوراک کم کرنا شروع کرتے ہیں اور میدان میں دوڑاتے اور چکر لگواتے ہیں تاکہ اس کا جسم مضبوط اور سخت جان ہو جائے اور جسم کا ڈھیلا پن سخت ہو جائے اور عربوں کے ہاں تضمیر کا یہ عمل چالیس روز تک ہوتا تھا۔ ﴿من الحفیاء﴾ ”حا“ پر فتح اور ”قا“ ساکن ممدودہ اور کبھی قصر یعنی بغیر مد کے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مدینہ کے باہر ایک جگہ کا نام اور اس فقرے میں کلمہ ”من“ سے مراد غایت کی ابتداء ہے۔ ﴿امدھا﴾ حمزہ اور میم دونوں پر فتح۔ اس سے غایت مراد ہے۔ ﴿ثنیہ الوداع﴾ یہ بھی مدینہ منورہ سے باہر ایک مقام ہے اور ثنیہ ”ثا“ پر فتح نون کے نیچے کسرہ اور ”یا“ پر تنقید۔ یہ عقبہ کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ الوداع کی جانب اسے مضاف کیا گیا ہے اس لئے کہ مہمانوں کو اس جگہ سے الوداع کہا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے جہاد کی تیاری کیلئے گھڑ دوڑ، تیر اندازی اور نیزہ بازی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس دور میں یہی چیز عموماً جنگ میں کام آتی تھی۔ آج کے دور میں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں چلانے کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ تیرو نیزے کی جگہ بندوق، توپ اور جدید جنگی تربیت حاصل کرنی چاہئے۔

(۱۱۳۱) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

لغوی تشریح: ﴿فصل القرع فی الغایة﴾ نوجوان گھوڑے کی غایت (فاصلہ) زیادہ دور اور لمبا رکھا، دوسرے کی یہ نسبت اور فعل تفغیل سے مبنی للفاعل ہے اور قرع کے قاف پر ضمہ اور ”را“ پر تشدید اور فتح، قارح کی جمع۔ نوجوان گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی عمر پوری و مکمل اور جس کی کچلیاں نمایاں ہو چکی ہوں۔ غایت میں یہ فضیلت و فرق اس لئے رکھا گیا ہے کہ نوجوان، تندرست و توانا اور قوی الجیش گھوڑا دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ لمبی دوڑ کا متحمل ہو سکتا ہے جبکہ کمزور اور ضعیف اس کی سکت نہیں رکھتا۔ حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جانوروں کا بھی بہت خیال اور لحاظ رکھنا چاہئے۔ جتنی ہمت و طاقت کا جانور ہو اس سے اس کے مطابق کام و خدمت لی جانی چاہئے۔ ہمت و طاقت سے زیادہ کام لینا درست نہیں۔

نوعی تشریح: ﴿لا سبق﴾ سبق کے ”سین“ اور ”با“ دونوں پر فتح۔ دوڑ کے مقابلہ میں جو مالی انعام غیرہ رکھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ مسابقت میں مال لینا حلال نہیں ہے۔ ﴿الافی خف﴾ سوائے اونٹ کے۔ ﴿اونصل﴾ یا تیر اندازی کے ﴿او حافر﴾ یا گھڑ دوڑ میں۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ مقررہ انعام کی صورت میں دوڑ کا مقابلہ کرنا جائز ہے۔ ﴿جعل﴾ کے جیم پر ضمہ، معنی انعام۔ اگر انعام دوڑ کے مقابلہ میں حصہ لینے والوں کے علاوہ اور کسی کی جانب سے ہے جیسے امام جینتے والے کو کوئی انعام دے تو یہ حلال ہے۔ بغیر کسی خوف و تردد کے اور اگر یہ انعام کسی مقابلہ میں حصہ لینے والے کی جانب سے ہو تو یہ حلال نہیں، یہ قمار و جوا ہے۔ انعام میں مال لینا مذکورہ بالا کلاموں میں حلال ہے۔ اس لئے کہ یہ جنگ کی تیاری و تربیت اور ٹریننگ ہے اور جہاد کیلئے قوت تیار کرتا ہے۔ جو ایسی صورت میں نہ ہو اس پر مال لینا قمار ہے۔ جس سے اجتناب کیا جانا چاہئے۔ جیسے پرندوں اور کبوتروں کی دوڑ اور مینڈھوں کو لڑا کر انعام حاصل کیا جاتا ہے۔

(۱۱۳۳) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں
 قَالَ: «مَنْ أَذْخَلَ قَرْسًا بَيْنَ كَتِفَيْهِ لَمْ يَكُنْ مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ» کہ آپؐ نے فرمایا ”جس شخص نے دو گھوڑوں کے

فَرَسَيْنِ، وَهُوَ لَا يَأْمَنُ أَنْ يَسْبَقَ فَلَا بَأْسَ بِهِ، فَإِنْ أَمِنَ فَهُوَ قِمَارٌ رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

درمیان تیسرا گھوڑا داخل کیا لیکن اس شخص کو یہ یقین نہ تھا کہ یہ گھوڑا آگے بڑھ جائے گا۔ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر اس شخص کو یہ یقین تھا کہ یہ تیسرا گھوڑا بڑھ جائے گا تو یہ جوا ہو جائے گا۔

(اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند

ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان یسبق﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وہ تو بیچھے رہ جائے گا اور دوسرا آگے بڑھ جائے گا۔ ﴿فان امن﴾ اگر اسے بیچھے رہنے اور آگے بڑھنے کا یقین ہو تو ﴿فہو قمار﴾ وہ قمار و جوا ہے۔ قمار کے قاف کے نیچے کسرہ۔ پس مسابقت سے غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ گھوڑے کی قوت و طاقت کا صحیح اندازہ ہو جائے جب غرض پوری نہ ہو تو بے سود ہونے کی وجہ سے اسے ناجائز قرار دے دیا گیا۔

(۱۱۳۴) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ حَضَرْتُ عَقِبَةَ بْنَ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ، (آیت) پڑھ رہے تھے۔ (ترجمہ) ”تم جو کچھ اپنی قوت یقول: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ﴾ آلائیہ، کرو اور گھوڑوں کے باندھنے سے۔“ اور (فرماتے) أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيَ، أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ تھے) ”خبردار! قوت تیر اندازی ہے۔ خبردار! قوت تیر الرَّمْيَ، أَلَا! إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيَ“۔ رَوَاهُ اندازی ہے۔ خبردار! قوت تیر اندازی ہے۔“ (مسلم) مُسْنَدٌ.

لغوی تشریح: ﴿اعدوا﴾ اعداد سے امر کا صیغہ ہے۔ اعداد تیاری کو کہتے ہیں مستقبل کیلئے کسی چیز کا تیار کرنا۔ ﴿ما استطعتم﴾ ما عام ہے حالات و ظروف اور اوضاع کے حسب حال انسان کے تمام ممکنات اس میں شامل ہیں۔ ﴿رباط الخیل﴾ ”راء“ کے نیچے کسرہ۔ اس کے معنی اصل میں روکنے اور جمع رکھنے کے ہیں پھر اسے خاص طور پر سرحدوں کی حفاظت اور سرحدوں پر واقع شہروں کی حفاظت کیلئے قیام کرنے کو رباط کہا جانے لگا۔ تفسیر المنار (ج ۱۰، ص: ۶۹) میں علامہ رشید رضا نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امت مسلمہ کی مستقل آرمی ہونی چاہئے جو اپنا دفاع کرنے کیلئے ہر وقت تیار و مستعد رہے جس وقت بھی دشمن اچانک دھوکہ سے حملہ آور ہو۔ اسی وقت اسے ناکوں پنے چبانے کے لئے میدان کار زار میں سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے گھوڑ سواروں کا دستہ چاک و چوبند ہو اور تیز رفتاری و سبک رفتاری سے سرحدوں پر رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع، سرحدی شہروں اور دیہاتوں پر واقع

ہونے والے واقعات کی خبر اور ہر طرف سے دار الخلافہ میں تیز گامی سے پہنچانے کیلئے تیار رہیں۔ ﴿الا ان القوة الرمی﴾ سن لو کہ قوت تیر اندازی میں ہے۔ تفسیر المنار (ج ۱۰، ص: ۷۰) میں ہے کہ اس حدیث میں رمی سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو پھینک کر دشمن کو نشانہ بنایا جاسکے، تیر ہے، نیزہ ہے، منجیق کے ذریعہ گولہ باری ہے، جنگی جہازوں کے ذریعہ گولہ باری ہے یا بندوق کے ذریعہ اور توپ کے ذریعہ گولے پھینکنا وغیرہ ہے۔ اگرچہ یہ تمام اسلحہ، حرب نبی ﷺ کے عہد سعادت میں متعارف نہیں تھا مگر لفظ رمی سب کو شامل ہے۔ اگر آپؐ اسے معروف تیروں سے متقید کر دیتے تب بھی مقصود یہی پھینکنے والی چیز مراد ہوتی۔ حالانکہ آپؐ نے تیر کے پھینکنے کا ذکر نہیں کیا ہے ہمیں کیا معلوم شاید اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی لسان مبارک پر ان الفاظ کو جاری فرما دیا ہو جس میں عمومیت کا معنی پایا جاتا ہے کہ ہر دور میں آپؐ کی امت کیلئے عمومیت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس دور میں حسب ضرورت اسے مارنے کے معنی میں استعمال کر سکے۔



۱۲۔ کِتَابُ الْأَطْعِمَةِ

کھانے کے مسائل

(۱۱۳۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السَّبَاعِ فَأَكْلُهُ حَرَامٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ”درندوں میں سے ہر کچلی والے کا کھانا حرام ہے۔“ (مسلم)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے اور اتنا اضافہ ہے کہ ”پرندوں میں ہر اس پرندے کا کھانا حرام ہے جو پنجوں میں گرفت کر کے کھائے۔“

لعنوی تشریح: ﴿کتاب الاطعمه﴾ طعام کی جمع ہے یہاں یہ بیان کرنا اور بتانا مقصود ہے کہ کھانے کی اشیاء میں سے حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ ﴿کل ذی ناب من السباع﴾ ناب اس دانت کو کہتے ہیں جو رباعیہ کے پیچھے ہوتا ہے اور رباعیہ ثنایا کے ساتھ ہی ہوتے ہیں (جسے ہم کچلیاں کہتے ہیں) اور ”سباع“ سبع کی جمع ہے سبع پر فتح اور ”ب“ پر ضمہ ہے۔ وہ جانور جو چیر پھاڑ کرنے والا ہو اور کچلیوں والے جانوروں سے مراد وہ درندہ ہے جس کی کچلیاں ہوں اس کے ذریعہ سے وہ شکار کرنے میں قوت کا باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً شیر، بھیڑیا، چیتا اور تیندوا وغیرہ۔ (تحفہ الاحوذی، ج ۲، ص: ۳۵) ابن سینا کا قول ہے کہ ایک حیوان میں کچلی اور سینگ اکٹھے پیدا نہیں ہوتے۔ ﴿بلفظ نہی﴾ یعنی درندوں میں ہر کچلی والا جانور کھانے سے منع فرمایا۔ ﴿ذی مخلب﴾ مخلب کے میم کے نیچے کسرہ اور ”خا“ ساکن اور لام پر فتح۔ جس کے معنی پنجہ یا چنگل کے ہیں۔ جس طرح انسان کے ناخن ہوتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ پرندہ پنجے کے ذریعہ سے شکار میں تقویت حاصل کرتا ہے جیسے چیل، شکار، شامین اور باز وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں حرمت کی ایک جامع علامت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر چیرنے

پھاڑنے والا درندہ چوپایہ دوسرے الفاظ میں گوشت خور جانور حرام ہے اور ہر وہ پرندہ جو پنجے میں پکڑ کر کھاتا ہو حرام ہے۔ اس اصول کو امام شافعی رحمہ اللہ، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور داؤد ظاہری رحمہ اللہ نے تسلیم کیا ہے مگر اس کے باوجود درندوں کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ لہذا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک گوشت خور جانور جیسا بھی ہو وہ ”سبع“ ہے۔ اس اعتبار سے بلی وغیرہ بھی سباع میں شامل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سباع وہ درندہ ہے جو انسان پر حملہ آور ہو جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ۔ بگو اور لومڑی نہیں۔ اس لئے کہ یہ آدمی پر حملہ نہیں کرتے۔ اسی طرح پنجے سے شکار اور پنجہ سے پکڑ کر کھانے والا پرندہ بھی حرام ہے جیسے عقاب، باز، شکر، شاپین وغیرہ۔ جمہور علماء کا قول یہی ہے لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے انہیں مکروہ کہا ہے حرام نہیں کہا البتہ چیل اور گدھ کو خباثت کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔

(۱۱۳۶) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتُ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَے روایت ہے کہ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے خیبر کے روز گھریلو گدھوں کے يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا اور گھوڑوں کے الْأَهْلِيَّةِ، وَأَذِنَ فِي لُحُومِ الْخَيْلِ. گوشت کی اجازت دی تھی۔ (بخاری و مسلم) اور مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: «وَرَخَصَ». بخاری کی روایت میں ہے ”اذن“ کے بجائے ”رخص“ کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کہ آپؐ نے رخصت دی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خیبر کے روز گھریلو گدھوں کا گوشت کھانا حرام قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے اس کی اجازت تھی تو گویا احکام بتدریج نافذ کئے گئے ہیں۔ حرام کئے جانے کی وجہ جیسا کہ بخاری میں بھی آیا ہے کہ یہ ناپاک و پلید حیوان ہے۔ جمہور علماء، صحابہ و تابعین وغیرہ اس طرف گئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ گھوڑے کا گوشت حلال ہے۔ رخصت اور اذن کا لفظ غالباً اس لئے فرمایا کہ گھوڑوں کی کمی کی وجہ سے تنزیہی طور پر ممنوع قرار دیا تھا پھر رخصت دے دی۔ زید بن علی، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشیدین یعنی صاحبین اور امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اور سلف و خلف کے سب علماء اس کی حلت کے قائل ہیں لیکن امام مالک رحمہ اللہ اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حرام ہے مگر یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث صریحاً ان کے خلاف ہیں۔

(۱۱۳۷) وَعَنْ ابْنِ أَبِي أَوْفَى حَضْرَتِ ابْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ، کھاتے رہے ہیں۔ (بخاری و مسلم) نَأْكُلُ الْجَرَادَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لعوی تشریح: ان احادیث میں کچھ جانوروں کی حلت و حرمت نام بنام بیان کی گئی ہیں۔ مڈی بھی انہی میں

سے ہے۔ اس کی حلت پر تقریباً سب کا اتفاق ہے۔

(۱۱۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ أَبِيهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: فَذَبْحُهَا فَبَعَثَ بِوَرِيكَيْهَا إِلَى رَانَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي خِدْمَتِهِ مِثْلَ مِثْلٍ. جَسَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَبِلَهُ. مُتَّقَى عَلَيْهِ. آپؐ نے قبول فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی قصۃ الارنب﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے ایک خرگوش کو بھگایا اس وقت ہم مرا الظہران کے مقام پر تھے۔ لوگ دوڑے اور پکڑنے کی کوشش کی۔ خرگوش دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ درماندہ ہو گیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا۔ انہوں نے اسے ذبح کر کے ران نبی ﷺ کی خدمت میں بھیج دی جسے آپؐ نے شرف قبولیت سے نوازا۔ ﴿ودک﴾ ”واؤ“ پر فتح اور ”را“ کے نیچے کسرہ اور کبھی کبھار ساکن بھی پڑھ لیا جاتا ہے ورک کہتے ہیں ران کے اوپر والے حصہ کو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خرگوش حلال ہے۔ اگر حلال نہ ہوتا تو آپؐ اسے قبول نہ فرماتے۔

(۱۱۳۹) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَأْكُلَ الْبُحَارُ مِنْ جُلْدِ الْبُحَارِ. جَسَ الْبُحَارِ، وَالنَّمْلَةَ، وَالشَّخْلَةَ، (اسے احمد اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے وَالْهَذُودَ، وَالصُّرَدَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

لغوی تشریح: ﴿من الدواب﴾ دواب دابہ کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر ریگلتا ہے۔ ﴿الصدر﴾ عمر کے وزن پر۔ ایسا پرندہ جس کا سر، چونچ اور پر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اس کا پیٹ سفید رنگ کا اور پشت سبز رنگ کی ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے جن کے مارنے سے منع فرمایا ہے وہ حرام ہیں۔ جمہور علماء کرام کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

(۱۱۴۰) وَعَنْ ابْنِ أَبِي عُمَارٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ أَبِيهِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: قُلْتُ لِحَبَابٍ: الضَّبُّ صَيْدٌ. قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: شَكَرَ هِيَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: شَكَرَ هِيَ؟ انہوں نے کہا ہاں! میں نے پھر پوچھا،

اللہ ﷻ! قَالَ: نَعَمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نے فرمایا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! وَالْأَزْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الْبُخَارِيُّ وَابْنُ جَبَّانَ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور بخاری اور

ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الضبع﴾ ضاؤ پر فتح اور ”با“ پر ضم۔ معروف اور جانا پہچانا جانور ہے جو قبروں کو کھودنے (بھاڑنے) کا شوقین ہے۔ فارسی زبان میں اسے ﴿کفتار﴾ اور ہندی زبان میں بگو کہتے ہیں۔ نیل الاوطار میں ہے کہ اس کا معاملہ بھی حیران کن اور عجب ہے کہ وہ ایک سال نہ ہوتے ہیں اور ایک سال مادہ۔ حاملہ وہ بحالت نہ ہوتی ہے اور بحالت مادہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ ﴿صیدھی؟﴾ یہاں پر حرف استفہام حذف ہے اور مقصود یہ تھا کہ کیا اس کا کھانا حلال ہے؟ اس لئے کہ شکار شرعاً اس جانور کا ہے جس کو کھانے کیلئے شکار کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور اسحق رحمہ اللہ کے نزدیک بگو حلال ہے اور نیل الاوطار میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا، صفا اور مروہ کے درمیان ہمیشہ سے لوگ اس کی خرید و فروخت کرتے اور اسے کھاتے ہیں اور کوئی کسی پر اعتراض نہ کرتا۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کو حرام کہتے ہیں کہ یہ درندہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کی کچلیاں نہیں ہوتیں اور کسی درندے کے حرام ہونے کیلئے اس کا کچلیوں والا اور درندہ ہونا ضروری ہے یعنی اس میں دونوں وصف پائے جانے چاہیں اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ حدیث کے عموم سے یہ مخصوص ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ابی عمار﴾ ان کا نام عبدالرحمن بن عبداللہ بن ابی عمار القرظی المکی ہے۔ کثرت عبادت کی وجہ سے ان کا لقب ”القس“ یعنی راہب و پادری تھا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔

(۱۱۴۱) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ الْقُفْذِ، فَقَالَ: «قُلْ لَا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا إِلَّايَةَ فَقَالَ شَيْخٌ عِنْدَهُ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ يَقُولُ: ذَكَرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «إِنَّهَا خَبِيثَةٌ مِنَ الْخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے سیدہ (خارپشت) کے متعلق دریافت کیا گیا۔ انہوں نے جواب میں اللہ کا فرمان سنایا ”(اے رسول!) کہہ دے کہ میں اس میں کوئی حرام چیز نہیں پاتا جو میری طرف وحی کی گئی ہے“ اس کے پاس ایک بزرگ بیٹھے تھے، انہوں نے کہا میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ اس کا ذکر نبی ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ نے فرمایا ”خبیث جانوروں میں سے ایک خبیث جانور ہے۔“ (اس کی روایت احمد اور ابوداؤد نے

کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے)

لعنوی تشریح: "لتسفنذ" قاف پر ضمہ، نون ساکن، فاف پر ضمہ۔ ایک خار دار جانور جو جسامت میں بلی کے برابر ہوتا ہے جس کے جسم پر نکلے کی طرح کانٹے ہوتے ہیں اور خطرہ کے موقع پر ان کو پھیلا کر ان میں چھپ جاتا ہے۔ جسے سیمہ اور خار پشت بھی کہتے ہیں۔ ﴿انہا خبیثۃ من الخبیثات﴾ کہ وہ خبیث جانوروں میں سے ہے اس لئے وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "یحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبیثات" (۷: ۱۷۵) کہ وہ ان کیلئے طیبات کو حلال اور خبیثات کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہر وہ جانور حرام ہے جو خبیث ہے اور ایک نسخہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ جانور ایسا ہے تو یہ لازماً ایسا ہی ہے جیسا آپ نے فرمایا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خار پشت یعنی سیمہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام احمد رضی اللہ عنہ کی یہی رائے ہے۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے صراحت کی ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ اور ابن ابی یعلیٰ کا خیال ہے کہ یہ حلال ہے کیونکہ حرمت کی کوئی دلیل صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔ (سبل)

(۱۱۴۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَنِ الْجَلَالَةِ وَأَلْبَانِهَا. أَخْرَجَهُ جَارُونَ فِي رِوَايَتِ كَيْسَانَ وَابْنِ تَرْمِذٍ فِي رِوَايَتِهِ. (سنن ترمذی)

(دیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿الجلالة﴾ لام پر تشدید ہے یعنی گندگی خور جانور۔ خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے، بکری ہو یا مرغی۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔ خطاب نے کہا ہے کہ ایک حدیث میں یہ مروی ہے کہ گائے گندگی خور ہو تو اسے چالیس روز چارہ کھلایا جائے۔ تو اس کے بعد اس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ شارح ترمذی نے تحفۃ الاحوذی (ج ۳، ص ۸۹) میں ابن رسلان کی شرح السنن سے نقل کیا ہے کہ بند کر کے رکھنے کی کوئی معین و مقرر مدت نہیں ہے اور بعض کی یہ رائے ہے کہ اونٹ، گائے کیلئے چالیس روز اور بکری کیلئے سات روز اور مرغی کیلئے تین روز کی مدت ہے۔ اسی رائے کو الھذب اور التحریر میں پسند کیا گیا ہے اور سبل السلام میں ہے۔ وقت کی تعیین کے سلسلہ میں مخالفین کی مخالفت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو سکتی۔ (۱۱۴۳) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْحَمَارِ سَلَسْلَسَ فِي رِوَايَتِهِ. (سنن ترمذی)

تداول فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا جنگلی گدھا حلال ہے اور اس کی حلت پر اجماع ہے۔ (السبل)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پہلے کتاب الحج میں باب الاحرام کے تحت تفصیلاً گزر چکی ہے۔

(۱۱۴۴) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي حُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: نَحَرْنَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ فَرَسًا نَكَلْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

بُخَارِي وَمُسْلِمٌ

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے عہد میں گھوڑا ذبح کیا اور اسے ہم نے کھایا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں گھوڑے کا گوشت کھانا حلال ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس باب کے شروع میں گزر چکا ہے۔

(۱۱۴۵) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: أَكَلِ الضَّبَّ اللَّهُ ﷻ كَسَرِ الْخَوَانِ بِرِ سَوَسَارِ (سَانْدَا) كَو كَهَايَا كِيَا.

عَلَى مَا يَذَرُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اُکُلِ الضَّبَّ اللہ ﷻ کے دسترخوان پر سوسار (سانڈا) کو کھایا گیا۔

لغوی تشریح: ﴿الضب﴾ زمین پر ریگنے والا چھوٹا سا جانور جو گرگٹ کے مشابہ ہوتا ہے۔ ہندی زبان میں اسے سانڈ کہتے ہیں اور فارسی میں سوسار۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جانور پانی نہیں پیتا بلکہ صرف نیم اور ہوا کی خشکی پر اکتفا کرتا ہے اور چالیس روز بعد صرف ایک قطرہ پیشاب کرتا ہے اور موسم سرما میں یہ جانور اپنے بل سے باہر نہیں آتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ذکر کی دو فریعیں ہوتی ہیں۔ سوسار کا گوشت قوت جماع انتہائی زیادہ کر دیتا ہے جب اس کے گوشت کے ٹکڑے تلے جائیں تو ان میں روغن برآمد ہوتا ہے جو کہ عضو مخصوص مردانہ پر ملنے سے اس کے امراض کا بہترین علاج ہے اور مرد کی قوت مردی اور شباب و جوانی عود کر آتی ہے۔ اہل عرب بالعموم اور اہل نجد بالخصوص کثرت سے اس کا گوشت کھاتے تھے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مشہور ہے کہ ضب سے مراد گدھ ہے یہ صحیح نہیں ہے وہ تو گرگٹ ہے اور حرام ہے۔ یہ حدیث ضب کے کھانے کے جواز کی دلیل ہے اور جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ضب حلال ہے، جمہور علماء کی یہی رائے ہے بعض نے اسے حرام اور بعض نے اسے مکروہ بھی کہا ہے اور دلیل کے لئے ابوداؤد کی روایت پیش کی ہے کہ آپؐ نے ”ضب“ کھانے سے منع فرمایا۔ مگر صحیحین کی یہ حدیث اور اس موضوع کی دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت حرمت کی نہیں کراہت کی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خود ضب نہیں کھائی البتہ صحابہ کرام کو کھانے سے منع نہیں فرمایا بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”اسے کھاؤ یہ حلال ہے لیکن یہ میرا کھانا نہیں ہے۔“ جو اس بارے میں واضح نص ہے کہ ممانعت زیادہ کراہت پر مبنی ہے، حرمت پر قطعاً نہیں۔

(۱۱۴۶) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُمَانَ قُرَشِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ أَكَلَ الضَّبَّ لَمْ يَكُنْ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ.

حضرت عبدالرحمن بن عثمان قرشی رضی اللہ عنہ سے مروی

عُثْمَانُ الْقُرَشِيُّ، أَنَّ طَبِيبًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ الضَّفَدِ يَجْعَلُهَا فِي دَوَاءٍ، فَتَنَهَى عَنْ قَتْلِهَا. (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مینڈک دوا میں استعمال کرنے کی غرض سے مارنا بھی ممنوع ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ حرام ہے۔ یہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مینڈک کو مت مارو کہ اس کی آواز تبع ہے۔

شکار اور ذبائح کا بیان

۱ - بَابُ الصَّيْدِ وَالذَّبَائِحِ

(۱۱۴۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ مَاشِيَةٍ، أَوْ صَيْدٍ، أَوْ زَرْعٍ، انْتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلِّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے مال مویشی کے تحفظ کیلئے (رکھے گئے کتے) یا شکاری کتے یا زراعت کی دیکھ بھال و حفاظت کرنے والے کتے کے علاوہ دوسرا کوئی کتا (شوقیہ طور پر) رکھا تو اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط ثواب کم ہو جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل کے بھلاوے اور شوق فضول کی تسکین کیلئے کتا رکھنا ممنوع ہے البتہ شکار کیلئے، کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی و حفاظت کیلئے رکھنے کی اجازت ہے اور اس کے شوقیہ رکھنے کی وجہ سے یومیہ ایک قیراط ثواب میں کمی واقع ہوتی ہے۔

(۱۱۴۸) وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أُرْسِلَتْ كَلْبُكَ فَأَذْكُرْ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ، فَإِنْ أَمْسَكَ عَلَيْكَ فَأَذْكُرْتَهُ حَبًّا فَأَذْبَحْهُ، وَإِنْ أَذْكُرْتَهُ قَدْ قُتِلَ، وَلَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ فَكُلْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًا حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ ”جب تو اپنا شکاری کتا جانور کے شکار کیلئے چھوڑے تو اس پر اللہ کا نام پڑھ لیا کرو (بسم اللہ پڑھ لیا کرو) پھر اگر وہ شکار کو تمہارے لئے روک لے اور تو اسے زندہ پالے تو اسے ذبح کر لو اور اگر تو شکار کو مردہ حالت میں پائے اور کتے نے ابھی تک اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو تو

غَيْرُهُ، وَقَدْ قُتِلَ، فَلَا تَأْكُلْ. فَإِنَّكَ تَمَّ اسے کھا سکتے ہو اور اگر تو اپنے کتے کے ساتھ لَا تَذَرِي أَتَيْهَمَا قَتْلَهُ، وَإِنْ رَمَيْتَ دوسرا کوئی کتا بھی پائے اور جانور مردہ حالت میں ملے بِسَهْمِكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ، فَإِنْ غَابَ تو پھر اسے نہ کھا کیونکہ تجھے معلوم نہیں کہ ان عَنْكَ يَوْمًا فَلَمْ تَحِذْ فِيهِ إِلَّا أَثَرَ دونوں میں سے کس نے اسے مارا ہے اور اگر تو اپنا سَهْمَكَ فَكُلْ إِنْ شِئْتَ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ تیرے چھوڑے تو اس پر بسم اللہ پڑھ۔ پھر اگر شکار تیری غَرِيقًا فِي الْمَاءِ فَلَا تَأْكُلْ. مُتَّفَقٌ نظروں سے ایک روز تک او جھل رہے اور اس میں تیرے تیر کے سوا دوسرا کوئی زخم کا نشان نہ ہو تو پھر عَلَيَّ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

اسے تو کھالے۔ اگر تیری طبیعت کھانے کی طرف مائل ہو اور اگر شکار کو پانی میں ڈوب کر مرا ہوا پائے تو اسے نہ کھا۔“ (بخاری و مسلم) اور یہ الفاظ مسلم کے

(ہیں)

لغوی تشریح: ﴿مَلِكُكَ﴾ سدھایا ہوا کتا وہ ہوتا ہے کہ مالک جب کتے کو شکار پر جھپٹنے کیلئے ابھارے تو وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور جب ڈانٹ پلائے تو فوراً رک جائے اور جب شکار کر لے تو اسے مالک کیلئے روکے رکھے۔ خود نہ کھائے۔ یہ تیسری صفت کے شرط ہونے میں اختلاف ہے۔ ﴿فَانِ اسُكَ عَلَيْكَ﴾ اور اگر وہ تمہارے لئے روکے رکھے بائیں طور کہ خود اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے کیلئے یا منافع حاصل کرنے کیلئے شکار کرنا جائز ہے۔ شکار شکاری کتے سے کیا جائے یا شکاری پرندوں سے سب جائز ہے اور ان کا کھانا حلال ہے۔ اس کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ ضرور پڑھی جائے دوسرا یہ کہ کتا تربیت یافتہ یعنی سدھایا ہوا ہو سدھایا ہوا کتا اگر اس شکار میں سے کچھ کھالے تو شکار حرام ہو گیا۔ اس کا کھانا جائز نہیں رہا۔ اگر شکار کردہ جانور صحیح سالم حالت میں ہے تو اسے کھانا جائز ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی سامنے رہنی چاہئے کہ اگر کتے نے شکار اپنے دانتوں سے پکڑا ہے اور وہ مر گیا ہے تو اس کا کھانا حلال ہے اور اگر کتے کے جسم کی ضرب سے مرے تو حرام ہے۔ پھر اگر وہ شکار آدمی کے پیچنے تک بقیہ حیات ہو تو اسے ذبح کرنا چاہئے اور اگر مرچکا ہو تو وہ کھانا حلال ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکاری کتے کو مالک نے خود پڑھ کر چھوڑا ہو۔ اگر از خود شکار پر ٹوٹ پڑا اور شکار مار بھی لیا تو ایسا شکار بھی حلال نہیں ہوگا۔ جسور علماء کی یہی رائے ہے۔ مگر ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ کتے کا سدھایا ہونا شرط ہے۔ مقصد و ارادہ سے چھوڑنا شرط نہیں۔

اسی طرح اس حدیث سے شکار کی دوسری چیز نیزہ اور تیر سے شکار کرنا بھی ثابت ہے۔ تیر چھوڑتے وقت بھی اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بسم اللہ کتنا ایسے شکار کیلئے واجب ہے البتہ اگر بھول

ایسا جانور پھر مذبح کے حکم میں ہوتا ہے۔ ﴿بعضہ﴾ عرضہ عین پر فتح اور ”را“ ساکن۔ جس کی ایک طرف لوہا لگا ہوا نہ ہو۔ ﴿فانہ و قیذ﴾ وقیذ موقوذ کے معنی میں ہے وہ جانور جسے لاشی یا پتھریا ایسی چیز جس سے لوہا لگا ہوا نہ ہو سے مارا جائے، وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت ذبح نہیں کی گئی اور حکماً بھی اسے مذبح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شکار میں یہ اصول ہے کہ اگر تو جانور کسی تیز چیز سے زخمی ہو کر خون بہہ جانے کی وجہ سے مرے تو اس کا کھانا جائز و حلال ہے اور اگر کسی چیز کی ضرب و چوٹ سے مرے تو اس کا کھانا حرام ہے۔ قرآن و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہے۔

(۱۱۵۰) وَعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ، فَعَابَ عَنْكَ، فَأَذْرَحْتَهُ: فَكُلْهُ، مَا لَمْ يَتَيْنِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جب تو اپنے تیر سے شکار کرے اور وہ شکار تیری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ بعد میں پھر تو اسے پالے تو جب تک وہ بدبودار نہ ہو کھالے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مالم یستن﴾ باب افعال سے ہے یعنی جب تک اس میں بدبو پیدا نہ ہو۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی پرندے کا شکار کیا اور وہ زخم کھا کر ایسی جگہ جاگرا کہ شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بعد ازاں پھر مل گیا۔ اگر وہ پانی میں مردہ حالت میں ملا ہو پھر تو حرام ہے اگر زندہ مل جائے تو اسے زنج کر لیا جائے اور اگر خشکی پر مردہ حالت میں ملا ہو اور اس کے جسم پر تیر کے نشان کے علاوہ اور کوئی نشان نہ ہو تو وہ حلال ہے۔ مگر جب اس میں تعفن اور بدبو پیدا ہو جائے تو وہ قطعی حرام ہے۔

(۱۱۵۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: أَنَّ قَوْمًا قَالُوا لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ قَوْمًا يَأْتُونَنَا بِاللَّحْمِ لَا نَدْرِي أَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ، أَمْ لَا؟ فَقَالَ: «سَمُّوا اللَّهَ عَلَيْهِ أَنْتُمْ، وَكُلُّوهُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں جس کے متعلق ہمیں معلوم نہیں کہ وہ گوشت کس طرح کا ہوتا ہے آیا اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہوتا ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ”تم اس پر اللہ کا نام لو اور کھا لو۔“ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کو مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہئے نیز یہ کہ جب تک حتمی اور یقینی طور پر کسی چیز کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حرام ہے محض شبہات کی بنا پر اسے حرام قرار نہیں دیا جانا چاہئے بالخصوص جبکہ وہ چیز کسی مسلمان بھائی کے پاس ہو۔

(۱۱۵۲) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُعْقَلٍ حضرت عبد اللہ بن معقل مزیؓ سے روایت ہے

الْمُزْنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْحَذَفِ، سَعًى مَنَعَ فَرَمَا اُور فَرَمَا "كِه نِه هِي تَوِيه شَكَار كِر سَكْتَا وَقَالَ إِنَّهَا: «لَا تَصِيدُ صَيْدًا، وَلَا تَنَكُّأُ عَدُوًّا، وَلَكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ، كِسِي كَا دَا نَت تَوُثَّرِي غَايَا آنَكُه پھوڑے گا۔" (بخاری و وَتَفَقَّأَ الْعَيْنَ». مَتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. مُسْلِم اُور يِه الْفَاظ مُسْلِم كِي هِي)

لَعُو تَشْرِيح: ﴿الْحَذَفُ﴾ خَاوَ پَر فَتْحِ ذَالِ سَاكِن۔ وَه كَنْكِرِي يَا سَكْرِيْزِي كَا پَھِيْنَكْنَا هِي۔ دَر مِيَا ن اُور شَهَادَتِ الْوَالِي الْاَنْكَلِي سِي يَا اَنْكُوْثِي اُور شَهَادَتِ الْوَالِي الْاَنْكَلِي سِي۔ ﴿اِنْهَا﴾ اِيْنِي وَه سَكْرِيْزِي جُو خَذَف سِي سَمَجْهَا گِيَا هِي ﴿لَا نَسْكَ﴾ بَابِ فَتْح سِي هِي وَه زَخْمِي نِيْس كِرْتِي ﴿تَفَقَّأَ﴾ اِيْنِي وَه آنَكُه كُو نَقْصَا ن دِيْتِي اُور اِنْدَهَا كِر دِيْتِي هِي۔

حَا صِل كَلَام: اِسْ حَدِيْث سِي مَعْلُوْم هُوَا كِه كَنْكِرِي گَنِي سِي جَانُوْر مَرَجَا ئِي تُوَا س كَا كَهَا نَا حَلَال نِيْس۔ اِس شَغْل كَا فَائِدَه كَم اُور نَقْصَا ن كَا اَحْطَال زِيَا دِه هِي اِس لِي "خَذَف" سِي مَنَعَ فَرَمَا گِيَا هِي۔ اِْسِي ضَمْن مِي سِي يِه بَھِي مَعْلُوْم هُوَا كِه غَلِيْل سِي مَارَا هُوَا جَانُوْر وَ پَرْنَدِه بَھِي حَلَال نِيْس كِيُوْنَكِه وَه بَھِي خَذَف كِي طَرَح چُوْث وَ ضَرْب سِي مَرْتَا هِي۔ اِْسِي طَرَح بَنْدُوْق كِي گُوْلِي سِي مَارَا هُوَا پَرْنَدِه بَھِي جَمُوْر كِي زَرْدِيْكَ حَلَال نِيْس۔ مَگر عِلَامَه اِيْمَانِي رَضِيَ اللّٰهُ عَنْہُ فَرَمَاتِي هِي اِس دُوْر مِيْس بَنْدُوْق كِي گُوْلِي كِيْل كِي طَرَح جَسْم كُو كَاْثِي هِي اِس لِي بَنْدُوْق سِي كِيَا هُوَا شَكَار حَلَال هِي۔ (السُّبُل)

(۱۱۵۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الْخَذَفِ، سَعًى مَنَعَ فَرَمَا "كِسِي ذِي رُوْح چِيْز كُو نَشَا نِه بِنَا كِرْنِه مَارُو۔" قَالَ: «لَا تَتَّخِذُوا شَيْئًا فِيهِ الرُّوحُ (مُسْلِم) غَرَضًا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لَعُو تَشْرِيح: ﴿غَرَضًا﴾ غِيْن اُور "رَا" دُوْنُوْں پَر فَتْح۔ نَشَا نِه بِنَا كِر تِيْر مَارَنَا۔ حَا صِل كَلَام: اِسْ حَدِيْث سِي مَعْلُوْم هُوَا كِه كِسِي جَانُوْر كُو بَا نْدِه كِر تِيْر وَ غِيْرِه مَارَنَا حَرَام هِي كِيُوْنَكِه اِس سِي اِسِي شَدِيْد تَكْلِيْف هُوْتِي هِي اُور شَرِيْعَتِ اِسْلَامِيْه جَانُوْر تَك كُو اِذِيْت اُور تَكْلِيْف دِيْنِي كِي حَق مِيْس نِيْس هِي۔

(۱۱۵۴) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً عَمُرْتِ فِي بَيْتِهَا كِسِي كَبْرِي كُو ذَرْع كِر دِيَا۔ نَبِي ﷺ ذَبَحَتْ شَاةً بِحَجَرٍ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ سِي اِس كِي كَهَا نِي كِي مَتْعَلَق پُوْچْهَا گِيَا تُوَا اُپْ نِي عَنِ ذَلِكَ، فَأَمَرَ بِأَكْلِهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. اِسِي كَهَا نِي كَا حَكْم فَرَمَا۔ (مُسْلِم)

کھانے کے مسائل 865

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذبح چھری وغیرہ کے علاوہ بھی اور چیزوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ پتھر نوکدار تھا جس سے خون بہہ گیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کا ذبیحہ حلال ہے اور اس کا کھانا بلا کراحت جائز ہے۔

(۱۱۵۵) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ. حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ روایت کیا ہے کہ ”جو چیز خون کو بہا دے اور اسے ﷺ قَالَ: «مَا أَنَهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ كَانَامَ لے کر ذبح کیا گیا ہو تو اس جانور کو کھالو۔ اللہ عَلَيهِ، فَكُلْ، لَيْسَ النَّسْنُ ذَبْحُ كَرْنِے كَا آلہ دانت اور ناخن نہیں کیونکہ دانت تو وَالظُّفْرُ، أَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ، وَأَمَّا هَذِي ہے اور ناخن حبشیوں کی چھری ہے۔“ (بخاری و الظُّفْرُ فَمُدَى الْحَبَشَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مَا أَنَهَرَ الدَّمَ﴾ جو چیز خون بہا دے، جاری کر دے اور چلا دے اور کلمہ ”ما“ عام ہے اس میں تلوار، چھری، تیز پتھر، لکڑی، شیشہ، سرکنڈا، بانس، ٹھکری، تانبے یا لوہے کی ساختہ چیزیں شامل ہیں۔ ﴿فَمُدَى﴾ مدی کی جیم پر ضمہ اور کسرہ دونوں درست ہیں۔ مدیہ کی جمع ہے۔ چھری کو کہتے ہیں۔ ناخن کے ساتھ ذبح کرنے میں کفار سے تشبیہ ہے ناخن سے گلے کو گھونٹنے کے سوا اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو ذبح کی صفت میں نہیں آتا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث مطلق دانت اور ناخن سے ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔ دانت و ناخن خواہ انسان کا ہو یا کسی اور جانور کا الگ اور جدا ہو یا جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو خواہ لوہے سے بنایا ہو۔

(۱۱۵۶) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ. حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُقْتَلَ شَيْءٌ مِّنَ الدَّوَابِّ صَبْرًا. رَوَاهُ مُسْنِدُ النَّهَى سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: باندھ کر قتل کرنے کا معنی یہ ہے کہ کسی جاندار کو زندہ باندھ کر اسے نشانہ لگا کر مارا جائے کہ وہ جاں بحق ہو جائے۔ جہاں تک باندھ کر ذبح کرنے کا تعلق ہے تو وہ جائز ہے۔ وہ باندھ کر قتل کرنے کے ضمن میں نہیں آتا۔

(۱۱۵۷) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ. حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ إِحْسَانَ كَرْنَا فَرْض قَرَار دیا ہے لَنْدَا جب تم قتل کرو تو الْإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ عَمَدَةً وَاجَّهْتُمْ طَرِيقَةً سے قتل کرو اور جب تم کسی

اللہ عَلَیْهَا اَمَ لَمْ یَذْکُرْ، وَرِجَالُهُ مُؤْتَقُونَ۔ ہے۔ اس ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔“

(اس کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بھول کر تکبیر ذبح چھوٹ جائے تو جانور حلال ہے مگر یہ احادیث ان صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جن سے ذبیحہ پر تکبیر پڑھنا واجب ثابت ہے۔ البتہ یہ احادیث تکبیر کے وجوب کو کمزور کر دیتی ہے اور متروک التسمیہ کے نہ کھانے کو ورع و تقویٰ کے باب میں لے جاتی ہے۔ (البل)

راوی حدیث: ﴿محمد بن یزید بن سنان﴾ یہ صاحب تسمی بھی ہیں اور جزری رھاوی بھی۔ ان کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ ابو حاتم نے کہا ہے کہ آدمی تو صالح تھا مگر پختہ نہیں تھا اور ابو داؤد نے کہا ہے وہ کچھ بھی نہیں تھا اور امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے وہ قوی نہیں تھا اور ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے ثقات میں شمار کیا ہے۔ ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

(احکام) قربانی کا بیان

۲ - باب الْأَضَاحِی

(۱۱۶۰) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُضْحِي بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ، وَيُسَمِّي، وَيُكَبِّرُ، وَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلَى صَفَاحِهِمَا. وَفِي لَفْظٍ: «دَبَحَهُمَا بِيَدِهِ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ: «سَمِينَيْنِ». وَلَأِبْنِي عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ: «ثَمِينَيْنِ» بِالْمُثَلَّثَةِ بَدَلِ السَّيْنِ. وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: «وَيَقُولُ بِسْمِ اللَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ».

حضرت انس بن مالک رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دو مینڈھے، چتکبرے، سیٹوں والے قربانی کرتے تھے اور بسم اللہ پڑھتے اور تکبیر کہتے اور ان کے پلوؤں پر اپنا پاؤں مبارک رکھتے تھے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ ان دونوں کو اپنے دست مبارک سے ذبح کیا (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ وہ خوب موٹے تازے تھے اور ابو عوانہ کی صحیح میں ”ثمینین“ سین کی جگہ ثاء ہے۔ یعنی وہ قیمتی تھے اور مسلم کے الفاظ ہیں کہ آپ نے بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔

اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ سیٹوں والا مینڈھا ہو جس کے پاؤں کالے ہوں اور پیٹ کا حصہ بھی سیاہ ہو اور آنکھیں بھی سیاہ ہوں تاکہ آپ اس کی قربانی کریں۔ آپ نے فرمایا ”عائشہ چھری تیز کرو۔“ پھر

فَأَضَجَعَهُ، ثُمَّ ذَبَحَهُ، وَقَالَ: بِسْمِ اللَّهِ، آپؐ نے چھری کو پکڑا اور مینڈھے کو پچھاڑا۔ پھر اللہ، اللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ، وَآلِ اسے ذبح کیا اور فرمایا ”اللہ کے نام سے۔ اسے اللہ! مُحَمَّدٍ، وَمِنْ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ ثُمَّ صَحَّى مُحَمَّدٌ اور آلِ مُحَمَّدٌ اور امتِ محمدؐ (کی طرف) سے قبول یہ۔ ﷺ فرما۔“

لغوی تشریح: ﴿باب الاضاحی﴾ اضافی میں ”حا“ کے نیچے کسرہ اور ”یا“ مشدّر ہے یہ ﴿اضحیہ﴾ کی جمع ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ امام نووی نے کہا ہے کہ ﴿اضحیہ﴾ میں چار لغات ہیں اور یہ اس ذبح شدہ جانور کو کہتے ہیں جو قربانی کے روز ذبح کیا جاتا ہے۔ پہلی اور دوسری لغت کے اعتبار سے اضحہ اور اضحیہ کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے اور اس کی جمع اضافی آتی ہے اور اضافی میں ”یا“ پر تشدید بھی ہے اور تخفیف بھی اور تیسری لغت کے اعتبار سے ضحیہ اور اس کی جمع ضحایا آتی ہے اور چوتھی لغت کے اعتبار سے اضحیۃ ہمزہ فتح کے ساتھ اور اس کی جمع ہے اضحیۃ ارطۃ اور ارطی کے وزن پر اور اسی وجہ سے اس دن کو یوم الاضحیٰ کہتے ہیں۔ ﴿بکشین﴾ کبش بھیڑ کے نز کو کہتے ہیں۔ یعنی مینڈھا خواہ عمر کتنی ہی ہو۔ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دودنا ہو یعنی جس کے دودانت نکل آئے ہوں اور ایک قول یہ ہے کہ چوگا یعنی جس کے چار دانت نکل چکے ہوں۔ ﴿املحین﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے جسم پر سیاہ بال ہوں مگر سفید بال زیادہ ہوں۔ ﴿اقرنین﴾ دونوں کے دو خوبصورت اور مناسب سینگ ہوں۔ ﴿ویسمی ویکبر﴾ یعنی بسم اللہ واللہ اکبر کہتے۔ ﴿صفحاہما﴾ صاد کے نیچے کسرہ کا پہلو اور ایک قول ہے کہ ”صفحة“ کی جمع ہے اور چرے کے عرض کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق گردن کے ارد گرد کا حصہ ﴿سمنین﴾ سین کے ساتھ سمانہ سے ماخوذ ہے یعنی موٹے تازے تھے، کمزور نہیں تھے۔ ﴿نمینین﴾ ”ٹا“ کے ساتھ معنی قیمتی۔ قیمتی اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کہ خوب موٹے تازے نہ ہوں۔ ﴿یطا﴾ چلتا ہو (پاؤں) ﴿فی سواد﴾ یعنی ٹانگیں سیاہ باقی سفید۔ ﴿یبرک فی سواد﴾ بروک سے ماخوذ ہے۔ بیٹے کا وہ حصہ جو زمین سے جا لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مینڈھے کا پیٹ اور سینہ سیاہ ہو۔ ﴿وینظر فی سواد﴾ آنکھوں کے ارد گرد کا حصہ سیاہ ہو۔ ﴿اشحذی﴾ تیز کر کے لاؤ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) رسول اللہ ﷺ نے قربانی مدینہ طیبہ میں بھی کی ہے۔ (۲) مینڈھا جو چت کبرا، موٹا تازہ اور قیمتی ہو تا اس کی قربانی آپؐ کو محبوب تھی۔ (۳) قربانی سے پہلے چھری خوب تیز کر لینی چاہئے۔ (۴) ذبح جانور کو پہلو کے بل لٹا کر کرنا چاہئے۔ (۵) ذبح سے پہلے مسنون دعا اور تکبیر پڑھنی چاہئے۔ (۶) اہل خانہ کی طرف سے ایک جانور قربانی کرنے سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ (۷) قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنی چاہئے گو اس میں نیابت بھی جائز ہے۔

(۱۱۶۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ حَضْرَتُ ابُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص میں قربانی کرنے کی طاقت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ میں «مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحَّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّاتَنَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ حَكَمٍ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے بعض نے قربانی کے وجوب پر استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ اولاً تو یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ثانیاً یہ وجوب میں صریح نہیں یہ اسی طرح ہے جیسے حدیث میں ہے کہ جس نے لسن کھلایا ہو وہ ہماری مسجد میں نہ آئے۔ جمہور کے نزدیک یہ حکم صرف استحباب کی تاکید کیلئے ہے۔ اس کے علاوہ بھی جن دلائل سے قربانی کے وجوب پر استدلال کیا جاتا ہے وہ صحیح اور صریح نہیں ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ قربانی سنت ہے بلکہ شعار اسلام سے ہے۔

(۱۱۶۲) وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ الْأَضْحَى مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ بِالنَّاسِ نَظَرَ إِلَى غَنَمٍ قَدْ ذُبِحَتْ، فَقَالَ: «مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيَذْبَحْ شَاةً مَكَانَهَا، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ ذَبَحَ فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللَّهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں عید قربان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا چکے تو دیکھا کہ ایک بکری ذبح کی ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ”جس کسی نے نماز سے پہلے ہی اسے ذبح کر دیا ہے وہ اس کی جگہ دوسری بکری ذبح کرے اور جس نے ذبح نہیں کیا اسے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنا چاہئے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کا صحیح وقت نماز عید کے بعد ہے۔ اگر کسی نے نماز کی ادائیگی سے پہلے ہی جانور ذبح کر دیا تو اس کی قربانی نہیں ہوئی، اسے دوبارہ قربانی کرنی چاہئے۔ قربانی کا انتہائی وقت کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں ذوالحجہ کی ۱۲ تاریخ کی شام تک اس کا آخری وقت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذوالحجہ کی ۱۳ تاریخ کی شام تک۔ داؤد ظاہری اور تابعین کی ایک جماعت کے نزدیک منی میں بارہ ذوالحجہ کی شام تک اور غیر منی میں یوم النحر کی شام تک صرف ایک روز اور ایک جماعت کی رائے یہ بھی ہے کہ ذوالحجہ کے آخری دن تک۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے موقف کو دلیل

کھانے کے مسائل 870

کے اعتبار سے رائج قرار دیا ہے کہ ایام تشریق یعنی ۱۳ ذوالحجہ تک قربانی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ﴾ جندب بن عبد اللہ بن سفیان رضی اللہ عنہ بجیلہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے بجلی کہلائے اور ملتی بھی۔ اور ملتی بجیلہ کی شاخ تھی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ با اوقات اپنے دادا کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ پہلے کوفہ میں تھے پھر بصرہ میں تشریف لے گئے۔ ۶۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(۱۱۶۳) وَعَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: «أَزْبِغْ لَا تَجُوزُ فِي الضَّحَايَا: الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوْرُهَا، وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَرَجَاءُ الْبَيِّنُ ضَلْعُهَا، وَالْكَبِيرَةُ الْبَيِّنُ لَنْتَرَأُهَا، وَالتَّيْسُ لَا تَنْقَى». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْمَعِيُّ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ جِبَانَ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے تھے تو آپ نے فرمایا ”چار قسم کے جانور قربانی میں جائز نہیں۔ ایک چشم جانور جس کا ایک چشم ہونا بالکل صاف طور پر معلوم ہو اور وہ بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو اور لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن نمایاں اور ظاہر ہو اور وہ جانور جو نہایت ہی بوڑھا ہو گیا ہو جس کی ہڈیوں میں گودا نہ رہا ہو۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا)

ہے ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے

لغوی تشریح: ﴿العوراء﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ کی بصارت جاتی رہی ہو۔ ﴿البین﴾ ظاہر اور واضح ﴿عورھا﴾ عین اور واؤ دونوں پر فتح جس کی دونوں آنکھوں میں سے ایک کی بینائی نہ ہو۔ ﴿والمريضة البين مرضها﴾ بیمار ہو عموماً چارہ نہ کھاتی ہو اور اس کا مرض اس کے گوشت کے ناقص اور خراب ہونے کی وجہ سے واضح اور نمایاں ہو۔ ﴿العرجاء﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے ایک پاؤں میں چوٹ آئی ہو اور اس وجہ سے چل پھر نہ سکتا ہو گویا لنگڑا ہو۔ ﴿ضلعها﴾ ضاد اور لام پر فتح اور لام پر سکون بھی جائز ہے۔ معنی اس کا لنگڑا پن اس کا لنگڑا پن ظاہر ہو جس وجہ سے وہ جانور چل پھر نہ سکے یا چراگاہ میں دوسرے جانوروں کے ساتھ مل کر چرنے کیلئے نہ جاسکے۔ ﴿التى لا تنقى﴾ تنقی باب الافعال سے ہے یعنی لاغراور کمزور ہونے کی بنا پر اس کی ہڈیوں میں میخ اور گودا نہ رہا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ بالا چاروں عیب والا جانور قربانی کے لائق نہیں۔ ان میں سے ایک عیب والا جانور بھی قربانی کیلئے جائز نہیں ہے اور اسی طرح کا دوسرا کوئی عیب یا جو اس سے بھی قبیح ہو۔ عیب کے واضح اور نمایاں ہونے کی قید اس چیز کی مقتضی ہے کہ قربانی کے جانوروں میں معمولی نوعیت کا کوئی نقص و عیب قابل گرفت نہیں۔ معاف ہے، قابل درگزر ہے۔

(۱۱۶۴) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمْ يَأْكُلْ مِنْ دَنَاءِ (دَوْنَا) لَيْكِنْ

کھانے کے مسائل 872

میں ہے کہ یہ ایسی بکری ہے جس کے کان آگے سے کٹے ہوں اور لٹکے ہوئے ہوں۔ ﴿مدابرة﴾ ”با“ پر فتح یہ ایسی بکری جس کے کان پیچھے سے کٹے ہوں اور پیچھے سے لٹک رہے ہوں۔ ﴿خرقاء﴾ یہ ایسی بکری ہے جس کے کان میں گول سوراخ ہو اور خرق کے معنی سوراخ کے ہیں۔ ﴿شرقاء﴾ لمبائی میں جس کے کان کٹے ہوئے ہوں اور خرقاء کے بارے میں یہ بھی ہے کہ وہ جانور جس کے کان عرض میں کٹے ہوئے ہوں۔

(۱۱۶۶) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ أَقُومَ عَلَى بُذْنِهِ، وَأَنْ أَقْسِمَ لِحَوْمِهَا وَجُلُودِهَا وَجِلَالِهَا عَلَى الْمَسَاكِينِ، وَلَا أُعْطِيَ فِي جِزَارَتِهَا شَيْئًا مِنْهَا. مُتَّفَقٌ (بخاری و مسلم) عَنِهِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا کہ میں قربانی کے اونٹوں کی نگرانی و حفاظت کروں۔ یہ حکم دیا کہ میں ان کا گوشت اور چمڑا اور جھول کو مساکین و غریب پر تقسیم کر دوں اور قصاب کو اس سے کچھ بھی نہ دوں۔ اُعطی فی جزارتہا شیئاً منها۔ متفق (بخاری و مسلم) عنیہ۔

لغوی تشریح: ﴿علی بدنہ﴾ بدن ”با“ پر ضمہ اور دال ساکن۔ بدنہ کی جمع۔ اصل میں تو اونٹ کو کہتے ہیں اور گائے کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ ﴿جلالہا﴾ جل کی جمع ہے۔ جیم پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ مردی وغیرہ سے بچنے کیلئے جو کچرا جانور پر ڈالا جائے اسے ”جل“ کہتے ہیں۔ ﴿جزارتہا﴾ جیم پر ضمہ اس اجرت و معاوضہ کو کہتے ہیں جو قصاب ذبح کے بدلہ میں وصول کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں قربانی کے جن اونٹوں کا ذکر ہے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے وہ اونٹ تھے جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لائے تھے ان کی تعداد ایک سو تھی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت، اس کا چمڑا اور اس سے متعلق سلمان پالان، رسی وغیرہ سب کچھ خیرات کر دینا چاہئے اور قصاب کو اجرت تک اس گوشت میں سے نہیں دی جاسکتی۔ اجرت و معاوضہ الگ سے دینا چاہئے۔

(۱۱۶۷) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صلح رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَحَرْنَا حَدِيدِيَةَ الْخَدِيدِيَّةِ عامَ الْحَدِيدِيَّةِ اُونٹ اور گائے کو سات سات آدمیوں کی جانب سے اَلْبَدَنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ، وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ. نَحْرِكِيَا. (مسلم) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صلح رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَحَرْنَا حَدِيدِيَةَ الْخَدِيدِيَّةِ عامَ الْحَدِيدِيَّةِ اُونٹ اور گائے کو سات سات آدمیوں کی جانب سے اَلْبَدَنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ، وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ. نَحْرِكِيَا. (مسلم) رَوَاهُ مُسْلِمٌ

حاصل کلام: سات افراد کی طرف سے اونٹ یا گائے ذبح کرنے کا یہ ضابطہ و اصول ہدی کے جانوروں کیلئے ہے جبکہ قربانی میں اونٹ دس افراد کی طرف سے بھی جائز ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما

کھانے کے مسائل 873

سے روایت ہے کہ ہم سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے۔ قربانی کا وقت آگیا تو ہم گائے میں سات آدمی شریک ہوئے اور اونٹ میں دس آدمی۔ یہ روایت نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔

۳ - باب العقیقۃ عقیقہ کا بیان

(۱۱۶۸) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ كَبْشًا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حُزَيْمَةَ. وَابْنُ الْجَارُودِ وَعَبْدُ الْحَقِّ، لَكِنْ رَجَعَ أَبُو حَاتِمٍ إِزْسَالَهُ، وَأَخْرَجَ ابْنُ جِبَّانٍ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ. طَرَحَ رَوَايَتَ كَيْفَ هُوَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک ایک مینڈھے سے عقیقہ کیا۔ (اسے ابو داؤد نے روایت کبشاً۔ رواہ ابو داؤد، وصحّحہ ابن حزمہ و ابن الجارود و عبد الحق، لكن رجّع أبو حاتم إزساله، وأخرج ابن جبان من حديث أنس. طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب العقیقۃ﴾ عقیقہ کے عین پر فتح۔ اس ذبیحہ کو کہتے ہیں جو نومولود کی طرف سے ذبح کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل میں عقیقہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو شکم مادر میں نومولود کے سر پر نکلتے ہیں۔ اس حالت میں نومولود کی طرف سے جو بکری ذبح کی جاتی ہے اسے عقیقہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس بال کو نومولود کے سر سے ذبح کے وقت مونڈ دیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقیقہ ”عق“ سے ماخوذ ہیں اور عق کے معنی پھاڑنے اور کاٹنے کے ہیں۔ نومولود کی طرف سے ذبح کی جانے والی بکری کو عقیقہ کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کے اعضاء کو ٹکڑے کر دیا جاتا ہے اور پیٹ کو چیر پھاڑ دیا جاتا ہے۔ ﴿عق﴾ کا معنی ہے ذبح کیا۔ ﴿کبشا کبشا﴾ ان دونوں میں سے ہر ایک کی جانب سے ایک ایک مینڈھا۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ لڑکے کی جانب سے ایک ہی جانور پر اکتفاء جائز ہے اور تعداد اس میں شرط کے طور پر نہیں بلکہ مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿حسین رضی اللہ عنہ﴾ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا مختصر تذکرہ کتاب الصلوٰۃ کے باب صفۃ الصلوٰۃ کے تحت ہو چکا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے تقریباً ایک سال چھوٹے تھے۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کے نواسے تھے اور آپ کی خوشبو تھے۔ ۱۷ھ عاشورہ کے دن سرزمین عراق کے میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۴ سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔

(۱۱۶۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَمَرَهُمْ صَاحِبَهُ "كُوْهُمَ دِيَا" كَيْفَ لَوْ كَانَتْ لَكِ مِنْ رِجْلِ الْغُلَامِ شَاتَانِ. طَرَحَ رَوَايَتَ كَيْفَ هُوَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ایک جیسی اور لڑکی کی طرف سے ایک

کھانے کے مسائل 874

مُكَافِتْنَانِ، وَعَنْ الْحَارِثِ شَاةً. رَوَاهُ بَكْرِيُّ عَقِيْقَةٍ كَرِيْمٍ۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور الترمذی، وَصَحَّحَهُ، وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ عَنْ اِسے صحیح قرار دیا ہے، احمد اور چاروں نے ام کرز کعبیہ سے اُمُّ حُرْزٍ الْكَعْبِيَّةِ نَحْوَهُ۔ اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان یعق﴾ صیغہ مجہول ﴿مکافستن﴾ ”قا“ کے نیچے کسرہ۔ یہ بھی قول ہے کہ ایک جیسی ہوں۔ ایک دوسری کی تقریباً ہم عمر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی ہوں جیسی قربانی اور زکوٰۃ میں دی جاتی ہیں اور یہ بھی قول ہے کہ دونوں ایک دوسری کی مثل ہوں۔

حاصل کلام: یہ جمہور کے نزدیک مستحب ہے البتہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنی چاہئے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ دونوں میں فرق کے قائل نہیں مگر یہ حدیث ان کے خلاف ہے اور مطلقاً ﴿شاة﴾ کے لفظ سے یہ کہا گیا ہے کہ عقیقہ کے جانور میں قربانی کے جانور کی شرائط نہیں ہیں لیکن اس کیلئے مساوی اور متقارب کی قید اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس میں کھلا ہوا نقص اور عیب نہ ہو۔ لہذا قربانی کے جانور میں شارع نے جن نقائص و عیوب سے بچنے اور پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ان کا لحاظ رکھا جائے۔ اس جانور کا منہ ہونا کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں البتہ لفظ ﴿شاة﴾ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ بکری کا بچہ نہ ہو بلکہ بڑی عمر کا ہو جسے شاة (بکری) کہا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا﴾ خزاعہ قبیلہ سے تھیں اس لیے خزاعیہ کہلائیں۔ شرف صحابیت سے مشرف تھیں۔ ان سے کئی احادیث منقول ہیں۔ کرز کے کاف پر ضمہ اور ”راء“ ساکن ہے۔

(۱۱۷۰) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُّ غُلَامٍ مَرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ، وَيُحْلَقُ وَيُسَمَّى»۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مرتہن﴾ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ رہن رکھا ہوا۔ خطابی کا قول ہے کہ ﴿مرتہن﴾ کے مفہوم میں اختلاف ہے اور سب سے عمدہ بات وہ ہے جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ یہ شفاعت کے متعلق ہے۔ یعنی جب بچہ کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو اور وہ بچہ فوت ہو جائے تو وہ اپنے والدین کے حق میں سفارش نہیں کرے گا اور یہ بھی قول ہے کہ عقیقہ ناگزیر اور لازمی ہے اس کے کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور بچے کو رہن سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح رہن مرتہن کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے، اسی طرح بچے کی طرف سے عقیقہ بھی ضروری ہے۔ توجیہ سے ان حضرات

875 کھانے کے مسائل

کی تائید ہوتی ہے جو عقیقہ کو واجب قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بالوں کی گندگی و ناپاکی میں مرہون ہے۔ اس لئے حدیث میں ہے کہ اس سے گندگی کو دور کرو۔ ﴿یوم سابعہ﴾ یعنی ساتویں روز عقیقہ کرو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر ساتواں روز گزر جائے تو پھر چودھویں روز وہ بھی گزر جائے تو پھر اکیسویں دن عقیقہ کیا جائے۔ اس بارے میں ایک حدیث بھی مروی ہے مگر وہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں روز بچے کے سر کی پیدائشی آلائش صاف کر کے یعنی اس کے سر کے بال اتروا کر بچے کو نہلایا جائے۔ اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے اور اس کا نام بھی رکھا جائے



۱۳۔ کِتَابُ الْاِيْمَانِ وَالنَّذْرِ

قسموں اور نذروں کے مسائل

(۱۱۷۱) عَنْ أَنَسٍ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، أَنَّهُ أَدْرَكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فِي رَكْبٍ، وَعُمَرُ يَحْلِفُ بِأَبِيهِ، فَنَادَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَلَا إِنَّ اللَّهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تُحْلِفُوا آبَاءَكُمْ، فَمَنْ كَانَ قَسَمَ كَهَانَا چاہے تو اسے اللہ کے نام کی قسم کھانی چاہئے خَالِفًا فَلْيَحْلِفْ بِاللَّهِ أَوْ لِيَصُمْتُ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿کتاب الایمان﴾ ہمزہ پر فتح۔ یمن کی جمع ہے۔ لغت میں ہاتھ کو کہتے ہیں اور حلف (قسم) پر اس کا اطلاق اسی لئے کیا گیا ہے کہ جو لوگ قسم کھاتے تھے تو ہر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا اور شرعاً کسی شے کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لئے اللہ کا ذاتی نام یا صفاتی لے کر قسم کھانا اور ﴿النذور﴾۔ نذر کی جمع ہے اور اس کا اصل تو ”انذار“ ہے جس کے معنی ڈرانے کے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ انذار کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔ ﴿فی ركب﴾ ”را“ پر فتح اور کاف ساکن۔ راکب کی جمع۔ مطلب ہے کہ ایک قافلہ و کارواں میں تھے اور وہ کارواں کسی غزوہ میں جا رہا تھا۔ ﴿فلیحلف باللہ﴾ اللہ کے نام و صفات کی قسم کھانی چاہئے۔ ﴿اولی صمت﴾ یا پھر خاموش رہے۔ صمت نصر بنصر کے وزن پر ہے۔ لام اس میں امر کا ہے۔ ﴿ولا بلاندا﴾ انداز سے یہاں بت مراد ہیں۔ انداد ند کی جمع۔ ند کے نون کے نیچے کسرہ اور وال مشدود، مثل کے معنی میں۔ صنم کو ند کہا گیا ہے اس لئے کہ مشرکین نے اسے اللہ کے ساتھ مستحق عبادت بنا لیا تھا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا حرام ہے۔ ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر یا شرک کا ارتکاب کیا۔“ ابوداؤد اور احمد نے

قسموں اور نذروں کے مسائل 877

بائیں الفاظ روایت نقل کی ہے کہ ”جس کسی نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا اور یہ اس بنا پر ہے کہ کسی چیز کی قسم کھانا اس کی عظمت کا مقتضی ہوتا ہے اور عظمت فی الحقیقت صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔“ قدیم ترین زمانے سے لوگوں کا یہ اعتقاد و نظریہ چلا آرہا ہے کہ جس کے نام کی قسم کھائی جائے اس کا قسم کھانے والے پر تسلط اور غلبہ ہوتا ہے اور وہ مافوق الاسباب بھی نفع و نقصان دینے کی قدرت و طاقت رکھتا ہے۔ پس جب قسم کھانے والا اپنی قسم پوری کرتا ہے تو جس کی قسم کھائی گئی ہوتی ہے وہ خوش ہوتا ہے اور اسے نفع دیتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے اور جب قسم اٹھانے والا اپنی قسم پوری نہیں کرتا تو وہ اس پر ناراض ہوتا ہے اور اسے نقصان اور ضرر پہنچاتا ہے۔ لاریب ایسا اعتقاد غیر اللہ کے بارے میں رکھنا کھلا شرک و کفر ہے اور غیر اللہ کے نام کی قسم اور غیر اللہ کے نام کی نذر شرک کا باعث ہے۔ پس جب کوئی اس اعتقاد کے ساتھ قسم کھائے تو اس نے حقیقت میں شرک کا ارتکاب کیا اور جب قسم کھائے اور یہ اعتقاد و نظریہ نہ ہو تو پھر اس نے شرک کے اسباب میں سے ایک سبب کا ارتکاب کیا۔ شریعت نے اسباب شرک سے بھی اسی طرح منع کیا ہے جیسے شرک سے منع فرمایا ہے۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ حَضَرْتُ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مَرْفُوعًا: «لَا تَحْلِفُوا بِأَبَائِكُمْ، وَلَا بِأُمَّهَاتِكُمْ، وَلَا بِالْأَنْدَادِ، وَلَا تَحْلِفُوا بِاللَّهِ إِلَّا وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے: ”اپنے باپ دادوں، اپنی ماؤں اور اللہ کے شریکوں کی قسم نہ کھاؤ۔ اللہ کی قسم بھی صرف اس حالت میں کھاؤ کہ جب تم سچے ہو۔“

(۱۱۷۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «بِمَيْنِكَ عَلَى مَا يُصَدِّقُكَ بِهِ صَاحِبُكَ». وَفِي رِوَايَةٍ: «أَلِيمِينُ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تیری قسم اس پر واقع ہوتی ہے کہ تمہارا ساتھی تجھ کو سچا سمجھے“ اور ایک روایت میں ہے ”قسم کا دارومدار قسم لینے والے کی نیت پر ہے۔“ (ان دونوں احادیث کی روایت مسلم نے کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿يُصَدِّقُكَ﴾ تصدیق سے ماخوذ ہے۔ ﴿صَاحِبُكَ﴾ سے یہاں مد مقابل ساتھی مراد ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اس پر واقع ہونے والا ہے اور تو یہ اس میں اثر انداز نہیں ہوگا۔ پھر اگر قسم کھانے والا اپنے دل میں قسم لینے والے کی نیت کے خلاف نیت و ارادہ رکھے تو وہ اپنی قسم توڑنے سے نجات و چھٹکارا نہیں پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قسم کھانا جائز ہے اور قسم کا اعتبار تب ہوگا جب مدعی کی مراد کے مطابق قسم کھائی جائے۔

(۱۱۷۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ حَزْرَةَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ حَضَرْتُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنِ سَمُرَةَ عَنْ مَرْوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ

قسموں اور نذروں کے مسائل 878

سَمَرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اللَّهُ ﷻ نے فرمایا ”جب تم کسی کام پر قسم کھاؤ اور قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «وَإِذَا حَلَفْتَ اس کام کے خلاف کو بہتر دیکھو تو قسم کا کفارہ ادا کرو عَلى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا اور جو بہتر ہے وہ کر لو۔“ (بخاری و مسلم) اور بخاری مِنْهَا، فَكَفَّرَ عَنْ يَمِينِكَ وَائْتِ الَّذِي کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جو کام بہتر ہے اسے کرو اور هُوَ خَيْرٌ“. مَنَّعَ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظِ قسم کا کفارہ ادا کرو۔“ اور ابو داؤد کی روایت میں اس لِلْبَخَارِيِّ: «فَأَتَتْ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، طرح ہے کہ ”اپنی قسم کا کفارہ دے کر وہ کام کرو جو وَكَفَّرَ عَنْ يَمِينِكَ“. وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي بہتر ہے۔“ (دونوں احادیث کی سند صحیح ہے) دَاوُدَ: «فَكَفَّرَ عَنْ يَمِينِكَ. ثُمَّ أَتَتْ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ“. وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ.

لغوی تشریح: ﴿کفر﴾ تکفیر سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب ہے کہ اس کا کفارہ ادا کر۔ ﴿وات﴾ اتیان سے امر کا صیغہ ہے یعنی کرو۔ حدیث کے الفاظ مجموعی طور پر قسم توڑنے کی صورت میں کفارہ کی ادائیگی پہلے بھی اسی طرح جائز بتاتے ہیں جس طرح اس کے بعد جائز بتاتے ہیں۔ جمہور کا یہی مسلک ہے مگر حنفیہ کے نزدیک قسم توڑنے کا کفارہ قسم توڑنے سے پہلے ادا کرنا کسی حالت میں درست نہیں ہے۔ مگر ابو داؤد رحمہ اللہ کی یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ جس میں کفارہ کے بعد ”ثم“ کے لفظ سے امر خیر کا حکم ہے اور ”ثم“ کا لفظ ترتیب کا مقتضی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن سمرہ رحمہ اللہ﴾ ان کی کنیت ابوسعید ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ مجستان اور کابل کے فاتح ہیں۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ۵۰ھ یا بعد میں وفات پائی۔

(۱۱۷۴) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷻ نے فرمایا ”جو کسی کام پر قسم کھائے اور ساتھ ہی ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، انشاء اللہ کہے تو اس قسم کو توڑنے کا کفارہ نہیں فَقَالَ: إِنْ شَاءَ اللَّهُ، فَلَا حِنْثَ ہے۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن عَلَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعِيُّ، وَصَحَّحَهُ أَبُو حَبَانَ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

جئنا.

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے قسم کھانے والا ساتھ ہی اگر انشاء اللہ کہہ دے تو ایسی قسم توڑنے پر کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ قسم کو جب مشیت الہی سے مقید کر دیا جائے تو بالاتفاق وہ قسم منعقد نہیں ہوتی لہذا جب منعقد نہ ہوئی تو پھر اس کے توڑنے کے کفارہ کا کیا سوال۔

قسموں اور نذروں کے مسائل 879

(۱۱۷۵) وَعَنْهُ، قَالَ: كَانَتْ يَمِينُ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی النِّبْيِ ﷺ: «لَا، وَمُقَلَّبِ قسم کے الفاظ یہ ہوتے تھے ”نہیں“ قسم ہے دلوں کے القُلُوبِ“۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔ بدلتے والے کی۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لَا﴾ پہلی بات اور گفتگو کی نفی اور تردید کیلئے ہے۔ ﴿وَمُقَلَّبِ القلوب﴾ یہاں ”واو“ تسمیہ ہے اور مقلب اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مراد ہیں اور تقلیب قلوب سے مراد ہے دل کا ایک رائے سے دوسری رائے کی جانب پھرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قسم کھانے کا انداز و طریقہ بیان ہوا ہے کہ آپ پہلے جو گفتگو یا بات ہو رہی ہوتی تھی اگر درست نہ ہوتی تو پہلے لفظ ﴿لَا﴾ سے اس کی تردید اور نفی فرماتے پھر اللہ کے صفاتی نام سے قسم کھاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفاتی سے بھی قسم کھانی جائز ہے۔ خواہ اس صفت کا تعلق آپ کی ذات سے ہو جیسے علم اور قدرت خواہ صفت فعلی سے ہو جیسا کہ قر اور غلبہ وغیرہ۔

(۱۱۷۶) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَاءَ أَغْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا الْكَبَائِرُ؟ - فَذَكَرَ الْحَدِيثَ، وَفِيهِ - «الْيَمِينُ الْغَمُوسُ» - وَفِيهِ - قُلْتُ: وَمَا الْيَمِينُ الْغَمُوسُ؟ قَالَ: «الَّتِي يُقْتَطَعُ بِهَا مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور آپ سے پوچھا کہ کبیرہ گناہ کون سے ہیں؟ پھر اس نے ساری حدیث بیان کی۔ اس حدیث میں جھوٹی قسم کا ذکر بھی تھا۔ میں نے عرض کیا جھوٹی قسم کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا ”جھوٹی قسم یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اڑا لیا جائے حالانکہ وہ اس میں سراسر مَالِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿مَا الْكَبَائِرُ﴾ کبار کبیرہ کی جمع ہے۔ یعنی بڑے بڑے گناہ اور ذنوب۔ ﴿الْيَمِينُ الْغَمُوسُ﴾ جھوٹی قسم۔ ﴿غَمُوس﴾ کے غین پر فتح فاعل کے وزن پر اور غمس سے ماخوذ ہے۔ غمس کے معنی ہیں پانی میں غوطہ کھانا، ذوب جانا، اس کا نام غمس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا انسان گناہ میں غرق ہو کر انجام کار دوزخ کی آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔

(۱۱۷۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، فِي قَوْلِهِ تَعَالَى «لَا يُوَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ» حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ارشاد اللہ تعالیٰ کے ”اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری لغو قسموں کا مواخذہ نہیں کرتا“ کی تفسیر میں فرمایا، اس

قسموں اور نذروں کے مسائل 880

قَالَتْ: هُوَ قَوْلُ الرَّجُلِ: لَا، سے مراد انسان کا یہ کہنا ہے لا، واللہ (نہیں، بخدا) واللہ، وبلی، واللہ، أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، اور ولسی، واللہ ہاں اللہ کی قسم۔ (اس کی تخریج بخاری نے کی ہے اور ابو داؤد نے اسے مرفوعاً روایت کیا

ہے)

لغوی تشریح: ﴿اللغو﴾ ایسی بے فائدہ و بے ثمر بات جس کا کوئی اعتبار نہ ہو اور قسم میں لغویہ ہے کہ آدمی دلی ارادے کی پختگی کے بغیر ہی قسم کھائے بلکہ زبان پر یونہی جاری ہو جائے۔ جسے ہم تکیہ کلام کہتے ہیں کہ بات بات پر قسم کھا جانا۔

(۱۱۷۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ» مَثَّقَ عَلَيْهِ. وَسَاقَ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ الْأَسْمَاءَ، وَالتَّحْقِيقُ أَنَّ سَرَدَهَا إِذْرَاجٌ مِنْ بَعْضِ الرُّوَاةِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بے شک اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو (ننانویس) نام ہیں۔ جس نے ان کو ضبط رکھا وہ جنت میں داخل ہو گا۔“ (بخاری و مسلم) ترمذی اور ابن حبان نے وہ نام بھی بیان کئے ہیں اور تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ اصل حدیث میں اسماء کی تفصیل نہیں ہے بلکہ کسی راوی نے اپنی طرف سے ان کو درج کر دیا

ہے)

لغوی تشریح: ﴿من احصاها﴾ اور ایک روایت میں ﴿من حفظها﴾ ہے اور یہ حفظ دراصل احصی کی تفسیر ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان اسماء کو پوری طرح ذہن و حافظہ میں محفوظ کر لیا اور ان تمام اسماء سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی تو جو ثواب ان کے پڑھنے کے بدلہ میں دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا وہ اس آدمی کیلئے واجب ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے جس کسی نے اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کیا۔ اس باب میں اس حدیث کو لانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس کسی نے ان اسماء کے ساتھ قسم کھائی تو وہ قسم منعقد ہو جائے گی۔

(۱۱۷۹) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ ضَمِنَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ، فَقَالَ لِفَاعِلِهِ: جَزَاكَ اللَّهُ خَيْرًا، فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الشَّأْنِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی سے نیکی اور اچھا برتاؤ کیا جائے اور وہ اس کرنے والے سے کہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے تو اس نے اس کا پورا حق شکریہ ادا کر دیا۔“ (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

قسموں اور نذروں کے مسائل 881

لغوی تشریح: ﴿صنع﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿معروف﴾ احسان، عمدہ سلوک اور بھلائی و نیکی۔ ﴿ابلاغ فی النساء﴾ یعنی اس نے اس کی تعریف کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ سبیل السلام میں ہے کہ اس حدیث کا اس باب میں ذکر کرنا (یعنی باب الایمان والنذور میں) غیر متعلق اور غیر موافق ہے۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی اصل جگہ اور مقام باب الادب الجامع ہے۔

(۱۱۸۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ، كَمَا أَنَّ النَّذْرَ، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَا يَأْتِي بِخَيْرٍ، وَإِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا کہ ”نذر سے کوئی خیر و بھلائی حاصل نہیں ہوتی صرف بخلی و کنجوسی کا مال اس طریقہ سے نکال لیا جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نذر سے منع کرنا دراصل افضل کی طرف راہنمائی کرنا ہے اور صدقہ و خیرات وغیرہ کا مطلوب کے حصول سے متعلق کرنا کسی صاحب عظمت و مروت کے شان کے شایان نہیں ہے۔ یہ عمل تو ایسا بخل آدمی کرتا ہے جو کبھی خرچ نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو اس کے عوض افضل چیز کی خواہش کرتا ہے اور یہ ایسا شخص کرتا ہے جس کا دل صدقہ و خیرات کرنا نہیں چاہتا۔ الا یہ کہ جب اس کا ناطقہ بند اور حالات تنگ ہو جاتے ہیں تو حالات کی درنگی کیلئے صدقہ و خیرات کی نذر مانتا ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تب صدقہ کرتا ہے ورنہ خیرات نہیں کرتا۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اگر اللہ نے مجھے میرے مرض سے شفا بخش دی یا میرے مریض کو صحت و تندرستی سے نوازا دیا تو میں اتنا مال راہ خدا میں خرچ کروں گا۔ اتنا مال خرچ کرنا میرے ذمہ ضروری و لازمی ہے اور وہ مال تب خرچ نہیں کرتا جب اسے اس مرض سے صحت و تندرستی مل جاتی ہے۔ اگرچہ کرتے وقت بھی دل کی گھٹن موجود ہوتی ہے۔ لہذا نذر سے منع اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں ایسا کمینہ پن ہے جو کسی پر مخفی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نذر ماننے والا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اسے نذر ماننے کی صورت میں وہ چیز حاصل ہو جائے گی جسے اللہ تعالیٰ نے مقدر نہیں فرمایا لیکن اگر اس کا یہ اعتقاد نہ ہو تو نذر ماننے کی اجازت ہے۔

(۱۱۸۱) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كَفَّارَةُ النَّذْرِ كَفَّارَةُ يَمِينٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ فِيهِ: «إِذَا لَمْ يُسَمَّ». وَصَحَّحَهُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نذر کا کفارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہی ہے۔“ (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ ”جب اس کا نام نہ لے“ (اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

وَلَا بَيْنَ دَاوُدَ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ مَرْفُوعٍ رَوَاهُ عُبَّاسٌ مَرْفُوعاً: «مَنْ نَذَرَ نَذْرًا لَمْ

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں ہے کہ ”جس کسی نے کوئی نذر مانی اور اس کا

غلوٰی تشریح: ﴿حافہ﴾ یعنی ننگے پاؤں۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اس نے یہ بھی نذر میں کہا کہ وہ اوڑھنی نہیں لے گی۔ اوڑھنی سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے۔ ﴿بشقاء اختك﴾ شقاء کے شین پر فتنہ، تکان اور مشقت و تکلیف دے کر ﴿فلتختمر﴾ دوپٹہ اوڑھ لے۔ اس لئے کہ عورت کا سر بھی پردہ ہے اور اس کا کھولنا معصیت ہے اور معصیت کی نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ ﴿ولتصم ثلاثة ایام﴾ اور تین دن کے روزے رکھ لے۔ معصیت کی نذر میں کفارہ کے وجوب کے جملہ دلائل میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے اگر کسی نے بیت اللہ شریف کی طرف پیدل یا ننگے پاؤں چل کر جانے کی نذر مانی ہو تو ایسی نذر کا پورا کرنا ضروری اور لازمی نہیں۔ خواہ چل کر جانے سے عاجز بھی نہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔

(۱۱۸۳) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَسْتَفْتِي سَعْدُ
بُنْ عَبَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي نَذْرٍ كَانَ عَلَى
أُمِّهِ، تُوفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ، فَقَالَ:
«أَقْضِيهِ عَنْهَا». مَقْنَعٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت
سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس نذر
کے متعلق پوچھا جو اس کی والدہ پر تھی اور وہ اسے
پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی تھی۔ آپؐ نے
فرمایا ”تو اس کی طرف سے پوری کر دے۔“ (بخاری و
مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حقوق واجبہ مالیہ کو پورا کرنا میت کے وارثوں کے ذمہ واجب ہے اور اس کیلئے میت کی طرف سے اسے پورا کرنے کی وصیت ضروری نہیں، ورثاء کو از خود ہی اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ ورثاء میں اولاد بالخصوص اسے پورا کرنے کی زیادہ ذمہ دار ہے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ خزرج کے سردار تھے۔ تمام عزوات میں انصار کا علم ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ نخی سردار تھے۔ عربی لکھنا جانتے تھے۔ پیراکی اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ اسی لئے ان کو کامل (یعنی ہر فن مولا) کہتے تھے۔ کثرت سے صدقہ و خیرات کرنے والے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کئے بغیر مدینہ سے نکل گئے تھے۔ ان کو جن نے دمشق کے مضافات حوران میں ۱۲ھ یا ۱۵ھ یا ۱۶ھ میں قتل کر دیا گیا تھا۔

(۱۱۸۴) وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ
حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک آدمی نے بوانہ کے مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے متعلق پوچھا۔ تو آپؐ نے دریافت فرمایا ”کیا اس جگہ بت تھا کہ جسے پوجا جاتا رہا ہو؟“ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے پوچھا ”کیا وہاں ان کا کوئی میلہ تو نہیں لگتا تھا؟“ اس آدمی نے کہا نہیں۔ تو پھر آپؐ نے فرمایا ”اپنی نذر پوری کر۔ وہ نذر پوری نہیں کرنی چاہئے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو یا قطع رحمی ہو اور جس کا پورا کرنا اس آدم کے بیٹے کے بس میں نہ ہو۔“ (ابوداؤد طبرانی اور یہ الفاظ طبرانی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے اور مسند احمد میں کردم کی حدیث اس کی شاہد ہے)

الضَّحَّاكُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: نَذَرْتُ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بِبُؤَانَةَ، فَأَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «هَلْ كَانَ فِيهَا وَثْنٌ يُعْبَدُ؟» قَالَ: لَا. قَالَ: «فَهَلْ كَانَ فِيهَا عِيْدٌ مِّنْ أَغْيَادِهِمْ؟» فَقَالَ: لَا. فَقَالَ: «أَوْفَ بِنَذْرِكَ، فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرِ فِي مَعْصِيَةِ اللَّهِ، وَلَا فِي قَطِيعَةِ رَحِمٍ، وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتَّيْرَانِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَهُوَ صَحِيحٌ لِإِسْنَادِهِ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِّنْ حَدِيثِ كَرْدَمٍ عِنْدَ أَحْمَدَ.

لعنوا تشریح: ﴿ببوانہ﴾ پہلی ”با“ حرف جار ہے اور ببوانہ کی ”با“ پر ضمہ ہے اور فتح بھی کہا گیا ہے اور واؤ پر تخفیف۔ بوانہ شام اور دیار بکر کے درمیان واقع ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ کے زیریں اور یلم سے آگے جگہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیج کے آگے پھیلا ہوا پھاڑ یعنی میناء المدینہ ہے۔ یہ نذر ماننے والا شخص کرم تھا اس کے اولاد نرینہ نہ ہوئی تھی۔ اس نے نذر مانی کہ اگر اس کے ہاں اولاد نرینہ ہوئی تو وہ بوانہ کے سر پر کئی بکریاں ذبح کرے گا۔ یہ حدیث دلیل ہے مباح کاموں میں نذر جائز ہے۔ بتوں کی جگہ یا کفار کے میلے ٹھیلوں کے مقام پر نحر و ذبح کرنا جملہ معاصی میں سے ہے اگرچہ اللہ کی رضا کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو اس لئے کہ اس میں ان کے شرک کے مظاہر اور ان کے دین کے شعار کی ترویج پائی جاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿کردم﴾ کاف پر فتح اور راء ساکن۔ بن سفیان ثقفی۔ ان سے ان کی بیٹی میمونہ رضی اللہ عنہا اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۸۵) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَوْمَ الْفَتْحِ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنِّي نَذَرْتُ - إِنْ فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكَ مَكَّةَ - أَنْ أَصْلِيَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے فتح مکہ کے روز آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ہاتھوں مکہ فتح کر

885 قسموں اور نذروں کے مسائل

فِي بَيْتِ الْمَقْدِسِ . فَقَالَ : صَلِّ هَاهُنَا . فَسَأَلَهُ ، فَقَالَ : صَلِّ هَاهُنَا ، فَمَا هَذَا ؟ فَقَالَ : فَسَأَلَهُ إِذْنُ . رَوَاهُ أَحْمَدُ . وَأَبُو دَاوُدَ ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ .
 دیا تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا ”یہیں پڑھ لو۔“ اس نے پھر پوچھا تو آپ نے فرمایا ”یہیں پڑھ لو۔“ اس نے پھر سوال کیا تو آپ نے فرمایا ”تیری مرضی۔“ (مسند احمد، ابوداؤد اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿صل ہینا﴾ اس جگہ پڑھ لو سے مراد مسجد حرام ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس جگہ نذر پوری کرنے کی منت مانی ہو جب اس سے افضل جگہ پوری کر لی جائے تو نذر پوری ہو جائے گی بلکہ سیاق تو اسی کا مقتضی ہے کہ افضل مکان کو ترجیح حاصل ہے اگرچہ وہ جگہ نذر کی جگہ سے الگ ہو۔ ﴿شانک﴾ منصوب ہے معنی لازم پکڑے۔ ﴿اذا﴾ توین کے ساتھ معنی ہے کہ جب تو یہاں نماز پڑھنے سے انکاری ہے تو پھر جو تمہارا جی چاہے وہ کرو یا یہ معنی ہوگا کہ جو نذر تو نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی مانی ہے وہیں جا کر پڑھو۔

(۱۱۸۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ : مَسْجِدِ الْحَرَامِ ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصَى ، وَالْمَقْدِسِ الْحَبَشِيِّ» .
 حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا ”تین مساجد کے سوا اور کسی کیلئے زیارت کی غرض سے سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری مسجد۔“ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث باب الاعتکاف کے آخر میں پہلے گزر چکی ہے۔ اس جگہ اسے دوبارہ لانے کا غالباً مقصد یہ ہے کہ نذر کیلئے ان تین مقامات مقدسہ کے علاوہ اور کسی جگہ کو نذر پوری کرنے کیلئے متعین و مقرر نہ کیا جائے۔ (سبل السلام) یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ان تین مساجد میں سے کسی ایک جانب سفر کی نذر تو جائز ہے اور کسی جگہ کیلئے نہیں۔

(۱۱۸۷) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ ، قَالَ : قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ! إِنِّي نَذَرْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ أَنْ أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ . قَالَ : أَوْفِ بِنَذْرِكَ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ، وَرَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ : فَأَعْتَكِفْ لَيْلَةً .
 حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے جاہلیت کے زمانہ میں نذر مانی تھی کہ میں مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کروں گا۔ آپ نے فرمایا ”پھر اپنی نذر کو پورا کرو۔“ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے ایک

رات اعتکاف کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کافر نے حالت کفر میں جو نذر مانی تھی۔ اسلام لانے کے بعد اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ، امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اور شوافع کی ایک جماعت کی رائے یہی ہے مگر جمہور کے نزدیک کافر کی نذر منعقد ہی نہیں ہوتی تو پوری کرنے کا کیا سوال۔ بعض مالکیہ نے یہ تاویل کی ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور استحباب نذر پوری کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہو۔



۱۴۔ کِتَابُ الْقَضَاءِ

قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل

(۱۱۸۸) عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْقَضَاءُ ثَلَاثَةٌ، اثْنَانِ فِي النَّارِ، وَوَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ: رَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَى بِهِ فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ. وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَلَمْ يَقْضِ بِهِ، وَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ. وَرَجُلٌ لَمْ يَعْرِفِ الْحَقَّ، اس نے حق کو پہچانا نہ حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور دوسرا وہ جس نے حق کی پہچان کر لی مگر فیصلہ حق کے ساتھ نہ دیا بلکہ فیصلہ میں ظلم کیا وہ دوزخی ہے اور تیسرا وہ جس نے نہ حق کو پہچانا نہ حق کے ساتھ فیصلہ کیا بلکہ اس نے لوگوں میں جہالت و نادانی سے فیصلہ کیا وہ بھی دوزخی ہے۔“ (اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿جار فی الحکم﴾ فیصلہ میں جور و ظلم کیا ﴿علی جہل﴾ قضی کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی لوگوں کا فیصلہ جہالت و نادانی سے کیا۔ اس کا ظاہر تو یہی ہے کہ وہ دوزخی ہے۔ اگرچہ اس کا فیصلہ حق کے موافق ہو کیونکہ فقضی للناس علی جہل کے قول کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس نے حق کے مطابق فیصلہ کیا مگر وہ خود اپنے فیصلہ سے جاہل و نادان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عدالت میں فیصلہ کرنے والوں کی اقسام بیان ہوئی ہیں جنہیں قاضی یا جج کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دو قسم کے قاضی تو ایسے ہیں جو دوزخ کا بندھن بننے والے ہیں۔ ایک حق کو نہ جاننے اور پہچاننے والا اور دوسرا حق کو جان پہچان کر اس پر عمل پیرا نہ ہونے والا۔ اس میں اس کی بددیانتی کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ تفتیش و تحقیق میں سستی و لاپرواہی بھی ہو سکتی ہے اور دوزخ سے بچنے والا قاضی وہ ہے جو حق کو پہچان کر حق دار کو اس کا حق دیتا ہے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا

قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل 888

نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جاہل شخص کو عمدہ قضاء پر بٹھانا درست نہیں بلکہ غیر مجتہد کالج بنانا اور بنانا دونوں ناجائز ہے۔

(۱۱۸۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ وَلِيَ الْقَضَاءَ فَقَدْ ذُبِحَ» (سبحہ لو) کہ اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ «بَغَيْرِ سِكِّينَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ. (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور وَصَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ جِبَّانَ. ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من ولی القضاء﴾ تولیہ سے ماخوذ ہے۔ مجہول کا صیغہ ہے یعنی جسے قاضی بنایا گیا۔ ﴿بغیر سکیں﴾ ایک قول کے مطابق ذبح کا معنوی مفہوم مراد ہے اس لئے کہ اگر اس نے صحیح فیصلہ دیا تو اہل دنیا اس کے درپے آزار ہوں گے۔ اگر غلط فیصلہ دیا تو آخرت میں عذاب میں مبتلا ہوگا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اسے خبردار اور متنبہ کیا جائے کہ اس ہلاکت سے مراد اس کے دین کی بربادی و تباہی ہے، بدن کی نہیں یا یہ کہ چھری سے ذبح کرنے میں مذبح کیلئے راحت ہوتی ہے اور بغیر چھری کے گلہ گھونٹنے یا کسی اور طرح سے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ذکر سے ڈرانے اور خوف دلانے میں مبالغہ کا بیان ہے۔ مگر یاد رہے کہ گلہ گھونٹنے کو ذبح کرنا نہیں کہتے۔

(۱۱۹۰) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الْإِمَارَةِ، وَتَسْتَكُونُونَ نَدَامَةَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَيَنْعَمَتِ الْمُرْضَعَةُ، وَيَبْسُتِ الْفَاطِمَةُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

(بخاری)

لغوی تشریح: ﴿الامارة﴾ ممرہ کے نیچے کمرہ۔ معنی ولایت، حکومت، سربراہی۔ یہ ہر حکومت و ولایت کو شامل ہے۔ امانت عظمیٰ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی سربراہی و ولایت تک۔ ﴿فانعمت المرصعة﴾ اچھی دودھ پلانے والی دنیا میں اس لئے کہ یہ دودھ مال و دولت، جاہ و منصب اور عزت و کرامت کی صورت میں۔ حکم کے نافذ کرنے اور لوگوں کو دبا کر رکھنے کی صورت میں۔ حکومت و امارت کو مرضعہ سے تشبیہ اس لئے دی گئی ہے کہ یہ بھی اسی طرح منافع بخش اور سود مند رہتی ہے جس طرح دودھ پلانے والی بکھرت دودھ دیتی ہے۔ ﴿وبست الفاطمة﴾ فاطمہ فطم سے ماخوذ ہے اور فطم کہتے ہیں بچے کے دودھ چھڑانے کو اور اس سے مراد قیامت کے روز تاوان ہے جو امارت پر مرتب ہوگا۔ یعنی امارت امیر کو محروم کرتی ہے اور اسے خیرات اور منافع سے الگ رکھتی ہے اور اسے تباہی کے گڑھوں اور

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 889

تاوان کے گرداب میں پھنسا کر گرا دیتی ہے اور یہ عام امراء کے حالات کے نقطہ نظر سے ہے۔
حاصل کلام: اس حدیث میں امارت و سرداری سے بچنے اور اجتناب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے کہ حکومت و سربراہی دنیا میں ملامت اور حکومت سے فارغ ہوتے ہی ندامت و پشیمانی ہے اور آخرت میں باعث عذاب ہے۔ جس وقت حکومت کی کرسی پر براجمان ہوتا ہے تو عزت و توقیر ملتی ہے، دولت و ثروت ہاتھ آتی ہے، عوام ماتحت ہوتے ہیں، ان پر حکم چلتا ہے۔ ٹھانڈا ہاتھ جتے ہیں۔ ایسی صورت میں بڑی اچھی لگتی ہے۔ مگر جب بدعنوانیوں اور بداعتدالیوں کا احتساب اس دنیا ہی میں شروع ہوتا ہے تو پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور آخرت کے حساب و کتاب کی سختی تو ایسی ہوگی جس کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی خوف کے پیش نظر امت مسلمہ کے صلحاء اس سے کوسوں دور رہنے کی کوشش کرتے رہے حتیٰ کہ سزائیں بھگتیں مگر اس منصب پر بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حکومت اور سرداری کی ابتداء بڑی خوبصورت ہے مگر اس کا انجام خطرناک ہے۔ ابتداء میں انسان عیش و عشرت پاتا ہے جیسے عورت جب تک دودھ پلاتی ہے تو بچہ خوش رہتا ہے مگر جب دودھ چھڑاتی ہے تو بچے کو ناگوار گزرتا ہے۔

(۱۱۹۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، أَنَّهُ سَمِعَ رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: «إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أخطأَ تَوَاسَعَ دُغْنَا ثَوَابٍ مَّا هُوَ اور جب وہ فیصلہ کرنے میں جدوجہد تو اسے دو گنا ثواب ملتا ہے اور جب وہ فیصلہ کرنے میں جدوجہد تو پوری کرے مگر صحیح فیصلہ کرنے میں خطا کرے۔ فَلَهُ أَجْرٌ». مَنَقَّ عَلَيْهِ.

جائے تو اسے ایک اجر ملے گا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاجتهد﴾ خوب غور و خوض کر لے۔ ﴿فأصاب﴾ اور اس کی کوشش اور جدوجہد اللہ کے حکم و فیصلہ کے موافق ہو جائے۔ ﴿فله اجران﴾ تو اسے دو اجر ملیں گے ایک جدوجہد کا اور دوسرا صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ ﴿فله اجر﴾ اسے ایک اجر اس کی جدوجہد اور سعی و کوشش کا جو اس نے تلاش حق میں صرف کی کیونکہ اس کا اجتہاد عبادت ہے اور غلطی و خطا پر اجر نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے صرف اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس شخص کیلئے ہے جو اجتہاد کے تمام آلات و ذرائع کا جامع، اصول اجتہاد سے واقف اور قیاس کی تمام اقسام کا عالم ہو اور جو شخص اجتہاد کا اہل نہ ہو وہ تو جان بوجھ کر اس مسئلہ میں الجھتا ہے لہذا غلطی و خطا کی صورت میں اسے معذور قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ گناہ گار ہے جیسا کہ ابھی شروع کی حدیث کے تحت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ الخ۔ نیز علامہ خطابی نے کہا ہے کہ ان کا تعلق ان

(۱۱۹۲) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا يَحْكُمُ
أَحَدٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضَبَانُ». مُتَّفَقٌ
عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿وہو غضبان﴾ بغیر تین یہ غیر منصرف ہے۔ دو اسباب کی بنا پر ایک وصف اور دو سرا الف اور نون زائدہ۔ معنی ہے حالت غضب۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں وہ اجتہاد پر قدرت نہیں رکھتا اور دونوں کے مسئلہ میں غور و فکر صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ہر اس حالت میں جو فکر انسانی میں تشویش کا باعث ہو فیصلہ کرنا درست نہیں۔ مثلاً بھوک، پیاس، زیادہ شکم سیری، اونگھ اور نیند کا غلبہ وغیرہ۔ بظاہر تو یہ نہی تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے کراہت پر محمول کیا ہے مگر رائج قول پہلا ہی ہے کہ یہ حرام ہے۔

(۱۱۹۳) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلأَوَّلِ حَتَّى تَسْمَعَ كَلَامَ الْآخِرِ، فَسَوْفَ تَذَرِي كَنْفَ تَقْضِي». قَالَ عَلِيٌّ: فَمَا زِلْتُ قَاضِيًا بَعْدُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنُهُ وَقَوَاهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ الْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ

عباس۔

لغوی تشریح: ﴿تقاضی﴾ حاکم تسلیم کریں اور مقدمہ برائے فیصلہ پیش کریں۔ ﴿فلا نقض للاول﴾ مقدمہ لانے والوں میں سے پہلے یعنی مدعی کے حق میں فیصلہ نہ دے دو تا وقتیکہ دوسرے فریق مدعا علیہ کی بات سن لو۔ ﴿فسوف تدری کیف تقضی﴾ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے فیصلہ کیونکر کرنا ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ یہ زیادہ مناسب اور بہتر ہے کہ فیصلہ تیرے روبرو واضح ہو جائے گا۔ ﴿بعد﴾ یعنی بعد کے دال پر ضمہ ہے کیونکہ اس وقت کسی کی طرف مضاف نہیں ہو رہا ہے مگر نیت میں مضاف الیہ ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کا انہیں بلانے اور تعلیم دینے کے بعد۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قاضی کو فریقین کے دلائل سماعت کرنے کے بعد فیصلہ دینا چاہئے اگر وہ اس کے خلاف عمل کرے گا تو یہ حرام ہوگا۔ فریقین کی بات اور دلائل سماعت کر کے فیصلہ دینا واجب ہے محض ایک فریق کے دلائل سن کر فیصلہ کر دینا باطل ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر فریق ثانی خاموش رہے عدالت کے روبرو کچھ نہ کہے، نہ اقراری ہو نا انکاری یا فریق ثانی عدالت کی طلبی کے باوجود عدالت میں بیان دینے کیلئے حاضری نہ ہو یا لیت و لعل سے کام لے تو کیا ایسے فریق کے خلاف یک طرفہ ڈگری دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ قرین صواب بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پھر عدالت یک طرفہ فیصلہ دینے کی مجاز ہوگی۔ (سبل)

(۱۱۹۴) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ الْاَحْنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِي لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ، فَمَنْ قَطَعْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بے شک تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لے کر آتے ہو اور تم میں سے بعض اپنے دلائل بڑی خوبی و چرب زبانی سے بیان کرتا ہے تو میں نے جو کچھ سنا ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں۔ پس جسے اس کے بھائی کا حق میں سے کوئی چیز دوں تو میں اس کیلئے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تختصمون﴾ فیصلہ کیلئے اپنے مقدمات اور اپنے تنازعات میرے پاس لاتے ہو۔ ﴿الحن﴾ لحن سے اسم تفضیل ہے۔ باب سمع سے۔ معنی ہے سمجھ، زیادہ معرفت حاصل کرنا، زیادہ پہچانا۔ معلوم ہوا کہ جب وہ زیادہ فطین و سمجھدار ہوگا۔ وہ اپنی دلیل دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ مبلغ طریقہ سے پیش کر سکے گا۔ ﴿فمن قطع له﴾ جس کے حق میں فیصلہ کر کے دے دوں۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ ظاہر بیانات کی روشنی میں فیصلہ واجب ہے۔ حاکم کا فیصلہ حقیقت میں کسی چیز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا اور نفس الامر میں نہ حرام کو حلال کر سکتا ہے اور نہ حلال کو حرام۔ جمہور بھی اسی طرف گئے

قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل 892

ہیں۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قاضی کا فیصلہ ظاہری اور باطنی دونوں طرح نافذ ہو جاتا ہے مثلاً ایک جج جھوٹی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ دیتا ہے کہ فلاں عورت فلاں کی بیوی ہے باوجودیکہ وہ خاتون اجنبی ہے اس مرد کیلئے حلال ہو جائے گی حالانکہ اس کی قیاحت اور اس کا باطل ہونا کسی پر مخفی نہیں۔

(۱۱۹۵) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ جَابِرِ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «كَيْفَ تُقَدَّسُ أُمَّةٌ لَا هِيَ فِي طَاقَتِهَا أَنْ تَكُونَ كَمَا كَانَتْ» (اے ابن حبان نے روایت کیا ہے اور بزار کے ابْنِ جِبَانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ بُرَيْدَةَ عِنْدَ الشَّاهِدِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ عِنْدَ ابْنِ الزُّبَيْرِ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ سَعِيدٍ عِنْدَ ابْنِ شَاهِدِ ابْنِ مَاجَةَ میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے) مَاجَةَ.

لغوی تشریح: ﴿تقدس﴾ باب کرم سے فعل معلوم ہے یعنی گناہوں سے کیسے پاک ہوگی اور کیسے بابرکت ہوگی۔ ﴿من شدیدہم﴾ جب ظلم کیا جائے تو طاقتوروں سے ظلم کا بدلہ لیا جائے۔ سبل السلام میں ہے کہ اس سے مراد ہے کہ وہ امت جو قوی سے کمزور کو انصاف نہیں دلواسکتی اور اس کا جو حق بنتا ہے وہ لے کر نہیں دیتی تو وہ گناہوں سے کیسے پاک ہوگی۔ لہذا کمزور کی مدد کرنا واجب ہے یہاں تک کہ قوی سے کمزور کا حق لیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے طاقتور سے کمزور کا حق دلانا فرض ہے اگر کسی حکومت کے کارندے اور حاکم کمزور کو اس کا جائز حق دلوانے میں دیدہ دانستہ کوتاہی کے مرتکب ہوں اور قوم ان سے پوچھ نہ سکے اور ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کو جواب دہی پر مجبور نہ کر سکے تو پھر ساری قوم مجبور شمار ہوگی کیونکہ آج کے دور میں ان کا انتخاب اور چناؤ عوام ہی اپنے ووٹوں سے کرتے ہیں۔ کرسی عدالت اور کرسی اقتدار پر براہمن کرانے والے یہی عوام ہی ہیں۔ لہذا عوام کو اپنے بچاؤ کی خاطر حکمرانوں پر غلط اقدام کی برطا مخالفت کرنی چاہئے اور ان کو راہ راست پر لانے کیلئے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لانی چاہئے۔ گویا جو غریب و کمزور کا ہمدرد نہیں وہ آخرت میں جواب دہی کیلئے تیار رہے۔

(۱۱۹۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتِ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «يُذْعَمُ بِالْقَاضِيِ الْعَادِلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُلْقَى مِنْ شِدَّةِ الْحِسَابِ مَا يَتَمَنَّى أَنَّهُ لَمْ يَفْضَحْ» (اے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے) قیامت کے روز عادل قاضی کو حساب کیلئے طلب کیا جائے گا وہ اپنے حساب کی شدت کو محسوس کر کے آرزو کرے گا کہ کاش وہ دنیا میں دو شخصوں کے درمیان اپنی عمر میں

893 قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل

بَيْنَ اثْنَيْنِ فِي عُمُرِهِ. رَوَاهُ ابْنُ جِبَانَ، ایک فیصلہ بھی نہ کرتا۔“ (اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس کو نقل کیا ہے۔) اس میں اتنا اضافہ ہے کہ ”کبھی ایک کبھور کا بھی فیصلہ نہ کرتا۔“

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قاضی کا عدالت الٰہی میں بڑا سخت احتساب ہوگا۔ اس لئے جس کے ذمہ انصاف ہو اسے چاہئے کہ وہ انصاف کرے ورنہ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

(۱۱۹۷) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: کہ آپؐ نے فرمایا ”ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمَرَهُمْ أَمْرًا“. جو عورت کو اپنا حاکم و فرمانروا بنا لے۔“ (بخاری رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ۔

لغوی تشریح: ﴿ولوا﴾ تولیہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی اپنے امور مملکت کا اس کو والی بنالیں۔ یہ ہر امارت کیلئے عام ہے امارت عظمیٰ سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے منصب پر بولا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے یہ ارشاد اس موقع پر فرمایا تھا جب آپؐ کو خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حاکم و فرمانروا بنالیا ہے۔ بنت کسریٰ وہی بوران بنت پرویز تھی۔ اسے اہل فارس نے اس وقت اپنا حاکم بنایا جب نبی ﷺ کی حیات مقدسہ کے آخری ایام تھے۔ جب مملکت فارس کے تخت کی چولیس متزلزل ہو رہی تھیں گردش ایام اور حوادث زمانہ نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شیروہ قباز نے اپنے باپ کسریٰ پرویز کو قتل کر دیا اور ۷۷ھ میں تخت پر قابض ہوا اور ۹۷ھ میں وہ وفات پا گیا۔ عوام نے ارد شیر کو جو ہوز پچہ تھا فرمانروائے مملکت بنالیا اسے ایک سربر آوردہ قائد نے قتل کر دیا جس کا نام شمر براز تھا۔ پھر وہ خود تخت نشین ہوا مگر چالیس روز بعد اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بوران نامی شزادی کو ۹۷ھ یا ۱۰۷ھ کے اوائل میں سربراہ مملکت بنا لیا۔ حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کی سربراہی موجب بربادی ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ عمد رسالت کے بعد امہات المؤمنین میں سے بھی کسی کو یہ منصب نہیں سونپا گیا۔ جب عورت گھر کی سربراہ نہیں تو ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں کس طرح دی جاسکتی ہے۔

(۱۱۹۸) وَعَنْ أَبِي مَرْيَمَ الْأَزْدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلَّاهُ اللَّهُ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ، فَاجْتَنَبَ عَنْ حَاجَتِهِمْ وَفَقَّرَهُمُ اخْتَجَبَ اللَّهُ دُونَ حَاجَتِهِ». حضرت ابو مریم ازدی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کسی کام کا حاکم بنا دیا اور وہ پردہ میں رہا۔ ان کی ضروریات اور ان کی حاجات پوری کرنے میں، اللہ تعالیٰ بھی پردہ میں رہے گا اس کی

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 894

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ. حاجت سے۔“ (ابوداؤد اور ترمذی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سرکاری اہل کار کو عوام کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسے اس منصب پر اس لئے فائز نہیں کیا گیا کہ خود تو دربانوں کے پہرے میں بنگلے میں بیٹھی نیند سوئے اور غریب بے چارے مارے مارے پھریں۔ اس سے داد رسی کیلئے آئیں تو دربان اندر جانے ہی نہ دیں کہ صاحب اس وقت مصروف ہیں۔ جو حاکم ایسا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ روا رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی حاجت روائی و مشکل کشائی نہیں فرمائے گا۔

راوی حدیث: ﴿ابو مریم ازدی رضی اللہ عنہ﴾ ازدی، اسدی دونوں طرح مشہور ہیں، حضری بھی کہتے ہیں۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے تھے۔ ان کو یہ حدیث بیان کی۔ (۱۱۹۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الرَّاشِيَّ وَالْمُرْتَشِيَّ فِي الْحُكْمِ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلے میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ نسائی کے علاوہ ابن جبار، وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عِنْدَ الْأَزْبَعَةِ إِلَّا النَّسَائِيَّ. چاروں کے ہاں عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کی شاہد ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے تو گویا رشوت لینا اور دینا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے حقوق العباد پر کھلے بندوں دن رات ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ، ہمدرد اور غمگسار کیسے ہو سکتے ہیں؟

(۱۲۰۰) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّ الْخَضَمَيْنِ يَقْعَدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَاكِمِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ. حضرت عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ جھگڑا کرنے والے دونوں حاکم کے روبرو بیٹھیں۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ایک یہ کہ عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو یکساں سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ کسی سے امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حاکم کے سامنے بیٹھ کر بیان دیں، کھڑے ہو کر بیان نہ دیں۔

۱ - بَابُ الشَّهَادَاتِ۔ شہادتوں (گواہیوں) کا بیان

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 895

(۱۲۰۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ الْجُهَنِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ نَبِيَّ ﷺ نے فرمایا ”کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ النَّبِيُّ ﷺ قَالَ: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ بَهِرْتَرِينَ گواہ کون سے ہیں؟ وہ جو کہ بغیر گواہی طلب الشَّهَدَاءِ؟ هُوَ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ كَعَنْهُ اَزْخُوْدِي گواہی دے۔“ (مسلم) قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿باب الشهادات﴾ شہادت کی جمع ہے۔ کسی چیز کی صحت کی خبر و اطلاع دینا۔ اپنی آنکھوں دیکھے حال اور مشاہدے کی بناء پر۔ مؤلف اسے جمع اس لئے لائے ہیں کہ اس کی بہت سی انواع و اقسام ہیں۔ ﴿قبل ان يسالها﴾ فعل صيغہ مجہول۔ یعنی گواہی طلب کئے بغیر ہی گواہی از خود دے۔ بایں صورت کہ اس کے پاس کسی انسان کی شہادت کا حق تھا اور اس انسان کے علم میں بھی نہ ہو کہ وہ گواہ ہے۔ اس کے پاس آئے اور باخبر کرے کہ وہ اس کا گواہ ہے یا اس کے پاس طلاق یا عتق یا وقف یا وصیت یا ایسے ہی دوسرے معاملہ کی شہادت ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ قاضی کے پاس اسے لے جائے اور اعلان کرے تاکہ فی الحقیقت معاملات کی جو پوزیشن ہے وہ مکمل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اداء شہادت کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اسے چھپانا گناہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثَمُ قَلْبِهِ (۲: ۲۳۸) ”کہ گواہی کو مت چھپاؤ جو اسے چھپاتا ہے وہ گناہ گار ہے۔“ اور فرمایا: وَاَقِمُوا الشَّهَادَةَ (۲: ۶۵) ”اور شہادت کو پورا کرو۔“

(۱۲۰۲) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنْ خَيْرُكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ يَكُونُ قَوْمٌ يَشْهَدُونَ، وَلَا يُسْتَشْهَدُونَ، وَيَخُونُونَ وَلَا يُؤْتَمَنُونَ، وَيَنْذِرُونَ وَلَا يُؤْفُونَ، وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السَّمَنُ». مَثَّقَ عَلَيْهِ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میرا زمانہ تمہارے تمام زمانوں سے بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد والا۔ پھر اس کے بعد والا۔ اس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گواہی دیں گے اور ان سے گواہی طلب نہیں کی جائے گی۔ وہ خائن ہوں گے، امین نہیں ہوں گے۔ نذر مانیں گے مگر پورا نہیں کریں گے اور ان میں السمن ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قرنی﴾ قرنی سے مراد ایسے زمانے کے لوگ جنہوں نے مجھے پایا اور مجھ پر ایمان لائے اور وہ صحابہ کرامؓ ہیں۔ ﴿ثم الذين يلونهم﴾ یعنی پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کے قریب ہوں گے یا ایمان میں ان کی پیروی کریں گے یا ان کے زمانہ سے متصل ہوں گے بایں طور کہ انہوں نے ان کو پایا ہوگا اور ان سے استفادہ کیا ہوگا اور وہ تابعین کرامؓ ہیں۔ ﴿يشهدون ولا يستشهدون﴾ يشهدون

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 896

پہلا صیغہ معروف اور دوسرا مجہول ہے یعنی وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ قبل اس کے کہ ان سے شہادت طلب کی جائے، از خود شہادت دیں گے۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اس حدیث سے از خود شہادت دینے کی مذمت ہوتی ہے جبکہ پہلی حدیث میں اس کی مدح و تعریف کی گئی ہے۔ تعارض اس طرح دفع ہو جاتا ہے کہ مذمت مطلقاً از خود شہادت پیش کرنے کی نہیں بلکہ جلدی سے ایسی شہادت دینے کی وجہ سے ہے جس سے جھوٹ ثابت کر سکیں اور باطل طریقہ سے کھاپی سکیں اور لوگوں کے حقوق پر ڈال کہ ڈال کر ہضم کر سکیں۔ جو شخص سابق حدیث میں ذرا غور و تامل کرے گا وہ یہ کھلا ہوا فرق پا لے گا۔ ان دونوں احادیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ طلب سے پہلے از خود شہادت دینا بہتر اور عمدہ طریقہ ہے جبکہ یہ شہادت حقوق کے تحفظ کیلئے دی گئی ہو اور قبیح اس صورت میں ہے کہ حقوق کو ہڑپ کر جانے کی نیت ہو۔ «السمن» سین کے نیچے کسرہ اور میم پر فتح۔ لاغر پن کی ضد۔ یعنی موٹاپا۔ یعنی ان لوگوں کا مطمع نظر دنیا ہی ہو، دین نہ ہو۔ پھر یہ لوگ خوب کھائیں پیئیں کہ بدنوں پر چربی چڑھ جائے اور جسم موٹے اور بھاری بھرکم ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بہترین زمانہ کی پیش گوئی ہے۔ سب سے بہتر زمانہ آپ کا عہد مبارک ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ پھر تابعین کرام کا جس سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ یہ فضیلت جمہور علماء کے نقطہ نظر سے فرداً فرداً بھی ہو سکتی ہے اور بحیثیت مجموعی بھی۔ لیکن اصحاب بدر اور حدیبیہ ہر اعتبار سے افضل ہیں۔ اس حدیث میں لفظ قرن آیا ہے۔ قرن کہتے ہیں زمانہ کی ایک مدت اور عرصہ کو جس کی حد دس سال سے لے کر ایک سو بیس سال بتائی گئی ہے۔ مگر صحیح ترین بات یہ ہے کہ ایک زمانہ کے لوگوں کا مقصود و مطلوب امور میں شریک ہونا مراد ہے اور اس حدیث میں بھی غالباً اسی معنی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۲۰۳) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا ذِي غِمْرٍ عَلَى أَخِيهِ، وَلَا تَجُوزُ شَهَادَةُ الْقَانِعِ لِأَهْلِهِ الْبَيْتِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”خائن مرد و عورت کی گواہی جائز نہیں اور دشمن اور کینہ ور شخص کی اپنے بھائی کے خلاف بھی گواہی جائز نہیں اور جو شخص کسی دوسرے کے زیر کفالت ہو اس کی گواہی کفیل خاندان کے حق میں جائز نہیں ہے۔“ (مسند احمد و ابوداؤد)

لغوی تشریح: «ولا ذی غمر» غین کے نیچے کسرہ اور میم ساکن ہے۔ حقد و کینہ اور عداوت و دشمنی۔ «علیٰ اخیه» اپنے مسلمان بھائی کے خلاف۔ پس کسی دشمن کی شہادت اس کے دشمن کے خلاف جائز نہیں۔ «القانع» سے مراد گھر کا خادم اپنی ضروریات کی تکمیل اور اہل خانہ کی خدمت کیلئے کٹ کر رہ

قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل

۔۔۔

گیا ہو۔ جیسے خادم، تابع دار اور مزدور اس کی شہادت اہل خانہ کے حق میں قابل قبول نہیں، اس لئے کہ وہ شہادت دے کر اپنا فائدہ حاصل کرے گا اور یہ قسمت کا مقام ہے۔
حاصل کلام: اس حدیث سے خائن، دشمن اور کینہ ور کی شہادت ناجائز ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی کے زیر کفالت ہو اس کی گواہی بھی اس شخص اور اس کے اہل خانہ کے حق میں قبول نہیں تاکہ جانب داری کا شبہ نہ رہے۔

(۱۲۰۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ بَدْوِيٍّ كِيُغَاوِيٍّ شَرِيٍّ كِيُغَاوِيٍّ شَرِيٍّ كِيُغَاوِيٍّ شَرِيٍّ»
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَنَاكَ «صَحْرًا نَوْرًا بَدْوِيٍّ» (دیهاتی)
عَلَى صَاحِبِ قَرْيَةٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ (ابوداؤد وابن ماجہ)
مَاجَه.

لفوی تشریح: ﴿البدوی﴾ بادیہ نشین۔ دیہات کا باشندہ۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نمایہ میں کہا ہے کہ شری کے حق میں دیہاتی کی شہادت کو اس وجہ سے ناپسند اور مکروہ قرار دیا گیا ہے کہ اس میں دین کے بارے میں سختی اور احکام شرع سے ناواقفیت ہوتی ہے اور اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ وہ لوگ شہادت کو اچھی طرح ضبط نہیں رکھ سکتے۔ سبل السلام میں ہے کہ اکثریت نے ان کی شہادت کو قبول کیا ہے اور اس حدیث کو ایسے دیہاتیوں پر محمول کیا ہے جن کی عدالت ثابت نہ ہو۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ان کی عدالت معروف نہیں ہوتی۔

(۱۲۰۵) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: إِنَّ أُنَاسًا كَانُوا يُؤْخَذُونَ بِالْوَحْيِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمْ الْآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ غَمَالِكُمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.
حضرت عمر بن خطاب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ عہد نبویؐ میں لوگوں کا فَقَالَ: إِنَّ أُنَاسًا كَانُوا يُؤْخَذُونَ بِالْوَحْيِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمْ الْآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ غَمَالِكُمْ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.
مواخذہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اب وحی کا نزول بند ہو چکا ہے اب ہم تمہارا مواخذہ تمہارے اعمال کے مطابق کریں گے جیسے وہ ہمارے روبرو ظاہر ہوں گے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس اثر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی تھی اور آپؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا گویا نبوت کی تکمیل ہو گئی۔ اب نہ کوئی نیا نبی و رسول آئے گا اور نہ وحی آسمان سے نازل ہوگی۔ اب اگر کوئی اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے تو وہ سراسر دروغ گو، کذاب اور مفتزی اور دائرۃ اسلام سے خارج ہے۔ حضرت عمر رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں تو لوگوں کے بارے میں معلومات کا ذریعہ وحی الہی تھی مگر اب ایک شخص کے ظاہری حالات و اعمال کو دیکھ کر فیصلہ کریں گے اگر اس کے ظاہری اعمال و احوال شک و شبہ سے محفوظ ہیں تو وہ قابل

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہ بہت سے ہیں مثلاً اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، میدان کارزار سے بلاوجہ فرار، پاک دامن خاتون کی عصمت پر تہمت لگانا وغیرہ کے علاوہ جھوٹی گواہی دینا، کبیرہ گناہ وہ ہے جس کی شریعت نے سزا مقرر کی ہو یا عذاب آخرت کی وعید دی گئی ہو۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہی کا سلسلہ اگر بند ہو جائے تو انصاف نہایت ارزاں اور جلد مل جائے۔ عدالتی نظام کے فساد کی جڑ جھوٹی گواہی ہے مزید برآں رشوت۔ اس نظام کو ان دو بڑی خرابیوں سے پاک کر دیا جائے تو معاشرہ میں امن و سلامتی کی ہماریں آجائیں۔

(۱۲۰۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ
لِرَجُلٍ: «تَرَى الشَّمْسَ؟» قَالَ:
نَعَمْ. قَالَ: «عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ،
أَوْدَعُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ،
وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ.

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گواہی اس وقت دینی چاہئے جب اس کے روز روشن کی طرح ہونے کا یقین ہو ورنہ گواہی سے اجتناب بہتر ہے۔ محض گمان اور ظن کی بنیاد پر گواہی دینا درست نہیں۔

(۱۲۰۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَضَى بِمِثْلِهِ وَشَاهِدٌ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِينِيُّ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

نقلی تشریح: ﴿بیمین و شاهد﴾ یہ اس صورت میں ہے جبکہ مدعی کے پاس صرف ایک گواہ ہو تو مدعی سے دوسرے گواہ کی جگہ قسم کو قبول کر لیا جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اور جمہور امت اسی طرف گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ مالی معاملات میں ایک گواہ اور ایک قسم جائز ہے البتہ غیر مالی معاملات میں ان کے نزدیک دو گواہوں کا ہونا ناگزیر اور لازمی ہے۔ رہے

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تو ان کے نزدیک مالی معاملات ہوں یا غیر مالی معاملات دونوں میں دو گواہوں کا ہونا لازمی ہے (ضروری و لازمی ہے) اس باب کی تقریباً تیس کے قریب احادیث ان کے خلاف جمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جس ارشاد سے انہوں نے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے۔ **وَأَشْهَدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنْكُمْ** (۲: ۲۵) اور اللہ کا فرمان: **وَأَشْهَدُوا شَهِيدِينَ مِّنْ رِّجَالِكُم** البخ (۲: ۲۸۲) اس سے ان کا استدلال کامل نہیں بالخصوص جبکہ وہ مفہوم مخالف کے قائل نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین (ج ۱، ص: ۳۲-۳۸) میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

(۱۲۰۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلَهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔ (اس کی تخریج ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

دعویٰ اور دلائل کا بیان

۲ - بَابُ الدَّعْوَى وَالْبَيِّنَاتِ

(۱۲۱۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادْعَى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَأَمْوَالَهُمْ، وَلَكِنَّ الْيَمِينَ عَلَى الْمُدْعَى عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اگر لوگوں کو محض ان کے دعوے کرنے سے حق دے دیا جائے تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور ان کے اموال کا دعویٰ کریں گے لیکن مدعا علیہ کے ذمہ قسم لازم ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور بیہقی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ گواہ مدعی کے ذمہ اور قسم اس کے ذمہ جو اس کا انکار کرے۔

وَالْبَيِّنَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ: «الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدْعَى، وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ».

لغوی تشریح: ﴿باب الدعوى والبيّنات﴾ 'بیّنات - بیّنہ کی جمع ہے اس کی با پر فتح ہے اور یا مکسورہ پر تشدید ہے۔ اس کے معنی واضح دلیل و ثبوت کے ہیں۔ اس کو بیّنہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حق کو صاف اور واضح طور پر ظاہر کرتی ہے اور اس سے مراد وہ دلیل ہے جس سے مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث میں قضا کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ مدعی اپنا دعویٰ دلائل سے ثابت کرے اور گواہ پیش کرے یا مدعا علیہ، مدعی کے دعویٰ کی خود تصدیق کر دے کہ اس کا بیان درست ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو مدعا علیہ۔ دعویٰ کے خلاف اپنے دلائل عدالت کے روبرو پیش کرے اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر مدعا علیہ قسم دے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔

(۱۲۱۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَرَضَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم پر قسم پیش کی تو وہ قسم کھانے پر فوراً

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 900

عَلَى قَوْمِ الْيَمِينِ فَأَسْرَعُوا، فَأَمَرَ أَنْ تَيَّارَ هُوكَ تَوَّابُ نَظْمِ قَوْمِ الْيَمِينِ فِي الْيَمِينِ، أَيُّهُمْ قَرَعَ انْدَازِي كِي جَائے كِه كُون ان ميں سَ قِسم يَحْلِفُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

كھائے گا۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿فاسرعوا﴾ یعنی دونوں فریق ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر قسم اٹھانے کیلئے تیار ہو گئے۔ ﴿فامرهم ان يسهم﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی قرعہ اندازی کی جائے۔ پس قرعہ جس کے نام کا نکلا وہ حلف اٹھائے، قسم کھائے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے وہ اس حدیث کے معنی کی صحیح تفسیر ہے کہ دو آدمیوں نے کسی مال و متاع کے سلسلہ میں جھگڑا نبی ﷺ کی عدالت میں پیش کیا۔ دونوں میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہیں تھا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ ”قسم کے بارے میں تم دونوں قرعہ اندازی کرو کہ کون قسم اٹھائے۔“

حاصل کلام: جس مقدمہ کی نوعیت ایسی ہو کہ فریقین مدعی ہوں اور دونوں باہم مدعا علیہ بھی ہوں بالفرض دیگر حتمی اور یقینی طور پر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون تو ایسی صورت میں دونوں کو قسم دینے کا حق پہنچتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی قسم سے انکاری ہو تو فریق مخالف قسم دے کر مال اپنے قبضہ میں لے لے گا اور اگر دونوں فریق قسم اٹھانے پر آمادہ ہوں تو پھر ایسی صورت میں قرعہ اندازی کی جائے گی۔ قرعہ جس کے نام نکلے وہ قسم دے کر مال لے جانے کا مستحق قرار پائے گا۔

(۱۲۱۲) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْخَارِثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ افْتَنَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِبَيْمِنِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللَّهُ لَهُ النَّارَ، وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ». فَقَالَ لَهُ جَنْتَ حَرَامَ قَرَارِ دَعَايَ هِيَ. «أَيُّ كَسِي نَظْمِ قَوْمِ الْيَمِينِ فِي الْيَمِينِ، أَيُّهُمْ قَرَعَ انْدَازِي كِي جَائے كِه كُون ان ميں سَ قِسم يَحْلِفُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو امامہ خارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے اپنے مسلمان بھائی کا حق اپنی قسم کے ذریعہ مارا۔ اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے دوزخ واجب کر دی ہے اور اس پر جنت حرام قرار دے دی ہے۔“ ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! اگرچہ کوئی رسول اللہ؟ قَالَ: «وَإِنْ كَانَ قَضِيًّا حَقِيرًا وَمَعْمُولِي شَيْءٍ هُوَ؟» آپ نے فرمایا کہ ”اگرچہ درخت پیلو کی ایک شاخ ہو۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿القصيب﴾ شاخ، ٹنڈی، ﴿والادراك﴾ ممرہ پر فتح مشہور و معروف درخت ہے جس کے پتے اونٹ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اردو زبان میں اسے پیلو کا درخت کہتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو امامہ رضی اللہ عنہ﴾ یہ صاحب ابو امامہ بن ثعلبہ انصاری خارثی تھے۔ ان کے نام میں بہت اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا نام ایاس بن ثعلبہ تھا۔ یہ بنو حارث بن خزرج یا ایک قول کے مطابق بلوی تھے۔ انصار کے حلیف تھے اور قدامت صحابہ کرام میں سے تھے۔ اپنی والدہ کی تیمارداری کی وجہ سے غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔

(۱۲۱۳) وَعَنْ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ اشعث بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، يَقْطَعُ بِهَا مَالَ امْرَأَةٍ مُسْلِمَةٍ، هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ، لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضَبَانٌ». مَتَّقُوا عَلَيْهِ.

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص قسم کھا کر کسی دوسرے کا مال اڑالے اور وہ اس میں جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر سخت ناراض ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

راوی حدیث: ﴿اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ﴾ اشعث بن قیس بن معدیکرب، کندی ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ یوم یرموک میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ بڑے سختی، مہربان انسان تھے۔ قسم کھائی اور اس کا کفارہ پندرہ ہزار دیا۔ آزر بایجان کے والی بنے۔ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے چالیس روز بعد وفات پائی۔ اس وقت ۶۳ برس کے تھے۔

(۱۲۱۴) وَعَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِي دَابَّةٍ، وَلَيْسَ لِرَاحِدٍ مِّنْهُمَا بَيِّنَةٌ، فَقَضَىٰ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَيْنَهُمَا نِصْفَيْنِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَهَذَا لَفْظُهُ. وَقَالَ: إِسْنَادُهُ حَيْثُ.

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمیوں کا ایک جانور کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی تو آپ نے اس جانور کو ان دونوں کے درمیان آدھا آدھا دینے کا فیصلہ فرمایا۔ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے، یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ اس کی سند عمدہ اور اچھی ہے)

حاصل کلام: علامہ خطابی نے کہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اونٹ یا جانور کو دونوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تب ہی نبی ﷺ نے ان دونوں کو آدھے آدھے کا مستحق قرار دیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ یعنی ان دونوں کے علاوہ وہ کسی تیسرے آدمی کے قبضے میں ہوتا تو صرف دعوے سے وہ دونوں حقدار نہ بن سکتے تھے۔ ملا علی قاری نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ جانور کسی تیسرے آدمی کے پاس ہو جس کا ان دونوں کے ساتھ کوئی تنازعہ نہ ہو۔

(۱۲۱۵) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى مِثْرِي هَذَا بِبَيْعَةِ أَيْمَةٍ نَّبَوًا مَّقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے میرے اس منبر پر کھڑے ہو کر جھوٹی قسم کھائی تو اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لعوی تشریح: ﴿ایمۃ﴾ جھوٹی قسم جو موجب گناہ ہو۔ اس حدیث میں تنبیہ ہے کہ جو مقام جتنا مرتبہ

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 902

و فضیلت والا ہوگا وہاں ارتکاب گناہ کا عذاب بھی بہت زیادہ ہوگا۔ اسی طرح اوقات جن کی فضیلت بیان ہوئی ہے مثلاً عصر کے بعد اور جمعہ کے دن، رات میں جو گناہ کیا جائے گا اس کی سزا بھی زیادہ اور سخت ہوگی۔

(۱۲۱۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ عَلَى فَضْلٍ مَاءٍ بِالْفَلَاءِ يَمْنَعُهُ مِنْ ابْنِ السَّبِيلِ. وَرَجُلٌ بَايَعَ رَجُلًا بِسَلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ، فَحَلَفَ لَهُ بِاللَّهِ: لَأَخْذَهَا بِكَذَا وَكَذَا، فَصَدَّقَهُ، وَهُوَ عَلَى غَيْرِ ذَلِكَ. وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لَا يَبَايِعُهُ إِلَّا لِلدُّنْيَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفَى، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ يَفِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی جانب نظر (رحمت) کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا بلکہ ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا۔ پہلا وہ آدمی جو ایک مسافر کو جنگل میں بچے ہوئے پانی سے روکتا ہے اور دوسرا وہ آدمی جو عصر کے بعد کسی چیز کا دوسرے سے سودا کرتا ہے اور اللہ کی قسم کھاتا ہے کہ اس نے اس چیز کو اتنے اتنے میں خریدا ہے حالانکہ حقیقت ایسے نہ تھی اور وہ خریدار اس کو سچ مان گیا اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیاوی غرض کے لئے کسی بادشاہ کی بیعت کی اگر بادشاہ اس کو کچھ دیتا ہے تو وہ وفا کرتا ہے اور اگر وہ اس کو کچھ نہیں دیتا (یعنی دنیا کا مال) تو وہ وفا نہیں کرتا۔ (بخاری و مسلم)

لعفی تشریح: ﴿علی فضل ماء﴾ اپنی ضرورت و حاجت سے زائد پانی۔ ﴿بالفلاء﴾ ایسا وسیع صحراء کہ جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو اور پھر بھی وہ پانی کو روک لے اور کسی دوسرے کو نہ دے۔ ﴿بسلیعة﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن سلمان تجارت۔ ﴿فصدقه﴾ خریدار اس کی قسم کے پیش نظر اسے سچا سمجھے۔ ﴿وهو علی غیر ذلک﴾ سلمان فروخت کرتے وقت درحقیقت ایسا نہ ہو بلکہ جھوٹا ہو۔ ﴿وفی﴾ اپنا عہد وفا پورا کرے اور اپنی بیعت سچ و طاعت کو نبھائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے زائد از ضرورت پانی کو روک لینا اور ضرورت مندوں کو لینے نہ دینا۔ عصر کے بعد جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنا اور دنیوی غرض کیلئے حاکم وقت کی تائید کرنا۔ رب کائنات کی سخت ناراضی کا موجب ہے اور رحمت الہی سے محرومی کا باعث ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی حیثیت جس طرح کسی افضل مکان کی وجہ سے دوچند ہو جاتی ہے اسی طرح افضل وقت میں بھی اس کی

حیثیت برہ جاتی ہے۔

(۱۲۱۷) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِي نَاقَةٍ، فَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا: نُبْتَجَتْ عِنْدِي، وَأَقَامَا بَيْنَهُ، فَقَضَى بَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِمَنْ هِيَ فِي يَدِهِ. حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمی ایک اونٹنی کا مقدمہ عدالت نبویؐ میں لائے۔ ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ اونٹنی نے بچہ میرے ہاں جتا ہے اور دونوں نے اپنے اپنے گواہ بھی پیش کئے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا جس کے قبضہ میں اونٹنی تھی۔

لعوی تشریح: ﴿نبتج﴾ بچہ جتا۔ بناء للمفعول۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ موافق شہادت مدعی کیلئے وجہ ترجیح ہے اور یہ کہ دونوں کے دلائل میں تعارض ہو تو ایک کے حق میں فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ الا یہ کہ قابل ترجیح پہلو ہو اور قبضہ قابل ترجیح ہے۔

(۱۲۱۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ الْيَمِينَ عَلَى طَالِبِ الْحَقِّ. رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ، وَفِي إِسْنَادِهِمَا ضَعْفٌ. حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مدعی پر قسم ڈال دی۔ (ان دونوں احادیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور دونوں کی سند میں ضعف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدعا علیہ عدم ثبوت یا عدم شہادت کی صورت میں قسم اٹھانے سے بھی انکار کر دے تو ایسی صورت میں مدعی سے قسم کھانے کیلئے کہا جائے گا اگر وہ قسم کھالے گا تو متنازعہ فیہ چیز اسے دے دی جائے گی۔

(۱۲۱۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مَسْرُورًا، تَبَرَّقَ أَسَارِيرُ وَجْهِهِ، فَقَالَ: «أَلَمْ تَرَ أَنَّ مُجَزَّزًا الْمُدْلِحِيَّ نَظَرَ أَنْفًا إِلَى زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ وَأَسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، فَقَالَ: هَذِهِ الْأَقْدَامُ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ خوش و خرم میرے ہاں تشریف لائے۔ آپؐ کا رخ انور چمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”کیا تجھے معلوم نہیں کہ مجز زملی نے ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہم) کو دیکھ کر کہا ہے کہ یہ پاؤں ایک دوسرے کا جزء ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿تبرق﴾ ”را“ پر ضمہ باب نھر۔ چمک رہے تھے، روشن تھے۔ ﴿اساریر﴾ اسرار کی جمع ہے اور اسرۃ اور اسرار سر کی جمع ہے۔ سین کی زیر اور ضمہ دونوں جائز ہیں اور ”راء“ پر تشدید اور اسرۃ کی جمع سرسرد کے سین اور را دونوں پر فتح۔ اساریر جمع الجمع ہے۔ چہرے کے خطوط جو پیشانی پر جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی بکھر بھی جاتے ہیں۔ ﴿مجزز﴾ اسم فاعل کا صیغہ ہے باب تفعیل سے اور کبھی

قاضی (ج) وغیرہ بننے کے مسائل 904

اسے اسم مفعول بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ابن اعور بن جعدہ تھے۔ یہ علم قیافہ کے عالم تھے۔ ابن یونس نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جو فتح مصر میں حاضر تھے۔ ان کو مجزز اس لئے کہا جاتا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی قیدی قید ہو کر آتا تو اس کی پیشانی کے بال کاٹ دیتا تھا اور اسے آزاد کر دیتا۔ ﴿مدلجی﴾ بنو مدلج کی جانب نسبت کی وجہ سے مدلجی کہلائے۔ مدلج باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ نسب یہ ہے مدلج بن مرہ بن عبد مناف بن کنانہ۔ مشہور و معروف قبیلہ ہے۔ قیافہ کا علم اس قبیلہ میں اور بنو اسد میں پایا جاتا تھا اور عرب ان کو اس سے جانتے پہچانتے تھے۔ ﴿ہذہ الاقدام بعضہا من بعض﴾ ان دونوں کے مابین نسبی تعلق ہے اور یہ بات اس نے اس وقت کہی جب اس نے اسامہ اور زید کو اکٹھے لیٹے ہوئے دیکھا۔ دونوں کے چہرے اور سر چادر سے ڈھانپے ہوئے تھے اور قدم دراز تھے اور کھلے ہوئے تھے۔ آپ کی مسرت و انبساط اور خوشی کی وجہ یہ تھی کہ کچھ لوگ اسامہ رضی اللہ عنہ کے سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے ان کے نسب میں طعن کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا باپ زید سفید رنگ کا تھا۔ باوجودیکہ طعن کا کوئی بہت بڑا مقام نہیں تھا کیونکہ ان کی والدہ ام ایمن کالے رنگ کی حبشی خاتون تھیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا ثبوت نسب کے سلسلہ میں قیافہ شناسی سے کام لیا جاسکتا ہے اور فیصلہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے اور عدالت اسے تسلیم کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿مجزز مدلجی رضی اللہ عنہ﴾ بنو مدلج سے ہونے کی وجہ سے مدلجی کہلائے۔ دور جاہلیت میں ان کی قیافہ شناسی مسلمہ تھی۔ ان کو مجزز اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ قیدی بنائے اور ان کی پیشانی بال کاٹ دیئے گئے۔ مجزز محدث کے وزن پر ہے۔ مجزز بن اعور بن جعدہ کنانی مدلجی۔



۱۵۔ کِتَابُ الْعِتْقِ

آزادی کے مسائل

(۱۲۲۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيُّمَا أَمْرِيءٍ مُسْلِمٍ أَعْتَقَ أَمْرَأً مُسْلِمًا اسْتَنْقَذَ اللَّهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس مسلمان نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو اس کے ہر عضو کے بدلے جہنم کی آگ سے آزاد فرما دے گا۔“ (بخاری و مسلم) اور ترمذی میں ابوامامہ کی روایت ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے کہ ”جس مسلمان مرد نے دو مسلمان لونڈیوں کو آزاد کیا تو وہ دونوں اس مرد کے دوزخ سے آزاد ہونے کا سبب بن جائیں گے۔“ اور ابوداؤد میں کعب بن مرہ کی روایت میں ہے کہ ”جو مسلمان خاتون کسی مسلمان لونڈی کو آزاد کرے گی تو وہ اس کے جہنم سے آزاد ہونے کا موجب ہوگی۔“

لغوی تشریح: ﴿کتاب العتق﴾ عین کے کسرہ کے ساتھ اور ”تاء“ کے سکون کے ساتھ۔ آزادی دینا یعنی صرف اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کسی غلام کو آزاد کرنا۔ ﴿استنقذ﴾ جس نے بچلایا، نجات دی۔ ﴿کاننا فکاکہ﴾ ”قا“ پر لغوی طور پر فتح اور کسرہ دونوں ہیں یعنی دونوں لونڈیاں آزادی بخشے والے کی خلاصی و رہائی کا موجب بن جائیں گی۔ ﴿معنق﴾ کی ”تا“ کے نیچے کسرہ ہے۔ آزاد کرنے والا ﴿من النار﴾ یعنی ان دونوں کا آزاد کرنا نار جہنم سے اس کی خلاصی و رہائی کا سبب ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان غلام کو نعمت آزادی سے بہرہ ور کرنا بخشش و مغفرت اور جہنم سے آزادی کا موجب ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز میں اس کی بڑی ترغیب دی ہے۔ یہ انسانیت پر نبی ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے عہد غلامی کی زنجیروں سے انسانوں کو آزادی کی غیر مترقبہ نعمت سے نوازا ہے اور غلاموں کے حقوق سے خبردار کیا ہے ورنہ غلاموں کو تو جانوروں سے بھی بدتر حالات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ﴾ بعض مرہ بن کعب بھی کہتے ہیں۔ پہلے بصرہ آئے پھر اردن منتقل ہو گئے۔ اور وہیں ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو وفات پائی۔

(۱۲۲۱) وَعَنْ أَبِي دَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «إِيمَانٌ بِاللَّهِ، وَجِهَادٌ فِي سَبِيلِهِ». قُلْتُ: فَأَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «أَغْلَاهَا ثَمَنًا، وَأَنْفُسَهَا عِنْدَ أَهْلِهَا». مَنَّكَ عَلَيْهِ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ بہترین عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ”اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا۔“ میں نے عرض کیا کونسا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ فرمایا ”وہ غلام جو قیمت میں زیادہ گراں اور مالکوں کی نظروں میں زیادہ نفیس و محبوب ہو۔“ (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿ای الرقاب الفضل﴾ یعنی کسی غلام کا آزاد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے؟ ﴿انفسها افضل التفضل نفاست سے ہے۔﴾ یعنی مالکوں کی نظروں میں زیادہ نفیس اور زیادہ پسندیدہ اور زیادہ معزز۔

(۱۲۲۲) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ أَعْتَقَ شِرْكَاءَ لَهُ فِي عَبْدٍ، فَكَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ الْعَبْدِ، قَوْمٌ عَلَيْهِ قِيَمَةٌ عَدْلٍ، فَأَعْطَى شُرَكَاءَهُ حِصَصَهُمْ، وَعَتَقَ عَلَيْهِ الْعَبْدُ، وَإِلَّا فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ». مَنَّكَ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص مشترکہ غلام میں سے اپنا حصہ آزاد کر دے اور اس کے پاس مزید اتنا مال بھی ہو کہ غلام کو خرید کر آزاد کر سکے تو انصاف سے اس کی قیمت مقرر کر کے دوسرے شرکاء کو ان کے حصہ کی قیمت ادا کر دے تو یہ غلام اس کی طرف سے آزاد ہوگا۔ ورنہ جتنا کچھ آزاد ہوا سو ہو چکا۔“ (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «وَلَا قَوْمٌ عَلَيْهِ، وَاسْتُسِمِيَ حَبِيرٌ مَشْفُوقٌ عَلَيْهِ». وَقِيلَ: إِنَّ السَّعَابَةَ مُدْرَجَةٌ فِي

دونوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ”ورنہ اس کی قیمت لگائی جائے گی اور اس پر مشقت ڈالے بغیر اسے آزادی حاصل کرنے کا موقع دیا

الخَبَرِ۔ جائے گا۔“ (اگلی عبارت کا مفہوم لغوی تشریح میں دیکھیں)

لغوی تشریح: ﴿شُرکا﴾ شین کے نیچے کسرہ اور ”را“ ساکن۔ معنی اس کے حصہ اور نصیب کے ہیں۔ ﴿یبلغ ثمن العبد﴾ یعنی غلام کی باقی قیمت۔ ﴿قوم﴾ صیغہ مجہول۔ تقویم سے ماخوذ ہے۔ اس غلام کی عدل و انصاف سے قیمت طے کروائی جائے گی۔ ﴿فاعطی شُرکاءہ﴾ الخ یہ آزاد کرنے والا باقی شرکاء کو ان کے حصے کی قیمت ادا کرے گا اور یہ غلام پورے کا پورا اس کی جانب سے آزاد ہو جائے گا۔ یہ خبر ہے مگر امر کے معنی میں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس آدمی پر اس غلام کا آزاد کرنا لازمی اور ضروری ہے اس سے جائے پناہ کوئی نہیں۔ ﴿والا﴾ یعنی اگر آزاد کرنے والے کے پاس مال نہ ہو۔ ﴿فقد عتق الخ﴾ عتق کی تا پر فتح ہے مطلب یہ ہے کہ پھر جتنا اس نے اپنا حصہ آزاد کیا ہے وہ آزاد ہو جائے گا اور باقی اسی طرح غلام رہے گا۔ ﴿والا قوم علیہ واستسعی الخ﴾ قوم اور استسعی دونوں صیغہ مجہول ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آزاد کرنے والے کے پاس مزید اتنا مال نہیں ہے جو اس کی پوری قیمت کے برابر ہو تو پھر غلام کو کم کر لانے کی زحمت دی جائے گی اور اسے تکلیف دی جائے گی کہ وہ اتنا مال تلاش کرے جو دوسرے شریک کے حصہ کے برابر ہو جب غلام وہ حصہ مالک کے سپرد کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا۔ ﴿الاستسعاء﴾ سے یہاں یہی مراد ہے۔ (اسی مادہ سے السعایہ بھی آتا ہے کہ جس کا معنی ہے ”چغلی“ کہا جاتا ہے کہ: ”چغلی خبر میں لیٹی ہوئی ہوتی ہے۔“

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض نے تو پہلی حدیث کو لے لیا کہ غلام کا بقیہ حصہ غلام ہی رہے اور اس سے سعی کسب نہیں کرائی جائے گی اور کچھ نے کہا کہ نہیں اس میں کوئی حرج نہیں حالانکہ فقد عتق منہ ماعتق کا جملہ کسب کے منافی نہیں ہے۔ اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام شرکاء حصص میں سے صرف ایک کے حصہ کے آزاد کرنے سے فی الفور غلام پورا آزاد نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایسے مکاتب کی ہوگی جس نے اپنی کتابت کا کچھ حصہ تو ادا کر دیا ہے اور کچھ ابھی باقی ہے۔ یہی رائے امام بخاری رحمہ اللہ کی ہے۔ اس قول کے حق میں دلیل موجود ہے کہ وہ غلام باقی حصے میں غلام ہی رہے اور مستقبل میں ہمیشہ رہے گا اور یہ کہ جتنا حصہ غلامی سے آزاد ہو چکا ہے اس میں کسب سعی کی ضرورت نہیں۔ ﴿وقبل ان السعایہ مدرجۃ فی الخبر﴾ بل السلام میں ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ جملہ بھی مرفوع روایت ہوا ہے۔ مدرج فی الخبر اور کہا گیا ہے غلام کیلئے حدیث میں سعی و کسب کا ذکر مدرج ہے مگر بل السلام میں ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ جملہ بھی مرفوع روایت ہوا ہے۔ جب تک اس پر مضبوط دلیل قائم نہ ہو اسے مدرج نہیں کہا جاسکتا۔

(۱۲۲۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَجْزِي وَلَدٌ وَالِدَهُ إِلَّا أَنْ كُفِيَ بَابُ الْإِسْلَامِ»

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کوئی بیٹا باپ کیلئے کافی نہیں۔ الا یہ“

کہ باپ غلام ہو تو وہ اسے خرید کر آزاد کر دے۔“

يَجِدُهُ مَمْلُوكًا فَيَشْتَرِيهِ، ثُمَّ يُعْتِقَهُ. (مسلم)

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿لَا يَجْزِي﴾ ”یا“ پر فتح، معنی ہے کہ نہیں کافی ہوگا۔ ﴿فِيَعْتِقَهُ﴾ اس میں ”ف“ تعقیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض خریدنے سے آزاد نہیں ہوگا بلکہ خرید کر اسے پھر آزاد کرے۔ ظاہر یہ حضرات نے اس کا یہی معنی لیا ہے اور جمہور نے کہا ہے کہ وہ صرف خریدنے سے آزاد ہو جائے گا لیکن جب کہ خریدنا ہی اس کی آزادی کا سبب ہے تو مجازی طور پر اس کی طرف منسوب کر دیا ہے ان کی دلیل آنے والی حدیث ہے۔

(۱۲۲۴) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: «مَنْ فَرَمَا "بِوَشْخَصْ كَسِي قَرَابَتِ دَارِ كَالْمَلِكِ هُوَ جَائِزٌ تَوَهُ مَلِكٌ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ". رَوَاهُ غَلَامٌ آزَادٌ هُوَ.» (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا أَخْمَدُ وَالْأَزْهَرِيُّ، وَزَجَّحَ جَمْعُ مَنْ الْخَطَاطُ أَنَّهُ هُوَ أَوْ مَحْدِثِينَ كِي أَيْكِ جَمَاعَتِ نِي أَسِي مَوْقُوفٍ قَرَارِ دِيَا مُؤَفُوفٌ. ہے)

لغوی تشریح: ﴿ذَا رَحِمٍ﴾ ”رحم کے ”را“ پر فتح اور ”حا“ کے نیچے کسرہ۔ وہ جگہ جہاں بچہ ماں کے پیٹ میں پرورش پاتا ہے پھر اس کا استعمال قرابت کیلئے کیا جانے لگا۔ پس وہ تعلق جو تیرے اور اس کے درمیان حرمت نکاح کو واجب کرتا ہے۔ ﴿مَحْرَمٍ﴾ قیاس کے اعتبار سے اس پر نصب ہے لیکن دراصل جاری وجہ سے مجرور ہے اور ”محرم“ کے میم پر فتح اور ”حا“ ساکن اور ”را“ پر فتح اور محرم کو صیغہ مفعول بھی کہا گیا ہے اس صورت میں یہ تحریم سے ماخوذ ہوگا اور محرم کہتے ہیں جس کے ساتھ نکاح حرام ہو مثلاً باپ، بھائی، چچا اور اس ضمن میں دوسرے رشتہ دار۔ ﴿فَهُوَ حُرٌّ﴾ یہاں حر سے مراد ہے وہ قرابت دار خواہ مرد ہو یا عورت۔ اس کی ملکیت کے سبب وہ آزاد ہو جائے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث بقول محدثین موقوف ہے مگر اس باب میں اور احادیث بھی مروی ہیں جن میں سے ایک کو ابن قنّان اور ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی رو سے جن تعلق داروں کا بہم نکاح نہیں ہو سکتا ان میں غلامی اور آقا کی کا تعلق بھی ایسا ہے جس کی وجہ سے نکاح نہیں رہ سکتا۔ (السل)

(۱۲۲۵) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ. حَضَرْتُ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلًا أَدَّى فِي أَمْنِ مَوْتِ كِي وَقْتِ أَسْنِي چھ غلامِ أَغْتَنَى سِتَّةَ مَمَالِيكَ لَهُ، عِنْدَ مَوْتِهِ، آزَادِ كَرْدِيے۔ ان غلاموں کے علاوہ اس کی کوئی اور لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُمْ، فَدَعَا بِهِمْ جَانِيَادِ نِيْسِي تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو طلب رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَجَزَّاهُمْ أَثْلَانَا، ثُمَّ فَرَمَا یا اور ان کے تین حصے کئے پھر ان میں سے قرعہ

أَقْرَعَ بَيْنَهُمْ، فَأَعْتَقَ اثْنَيْنِ، وَأَرْقَىٰ أُنْدَازِي فَرْمَائِي. پھر آپؐ نے دو غلاموں (ایک تہائی) کو اَرْبَعَةً، وَقَالَ لَهُ قَوْلًا شَدِيدًا. رَوَاهُ: آزاد فرما دیا اور باقی چار کو غلام رہنے دیا اور آزاد کرنے والے کے حق میں سخت کلمہ بھی فرمایا۔ (مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿فجزاهم الاطلاق﴾ جزا کی ”زا“ پر تشدید۔ معنی ہے کہ ان کو تقسیم کیا تین حصوں میں۔ ہر ایک حصہ کو دو غلاموں سے منسلک کر دیا۔ ﴿ارق﴾ ”قاف“ پر تشدید ارقاق سے ماضی کا صیغہ ہے۔ باقی چاروں پر غلامی کا حکم بدستور باقی رکھا۔ ﴿وقال له قولاً شديداً﴾ آزاد کرنے والے کے فعل و عمل کو ناپسند کرنے اور مکروہ سمجھنے کی وجہ سے اسے سخت الفاظ سے یاد فرمایا اور ابوداؤد میں ہے کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر میں اس کی تدفین سے پہلے موجود ہوتا تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جاتا۔“ سبل السلام میں ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیماری کا صدقہ وصیت کا حکم رکھتا ہے اور وہ ترکہ کے تیسرے حصہ میں نافذ ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے کے وقت صدقہ کی حیثیت وصیت کی ہوتی ہے اور وہ شرعاً ترکہ کی ایک تہائی وصیت کرنے کا مجاز ہے اس سے زائد نہیں اور اگر مرنے والا مرض الموت میں اس کے خلاف صدقہ یا وصیت کر گیا تو اس کی اصلاح کی جائے گی اور وہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

(۱۲۲۶) وَعَنْ سَفِينَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتُ سَفِينَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ میں ام سلمہؓ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَمْلُوكًا لِأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، پر آزاد کرتی ہوں کہ تو رسول اللہ ﷺ کی تاحیات فَقَالَتْ: أَعْتَقْتُكَ، وَأَشْتَرِيكَ عَلَيْكَ أَنْ خُدْمَتِي بِجَالَتَا رِجْلَيْهِ (اسے احمد، ابوداؤد، نسائی اور حاکم تَحْدِثِمْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا عَشْتُ. رَوَاهُ: نے روایت کیا ہے)

أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتَّيَمِيُّ وَالْحَاكِمُ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزادی کا پروانہ مشروط طور پر بھی دینا جائز ہے اور غلام سے تاحیات کسی کی خدمت کی شرط لگانا بھی درست ہے۔

(۱۲۲۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَضْرَتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ تَعَالَى عَنْهَا، أَنْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”(ولاء) اسی کا حق ہے جو اسے آزاد قَالَ: «إِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ». مُتَّفَقٌ كَرِهَ۔“ (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

عَلَيْهِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ.

لعنوی تشریح: ﴿الولاء﴾ ولاء کے ”واؤ“ پر فتح اور آخر پر مد ہے یعنی عتق کی ولاء اور وہ یہ ہے کہ آزاد شدہ غلام جب فوت ہو جائے تو اس کے ترکہ کا حق آزاد کرنے والے کو پہنچتا ہے۔ یہ حدیث مفصل

طور پر کتاب البیوع میں اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

(۱۲۲۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْوَلَاءُ لِحِمَّةٍ كُلِّحِمَةٍ تَعْلُقُ بِهِ جَسَدٌ أَوْ نَسَبٌ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوهَبُ». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ وَالْحَاكِمُ، وَأَضْلَعَهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ. بِغَيْرِ هَذَا اللَّفْظِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ولاء بھی نسب کی طرح ایک جزو اللہ ﷻ: «الْوَلَاءُ لِحِمَّةٍ كُلِّحِمَةٍ تَعْلُقُ بِهِ جَسَدٌ أَوْ نَسَبٌ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوهَبُ»۔“ (اسے شافعی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور صحیحین میں اس کا اصل ہے جس کے الفاظ یہ نہیں)

لغوی تشریح: لحمۃ لام پر ضمہ اور فتح دونوں درست ہیں۔ کپڑے کے بانا کو کہتے ہیں اور سبل السلام میں ہے کہ اس کو تعلق نسب سے تشبیہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ میراث جس طرح نسب میں جاری ہوتی ہے اسی طرح ولاء میں بھی جاری ہوتی ہے جیسے کپڑے کے بننے کو تانے کے ساتھ ملا دیتے ہیں تو ایک ہی چیز بن جاتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزاد کرنے والے کو ولاء اسی طرح ملتی ہے جس طرح نسب کے قریبی کو میراث ملتی ہے۔ جس طرح باپ بیٹے اور بھائی بھائی کا ایسا تعلق ہے جو ناقابل فروخت ہے اور ہمہ بھی نہیں ہو سکتا اسی طرح ولاء نہ فروخت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہمہ۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ ولاء اس میراث کو کہتے ہیں جو شرعاً آزاد کرنے والے کو اپنے آزاد کردہ کی وجہ سے ملتا ہے۔

۱ - بَابُ الْمَذْبُورِ وَالْمُكَاتَبِ وَأَمَّا مَدِيرُ مَكَاتِبٍ أَوْ رَامَ وَلَدٍ كَابِيَانِ

الْوَلَدِ

(۱۲۲۹) عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ أَغْتَقَ غُلَامًا لَهُ عَنْ ذُبُرٍ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُ، فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «مَنْ يَشْتَرِيهِ مِنِّي؟» فَاشْتَرَاهُ نُعَيْمُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بِثَمَانِيَّةٍ دِرْهَمٍ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَاشْتَرَاهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے اپنا ایک غلام مرتے وقت آزاد کر دیا۔ اس کی ملکیت صرف یہی مال تھا۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا ”کون ہے جو اس غلام کو مجھ سے خریدتا ہے؟“ نعیم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے اسے آٹھ سو درہم میں خرید لیا۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں پس وہ محتاج ہوا۔

اور نسائی کی روایت میں ہے کہ اس پر قرض تھا پس آپؐ نے اسے آٹھ سو درہم کے عوض فروخت کیا اور اسے دے کر فرمایا ”اپنا قرض ادا کر۔“

فَأَعْطَاهُ، وَقَالَ: «أَقْضِ دَيْنَكَ».

911 آزادی کے مسائل

لغوی تشریح: ﴿باب المدبر﴾ تدبیر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور ”مدبر“ اس غلام کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک یوں کہدے کہ میری وفات کے بعد تو آزاد ہے۔ ﴿والمکاتب﴾ یہ اسم مفعول ہے مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا و مالک سے ایک مقرر مال پر معاہدہ کر لے کہ جب وہ طے شدہ رقم ادا کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا اس عقد کو مکاتب کہتے ہیں۔ ﴿ام الولد﴾ اس لونڈی کو کہتے ہیں جس کی اس کے مالک سے اولاد پیدا ہوئی ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث کتاب البیوع میں مختصر گزر چکی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کو مدبر کرنا درست ہے اور جمہور کہتے ہیں کہ اس کو تیسرے حصے میں سے تدبیر کیا جاسکتا ہے سارے راس المال سے نہیں۔ اس حدیث سے ”بولی“ دینا جائز ثابت ہوا۔ یعنی ایک چیز کو فروخت کرنے کیلئے کہنا کہ کون اس چیز کو خریدتا ہے؟ ایک نے کہا میں اسے اتنے میں خریدتا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں اتنے میں خریدتا ہوں۔ اس طرح گاہک قیمت بڑھاتے جاتے ہیں۔ مالک جب دیکھتا ہے کہ اب اس کی قیمت ٹھیک لگ گئی ہے تو وہ اسے فروخت کر دیتا ہے۔ آج کل منڈیوں میں عام طور پر سودا جات اسی طرح فروخت ہو رہے ہیں اور یہ طریقہ جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا لقب نعام تھا۔ نون پر فتح اور ”خا“ پر تشدید۔ قریش کے قبیلہ عدی سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ شروع میں اپنا ایمان مخفی رکھا۔ انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو بنو عدی نے کہا یہاں سے نہ جاؤ چاہے کسی بھی دین پر قائم رہو کیونکہ یہ یوگان و یتائی پر خرچ کرتے تھے پھر انہوں نے صلح حدیبیہ والے سال ہجرت فرمائی۔ عہد صدیقی یا فاروقی میں فتح شام کے موقع پر شہادت پائی۔

(۱۲۳۰) وَعَنْ عُمَرُو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمُكَاتَبُ عَبْدٌ، مَا بَقِيَ عَلَيْهِ مِنْ مُكَاتَبَتِهِ ذَرْهَمٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ. وَأَضْلَعَهُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَالثَّلَاثَةَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”مکاتب اس وقت تک غلام ہی ہے جب تک اس کی مکاتبت سے ایک درہم بھی باقی ہے۔“ (اسے ابو داؤد نے حسن سند سے نکالا ہے اور اس کی اصل احمد اور تینوں کے ہاں ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿المکاتب عبد﴾ جس پر غلام ملوک کے احکام جاری ہوں گے۔ حاصل کلام: اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ”مکاتب“ جب تک کتابت کی رقم ادا نہ کر سکے اس وقت تک وہ غلام ہی رہے گا۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔

(۱۲۳۱) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «جَبَّ تَمَّ مِّنْ كَسَى كَيْسٍ»

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کسی کے پاس

ﷺ: «إِذَا كَانَ لِإِحْدَاكُم مَّكَاتٌ، مَكَاتٌ هُوَ اس کے پاس اتنا مال ہو کہ ادا کر کے وَكَانَ عِنْدَهُ مَا يُؤَدِّي، فَلْتَحْتَجِبْ آزاد ہو سکتا ہے تو پھر (عورت کو) اس سے پردہ کرنا مِنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْأَزْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ. چاہئے۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مکاتب کے پاس زر کتابت ادا کرنے کیلئے رقم کا بندوبست ہو جائے تو مالک کو اس سے پردہ کرنا چاہئے۔ حالانکہ مالک غلام سے پردہ کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ امر استحباب اور تورع کیلئے ہے کیونکہ اوپر والی حدیث میں ہے کہ مکاتب جب تک پوری زر کتابت ادا نہ کر دے وہ اس وقت تک غلام ہی کے حکم میں رہتا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ پردہ ایک مسلمان خاتون کیلئے ضروری ہے جب مکاتب سے پردہ کا حکم ہے تو دوسروں سے کیوں نہیں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ عورت غلام کو دیکھ سکتی ہے۔

(۱۲۳۲) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نے فرمایا کہ ”مکاتب“ جتنا آزاد ہے اس قدر آزاد قَالَ: «يُودَى الْمَكَاتُ بِقَدْرِ مَا عَتَقَ کی دیت ادا کرے گا اور جتنا غلام ہے اس قدر غلام مِنْهُ دِيَّةُ الْحَرِّ، وَيَقْدَرُ مَارِقٌ مِنْهُ دِيَّةٌ کی۔“ (اسے احمد، نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے) الْعَبْدُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿يُودَى الْمَكَاتُ﴾ بودی فعل مضارع ”یا“ پر ضمہ اور واؤ ساکن دال پر فتح میخڑ، مجہول و دی بدی دیہ سے معنی ہے مکاتب کی دیت دے گا۔ ﴿بِقَدْرِ مَا عَتَقَ مِنْهُ﴾ وہ حصہ جس کے ادا کرنے کے بعد وہ آزاد ہوتا ہے۔ ”دیہ الحر دیہ منصوب ہے یعنی آزاد کی دیت۔ ﴿وَبِقَدْرِ مَارِقٍ مِنْهُ﴾ غلام کی دیت دی جائے گی جس قدر غلام رہ گیا ہے۔ مثلاً جب مکاتب کو قتل کر دیا گیا جب کہ اس نے آدھی زر کتابت ادا کر دی تھی تو اس صورت میں قاتل آدھی دیت آزاد کی اور آدھی غلام ہونے کی دے گا۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عام فقہاء کا قول یہ ہے کہ مکاتب جب تک پورا زر کتابت ادا نہ کر دے اس وقت تک وہ بار اس کے ذمہ ہے۔ جہاں تک ہمارا مبلغ علم ہے علماء میں سے سوائے ابراہیم نخعی کے اس حدیث پر کسی نے فتویٰ نہیں دیا البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک قول یہی ہے اور جب حدیث کی صحت ثابت ہو تو اس پر عمل واجب ہے بشرطیکہ وہ منسوخ نہ ہو اور نہ اس کے معارض کوئی دوسری حدیث ہو جو اس سے بہتر ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مکاتب کے قتل کئے جانے کی صورت میں دیت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ جب مکاتب قتل ہو جائے اور وہ اپنی نصف زر کتابت ادا کر چکا ہو تو اس صورت میں قاتل نہ آزاد کے سوا انٹ ادا کرے گا اور نہ غلام کے آدھے بلکہ جب وہ آدھی زر کتابت دے چکا ہے تو پھر قاتل پر ۵۷ اونٹ

واجب الادا ہوں گے۔

(۱۲۳۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ حَارِثٍ عَنْ امِّ الْمُؤْمِنِينَ حَضْرَةِ جُورِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَا تَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عِنْدَ مَوْتِهِ دِرْهَمًا، وَلَا دِينَارًا، وَلَا عَبْدًا، وَلَا أَمَةً، وَلَا شَيْئًا، إِلَّا بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ، وَوَأَرْضًا جَعَلَهَا صَدَقَةً. حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہما نے اپنی وفات کے وقت نہ کوئی درہم میراث میں پیچھے چھوڑا اور نہ دینار اور نہ کوئی غلام اور نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز۔ بس ایک سفید خچر، اپنا اسلحہ جنگ اور کچھ تھوڑی سی زمین جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔ (بخاری)

رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿ولامہ﴾ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آپ نے ام ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پیچھے چھوڑا تھا پھر لامہ کہنا کیسے درست ہوا جبکہ ان کی وفات تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی ہے۔ اس کا جواب اس حدیث کی روشنی میں یہ ہے کہ چونکہ وہ ام ولد تھیں، اس لئے وہ لونڈی نہ رہیں۔ اسی بنا پر مصنف رحمہ اللہ نے اس باب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے اور رہی وہ تھوڑی سی زمین جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپ کو اپنی زندگی میں تین زمینیں حاصل ہوئی تھیں۔ بنو نضیر کے کھجور کے باغ، خیبر کی زمین اور فدک کی زمین، بنو نضیر کی کھجوریں تو آپ کیلئے خصوصی طور پر تھیں۔ اکثر آپ نے ان میں سے ماجرین کو عطا فرمادی تھیں۔ اور تھوڑی سی ان میں سے بطور وقف برائے ضروریات ناگمانی روک لی تھیں اور یہ وہی صدقہ تھا جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ جیسا کہ ابوداؤد میں ہے۔ رہا خیبر کی زمین کا معاملہ تو اسے آپ نے تین ہزار چھ سو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا نصف ایک ہزار آٹھ سو اسے آپ نے غزوہ خیبر میں شریک مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں دوسرے کسی مسلمان کی طرح رسول اللہ ﷺ کا بھی حصہ تھا اور دوسرا نصف حصہ الگ رکھا وہ بھی ایک ہزار آٹھ سو تھا یہ حصہ آپ نے اپنی اور مسلمانوں کی ناگمانی ضروریات کیلئے وقف کر دیا۔ رہا فدک کا حصہ تو یہ آپ کیلئے مخصوص تھا اسے آپ نے مسافروں کیلئے وقف و مخصوص کر دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ کی دنیا سے بے رغبتی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ تریبہ کے لگ بھگ لونڈی غلام آپ کے قبضہ میں آئے۔ آپ نے ان سب کو آزاد کر دیا اور اپنے پیچھے کوئی میراث نہیں چھوڑی بلکہ آپ نے فرمایا کہ ”انبیاء کا گروہ درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑتے جو ترکہ چھوڑتے ہیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے۔“

راوی حدیث: ﴿عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ یہ صاحب ابن حارث بن ابی ضرار بن حبیب خزاعی مصلقی

914 آزادی کے مسائل

تھے۔ یعنی قبیلہ خزاعہ کی شاخ مصطلق سے تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۱۲۳۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «أَيُّمَا أُمَةٍ وَلَدَتْ مِنْ سَيِّدِهَا فَهِيَ حُرَّةٌ بَعْدَ مَوْتِهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ وَالتَّحَاكُمُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَرَجَّحَ جَمَاعَةٌ وَقَفَهُ عَلَى عَمْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث اور پہلی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ام ولد اپنے آقا کی وفات کے بعد از خود آزاد ہو جاتی ہے۔ یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں حسین بن عبد اللہ ہاشمی بہت ہی کمزور و ضعیف راوی ہے۔

(۱۲۳۵) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَعَانَ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، أَوْ غَارِمًا فِي عُسْرَتِهِ، أَوْ مُكَاتَبًا فِي رَقَبَتِهِ، أَظَلَّهُ اللَّهُ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ التَّحَاكُمُ.

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے مجاہد فی سبیل اللہ کی اعانت و مدد کی یا تنگی حالات میں کسی مقروض سے تعاون کیا یا کسی مکاتب کو اس کے زر کتابت کی ادائیگی میں ہاتھ بٹایا کہ وہ آزاد ہو جائے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ اس روز سایہ عطا فرمائے گا جس روز اس کے سایہ کے ماسوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الغارم﴾ جس پر قرض کا بار ہو یعنی مقروض۔ دراصل لغت میں غارم ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کا ضامن بنے۔ جس کا ضامن بنے وہ اپنے ذمہ کی رقم وغیرہ ادا نہ کر سکے اور ضامن کو وہ رقم ادا کرنی پڑے تو یہ ضامن بھی غلام کہلائے گا۔ تمی دست ہو تو ایسے مقروض کو بھی غلام کہتے ہیں پھر ہر ایک مقروض پر یہ لفظ بولا جائے گا۔

حاصل کلام: اسلام خیر خواہی، مواساة اور باہمی ہمدردی کا درس دیتا ہے۔ برے وقت اور خراب حالات میں ایک دوسرے سے تعاون کی تلقین و ترغیب دیتا ہے۔ اسی کی روشنی میں اس حدیث میں مقروض کو بار قرض سے سبکدوش کرانے اور مجاہد فی سبیل اللہ کی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب ہے کہ قیامت کے

915 آزادی کے مسائل

روز جب کوئی سایہ دار چیز نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ اسے سایہ نصیب کریں گے۔



۱۶۔ کِتَابُ الْجَامِعِ متفرق مضامین کی احادیث

۱۔ بابُ الْأَدَبِ۔ ادب کا بیان

(۱۲۳۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ، إِذَا لَقِيْتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ، وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانصَحْهُ، وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدِ اللَّهَ فَشَمِّنْهُ، وَإِذَا مَرَضَ فَعُدُّهُ، وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ جب ملاقات ہو تو“ تو اسے سلام کہہ اور جب دعوت پر مدعو کرے تو دعوت قبول کر اور جب نصیحت طلب کرے تو اسے نصیحت کر اور چھینک مار کر الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تو یرحمک اللہ کہہ اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کر اور جب وفات پا جائے تو اس کے جنازہ میں شرکت کر۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجامع﴾ اس میں مختلف موضوعات پر بحث کی گئی ہے مثلاً آداب، اخلاق، نیکی و خیر خواہی، زہد و تقویٰ اور اذکارِ منونہ کا وغیرہ۔ ﴿ست﴾ صرف چھ حقوق پر منحصر ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے کم و بیش بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿شمتہ﴾ امر ہے تشمیت سے اور وہ اس طرح کہ چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے تو جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ ﴿فعطس فحمد اللہ﴾ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ اگر چھینک مارنے والا الحمد للہ نہ کہے تو سامع پر اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔ ﴿فعده﴾ یہ عیادۃ سے امر ہے اور باب نصر سے ہے۔ ﴿فاتبعہ﴾ اس کی اتباع سے مراد ہے کہ اس کے جنازے کے پیچھے پیچھے چل۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق بیان ہوئے ہیں۔ مسلم کی ایک روایت میں پانچ کا ذکر بھی ہے، اس میں خیر خواہی کا ذکر نہیں اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب وہ تجھے کسی معاملہ پر قسم اٹھوائے تو حق ہونے کی صورت میں قسم دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان چھ حقوق کا ادا کرنا ہر مسلمان پر بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک مستحب ہے۔ مگر ظاہر حدیث کے الفاظ سے ان حقوق کی ادائیگی واجب ہی معلوم ہوتی ہے۔

(۱۲۳۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «انْظَرُوا إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظَرُوا إِلَى مَنْ هُوَ زِيَادَهِ مَنْسَبُ هُوَ (اس لیے) کہ تم اللہ کی کسی نعمت فوقکم، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدُرُوا کو حقیر نہ سمجھو گے۔» (بخاری و مسلم)

نِعْمَةُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ. مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ لَا تَنْظَرُوا إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْكُمْ ﴾ اپنے سے اوپر سے مراد مال و دولت میں، جاہ و حشمت میں اور دنیوی امور و معاملات میں بالا و برتر۔ ﴿ اجدر ﴾ زیادہ مناسب، زیادہ لائق اور زیادہ مستحق۔ ﴿ ان لا نزدرو ﴾ حقیر اور معیوب نہ سمجھو اور یہ اس لئے کہ انسان جب اپنے سے فروتر کی طرف دیکھتا ہے تو قناعت کرتا ہے، شکر ادا کرتا ہے اور جب اپنے سے بالاتر کی طرف دیکھتا ہے تو حرص و لالچ اور حسد کرتا ہے اور جس نعمت میں وہ اس وقت ہوتا ہے اسے حقیر تصور کرتا ہے۔

(۱۲۳۸) وَعَنْ النَّوَاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَزَلَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ بَنِي أَدِیْنِیْ وَنَکِیْ وَنَکِیْ اَوْرِگَنَہِ کَے مَظْلُوقِ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ الْبِرِّ سَوَالِ کِیَا تُوْ اَپْ نَے اَرْشَادِ فَرَمَیَا "نِکِی اِجْتِہِ اَخْلَاقِ کَا وَالْإِنْسَانِ، فَقَالَ: «الْبِرُّ حُسْنُ النَّامِ هُوَ اَوْرِگَنَہِ وَہِ هُوَ جَوْتِیرِے سِینِے مِیْنِ کُھلِے اَوْرِ تُو الْخُلُقِ، وَالْإِنْسَانُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ نَپِندِ سَچِھِے کَہ لُوگِ اِس پَر مَطْلَعِ هُوَ جَائِسِ۔" (مسلم)

أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ ﴾ تیرے سینے میں اضطراب پیدا کرے اور تو اسے انجام دینے میں تردد اور تذبذب میں مبتلا ہو کہ اس کے کرنے میں ملامت ہوگی یا اسے اس خوف اور ڈر کے پیش نظر چھوڑ دے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نیکی اور گناہ کی حقیقت کے بارے میں بیان ہوا کہ نیکی یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ان سے دوستی رکھے، ان پر مشقت نہ ڈالے، ان کے کام آئے، ان کے بوجھ اٹھائے، ان سے برا سلوک نہ کرے۔ ہاتھ، زبان سے ان کے ساتھ دست درازی نہ کرے۔ بلاوجہ آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ حتی الوسع درگزر اور عفو سے کام لے۔ مواخذہ اور گرفت کا رویہ اختیار نہ کرے وغیرہ اور گناہ یہ ہے کہ دل میں کھٹک اور شبہ رہے کہ نہ جانے یہ کام اللہ کی نظر میں کیسا ہے۔ دل میں تسلی و تشفی نہ ہو۔ اس دنیا میں نیکی اور گناہ کی کشمکش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ نیکی اور برائی کو پہچاننے کا یہ بہترین نسخہ ہے۔

متفرق مضامین کی احادیث 918

راوی حدیث: ﴿نَاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ﴾ نَاسِ مِیں وَاوْ پَر تَشْدِید اور سَمْعَانَ مِیں سِنِ پَر فَتْحَ یَا کَسْرَ۔
بن خالد کلابی عامری۔ بنو کلب سے تعلق تھا۔ شامی صحابہؓ مِیں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے
باپ نے نبیؐ کے پاس ان کو بلانے کے لئے ایک وفد بھیجا۔ نبیؐ کو جوتے ہدیئے مِیں بھیجے جنہیں آپؐ نے
قبول فرمایا۔

(۱۲۳۹) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاجَوْنَ تِيسَرَةَ كَوَالِكِ كَرِيسَ تَوَقْتِكِهِ وَهَ
اِثْنَانِ دُونَ الْآخَرِ، حَتَّى تَخْتَلِطُوا لَوْ كُنْتُمْ مِثْلَ جَلِّ نَهْجِ كَرِيسَ تَوَقْتِكِهِ وَهَ
بِالنَّاسِ، مِنْ أَجْلِ أَنْ ذَلِكَ شَيْءٌ غَمْلِكُنْ أَوْ رَجِيحُهُ خَاطِرُ كَرِيسَ تَوَقْتِكِهِ وَهَ» (بخاری و
يُحَرِّهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَالْفَلْظُ لِمُسْلِمٍ۔
مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿التناجی﴾ سرگوشی کو کہتے ہیں۔
حاصل کلام: اس حدیث میں ساتھی کو نظر انداز کر کے کانا پھوسی اور سرگوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔
جس سے انسانی جذبات و احساسات کا احترام ملحوظ رکھنے کا سبق ملتا ہے کہ ایسا کام انجام نہ دیا جائے جس
سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہو اور اسے خیال گزرے کہ یہ مجھے اپنا نہیں بلکہ غیر تصور کرتے ہیں یا اسے
کھٹکا اور اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں میرے خلاف ساز باز کر رہے ہیں اور مجھے دھوکہ دینے کی
کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے دوسرے کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچتی ہے اس لئے جماعتی زندگی
میں کانا پھوسی اور سرگوشی کرنا منع فرمایا گیا ہے۔

(۱۲۴۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ
مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ، وَلَكِنْ مَجْلِسٌ وَسِعَ اور كَشَادَ كَرِيسَ تَوَقْتِكِهِ وَهَ اور اس مِیں توسیع کر
تَفْسَحُوا وَتَوَسَّعُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔
لے۔» (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ولكن تفسحوا﴾ یعنی اہل مجلس سکر کر قریب قریب ہو جائیں۔ تفسحوا اور توسعوا
تقریباً ہم معنی ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مجلسی آداب کی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر مجلس میں جگہ کی کمی واقع ہو رہی
ہے اور لوگوں کی آمد بدستور جاری ہے تو پہلے نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ذرا سکر جائیں، ایک دوسرے
کے قریب ہو جائیں یا مجلس کو ذرا اور وسیع کر لیا جائے تاکہ آنے والے حضرات بھی بیٹھ سکیں۔ البتہ یہ
نہیں ہونا چاہئے کہ ایک آدمی کسی ضرورت کے پیش نظر اپنی نشست چھوڑ کر ذرا دیر کیلئے باہر جائے تو

متفرق مضامین کی احادیث 919

دوسرا اس کی جگہ پر قبضہ جمالے یہ حکم ہر جگہ کیلئے یکساں ہے خواہ یہ مسجد میں ہو یا مجلس احباب میں یا کہیں دوسرے مقام پر ہو۔

(۱۲۴۱) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا تَوَاطَا بَاطَهُ جَائِعًا يَأْكُلُ مِنْهُ» (بخاری و مسلم)

لفظی تشریح: ﴿بِاطَهُ﴾ باب سمع یسمع۔ خود اپنی زبان سے اپنا ہاتھ چاٹ کر صاف کرے۔ ﴿تَوَاطَا بَاطَهُ﴾ باب افعال سے اپنے علاوہ کسی دوسرے سے مثلاً غلام سے، خادم خانہ سے یا اپنے بیٹے وغیرہ سے۔ اس کی وجہ و علت یہ ہے کہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں کھانا نوش کرنے کے آداب میں سے ایک ادب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کو رومال وغیرہ سے صاف کرنے سے پہلے انگلیوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر یا دوسرے کسی سے چٹوا کر صاف کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ ہاتھ پر لگے ہوئے کھانے ہی میں برکت ہو۔ دوران کھانا ہاتھوں کو رومال وغیرہ سے صاف کرتے رہنا یا انگلیوں سے چاٹنے سے پہلے صاف کرنا بہر نوع خلاف سنت ہے۔

(۱۲۴۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَيْسَ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ، وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ، وَالْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ»۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ سوار

والراكب على الماشي۔ وفي رواية لمسلم: يديل كسلام کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں باہمی ایک دوسرے کو سلام کہنے کے بارے میں آداب کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا ”کم عمروا لا بڑی عمر والے کو پہلے سلام کرے۔“ اس سے بڑے کی عزت و توقیر مقصود ہے اور آنے والے کو حکم ہے کہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اس کی حکمت و علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنے والے سے ضرر و نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہے مگر جب وہ پہلے سلام کرے گا تو اس سے گویا خطرہ کا اندیشہ ختم ہو گیا اور فرمایا کہ سوار پیدل چلنے والوں کو سلام کریں کیونکہ سواری پر بیٹھا ہوا انسان ذرا بڑائی کے زعم اور تکبر میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے، اس کے ازالہ کیلئے حکم فرمایا کہ ”سوار پہلے سلام کرے اور اپنی تواضع اور محبت کا

متفرق مضامین کی احادیث 920

اظہار کرے۔“ اسی طرح کم تعداد‘ زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں اس میں کثرت کو قلت پر فوقیت اور افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ گویا اسلام نے حفظ مراتب کا اہل اسلام کو سبق دیا ہے جس پر ماشاء اللہ یہ امت عمل پیرا ہے۔

(۱۲۴۳) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يُجْزَى عَنْ الْجَمَاعَةِ - إِذَا مَرُّوا - أَنْ يُسَلِّمَ أَحَدُهُمْ، وَيُجْزَى عَنْ الْجَمَاعَةِ أَنْ يَرُدَّ أَحَدُهُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتَّيْهَقِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب ایک جماعت کسی کے پاس سے گزرے تو ان میں سے ایک آدمی کا سلام کہہ دینا کافی ہے اور جماعت میں سے ایک آدمی کا جواب دینا کافی ہے۔“ (مسند احمد، سنن بیہقی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کہنا اور اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے۔ جماعت میں سے ایک فرد اگر جواب دے گا تو تمام کی طرف سے ادائیگی ہو جائے گی۔

(۱۲۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَبْدَءُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلَامِ، وَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُمْ إِلَى أَضْبَاقِهِ» أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”یہود و نصاریٰ کو پہلے سلام مت کرو اور جب ان سے راستہ میں ملد بھیر ہو جائے تو انہیں تنگ راستہ کی طرف مجبور کر دو۔“ (مسلم)

(۱۲۴۵) وَعَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ: يَرْحَمُكَ اللَّهُ. فَإِذَا قَالَ لَهُ: يَرْحَمُكَ اللَّهُ، فَلْيَقُلْ لَهُ: يَهْدِيكُمُ اللَّهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا ”جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے الحمد للہ (سب تعریف اللہ کے لئے ہے) کہنا چاہئے اور اس کا بھائی اسے یرحمک اللہ (اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے۔ جب وہ یرحمک اللہ کہہ دے تو پھر چھینک مارنے والا جواباً کہے یرھدیکم اللہ و یصلح بالکم۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال درست فرمائے۔

(بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چھینک کا جواب دینا چاہئے بشرطیکہ چھینک مارنے والا پہلے الحمد للہ کہے اور یہ جواب تین بار تک چھینک آئے تو دینا چاہئے اس سے زیادہ ہو تو جواب نہیں دینا چاہئے

کیونکہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ ”تمن سے زیادہ چھینکیں زکام کی علامت ہیں۔“ (ابوداؤد) (۱۲۴۶) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَسْرَبَنَّ أَحَدُكُمْ قَانِمًا». ﷺ نے فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی کھڑے کھڑے آخرجہ مسلمہ۔“ (مسلم) پانی نہ پئے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں کھڑے کھڑے پانی پینے کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت کو جمہور علماء نے بھی تنزیہی پر محمول کیا ہے لیکن ابن حزم کا قول ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا حرام ہے اور بعض علماء اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے آب زم زم کھڑے ہو کر پینا ثابت ہے غالباً اسی بنا پر جمہور نے کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت کو بھی تحریمی پر محمول نہیں کیا۔

(۱۲۴۷) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِينِ، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشَّمَالِ، وَلْتَكُنِ الْيُمْنَى أَوْ لَهَا تَنْعَلُ، وَآخِرُهُمَا تُنْزَعُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب تم میں سے کوئی جوتا پہننے لگے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنے اور جب اتارے تو پہلے بائیں پاؤں سے اتارے اور چاہیے کہ دائیں پاؤں میں جوتا پہلے پہنے اور دونوں پاؤں میں سے آخر میں دائیں پاؤں سے جوتا اتارے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الانتعال﴾ جوتے پہننا۔ حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ہر باعث تکرم اور موجب عزت کام کا آغاز دائیں طرف سے ہونا چاہئے اور ہر کم اہمیت والا کام بائیں جانب سے شروع کیا جائے۔ مثلاً جوتا پہننا، کنگھی کرنا، وضو کرنا، قیض و شلوار یا پاجامہ وغیرہ پہننا دائیں طرف سے اور جوتا اتارنا، استنجا کرنا وغیرہ بائیں جانب سے۔ اسی طرح مسجد میں داخل ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بائیں پاؤں باہر نکالنا چاہئے۔

(۱۲۴۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَمْسَسُ أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ، وَلْيَنْعَلْهُمَا جَمِيعًا، أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی ایک جوتا پہن کر نہ چلے پھرے یا تو دونوں یکجا پہنے یا پھر دونوں اتار دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ليخلعهما﴾ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کا ضبط اس طرح کیا ہے کہ حرف مضارع یعنی یا پر ضمہ ہے اور اسے باب افعال سے مانا ہے اور تشنیه کی ضمیر دونوں پاؤں کی جانب راجع ہے اگرچہ ان دونوں کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس تکلف کی چنداں ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ باب فتح سے بھی جوتا پہننے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿اوليخلعهما﴾ دونوں پاؤں سے اتار لے یہ نووی رحمہ اللہ کی تفسیر کی رو سے

922 متفرق مضامین کی احادیث

ہے اور یہ معلوم ہے کہ ضمیر کا نعلین کی جانب مرجع زیادہ فصیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿اخلع نعلیک﴾ اپنے جوتے اتار دو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ایک جو تا پن کر نہ چلنا چاہئے۔ دونوں پہنے یا دونوں اتار دے۔ بعض علماء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ جوتے پہننے سے مقصود دونوں پاؤں کو تکلیف دہ چیزوں مثلاً کانٹا وغیرہ سے بچانا ہوتا ہے جب کہ ایک پاؤں ننگا ہوگا تو مقصد حاصل نہیں ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ شیطان کے چلنے کا طریقہ ہے۔ (سبل) سیدھی سی بات ہے کہ ایک پاؤں میں جوتا اور دوسرا ننگا لئے پھرنا شائستگی اور تہذیب کے بھی منافی ہے۔

(۱۲۴۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى مَنْ جَرَّ رَحْمَتَ سَ نَه دِكْیَے گا جو تکبر سے اپنا کپڑا پاؤں کے نیچے اور پیچھے گھسیٹتا پھرے۔» (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الخیلاء﴾ ”خا“ پر ضمہ اور کسرہ بھی اور ”یا“ پر فتح۔ اس کے معنی تکبر، عجب، تفاخر اور اترانا وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مردوں کیلئے ٹخنوں سے نیچے چادر وغیرہ کا لٹکانا حرام ہے۔ کیونکہ یہ متکبرین کی علامت ہے۔

(۱۲۵۰) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِبِمِینِهِ، وَإِذَا شَرَبَ فَلْيَشْرَبْ بِبِمِینِهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ، وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب بھی تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہئے اور جب کوئی مشروب نوش کرے تو اسے دائیں ہاتھ سے نوش کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہی سے پیتا ہے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کھانا پینا دائیں ہاتھ سے ہونا چاہئے۔ بلاوجہ اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا پینا حرام ہے اور شیطان سے مشابہت ہے۔

(۱۲۵۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلْ، وَاشْرَبْ، وَابْسُ، وَتَصَدَّقْ، فِي غَيْرِ

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کھا“ پی اور لباس پن اور صدقہ کر لیکن اسراف اور فخر کے بغیر۔“ (اس کو ابوداؤد اور

متفرق مضامین کی احادیث 924

کے علم کے اعتبار سے ہے جسے انسان کی عمر پر مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کی عمر سو برس کی ہوگی اگر وہ صلہ رحمی کرے گا اور اگر قطع رحمی کرے گا تو ساٹھ برس ہوگی۔ حالانکہ اللہ کے علم میں ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے گا یا قطع رحمی۔ جو علم الہی میں ہے اس میں کوئی رد و بدل اور تغیر نہیں ہوگا اور جو فرشتے کے علم میں ہے اس میں کی بیشی کا امکان ہے۔ پہلی تاویل رائج ہے۔

(۱۲۵۳) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ، حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ اللَّهُ ﷻ لَمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ» (بخاری و مسلم) «يَعْنِي قَاطِعَ رَحِمٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث میں قطع رحمی کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے کہ ایسا آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ قطع رحمی کبیرہ گناہ ہے اور جنت میں داخل نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس جرم کا مرتکب فی الفور جنت میں نہیں جائے گا بلکہ اپنے اس گناہ کی سزا کے بعد ہی جنت میں جائے گا۔

(۱۲۵۴) وَعَنْ الْمُغْبِرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الْأُمَّهَاتِ، وَوَادَّ الْبَنَاتِ: رَهْنًا وَدَرُورًا» (بخاری و مسلم) «وَمَنْعًا وَهَاتٍ، وَكَرِهَ لَكُمْ قَيْلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ». اور مال کو ضائع کرنا ناپسند کیا ہے۔

لغوی تشریح: «عقوق» عین پر ضمہ۔ «عق» سے ماخوذ ہے جس کے دراصل معنی قطع کرنے، پھاڑنے کے ہیں اور عق والدہ الخ۔ اس وقت بولتے ہیں جب بچہ اپنے والد کو اذیت و تکلیف دے اور اس کی نافرمانی اور اس کے خلاف خروج و بغاوت کرے۔ اس سے مراد ہے کہ اپنے قول و فعل سے اپنے والدین کو اذیت دے اور اس میں عرف کے مطابق نرمی نہ ہو۔ «واد» اس میں حمزہ ساکن ہے۔ بچی کو زندہ درگور کرنا۔ «منعاً وھات» منع کے معنی روکنا یعنی اموال اور حقوق میں سے واجبات بھی ادا کرنے سے باز رہنا اور ھات میں تا کے نیچے کسرہ ہے اور یہ امر مجذوم ہے اور اس سے مراد ہے ایسا مال طلب کرنا جس کے طلب کرنے کا اسے استحقاق نہ ہو۔ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مالدار آدمی کیلئے بخل اور سوال کرنا حرام قرار دیا ہے۔ «قیل وقال» بہت زیادہ باتیں کرنا، کثرت کلام اور لالچنی و بے معنی جھگڑا اور مجادلہ اور لوگوں کے معاملات و حالات، ان کے حکایات اور تصرفات کے بارے میں باتوں میں مشغول رہنا۔

(۱۲۵۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «رَضَا اللَّهُ فِي رَضَا رَضَامِنْدَى وَالدِّينِ كِي رَضَامِنْدَى مِيں هِي اور اللّٰهُ الْوَالِدَيْنِ، وَسَخَطَ اللَّهُ فِي سَخَطِ تَعَالَى كِي نَارَانْسْكَ وَالدِّينِ كِي نَارَانْسْكَ مِيں هِي۔» (اسے الْوَالِدَيْنِ) أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ تَرَمِذِي نِي نَكَلَا هِي اور ابن حبان اور حاكم نِي اسے صَحِّح جَبَّانَ وَالْحَاكِمُ۔
(قرار ديا هے)

حاصل كلام: اس حديث ميں والدین کو راضی رکھنے اور ان کی ناراضی سے بچنے کا حکم ہے لیکن اگر والدین ایسے کام کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو پھر ان کی اطاعت ناجائز ہے۔ ایسی صورت میں ان کی ناراضی کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

(۱۲۵۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَجَّهْ اس ذَاتِ اَقْدَسِ كِي قَسَمْ، جس كِي وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ أَوْ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ”مجھے اس ذات اقدس کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ہمسایہ یا اپنے بھائی کیلئے بھی وہی پسند نہ کرے۔ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے“ (بخاری و مسلم)

حاصل كلام: اس حديث ميں تحکيل ايمان کیلئے ایک شرط بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے لئے پسند اور محبوب رکھے اپنے ہمسائے یا اپنے بھائی کیلئے بھی وہی چیز محبوب رکھے۔ اگر اس کی خواہش ہے کہ اس کی عزت و توقیر کی جائے تو اس کی اپنے ہمسایہ اور بھائی کیلئے بھی یہی سوچ ہونی چاہئے اگر اس کے دل میں یہ تمنا ہو کہ وہ امن و امان اور سلامتی سے رہے۔ تو اپنے بھائی کے لئے بھی ایسی سوچ ہی ہونی چاہئے کہ وہ بھی امن و امان اور سلامتی سے رہے۔ جن افراد میں ایسی سوچ ہوگی وہ معاشرہ امن و سلامتی کا گوارہ ہوگا۔ ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔ معاشرے کا ہر فرد اپنی جگہ جب ایسے جذبات و احساسات رکھے گا تو لامحالہ معاشرہ میں سکون و اطمینان ہوگا۔ بے چینی اور اضطراب نہیں ہوگا۔ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوگا۔ اچھے معاشرے کا بھی یہی طرہ امتیاز ہے۔

(۱۲۵۷) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: «أَنْ تَجْعَلَ لِلَّهِ نِدَاءً، وَهُوَ خَلَقَكَ»، قُلْتُ: ثُمَّ أَيُّ، قَالَ: «ثُمَّ أَنْ تَقْتُلَ»
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا ”کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟“ آپ نے فرمایا ”یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنائے۔ حالانکہ وہ تیرا خالق ہے۔ میں نے عرض کیا پھر کونسا؟“ آپ نے فرمایا ”یہ کہ تو اپنی

متفرق مضامین کی احادیث 926

وَلَذَكَ خَشِيَةً أَنْ يَأْكُلَ مَعَكَ». قُلْتُ: اولاد کو اس ڈر سے قتل کرے کہ وہ تمہارے ساتھ
تُمْ أَيُّ؟ قَالَ: ثُمَّ أَنْ تُزَانِيَ بِحَلِيلَةٍ مل کر کھائیں گے۔ میں نے پھر عرض کیا کہ پھر کون
جَارِكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. سا؟ آپ نے فرمایا ”یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی اہلیہ
سے زنا کرے۔“ (بخاری و مسلم)

لعوی تشریح: ﴿ندا﴾ نون کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید۔ اس کے معنی ہیں شریک، سا جہی اور اصل
میں اس کے معنی ہیں نظیر، ثیل، پناہ کنندہ۔ ﴿حلیلہ جَارِكَ﴾ ہمسایہ کی اہلیہ، قتل اور زنا مطلقاً کبیرہ
گناہ ہیں لیکن قتل ولد اور ہمسایہ کی بیوی سے منہ کالا کرنا، عظیم ترین اور فحش ترین افعال ہیں کیونکہ
دوسروں کے مقابلہ میں ان دونوں کا حق زیادہ ہے کہ ان کے حقوق کا خیال و لحاظ رکھا جائے اور ان کو
تحفظ فراہم کیا جائے۔ جب باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگ جائے تو اس کھیت کا پھر اللہ ہی حافظ ہے۔

(۱۲۵۸) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی
بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کبیرہ گناہوں میں
سے اپنے والدین کو گالی دینا ہے۔“ کہا گیا کہ کیا کوئی
شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ نے
فرمایا ”ہاں! کہ وہ کسی آدمی کے باپ کو گالی گلوچ
کرتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی گلوچ کرتا ہے اور
وہ اس کی والدہ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی والدہ کو
گالی دیتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کام کیلئے سبب بننا گویا خود اس کام کو انجام دینا ہے۔
بالفاظ دیگر حرام چیز کے اسباب بھی حرام ہوتے ہیں۔ اگر اسباب کو عملی جامہ پہناتے وقت مسبب کی نیت نہ
بھی ہو پھر بھی ان کا ارتکاب جرم ہے۔ نیز اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی کام کا اگر نتیجہ حرام ہو تو وہ کام
بھی حرام ہے۔ اس لئے اگر اپنے والدین کو گالی سے بچنا ہے تو دوسرے کے والدین کو گالی نہ دو اور نہ ہی
ان کو برا بھلا کہو۔

(۱۲۵۹) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حضرت ابویوبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ. يَلْتَقِيَانِ يَلْتَقِيَانِ تعلق رکھے۔ جب دونوں کا آمناسامنا ہو تو یہ اپنا منہ
فِيَعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا، ادھر کر لے اور وہ ادھر کر لے۔ دونوں میں بہتر

متفرق مضامین کی احادیث 927

وَحَیْزُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ». مُتَّفَقٌ اِنْسَانُ وَهُ هُوَ جُو سَلَامٌ مِیْنِ پَهْلِ کَرِے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو مسلمان بھائیوں کی ناراضی ذاتی نوعیت کے معاملات کی وجہ سے ہو تو ایسی صورت میں تین روز سے زیادہ دن ناراض رہنا جائز نہیں ہے لیکن اگر ناراضی کی وجہ دینی معاملہ ہو تو اس کیلئے غالباً کوئی حد نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ سے تادم زیست قطع روابط کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ دینی ناراضی تو عین ایمان کی علامت ہے۔ علت ناراضی موجود ہے، اس وقت تک قطع تعلق درست ہے جب وہ سبب دور ہو جائے تو ناراضی کو بھی ختم کر دینا چاہئے کیونکہ مومن صادق کے ہاں باہم تعلقات کا سبب دین ہے، دنیا نہیں۔

(۱۲۶۰) وَعَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ». أَخْرَجَهُ

البُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿المعروف﴾ بھائی کا ہر کام۔ دوسری حدیث جو آگے بیان ہو رہی ہے اس کیلئے ایک نص ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ صرف مال خرچ کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ ترمذی اور ابن حبان میں ابوداؤد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تیرے اپنے بھائی کے روبرو مسکرانا بھی صدقہ ہے اور اس کی اچھے کام کی طرف رہنمائی کرنا اور غیر شرعی کام سے روکنا بھی صدقہ ہے اور گم کردہ راہ گیر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے یہاں تک کہ راستہ سے ہڈی اور کانٹے کا اس نیت سے دور کرنا کہ راہ چلتے مسافر کیلئے باعث اذیت و تکلیف ہو گا“ صدقہ ہے۔ اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں کچھ پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔“

(۱۲۶۱) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهِهِ بَاتِلًا، يَكُونُ لَكَ بِهِ نَفْعٌ». أَخْرَجَهُ

لغوی تشریح: ﴿بوجہ﴾ توہین کے ساتھ۔ ﴿طلق﴾ اس میں لام ساکن ہے۔ طلیق بروزن امیر آتا ہے اور طلیق کشف کی طرح طلق کہتے ہیں خندہ پیشانی کو یعنی اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت چہرہ مسکراتا، ہنستا، کھلتا ہو۔

(۱۲۶۲) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ انْہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

متفرق مضامین کی احادیث 928

اللہ ﷻ: «إِذَا طَبَخْتَ مَرْقَةً فَأَغْرِزْ» ”جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں ذرا پانی زیادہ ڈال لیا مَاءَهَا، وَتَعَاهَدْ جِيرَانَكَ“۔ أَخْرَجَهُمَا۔ کرو اور اپنے ہمسایہ کا بھی خیال رکھا کرو۔“ (ان مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿المرقہ﴾ مِمْ، را اور قاف پر فتح۔ وہ پانی جس میں گوشت کو جوش دے کر ابالا جاتا ہے اور وہ چکناٹ والا ہو جاتا ہے۔ ﴿تعاهد﴾ صیغہ امر کے ساتھ۔ خیال رکھو اور ﴿جیران﴾ جار کی جمع جس کے معنی ہمسایہ و پڑوسی کے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمسایہ سے حسن سلوک کا حکم ہے حتیٰ کہ فرمایا اگر گوشت پکانے کی نوبت آگئی ہے تو بجائے قورمہ اور بھنا ہوا پکانے کے اس میں ذرا پانی زیادہ ڈال کر شوربا تیار کر لیں اور اس میں سے ہمسایہ کے ہاں بھی بھیج دیں، ہمسایہ اگر غریب ہو تو آپؐ کا یہ ارشاد وجوب کیلئے ہوگا اور اگر امیر ہو تو پھر استہباب پر محمول ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جبریل علیہ السلام جب میرے پاس تشریف لاتے تو مجھے حق ہمسایہ کی پرزور تلقین کرتے رہتے حتیٰ کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں ہمسایہ کو وارث نہ بنا دیا جائے۔

(۱۲۶۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ نَفَسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرْبِ الدُّنْيَا نَفَسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرْبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ بَسَرَ عَلَى مُغْسِرٍ بَسَرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ“۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو کوئی دنیا کی مصیبتوں اور سختیوں میں سے کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز، قیامت کی سختیوں میں سے اس کی کوئی سختی دور فرما دے گا اور جو کوئی کسی تنگ دست کیلئے دنیا میں آسانی پیدا کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کیلئے آسانی پیدا فرمائے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے گا۔“

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نفس﴾ تنفیس سے ماخوذ ہے، کشادہ کرتا ہے، دور کرتا ہے اور تکلیف کے بندھن سے کھول کر آزاد کر دیتا ہے۔ ﴿کربہ﴾ کاف پر ضمہ اور ”را“ ساکن۔ اس کی جمع ﴿کرب﴾ کاف کے فتح سے آتی ہے یعنی مشقت، حزن اور پریشانی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیک عمل کی راہنمائی کرنے والے کو اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا جتنا اس نیکی پر عمل کرنے والے کو ملے گا۔ یہ راہنمائی براہ راست ہو یا بالواسطہ کہ دوسرے کسی عالم کی طرف رجوع کا اشارہ کیا جائے۔ دونوں کو شامل ہے۔

لغوی تشریح: ﴿من استعاذکم باللہ﴾ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اللہ کے نام سے پناہ طلب کرے کسی ایسے کام کے بارے میں جو اس پر واجب نہ ہو تو وہ پناہ دے دے اور جس کا اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسے انجام دے تو اسے چھوڑ دے۔ اسی طرح مصائب یا ناپسندیدہ کاموں میں اللہ کے نام سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دینا واجب ہے۔ ﴿فکافئوہ﴾ امر کا صیغہ ہے معنی ہے کہ اسے اس کے احسان سے اچھی جزا دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اللہ کے نام پر پناہ طلب کرنے والے کو پناہ دینے اور اللہ کا نام لے کر سوال کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ضرور دینے اور احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی تاکید ہے۔ اللہ کے نام سے سوال کرنے والے کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہئے۔ مگر دست سوال دراز کرنے والے کو کلام ہے کہ اللہ کا واسطہ دینے سے بچنا چاہئے۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ملعون ہے وہ جو اللہ کا نام لے کر سوال کرے اور وہ بھی ملعون ہے جس سے اللہ کے نام پر سوال کیا جائے اور وہ کچھ بھی نہ دے بشرطیکہ وہ سوال کسی بری چیز کا نہ ہو۔“ بہر حال اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سوال کرنا دوسرے کو بھی مشکل میں ڈال دیتا ہے اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

۳ - بَابُ الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ - دنیا سے بے رغبتی اور پرہیزگاری کا

بیان

(۱۲۶۶) وَعَنِ الثُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ - وَأَهْوَى الثُّعْمَانُ بِإِصْبِهِ إِلَى أُذُنَيْهِ - : «إِنَّ الْحَلَالَ بَيْنَ، وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيْنَ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنْ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدْ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِزِّهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ. كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوْشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ. أَلَا! وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا! وَإِنَّ حِمَى اللَّهِ مَحَارِمُهُ. أَلَا! وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضَغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ».

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور نعمان اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے کانوں کی طرف لے گئے ”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی ان دونوں کے درمیان شبہات ہیں۔ لوگوں کی اکثریت ان کو نہیں جانتی۔ پس جو کوئی شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت و آبرو کو بچالیا اور جو شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پھنس گیا۔ جیسے چرواہا کہ چراگاہ کے گرد مویشی چراتا ہو تو کبھی نہ کبھی مویشی چراگاہ میں چلے جاتے ہیں۔ خبردار! ہر بادشاہ کی چراگاہ ہوتی ہے۔ خبردار! حرام چیزیں اللہ کی چراگاہ ہے۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو! وہ ٹکڑا دل ہے۔“ (بخاری و مسلم)

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿باب الزهد﴾ زہد کے ”زاء“ پر ضمہ اور ہا ساکن۔ رغبت و دلچسپی کی ضد، کتاب و سنت کے تقاضا کے عین مطابق دنیوی رغبت و دلچسپی سے کنارہ کشی اور اسے ترک کرنا۔ ﴿والنوع﴾ واؤ اور راء دونوں پر فتح اور را کو ساکن پڑھنا ہی جائز ہے۔ اس کے معنی میں گناہوں سے دور رہنا معاصی اور شبہ میں ڈالنے والی چیزوں سے اجتناب کرنا۔ ﴿أهوى الثعمان بإصبعه﴾ دونوں انگلیوں کو لمبا کیا، دراز کیا اور اونچا اٹھایا۔ یعنی اشارہ کیا کہ ان کانوں نے ارشاد نبوی کو سنا ہے۔ ﴿الحلال بين﴾ بین میں ”با“ پر تشدید اور نیچے کسرہ ہے۔ مطلب ہے کہ حلال بالکل واضح و نمایاں ہے، دلیل کی بنا پر اس کی حلت میں کوئی شک نہیں یا اصل کی بنیاد کی وجہ سے اس سے جزئیات کا استخراج ممکن ہے۔ ﴿والحرام بين﴾ حرام بھی واضح ہے دلیل کی بنا پر اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں، جیسے مردار ہے، خون ہے یا ہر مسئلہ کی

نغوی تشریح: ﴿نعم﴾ سمع اور فتح کے باب سے ہے، ہلاک و برباد ہو گیا۔ ﴿القطیفة﴾ وہ کپڑا جس کے پھندنے ہوں اور ﴿عبد الدینار الخ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان اشیاء پر حریص اور ان کی وجہ سے فتنہ میں ایسا مبتلا ہو کہ انہی کی فریفتگی اور شیفگی میں گم ہو گیا ہو، اس کی زندگی کا مقصد جزا ان کو جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے اور پھندنے دار چادر زیب تن کر کے فخر کے ساتھ اکڑ کر چلنے کے سوا کچھ بھی نہ

متفرق مضامین کی احادیث

ہو۔ رہا وہ۔ شخص جو ان اشیاء کو بس حق کی حد تک حاصل کرے اور جہاں ان کا حق ہو وہیں ان کو رکھے اور خرچ کرے تو یہ اس ضمن میں نہیں آتا اگرچہ اس کے پاس کتنا ہی مال جمع ہو جائے۔ ﴿دسی﴾ دنیوی مال و متاع سے اللہ سے راضی ہو جاتا ہے۔

(۱۲۶۸) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِمَنْكِبِي، فَقَالَ: «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَضْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صَحَّتِكَ لِسَقَمِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے پکڑ کر فرمایا ”اے ابن اللہ ﷺ بِمَنْكِبِي، فَقَالَ: «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَضْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صَحَّتِكَ لِسَقَمِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

لغوی تشریح: ﴿بمنکبی﴾ مفرد اور تشبیہ دونوں طرح مروی ہے۔ میم پر فتح اور کاف کے نیچے کسرو، بازو اور کندھے کے ملنے کی جگہ۔ ﴿غریب﴾ جو اپنے وطن سے دور ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی شہر میں مقیم ہوتا ہے لیکن وہاں اس کی کوئی بہت زیادہ جان پہچان نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں سے وحشت زدگی محسوس کرتا ہے، حدیث میں دراصل یہی شخص مراد ہے۔ ﴿عابر سبیل﴾ ایسا آدمی جو ہمیشہ سفر پر رہے، راستے طے کرتا رہے۔ نہ اپنے شہر میں اور نہ کسی دوسرے میں ٹھہرتا ہی نہیں۔ ﴿خذ من صحتک الخ﴾ اپنی صحت کے وقت اپنی بیماری کیلئے کچھ سلمان کرے۔ اس ﴿السقم﴾ سین اور قاف پر فتح، جس کے معنی بیماری اور مرض کے ہیں اور سین پر ضمہ اور میم ساکن بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں بھی معنی بیماری اور مرض کے ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اپنی صحت کے ایام میں اطاعت و فرمانبرداری اور صدقہ و خیرات کے کام اتنے کر لے کہ جو تجھے ایام بیماری میں نفع دیں اور تاخیر کی وجہ سے عمل میں جو کمی و کوتاہی رہ گئی ہے اس کا سدباب ہو جائے اور اس کمی کو پورا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دنیا کی بے ثباتی اور اس کے فانی ہونے کا بیان ہے اور زندگی بسر کرنے کا ایک اصول بتایا گیا ہے کہ دنیا میں انسان کو کس خیال سے رہنا چاہیے۔ دنیا انسان کا گھر نہیں بلکہ مسافر خانہ ہے جیسے مسافر اپنی اصل منزل کی جانب رواں دواں ہے، راستے کی چیزوں سے قلبی تعلق وابستہ نہیں کرتا، اس کا مطیع نظر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ دنیا میں بھی ایک انسان کو بس اسی طرح رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں کب رخت سربانڈھنے کا حکم صادر ہو جائے۔

(۱۲۶۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِمَنْكِبِي، فَقَالَ: «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَضْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرَ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صَحَّتِكَ لِسَقَمِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے دوسری قوم سے اللہ ﷻ، «مَنْ تَشَبَهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»۔ أخرجه أبو داود، وصححه ابنُ جبان۔ ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث تنبیہ با کفار کی حرمت کی دلیل ہے اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کا فیشن اپنانے کو مکروہ قرار دیا ہے یہ ”تشبیہ“ کا باب بڑا وسیع ہے۔ اس میں عبادات، عادات، اطوار، خور و نوش، ملبوسات، زیب و زینت، آداب و رسومات، رجحانات اور میل جول سب شامل ہے اور حدیث میں ان تمام چیزوں کی ممانعت ہے اگر اس مقام پر تنگی دامن کا خوف نہ ہوتا تو ہم یہاں ان کی نصوص بالتفصیل بیان کرتے۔ علامہ ناصر الدین البانی نے اپنی ”حجۃ المرأة المسلمة“ کے صفحہ ۷۸، ۹۰ طبع ثانی میں اس موضوع پر نہایت عمدہ بحث کی ہے۔

(۱۲۷۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ دُنٍ فِي نَبِيِّ ﷺ كَيْفَ كُنْتُ (کھڑا) تھا۔ آپ نے فرمایا النَّبِيِّ ﷺ يَوْمًا فَقَالَ: «يَا غُلَامُ! اے لڑکے! تو اللہ (کے احکام) کی حفاظت کر اللہ اخْفِظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ، اخْفِظِ اللَّهَ تَعَالَى تِيرِي تَكْسِبَانِي کرے گا۔ تو اللہ کی طرف دھیان تَحِذُهُ تُبَاهِكَ، وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ رَحْمَةً رَكَّ، رَكَّ، تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کچھ اللہ، وَإِذَا اسْتَعْنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللَّهِ»۔ (صرف) اللہ تعالیٰ سے مانگ اور جب تو مدد رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ صَحِيحٌ۔ طلب کرے تو (بس) اللہ سے مدد مانگ۔“ (ترمذی نے

اسے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿احفظ الله﴾ یہ امر کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ اللہ کو یاد کر اور اس کے اوامر پر عمل پیرا رہ کر ان کو یاد رکھ اور اس کے نواہی سے اجتناب کر کے اسے یاد رکھ اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز اور تعدی نہ کر کے اس کو یاد رکھ۔ ﴿تجاسك﴾ اپنے روبرو اور سامنے پائے گا اور وہ دونوں جہانوں میں شر سے محفوظ رکھے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خالص توحید کی بہترین انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے مقرر کردہ حدود اور اس کے اوامر و نواہی کا ہر وقت پوری طرح خیال رکھے۔ خود بھی ان سے بچنے کی کوشش کرتا رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے اور اللہ کی حفاظت کا مطلب ہے کہ وہ ایسے بندے کو دنیوی مصائب و آلام سے بچائے گا۔ ان سے بچنے کا راستہ سمجھائے گا۔ قیامت کے روز جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ منہ امام احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا ”ساری دنیا والے مل کر بھی تیرا کچھ بگاڑنا چاہیں، نقصان پہنچانا چاہیں تو نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ نقصان

متفرق مضامین کی احادیث 935

عمل کے مشابہ ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ اخذ نہیں کیا تو اس کا کفار کے ساتھ تشبہ ہونا محل نظر ہے۔ لیکن اس سے بھی منع ہی کیا جاتا ہے تاکہ یہ ان کے ساتھ تشبیہ کا ذریعہ نہ بن جائے اور اس لئے بھی کہ اس میں کفار کی مخالفت ہے جیسا کہ داڑھی کو رنگنے اور مونچھوں کو صاف کرنے کا حکم ہے حالانکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ بڑھاپے کا رنگ تبدیل کرو اور یہود سے مشابہت اختیار نہ کرو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بالوں کو نہ رنگنے میں ان کے ساتھ تشابہ ہمارے ارادہ اور عمل کے بغیر بھی ہو جاتا ہے اور یہ اتفاقی طور پر ان سے عملی موافقت کی بڑی واضح مثال ہے۔ پھر علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس فحی کی انتہائی غایت اپنی قلبی بصیرت کی روشنی میں ذکر کی ہے کہ یہاں ظاہر اور باطن میں مضبوط ربط و تعلق ہے اور تشبہ با کفار ان کے ساتھ دوستی اور باہمی مودت کا سبب بنتا ہے حالانکہ تعلق ممنوع ہے اور دین میں مداخلت اختیار کرنے کا موجب ہے اور اس سے ان کے اخلاق اور خبیث عادات اپنے تمام تر نقصانات کے ساتھ ساتھ جو اللہ کے غضب کا بھی موجب ہیں مسلمانوں کی صفوں میں سرایت کر جاتی ہیں اور یہ اس دور کی چشم دید حقیقت ہے جسے ہم دونوں آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور دونوں کانوں سے سنتے ہیں۔

(۱۲۷۲) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي حَضْرَتِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ تَعَالَى إِيَّاهُ بِنْدَةَ كُودُوسُ وَ مَحْبُوبُ رَكَّهَاتِهِ جُودُ اللَّهِ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ» (مسلم) أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿التقی﴾ جو امور واجب ہیں اور حلال ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور جو حرام ہیں ان سے اجتناب کرے۔ ﴿الغنی﴾ اس سے مراد دل کا غنی ہونا ہے یعنی لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس میں اسے کوئی طمع و دلچسپی نہ ہو اگرچہ اس کا اپنا ذاتی مال کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ ﴿الخفی﴾ وہ شخص جس کی عبادت کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔ پردہ اخفاء میں رہے اور اس کی پرہیزگاری کا ریا و شہرت کے ظن و گمان سے دور رہنے کی وجہ سے بھی کسی کو علم نہ ہو۔

(۱۲۷۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ تَعَالَى إِيَّاهُ بِنْدَةَ كُودُوسُ وَ مَحْبُوبُ رَكَّهَاتِهِ جُودُ اللَّهِ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ» (مسلم) أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿مالا یغنیہ﴾ جو اہم اور مفید نہیں۔ حاصل کلام: اس حدیث کو نبی ﷺ کے ارشادات میں جو امع الکلم کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا میں انسان

936 متفرق مضامین کی احادیث

کا مقصد حیات اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ ایک مومن صادق کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بے مقصد اور بے فائدہ کام سرانجام ہی نہ دے۔ وہ یہاں وقت کاٹنے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کی عبادت اور رضا جوئی حاصل کرنے کیلئے آیا ہے۔ اس لئے جو اعمال مقصد حیات کے منافی، اصلاح دین کے مخالف ہیں وہ سب بے کار اور لالچنی ہیں۔ مالک کا سچا غلام ان کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا جو مالک کو ناپسند اور اس کی رضا کے منافی ہوں۔

(۱۲۷۴) وَعَنْ الْمِقْدَامِ بْنِ حُزَيْمٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَعْدِيكَرِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ لَمَّا قَالَ: «مَا مَلَأَ» انسان بھرتا ہے وہ اس کا پیٹ ہے۔ (اس کی روایت ابْنُ آدَمَ وَعَاءٌ شَرَاهُ مِنْ بَظَنِّهِ. أَخْرَجَهُ ترمذی نے کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے) الترمذی، وَحَسَنٌ.

حاصل کلام: اس حدیث میں بسیار خوری کو بدترین خصلت قرار دیا گیا ہے۔ بسیار خوری بہت سے دینی اور دنیاوی مفاسد اور خرابیوں کی جڑ ہے۔ ایسا آدمی صرف کھانے پینے کی فکر میں رہتا ہے اور بسا اوقات وہ یہ بھی تمیز نہیں کرتا کہ جس کھانے سے پیٹ بھر رہا ہے، وہ حلال ہے یا نہیں۔ بسیار خوری امراض معدہ کا باعث بھی ہے اور دل و دماغ پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسند ہزار میں ہے کہ بسیار خور قیامت کے دن بھوکا ہوگا۔ اس لئے یہ عادت دنیا و آخرت دونوں کی خرابی کا باعث ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں بسیار خوری کے دس نقصانات کا اور بقدر کفایت کھانے کے دس فوائد کا تذکرہ کیا ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

(۱۲۷۵) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ خَطَّاءٍ تَوَابُونَ». (اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند قوی ہے) وَابْنُ مَاجَهَ، وَسَنَدُهُ قَوِيٌّ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی زادہ خطا و گناہ کا پتلا ہے۔ انبیاء کرامؑ کے علاوہ کوئی بھی انسان معصوم نہیں۔ مگر آدمیت کا تقاضی ہے جب کبھی خطا سرزد ہو فوراً حضرت آدم علیہ السلام کی طرح توبہ و استغفار کرے۔ شیطان کی طرح گناہ پر اصرار نہ کرے۔

(۱۲۷۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «خَمُوشِي حَكْمَتٌ وَدَانِيٌّ لَيْكِنَ اسَ پر

937 ————— متفرق مضامین کی احادیث

﴿الصَّمْتُ حِكْمَةٌ، وَقَلِيلٌ عَمَلٌ پِیرا ہونے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔﴾
 فَأَعْلَهُ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعْبِ بِسَنَدٍ (اسے بیہقی نے شعب الایمان میں ضعیف سند کے ساتھ
 ضعیف. وَضَحَّ أَنَّهُ مُؤَوَّفٌ مِنْ قَوْلِ لُقْمَانَ رَوَايَتِ كَيْسَانَ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ لقمان حکیم کا قول
 الحکیم ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں خاموش و مہربان رہنے کو حکمت و دانائی اور عقلمندی و دانش مندی قرار دیا
 گیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونے والے اور اسے اختیار کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے
 ہیں۔ یہ گو حضرت لقمان عبدالسلام کا قول ہے مگر بہت سی احادیث میں خاموشی کی تائید اور فضول گوئی کی
 مذمت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ”جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔“ ایک حدیث میں ہے
 ”جو کوئی بات کرے تو اسے چاہئے کہ ہمیشہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔“

۴ - بَابُ التَّزْهِيْبِ مِنْ مَسَاوِيءِ
 الْأَخْلَاقِ
 برے اخلاق و عادات سے ڈرانے اور
 خوف دلانے کا بیان

(۱۲۷۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ، كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَابْنُ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ نَحْوَهُ.
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ اس لئے
 کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔“ (اس کی تخریج ابوداؤد
 نے کی ہے اور ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی
 طرح مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب التزہیب﴾ خوف دلانا، ڈرانا اور ﴿من مساوی﴾ میم پر فتح مساوۃ کی جمع۔
 معنی برائی۔ اور یہ برائی قولی اور فعلی دونوں طرح کی۔ ﴿الاحلاق﴾ خلق ”خاء“ اور ”لام“ دونوں پر ضمہ
 معنی عادت و خصلت۔ ﴿ایاکم والحسد﴾ حسد اس میں منصوب ہے، تحذیر کیلئے۔ یعنی حسد سے بچو اور
 ڈرو اور حسد یہ ہے کہ دوسرے کے پاس نعمت کو ناپسند و مکروہ سمجھے اور اس نعمت کے زوال کی تمنا و
 خواہش کرے لیکن اگر وہ ایسی تمنا کرے کہ فلاں کے پاس جو نعمت ہے وہ مجھے بھی مل جائے اس میں یہ
 خواہش و تمنا نہ پائی جائے کہ اس سے وہ زائل ہو جائے تو اسے اصطلاح شرع میں غبطہ یعنی رشک کہتے
 ہیں۔ یہ رشک دینی امور میں مطلوب ہے اور دنیوی امور میں معاف ہے۔

حاصل کلام: حسد کبیرہ گناہ ہے۔ شیطان کی پہلی نافرمانی حسد کی بنا پر تھی۔ قاتیل نے ہاتیل (اپنے بھائی)
 کو حسد کی بنا پر قتل کیا۔ حضرت یوسفؑ کے خلاف ان کے بھائیوں کی کارگزاری اسی حسد کے نتیجہ میں

متفرق مضامین کی احادیث 938

تھی۔ علمائے یسود بلکہ عبداللہ بن ابی منافق کی رسول اللہ ﷺ سے عداوت کا باعث بھی یہی حسد تھا۔ اس کی شہادت پر متعدد روایات مروی ہیں۔ یہ غیر مومنانہ عادت ہے اسی لئے آپؐ نے بڑی سختی سے اس سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔

(۱۲۷۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ: «لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرْعَةِ، اللہ ﷺ نے فرمایا ”کسی کو پچھاڑ دینا بہادری نہیں إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ ہے۔ بہادر تو وہ ہے جو غصہ میں اپنے آپ کو قابو میں الْعُظْبِ“۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الشديد﴾ شجاع، قوی اور بہادر ﴿الصرعة﴾ صادر پر ضمہ اور عین پر فتحہ ایسا آدمی جو اکثر اوقات اپنی قوت سے لوگوں کو پچھاڑ لیتا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اپنے حریف اور دشمن کو معاف کر دینا، اس سے درگزر کرنے کی فضیلت کا بیان ہے کہ آدمی طاقت کے باوجود غصہ کی حالت میں مد مقابل سے انتقامی کارروائی نہ کرے اور ایسے نازک موقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس کا جہاد کفار کے خلاف جہاد سے بھی مشکل ہے۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے غصہ کے موقع پر اپنے نفس پر قابو پالینے کو تمام لوگوں سے زیادہ طاقت ور اور قوی شمار کیا ہے۔

(۱۲۷۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ اللہ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ ﷺ نے فرمایا ”ظلم، قیامت کے روز بہت سی اللہ ﷺ: «الظُّلْمُ ظَلَمَاتٌ يَوْمَ تَارِكِيَّوْنَ اور اندھیروں کا باعث ہے۔“ (بخاری و الْقِيَامَةِ“۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں ظلم سے بچنے کا حکم ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں جو ظلم کرے گا وہ قیامت کے روز بہت سے اندھیروں میں بھگتا پھرے گا اور یہ ظلم اپنی تمام اقسام پر مشتمل ہے۔ یعنی ظلم جان پر ہو، مال میں ہو، کسی کی عزت و آبرو پر ہو، حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں ہو بہر نوع ظلم ہے اور حرام ہے۔

(۱۲۸۰) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللہ نے فرمایا ”ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے روز ﷺ: «اتَّقُوا الظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ اندھیرے اور تاریکیاں ہوں گی۔ نیز بخیلی سے بھی ظَلَمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَاتَّقُوا الشُّحَّ بچو۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اسی سے ہلاک فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ“۔ أَخْرَجَهُ ہوئے ہیں۔“ (مسلم)

(۱۲۸۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، إِذَا حَدَّثَ
كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا
أُؤْتِمِنَ خَانَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلَهُمَا مِنْ
حَدِيثِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا:

لغوی تشریح: ﴿آیۃ المنافق﴾ یعنی منافق کے نفاق کی نشانی۔ ﴿خاص﴾ جھگڑا کرتا ہے، لڑتا ہے۔ ﴿فاجر﴾ سب و شتم کرتا ہے، گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ ان تمام امور کا مرکب ہونا نفاق عملی ہے اور یہ نفاق کی ایک قسم ہے اور دوسری قسم نفاق اعتقادی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایمان کا تو اظہار کرے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں منافق کی چار علامات بیان کی گئی ہیں اور مسلم میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ اگرچہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو نیز یہ دعویٰ بھی کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اکثر محقق علماء کی رائے یہی ہے کہ یہ کام اعتقادی منافقوں کے ہیں اور جب ایک سچا مومن اپنے اندر یہ صفات پیدا کرے گا تو منافق جیسا بن جائے گا، ایسے شخص پر منافق کا لفظ مجازی طور پر بولا جائے گا۔

(۱۲۸۳) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ،
وَقِتْلُهُ كُفْرٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور
اسے قتل کرنا کفر ہے۔" (بخاری و مسلم)

نفعی تشریح: ﴿السبب﴾ سین کے نیچے کسرہ، گالی دینا۔ ”سب“ کے باب مفاصلہ کا مصدر ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کا مسلمان کو گالی دینا فسق قرار دیا گیا اور ”فسق“ آدمی کا اللہ کی اطاعت سے باہر نکل جانے کو کہتے ہیں۔ چونکہ اسلام میں مسلمان کو گالی دینا ممنوع ہے اور گالی دینے والا حکم الہی سے باہر نکل جاتا ہے، اس لئے ایسے شخص کو فاسق کہا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان کا قتل جائز سمجھتا ہو اور اسلام کی وجہ ہی سے اس سے لڑتا ہو تو اس کے کفر حقیقی پر سب کا اتفاق ہے اور اگر دونوں باتیں نہ ہوں تو اس پر کفر کا اطلاق مجازی طور پر ہوگا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میری امت کے سب لوگ عافیت میں رکھنے کے قابل ہیں مگر جو لوگ کھلے عام ظاہری طور پر گناہ کا ارتکاب کریں، وہ لوگ اس کے مستحق نہیں۔“ علماء میں فاسق کے فسق سے آگاہ کرنے میں اختلاف ہے۔ طبرانی میں بسند حسن مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم لوگ کب تک بدکار لوگوں کا حال بیان کرنے سے باز رہو گے۔ اس کی توہین اور چٹک کرو۔“ اس حدیث کی روشنی میں فاسق کے فسق کو اگر اس لئے ظاہر کیا جائے کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہ سکیں تو بالکل جائز ہے۔

(۱۲۸۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا حُمْرَ الظَّنِّ، فَإِنَّ الظَّنَّ جُھُوتٌ هـ»۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایاکم والظن﴾ یہاں ظن منصوب اس وجہ سے آیا ہے کہ تحذیر مقصود ہے اور تحذیر کہتے ہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کو اور ظن سے مراد برا گمان ہے اور یہ قاتل مذمت ہے اور اطلاق کے وقت مذمت کا پہلو ہی ذہن میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے گمان کا حکم فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:-

حاصل کلام: ظن کو بہت بڑا جھوٹ اس لئے کہا گیا ہے کہ انسان اپنے دل ہی دل میں گمان و ظن کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ پھر اسے زبان پر لاتا ہے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے علماء نے اسے تمت قرار دیا ہے اور تمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔ گویا ظن کا دوسرا نام تمت ہے اور تمت کبیرہ گناہ ہے اور گناہ کبیرہ توبہ کے بغیر قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ جس معاشرے میں بدگمانیاں پرورش پائیں گی وہاں حسن ظن نام کی کوئی چیز پنپ نہیں سکتی۔ اس معاشرے کے افراد کے درمیان اعتماد کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ یہ معاشرے کی تعمیر و ترقی کی علامت نہیں بلکہ زوال و تخریب کی نشانی ہے۔ صالح معاشرہ میں بدگمانی کے جراثیم کو پنپنے نہیں دیا جاتا جائے۔

(۱۲۸۵) وَعَنْ مَفْقِلَ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٍ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ». مَقْنَعٌ عَلَيْهِ.

دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

نفعی تشریح: ﴿يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَةً﴾ جسے اللہ راعی، حاکم، سربراہ اور لوگوں پر امیر مقرر فرمادے اور رعیت کی را پر فتح اور عین کے نیچے کسر اور ”یاء“ پر تشدید۔ اس کی جمع رعایا۔ را پر فتح۔ رعایا سے مراد عوام الناس ہیں۔ جو امیر کے سامنے سرگلوں اور تابع فرمان رہیں۔ ﴿غاش﴾ شین پر تشدید۔ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ خانت کرنے والا جو لوگوں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرے۔

حاصل کلام: سربراہ مملکت اور امیر کو چاہئے کہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ ہر ایک کو انصاف مہیا کرے۔ کسی سے ناانصافی نہ کرے اور نہ دوسرے سے ناانصافی ہونے دے۔ ان کے کاموں میں آسانی اور نرمی پیدا کرے۔ انہیں مشکلات اور مشقتوں میں نہ ڈالے۔ عوام کے معمولی قصور پر مؤاخذہ نہ کرے، درگزر اور معافی کا رویہ اپنائے، ان کو حتی الوسع ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرے، ان کے

942 مفرق مضامین کی احادیث

مال پر ہاتھ صاف نہ کرے، عزت و ناموس پر ڈاکہ نہ ڈالے، ٹیکسوں کی بھرمار سے عوام کا جینا دشوار نہ کرے، ان کو چوروں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے تحفظ مہیا کرے۔ اس کی بجائے اگر وہ عوام کا خون چوستا ہے تو ایسے حاکموں کیلئے اس حدیث میں شدید وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔ جنت کا حرام ہونا صاف بتا رہا ہے کہ رعیت کو دھوکہ دینا گناہ کبیرہ ہے۔ اس لئے اگر حاکمین اور امراء چاہتے ہیں کہ جنت میں داخلہ مل جائے تو انہیں ایسے فعل سے باز رہنا چاہئے۔

(۱۲۸۶) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اللَّهُمَّ: مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَنَسَقَ عَلَيْهِمْ فَاسَقُ عَلَيْهِ». مشقت میں مبتلا کرے تو تو اس پر سختی فرما۔“ (مسلم) أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لعفی تشریح: ﴿فَسَقَ عَلَيْهِمْ﴾ لوگوں کو مشقت اور تکلیف میں مبتلا کرے تو تو بھی اس کے ظلم اور جور کی وجہ سے اس پر سختی فرما۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ظالم حکمرانوں کے حق میں اللہ کے رسول نے بددعا فرمائی ہے۔ ظاہر ہے نبی کی بددعا اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ اس سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ حاکم اپنی رعایا پر شفقت اور نرمی سے پیش آئے۔ ان سے غفو و درگزر کا معاملہ کرے اور اگر وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ محبت کا معاملہ کرے تو اسے اپنی رعایا سے بھی محبت کا معاملہ کرنا چاہئے اور ناروا ظلم و ستم سے باز آجائے۔

(۱۲۸۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ». مَنْقُطٌ عَلَيْهِ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باہم لڑائی جھگڑے میں مارتے وقت منہ (چہرے) کو بچانا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ”جب کوئی کسی کو مارے تو چہرے پر مت مارے“ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ چہرے پر مارنا حرام ہے۔ یہ مارنا حدود و تعزیرات میں ہو یا تادیب کے طور پر۔ حتیٰ کہ جانوروں کے چہرے پر مارنے سے بھی گریز کرنا چاہئے۔

(۱۲۸۸) وَعَنْهُ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَوْصِنِي. قَالَ: «لَا تَغَضَّبَ». فَرَدَّدَ مِرَارًا، وَقَالَ: «لَا

حاصل کلام: اس حدیث میں غصہ سے بچنے کی تاکید ہے۔ بہت سے ظالمانہ کام انسان غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد میں اکثر تادم و پریشان ہوتا ہے۔ علامہ ابن النین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع کر دی گئی ہیں کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان نرمی اور رحم دلی کی صفات سے خالی ہو جاتا ہے۔ قطع رحمی کا سبب بنتا ہے اور دوسرے مسلمان کو ایذا دینے کے درپے ہو جاتا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو انسان کی دنیا و آخرت میں بربادی کا باعث بنتے ہیں اور اگر ان سے اجتناب کرے تو دنیا و آخرت میں فلاح و فوز کا سبب بنتے ہیں۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ غصہ سے بچنے کا مقصد یہ ہے کہ ان اسباب سے اجتناب کیا جائے جو غصہ کا باعث بنتے ہیں کیونکہ غصہ تو ایک طبعی و فطری معاملہ ہے اور انہی اسباب میں سے ایک سبب وہ تکبر بھی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے مزاج کے پیش نظر فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ کیونکہ وہ بات بات پر غضب ناک ہو جاتا تھا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ وہ سائلہ جاریہ بنت قدامہ تھیں اور ایک حدیث میں ہے کہ وہ سائل سفیان بن عبد اللہ الشقیفی تھے۔

لغوی تشریح: ﴿يَخْوِضُونَ﴾ یہ خوض سے ماخوذ ہے اور خوض کہتے ہیں پانی میں داخل ہونے کو۔ یعنی اللہ کے مال میں وسعت اختیار کرتے ہیں۔ خورد و نوش کی صورت میں، نئی نئی چیزوں کی خریداری اور جدید ملبوسات کی شکل میں۔ یہ اشارہ ہے کہ ایسے لوگ بغیر استحقاق کے یہ چیزیں حاصل کرتے ہیں یا یہ معنی ہے کہ وہ لوگ اپنے استحقاق سے زائد حاصل کرتے ہیں کیونکہ توسع بقدر ضرورت و حاجت کے حصول سے حاصل نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ناحق اللہ کا مال لینے والوں کیلئے جہنم کی وعید ہے۔ اللہ کے مال سے کیا مراد ہے۔ اللہ کے مال میں بیت المال بھی آتا ہے اور صدقات وغیرہ بھی۔ بیت المال میں سے سرکاری آدمی کا اِجی جائز ضروریات کی حد تک مال لینا تو اس کا حق ہے، اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر خرچ کرنا یا خود

متفرق مضامین کی احادیث 944

استحقاق سے زیادہ حاصل کرنا اور اس کا مالک بن بیٹھنا، جائز نہیں اور نہ غیر سرکاری آدمی کیلئے کسی طور پر مال لینا درست ہے۔ حاکم چونکہ بیت المال کا محافظ و نگران ہوتا ہے اس لئے اس کا اس میں سے استحقاق سے زائد مال لینا حرام اور جہنم کا موجب ہے۔

راوی حدیث: ﴿خَوْلَةُ رُحْمَاءَ﴾ یہ خولہ بنت ثامر ہیں جن کا تعلق انصار سے تھا۔ اس لئے انصاریہ کہلائیں۔ ابن عبدالبر کا قول ہے کہ یہ خاتون قیس بن فہد کی بیٹی تھیں ان کا لقب ثامر تھا۔ مؤلف اسد الغابہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اس صورت میں بنو مالک بن نجار کی وجہ سے نجاریہ بھی ہوتی ہیں۔ ان کی کنیت ام محمد المطلب تھی اور یہ سید الشهداء حمزہ بن عبدالمطلب کی زوجیت میں تھیں۔ جب یوم احد میں ان کو شہید کر دیا گیا تو نعمان بن عجلان انصاری زرقی رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کر لی تھی۔

(۱۲۹۰) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنْ النَّبِيِّ ﷺ، فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ، قَالَ: «يَا عِبَادِي! هِيَ حَرَمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلَتْهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا، فَلَا تَظَالُمُوا». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا، ان خبروں کے متعلق جو آپ اللہ تعالیٰ سے بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے۔ لہذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔“ (مسلم)

حاصل کلام: یہ حدیث حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس کے الفاظ اللہ رب العزت کے ہوں اور انہیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہو۔ اس حدیث کی رو سے ظالم کیلئے کسی قسم کی رو رعایت نہیں اور اسلوب بیان یہ ہے کہ جب میں ظلم نہیں کرتا تو تم بھی باہم ایک دوسرے پر ظلم سے باز آ جاؤ۔ ظلم عقلاً و نقلاً برا عمل ہے۔ جس کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ ”وقد خاب من حمل ظلمها“ اس لئے ظالم کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔ وہ خسارے ہی خسارے میں رہے گا۔

(۱۲۹۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ: «أَتَذَرُونَ مَا الْعِيبَةُ؟» قَالُوا: أَلَلَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: «ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ». قَالَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَحْيٍ مَا أَقُولُ؟ قَالَ: «إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدْ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ فَقَدْ بَهْتَهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کسے کہتے ہیں؟“ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ”غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر برائی سے کرے۔“ کسی نے عرض کیا جو بات میں کہتا ہوں اگر وہ میرے بھائی میں پائی جائے تو۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا ”جو کچھ تم اپنے بھائی کے متعلق کہتے ہو

اگر وہ اس میں پائی جاتی ہے تو اس کی غیبت کی اور اگر وہ بات جو تم اس کے متعلق کہتے ہو اس میں موجود ہی نہیں تو اس پر تو نے بہتان تراشی کی ہے۔“
(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿العیبہ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور یا ساکن۔ اس کی تفسیر تو حدیث میں موجود ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے فی الاحکام میں غزالی کی پیروی میں کہا ہے، غیبت یہ ہے کہ کسی آدمی کا تذکرہ اس طور پر کیا جائے جو اسے ناپسند ہو خواہ بدن انسان میں پایا جائے یا اس کے دین میں، اس کی دنیا، اس کے نفس، اس کے اخلاق و عادات، اس کے مال، اس کے والد، اولاد، بیوی، خادم، اس کی حرکات، اس کی خندہ پیشانی، اس کی خشک مزاجی وغیرہ سے، یہ ساری چیزیں اس کے برے ذکر میں شمار ہوں گی۔ خواہ یہ ذکر الفاظ میں ہو یا اشارہ و کنایہ میں۔ (سبل) ﴿اغتبہ﴾ اس پر عیب لگایا۔ عیب جوئی کی اس کی یعنی اس کی غیبت کی۔ ﴿بہتہ﴾ با اور ہا پر فتح اور تا پر تشدید اور فتح۔ بہتان سے صیغہ، مخاطب ہے یعنی اس پر بہتان تراسی کی اور اس پر جھوٹ باندھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں غیبت کی قباح و شاعت بیان ہوئی ہے۔ غیبت بالافتراق حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔ قرآن میں غیبت کرنے کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور اس کی دل آزاری کا باعث بنتا ہے۔

(۱۲۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَسُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا. وَلَا يَبِغْ بَغْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَغْضِهِ، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، الثَّقَوِيُّ هَهْنَا، وَيُسْبِرُ إِلَى صَدْرِهِ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، «يَحْسَبُ امْرِئٌ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ»

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور قیام نہ بدھاؤ۔ ایک دوسرے سے بے رخی نہ اختیار کرو۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے غیبت نہ کرو۔ ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو۔ اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر ہی سمجھتا ہے“ اپنے سینہ کی طرف تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا کہ ”ثقیفی یہاں ہے۔ کسی آدمی کیلئے بس اتنا ہی گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر

متفرق مضامین کی احادیث 946

وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔ سمجھئے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور آبرو حرام ہے۔ ”(مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿وَلَا تَنَاجَشُوا﴾ یہ نجش سے ماخوذ ہے اور نجش یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی مسلمان کی قیمت بولی دے کر بڑھاتا ہے۔ اس کا مقصد سودا خریدنا نہیں ہوتا محض دوسرے خریداروں کو دھوکہ دینا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اس کی دیکھا دیکھی سامان کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور اصلی قیمت سے کہیں زیادہ قیمت وصول ہو جائے۔ کتاب البیوع میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ ﴿وَلَا تَدَابُرُوا﴾ ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں کہ ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی سے بے رخی کرے اور اس کی جانب سے منہ موڑ لے اور اسی طرح دوسرا بھی منہ موڑ لے۔ ﴿وَلَا يَبِغْ﴾ غبن کے ساتھ، اس کا معنی ہے کہ ظلم نہ کرے اور ایک نسخہ میں عین کے ساتھ بھی آیا ہے۔ کتاب البیوع میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ ﴿لَا يَخْذُلُهُ﴾ ذال پر ضمہ۔ یہ خذلان سے ماخوذ ہے۔ یعنی کسی کی مدد سے ہاتھ کھینچ لینا اور اعانت نہ کرنا۔ امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ظالم کے ظلم کے دفع کرنے کیلئے مدد طلب کی جائے تو اس صورت میں اس کی اعانت و مدد کرنا چاہی بشرطیکہ مدد کرنا ممکن ہو اور کوئی عذر شرعی بیچ میں لاحق نہ ہو۔ ﴿بِحَسَبِ أَمْرِ مِنَ الشَّرِّ﴾ انسان کیلئے بس یہی کافی ہے یعنی اس کی اخلاقی برائی کیلئے بس یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ﴿بِحَسَبِ أَمْرِي﴾ مبتداء ہے اور ”باء“ اس میں زائد ہے اور ﴿إِنْ يَحْقِرْ﴾ اس کی خبر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اچھے مسلم معاشرہ میں افراد میں کس طرح باہمی برتاؤ اور رہن ہونا چاہئے، کا جامع بیان ہے۔ اس حدیث میں حسد جیسی ملکہ بیماری جو نیکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور معاشی اعتبار سے ایک سودے کی قیمت صرف مالک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے بڑھانا بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں ہے کیونکہ خریدار بھی تو اس کا بھائی مسلمان ہے، اسے نقصان پہنچانا کہاں کی شرافت ہے۔ بغض نہ رکھا کرو، اس سے باہمی محبت میں بڑا فرق واقع ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر زیادتی، سرکشی اور ظلم نہ کرو بلکہ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ کوئی کسی کو ضرر و نقصان نہ پہنچائے اور نہ ایک دوسرے کے عیب تلاش کرے، نہ کسی کو حقیر جانے اور نہ ہی خود کو بڑا سمجھے کیونکہ بڑا سمجھنا اور دوسرے بھائی کو حقیر سمجھنا تکبر ہے، جو انتہائی خطرناک بیماری ہے۔ ہر مسلمان پر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے۔ کوئی کسی کی جان مال اور عزت سے مت کھیلے۔

(۱۲۹۳) وَعَنْ قُطَيْبَةَ بْنِ مَالِكٍ حضرت قطبہ بن مالک رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يه دُعَايَهُ كَلِمَاتٍ فَرَمَا كَرْتَةً تَه رَسُوْلُ اللَّهِ ﷺ يَقُوْلُ: «اللَّهُمَّ جَنِّبْنِي ”اللی! مجھے برے اخلاق، برے اعمال، بری خواہشات

947 متفرق مضامین کی احادیث

مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ، وَالْأَعْمَالِ، اور بری بیماریوں سے بچا۔“ (اس کو ترمذی نے روایت
وَالْأَهْوَاءِ، وَالْأَدْوَاءِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ اسی کے
وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ وَاللَّفْظُ لَهُ. ہیں)

لعنوی تشریح: ﴿جنسبی﴾ بچنے اور دور رکھنے کی دعا ہے۔ جنسبی تجنیب سے ماخوذ ہے جس کا معنی
ہے مجھ سے دور فرما دے یا مجھے دور رکھ۔ ﴿منکرات الاخلاق﴾ ایسے اخلاق اور عادات جو عادتاً اور
شرعاً ناپسندیدہ ہوں۔ ﴿والاھواء الاخلاق﴾ پر اس کا عطف ہے اور ہوئی کی جمع ہے اور ہوئی کہتے ہیں
ایسی خواہش نفس کو جس میں کسی ایسے مقصد کی طرف نظر نہ ہو جسے شرع نے پسندیدہ قرار دیا ہو۔ ﴿والا
دواء﴾ اس کا عطف بھی الاخلاق پر ہے اور یہ داء کی جمع ہے، معنی اس کے بیماری اور مرض کے ہیں اور
منکرات الامراض ان بیماریوں کو کہتے ہیں جو پرانی اور دیرینہ ہوں، جن سے نفرت کی جاتی ہو اور دور رہا
جاتا ہو مثلاً برص، جذام کے امراض ہیں یا ملک امراض جن سے عموماً موت واقع ہو جاتی ہے جیسے ذات
الجنسب کا مرض ہے۔ ہیضہ، طاعون اور فالج وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ برے اخلاق، برے اعمال، بری خواہشات اور بری بیماریوں
سے ہر وقت اللہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے رہنا چاہئے کیونکہ ان امور سے اللہ کی توفیق ہی سے بچا جا
سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿قطبہ بن مالکؓ﴾ قطبہ بن مالک بن ثعلبہ سے ہونے کی وجہ سے ثعلبی کہلاتے
اور ثعلبہ بن سعد بن ذبیان میں ذبیان کی طرف نسبت کر کے ذبیانی کہلاتے تھے، کوفہ سے تعلق تھا اور ان
کے بھتیجے زیاد بن علاقہ نے ان سے احادیث نقل کی ہیں۔

(۱۲۹۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تُمَارِ أَخَاكَ، وَلَا تُمَارِخُهُ، وَلَا تَعْدُهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ». وعده بھی نہ کرو جس کی بعد میں خلاف ورزی کرو۔“
أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. (اسے ترمذی نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

لعنوی تشریح: ﴿لا تماری﴾ ”تاء“ پر ضمہ ممرارة سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں مجاہدہ نہ کرو، جھگڑانہ
کرو۔ سبل السلام میں ہے مراہ کی حقیقت یہ ہے کہ غیر کے کلام و گفتگو میں طعن کرنا، محض خلل ڈالنے
کی غرض سے۔ اس غرض کے سوا کہ اس سے کہنے والے کی تحقیر مقصود ہو اور کوئی مقصد و غرض نہ ہو
اور اپنی امتیازی شان اس پر مسلط کرنا ہو۔ ﴿ولا تماریخہ﴾ یہ ”مزاح“ سے ماخوذ ہے اور ”مزاح“ خوش
طبعی کرنے اور ٹھٹھا مزاق کرنے کو کہتے ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”وہ مزاح ممنوع ہے جس

متفرق مضامین کی احادیث 948

میں افراط ہو اور جو ہمیشہ کیا جاتا رہے کیونکہ مزاح سے ہنسی اور سنگ دلی پیدا ہوتی ہے، اللہ کے ذکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور دین کے حقیقی مسائل سے فکر ہٹ جاتی ہے بلکہ اکثر اوقات یہ مذاق ایزاء رسانی کا باعث بنتا ہے اور اس سے بے شمار بغض و کینہ جنم لیتا ہے، انسان کا وقار اور ہیبت و رعب جاتا رہتا ہے اور جو انسان ان خطرات سے محفوظ رہتا ہے، وہ مزاح مباح ہے اور ایسا مزاح کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا ہے جس سے مخاطب کا دل خوش ہو جاتا اور اس کی محبت میں اضافہ ہو جاتا۔ اس لئے ایسا مزاح مستحب ہے۔ یہ مسئلہ خوب سمجھ لو کیونکہ اس کی بہت ضرورت رہتی ہے۔

(۱۲۹۵) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابُو سَعِيدِ خُدْرِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ”دو خصلتیں ایسی ہیں جو رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «خَصْلَتَانِ لَا كُفِيَ مَوْمِنٌ فِي جَمْعِ نَهِسٍ هُوَ سَكْتَانِ - بَخْلٍ اَوْ سَوْءِ تَجَمُّعَانِ فِي مُؤْمِنٍ: الْبُخْلُ وَالسُّوءُ خُلُقٌ» (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور اس کی سند میں ضَعُفٌ۔ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کا دل بدخلق اور بخیل نہیں ہو سکتا۔ ایمان تو حسن خلق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا نام ہے۔ جب یہ دونوں غناء ہیں تو کامل ایمان کا مدعی کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۱۲۹۶) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ”گالی گلوچ کرنے والے دو آدمیوں ﷺ: «الْمُسْتَبَانِ مَا قَالَا فَعَلَىٰ» میں سے ابتداء کرنے والے پر بار گناہ ہے تاوقتیکہ الْبَادِي، مَا لَمْ يَنْتَدِ الْمَظْلُومُ»۔ مظلوم زیادتی نہ کرے۔“ (مسلم) أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔

لغوی تشریح: ﴿المستبان﴾ اس میں ”باء“ پر تشدید ہے اور باب اففعال سے اسم فاعل ہے یعنی ایک دوسرے کو سب و شتم کرنے والے دو آدمی۔ ﴿فعلى البادی﴾ گناہ کا بار اس شخص پر ہے جس نے گالی دینے میں پہل کی اور جواب میں گالی دینے والا اس زمرہ میں نہیں آتا۔ اس جرم کا سارا گناہ اس کے سر ہے کیونکہ وہی اس کا سبب بنا ہے۔ ﴿ما لم ينتد المظلوم﴾ تاوقتیکہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے۔ اگر وہ حد پھیلائے گیا یعنی اس نے جواباً زیادہ گالی دی اور گالی کا آغاز کرنے والے کو زیادہ ستایا اور اذیت دی تو اس کی ایزا رسانی اس کے گناہ کے ساتھ شامل ہو جائے گی اور بسا اوقات ایسا بھی امکان ہے کہ ابتداء کرنے والے سے اس کا گناہ زیادہ ہو جائے۔

(۱۲۹۷) وَعَنْ أَبِي صِرْمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ حَضْرَتِ ابُو صَرْمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «مَنْ ضَارَّ مُسْلِمًا ضَارَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ شَاقَّ مُسْلِمًا شَاقَّ اللَّهُ عَلَيْهِ». (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

یعنی جس کسی نے مسلمان کو مالی و جانی نقصان اور عزت و آبرو میں ناخن تکلیف دی اللہ تعالیٰ اسی جیسی تکلیف و مشقت بطور مجازات اس پر ڈال دے گا اور اسے اس میں مبتلا فرما دے گا۔ ﴿من شاق﴾ جس نے مسلمان سے ناخن جھگڑا کیا اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ڈال دے گا۔ (نازل فرما دے گا)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کو تکلیف دینے، اذیت پہنچانے سے خبردار کیا گیا ہے کہ جو آدمی کسی مسلمان کو تکلیف دیتا ہے، اس پر ظلم کرتا ہے اور اس سے بغیر کسی وجہ سے ناخن جھگڑا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر مشقت نازل کر دیتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوصرمہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ مازن سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے مازنی کہلائے۔ ان کا نام مالک بن قیس تھا یا قیس بن مالک۔ بدر وغیرہ غزوات میں حاضر رہے۔ ان سے چند احادیث مروی ہیں۔

(۱۲۹۸) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ «إِنَّ اللَّهَ يَبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. (اسے ترمذی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

(۱۲۹۹) وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - رَفَعَهُ - : «لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلَا اللَّعَّانِ، وَلَا الْفَاحِشِ، وَلَا الْبَذِيءِ». وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ. (ابو درداء) سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت میں ہے، کہ ”ایک مومن بہت طعن کرنے والا، بہت لعنت کرنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بے حیاء نہیں ہوتا“ (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿البذی﴾ بذاء سے فعل کے وزن پر۔ قبیح گفتگو اور فحش گوئی کو کہتے ہیں جو مومن کی صفات و اوصاف میں سے نہیں ہے۔ ﴿الطعان﴾ اللعان ﴿دونوں میں عین پر تشدید ہے، مطلب بہت

متفرق مضامین کی احادیث 950

لعن کرنے والا، بہت لعنت کرنے والا۔ مگر یہاں زیادت کا مفہوم مراد نہیں ہے کیونکہ لعنت کرنا تو حرام ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کامل کیلئے لائق نہیں کہ وہ بد خو، فحش گو اور لعن و طعن کرنے والا ہو۔ البتہ اس سے وہ عمل یا شخص مستثنیٰ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے ملعون قرار دیا ہے۔ مثلاً کافر، شراب پینے والا، حلالہ کرنے والا وغیرہ۔

راوی حدیث: ﴿ابوالدرداء رضی اللہ عنہ﴾ بڑے جلیل القدر اور نہایت عابد و زاہد صحابی تھے۔ ان کا نام عویمر بن زید یا ابن مالک بن عبد اللہ بن قیس تھا۔ انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ خزرج قبیلہ سے تھے۔ بدر کے روز اسلام قبول کیا۔ احد میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بدری اصحاب میں شامل فرمایا تھا۔ انہوں نے جمع قرآن کی خدمت انجام دی۔ دمشق کے والی رہے۔ ان کے فضائل بے شمار ہیں۔ ان کے اقوال زریں میں سے ایک قول یہ ہے کہ ایک لمحہ کی شہرت طویل حزن و ملال سے دوچار کر دیتی ہے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضُوا إِلَيَّ مَا قَدَّمُوا». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ. (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث میں کسی بھی مرنے والے کو برا کہنے اور گالی دینے سے منع فرمایا گیا ہے کیونکہ مردے کو گالی دینے کی وجہ سے اس کے لواحقین کو اذیت پہنچ سکتی ہے جو باہمی دشمنی اور عداوت کا باعث بن سکتی ہے ویسے بھی یہ لغو اور فضول سی بات ہے ورنہ مرنے والا اپنے مالک کے پاس پہنچ چکا ہے، اب اس کا معاملہ اس کے سپرد ہے، سزا دے یا نہ دے۔ کسی کے گالی دینے سے اسے کیا فرق پڑے گا۔ پھر یہ کونسی شرافت ہے کہ جو جوابی کاروائی کی پوزیشن ہی میں نہیں ہے اسے گالی گلوچ کرنے سے سوائے اپنے نفس کو تسلی دینے کے کیا حاصل ہے۔

(۱۳۰۱) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ». مَنَّكَ هُوَ الْكَافِرُ. (بخاری و مسلم)

لعنوی تشریح: ﴿قتات﴾ قاف پر فتح اور تاء پر تشدید۔ ”نمام“ کے معنی میں یعنی چغل خور جو کسی انسان کی یا کسی قوم کی بات دوسرے انسان یا قوم کے پاس اس طریقہ سے نقل کرے کہ دونوں میں فساد برپا ہو جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”نمام“ اور ”قتات“ میں لطیف سا فرق ہے۔ نمام اس آدمی کو کہتے

متفرق مضامین کی احادیث 951

ہیں جو لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے میں شریک ہو پھر ان کے خلاف چغل خوری کرے اور ان کی گفتگو کو آشکارا کرے جسے وہ افشا کرنا پسند کرتے ہوں اور قصات اس آدمی کو کہتے ہیں جو دوسروں کی بات ان کی بے خبری میں سنے پھر چغل خوری کرے اور ان کی بات کو آگے نقل کر دے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جبکہ اس کے آگے نقل کرنے میں شرعی مصلحت نہ ہو۔ ورنہ یہ مستحب ہے یا واجب ہے۔ مثلاً کسی آدمی کو پتہ چل گیا کہ ایک شخص دوسرے آدمی پر ظلم کرنا، ایذا دینا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس شخص کو ڈرائے، دھمکائے کہ ایسا نہ کرے اور جس پر ظلم کرنا چاہتا ہے، اسے جا کر بتائے کہ وہ ہوشیار و محتاط رہے اور اسی طرح جس نے سربراہ مملکت یا اس کے کسی نمائندے کو اس سے مطلع کر دیا تو اس سے منع نہیں کیا گیا۔ یعنی ایسا کرنا جائز ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ چغلی کے حرام ہونے پر امت کا اجماع ہے اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

(۱۳۰۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ كَفَّ عَصْبَهُ كَفَّ اللَّهُ عَنْهُ اللَّهُ تَعَالَى اس سے اپنا عذاب روک لے گا۔» (اسے عَذَابُهُ). أَخْرَجَهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْأَوْسَطِ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ عِنْدَ ابْنِ أَبِي الدُّنْيَا.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے اپنے غصے کو روک لیا اللہ تعالیٰ اس سے اپنا عذاب روک لے گا۔“ (اسے عذابہ)۔ آخرجہ الطبرانی فی الاوسط۔ ولہ شاهد من حدیث ابن عمر عند ابن ابی الدنیا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں غصہ پر قابو پانے کی فضیلت ہے۔ اپنے زیر دستوں اور خردوں کی کسی غلطی پر غصہ نہ کھانا بلکہ انہیں معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

(۱۳۰۳) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصَّدِيقِ. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دھوکہ باز، بخیل اور بدخلق آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ (ترمذی نے اس کو حَبَّ، وَلَا بِخَيْلٍ، وَلَا سَيِّءٍ روایت کیا اور اس نے اسے دو احادیث کی صورت میں الْمَلَكَةِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفَرَّقَهُ حَدِيثَيْنِ، الگ الگ بیان کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے) وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

لعنوی تشریح: ﴿لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ﴾ یعنی آغاز ہی میں جنت میں داخل نہیں ہوگا یا یہ معنی ہیں کہ پہلے کوئی سزا اور عذاب اگر ہے تو اسے بھگتے بغیر جنت میں نہیں جا سکے گا۔ ﴿حَبَّ﴾ خاں پر فتح اور باء پر تشدید۔ دھوکہ باز جو دھوکہ و فریب سے لوگوں میں فساد اور خرابی پیدا کرے۔ ﴿ولہ سنی الملکۃ﴾ ملکہ کے میم اور لام پر فتح ”ملکہ“ کے معنی میں ہے۔ ﴿سنی الملکہ﴾ جو اپنے غلاموں سے برا سلوک کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ ملکہ کو پختہ عادت کے معنی میں لیا جائے تو اس صورت میں

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ دھوکہ دینے والے، بخیل اور بد اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گے بلکہ وہ اپنے ان گناہوں کا خمیازہ بھگت کر ہی جنت میں جائیں گے۔

(۱۳۰۴) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ ﷺ: «مَنْ تَسَمَّعَ حَدِيثَ قَوْمٍ،
وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ، ضَبَّ فِي أُذُنِهِ
الْأَنْكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». يَعْني
الرَّصَاصَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی کسی قوم کی بات سننے کی
سعی کرے جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں تو قیامت
کے روز اس کے دونوں کانوں میں سیسہ ڈالا جائے
گا۔“ آنک کا معنی سیسہ ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿من تسمع﴾ باب تفعیل سے ماضی کا صیغہ ہے اور اس میں تکلف پایا جاتا ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ جو شخص کسی قوم کی بات سننے میں بڑی سعی و جدوجہد کرتا ہے یعنی چھپ کر مخفی طور پر بات سننے کی کوشش کرتا ہے اور رہی یہ بات کہ اس کے کان میں لوگوں کی بات بغیر کسی تکلف و اہتمام اور بغیر اس کی کوشش اور جدوجہد کے پڑ جائے تو اس پر اس سلسلہ میں کوئی مواخذہ نہیں لیکن اس کا مخفی رکھنا اور اسے نہ پھیلانا اس پر واجب ہے۔ جب کہ وہ ناپسندیدہ نہ ہو اور کسی فساد کا سبب نہ بن رہی ہو۔ ﴿صب﴾ صیغہ مجہول یعنی اس کے کانوں میں انڈیلا جائے، ڈالا جائے گا ﴿الانک﴾ حمزہ پر مد اور نون پر ضمہ۔ بمعنی سیہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اس بات کی ممانعت ہے کہ آدمی کسی دوسرے آدمی یا قوم کے راز و خفیہ باتیں جو دوسرے کے روبرو بیان کرنا وہ نہیں چاہتے، بڑے اہتمام، توجہ اور کوشش سے سننے کی ٹوہ میں لگا رہے۔ ایسے آدمی کے کانوں میں قیامت کے روز پھلکا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ یہ مجلسی آداب میں سے ایک ادب ہے جسے ملحوظ رکھنا چاہئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الادب المفرد“ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ سعید مقبری سے مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کسی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے یہ صاحب بھی ان کے قریب کھڑے ہو گئے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے سینے پر تھپڑ رسید کیا اور فرمایا کہ جب دو آدمی الگ سے بات چیت کر رہے ہوں تو ان کی باتیں نہ سنا کرو۔ یہ ممنوع ہے۔ بہر حال کسی کی رازداری میں مداخلت درست نہیں۔

(۱۳۰۵) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «طُوبَى لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاسِ». أَخْرَجَهُ الْبَزَّازُ بِإِسْنَادٍ

حضرت انس رضی اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اس شخص کو مبارک ہے جس کو اپنے عیب نظر آئیں اور دوسرے لوگوں کے عیوب نظر نہ آئیں۔“ (اس روایت کو بزار نے حسن سند سے نکالا ہے)

(۱۳۰۷) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ حَضْرَتِ سَلِّ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ. حضرت سل بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”عجلہ بازی و عجلت پسندی شیطانی کام ہے۔“ (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

متفرق مضامین کی احادیث 954

لغوی تشریح: ﴿العجلۃ﴾ عین اور جیم پر فتح۔ کسی کام کو انجام دینے میں جلدی کرنا۔ سرعت اور تیزی سے کام کرنا۔ یہ قابل مذمت حرکت ہے اس لئے کہ ایسا کرنے سے امور کے انجام پر غور و فکر کرنے اور ان میں خوب چھان بین کرنے کی نوبت نہیں آتی اور اسی کے نتیجہ میں انسان ہلاکت کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے اور یہ شیطان کا دھوکہ و فریب اور اس کی وسوسہ اندازی ہے جس سے بہر نوع بچنا چاہئے۔

(۱۳۰۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «بَدَخَلِي نَحْوَسْتِ هِيَ» (اس کو احمد نے رحمۃ اللہ علیہ: «الشُّومُ سُوءُ الْخُلُقِ»۔ أَخْرَجَهُ روايت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے) اُحْمَدُ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ۔

لغوی تشریح: ﴿الشوم﴾ یمن اور برکت کی ضد ہے۔ اس کے شین پر ضمہ اور حمزہ ساکن ہے اور آسانی سے پڑھا جاتا ہے یا پھر واؤ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی نحوست یا مصیبت جو انسان پر وارد ہوتی ہے اس کا اصل سبب بد خلقی ہے۔ نیز یہ بھی کہ بد خلقی اور خوش خلقی انسان کے اختیار میں ہے اگر چاہے تو بد خلقی کی راہ اختیار کر لے اور چاہے تو خوش خلقی کی شاہراہ پسند کر لے۔ بد خلقی کا انجام نحوست ہے اور خوش خلقی کا انجام خیر و برکت ہے۔

(۱۳۰۹) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّعَّانِينَ لَا يَكُونُونَ شَفَعَاءَ رَوْزِ نَهْ سَفَارَشِ كَرْنِ وَالِے هُونِ كِے اور نہ گواہی وَلَا شَهْدَاءَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ»۔ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ۔ دینے والے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پاکشت لعنت کرنے والے ایسے لوگوں کی سفارش قبول نہیں فرمائے گا اور نہ ایسے لوگوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس قبولیت شہادت کا بعض نے تعلق دنیا سے بتایا ہے کہ چونکہ ایسے لوگ فاسق ہوتے ہیں، اس لئے ان کی شہادت دنیا میں قبول نہیں کی جائے گی اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز انبیاء کرام کی تبلیغ دین پر شہادت نہیں دے سکیں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں تب بھی شہادت کے مرتبہ کو نہیں پاسکیں گے۔ (سبل)

(۱۳۱۰) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «بِجَوْ حُفْصِ كَسِي مُسْلِمَانِ كُو كَسِي كِنَاهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ كِي عَارِ دَلَّائِے گاتو وہ خود وہ کام کر کے مرے گا۔“

نغوی تشریح: ﴿عیر﴾ تعبیر سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی اسے عار کی طرف منسوب کیا اور اسے برا کہا تاکہ اس کو ذلیل و رسوا کرے۔

(۱۳۱۱) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيَيْلٌ لَهُ، ثُمَّ وَيْلٌ لَهُ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ.

حضرت بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ہلاکت ہے اس شخص پر جو جھوٹی باتیں سنا کر لوگوں کو ہنسائے۔ اس پر ہلاکت ہے۔ پھر اس پر ہلاکت ہے۔“ (اسے تینوں نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

(۱۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كَفَّارَةُ مَنْ اغْتَبَتَهُ أَنْ تَسْتَغْفِرَ لَهُ».

روَاهُ الْحَارِثُ بْنُ أَبِي أُسَامَةَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کی تو نے غیبت کی ہو اس کا کفارہ یہ ہے کہ تو اس کیلئے اللہ سے مغفرت طلب کرے۔“ (اسے حارث بن ابی اسامہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ غیبت کے گناہ کو دور کرنے کیلئے استغفار کافی ہے۔ لیکن علماء کا قول ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ آدمی کا اتنا پتا معلوم نہ ہو جس کی غیبت کی گئی ہے۔ اگر معلوم ہو جائے تو پھر اس سے معافی کے بغیر چارہ نہیں۔

(۱۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا حَفَرْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ

متفرق مضامین کی احادیث 956

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نے فرمایا ”بندوں میں اللہ کے نزدیک سب سے
 ﴿الْحَصْمُ﴾. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. ”مغض الرجال إلى الله الألد“ مغضوب بندہ وہ ہے جو سب سے زیادہ جھگڑالو ہو۔“
 (مسلم)

لعنوا تشریح: ﴿اللد﴾ ممرہ پر فتح اور لام پر فتح اور دال پر تشدید۔ سخت جھگڑالو اور ﴿الخصم﴾ کے
 ”خا“ اور صا پر فتح اس کا معنی بھی جھگڑنے والا۔

حاصل کلام: لڑنے جھگڑنے میں شدت اور سختی کرنا شریف لوگوں کا کام نہیں۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو
 عند اللہ سب سے زیادہ مغضوب ہیں۔ شدت اور سختی دونوں حرام ہیں مگر اپنے حقوق کے حصول کیلئے جائز
 حد تک جھگڑنا جائز ہے۔

۵ - باب التزغيب في مكاريم الاخلاق

ترغيب کا بیان

(۱۳۱۴) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «عَلَيْكُمْ بِالصَّدَقِ، فَإِنَّ الصَّدَقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ، وَيَتَحَرَّى الصَّدَقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صَدِيقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ، وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذَابًا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ
 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”سچائی کو لازم پکڑو کہ سچ
 نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی
 جانب رہنمائی کرتی ہے اور آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور
 سچ کی تلاش میں رہتا ہے تا آنکہ اسے اللہ کے ہاں
 صدیق لکھا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو۔ جھوٹ گناہ
 کی جانب لے جاتا ہے اور گناہ آتشیں جہنم کی جانب
 لے جاتا ہے اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے اور
 جھوٹ میں کوشش کرتا رہتا ہے تو اسے اللہ کے ہاں
 جھوٹا لکھا جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لعنوا تشریح: ﴿باب الترغيب﴾ ”مکرمہ“ مکرمہ کی جمع ہے مکرمہ کے میم اول پر فتح کاف
 ساکن اور ”را“ پر ضمہ ہے شریفانہ کام کو کہتے ہیں۔ ﴿عليكم بالصدق﴾ اس کا معنی صدق کو لازم
 پکڑنے اور اختیار کرنے کے ہیں اور صدق نام ہے واقعہ کے مطابق کام یا بات کرنے کا۔ ﴿فان الصدق﴾
 یعنی صدق کو لازم پکڑنے اور اس پر مداومت اختیار کرنا ﴿يتحري الصدق﴾ صدق کے سلسلہ میں
 انتہائی کوشش اور جدوجہد۔ ﴿صديقا﴾ صا کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید۔ صدق میں مبالغہ کو کہتے

ہیں۔ انتہائی سچ بولنے والا۔ اس حدیث میں سچ بولنے والے کے حسن خاتمہ اور اس کے برے انجام سے مامون و محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿الفجور﴾ ”فء“ پر ضمہ اس کے معنی ہیں فساد کی جانب میلان رکھنا اور معاصی کی طرف لپکنے کو فسق و فجور کہتے ہیں اور یہ شر و برائی کیلئے جامع نام ہے۔ ﴿حتیٰ یکتب عند اللہ کذابا﴾ مؤلف نے فتح الباری شرح بخاری میں کہا ہے کہ کتابت سے مراد یہاں اس کے بائیں فیصلہ کرنا ہے اور ملاء اعلیٰ سے دونوں مخلوق کیلئے اس کا اظہار کرنا ہے۔

(۱۳۱۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بدگمانی سے بچو۔ بدگمانی سب سے بڑا قال: «إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ». جھوٹ ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: دونوں احادیث میں جھوٹ سے بچنے اور ہمیشہ سچائی کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ سچائی کا آخری ثمرہ و نتیجہ جنت ہے اور جھوٹ کا نتیجہ خالق کائنات کی ناراضگی کی صورت میں دوزخ ہے۔ گویا اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جو کوئی اپنی تمام باتوں میں سچ اختیار کرتا ہے اور سچائی کو اپنی زندگی کا عین مقصد سمجھتا ہے تو سچائی اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور اس کا نتیجہ جنت ہے۔

(۱۳۱۶) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ بِالطَّرَفَاتِ»، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا، نَتَحَدَّثُ فِيهَا، قَالَ: «فَأَمَّا إِذَا أَبَيْتُمْ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ»، قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: «غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ الْأَذَى، وَرَدُّ السَّلَامِ، وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”راستوں (اور گلی کوچوں) میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہؓ نے عرض کیا: راستوں پر بیٹھے بغیر ہمارا گزارہ نہیں کیونکہ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”پس اگر تم نہیں مانتے تو راستہ کا حق ادا کرو۔“ انہوں نے عرض کیا اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا ”آنکھوں کو نیچے رکھنا۔ اذیت رسانی نہ کرنا اور سلام کا جواب دینا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایاکم والجلوس﴾ ایسا کہ بیٹھنا اس لئے ہے کہ اس سے مقصود ڈرانا اور خبردار کرنا ہے یعنی اس سے خوف کھاؤ، ڈرو اور محتاط رہو۔ ﴿مالنابذ﴾ بد کے ”باء“ پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ کوئی چارہ جائے فرار نہیں۔ ﴿لابدمنہ﴾ وہاں کہا جاتا ہے جہاں اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو اور جس کے سر انجام دیئے بغیر گزارہ نہ ہو معنی یہ ہوا کہ ضرورت و حاجت ہمیں راستوں پر بیٹھنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔

متفرق مضامین کی احادیث 958

پس اس سے ہمارے لئے کوئی کشادگی و فراخی کی گنجائش نہیں۔ ﴿فَانِ ابْتِغَاءُ﴾ پس اگر تم لوگوں کے راستوں میں بیٹھنے سے باز نہیں آئے تو پھر راستہ کا حق ادا کرو اور وہ یہ کہ اپنی نظروں کو غیر محرم پر پڑنے سے بچاؤ۔ ﴿كَفِ الْأَذَى﴾ راہ گیروں کو اذیت دینے سے رک جاؤ اور دوسری روایات میں راستے کے حق کے بارے میں مزید بیان بھی ہے کہ راستہ کی راہنمائی کرے، مصیبت زدہ کی فریاد رسی کرے، گم کردہ راہ مسافر کو راہ راست دکھائے۔ جب کوئی چھینک آنے کے بعد الحمد للہ کہے تو اس کا جواب (برحمتہ اللہ) دے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں راستوں میں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں بیٹھنا اور قصہ گوئیاں کرنا ممنوع ہے۔ گلی کوچوں میں بیٹھنا، راہ چلنے والوں کیلئے راستہ تنگ کرنا کوئی شرافت ہے۔ راستوں پر خواتین کا آنا جانا بھی رہتا ہے۔ لامحالہ ان کیلئے مشکل پیدا ہوتی ہے ان کے علاوہ ٹریفک کے مسائل ہیں اور اگر راستے پر بیٹھنا مجبوری ہو تو پھر اس کے حقوق کی ادائیگی ضروری ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

(۱۳۱۷) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ بُرِدَ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفْقَهُهُ فِي» کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ «الدين». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الفقه فی الدین﴾ قواعد اسلام کا سیکھنا، کتاب و سنت کے حلال و حرام کی معرفت حاصل کرنا۔ رہا ائمہ کے تخریج شدہ اقوال کی معرفت تو اسے اس امام کے مذہب کی فقہ کیس گے۔ یہ فقہ فی الدین نہیں ہے۔

(۱۳۱۸) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا مِنْ شَيْءٍ فِي الْمِيزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ حَضْرَتِ ابُو الدرداء رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اچھے خلق سے زیادہ کوئی اور چیز ترازو میں وزنی نہیں ہے۔“ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے) وَالتَّوْبَةُ، وَصَحَّحَهُ.

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز ترازو میں بھی ہوں گے جن میں اعمال تو لے اور وزن کئے جائیں گے اور ترازو میں سب سے وزنی چیز انسان کے عمدہ اخلاق ہوں گے۔ اس سے اچھے اور بہترین اخلاق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱۳۱۹) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ». حَضْرَتِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”حیا ایمان کا جزء ہے۔“ (بخاری و مسلم)

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿الحیاء﴾ لغوی طور پر حیا کے معنی ہیں، کسی عیب کے ڈر سے طبیعت میں تغیر و انکساری پیدا ہونا اور شرعاً یہ ایسی خصلت و عادت ہے جو برے اور بدنام کام سے بچنے کا موجب و باعث ہوتی ہے اور حقدار کے حق میں کوئی کوتاہی و کمی کرنے سے روکتی ہے اور حیا اگرچہ ایک طبعی خصلت ہے لیکن اسے شرعی طور پر استعمال کرنے ہی کیلئے جانے اور نیت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کو ایمان کا جزء اور شاخ قرار دیا گیا ہے اور کبھی کلیتاً کسی بھی ہوتا ہے اور اسے ایمان کا جزء قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ صاحب حیا کو اس کا حیا گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ جس طرح کہ ایمان گناہوں سے روکنے کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح حیا بھی انسان کو معاصی و گناہوں سے بچنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ ڈھال کا کام دیتا ہے۔ (سبل السلام)

(۱۳۲۰) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ الْأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحْ شَرَمٌ نَهَ كَرَهُ تَوْجُوَ چاہے کر۔» (بخاری) فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حاصل کلام: پہلے ثبوت کے کلام سے مراد وہ بات ہے جس پر سب انبیاء کا اتفاق ہے۔ یہ چیز ان کی شریعتوں کی طرح منسوخ نہیں ہوئی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہلی شریعتوں کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو منسوخ نہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ ”جب تو شرم و حیا نہ کرے تو جو چاہے کر“ بے حیائی سے روکنے کا جب یہ ذریعہ نہیں تو انسان بے حجابی میں جو چاہے گا، کرے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے دیکھ لو اگر وہ ایسا ہو کہ اس سے حیاء کی جائے تو اسے چھوڑ دو۔ (سبل)

(۱۳۲۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلِّ خَيْرٍ، اخْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ، وَاسْتَعِمْ بِاللَّهِ، وَلَا تَغْعِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَذَا كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلَكِنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”قوی مومن اچھا، اللہ کے ہاں زیادہ محبوب ہے ضعیف و کمزور مومن سے۔ ہر مومن میں بھلائی و اچھائی ہے۔ جو چیز تیرے لئے منافع بخش ہے اس کی حرص و لالچ کر۔ مدد صرف اللہ سے طلب کر، عاجز و درماندہ بن کر نہ بیٹھ اور اگر تجھے چیز حاصل ہو تو اس طرح مت کہو کہ اگر فلاں کام میں نے اس طرح سرانجام دیا ہوتا تو اس سے مجھے یہ اور یہ فوائد

لغوی تشریح: ﴿فان لو﴾ ”لو“ کا لفظ کسی کام کے مراد اور مقصود کے خلاف واقع ہونے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کہتا ہے اگر میں اس طرح کرتا تو اس کا نتیجہ لازماً اس طرح ہوتا جیسا کہ حدیث بالا میں مذکور ہے۔ ﴿تفتح عمل الشیطان﴾ یہ شیطان کا عمل کھول دیتا ہے۔ یعنی اچھے کام کے ہاتھ سے نکل جانے پر شیطان اسے شدت حرص اور حسرت و افسوس پر ابھارتا ہے اور قضاء و قدر پر عدم رضامندی پر مائل کرتا ہے اور اس میں تقدیر کو بدلنے کے امکان کا گمان دلاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں لفظ ”لو“ جس کے معنی ”اگر“ کے ہوتے ہیں کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے اور بعض احادیث سے اس کے استعمال کی گنجائش نظر آتی ہے۔ لہذا یہ ممانعت تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔ قاضی عیاض وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر ”لو“ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اگر میں فلاں کام اس طرح انجام دیتا تو یقیناً اس کا نتیجہ اس طرح برآمد ہوتا اس طور پر لفظ ”لو“ کا استعمال حرام ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ وہی ہو کر رہنا تھا جو ہو چکا ہے اور ہو گا بھی وہی جو تقدیر الہی میں ہے تو ایسی صورت میں لفظ ”لو“ کا استعمال درست ہوگا، ممنوع نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر دین اسلام کی تابعداری نہ کرنے پر تاسف کی صورت میں ”لو“ کہتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ دوسرے اس حدیث میں قوی و مضبوط مومن کو اللہ تعالیٰ ضعیف و کمزور کے مقابلہ میں محبوب رکھتا ہے کیونکہ جماد میں قوت و طاقت کی ضرورت ہے۔ تندرست و صحت مند آدمی بیمار و کمزور آدمی کے مقابلہ میں دین کی خدمت بھی زیادہ کر سکتا ہے اور عبادت بھی زیادہ اور غریاء و مساکین اور ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی خدمت بھی زیادہ کر سکتا ہے۔ لیکن قوت و ہمت کے باوجود انسان تنہی کچھ کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو۔ اس لئے اس میں حکم ہے کہ بہر نوح اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔

(۱۳۲۲) وَعَنْ عِيَّاضِ بْنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لَا يَبْنِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿التواضع﴾ تذلل و انکساری۔ یہ کبر کی ضد ہے۔ متکبر وہ شخص ہے جو دوسروں کے

متفرق مضامین کی احادیث 961

مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا اور ممتاز سمجھتا ہے۔ احکام الہی کی بغاوت کرتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے اس وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ جب تواضع تکبر کی ضد ہے تو تواضع کے آثار بھی اس کے مخالف ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تواضع و انکساری اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب ہے۔ باوجود بلند مرتبہ اور بلند شان ہونے کے، انسان کا اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں بڑا نہ سمجھنا اور لوگوں کو حقیر تصور نہ کرنا تواضع ہے۔ تواضع و انکساری سے انسان دوسرے انسانوں کو اپنا دوست اور ہمنوا بنا لیتا ہے اور تکبر و نخوت سے لوگوں کو اپنے سے دور کر لیتا ہے۔

(۱۳۲۳) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ بِالْغَيْبِ رَدَّ اللَّهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَنَهُ، وَلَا يَحْمَدُ مِنْ حَدِيثِ أَهْمَاءَ بِنْتِ يَزِيدَ نَحْوَهُ.

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس شخص نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے چہرے کو آتش جہنم سے محفوظ رکھے گا۔“ (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے اور مسند احمد میں اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی اسی طرح ہے)

لغوی تشریح: ﴿مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ﴾ اس کا مطلب ہے کہ جس نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کیا اور اس کی آبرو کی حفاظت کی ﴿بِالْغَيْبِ﴾ ایسی صورت میں جب اس کا بھائی موجود نہیں تھا، غیر حاضر تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اس مسلمان کی بڑی فضیلت کا بیان ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے بلکہ یہ دفاع واجب ہے کیونکہ یہ انکار منکر کے باب میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں دفاع نہ کرنے والے کی مذمت بھی آئی ہے۔ پھر اس دفاع سے غیبت وغیرہ کرنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے آئندہ وہ اس سے اجتناب کرے گا اور جس کا دفاع کیا ہے، اس سے بھائی چارہ اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا﴾ یہ یزید بن سکن کی صاحب زادی تھیں۔ قبیلہ اشل سے تھیں اس لئے اشلیہ کہلاتی تھیں۔ خواتین کی خلیہ تھیں۔ یرموک میں شریک ہوئیں۔ اس روز اس نے اپنے خیمہ کی لکڑی سے نو دشمنوں کو قتل کیا۔

(۱۳۲۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا نَفَقْتُ صَدَقَةً مِنْ مَالٍ، نَمِشَ كَرْتَا أَوْ لَاحَظَ كَرْتَا أَوْ رَغَزَ كَرْتَا»

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”صدقہ و خیرات کسی مال میں کمی واقع نہیں کرتا اور اللہ اس شخص کو جو درگزر کرتا ہے،

متفرق مضامین کی احادیث :-

وَمَا رَأَى اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ تَعَالَى. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

نہیں بڑھاتا مگر عزت میں اور نہیں تواضع کرتا کوئی بھی اللہ کیلئے مگر اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے۔ (مسلم)

نفعی تشریح: ﴿ما زاد الله رجلا بعفو﴾ اللہ اس شخص کو جو عفو و درگزر کرتا ہے نہیں بڑھاتا۔ یعنی اس کا کسی شے کے معاف کرنے کی وجہ سے یا انتقام و بدلہ لینے کی قوت و طاقت کے باوجود اسے معاف کر دینے کی وجہ سے۔ ﴿الا عزا﴾ مگر عزت۔ دنیا میں۔ کیونکہ عفو و درگزر کی صفت سے پہچانا گیا اس نے تو دلوں میں بہت بڑا مقام پیدا کر لیا یا پھر آخرت میں بھی عزت عطا فرمائے گا بایں طور کہ اس کے ثواب میں اضافہ فرما دے گا یا عزت و توقیر دینا اور آخرت دونوں میں عطا فرمائے گا۔ ﴿وما تواضع احد لله﴾ اور نہیں تواضع کرتا کوئی بھی اللہ کیلئے۔ یعنی اس طرح کہ وہ خود جس مرتبہ اور منصب کا مستحق ہے اپنے آپ کو اس سے نیچے اتار لے اس امید و توقع کے پیش نظر کہ اللہ کا قرب نصیب ہو جائے اس کے سوا کوئی دوسری غرض و مقصد نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مکارم اخلاق کی تین چیزوں کا ذکر ہے اور تینوں اخلاق فاضلہ کی جڑ ہیں۔ اور وہ صدقہ، عفو و درگزر اور تواضع ہیں۔ جس انسان میں یہ تینوں وصف پائے جائیں گے وہ شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوگا اور مخلوق خدا بھی اس سے محبت کرے گی۔

(۱۳۲۵) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَفْشُوا السَّلَامَ، وَصَلُّوا الْأَرْحَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ، وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

نقوی تشریح: ﴿افشوا﴾ افشاء سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی پھیلانا، عام کرنا کے ہیں۔ ﴿صلوا الارحام﴾ وصل سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿نیام﴾ نون کے نیچے کسرہ اور یہ ناٹم کی جمع ہے یعنی سونے والے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جن امور کو موجباتِ جنت قرار دیا گیا ہے ان میں تین کا تعلق انسانوں کے ساتھ باہمی پیار اور محبت سے ہے اور ایک کا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے، گویا اشارہ ہے کہ جس کا تعلق اللہ اور اللہ کے بندوں سے درست ہوا وہ جنت میں جائے گا اور یہ بھی کہ جو ان امور خیر کی پابندی کرے گا اس کیلئے جنت کے حصول کا راستہ آسان ہو جائے گا، وہ نیکی کی شاہراہ پر چل نکلے گا اور برائیوں سے

لغوی تشریح: ﴿الدين النصيحة﴾ یعنی دین کا عمود و ستون اور اس کو قائم رکھنے کا پیمانہ اور اس کا پایہ، خیر خواہی و نصیحت ہے۔ علامہ جزری نے النہایہ میں کہا ہے کہ نصیحت بڑا جامع کلمہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص سے بھلائی کا ارادہ کرنا جس کی خیر خواہی مطلوب و مقصود ہو اور ناممکن ہے کہ اس معنی کو ایک ہی لفظ میں ادا کیا جاسکے جو دوسرے معنی کو بھی اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہو اور "نصح" کا لغت میں تو دراصل معنی خلوص ہے۔ کہا جاتا ہے نصحتہ تو اس کے معنی ہیں "نصحت لہ" یعنی میں نے اس کی خیر خواہی کی اور اللہ سے خیر خواہی کے معنی یہ ہیں کہ عقیدہ صحیح ہو کہ اس کے سوا اور کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور نہ ہی اور کوئی معبود و مالک ہے اور اس کی عبادت میں بھی اخلاص ہو اور اس کی کتاب کی خیر خواہی سے مراد ہے کہ اس کتاب کی تصدیق کی جائے اور اس میں جو تعلیم ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے اور اس کے رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت و نبوت کو بصدق قلب تسلیم کیا جائے اور اس کے حکم کی بلاچون و چرا تعمیل کی جائے اور جس سے اس نے روکا ہو اس کام سے رک جائے اور ائمہ کی خیر خواہی یہی ہے کہ حق کے معاملہ میں ان کی بات مانی جائے اور ان کے خلاف بلاوجہ خروج نہ کیا جائے اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی سے مراد ہے کہ اچھے کاموں کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے۔

راوی حدیث: ﴿تمیم داری رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابورقیہ ہے۔ نام تمیم بن اوس بن خارجہ داری۔ ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔ بیت المقدس میں سکونت اختیار کی۔ جسارہ کی اطلاع نبی ﷺ تک انہوں نے پہنچائی تھی۔ ابن سیرین کا قول ہے کہ سارا قرآن حفظ کیا اور ایک رات میں سارا قرآن تلاوت کر لیتے تھے اور ابو نعیم کا قول ہے کہ تمیم وہ پہلے صحابی ہیں جس نے مساجد میں دیا روشن کیا تھا۔ ۴۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۲۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: «أَكْمَرُ مَا يُدْخِلُ الْجَنَّةَ تَقْوَى
حُفْرَتِ الْوُجْهِ»

حاصل کلام: اس حدیث میں تقویٰ اور حسن خلق اختیار کرنے والوں کو دخول جنت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اوامر پر عمل کرنا اور منہیات و نواہی سے رک جانا اور حسن خلق، اچھے عمل و کردار کا نام ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں تقویٰ اور حسن خلق کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور اس کی کتنی اہمیت و فضیلت ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت مخلوق ہے اور موجود ہے۔

(۱۳۲۸) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ لَا تَسْعُونَ النَّاسَ بِأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ لِيَسْغَهُمْ مِنْكُمْ بَسْطُ الْوَجْهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ». أَخْرَجَهُ أَبُو بَلْثَنْيَلٍ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

نفوی تشریح: ﴿ لا تسعون ﴾ یہ الواسع سے ماخوذ ہے اسی طرح ﴿ یسمعہم ﴾ بھی اسی "الوسع" سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم مال خرچ کر کے لوگوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ لوگوں کی تعداد زیادہ اور مال کم ہے۔ لیکن یہ کلام تم خندہ روئی اور خندہ پیشانی سے کر سکتے ہو لہذا اسی کو اپنے اوپر لازم کر لو نیز نرم پہلو اور نرم رویہ سے بھی اسے پورا کر سکتے ہو۔ اس کے برعکس سختی سے اور درشتگی سے یہ کام پایہٴ تحمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ (سبل السلام)

(۱۳۲۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ”مومن اپنے مومن بھائی کا آئینہ“ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمُؤْمِنُ مِرْآةُ أَخِيهِ الْمُؤْمِنِ». أخرجه أبو داود بإسناد حسن.

لغوی تشریح: ﴿المومن مرآة اخيه المومن﴾ المرآة کے میم کے نیچے کسرہ اور حمزہ پر مد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئینہ جس طرح اپنے دیکھنے والے کے محاسن اور نقائص بلا کم و کاست اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، اسی طرح ایک مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کیلئے آئینہ کی طرح ہے کہ وہ اپنے بھائی کو عیوب اور نقائص پر متنبہ کر کے اسے خبردار کر دیتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لے۔ یہ کام آئینہ صرف اپنے دیکھنے والے کو ہی بتاتا ہے، دوسرے کے روبرو چغلی نہیں کھاتا اور آئینہ اتنا عیب و نقص ہی بتاتا ہے جتنا دیکھنے والے کے چہرے میں ہوتا ہے، اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی نہیں کرتا اور اس کے سامنے بیان کرتا ہے، اس کی عدم موجودگی اور پٹھ پیچھے نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک مومن کو اپنے مومن بھائی کے

سامنے اس کے عیوب بیان کرنے چاہئیں، اس کی غیر موجودگی میں نہیں اور اتنے عیوب ہی بیان کرنے چاہئیں جتنے حقیقت میں اس میں پائے جاتے ہوں، اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی نہ کرے۔ آئینہ نکڑے ہو کر بھی اپنے دیکھنے والے کے عیوب ہر نکڑے میں وہی دکھاتا ہے جو اس میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح مومن کو اپنے بھائی سے ناراض ہو کر بھی اپنے مومن بھائی کے عیوب اتنے ہی بیان کرنے چاہئیں جتنے فی الواقع اس میں پائے جاتے ہیں۔ آئینہ ٹوٹ کر اپنی اصلیت کھو نہیں دیتا، اسی طرح مومن کو اپنی اصلیت کھو نہیں دینی چاہئے اور مومن کو اپنے عیوب پر تنبیہ کو اپنے لئے سچی خیر خواہی اور حقیقی ہمدردی سمجھنا چاہئے۔

(۱۳۳۰) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَضْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَضْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ، وَهُوَ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ، إِلَّا أَنَّهُ لَمْ يُسَمِّ الصَّحَابَةَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو مومن لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی جانب سے اذیت رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے بہتر اور اچھا ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا نہیں اور ان کی جانب سے اذیت رسانی پر صبر بھی نہیں کرتا۔“ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ نیز یہ حدیث ترمذی میں بھی ہے مگر اس نے صحابی کا نام نہیں لیا)

حاصل کلام: اس حدیث میں اس آدمی کو بہتر قرار دیا گیا ہے جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے ان سے میل ملاقات رکھتا ہے۔ دین کی تبلیغ کرتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے۔ تبلیغ دین کے سلسلہ سے ان کی جانب سے جو تکلیف اور اذیت پہنچتی ہے اس کو صبر و تحمل سے برداشت کرتا ہے، اس لئے کہ یہ تکلیف اسے دین کی وجہ سے دی گئی ہے۔ لہذا وہ اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو لوگوں میں آتا جاتا نہیں، ان سے میل ملاقات نہیں رکھتا۔ نہ وہ دین کی تبلیغ کرتا ہے اور نہ ہی ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے، نہ کسی سے تعاون لیتا ہے اور نہ دیتا ہے۔ البتہ جو آدمی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اس سے اس کی اپنی دہرداری کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں اس شخص کیلئے عزت اور کنارہ کشی کی گنجائش ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۱۳۳۱) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «اللَّهُمَّ كَمَا حَسَنْتَ خَلْقِي، فَحَسِّنْ خُلُقِي». زَوَّاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اے اللہ جس طرح تو نے میری تخلیق کو خوب اچھا بنایا ہے، اس طرح میرے اخلاق کو اچھا اور حسین بنا دے۔“ (اسے احمد نے روایت کیا)

جِئَانُ۔ ہے اور ابنِ حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حَسَنٌ﴾ تحسین سے ماخوذ اور مخاطب کا صیغہ ہے۔ ﴿خَلْقِي﴾ ”خا“ پر فتح اور لام ساکن اور دوسرے میں ”خا“ اور ”لام“ دونوں پر ضمہ ہے۔
حاصل کلام: یہ دعا رسول اللہ ﷺ عموماً آئینہ دیکھنے کے موقع پر کیا کرتے تھے۔ آپؐ تو تخلیق اور اخلاق کے لحاظ سے کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ تھے۔ آپؐ کی یہ دعا دراصل اس نعمت کے دوام کیلئے اور امت کو تعلیم دینے کیلئے تھی۔

۶ - بَابُ الذِّكْرِ وَالِدُعَاءِ ذِکْر اور دعا کا بیان

(۱۳۳۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: أَنَا مَعَ عَبْدِي مَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِِي شَفَاتَاهُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَلْفِيفًا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اپنے بندے کے اس وقت تک ساتھ رہتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے لئے اس کے ہونٹ ہلتے رہتے ہیں۔“ (اس کو ابن ماجہ نے نکالا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور بخاری نے اسے تعلقاً بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿بَابُ الذِّكْرِ﴾ یعنی اللہ کا ذکر زبان سے اور دل سے۔ ﴿وَالِدُعَاءِ﴾ دعا کہتے ہیں اللہ سے خیر طلب کرنا۔ دعا کبھی ضائع نہیں جاتی، بلکہ دعا مانگنے والے کے لئے تین میں سے ایک چیز ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ دعا کو بعینہ شرف قبولیت سے نوازتے ہیں یا یہ کہ اس دعا کو مانگنے والے کے لئے آخرت میں ذخیرہ بنادیتا ہے یا یہ کہ اس سے کسی برائی و مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔
حاصل کلام: اس حدیث میں ذکر کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اللہ کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ ذکر کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ ذکر اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ثناء، تحمید و تجلیل وغیرہ کے کلمات کو دل اور زبان پر جاری رکھنے کا نام ہے۔ محض دل میں ان کلمات کا ہونے کا کوئی معنی نہیں جب تک کہ زبان بھی دل کی ہمنوا نہ ہو اور صرف زبان سے ادا کرنا اور دل اس سے بے خبر رہے، اس سے بھی کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ جب دل اور زبان ہم آہنگ ہوں اور ایک دوسرے کے ہمنوا ہوں تو مطلوب حاصل ہوتا ہے اور یہی اللہ کے ہاں محبوب ہے۔ دعا اور ذکر میں طلب کا فرق ہے، دعا میں طلب ہوتی ہے، ذکر میں نہیں۔ دعا کی فضیلت میں بہت سی احادیث منقول ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی ”الوابل الصیب“ اس سلسلے میں بہترین کتاب ہے۔ اہل ذوق اس کی مراجعت فرمائیں۔

(۱۳۳۳) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ .

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل ذکر کی مجلسیں اور اجتماعات بڑی شان رکھتے ہیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ ذکر الہی تمام اعمال سے بہتر ہے، بعض مشائخ نے کہا ہے کہ زبان کا ذکر تسبیح و تہمید، تلاوت قرآن مجید وغیرہ ہے۔ آنکھوں کا ذکر اللہ کے خوف سے اشکبار ہونا، کانوں کا ذکر کلام الہی اور خیر خواہی کا کلمہ پوری توجہ سے سننا، ہاتھوں کا ذکر راہ خدا میں ہاتھوں سے خیرات کرنا، جسم و بدن کا ذکر اس کی حرکات و سکنات کا ہمیشہ اللہ کیلئے ہونا، دل کا ذکر یہ کہ صرف اللہ کا خوف اور امید و رجاء رکھنا اور روح کا ذکر ہے کہ اپنا سب کچھ اللہ کے حوالہ کرنا اور قضاء الہی پر رضامند رہنا۔ اس طرح گویا انسان مجسم ذکر الہی بن کر رہ جاتا ہے اور یہی دراصل مطلوب و مقصود ہے۔

(۱۳۳۵) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَا قَعَدَ قَوْمٌ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرُوا اللَّهَ فِيهِ، وَلَمْ يُصَلُّوا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”نہیں بیٹھتی کوئی قوم کسی مجلس میں کہ انہوں نے اس مجلس میں اللہ کا ذکر کیا اور نہ نبی ﷺ پر درود بھیجا مگر وہ مجلس ان کیلئے قیامت کے روز باعث حسرت و ندامت ہوگی۔“ (اسے ترمذی نے

نکالا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مجلس میں اللہ کا ذکر ضرور ہونا چاہئے اور نبی ﷺ پر درود ضرور بھیجنا چاہئے مگر درود و سلام کا جو رواج ہمارے دور میں شروع ہوا ہے، اس کا وجود عمد رسالت اور دور صحابہ کرامؓ میں نظر نہیں آتا۔ یہ لوگوں کی اپنی ایجاد ہے اگر تو وہ اسے مسنون سمجھ کر باعث اجر و ثواب سمجھتے ہیں تو یہ بدعت ہے۔ اجتماعی ذکر میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اکٹھے ایک جگہ بیٹھ کر اپنے طور پر ذکر الہی اور درود پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

(۱۳۳۶) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، يُحْيِي وَيُمِيتُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، عَشْرَ مَرَّاتٍ، كَانَ كَمَنْ أَتَقَّقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو کوئی دس مرتبہ ان کلمات کو کہے کہ ”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں“ بادشاہت اسی کی ہے، سب تعریف اسی کے لئے ہے، سب بھلائی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ تو وہ اس شخص کی مانند ہو گیا جس نے اولاد اسماعیل سے چار بہترین و نفیس ترین غلاموں کو آزاد کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿من ولد اسماعیل﴾ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور نسل میں سے اور ولد کی واؤ پر ضمہ ہے اور لام ساکن ہے اور دونوں پر فتح بھی جائز ہے اور ولد کا لفظ واحد، تشبیہ اور جمع سب پر یکساں بولا جاتا ہے اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے کسی کو نعمت آزادی سے سرفراز کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے بہ نسبت دوسرے کسی کے آزاد کرنے سے۔

(۱۳۳۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ (پاک ہے اللہ اپنی تعریفوں کے ساتھ) سو

نغوی تشریح: ﴿حطت﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی محو کر دی جائیں گی۔ عفو و درگزر اور بخشش کے ذریعہ زائل کر دی جائیں گی۔ ﴿وان كانت مثل زبد البحر﴾ اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ یہ کثرت گناہ سے کنایہ ہے اور ”زبد“ زلزلہ اور بادل دونوں پر فتح۔ پانی کے اوپر آنے والا مادہ جسے جھاگ کہتے ہیں اور یہاں خطایا سے صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ کبیرہ گناہ مراد نہیں، وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔

(۱۳۳۸) وَعَنْ جُوَيْرِيَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «لَقَدْ قُلْتُ بِعْدَكَ أَرْبَعُ كَلِمَاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتُ مِنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُمْ: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَاءِ نَفْسِهِ، وَزِينَةِ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

نفوی تشریح: ﴿ مَا لَقَدْ قُلْتَ بَعْدَكَ ﴾ بعدد کے کاف کے نیچے کسرو ہے کیونکہ اس سے مراد حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ہیں اور وہ مؤنث ہیں۔ بعدد سے مراد ہے کہ تمہارے پاس سے جانے کے بعد۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ نبی ﷺ ان کے پاس سے نکل کر باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بیٹھی ذکر الہی میں مصروف رہیں۔ آپؐ تقریباً نصف النہار کے قریب واپس تشریف لائے تو وہ اپنی جگہ بیٹھی ذکر میں مصروف تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”تم ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی پڑھ رہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! تو نبی ﷺ نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا ”لَقَدْ قُلْتَ بَعْدَكَ الْخ“ ﴿ لَوْ زَنْتَ ﴾ صیغہ غائب مجہول ﴿ لَوْ زَنْتَھن ﴾ یعنی یہ کلمات تمہارے کلمات پر ترجیح پائیں گے۔ یعنی وزن میں بڑھ جائیں گے۔ ﴿ زَنْتَ عَرَشَہ ﴾ زنہ کا اصل وزن ہے جیسے عدۃ صلوٰۃ اور ہبہ ہے۔ ان کا اصل وعد وصل اور وہب ہے اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب کلمات عظیم ہوں گے تو ان کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہوگا۔

متفرق مضامین کی احادیث 970

راوی حدیث: ﴿جوسرہ بنت حارثؓ﴾ امات المؤمنین میں سے ایک تھیں۔ غزوہٴ مریج میں اسیر ہوئیں۔ ثابت بن قیس بن شمس کے حصہ میں آئیں۔ انہوں نے ان سے مکاتبت کر لی۔ مکاتبت کی رقم رسول اللہ ﷺ نے ادا فرما کر ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس پر لوگوں نے ان کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا کہ یہ اب رسول اللہ ﷺ کی سسرالی رشتہ دار بن گئی ہیں۔ یہ خاتون ان کے قبیلے اور قوم کیلئے سب سے زیادہ باعث برکت ثابت ہوئیں۔ ۵۶ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۳۹) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ حَضْرَتِ ابِوسَعِيدٍ خُدْرِيؓ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نے فرمایا (آنے والے الفاظ) باقیات رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «الْبَاقِيَاتُ صَالِحَاتُ» یعنی ”اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، اللہ الصَّالِحَاتُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، پاک ہے، بلند شان والا ہے اور وہی سب سے بڑا وَسُبْحَانَ اللَّهِ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، ہے اور ہر خوبی اللہ کیلئے ہے اور برائی سے پھرنے وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا اور نیکی کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔“ بِاللّٰهِ. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ (اسے نسائی نے نکالا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے وَالْحَافِظُ۔ صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الباقیات الصالحات﴾ یعنی باقیات صالحات میں سے ہیں اور ان اعمال سے مراد ایسے اعمال ہیں کہ جن کا اجر و ثواب عامل کیلئے ہمیشہ ہمیش باقی رہتا ہے۔ ہر وہ کام جس کا تعلق اللہ کی اطاعت اور اعمال خیر سے ہو وہ باقیات صالحات میں سے ہیں۔ اس حدیث میں ان کلمات کو بالخصوص ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ایمان باللہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور ایمان اللہ تمام بھلائیوں اور اچھائیوں کا منبع و مرکز ہے۔ ایمان باللہ کے بغیر کوئی بھلائی و اچھائی شمار نہیں ہے۔ پس یہ کلمات گویا باقیات صالحات کی جڑ ہیں۔ ﴿لاحول ولا قوة الا باللہ﴾ علامہ نوویؒ نے کہا ہے کہ اہل لغت کا قول ہے کہ حول سے مراد حرکت اور حیلہ ہے یعنی اللہ کی مشیت کے بغیر نہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ حیلہ سازی کر سکتا ہے اور یہ بھی قول ہے کہ لاحول کا معنی ہے کہ شر کو دفع کرنے کی قوت اور خیر کو حاصل کرنے کی طاقت بھی اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے پھرنے کی طاقت اللہ کے تحفظ اور حفاظت کے بغیر ناممکن ہے اور اللہ کی اطاعت پر قوت بھی اس کی اعانت کے بغیر نہیں۔ یہ قول عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے اور یہ سارے اقوال قریب المعنی ہیں۔

(۱۳۴۰) وَعَنْ سَمُرَةَ بِنْتِ جُنْدُبٍ حَضْرَتِ سمرہ بنت جندبؓ سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نے فرمایا ”اللہ کے نزدیک سب سے محبوب و پسندیدہ کلام یہ چار الفاظ ہیں۔ ان میں سے اللہ أَرْبَعُ، لَا يَضُرُّكَ بِأَيِّهِنَّ بَدَأْتَ: خواہ کسی سے ابتدا کرے تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

971 متفرق مضامین کی احادیث

سُبْحَانَ اللَّهِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.
(وہ یہ ہیں) ”اللہ پاک ہے، بلند و بالا شان کا مالک ہے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے۔“ (مسلم)

(۱۳۴۱) وَعَنْ أَبِي مُوسَى
الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ
قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «يَا
عَبْدَ اللَّهِ بْنَ قَيْسٍ! أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى
كَنْزٍ مِنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ؟ لَا حَوْلَ وَلَا
قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. زَادَ النَّسَائِيُّ:
«وَلَا مُلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ».
حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا ”اے
عبداللہ بن قیس! کیا میں تجھے جنت کے خزانوں میں
سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ جو یہ ہے کہ برائی سے
منہ موڑنا اور نیکی پر زور سوائے اللہ کی مدد کے
(ممکن) نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم) اور نسائی میں اتنا
اضافہ ہے کہ ”اللہ کے سوا کہیں پناہ نہیں۔“

لعنوی تشریح: ﴿الملجاء﴾ پناہ گاہ، جائے تحفظ۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کلمہ کا جنت کا خزانہ
ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس کلمہ میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنا ہے اور اس کیلئے سر تسلیم خم کرنے کا
اعتراف ہے اور اس کا اعتراف ہے کہ اس کے سوا اور کوئی صانع نہیں ہے۔ اس کے ارادے کو کوئی رد
کرنے والا نہیں ہے اور اس معاملہ میں بندے کا کوئی اختیار نہیں اور یہاں کنز کا معنی ہے کہ جنت میں
اس کا ثواب ذخیرہ ہوگا اور وہ بہترین و نفیس ہوگا ایسے ہی جیسے سارے اموال چھپا کر رکھا ہوا مال زیادہ نفیس
اور قیمتی ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کی فضیلت کا بیان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جتنی
چیز نفیس اور قیمتی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی حفاظت اور دیکھ بھال اہتمام سے کی جاتی ہے۔ اسے چھپا کر رکھا
جاتا ہے اور یہ کلمات تو جنت کا خزانہ ہیں۔ اس لئے ان کی بھی محافظت کرنی چاہئے اور کثرت سے انہیں
پڑھنا چاہئے۔

(۱۳۴۲) وَعَنْ الثُّعْمَانِ بْنِ يَسِيرٍ
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا عَنْ النَّبِيِّ
ﷺ قَالَ: «إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ».
رَوَاهُ الْأَرْنَؤَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.
حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی
ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا ہی عبادت ہے۔ (اسے
چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)
اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں

”الدعاء مع العبادة“ کے الفاظ ہیں یعنی دعا مغز
عبادت ہے۔
اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے
مُحَّ الْعِبَادَةِ».

متفرق مضامین کی احادیث 972

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، رَفَعَهُ: «لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الدُّعَاءِ». (ہے) وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

لغوی تشریح: ﴿ان الدعاء هو العبادة﴾ یعنی دعا ارکان عبادت میں سے سب سے عظیم اور اس کے اہم ترین اجزاء میں سے ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”جج تو عرف کا نام ہے“ ﴿منح العبادة﴾ عبادت کا مغز ہے، سے مراد ہے کہ دعا عبادت کا خلاصہ اور اصل ہے اور حج کے میم پر ضمیمہ اور خاپر تشدید ہے اور حج ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی لئے دماغ کو مغز کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب ہوا کہ غیر اللہ سے جو دعائیں برائے قضاء حاجات و مشکلات کی جاتیں ہیں وہ گویا غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اسی لئے غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے۔ دعا کی تاثیر کا اندازہ تو اس سے لگائیں کہ طبرانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ آسمان سے کوئی مصیبت و بلا نازل ہو رہی ہوتی ہے اور آدمی اتفاق سے اس موقع پر رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوتا ہے تو قضاء آسمانی میں دونوں کی مدد بھیڑ ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے لپٹ جاتی ہیں، اس طرح دعا گویا نازل ہونے والی مصیبت کو راستہ ہی میں روک لیتی ہے اور اس پر نازل نہیں ہونے دیتی۔

(۱۳۴۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ لَا يَرُدُّ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَّانَ وَغَيْرُهُ.

حاصل کلام: استجاب دعا کے مختلف اوقات ہیں۔ ان میں ایک وقت اذان و اقامت کے درمیان کا وقت ہے۔ اس لئے کہ نمازی کی اس وقت توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، وہ نماز کے انتظار میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت کو فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

(۱۳۴۴) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ رَبَّكُمْ كَرِيمٌ، يَسْتَجِيبُ مِنْ عِبْدِهِ إِذَا رَفَعَ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا»

متفرق مضامین کی احادیث 973

صِفْرًا. أَخْرَجَهُ الْأَزْبَعَةُ إِلَّا النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ شَرْمُ آتِي هُـ"۔ (نسائی کے سوا چاروں نے اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

نغوی تشریح: ﴿حی﴾ فعل کے وزن پر۔ حیاء سے ماخوذ ہے اور معنی ہے شرم و حیاء والا۔ حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے اور یہ آداب دعا کا ایک ادب ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں اٹھے ہوئے بندہ محتاج کے ہاتھ خالی واپس نہیں کئے جاتے۔ دعائے استسقاء کے وقت رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ عام معمول سے ہٹ کر زیادہ ہی بلند فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھانے کی جو نفی ہے، اس سے مراد استسقاء کی طرح رفع الیدین میں مبالغہ کرنے کی نفی ہے۔

(۱۳۴۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا مَدَّ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَرُدُّهُمَا حَتَّى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ. وَلَهُ شَوَاهِدٌ مِنْهَا حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ، وَمَجْمُوعُهَا يَفْتَضِي أَنَّهُ حَدِيثٌ حَسَنٌ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا کیلئے ہاتھ اٹھایا کرتے تو ان کو اس وقت تک واپس نہ لوٹاتے جب تک کہ چہرے پر پھیر نہ لیتے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور اس کے کئی شواہد ہیں، ان میں ایک ابو داؤد وغیرہ کے ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور ان کا مجموعہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا مانگنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر ملنا یا پھیر لینا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دعا کے وقت اللہ کی جناب میں اٹھے ہوئے ہاتھ رحمت الہی سے لبریز ہو جاتے ہیں تو اس رحمت کو شکر یہ کے ساتھ چہرے پر مل لیا جاتا ہے، اس لئے کہ چہرہ اعضاء جسم میں سب سے اشرف عضو ہے۔ نیز چہرہ سارے جسم کا ترجمان نمائندہ ہے، جب نمائندے کو یہ شرف مل گیا تو باقی اعضاء از خود اس میں شامل ہو جائیں گے۔ اس حدیث کی سند میں حماد بن عیسیٰ جہنی ضعیف راوی ہے۔ لیکن اس کے دوسرے شواہد موجود ہیں جن کی بناء پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

(۱۳۴۶) وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِیَ یَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً». أَخْرَجَهُ تِرْمِذِي. ابْنُ حَبَانَ نے اسے روایت کیا ہے کہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے روز سب سے زیادہ میرے قریب وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والے ہوں گے۔" (ترمذی۔ ابن حبان نے اسے

التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حاصل کلام: قیامت کے روز رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت اور قرب کا ذریعہ آپؐ پر باکثرت درود شریف پڑھنا ہے۔ اس حدیث سے امام ابن حبان رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ اس میں حضرات محدثین رحمہم اللہ کی عظمت شان واضح ہوتی ہے کہ جو بولتے، لکھتے دن رات رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھتے ہیں۔ درود کے مختلف الفاظ احادیث میں منقول ہیں۔ سب سے افضل درود ابراہیمی ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل جلاء الافہام اور القوی البدیع میں موجود ہے۔

(۱۳۴۷) وَعَنْ شَدَادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «سَيِّدُ الْاسْتِغْفَارِ أَنْ يَقُولَ الْعَبْدُ: اللَّهُمَّ! أَنْتَ رَبِّي، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي، وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

نغوی تشریح: ﴿انا علی عہدک﴾ عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں ہر انسان سے کیا تھا یا پھر وہ عہد مراد ہے جو ہر مومن کے ایمان لانے کے ساتھ ہی لازم ہو جاتا ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو اس کے ساتھ خالص کرنے کے عہد کا نام ہے۔ ﴿ووعدک﴾ یہ عہد کی تاکید ہے یا پھر اس سے مراد جزاء کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ یعنی قیامت کے روز کئے جانے والے وعدے پر یقین رکھنے والا۔ ﴿ابوء لک﴾ میں تیرے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اسی طرح تمام حدیث کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ جس کسی نے اس دعا کو دل میں یقین رکھتے ہوئے پڑھا اور شام سے پہلے وفات پا گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہے اور جس کسی نے رات کو اس پر یقین رکھتے ہوئے پڑھا اور وہ صبح سے پہلے فوت ہو گیا تو وہ بھی اہل جنت میں سے ہے۔

متفرق مضامین کی احادیث 976

عَافِيَتِكَ، وَفُجَاءَةً نَفْمَتِكَ، وَجَمِيعِ هِرْقَمِ كِي نَارِ اَنَسْكَ وَغَصَہ سے پناہ طلب كرتا ہوں“
(مسلم) أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

لعنوی تشریح: ﴿التحول﴾ نفل ہونا اور ﴿فجاءة﴾ فاپر ضمہ الف ممدودہ کے ساتھ رحمت کے وزن پر آتا ہے۔ اس کا معنی اچانک ہے اور ﴿نقمة﴾ کے نون پر فتح اور قاف ساکن اور ایک قرأت کے مطابق قاف کے نیچے کسرہ اور نون کے نیچے بھی کسرہ اور قاف ساکن۔ انتقام سے اسم ہے اور یہ مکافات عقوبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: اللہ کی عطا کردہ نازل شدہ نعمتیں عموماً اپنے گناہوں کی شامت کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہیں، اس لئے زوالِ نعمت سے پناہ دراصل برے اعمال سے پناہ مانگنا ہے۔

(۱۳۵۰) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فرمایا کرتے تھے ”الہی! میں تجھ سے رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ! إِنِّي قرض کے غلبہ، دشمن کے غالب آنے اور اعداء کے أَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدِّينِ، وَغَلَبَةِ خوش ہونے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“ (نسائی نے الْعَدُوِّ، وَشِمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ). رَوَاهُ اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

لعنوی تشریح: ﴿الدین﴾ دال پر فتح اس کے ہیں۔ قرض، ادھار۔ ہر ایسی چیز از قسم مال جو تجھ پر دوسرے کی واجب الادا ہو اور ﴿شِماتت﴾ کے شین پر فتح۔ جس کے معنی اس خوشی اور مسرت کے ہیں جو مصیبت کے وقت دشمن کو حاصل ہوتی ہے۔

(۱۳۵۱) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حضرت بريدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ ایک آدمی کو یہ کلمات کہتے ہوئے سنا، الہی! میں آپ رَجُلًا يَقُولُ: اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ سے سوال کرتا ہوں اس لئے کہ میں گواہی دیتا ہوں بِأَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، الْأَحَدُ الصَّمَدُ، الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ. فَقَالَ: «لَقَدْ سَأَلَ اللَّهُ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أُعْطِيَ، وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أُجَابَ». أَخْرَجَهُ الْأَزْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

زریعہ طلب کیا جائے تو وہ عطا فرماتا ہے اور جب دعا

کی جاتی ہے تو اسے قبول فرماتا ہے۔“ (اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الصمد﴾ الصمد اس سردار کو کہتے ہیں جس میں سرداری اور بزرگی کے تمام انواع موجود ہوں اور یہ بھی قول ہے کہ ایسا سردار جس کی طرف تمام ضروریات و حاجات میں رجوع کیا جاتا ہے اور مرغوب و پسندیدہ چیزوں کیلئے پسند کیا گیا ہو اور مصائب کے موقع پر جس سے مدد و اعانت مانگی جاتی ہو۔ پریشانیوں کے دور کرنے کیلئے اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ الصمد وہ سردار جو اپنے افعال و صفات میں ہر پہلو سے کامل ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد خود باقی رہنے والا ہو۔ علاوہ ازیں اس کے اور بھی معانی ہیں۔ ”والکفو“ کاف پر ضمہ اور واؤ مخفف۔ اس کے معنی شبیہ، شیل اور نظیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کے وقت ان کلمات کو پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ قبولیت دعا کا ذریعہ ہیں۔

(۱۳۵۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَصْبَحَ، يَقُولُ: «اللَّهُمَّ! بِكَ أَصْبَحْنَا، وَبِكَ أَمْسَيْنَا، وَبِكَ نَحْيَا، وَبِكَ نَمُوتُ، وَإِلَيْكَ النُّشُورُ». وَإِذَا أَمْسَى قَالَ مِثْلَ ذَلِكَ، إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: «وَالَيْكَ الْمَصِيرُ». أَخْرَجَهُ الْأَزْمَعِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جب صبح ہوتی رسول اللہ ﷺ کہتے ”اے اللہ! تیرے ذریعہ سے ہم نے صبح کی اور تیرے ذریعہ سے شام کی اور تیرے ہی ذریعہ ہماری زندگی ہے اور تیرے ہی ذریعہ ہماری موت ہے اور تیری ہی طرف دوبارہ اٹھنا ہے۔“ جب شام ہوتی تب بھی یہ دعا پڑھتے اور ”الیک النشور“ (تیری طرف اٹھایا جانا ہے) کی بجائے ”والیک المصیر“ (تیری طرف واپس آنا ہے) کے الفاظ ادا فرماتے۔ (اسے چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اللهم بک اصبحنا﴾ اس میں ”باء“ محذوف کے متعلق ہے اور وہ اصباح کی خبر ہے۔ یہاں عبارت محذوف و مقدر ماننا ضروری ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی ﴿اصبحنا متلبسین بنو لبقک﴾ یعنی ہم نے تیری حفاظت کے ساتھ چپکے، لپٹتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی ہوگا کہ ہم نے تیری نعمتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیرے ذکر میں مشغول رہتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیرے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے صبح کی یا یہ

متفرق مضامین کی احادیث 978

معنی کہ ہم نے تیری توفیق کے شامل حال ہوتے ہوئے یا پھر یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیری عطا کردہ قوت و ہمت کی بدولت حرکت کرتے ہوئے صبح کی۔ ﴿وَبَكَ نَحْيًا وَبَكَ نَمُوتُ﴾ یعنی زندگی اور موت تو ہی دیتا ہے۔ تیرے زندگی عطا فرمانے سے زندہ ہیں اور موت وارد کرنے سے مرجائیں گے۔ ﴿وَالْبَيْكَةُ النُّشُورُ﴾ یہ جملہ ”نشر الامیت نشورا“ سے ماخوذ ہے۔ یعنی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا۔ ﴿المصیر﴾ مرنے کے بعد زندہ ہو کر اس کی جانب لوٹنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو انعام بھی انسان کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی جانب سے ہے اس میں کسی ولی، کسی فرشتے حتیٰ کہ کسی نبی کا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ سب خود اسی کے محتاج ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نیند اور موت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ انسان کا نیند سے بیدار ہونا ایک طرح کا موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اسی وجہ سے شام کے ذکر میں مصیر کا لفظ ہے، اس لئے کہ وہ نیند کا وقت ہے اور صبح اٹھنے کا وقت ہے۔ اسی مناسبت سے اس وقت البیکۃ النشور کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

(۱۳۵۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَضْرَتِ الْأَنْسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: كَانَ أَكْثَرُ دُعَائِهِ ﷺ بِكُفْرَتِ يَوْمَ الدُّنْيَا: «رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا مَوْلَاً، هَمِيسَ دُنْيَا مِثْلَ هَمِيسِ بَهْلَائِي عَطَا فَرَمَا أَوْ آخِرَتِ مِثْلَ حَسَنَةِ، وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً، وَقَنَا بَهْلَائِي سَمِعَ سَرَخَرُو فَرَمَا أَوْ هَمِيسَ آگِ كَعَذَابِ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. سے بچا“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فنا﴾ قاف کے نیچے کسر۔ دعائیہ صیغہ وقی یقی سے۔ اس میں نون ضمیر متکلم کا ہے، معنی ہے ہمیں محفوظ رکھ، ہمیں بچا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جس دعا کا ذکر ہے اسے نبی ﷺ بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ یہ دعا سب کی جامع ہے۔ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ دنیا و آخرت کے جملہ مطالب اس میں آگئے ہیں۔ اس میں لفظ حسنہ میں دنیا کے اعتبار سے نیک عمل، نیک اولاد، وسعت رزق اور علم نافع، صحت و عافیت وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ صرف ایک لفظ حسنہ کہہ کر دنیا کی جملہ بھلائیں طلب کر لیں اور آخرت کیلئے یہی لفظ بول کر دخول جنت کی طلب کر لی اور وہاں کی گھبراہٹ سے امن و سلامتی اور حساب و کتاب کی آسانی طلب کر لی اور آگ کے عذاب یعنی جہنم کے عذاب سے پناہ کی درخواست کر دی۔ گویا اس مختصر مگر جامع دعا میں دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں مانگ لیں اور دوزخ کے عذاب سے پناہ و نجات طلب کر لی۔

(۱۳۵۴) وَعَنْ أَبِي مُوسَى حَضْرَتِ ابْنِ مَوْسَى الشَّعْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «الْحَيُّ! مِيرَى خَطَا مَعَا فَرَمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدْعُو «اللَّهُمَّ دے۔ نیز میری نادانی و جمالت کے کاموں کو بخش اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي دے۔ میرے کلام میں مجھ سے جو زیادتیاں سرزد

ہو میں ان کو بھی اور جو کچھ میرے بارے میں تیرے علم میں ہے ان سب کو بھی معاف فرما دے۔ اے اللہ! مجھ سے ارادتا یا غیر ارادی طور پر جو کچھ صادر ہوا اس کی مغفرت فرما دے۔ خواہ وہ میری لغزش ہو یا ارادے سے ہو یہ سب میری ہی جانب سے ہوا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ میں کر چکا ہوں یا جو آئندہ کروں گا اور جو میرا پوشیدہ ہے یا جو مجھ سے ظاہر ہوا ہے اور جو کچھ بھی میرے متعلق تیرے علم میں ہے وہ سب بخش دے۔ تو ہی پہلے ہے اور تو ہی بعد میں اور تو ہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿جدی﴾ یعنی جو میں نے سنجیدگی سے کئے ہیں۔ ﴿وما اسررت﴾ جو میں نے خفیہ طور پر کئے۔

حاصل کلام: اس قسم کی جتنی دعائیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ یہ آپؐ نے امتثال امر کیلئے مانگی ہیں کیونکہ آپؐ تو معصوم عن الخطاء تھے یا امت کو تعلیم دینے کی غرض سے مانگی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ دعائی تشدد کے آخر میں پڑھتے اور بعض میں ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد۔ عین ممکن ہے کہ دونوں طرح آپؐ نے یہ دعا پڑھی ہو کبھی سلام سے پہلے کبھی سلام کے بعد۔

(۱۳۵۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ! أَضْلِحْ لِي دِينِي الَّذِي هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِي، وَأَضْلِحْ لِي دُنْيَايَ الَّتِي فِيهَا مَعَاشِي، وَأَضْلِحْ لِي آخِرَتِي الَّتِي إِلَيْهَا مَعَادِي، وَاجْعَلْ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِي فِي كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلْ الْمَوْتَ رَاحَةً لِي مِنْ كُلِّ شَرٍّ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے ”اے اللہ! میرے لئے دین درست رکھنا جس میں میرے کام کا بچاؤ ہے۔ میرے لئے میری دنیا کو درست فرما جس میں میری زندگی ہے اور میرے لئے میری آخرت درست فرما جس کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔ میری زندگی کو ہر عمل خیر کی زیادتی کا سبب بنا اور موت کو میرے لئے ہر برائی سے راحت بنا دینا“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿معدی﴾ یعنی جس میں موت کے بعد میرا لوٹنا، میرا رجوع کرنا۔ ﴿اجعل الحیاة﴾

زیادہ لمبی یعنی زیادتی کا سبب بنا۔

حاصل کلام: اس دعائیں بھی دین و دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کی جا رہی ہے کہ ایک مومن صادق یہی سمجھتا ہے کہ اس دنیا کی بھلائی بھی خالق کائنات کے اختیار میں ہے اور آخرت کی بھلائی کا بھی وہی تھما مالک ہے۔ اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہ کر لے کہ موت مانگنا درست ہے بلکہ اس حدیث میں تو موت کے بعد پیش آنے والے حالات سے سلامتی اور امن کی درخواست کی ہے۔ دنیا کی تکلیفیں اور مصائب تو موت کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہو جاتی ہیں، اب آگے کے مصائب شروع ہوتے ہیں ان مصائب سے سلامتی اور امن کی دعا ہے۔

(۱۳۵۶) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَارْزُقْنِي عِلْمًا يَنْفَعُنِي». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالْحَاكِمُ.

یہ دعا فرمایا کرتے تھے ”اے اللہ! جو علم تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اسے میرے لئے نافع بنا دے اور مجھے ایسا علم عطا فرما جو میرے لئے نفع بخش ہو اور مجھے نفع والا علم دے“ (اسے نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔)

وَلِلتَّرمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ ترمِذِي میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَقَالَ: هـ۔ اس کے آخر میں اتنا اضافہ ہے ”اور میرے علم فی آخرہ: «وَرِزْقِي عِلْمًا. اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میں اضافہ فرما۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے اور میں عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ اہل دوزخ کے حالات سے پناہ مانگتا ہوں۔“ (اس کی حَالِ أَهْلِ النَّارِ. وَلِإِسْنَادِهِ حَسَنٌ. اسناد اچھی ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث میں جو دعا منقول ہے اس میں ایسے علم کیلئے درخواست کی گئی ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں منافع بخش اور سود مند ہو۔ جو علم آخرت تباہ کر دے اس کی دعا کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا کیونکہ مومن کے نزدیک اخروی کامیابی و کامرانی بنیادی چیز ہے۔ نافع علم وہ علم ہے جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہو اور عمل کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ دنیاوی علوم کی درخواست دنیاوی امور کی اصلاح اور بہتری کیلئے کرنا جائز ہے۔ اس سے انسان کے ایمان باللہ میں اضافہ ہوگا۔ ان علوم میں بھی اہل ایمان کو برتری حاصل ہونی چاہئے ورنہ دنیاوی اعتبار سے کفار کا تسلط اور غلبہ ہوگا۔ جیسا آج یہی صورت حال ہے کہ ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم میں غیر مسلم بہت آگے نکل چکے ہیں اور وہی آج دنیا کی قیادت کے دعویدار بنے بیٹھے ہیں اسی زور پر جہاں چاہتے ہیں انقلاب اور تبدیلی لے آتے ہیں۔ اہل اسلام کو ان میدانوں میں بھی اپنی برتری اور فوقیت کا سکھ منوانا چاہئے۔

(۱۳۵۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا رَوَتْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ

تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهَا هَذَا الدُّعَاءَ: «اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ، عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرٍ مَا سَأَلَكَ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَادَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَسْأَلُكَ أَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَاءٍ قَضَيْتَهُ لِي خَيْرًا». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَةَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ جِبَانَ وَالْحَاكِمُ.

ان کو یہ دعا سکھائی ”الہی! میں تجھ سے ہر طرح کی بھلائی طلب کرتی ہوں۔ جلدی وصول ہونے والی ہو یا دیر سے ملنے والی۔ جس کو میں جانتی ہوں یا نہیں جانتی۔ اور ہر برائی سے میں تیری پناہ مانگتی ہوں“ جلدی آنے والی ہے یا دیر سے، جس کا مجھ علم ہے یا وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ خیر طلب کرتی ہوں جس کا تیرے بندے اور نبی نے سوال کیا تھا اور اس شر سے پناہ طلب کرتی ہوں جس سے تیرے بندے اور نبی نے پناہ مانگی تھی۔ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا اور ایسے عمل اور قول کا سوال کرتی ہوں جو جنت سے قریب کرنے والے ہیں اور تیری پناہ طلب کرتی ہوں جنم سے اور ہر اس عمل اور قول سے جو اس جنم کے قریب کر دے اور میں بات کا سوال کرتی ہوں کہ تو نے جو فیصلہ میرے حق میں کیا ہے اس کو میرے حق میں بہتر بنا دے۔“ (اسے ابن ماجہ نے نکالا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عاجلہ﴾ جو چیز جلدی میں حاصل ہو جانے والی ہو۔ یہاں دنیا کی بھلائی مراد ہے۔ ﴿آجلہ﴾ جو ذرا دیر و تاخیر سے ملنے والی ہو۔ اس سے مراد آخرت میں حاصل ہونے والی بھلائی ہے۔ ﴿عاذ﴾ پناہ طلب کی، امان طلب کی۔ ﴿وما قرب الیہا﴾ تقریب سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ یعنی جو اس کے قریب کر دے۔

حاصل کلام: یہ بھی جامع ترین دعاؤں میں سے ایک دعا ہے۔ جس میں مختلف اشیاء کے طلب اور استعاذہ کے بعد بالآخر عرض کی کہ میں ہر اس بھلائی کا خواستگار ہوں جس کی طلب رسول اللہ ﷺ نے کی ہے اور ہر اس برائی سے پناہ چاہتا ہوں جس سے رسول اللہ ﷺ نے پناہ چاہی ہے، جس میں دنیا و آخرت کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

(۱۳۵۸) وَأَخْرَجَ الشَّيْخَانِ عَنْ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہ رسول اللہ ﷺ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نے فرمایا ”دو کلمے ہیں جو رحمن کو بڑے پیارے ہیں۔

متفرق مضامین کی احادیث 982

قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «كَلِمَتَانِ زَبَانٍ بِهِنَّ هِيَ - تَرَاوُ فِي بَهَارِي هِيَ - (وہ یہ حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمَنِ خَفِيفَتَانِ عَلَى هِيَ) "اللہ پاک ہے" ساتھ اپنی تعریف کے۔ اللہ اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ: سُبْحَانَ پاك ہے، عَظَمْتَ وَالَا۔" (بخاری و مسلم) اللہ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ الْعَظِيمِ».

لعنوی تشریح: ﴿ثَقِيلَتَانِ﴾ دونوں کلمے وزنی ہیں۔ ان کے وزنی ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں کلموں میں سے ہر ایک باوجود اپنے حروف کے قلیل ہونے اور الفاظ کے خوشگوار ہونے کے توحید کے جملہ پہلوؤں پر محیط و حاوی ہیں۔ ﴿سُبْحَانَ اللَّهِ﴾ کا کلمہ اللہ کی ذات و صفات اور اعمال میں ہر عیب و نقص سے پاک ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور کلمہ ﴿وَبِحَمْدِهِ﴾ اس کیلئے کمال کی تمام صفات کو لازم و واجب قرار دیتا ہے کیونکہ حمد و تعریف مطلق اور عام ہے۔ کسی مخصوص امر پر نہیں ہے اور مطلق حمد اسی کا حق ہے جس میں کمال کے تمام تر اوصاف پائے جاتے ہیں اور ﴿الْعَظِيمِ﴾ کا لفظ دوسرے کلمہ میں وہی فائدہ دے رہا ہے جو پہلے کلمہ میں "بحمدہ" دے رہا ہے کیونکہ عظمت بھی مطلق ہے۔ اس کی مستحق بھی وہی ذات ہے جس میں عظمت و کمال کے جملہ اوصاف پائے جائیں۔ پھر عظمت و کمال حقوق و عادات میں غیر کی شرکت کی نفی کرتے ہیں لہذا اللہ تعالیٰ کا ہر عیب و نقص سے پاک ہونا اور تمام صفات کمالیہ سے متصف ہونا اور اس کی توحید کا کمال اظہار ہے۔ توحید ہی اصل الاصول ہے اور ہر مطلوب کی انتہا ہے جس طرح جو ہر بڑا قیمتی اور عظمت شان والا ہوتا ہے۔ حجم میں چھوٹا اور وزن میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ دونوں کلمے باوجود حروف کے قلیل ہونے کے ان کا وزن بھاری ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو کلموں کا ہلکا و وزنی ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ زبان سے ان کا ادا کرنا سہل و آسان ہے۔ کلمے بڑی آسانی سے ہر ایک کی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور ان کے بھاری ہونے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح نیکی کے مشکل اعمال وزن میں بھاری ہوں گے اسی طرح یہ آسانی سے پڑھے جانے والے کلمات بھی میزان اعمال میں بھاری اور ثقیل ہوں گے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت کے روز اعمال کا جسم ہوگا اور اعمال کو تولو اور وزن کیا جائے گا۔ اس حدیث سے اللہ عزوجل کی وسعت و رحمت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے نیک و مخلص بندوں کے تھوڑے اعمال کے بدلہ میں اجر و ثواب زیادہ عطا فرمائے گا۔ یہ محض اس کا فضل و کرم اور مہربانی ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔

قَالَ مُصَنِّفُهُ - الشَّيْخُ الْإِمَامُ الْعَالِمُ أَبُو الْوَلَدِ الْمُرْتَبِيّ قَاضِي الْقَضَاةِ عَلَامَةُ الدَّهْرِ شَيْخُ الْإِسْلَامِ (اللہ ان کے علم سے خلق کثیر کو نفع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے) احمد بن علی بن محمد بن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس

متفرق مضامین کی احادیث 983

مُحَمَّدُ بْنُ حَجَرٍ فِي حَدِيثٍ عَشَرَ كِتَابُ كِي تَعْنِيفَ سَ ۱۱ / ۳ / ۸۲۸ ھ كُو اللّٰهُ
شَهْرِ رَبِيعِ الْأَوَّلِ سَنَةِ ثَمَانٍ ذُو الْجَلَالِ كَا شُكْرِ اَدَا كَرْتِ ھُوَ ۱ اور رسول اللّٰهُ
وَعِشْرِينَ وَثَمَانِيَّةً، حَامِدًا لِلّٰهِ تَعَالَى ﷺ ۲ پر درود و سلام پڑھ كر آپؐ كِي تعظيم و تكريم
وَمُصَلِّيًا عَلَى رَسُولِهِ ﷺ وَمُكْرَمًا كَرْتِ ھُوَ فَارِغَ ھُوَ۔
وَمُبْجَلًا وَمُعْظَمًا۔

اللّٰهُ تَعَالَى مؤلف، شارح اور ھم سب كو اپنی وسيع تر رحمت سے حصہ وافر عطا فرمائے۔ انبياء كرام،
شهداء، صحابہ كرام اور سلف صالحين كِي رفاقت و معيت عطا فرمائے۔ آمين يا رب العالمين۔
وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين



جرح و تعدیل یا تخریج احادیث میں مذکور ائمہ محدثین کے مختصر حالات زندگی

﴿ ائمہ سبۃ ﴾

(۱) امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ: آپ ان چار ائمہ میں سے ایک ہیں، جو اطرافِ عالم میں پیشوا اور رہنما مانے جاتے ہیں۔ آپ کا نام ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی ہے۔ ربیع الاول ۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے اور بروز جمعہ بارہ ربیع الاول ۲۴۱ھ وفات پائی۔ آپ دین اسلام میں آزمائش اور ثابت قدمی کے اعتبار سے سب سے بڑے عالم ہیں۔ آپ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی وفات کے روز بیس ہزار عیسائی، یہودی اور پارسی دائرۃ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

(۲) امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ: آپ حدیث میں محدثین کے امام تھے، آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بوزہ (باء پر فتح راء ساکن، دال پر کسرہ اور زاء پر کسرہ ہے) جعفی بخاری ہے۔ یاد رہے کہ جعفی کی نسبت ولاء اسلام کی ہے نہ کہ ولاء رق و غلامی کی، کیونکہ آپ کے جد امجد مغیرہ، یمان جعفی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اور بخارا میں آنے پر ان کے طرف منسوب ہوئے۔ آپ شوال ۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ عید الفطر کی رات کو وفات پائی۔ آپ فن حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے اور آپ کی کتب الجامع الصغیر، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتب ہے، جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

(۳) امام مسلم بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ: آپ بڑے ائمہ محدثین میں سے ایک تھے، آپ کا نام مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری تھا۔ آپ ۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے اور رجب ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی کتاب الصصحیح، صحیح بخاری کے بعد صحیح ترین کتب ہے۔ آپ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کبار ائمہ حدیث سے سماع کیا۔

(۴) امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث رحمۃ اللہ علیہ: آپ کبار ائمہ محدثین میں سے ایک ہیں، آپ کا نام ابو

داؤد سلیمان بن اشعث بن اسحاق ازدی بختیانی (سین کے فتح اور کسرہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) ہے۔ آپ سنن ابو داؤد کے مصنف ہیں، آپ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور بروز جمعہ ۱۵ شوال ۲۷۶ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ فن حدیث میں اس قدر نمایاں ہوئے کہ یہ کہا جانے لگا کہ امام ابو داؤد کے لیے حدیث اس طرح آسان اور نرم ہو گئی ہے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہو گیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں ”میں نے نبی ﷺ کی پانچ لاکھ احادیث لکھی ہیں، سنن میں موجود احادیث انہی پانچ لاکھ سے ہی میں نے منتخب کی ہیں۔“

(۵) امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی رحمہ اللہ: ترمذی: تاء پر تینوں حرکات جب کہ میم پر ضمہ اور کسرہ دو حرکتیں ہیں، یہ دریائے جیون (آمودریا) کے مشرقی کنارہ پر واقع ایک قدیم شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ کا نام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ہے۔ آپ ”جامع الترمذی“ کے مصنف ہیں۔ آپ ۲۰۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۳ رجب ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ آپ اپنی جامع کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ”جس کے گھر میں یہ جامع موجود ہو، گویا اس کے گھر میں باتیں کرتا ہوا نبی موجود ہے۔“ آپ امام بخاری رحمہ اللہ کے تیار کردہ اور فیض یافتہ شاگرد ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ اپنی وفات کے بعد خراسان میں کوئی ایسا جانشین نہیں چھوڑ کر گئے، جو علم و حفظ اور ورع و زہد میں امام ترمذی رحمہ اللہ کا شیل ہو۔ آپ اپنے استاد امام بخاری کی وفات پر روتے روتے ٹاہینا ہو گئے اور برسوں ٹاہینا رہنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(۶) امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی رحمہ اللہ: نسائی: (نون کے فتح اور الف ممدودہ اور مقصورہ ساتھ) خراسان میں واقع نساء نامی شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ کا نام ابو عبد الرحمن احمد بن علی بن شعیب بن علی الحافظ ہے۔ آپ السنن الجتبی کے مصنف ہیں۔ آپ ۲۱۵ھ کو پیدا ہوئے اور ۳۰۳ھ کو وفات پائی، آپ نے فن حدیث میں اس قدر نمایاں مقام حاصل کیا کہ حفظ و اتقان میں بے مثال گردانے جانے لگے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد دیگر تمام سنن کی نسبت سب سے کم ضعیف احادیث آپ کی سنن میں ہیں۔ آپ نے مصر میں سکونت اختیار کرنے کے بعد دمشق کا رخ کیا اور وہاں کتاب ”الخصائص فی فضل علی رضی اللہ عنہ“ کی تصنیف کی، جس پر لوگوں نے آپ کو روند اور مار پیٹ کر مسجد سے باہر پھینک دیا، پھر آپ کو مکہ مکرمہ پہنچایا گیا۔ جہاں حدیث کا یہ روشن چراغ زخموں اور ضربوں کی تاب نہ لا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

(۷) امام محمد بن یزید بن ماجہ رحمہ اللہ: آپ بڑے ائمہ محدثین میں سے ایک ہیں۔ آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی ہے۔ آپ سنن کے مصنف ہیں۔ آپ کی ۲۰۷ھ کو پیدائش اور رمضان ۲۷۳ یا ۲۷۵ھ کو وفات ہوئی۔ اور ”ماجہ“ جیم کی تخفیف کے ساتھ اور اس کے آخر میں ہاء ساکن ہے، تاء نہیں۔ آپ نے امام مالک کے ساتھیوں سے سماع کیا اور ایک بڑی تعداد میں مخلوق نے آپ سے

روایت کی۔ اور آپ کی سنن میں ضعیف بلکہ منکر احادیث کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

﴿ ائمہ سبعہ کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث ﴾

* اسحاق بن راہویہ: آپ امام اور بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ آپ کا نام ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم تمیمی حنفی مروزی ہے۔ آپ نساپور کے رہنے والے، وہاں کے عالم بلکہ اہل مشرق کے بھی شیخ تھے، ابن راہویہ کے نام سے مشہور تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں ”عراق میں اسحاق بن راہویہ کا کوئی ثیل میں نہیں جانتا۔“ امام ابو زرہ رازی فرماتے ہیں ”امام اسحاق بن راہویہ سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا۔“ امام ابو حاتم فرماتے ہیں ”اسحاق بن راہویہ تعجب کی حد تک ضابط و پختہ کار اور اغلاط سے پاک اور حافظہ کے مالک تھے۔“ آپ ۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک قول کے مطابق ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کی رات کو فوت ہوئے۔

* احمد بن ابراہیم اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ: آپ امام، حافظ، مستند عالم اور شیخ الاسلام تھے۔ آپ کا نام ابو بکر احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن عباس اسماعیلی جرجانی ہے، اپنے علاقے میں شوافع کے بڑے امام تھے۔ بلادِ عجم میں منفرد اور بے مثال تھے۔ آپ سے ایک معجم روایت کی جاتی ہے، آپ نے الصحیح اور دیگر کثیر کتب تصنیف کیں، جن میں سے ایک مسند عمرؓ بھی ہے، جس کا خود آپ نے دو جلدوں میں اختصار کیا۔ امام حاکم کہتے ہیں ”اسماعیلی اپنے زمانے کے منفرد، بے مثال، محدثین و فقہاء کی سرداری، شرافت اور سخاوت میں ان سب کے سرخیل تھے، اور علماء، محدثین و فقہاء اور ان میں سے بلند پایہ اہل عقول کے درمیان ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ آپ ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۴ سال کی عمر پر ۱۷ رجب ۳۷۱ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

* احمد بن عمرو ہزار رحمۃ اللہ علیہ: آپ امام، حافظ اور بہت بڑے علامہ تھے۔ آپ کا نام ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری ہے۔ آپ کبار ائمہ میں سے ایک اور ”المسند الکبیر“ اور ”العلل“ کے مصنف تھے۔ آپ نے امام طبرانی اور دیگر ائمہ سے علم حاصل کیا، اور ۲۹۲ھ کو آپ کی وفات ہوئی۔ ہزار باء کے فتح اور زاء کی شد کے ساتھ ہے اور الف کے بعد بغیر نقطہ کے راء ہے۔

* احمد بن حسین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ: السیاقی: باء کے فتح کے ساتھ اس کے بعد یاء ساکن ہے۔ یہ نساپور کے قریب ایک یمن نامی شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ نامور امام، حافظ اور علامہ تھے۔ آپ کا نام ابو بکر احمد بن حسین ہے۔ شعبان ۳۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور آٹھ جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ کو وفات پائی۔ آپ کبار ائمہ حدیث اور بڑے فقہاء شافعیہ میں سے تھے، آپ نے ایسی ایسی تصنیفات لکھیں جن کی قرونِ اولیٰ میں کوئی مثال نہیں ملتی، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں: السنن الکبریٰ، السنن الصغریٰ، المبسوط اور الاسماء والصفات۔ امام ذہبی فرماتے ہیں ”امام بیہقی کی تالیفات ایک ہزار جزء کے لگ بھگ ہیں۔“

* **عبداللہ بن علی بن الجارود** رحمۃ اللہ علیہ: ابن الجارود ایک بلند پایہ امام، حافظ اور ناقد تھے۔ آپ کا نام ابو محمد عبداللہ بن علی بن جارود نيساپوری ہے۔ مکہ مکرمہ میں براجمان ہوئے۔ ”المنتقى فی الاحکام“ کے مصنف اور علماء ثقافت، مستندین اور قراء میں سے ایک تھے۔ اور ۳۰۷ھ کو وفات پائی۔

* **ابو حاتم محمد بن ادريس** رحمۃ اللہ علیہ: آپ امام اور بہت بڑے حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو حاتم محمد بن ادريس بن المنذر حظلی رازی ہے۔ آپ ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور شعبان ۲۷۷ھ میں وفات پائی۔ آپ فن حدیث کے نامور محدثین اور کبار ائمہ جرح و تعدیل میں سے ایک تھے۔

* **حارث بن ابو اسامہ** رحمۃ اللہ علیہ: آپ کا نام ابو محمد حارث بن ابی اسامہ محمد بن داہر تمیمی بغدادی ہے۔ آپ حافظ اور المسند کے مصنف تھے۔ البتہ اپنی مسند کو مرتب نہیں کر سکے۔ ابراہیم حربی اور ابو حاتم نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام دارقطنی کہتے ہیں کہ صدوق ہیں۔ آپ ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۷ھ کی عمر یا ۲۸۲ھ میں عرفہ کے روز فوت ہوئے۔

* **ابو عبداللہ الحاکم** رحمۃ اللہ علیہ: امام ابو عبداللہ امام المحققین تھے۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نيساپوری ہے اور ابن البیع (باء کے فتح اور کسور یاء کی تشدید کے ساتھ) سے معروف تھے۔ اور المستدرک علی الصحیحین کے مصنف تھے۔ ۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور صفر ۴۰۵ھ میں وفات پائی۔ آپ نے دو ہزار یا اس کے لگ بھگ مشائخ سے سماع کیا۔ تقویٰ اور دیانت کے ساتھ ساتھ آپ فائق اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

* **ابو حاتم محمد بن حبان** رحمۃ اللہ علیہ: آپ ائمہ اعلام میں سے ایک ہیں۔ آپ کا نام ابو حاتم محمد بن حبان (حاء کے کسرہ اور باء کی تشدید کے ساتھ) بن احمد بن حبان البستی ہے۔ بستی باء کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ، یہ بختان کے شہروں میں سے ایک شہر بستی کی طرف نسبت ہے، جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ حفاظ آثار و احادیث، فقہاء دین اور تشنگان علم کے لیے ہادی و مرجع تھے۔ اور آپ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ایک تھے اور اسی کے عشرے میں داخل ہو کر ۳۵۴ھ میں سمرقند کے اندر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* **محمد بن اسحاق بن خزیمہ** رحمۃ اللہ علیہ: آپ شیخ الاسلام، حافظ کبیر اور بڑے ائمہ حدیث میں سے ایک تھے۔ خزیمہ، تصغیر کے ساتھ ہے۔ ۲۲۳ھ کو نيساپور میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ کو اسی نيساپور میں وفات پائی۔ خراسان کے اندر اپنے زمانے میں امامت و حفظ کی آپ پر انتہاء تھی۔ اور آپ کی تصنیفات ۱۴۰ سے تجاوز ہیں۔

* **ابن ابی خيثمہ** رحمۃ اللہ علیہ: آپ امام، حافظ اور محقق عالم تھے۔ آپ کا نام ابو بکر احمد بن ابی خيثمہ زہیر بن حرب نسائی بغدادی ہے۔ اور التاریخ الکبیر کے مصنف ہیں۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں ”ثقہ اور معتبر ہیں۔“

خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔ ”ابن ابی خیشمہ ثقہ، عالم، متقن و ضابط، حافظ، تاریخ میں بصیرت رکھنے والے اور ادب کے راوی تھے۔“ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور ابن معین سے علم حدیث حاصل کیا اور ۹۳ سال کی عمر پر اکرمہ جہادی الاولیٰ ۲۸۹ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* علی بن عمر دار قطنی رحمہ اللہ: دار قطنی: راء کے فتح اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ بغداد کے ایک بڑے محلہ دار قطن کی طرف نسبت ہے۔ حافظ کبیر اور بے مثال امام تھے۔ آپ کا نام ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بغدادی ہے۔ ۳۰۶ھ کو پیدا ہوئے اور آٹھ ذوالقعدہ ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔ آپ اپنے زمانے کے منفرد و بے مثال اور اپنے وقت کے امام تھے۔ ان کے زمانے میں جاہ و حشمت، علم حدیث اور معرفت علل اسماء الرجال کی آپ پر انتہاء تھی۔

* امام دارمی رحمہ اللہ: سمرقند میں آپ کو شیخ الاسلام، حافظ حدیث اور امام کا مقام حاصل تھا۔ آپ کا نام ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن بن فضل بن بھرام تھیں دارمی سمرقندی ہے۔ آپ ”المسنَد العالی“ کے مصنف تھے۔ آپ نے حرین، خراسان، شام، عراق اور مصر میں علم حدیث کا سماع کیا۔ آپ سے امام مسلم رحمہ اللہ، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور دیگر ائمہ حدیث نے احادیث روایت کیں۔ آپ عقل و فضل کی بلندیوں کو چھوتے تھے اور دیانت، حلم، اجتہاد، عبادت اور دنیا سے بے رغبتی میں ضرب المثل تھے۔ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ آٹھ ذوالحجہ ترویہ کے دن اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* ابو داؤد طیالسی رحمہ اللہ: آپ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام سلیمان بن داؤد بن جارود بصری، اور فارسی الاصل، آل زبیر کے آزاد کردہ اور بڑے ائمہ حدیث میں سے ایک تھے۔ قلاس اور ابن مدینی فرماتے ہیں ”میں نے طیالسی سے بڑھ کر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔“ ابن مہدی فرماتے ہیں ”آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر سچے تھے“ آپ نے ایک ہزار اساتذہ سے احادیث لکھیں اور اسی سال کی عمر پر ۲۰۴ھ میں اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔

* ابن ابی الدینار رحمہ اللہ: آپ محدث، عالم اور صدوق تھے۔ آپ کا نام ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن عبید بن سفیان بن ابی الدینا قرشی اموی بغدادی ہے۔ آپ قریش کے آزاد کردہ غلام تھے، متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ نے خلفاء و امراء کی اولاد میں سے ایک جماعت کو ادب و علم سکھایا اور معتضد باللہ کو بھی آپ ہی نے ادب و اخلاق کی تربیت دی۔ ۲۰۸ھ کو پیدا ہوئے اور جمادی الاول ۲۸۱ھ میں وفات پائی۔

* امام ذہلی رحمہ اللہ: آپ امیر المومنین فی الحدیث، شیخ الاسلام اور حافظ نیساپور تھے۔ آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ بن عبد اللہ بن خالد بن فارس ہے۔ آپ بنو ذہل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے حرین، شام، مصر، عراق، ری، خراسان، یمن اور جزیرہ عرب میں علماء کی ایک بڑی جماعت سے سماع کیا اور علم حدیث میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ خراسان میں علم کے بہت بڑے شیخ اور استاد تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ”میں نے محمد بن یحییٰ ذہلی سے بڑھ کر زہری کی احادیث کو جاننے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔“

آپ ۱۸۰ھ کے بعد پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۲۵۸ھ کو رحلت فرما گئے۔

* ابو زرعہ رازی رحمۃ اللہ علیہ: آپ بہت بڑے محدث اور حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو زرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ رازی قرشی ہے۔ آپ قریش کے آزاد کردہ اور ائمہ جرح و تعدیل اور کبار محدثین میں سے ایک تھے۔ امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے آپ سے حدیث روایت کی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں ”ابو زرعہ رازی نے حرمین، عراق، شام، جزیرہ عرب، خراسان اور مصر میں بہت سے ائمہ سے سماع کیا ہے۔ آپ حفظ و ذہانت، دین و اخلاص اور علم و عمل کے اعتبار سے زمانے کے نامور لوگوں میں سے ایک تھے۔“ ۴۴ سال کی عمر پر ۲۷۴ھ کے آخری دن اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ: آپ کا نام سعید بن منصور بن شعبہ مروزی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ طالقانی پھر بلخی تھے۔ مکہ مکرمہ میں براجمان ہوئے۔ سنن کے مصنف ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے آپ کی تعریف کی اور عظیم الشان قرار دیا ہے۔ حرب کرمانی فرماتے ہیں ”سعید بن منصور نے اپنے حافظہ سے ہمیں دس ہزار احادیث الماعہ کرواتیں۔“ اور نوے کی دہائی میں پہنچ کر ۲۷۴ھ کو رمضان کے مہینے میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

* ابن السکین رحمۃ اللہ علیہ: آپ حافظ، امام اور قابل اعتماد عالم تھے، آپ کا نام ابو علی سعید بن عثمان السکین (سین اور کاف کے فتح کے ساتھ) بغدادی ہے۔ فن اور روایت حدیث کا اہتمام کیا، احادیث جمع کیں اور تصنیفات کی شکل دی۔ اور ۲۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۳ھ کو وفات پائی۔

* محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ: آپ ان چار ائمہ میں سے ایک ہیں، جو اطراف عالم میں رہنما اور پیشوا قرار پائے۔ آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف قرشی مکی ہے۔ مصر میں رہائش اختیار کی۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور جمعہ کی رات ۲۰۴ھ آخر رجب میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ غزہ میں پیدا ہوئے، مکہ مکرمہ پہنچائے گئے اور مصر میں وفات پائی۔ آپ امت کے پیشوا، ساتھیوں میں منفرد اور مغرب و مشرق میں سب سے بڑے عالم تھے۔ علوم و فنون میں نمایاں مقام حاصل کیا اور اصول فقہ کے بانی اور موجد بنے۔ آپ کے جد امجد شافع صحابی تھے اور جوانی میں نبی ﷺ سے ملاقات کی۔

* ابو بکر ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ: آپ حافظ اور بے مثال شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا نام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن حواری عنسی (ان کے آزاد کردہ) کوئی ہے۔ آپ مسند، مصنف اور دیگر کتب کے مصنف تھے، علم حدیث میں چٹان کی مثل تھے۔ امام ابو زرعہ، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد اور دیگر ائمہ حدیث نے آپ سے احادیث روایت کیں۔ ماہ محرم ۲۳۵ھ میں فوت ہوئے۔

حالات ائمہ مشاہیر 990

* سلیمان بن احمد طبرانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ قابلِ حجت اور دنیا کے لیے مستند امام تھے۔ آپ کا نام ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر نخعی طبرانی ہے۔ آپ نے ایک ہزار یا اس سے زیادہ مشائخ سے احادیث روایت کیں۔ طلبِ حدیث میں شام سے کوچ کیا اور ۳۳ سال سفر میں گزارے۔ آپ متعدد مفید اور عجیب و غریب کتب کے مصنف ہیں، جن میں آپ کی درج ذیل تین معاجم، المعجم الکبیر، المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ ۲۶۰ھ میں شام کے علاقہ طبریہ میں پیدا ہوئے اور اصہبان میں مقیم ہوئے اور ۲۸ ذی القعدہ ۳۶۰ھ کو اصہبان ہی میں وفات پائی۔

* احمد بن محمد طحاوی رحمۃ اللہ علیہ: آپ امامِ وقت، علامہ اور حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو جعفر احمد بن محمد سلامہ بن سلمہ ازدی، حجری، مصری، طحاوی، حنفی ہے۔ طحا: مصر کی ایک بستی کا نام ہے۔ آپ شروع میں شافعی تھے اور اپنے ماموں مزنی سے پڑھا کرتے تھے، ایک دن مزنی نے انہیں یہ کہا کہ اللہ کی قسم آپ کی طرف سے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ جس پر وہ ناراض ہو کر ابنِ ابی عمران حنفی کی طرف منتقل ہو کر حنفی بن گئے اور مذہبِ احناف کے اثبات کے لیے بڑے متعدد واقع ہوئے اور اپنے مذہب کے لیے اخبار و احادیث تیار اور جمع کرنے اور دوسروں کے ہاں ضعیف قرار پانے والی احادیث سے استدلال کرنے میں بڑا تکلف کیا۔ اور بقول امام بیہقی مختلف تاویلات کے ذریعے سے احادیث کو ضعیف قرار دینے کے درپے ہوئے۔ ان کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک معانی الآثار ہے۔ ۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جب کہ ایک دوسرے قول کے مطابق ۲۳۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اوائلِ ذی القعدہ ۳۲۱ھ میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ: آپ امام، علامہ، شیخ الاسلام اور حافظ مغرب تھے۔ آپ کا نام ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم نمری قرطبی ہے۔ آپ حفظ و اتقان میں اپنے زمانے میں موجود اہل علم کے سردار تھے۔ انساب اور اخبار میں بڑے ماہر تھے۔ ابن حزم فرماتے ہیں ”فقہ الحدیث کے متعلق بحث و تکرار کرنے میں میں قطعاً ان کا کوئی شیل نہیں جانتا، چہ جائے کہ کوئی ان سے اچھا اور بڑھ کر ہو۔“ آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں، جن میں الاستیعاب آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ ربیع الثانی ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ سال عمر یا کر جمعہ کی رات آخر ربیع الثانی ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔

* عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ: آپ حافظ، علامہ اور حجت ہیں اور آپ کا نام ابو محمد عبد الحق بن عبد الرحمن بن عبد اللہ بن حسین بن سعید ازدی اشبیلی ہے۔ آپ بجلایہ میں آباد ہوئے، اسی میں اپنے علم کی اشاعت کی، کتب تصنیف کیں اور شہرت پائی اور بجلایہ ہی میں خطیب مقرر ہوئے۔ آپ فقیہ، حافظ حدیث اور علل کے عالم اور رجال کے جاننے والے تھے۔ آپ خیر و صلاح، زہد و ورع اور لزوم سنت کے ساتھ آراستہ تھے اور حصولِ دنیا میں پیچھے اور ادب و شعر میں دلچسپی رکھنے میں آگے تھے۔ ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۵۸۱ھ کو بجلایہ میں وفات پائی۔

* عبدالرزاق بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام اور بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری صنعانی ہے۔ آپ قبیلہ حمیر کے آزاد کردہ تھے۔ اہل علم کا ماویٰ اور مرجع تھے، امام احمد، اسحاق، ابن معین اور ذہلی نے آپ سے روایات لیں، آخری عمر میں نابینا ہوئے اور حافظ تبدیل ہو گیا۔ ۸۵ سال کی عمر پر ۲۱ شوال ۲۱۱ھ میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* عبداللہ بن عدی رحمۃ اللہ علیہ : آپ شہرہ آفاق امام اور بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابو احمد عبداللہ بن عدی جرجانی ہے۔ آپ ابن القصار کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ کبار علماء اور ائمہ جرح و تعدیل میں سے ایک تھے۔ ۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے اور جمادی الثانی ۳۷۵ھ میں وفات پائی۔

* محمد بن عمرو العقیلی رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام اور حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ بن حماد عقیلی ہے۔ آپ عظیم المرتبت، عظیم الشان عالم اور کتب الضعفاء الکبیر اور دیگر بہت سی کتب کے مصنف ہیں اور حافظہ میں بڑے بلند تھے اور حرمین میں قیام کیا۔ اور ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔

* علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ : آپ جرح و تعدیل کے امام، حافظ وقت اور اہل حدیث کے پیشوا تھے۔ آپ کا نام ابو الحسن علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح سعدی (بنو سعد کے آزاد کردہ) مدینی ہے۔ امام بخاری، امام ابو داؤد اور دیگر کثیر ائمہ حدیث نے آپ سے روایت کیا۔ ابن مہدی فرماتے ہیں ”علی بن مدینی حدیث رسول ﷺ کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ امام بخاری فرماتے ہیں: علی بن مدینی کے سوا میں نے کسی کے پاس اپنے آپ کو حقیر اور کم تر نہیں سمجھا۔“ ۲۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۴ھ کو سامرا میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ : آپ محدث اور حافظ تھے، آپ کا نام یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن زید نيساپوری اسفرائینی ہے، آپ ائمہ کبار میں سے ایک اور المسند الصحیح المخرج علی مسلم کے مصنف تھے۔ طلب حدیث کے لیے آپ نے زمین کے اطراف و اقطار کا سفر کیا، آپ نے بہت سے شیوخ و ائمہ سے احادیث روایت کیں۔ جیسا کہ آپ سے بھی بہت سے علماء نے احادیث روایت کیں۔ آپ نے پانچ حج کیے۔ ۳۱۶ھ میں فوت ہوئے اور اسفرائین میں آپ کی قبر بہت مشہور ہے، لوگ اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

* علی بن محمد ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ : آپ کا نام ابو الحسن علی بن محمد بن عبدالملک فاسی ہے، آپ بہت بڑے حافظ، امام، ناقد اور علامہ تھے۔ قرطبہ میں پیدائش ہوئی اور فاس میں قیام کیا۔ آپ روایت حدیث کے سب سے زیادہ اصحاب علم و بصیرت اور اسماء الرجال کے سب سے بڑے حفاظ میں سے ایک تھے۔ اور متعدد کتب کے مؤلف تھے۔ ۵۲۲ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۶۲۸ھ میں فوت ہوئے۔

* امام مالک رحمۃ اللہ علیہ : آپ امت کے چار پیشواؤں و رہنماؤں میں سے ایک، دارالہجرت مدینہ طیبہ کے

امام، امت کے فقیہ اور اہل حدیث کے سردار تھے۔ آپ کا نام ابو عبد اللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر امجی ہے۔ امجی آپ کے نويس دادا ذوالصبح کی طرف نسبت ہے اور اصبح یمن کے سب سے بڑے فضل و شرف والے قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے، آپ ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۷۹ھ میں حدیث کا یہ روشن چراغ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ آپ نے نو سو سے زائد مشائخ سے علم حدیث حاصل کیا، جب کہ آپ سے لوگوں کی اتنی بڑی جماعت نے حدیث بیان کی جو احاطہ تحریر میں نہیں لائی جا سکتی اور آپ کے شاگردوں میں سے ایک امام شافعی بھی ہیں۔

* محمد بن اسحاق ابن منندہ: آپ کا نام ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق بن محمد بن یحییٰ بن منندہ (میم کے فتح، نون کے سکون اور وال کے فتح کے ساتھ) آپ بڑے ائمہ اور حفاظ حدیث میں سے ایک امام اور چلتے پھرتے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جو کثیر الحدیث ہونے میں مشہور ہیں۔ طلب حدیث کے لیے آپ نے بلاد عالم کا سفر کیا، اور جب آپ واپس لوٹے تو آپ کے پاس کتابوں کی چالیس گھڑیاں تھیں۔ آپ کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد ایک ہزار سات سو تھی۔ ۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور آخر ذی القعدة ۳۹۵ھ میں بیہوشی کے گھر آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔

* ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ: آپ مشہور حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ نعیم: تصغیر کے ساتھ ہے۔ آپ بلند پایہ ائمہ، محدثین اور کبار حفاظ میں سے ایک تھے۔ آپ نے بڑے بڑے نامور فضلاء سے اور بڑے بڑے فضلاء نے آپ سے علم حاصل کیا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ جن میں سے المستخرج علی صحیح البخاری۔ المستخرج علی صحیح مسلم اور حلیۃ الاولیاء قابل ذکر ہیں۔ اور حلیۃ الاولیاء ان کی بہترین کتب میں سے ایک کتاب ہے، کہا جاتا ہے کہ جب یہ کتاب نيساپور پہنچی تو اہل نيساپور نے اسے چار سو دینار میں خرید لیا۔ آپ رجب ۳۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور صفر یا ایک قول کے مطابق بیس محرم ۴۳۰ھ کو اصہبان میں وفات پائی۔

* ابو یعلیٰ احمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ: آپ کا نام احمد بن علی بن ثنی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال تہمی ہے، آپ جزیرہ عرب کے محدث، حافظ اور المسند الکبیر کے مصنف ہیں، آپ مشہور ارباب صدق و امانت اور دین و حلم میں سے ایک تھے۔ سمعانی کہتے ہیں ”میں نے حافظ اسماعیل بن محمد بن فضل سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے متعدد مسانید مثلاً مسند العدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، یہ سب نہریں ہیں، جب کہ مسند ابی یعلیٰ اس دریا کی مانند ہے جو مجمع الانهار ہو (یعنی جہاں سب نہریں اکٹھی ہوتی ہوں) آپ شوال

۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۰۰ھ میں وفات پائی۔



بلوغ المرام

”بلوغ المرام“ ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ کی وہ لاٹانی کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے مسلمہ ہے۔ مسائل و احکام کا یہ نہایت اہم مجموعہ علماء اور طلباء کے لئے یکساں مفید اور اہمیت کا حامل ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کے مدارس اسلامیہ و دینیہ میں داخل نصاب ہے۔ تصغیر کے نامور علماء کرام نے اس اہم کتاب کو اردو زبان میں ڈھالا۔ کم و بیش ہر حدیث کے نیچے پہلے لغوی تشریح اور پھر حاصل کلام کے نام سے شرح لکھی تاکہ ہر حدیث کی وضاحت ہو جائے اور جو احکامات اس حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی تشریح ہو جائے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے نہایت مفید رہے گا۔